ائمہ اہل بیت علیہم السلام

فکری و سیاسی زندگی

رسول جعفریان

ائمۂ اہلِ بیت علیہم السلام

فکری وسیاسی زندگی

تالیف

حجت الاسلام رسول جعفریان

ترجمہ

سجاد حسین مہدوی

یکے از مطبوعات

دار الثقلین

پوسٹ بکس نمبر ۲۱۳۳- کراچی ۷۴۶۰۰- پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: ائمۂ اہل بیتؑ فکری وسیاسی زندگی

تالیف: رسول جعفریان

ترجمہ: سجاد حسین مہدوی

نظر ثانی تہذیب وتسہیل: سید سعید حیدر زیدی

ناشر: دار الثقلین

طبع اوّل: ربیع الاوّل ۱۴۳۰ھ مطابق مارچ ۲۰۰۹ء

قیمت: ۳۵۰ روپے

انتساب

امام خمینیؒ کے نام

جن کی انقلابی جدو جہد کے نتیجے میں
ایک ایسی فضا وجود میں آئی'
جس میں ائمہؑ کی سیاسی زندگی پر گفتگو کا ماحول فراہم ہوا۔

maablib.org

فہرست

مقدمہ: تشیع اور تاریخ نگاری

۱۵_۵۲

امام علی علیہ السلام

۵۳_۱۲۲

امام حسن علیہ السلام

۱۲۳_۱۷۴

امام حسین علیہ السلام

۱۷۵۔۲۵۴

امام زین العابدین علیہ السلام

۲۵۵۔۲۸۲

امام محمد باقر علیہ السلام

۲۸۳۔۳۲۰

امام جعفر صادق علیہ السلام

۳۲۱۔۳۷۰

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام

۳۷۱ـ۴۱۶

امام علی رضا علیہ السلام

۴۱۷۔۴۶۰

امام محمد تقی علیہ السلام

۴۶۱۔۴۸۶

امام علی نقی علیہ السلام

۴۸۷۔۵۲۰

امام حسن عسکری علیہ السلام

۵۲۱۔۵۴۸

امام مہدی علیہ السلام

۵۴۹۔۵۸۶

فہرست منابع

☆☆☆

maablib.org

مقدمہ: تشیع اور تاریخ نگاری

امام سجاد علیہ السلام

"کنا نعلّم مغازی رسول اللّٰہ کم نعلّم السورة من القرآن."

"ہم رسول اللہ کی جنگوں کی اسی طرح تعلیم دیتے ہیں جس طرح سے قرآنی سوروں کی تعلیم دیتے ہیں۔"

(البدایہ والنہایہ۔ ج ۳۔ ص ۲۴۲؛ سبل الہدیٰ والرشاد۔ ج ۴۔ ص ۲۰)

دورِ تدوین کے آغاز میں شیعہ تاریخ نویسی

شیعوں نے اسلامی علوم کی تدوین کے سلسلے میں اپنا کام دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ہی ساتھ شروع کیا۔ ان علوم میں سے ایک علمِ تاریخ تھا۔ عراق میں تاریخ نویسی کی تحریک کے ساتھ ہی شیعوں نے بھی اپنی سرگرمیوں کا آغاز کردیا اور اس تحریک میں حصہ لیا اور اس میں تعاون کیا۔ ابومخنف اور ہشام کلبی جیسے عراقی شیعوں (۱) سے قطعِ نظر ابواسحاق جیسے مؤرخ جو عراق کی تشیع سے متاثر تھے' کچھ امامی شیعوں نے بھی اسی قدر تاریخِ اسلام کی نگارش میں ساتھ دیا ہے۔ سیرتِ نبویؐ کے مختلف موضوعات' نیز عراق میں ہونے والی تبدیلیوں کی تاریخ' وہ موضوعات تھے جن سے شیعوں کو بھرپور دلچسپی تھی' اور وہ اپنے آپ کو کسی صورت ان تبدیلیوں سے علیحدہ نہیں سمجھتے تھے۔ قدرتی بات ہے کہ اس دوران شیعہ یا شیعیت کی جانب رجحان رکھنے والی تحریکیں' حتیٰ اموی حکومت کی مخالف تحریکیں ان کے لیے (کبھی کبھی سیرتِ نبویؐ سے بھی زیادہ) اہم ہوجاتی تھیں۔ کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ سیرتِ نبویؐ تو بہرحال لکھی ہی جارہی ہے' اور دوسرے لوگ اس کی طرف متوجہ ہیں' لیکن علویوں اور شیعہ تحریکوں کی خبریں ضائع ہورہی ہیں یا ان میں کھلی تحریف کی جارہی ہے۔ دوسری تبدیلیاں' جیسے تاریخِ خلفا کا موضوع شیعوں کو اپنی جانب متوجہ نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی وجہ بھی یہ تھی کہ شیعوں کو اپنی اور ان کی تاریخ کے درمیان کوئی ربط نظر نہیں آتا تھا' لہٰذا قدرتی طور پر وہ اسے صرف منفی زاویے ہی سے دیکھتے تھے۔

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں سنیوں اور شیعوں کے یہاں مختلف موضوعات پر تاریخی رسالہ نویسیوں کا رواج تھا۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ اہلِ سنت کے یہاں طبری نے ایک خوبصورت جدت پیدا کی اور اسلاف کے چھوڑے ہوئے چھوٹے بڑے تاریخی رسالوں کو اپنے عظیم مجموعے میں جمع کردیا۔ ایسا کام شیعوں میں نہیں ہوا اور رفتہ رفتہ ان چھوٹے

۱۔ عراقی شیعہ ان خصوصیات کے حامل شیعوں کو کہا جاتا ہے' جو امام علیؑ کو حضرت عثمان پر ترجیح دیتے ہیں' اہلِ بیتؑ کا احترام کرتے ہیں' امامت کے بارے میں نص کا عقیدہ نہیں رکھتے' اہلِ بیتؑ کے فضائل نقل کرتے ہیں' شیخین کو قبول کرتے ہیں' امامی یا زیدی مذہب نہیں ہوتے۔ ان کی نمایاں مثالوں میں متن میں ذکر کیے گئے افراد کے علاوہ مؤرخ مسعودی اور ابوالفرج اصفہانی بھی شامل ہیں۔

چھوٹے رسالوں کے ناپید ہو جانے کی وجہ سے شیعہ تاریخی ورثے کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔ صرف بہت کم نمونے باقی بچ سکے' جیسے تیسری صدی ہجری کے اوائل کی نصر بن مزاحم کی ''وقعۃ صفین'' اور اسی صدی کی ثقفی کی کتاب ''الغارات''۔ اسی بات سے تاریخ میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو ضبطِ تحریر میں لانے کے سلسلے میں اس قسم کے آثار کی انتہائی اہمیت کی نشاندہی ہوتی ہے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلا دور گزرنے کے بعد شیعہ تاریخ کی نگارش کا دائرہ ائمہؑ کی زندگی' اُن کی سیرت اور مسئلۂ امامت سے تعلق رکھنے والے مسائل تک محدود ہو گیا۔ یہ سلسلہ اس زمانے تک جاری رہا جب تک دوبارہ ایک شیعہ حکومت قائم نہیں ہو گئی اور اس شیعہ حکومت کی تاریخ نگاری کا سلسلہ شروع نہ ہوا۔

ابتدائی صدیوں میں سیرتِ نبویؐ پر شیعہ آثار

شیعہ اور سنی نظریات میں اختلاف کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سیرت نگاری کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شیعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کو زیادہ تقدس کی نظر سے دیکھتے ہیں اور آنحضرت کی عصمت کو بنیاد بناتے ہیں۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اگرچہ سنی تاریخ نویسی میں حیاتِ رسولؐ کے بارے میں حیرت کا تاثر تو مکمل طور پر نظر آتا ہے' لیکن آپ کی عصمت پر اور وہ بھی اُس کے تمام پہلوؤں میں ان کے یہاں توجہ نہیں کی جاتی۔ اس کا نمونہ **زلۃ الانبیاء** کے عنوان سے ابوالفضل مشاط (۱) کی کتاب ہے' جو سید مرتضیٰ کی کتاب **تنزیہ الانبیاء** کے مقابلے پر لکھی گئی تھی۔ (۲) ان دو نظریات کے ایک دوسرے کے مقابل ہونے کو ساتویں صدی ہجری کے ایک شیعہ مؤلف نے اپنی کتاب **معتقد الامامیۃ** میں ذکر کیا ہے۔ (۳) یہاں تک کہ تیسری صدی ہجری میں ایک اور سنی عالم نے ایک کتاب **معاصی الانبیاء** کے نام سے لکھی' جسے سمرقند کے مشہور متکلم یعنی ابو منصور ماتریدی نے مسترد کیا۔ (۴)

جہاں تک سیرتِ نبوی کا تعلق ہے' تو یہ کہنا چاہیے کہ مغازی کی تعلیم ائمہؑ کے پروگرام میں شامل تھی۔ اس بات پر اہم ترین گواہی امام زین العابدینؑ کا یہ قول ہے' جس میں آپ نے فرمایا: **کنا نعلم مغازی رسول اللہ کما نعلم السورۃ من القرآن**. (۵) (ہم رسول اللہ کی جنگوں کی اسی طرح تعلیم دیتے ہیں جس طرح سے قرآنی سوروں کی تعلیم

۱۔ کتاب نقض۔ ص ۲۳۳

۲۔ ایضاً۔ ص ۱۱

۳۔ معتقد الامامیہ۔ ص ۲۷ (طبع دانش پژوہ تہران۔ ۱۳۳۹ ھ ش)

۴۔ دیکھئے: ادبیاتِ فارسی۔ استوری۔ ص ۷۴۵

۵۔ الجامع الاخلاق الراوی۔ ج ۲۔ ص ۲۸۸' البدایہ والنہایہ۔ ج ۳۔ ص ۲۴۲' سبل الهدیٰ والرشاد۔ ج ۴۔ ص ۲۰

دیتے ہیں)۔ امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کی روایات میں بھی سیرت سے متعلق بکثرت روایات پائی جاتی ہیں اور ان میں سے بہت سی مکتوب ماخذ میں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ابن اسحاق نے اپنی سیرت کی کتاب میں امام محمد باقرؑ کی چند روایات نقل کی ہیں۔ ان میں سے بعض نمونے طبقات ابن سعد میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ شیعہ کتب میں سے 'علی بن ابراہیم قمی کی تفسیر کا چوتھائی حصہ تاریخ وسیرت انبیاؑ سے متعلق روایات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب جسے کئی کتابوں سے مدوین کیا گیا ہے' اس میں ایسے مکتوب آثار سے استفادہ کیا گیا ہے جو تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں دسترس میں تھے۔ مثال کے طور پر تفسیر علی بن ابراہیم قمی میں ابان بن عثمان کی کتاب المبعث و المغازی سے استفادہ کیا گیا ہے۔ تفسیر قمی ان قدیم کتابوں میں سے ایک ہے' جس کا سیرت کا حصہ تقریباً امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کی روایات پر مبنی ہے۔ اس کی ایک وجہ اس میں "تفسیر ابی الجارود" کا داخل ہونا ہے' جس کی تمام روایات امام محمد باقرؑ سے ہیں' اور آیات کی شانِ نزول کے تناسب سے اس میں سیرت سے متعلق باتیں بیان ہوئی ہیں۔ ابی الجارود کی روایات دوسرے تمام حصوں سے مختلف ہیں۔ اس کتاب کی تمام روایات کو علامہ مجلسی نے بحار الانوار کی "تاریخ نبینا" کی جلدوں میں نقل کر دیا ہے۔

اسی کا ایک اور نمونہ عبداللہ بن میمون القداح کی مبعث النبی و اخبارہ ہے' جو خود امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کی روایات کے راوی رہے ہیں۔(۱) بہر طور یہ مثالیں ائمہ علیہم السلام اور اُن کے شیعوں کی سیرت کی روایات کی جانب توجہ کی دلیل ہیں۔ البتہ عمومی طور پر تاریخ اسلام بھی شیعوں کی دلچسپی کا محور رہی ہے۔ اصبغ بن نباتہ قدیم ترین شیعہ مؤلف ہیں' جنہوں نے امام حسینؑ کے مقتل پر ایک کتاب لکھی ہے۔(۲) احمد بن عبید اللہ ثقفی اس کی ایک اور مثال ہیں۔ ان کی بعض کتابوں کے عنوان یہ ہیں: **کتاب المبیضۃ فی اخبار مقاتل آل ابی طالب' کتاب فی تفضیل بنی ھاشم وذم بنی امیۃ و اتباعھم**.(۳) نجاشی کی روایت کے مطابق محمد بن زکریا بن دینار کی بعض کتابیں یہ ہیں: **الجمل الکبیر' الجمل المختصر' صفین الکبیر' مقتل الحسینؑ**(۴) **کتاب النہر(وان)' مقتل امیر المؤمنینؑ' اخبار زید' اخبار فاطمہ**.(۵) ایک اور مثال ابراہیم بن محمد ثقفی ہیں' وہ پہلے زیدی مذہب سے تھے' بعد

۱۔ رجال النجاشی۔ ص ۲۱۳

۲۔ تنقیح المقال۔ ج ۱۔ ص ۱۵۰

۳۔ الفہرست ابن ندیم۔ ص ۱۶۶

۴۔ یہ کتاب محمد بن سلیمان کوفی کی روایت کے مطابق زیدی مذہب کے جامع میں سے تھی۔ دیکھئے: مقدمہ مناقب الامام امیر المومنینؑ۔ ج ۱۔ ص ۱۲' مناقب کی اسی کتاب میں پندرہ مقامات پر (دیکھئے: اسی کتاب کی جلد سوم صفحہ ۱۷۷) کوفی نے امیر المومنینؑ کے فضائل کو جن میں سے بہت سے تاریخی ہیں محمد بن زکریا بن دینار سے نقل کیا ہے۔

۵۔ رجال النجاشی۔ ص ۳۴۷

میں امامی ہو گئے انہوں نے تاریخی کتابیں لکھی ہیں جن میں سے بعض کے عنوان یہ ہیں: **کتاب المبتدأ و المغازی والرّدّة' اخبار عمر' اخبار عثمان' کتاب الدار' الغارات** (یہ کتاب آج بھی موجود ہے) **اخبار زید' اخبار محمد** (نفس زکیہ اور ان کے بھائی) **و ابراهیم**' (۱) مدینہ میں جابر بن یزید جعفی کے آثار بھی انہی حوادث کے حوالے سے ہیں: **کتاب الجمل' کتاب صفین' کتاب النهروان' کتاب مقتل امیر المومنینؑ' کتاب مقتل الحسینؑ.** (۲)

علی بن حسن بن علی بن فضال کے بعض تاریخی آثار یہ ہیں: کتاب الدلائل' کتاب الانبیاء' کتاب البشارات اور کتاب الکوفہ۔ (۳)

عبدالعزیز جلودی ازدی جو بصرہ کے مشہور شیعہ علما میں شمار ہوتے تھے ان کے بعض تاریخی آثار کے عناوین ہیں: کتاب الجمل' کتاب صفین (۴)' کتاب الحکمین' کتاب الغارات' کتاب الخوارج' کتاب ذکر علی فی حروب النبیؐ' کتاب مآل الشیعہ بعد علیؑ' اخبار التوابین وعین الوردة' اخبار المختار' اخبار علی بن الحسینؑ' اخبار ابی جعفر محمد بن علیؑ' اخبار عمر بن عبدالعزیز' اخبار من عشق من الشعراء' اخبار قریش والاصنام' کتاب طبقات العرب والشعراء' کتاب خطب النبیؐ' کتاب خطب عثمان' کتاب رسائل عمر' کتاب رایات الازد' کتاب مناظرات علی بن موسیٰ الرضاؑ۔ (۵)

قم کے رہنے والے احمد بن اسماعیل بن عبداللہ بجلی کے بھی تاریخ کے بارے میں آثار موجود ہیں۔ ان کا اہم ترین اثر کتاب العباسی ہے' جس کے بارے میں نجاشی نے لکھا ہے کہ: **و هو کتاب عظیم نحو من عشرة آلاف ورقة من اخبار الخلفاء و الدولة العباسیة. رأیت منه اخبار الامین.** (یہ دس ہزار صفحوں پر مشتمل عظیم کتاب ہے جس میں خلفا اور عباسی حکومت کی خبریں ہیں۔ میں نے اس میں امین کی خبریں دیکھی ہیں)۔ یہ کتاب محمد بن حسن قمی کے پاس تھی' اور اس میں سے اس نے تاریخ قم میں چار مقامات پر نقل بھی کیا ہے۔ (۶) علی بن احمد جوانی نے بھی ایک کتاب

۱۔ رجال النجاشی۔ ص ۱۸' مزید دیکھئے: لسان المیزان۔ ج ۱۔ ص ۱۰۲' ۱۰۳' معجم الادباء۔ ص ۲۳۳

۲۔ رجال النجاشی۔ ص ۱۲۹

۳۔ رجال النجاشی۔ ص ۲۵۸۔ ش ۶۷۶

۴۔ ابن طاؤس نے مہج الدعوات میں اپنی کتاب "صفین" سے امام علیؑ کی دو دعائیں نقل کی ہیں' جو آپ نے جنگ صفین سے پہلے پڑھیں' دیکھئے: کتاب خانۂ ابن طاؤس۔ ص ۵۲۵

۵۔ رجال النجاشی۔ ص ۲۴۱' ۲۴۳

۶۔ رجال النجاشی۔ ص ۹۷' ش ۲۴۲' دیکھئے: کتاب شناسی۔ قم سے مربوط آثار۔ ص ۱۹' جو چیزیں نقل ہوئی ہیں وہ تاریخ قم کے صفحات ۱۳۵' ۲۰۰' ۲۳۶ اور ۲۳۷ پر ہیں۔

صاحب فخ اور ایک کتاب یحییٰ بن عبداللہ بن حسن کے بارے میں لکھی ہے۔(۱) قم کے ممتاز محدث احمد بن محمد بن خالد برقی نے سیرت پر ایک کتاب "کتاب المغازی" کے نام سے لکھی تھی۔ انہی کے تاریخ پر کچھ اور آثار بھی ہیں: کتاب الشعر و الشعراء، کتاب البلدان والمساحۃ، کتاب التاریخ، کتاب الانساب۔(۲)

ائمہ علیہم السلام کے زمانے کے ممتاز ترین مورخین میں سے ایک ابان بن عثمان احمر بجلی ہیں۔ انبیاؑ کے حالات اور سیرت رسولؐ پر ان کی ایک گرانقدر کتاب تھی، جس کا بدقسمتی سے کچھ ہی حصہ اب باقی بچا ہے۔ شیخ طوسی نے ان کی کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ: وماعرف من مصنفاته الا كتابه الذى يجمع المبتدأ والمبعث و المغازى والوفاة و السقيفة و الردة. (ان کی کتابوں میں سے صرف ایک کتاب معروف ہوئی ہے جس میں انہوں نے مبتدأ، مبعث، مغازی، وفات، سقیفہ اور ردہ کو جمع کیا ہے) پھر لکھتے ہیں: وهناك نسخة اخرىٰ انقص منها رواه القميون. (یعنی ایک اور نسخہ ہے جو دوسرے سے زیادہ ناقص ہے اور اسے قمیون نے روایت کیا ہے)۔(۳) یہ کتاب علی بن ابراہیم قمی کے پاس موجود تھی، اور انہوں نے اپنی تفسیر میں اس سے کئی بار نقل کیا ہے۔ نجاشی بھی اس کتاب سے واقف تھے۔ انہوں نے لکھا ہے: له كتاب حسن كبير يجمع المبتدا والمغازى والوفاة و الردة. (۴) یہ کتاب بہت سے علما کے پاس موجود تھی، لیکن شیخ طبرسی نے اعلام الوریٰ میں اس میں سے تفصیلی ترین نقل کی ہے۔ ہم نے ان کی کتاب کے مل جانے والے حصوں کو "کتاب المبعث والمغازی" کے عنوان سے شائع کیا ہے اور اس کے مقدمے میں **تفصیل** کے ساتھ اُن کے اور اُن کی کتاب کے بارے میں گفتگو کی ہے۔

یہاں ہم اُن آثار کی جانب اشارہ کریں گے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں لکھے گئے ہیں اور ان میں سے زیادہ تر موضوعاتی پہلو کے حامل ہیں:

کتاب صفات النبیؐ از وہب بن وھب۔ (نجاشی۔ ص ۴۳۰)

کتاب وفود العرب الی النبیؐ از منذر بن محمد بن منذر۔ (ان کے بعض دوسرے آثار کتاب الجمل، کتاب صفین، کتاب النہروان اور کتاب الغارات ہیں)۔ (نجاشی۔ ص ۴۱۸)

مسالۃ فی ایمان آباء النبیؐ از ابویعلی محمد بن حسن بن حمزۃ جعفری۔ (نجاشی۔ ص ۴۰۴)

۱۔ رجال النجاشی۔ ص ۴۶۳

۲۔ رجال النجاشی۔ ص ۷۶، ش ۱۸۲

۳۔ الفہرست۔ ص ۱۸، ۱۹

۴۔ رجال النجاشی۔ ص ۱۳

کتاب مسائلۃ فی معرفۃ النبیؐ از شیخ مفید۔ (نجاشی۔ ص۴۰۲)

کتاب زہد النبیؐ کتاب اوصاف النبیؐ کتاب فی معرفۃ فضل النبیؐ وامیر المومنین والحسن والحسین علیہم السلام از شیخ صدوق۔ (نجاشی۔ ص۳۸۹ اور ۳۹۱) نیز ایک کتاب بنام کتاب فی عبد المطلب وعبداللہ وابی طالب از شیخ صدوق۔ (نجاشی۔ ص۳۹۰)

کتاب البیان عن خیرۃ الرحمٰن فی ایمان ابی طالب وآباء النبیؐ از علی بن بلال المہلبی الازدی۔ (نجاشی۔ ص۲۶۵)

کتاب مبعث النبیؐ واخبارہ از عبداللہ بن میمون القداح۔ (نجاشی۔ ص۲۱۳)

کتاب وفاۃ النبیؐ از سلمۃ بن الخطاب براوستانی ازدورقانی۔ (نجاشی۔ ص۱۸۷)

کتاب الرد علی من زعم ان النبی کان علی دین قومہ قبل النبوۃ از جعفر بن احمد بن ایوب سمرقندی۔ (نجاشی۔ ص۱۲۱)

کتاب الرد علی من زعم النبی کان علی دین قومہ از حسین بن اشکیب خراسانی۔ (نجاشی۔ ص۴۴)

کتاب اخبار النبیؐ از ابوعلی احمد بن محمد بن عمار کوفی۔ ان کی ایک اور کتاب ایمان ابوطالب کے عنوان سے بھی تھی۔ (نجاشی۔ ص۹۵)

کتاب ذکر النبیؐ والصخرۃ والراہب وطرق ذلک از احمد بن محمد بن سعید سبیعی ہمدانی۔ (نجاشی۔ ص۹۴)

کتاب فضل النبیؐ از احمد بن محمد بن عیسیٰ اشعری۔ (نجاشی ص۔۸۱)

کتاب سیرۃ النبیؐ والائمۃ فی المشرکین از حسین بن علی بن سفیان بزدفری۔ (نجاشی۔ ص۶۸)

کتاب الوفود علی النبیؐ از حسین بن محمد بن علی الازدی۔ (نجاشی۔ ص۶۵)

کتاب نسب النبیؐ کتاب کتب النبیؐ کتاب اخبار الوفود علی النبیؐ۔ یہ تین عنوان عبدالعزیز جلودی ازدی کی کتابوں کے ہیں۔ (نجاشی۔ ص۲۴۱۔۲۴۴)

کتاب اسماء آلات رسول اللہؐ واسماء سلاحہ وکتاب وفاۃ النبیؐ از علی بن حسن بن علی بن فضال۔ (نجاشی۔ ص۲۵۸)

کتاب المغازی از احمد بن محمد بن خالد برقی۔ (نجاشی۔ ص۷۶)

المنبی عن زہد النبیؐ از ابومحمد جعفر بن احمد بن علی قمی ابن الرازی۔ ابن طاؤس نے اپنی چند کتابوں میں اس کتاب سے نقل کیا ہے۔(۱)

کتاب اسماء رسول اللہؐ از حسن بن خرزاد۔ (نجاشی۔ ص۴۴)

۱۔ کتاب خانۂ ابن طاؤس۔ ص۲۴۹، ۲۵۰

اس کے بعد بھی سیرت نبی کا موضوع شیعہ علمی حلقوں کی توجہ کا مرکز رہا۔ لیکن یہ توجہ صرف اس کے بارے میں معلومات، اور وہ بھی زیادہ تر شیعوں کے پیش نظر رہنے والے عقیدتی مسائل تک محدود تھی۔ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں: میں سال ۶۰۸ ہجری میں مذہب شیعہ کے فقیہ محمد بن معد علوی کے پاس گیا، جن کا گھر بغداد کے درب الدواب میں واقع تھا۔ ایک شخص ان کے سامنے واقدی کی مغازی پڑھ رہا تھا، پڑھتے ہوئے وہ اس روایت تک پہنچا جہاں واقدی نے فلاں وفلاں کہہ کر اُن افراد کی طرف اشارہ کیا تھا جو جنگ احد میں میدان سے فرار ہو رہے تھے۔ محمد بن معد نے مجھ سے کہا: اس سے مراد ابوبکر اور عمر ہیں۔ میں نے انکار کیا، تو انہوں نے کہا: صحابہ کے درمیان کسی کو بھی ایسا مقام حاصل نہیں، کہ اس کے نام کی بجائے فلاں کا لفظ استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ میں نے پھر بھی ان کی بات قبول کرنے سے انکار کیا، لیکن مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھ سے بہت سخت ناراض ہوئے ہیں۔ (۱)

قصص الانبیاؑ پر کتابیں

مسلمانوں کے تاریخی آثار میں تاریخ انبیاؑ پر "کتاب المبتدا" کے عنوان سے کام کیا گیا ہے۔ اس اصطلاح میں ابتدا سے آخری نبی سے پہلے تک کی پوری انسانی تاریخ شامل ہوتی ہے۔ اس بارے میں ابان بن عثمان احمر کی کتاب المبتدا والمبعث والمغازی کا ایک حصہ جس کی بعض باتوں کو ہم نے خود ان کی کتاب "کتاب المبعث والمغازی" کے مقدمے میں نقل کیا ہے، یہ بتاتا ہے کہ شیعوں کے درمیان اس قسم کی روایات تحریر کرنے کی رسم موجود تھی۔ البتہ اسی کتاب میں ایسی روایات بھی شامل ہیں جن میں سے بعض اسرائیلی منابع سے ہیں، اور ظاہر ہے کہ نا قابلِ اعتبار ہیں۔

شیعہ منابع (sources) میں تاریخ انبیاؑ کا حصہ بکھرے ہوئے انداز میں بہت وسیع پیمانے پر موجود ہے۔ علامہ مجلسی نے ان روایات کے مجموعے کو بحار الانوار کی گیارہویں تا چودہویں جلد میں شامل کیا ہے۔ ان کا زیادہ تر حصہ شیخ صدوق کی کتب، تفسیر علی بن ابراہیم قمی، تفسیر عیاشی، تفسیر مجمع البیان اور اسی قسم کی دوسری کتابوں میں آیا ہے، اور جیسا کہ کہا گیا ہے، اس قسم کی کتابوں میں اہلِ سنت کی روایات بہت زیادہ ذکر ہوئی ہیں، جو کعب الاحبار، عبداللہ بن سلام اور خاص طور پر وہب بن منبہ سے نقل ہوئی ہیں۔ ابن طاؤس نے قصص الانبیاؑ نامی ایک کتاب سے، جسے انہوں نے محمد بن خالد بن عبدالرحمن برقی کی تالیف قرار دیا ہے، فرج المہموم میں کچھ باتیں نقل کی ہیں۔ (۲) لیکن گویا کسی اور نے اس کتاب کا ذکر نہیں کیا ہے۔ جو آثار مستقل طور پر موجود ہیں، ان میں قطب راوندی کی کتاب قصص الانبیاؑ کی جانب اشارہ کیا جا سکتا ہے،

۱۔ شرح نہج البلاغہ۔ ج ۱۵۔ ص ۲۳، ۲۴

۲۔ کتاب خانۂ ابن طاؤس۔ ص ۴۸۶

جو استاد غلام رضا عرفانیان کی تحقیق کے ساتھ بنیاد پژوہشہای اسلامی کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں تاریخ انبیاؑ کے علاوہ ایک حصہ (باب ۱۹ صفحہ ۲۸۰ کے بعد سے) آنحضرت کے معجزات اور ایک حصہ (باب ۲۰) رسول اللہؐ کے احوال سے متعلق ہے اور اس پر اس اعتبار سے بھی توجہ کی ضرورت ہے۔ راوندی نے بھی اپنی تحریر کے کسی ماخذ کا ذکر نہیں کیا ہے' اور اکثر ایسی اسناد کا ذکر کیا ہے جو بہت سے مقامات پر واضح نہیں کہ کس کتاب سے لی گئی ہیں۔ امکان ہے کہ اس کے بیسویں باب کا زیادہ تر حصہ تفسیر علی بن ابراہیم قمی سے لیا گیا ہے۔

راوندی کے بعد سید نعمت اللہ جزائری (م: ۱۱۱۲ ہجری) نے کتاب "النور المبین فی قصص الانبیاؑ" میں خاص طور پر قصص انبیاؑ کا ذکر کیا ہے۔

چوتھی سے چھٹی صدی ہجری کے دوران دلائل کی کتابیں

شیعہ تاریخی کتابوں میں سے بعض کتابیں ایسی ہیں جو ائمہ علیہم السلام کے معجزات کو ضبط تحریر میں لانے کے لیے لکھی گئی ہیں' تا کہ اس طرح ان کی امامت کو ثابت کیا جائے۔ قدرتی طور پر ان میں ائمہؑ کی زندگی کا کچھ حصہ بھی درج کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے قدیم ترین کتاب' تیسری صدی ہجری کے اواخر اور چوتھی صدی کے اوائل کے شیعہ عالم محمد بن مسعود عیاشی کی ''دلائل الائمہؑ'' ہے۔ یہ عالم سمرقند میں رہتے تھے اور ان کی کتابوں کا تذکرہ ابن ندیم نے کیا ہے' جن میں یہ کتاب بھی شامل ہے۔(۱) آج یہ کتاب موجود نہیں ہے۔ ابوالقاسم کوفی' جن پر غلو کا الزام ہے' ان کی کتاب ''الدلائل والمعجزات'' بھی اسی موضوع پر ہے۔ انہی نے ایک اور کتاب ''تثبیت نبوۃ الانبیاؑ'' بھی لکھی ہے۔(۲) ایک اور کتاب ''دلائل النبیؐ'' کے نام سے احمد بن یحییٰ بن حکیم اودی صوفی کوفی نے لکھی ہے۔(۳) ''الاحتجاج لنبوۃ النبیؐ'' نامی ایک کتاب اسماعیل بن علی بن اسحاق بن ابی سہل بن نوبخت نے لکھی ہے۔(۴) ''کتاب الدلائل'' کے نام سے دو کتابیں ہیں' جن میں سے ایک ابوالعباس عبداللہ بن جعفر حمیری اور دوسری ابوعبداللہ محمد بن ابراہیم بن جعفر نعمانی کی ہے' جو ابن طاؤس کی بعض کتابوں کے مصادر میں شامل ہے۔(۵) چھٹی صدی ہجری کے شیعہ عالم ابومحمد عبدالباقی بن محمد بصری نے بھی ''دلائل'' نامی ایک کتاب

۱۔ الفہرست ابن ندیم۔ ص ۲۴۵

۲۔ رجال النجاشی۔ ص ۲۶۶

۳۔ ایضاً۔ ص ۸۱

۴۔ ایضاً۔ ص ۳۲

۵۔ کتاب خانہ ابن طاؤس۔ ص ۲۲۷' ۲۲۸' اربلی نے بھی بہت سے مقامات پر دلائل حمیری سے نقل کیا ہے' دیکھئے: علی ابن عیسیٰ اربلی و کشف الغمہ۔ ص ۱۰۹

لکھی ہے اسی طرح "الحجج و البراهین فی امامة امیر المومنین و اولاده الاحد عشر ائمة الدین صلوات اللّٰه و سلامه علیهم اجمعین" نامی کتاب بھی انہی کی تحریر کی ہوئی ہے۔(۱) شیخ طوسی کے ہم عصر محمد بن جریر طبری کی ایک کتاب "دلائل الامامۃ" ہے جو طبع ہو چکی ہے۔ ایک اور مثال قطب راوندی (م: ۵۷۳ ہجری) کی "الخرائج والجرائح" ہے، جس میں تفصیل کے ساتھ پیغمبرؐ اور ائمہؑ کے معجزات درج کیے گئے ہیں۔ بدقسمتی سے راوندی نے اپنے منابع کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس کتاب کی تلخیص ہو چکی ہے جو "کفایۃ المومنین" کے نام سے ترجمہ بھی ہوئی ہے۔ عربی متن تین جلدوں میں موسسۃ الامام المہدیؑ نے شائع کیا ہے۔

اس موضوع پر ایک اور قدیم کتاب ابو جعفر محمد بن علی المعروف بہ ابن حمزہ (وفات بعد از ۵۵۲ ہجری) کی "الثاقب فی المناقب" ہے۔ اس کتاب میں بھی انبیاؑ اور رسول خداؐ نیز حضرت فاطمہؑ اور تمام ائمہؑ کے معجزات درج ہیں۔ اس کتاب کا ایک مصدر حاکم نیشاپوری کی کتاب "مفاخر الرضا" ہے۔

اہل سنت کے یہاں بھی ابو نعیم اصفہانی اور بیہقی کی "دلائل النبوۃ" اسی موضوع پر تالیف کی گئی ہے۔ قاضی عبدالجبار ہمدانی نے بھی اپنی کتاب "تثبیت دلائل النبوۃ" میں یہی روش اختیار کی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ انہوں نے بحث کو کلامی انداز میں پیش کیا ہے۔

کلامی، تاریخی کتابیں

کلام کی بعض شیعہ تالیفات میں، شیعوں کے یہاں امامت سے متعلق ابحاث کی اہمیت کی بنا پر لازماً تاریخ کی بحث بھی چھڑ گئی ہے۔ امامت کی مباحث زیادہ تر دو حصوں پر مشتمل ہوتی ہیں: ایک حصہ عقلی مباحث پر مشتمل ہوتا ہے، جس میں وجود امام کی ضرورت اور اس سے ملحقہ دوسری باتیں ہوتی ہیں، جبکہ دوسرے حصے میں تاریخی مباحث ہیں، جن میں نص کی موجودگی کا ثبوت، دوسروں کی جانب سے نص سے بے اعتنائی کی وجہ، نیز بعض صحابہ پر اعتراض وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے۔ اس قسم کی کتابوں کے تاریخی حصے میں خلافت اور خلفا پر ایک طرح سے تنقید کی جاتی ہے، یہ وہ چیز ہے جس کا ذکر مطاعن کے عنوان سے کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ ان میں سے بعض کتابیں کلامی تاریخی ہیں اور بعض تاریخی کلامی، جو عام طور پر حدیث کی شکل میں پیش کی جاتی ہیں۔

ان میں سے باقی رہ جانے والی کتابوں کا ایک نمونہ ابو القاسم کوفی، جن پر غلو کا الزام لگایا جاتا ہے کی "الاستغاثۃ فی بدع الثلاثۃ" ہے، جو شائع بھی ہو چکی ہے۔ ایک اور کتاب "کتاب سلیم بن قیس" ہے۔ اس میں موجود بعض اخبار کے

۱۔ الفہرست منتجب الدین۔ ص ۶۷

بارے میں پائے جانے والے شبہات سے قطع نظر، یہ امامت کے باب میں حدیث کے قالب میں شیعہ عقائد کے تاریخی دفاع کے حوالے سے ایک قدیم کتاب ہے۔ مسعودی کی ''اثبات الوصیۃ'' کو بھی حدیث، تاریخ اور کلام کی کتابوں کی صف میں رکھا جاسکتا ہے۔ یہ مسعودی یقیناً وہ مسعودی نہیں ہیں جنہوں نے مروج الذہب لکھی ہے۔ اس حوالے سے قدیم ترین کتابوں میں سذ آبادی (سذ آباد رے کے دیہاتوں میں سے ایک دیہات ہے) کی "المقنع فی الامامۃ" بھی شامل ہے، جسے قم میں انتشارات اسلامی نے شائع کیا ہے اور یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے۔ اس قسم کے آثار میں سے مشہور ترین کتاب سید مرتضیٰ کی ''الشافی'' ہے جو شائع ہو چکی ہے۔ شیخ طوسی نے ''تلخیص الشافی'' کے نام سے اس کو دوبارہ تحریر کیا ہے اور یہ بھی طبع ہو چکی ہے۔ شیخ مفید کی متعدد کتابیں بھی بہت سے تاریخی نکات پر مشتمل ہیں، جن میں حدیث غدیر، ولایت کے معنی اور دوسرے مفاہیم پائے جاتے ہیں۔ شیخ مفید کی کتاب ''الجمل'' کا ذکر بھی زیادہ تر ایک تاریخی کلامی کتاب کے عنوان سے کیا جانا چاہیے نہ کہ اس کے برعکس کلامی تاریخی۔ یہ کتاب شیعوں کی خالص تاریخی تالیفات کا تسلسل ہے جو تیسری صدی ہجری میں معمول تھیں، نیز انفرادی تاریخ نویسی کا بھی ایک تسلسل تھا جو عراق کے شیعہ اپنے پیش نظر تاریخی مسائل کو ثبت کرنے کے لیے تحریر کرتے تھے۔ اس تالیف کے تاریخی ہونے میں کوئی شک و تردید نہیں ہے، لیکن یہ کہ شیخ مفید نے علمی تاریخ کو عثمانیہ اور معتزلہ کے مقابلے میں شیعہ نظریات کے اثبات کے لیے ایک وسیلہ قرار دیا، تاریخ کو علم کلام کے ساتھ ملانا شیخ مفید کی جدت طرازیوں میں سے ایک ہے۔ اس کے مقابل علامہ حلی کی ''کشف الیقین'' ہے، جو زیادہ تر کلامی ہے اور بعض تاریخی معلومات بھی اس میں بیان کی گئی ہیں۔

وہ کتابیں جو شیعہ فرقوں کی تشکیل کی سرگزشت کے بارے میں لکھی گئی ہیں، وہ بھی ایک اعتبار سے کلامی تاریخی مباحث پر مشتمل ہیں۔ دو اہم کتب جو نوے فیصد سے زیادہ ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی ہیں، وہ نوبختی کی ''فرق الشیعہ'' اور سعد بن عبداللہ اشعری کی ''المقالات والفرق'' ہیں۔ یہ دو کتابیں شیعہ تاریخ کے بارے میں گرانقدر معلومات پر مشتمل ہیں۔ طبرسی کی کتاب ''الاحتجاج'' کا شمار بھی اُن کتابوں میں ہوتا ہے جن میں اگرچہ مناظرے جمع کیے گئے ہیں، لیکن ایران میں ائمہ کے بارے میں معلومات بھی اس میں موجود ہیں۔ ''الطرائف فی معرفۃ المذاہب'' بھی مخالف مذاہب پر تنقید کرتے ہوئے تاریخ اور حدیث کی معلومات پر مشتمل کتاب ہے۔

حدیثی، تاریخی کتابیں

ہم جانتے ہیں کہ حدیث اور تاریخ کا قریبی تعلق ہے۔ اس حوالے سے کبھی تاریخ پر زور رہا اور کبھی حدیث پر۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری کی حدیث سے متعلق شیعہ تالیفات میں اہل سنت کی طرح بہت زیادہ تاریخی مواد نظر آتا ہے۔ کافی میں

جو حصہ امامت یا حجت کی بحث کے بارے میں مخصوص کیا گیا ہے اس میں ائمہؑ کی زندگی کی کچھ تاریخی باتیں بھی موجود ہیں۔ بدقسمتی سے "کافی" جیسی کوئی اور قدیم کتاب اس بارے میں نہیں ہے۔ شاید اس حوالے سے "بصائر الدرجات" کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے جس میں کم وبیش تاریخی باتیں موجود ہیں۔ امام رضاؑ کی زندگی کی تاریخ کے بارے میں شیخ صدوق کی لازوال کتاب "عیون اخبار الرضاؑ" ممتاز ترین تالیف ہے۔ اس کتاب میں اس دور میں امامؑ اور شیعوں کی زندگی کا مکمل عکس نظر آتا ہے۔ شیخ صدوق کی دوسری تمام کتابیں بھی کسی نہ کسی طرح سے تاریخی روایات پر مشتمل ہیں۔ ان میں کتاب "علل الشرائع" خاص امتیاز کی حامل ہے۔ "امالی" میں بھی اس قسم کی روایات مل سکتی ہیں۔ کیونکہ شیخ صدوق ضخیم کتابوں کی ابتدا اور شیعوں کی مختصر تالیفات (رسالوں) کے ایک حصے کے ختم ہونے کے دور میں زندگی گزار رہے تھے اور انہوں نے ان میں سے بہت سوں سے اپنی کتابوں میں استفادہ بھی کیا ہے اس لیے ان کی کتابوں کو اس حوالے سے غنیمت سمجھنا چاہیے۔

تاریخ غیبت کے موضوع پر تین گرانقدر کتابیں باقی رہ گئی ہیں جن میں سے ہر ایک تیسری صدی ہجری میں تاریخ شیعہ کے ایک اہم حصے کو بیان کرتی ہے۔ شیخ صدوق کی "کمال الدین" شیخ طوسی کی "الغیبۃ" اور نعمانی کی "کتاب الغیبۃ" اس موضوع پر اہم ترین کتابیں ہیں۔ اس دور کی شیعہ تاریخ انہی چند کتابوں پر مبنی ہے۔ ان کے مشابہ بہت سی اور کتابیں بھی تھیں جو باقی نہیں رہیں۔ اس قسم کی دو کتابیں تیسری صدی ہجری کے عالم محمد بن بحر رھنی سے تعلق رکھتی تھیں جن کا کچھ حصہ کتاب "کمال الدین" میں نقل ہوا ہے۔

حدیث کی کتابوں میں مناقب پر مشتمل کتب کا ذکر بھی کرنا چاہیے۔ اس قسم کی کتب بھی ایک اعتبار سے تاریخ نویسی میں شامل ہیں۔ اس حوالے سے قدیم ترین کتاب تیسری صدی ہجری کے محمد بن سلیمان کوفی قاضی کی "مناقب الامام امیر المومنینؑ" ہے۔ (۱) یہ کتاب ایسی تاریخی معلومات سے بھری پڑی ہے جن سے سیرت رسول اللہؐ اور امیر المومنینؑ کی زندگی کے بارے میں استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ باوجود یہ کہ اس کتاب کا مؤلف زیدی شیعہ اور یمن کے زیدی امام الھادی الی الحق کے قاضیوں میں سے تھا پھر بھی اس کتاب میں بکثرت امام محمد باقر علیہ السلام کی روایات موجود ہیں۔

مذکورہ بالا کتاب کی مانند اسماعیلی شیعوں کے یہاں قاضی نعمان بن محمد تمیمی مغربی (م: ۳۶۳ ہجری) جو فاطمی حکومت کے دور میں اسماعیلی مذہب کے ممتاز ترین عالم اور متعدد کتابوں کے مؤلف تھے کی گرانقدر کتاب "شرح الاخبار" (۲) ہے۔ یہ کتاب فضائل کے بارے میں ہے اور اس کا تاریخی پہلو بھی بہت مضبوط ہے۔ مثال کے طور پر اس کا پہلا اور دوسرا

۱۔ اس کے بارے میں دیکھئے: تاریخ التراث العربی۔ تدوین التاریخی۔ ص ۲۰۸، ۲۰۹، کتاب المناقب۔ محقق بزرگوار علامہ محمد باقر محمودی کے توسط سے تین جلدوں میں مجمع احیاء الثقافۃ الاسلامیہ کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

۲۔ یہ کتاب سید محمد حسینی جلالی کی کاوشوں سے انتشارات اسلامی کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

حصہ، جو پہلی جلد ہی میں شائع ہوا ہے، اس میں حضرت علیؑ کی رسول اللہؐ کے ساتھ ہمراہی اور جنگ بدر، احد اور خندق وغیرہ میں آپ کی شرکت کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کا چوتھا حصہ جنگِ جمل اور جنگِ صفین کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ پانچویں حصے میں جنگِ صفین سے متعلق مزید خبریں ہیں۔ چھٹا حصہ حجر بن عدی کے مقتل تک۔ ساتواں، آٹھواں، نواں اور دسواں حصہ امیر المومنینؑ کے فضائل کے بارے میں ہے۔ گیارھواں حصہ اہلِ بیتؑ کے مزید فضائل، خصوصاً جناب فاطمہ زہرا کے فضائل کے بارے میں ہے۔ بارھواں حصہ امام حسنؑ کے فضائل اور ان کی تاریخِ حیات اور امام حسینؑ کے مقتل پر مشتمل ہے۔ تیرھواں حصہ مصائبِ اہل بیتؑ پر مشتمل ہے، جس کے ضمن میں اہلِ بیتؑ کے بہت سے بزرگوں جیسے جعفر بن ابی طالبؑ اور امام سجادؑ وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ چودھویں حصے میں معتضد عباسی اور مہدی فاطمی کے ظہور تک کے حالات اور امام جعفر صادقؑ اور شیعہ فرقوں کی مختصر تاریخ کا تذکرہ ہے۔ پندرھواں حصہ خصائصِ مہدیؑ اور سولھواں حصہ آخری حصے کے عنوان سے فضائلِ شیعہ کے بارے میں ہے۔ اس کتاب کو تاریخِ اہلِ بیتؑ کی نگارش کے لحاظ سے، اپنے قدیمی ہونے کے پیشِ نظر اور معمولی اسماعیلی رجحان سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، ایک معتبر، جامع اور اپنے زمانے کی حد تک ایک بے مثال تالیف شمار کرنا چاہیے۔

اگر ہم اس بات کو پیشِ نظر رکھیں کہ قاضی نعمان نے اپنی اس کتاب میں غدیر کی روایات کو طبری کی کتاب ''الولایۃ'' سے لیا ہے، تو ہمیں اس لحاظ سے اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ بہتر طور پر ہو جائے گا کہ اس میں بہت سی ایسی ناگفتہ باتیں شامل ہیں جو مکتوب آثار کی صورت میں ان کی دسترس میں تھیں، اگرچہ بدقسمتی سے وہ اپنی اکثر روایات کا ماخذ بیان نہیں کرتے ہیں۔ ابن بطریق کی ''العمدۃ'' کو بھی اسی قبیل کے آثار میں شمار کرنا چاہیے۔

رجالی تاریخی کتابیں

علمِ رجال تاریخ کا ایک اہم شعبہ ہے۔ شیعوں میں بھی اس شعبے پر توجہ دی گئی ہے اور کئی بار اصحابِ ائمہ، مؤلفین اور شیعہ اخبار کے راویوں کی فہرستیں لکھی گئی ہیں، بدقسمتی سے ان میں سے زیادہ تر فہرستیں ضائع ہو گئی ہیں۔ اس حوالے سے آج بھی باقی رہ جانے والی اہم ترین تالیف جس میں شیعہ تاریخی نظریات کا اہم حصہ موجود ہے ''اختیار معرفۃ الرجال'' یا ''رجال کشی'' ہے، جسے ہر اعتبار سے اہم سمجھنا چاہیے۔ ''رجال النجاشی'' بھی رجالی ہونے اور کتاب شناسی کے حوالے سے اہم معلومات کے علاوہ شیعہ فکر کی تاریخ ہے۔ بعد کے زمانوں میں اس قسم کی تالیفات کم ہی تدوین ہوئی ہیں، لیکن جو بھی تدوین ہوئی ہیں، اُن پر تاریخی حوالے سے توجہ دینی چاہیے۔ الفہرست، رجال شیخ طوسی اسی طرح رجال علامہ حلی اسی قسم کی کتابیں ہیں۔ ابن ندیم کی عظیم کتاب ''الفہرست'' کو ایک مکمل شیعہ کتاب سمجھنا چاہیے اور یہ بات اپنے مقام پر ثابت شدہ

ہے۔ساتویں صدی ہجری کے شیعہ عالم ابن ابی طی (وفات ۶۳۰ ہجری) کی ایک کتاب ''طبقات الامامیۃ'' تھی' جو بدقسمتی سے مفقود ہو چکی ہے۔ابن حجر عسقلانی نے یغوث صحابی کا حال لکھتے ہوئے ''الاصابہ'' میں اس سے ایک روایت نقل کی ہے۔ان کی ایک اور اہم کتاب ''تاریخ ابن ابی طی'' تھی' جو سال کے لحاظ سے ترتیب دی گئی تھی' اور اس سے نقل ہو کر باقی رہ جانے والی کچھ باتیں وہی ہیں جو صفدی نے ''نکت الھمیان'' (جو مشہور نابیناؤں کے حالات کے بارے میں ہے) میں بیان کی ہیں۔(۱)

انساب کی کتابوں سے بھی غفلت نہیں کرنی چاہیے' جو ایک اعتبار سے تاریخ سے تعلق رکھتی ہیں۔یہ علم بھی شیعوں میں رائج تھا اور اس علم میں قدیم ترین کتاب ''المجدی'' (تالیف سن ۴۴۳ ہجری) ہے' جو مذہب امامیہ کے عالم ابوالحسن علی بن محمد بن علی العُمری کی تالیف ہے۔(۲) اس سے شیعہ مذہب کے علما کی اس علم میں بھی کاوشوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔علاوہ ازیں ابونصر بخاری کی ''سر السلسلۃ'' بھی ہے۔اس شعبۂ علم میں تاریخ اہلِ بیتؑ کا حصہ اس قابل نہیں کہ اس سے لاپروائی برتی جائے۔علمائے نسب کی ایک فہرست ہے جسے آیت اللہ مرعشی نے بیہقی کی ''لباب الالقاب'' کے مقدمے میں نقل کیا ہے۔ان میں سے اکثر کتابوں میں نسب کے علاوہ تاریخی باتوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

صفوی اور قاچاری دور میں ''ریاض العلماء'' اور ''روضات الجنات'' جیسے تفصیلی انسائیکلوپیڈیا لکھے جانے کی وجہ سے ہمیں تاریخ' بالخصوص تاریخِ علوم کے بارے میں زیادہ تفصیلی معلومات حاصل ہوئیں۔

پانچویں سے ساتویں صدی ہجری تک ائمہ اثناعشر کی تاریخیں

''تاریخ الائمہ'' یا ''تاریخ الموالید و وفیات اہل البیتؑ'' یا ان سے مشابہ ناموں سے ایک ایسی قدیم کتاب موجود ہے' جس میں امام محمد باقرؑ' امام جعفر صادقؑ' امام علی رضاؑ اور امام حسن عسکری علیہم السلام سے نقل کرتے ہوئے ائمہؑ کی ولادت اور وفات کی تاریخیں درج ہیں۔اس کتاب کو کبھی ابن خشاب' کبھی نصر بن علی جہضمی' کبھی احمد بن محمد فریابی اور کبھی ابن ابی الثلج سے منسوب کیا جاتا ہے۔بہر صورت اس کتاب کو اس بارے میں تیسری صدی ہجری کی ایسی اہم ترین تالیفات میں شمار کرنا چاہیے جو اب تک موجود ہیں۔(۳) ایک اور کتاب ''زهرة المُهج و تواريخ الحُجج'' کے نام سے تھی؛

۱۔دیکھئے: الذریعہ۔ج ۳۔ص ۲۱۹

۲۔المجدی۔ص ۱۵۷' وہاں تصریح کرتا ہے کہ ... ونحن اثنی عشرية.

۳۔یہ کتاب ''تاریخ اہل بیتؑ'' کے عنوان سے قم میں آقائے جلالی کے ذریعے تصحیح ہوئی اور موسسۂ آل البیتؑ کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔انہوں نے اس کتاب کے مقدمے میں تفصیل کے ساتھ کتاب کے نام' اس کے مؤلف کے نام اور کتاب سے متعلق دیگر نکات پر گفتگو کی ہے۔

جسے حیات ائمہؑ کے بارے میں ہونا چاہیے۔ ابن طاؤس نے اس کتاب سے استناد کیا ہے' لیکن اس کے بارے میں کوئی خاص معلومات موجود نہیں ہیں۔(۱)

کچھ خاص کتابیں بارہ اماموں کے حالاتِ زندگی پر لکھی گئی ہیں۔ اس بارے میں قدیم ترین تالیف' جس میں تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے' شیخ مفید کی ''کتاب الارشاد'' ہے۔ انہوں نے حضرت علیؑ کے بارے میں مفصل ترین گفتگو کی ہے' اور عملی طور پر امامؑ کے مقام کی اہمیت بیان کرتے ہوئے سیرتِ نبوی کا بھی مختصراً ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد آخر تک ائمہؑ کے بارے میں ایسی باتیں تحریر کی ہیں جن میں زیادہ تر تاریخی اور کلامی مباحث ہیں۔ اگرچہ انہوں نے ہر مقام پر اپنے منابع کا ذکر نہیں کیا ہے' لیکن ان کی اسناد سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اس زمانے میں رائج معتبر اور اہم منابع سے استفادہ کیا ہے۔ بنیادی طور پر ان مقامات پر شیخ مفید کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ عراقی مؤلفین کی جانب سے لکھی گئی عراق میں موجود کتابوں سے پوری طرح واقف تھے۔ شیخ مفید کی ''مسار الشیعہ'' بھی ائمہؑ کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہے۔ اس کے بعد ابوعلی فضل بن حسن طبرسی (م: ۵۴۸ ہجری) کی ''اعلام الوریٰ'' کا ذکر کیا جاسکتا ہے' جو علمی اعتبار سے ایک قابلِ اطمینان اور دقیق کتاب ہے۔ اعلام الوریٰ' سیرت النبیؐ اور سیرتِ ائمہؑ پر مشتمل ہے اور ائمہؑ کی سیرت کے حصے میں ائمہؑ کی امامت کے اثبات پر شیخ مفید کی طرح تاریخی کلامی نکات بیان کیے گئے ہیں۔ مؤلف نے اپنے مصادر انتہائی احتیاط کے ساتھ درج کیے ہیں اور اس طرح کتاب کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔

ہم بتا چکے ہیں کہ سیرت النبیؐ کے حوالے سے ایک اہم شیعہ ماخذ ابان بن عثمان کی کتاب ہے' جس کے اہم حصوں کو طبرسی نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ ایک اور لازوال تالیف محمد بن علی المعروف بہ ابن شہرآشوب سروی مازندرانی کی ''المناقب'' ہے۔ یہ اہم اور مفصل تالیف سینکڑوں کتابوں سے استفادہ کرتے ہوئے تیار کی گئی ہے اور مؤلف نے مختلف مصادر کو نقل کر کے اور ان کے نام ذکر کر کے ایک اہم کام انجام دیا ہے۔ اس کتاب کا زیادہ تر حصہ امیر المومنینؑ کی زندگی اور اہلِ سنت کے مصادر سے آپ کے فضائل پر مشتمل ہے۔ لیکن اس سے پہلے سیرتِ نبوی کو بھی بیان کیا گیا ہے' اور پھر آگے چل کر ائمہؑ سے متعلق اخبار کو بھی نقل کر دیا ہے۔ فتال نیشاپوری (م: ۵۰۸ ہجری) کی کتاب ''روضۃ الواعظین'' ایک اور تالیف ہے' جس میں مصادر کا ذکر کیے بغیر بارہ اماموں کی زندگی پر گفتگو کی گئی ہے۔ ساتویں صدی ہجری کی ایک اور باقی بچ جانے والی تالیف' شیخ راشد بن ابراہیم بن اسحاق بحرانی کی کتاب ''مختصر احوال النبی والائمۃ الاثنی عشر علیہم السلام'' ہے جس کا ایک نسخہ موجود ہے۔(۲) منتجب الدین نے رے کے رہنے والے شمس الاسلام حسن بن حسین بن بابویہ قمی کی ایک

۱۔ کتابخانہ ابن طاؤس۔ ص ۲۰۴

۲۔ اس کا واحد نسخہ ''مرکز احیاء التراث الاسلامی قم'' کے پاس ہے۔

کتاب ''سیر الانبیاء والائمۃ'' کا ذکر کیا ہے' جس کا کوئی اثر موجود نہیں ہے۔(۱) انہوں نے ہی سید ابوالقاسم زید بن اسحاق جعفری کی ایک کتاب ''المغازی والسیر'' کا ذکر بھی کیا ہے' جس سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ اس علم میں اس زمانے میں بھی شیعہ دلچسپی لیتے تھے۔ شیخ ابوالحسن علی بن ہبۃ اللہ بن عثمان بن احمد موصلی کی بھی ایک کتاب ''الانوار فی تاریخ الائمۃ الابرار'' کے نام سے تھی۔(۲)

ساتویں صدی کی ایک اور اہم کتاب' علی بن عیسیٰ اربلی کی ''کشف الغمۃ فی معرفۃ الائمۃ'' ہے۔ یہ تالیف جو مختلف شیعہ اور سنی منابع سے ماخوذ ہے' اور جسے بہت اعتدال کے ساتھ لکھا گیا ہے' اس نے ساتویں صدی کے آخری ربع میں اپنی تالیف کے زمانے سے عالم اسلام میں تشیع کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ کئی بار فارسی زبان میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں چہاردہ معصومینؑ کے حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں۔ ہم نے ایک الگ کتاب میں اس تالیف اور اس کے منابع کا جائزہ لیا ہے۔ ایک اور کتاب محقق حلی (م: ۶۷۶ ہجری) کے شاگرد شیخ یوسف بن حاتم شامی کی ''الدر النظیم فی مناقب الائمۃ اللہامیم'' ہے۔(۳) یہ تالیف جس کا ایک نسخہ موجود ہے' اس میں ائمہؑ کے حالات اور ان کے فضائل بیان کیے گئے ہیں۔ اس عبارت میں ''لہامیم'' سے مراد بزرگ اور سادات ہیں۔

اس زمانے میں عاشورا کے حوالے سے مقتل نویسی بھی توجہ کا مرکز تھی۔ ابن طاؤس (م: ۶۶۴ ہجری) نے دو کتابیں تحریر کیں' ایک ''اللھوف'' اور دوسری ''المصرع الشین فی قتل الحسینؑ''۔ رائج ''مقتل ابومخنف'' جو درحقیقت اصل کتاب کے مطابق نہیں ہے' اسی صدی سے منسوب کتب میں سے ہے۔ احتمال ہے کہ یہ بھی ابن طاؤس ہی کی تالیف ہو۔(۴)

چوتھی سے چھٹی صدی ہجری تک کی مقامی تاریخیں

شیعوں نے مقامی تاریخیں لکھنے میں بھی حصہ لیا ہے۔ اس حوالے سے قدیم ترین تالیف' جو دوسری تمام تالیفات سے قدیم ہے' محمد بن بحر رہنی کی کتاب ''نحل العرب'' ہے۔(۵) یاقوت نے مؤلف مذکور اور اس کی اس تالیف کے بارے میں لکھا ہے: له تصانيف منها: كتاب سماه كتاب نحل العرب يذكر فيه تفرق العرب في البلاد في

۱۔ فہرست منتجب الدین۔ ص ۴۷
۲۔ ایضاً۔ ۷۶
۳۔ دیکھیے: الذریعہ۔ ج ۸۔ ص ۸۶
۴۔ کتابخانہ ابن طاؤس۔ ص ۸۰۔۷۸
۵۔ معجم الادباء۔ ج ۱۸۔ ص ۳۱' الوافی بالوفیات۔ ج ۲۔ ص ۲۴۳' الذریعہ۔ ج ۲۴۔ ص ۸۳

الاسلام' ومن كان منهم شيعيا ومن كان منهم خارجيا اورسنيا فيحسن قوله في الشيعة ويقع فيمن عداهم. وقفت على جزء من هذا الكتاب ذكر فيه نحل اهل المشرق خاصة من كرمان و سجستان و خراسان وطبرستان. (ان کی متعدد تصانیف ہیں' ان میں سے ایک کتاب جس کا نام انہوں نے "نحل العرب" رکھا ہے' اس کتاب میں وہ عربوں کے مختلف اسلامی شہروں میں پھیلنے کا ذکر کرتے ہیں' اور یہ کہ ان میں سے کون شیعہ تھا' کون خارجی تھا' کون سنی تھا۔ انہوں نے یہاں شیعوں کے بارے میں اچھے الفاظ استعمال کیے ہیں اور شیعوں کے مخالفین کی مذمت کی ہے۔ میں نے اس کتاب کا ایک جز دیکھا ہے' جس میں انہوں نے اہل مشرق کے عقائد کے بارے میں گفتگو کی ہے' بالخصوص کرمان' سجستان' خراسان' طبرستان کے بارے میں) اس کتاب میں سے جو کچھ یاقوت نے "معجم البلدان" میں نقل کیا ہے' اس کے سوا کچھ بھی باقی نہیں بچا ہے۔

احمد بن خالد برقی کی ایک کتاب "البلدان والمساحۃ" یا "التبیان فی احوال البلدان" کے نام سے ہے۔ کتاب "تاریخ قم" کے مؤلف نے چوتھی صدی ہجری میں قم شہر کی تاریخ کے بارے میں اس کتاب سے استفادہ کیا ہے' اور احتمال ہے کہ اس کی اسی کتاب "البلدان" سے استفادہ کیا ہوگا۔ (۱) اس کے طبع شدہ نسخے میں متعدد مقامات پر "برقی" سے نقل کرتے ہوئے' قم سے متعلق کئی تاریخی باتیں بیان کی گئی ہیں' اور ایک مقام پر کہتے ہیں کہ: برقی نے کتاب "بنیان" میں یوں کہا ہے۔۔۔۔۔ (۲) امکان ہے کہ لکھنے میں غلطی ہوئی ہو اور "بنیان" وہی "بلدان" ہو۔ دوسرا احتمال "کشف الظنون" نے ظاہر کیا ہے' اور وہ یہ ہے کہ کتاب کا نام "التبیان فی احوال البلدان" تھا۔ (۳)

"البلدان والمساحۃ" کے نام سے ایک کتاب کو احمد کے باپ' یعنی محمد بن خالد کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے۔ (۴) اسی نام "البلدان والمساحۃ" سے ایک اور کتاب تیسری صدی ہجری میں ابوجعفر محمد بن عبداللہ بن جعفر بن حسین بن جامع حمیری کی بھی ہے۔ وہ احمد برقی کی کتاب کی تلاش میں تھے اور انہوں نے اسے بغداد' رے اور قم میں تلاش کیا تھا لیکن وہ انہیں نہیں ملی تھی' لہٰذا اس کے بعد انہوں نے خود اس بارے میں کتاب لکھی۔ (۵)

۱۔ آقائے مدرسی نے کتاب "التبیان" کے نقل شدہ مقامات کو "تاریخ قم" میں ذکر کیا ہے۔ دیکھئے: کتاب شناسی۔ قم سے متعلق آثار۔ ص ۱۸ پر۔ قابل ذکر ہے کہ رافعی نے "التدوین" صفحہ ۴۴' ۴۸ میں کئی مقامات پر کتاب "التبیان" سے نقل کیا ہے۔

۲۔ تاریخ قم۔ ص ۵۶

۳۔ دیکھئے: الذریعہ۔ ج ۳۔ ص ۱۵۴۔ ش ۴۹۷

۴۔ الذریعہ۔ ج ۳۔ ص ۱۴۵

۵۔ رجال النجاشی۔ ص ۳۵۵

اس بارے میں ایک اور اہم کتاب "تاریخ قم" ہے جو حسن بن محمد بن حسن قمی نے ۳۷۸ ہجری میں لکھی تھی۔ یہ اہم تاریخی تالیف توجہ طلب ترین اور علمی ترین کتاب ہے جو قدیم اسلامی تمدن کے بارے میں لکھی گئی ہے۔ اسلامی تمدن کے بارے میں جو مقامی تاریخیں لکھی گئی ہیں ان کا بڑا حصہ شہروں کے اہم افراد کے بارے میں ہے جبکہ "تاریخ قم" میں شہر کی تاریخ کے بارے میں باریکی کے ساتھ علمی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ مؤلف نے مقدمے میں کتاب کو بیس ابواب میں تقسیم کیا ہے لیکن بدقسمتی سے فارسی ترجمے کے صرف پانچ حصے دستیاب ہیں۔ اس کے عربی متن کے بارے میں بھی کوئی اطلاع نہیں ہے۔ اس کا فارسی متن حسن بن علی بن حسن بن عبدالملک قمی کا ہے جو سن ۸۰۵ ہجری میں مکمل ہوا ہے۔ اس کتاب میں قم شہر کے بارے میں معلومات سے قطع نظر اس زمانے کے خراج کے بارے میں بھی اہم معلومات دی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ اشعری قبیلے کے بارے میں بھی اس زمانے سے معلومات فراہم کی گئی ہیں جب یہ قبیلہ یمن میں ہوتا تھے اور اس کے بعد رسول اللہؐ کے پاس آیا پھر اس کے بعد عراق اور پھر ہجرت کر کے قم آ گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ فتوحات میں خصوصاً ایران کے بعض علاقوں کی فتح میں ان کے کردار پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔

ایک اور اہم لیکن مفقود کتاب صاحب الفہرست منتجب الدین کی "تاریخ رے" ہے۔ یہ چھٹی صدی ہجری کے عالم ہیں۔ اس کتاب کے بعض مقامات کو صرف ابن حجر نے "لسان المیزان" میں نقل کیا ہے۔ عظیم ادبی شاہکار "نثر الدر" کے مؤلف ابوسعد منصور بن حسین آبی کی بھی "تاریخ رے" کے نام سے ایک ہے۔ (۱) ہم نے ایک مستقل مقالے میں برقی رحنی ابوسعد آبی اور منتجب الدین کی جغرافیائی تالیفات کا تعارف پیش کیا ہے۔

ایک اور کتاب ابن اسفندیار کی "تاریخ طبرستان" ہے۔ یہ لازوال تالیف طبرستان کی تاریخ کے بارے میں لکھی جانے والی اہم ترین تحریر ہے۔ اس کے مؤلف چھٹی صدی ہجری کے ایک شیعہ مؤرخ ہیں۔ مولانا اولیاء اللہ آملی کی "تاریخ رویان" ایک اور اہم علاقائی تاریخ ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں بعض شیعہ تاریخی نظریات خصوصاً حضور ائمہؑ کے زمانے تک کے نظریات کو بیان کیا ہے۔

بارہ امامی سنیوں کی عربی اور فارسی تالیفات

اہل سنت میں سے بھی کچھ لوگوں نے مختلف اسباب کی بنا پر ائمہ اثنا عشر علیہم السلام کے حالات زندگی پر کتب تحریر کی ہیں۔ یہ ان لوگوں کے علاوہ ہیں جنہوں نے اہل بیتؑ کے بارے میں کتب تالیف کی ہیں اور جن کا مرحوم استاد عبدالعزیز طباطبائی نے مجلے "تراثنا" میں "اهل البيتؑ في المكتبة العربية" کے عنوان سے اپنے سلسلہ مقالات

۱۔ الذریعہ۔ ج ۳۔ ص ۲۵۳

میں تعارف کرایا ہے۔ان افراد کو اصطلاحاً بارہ امامی سنی کہا جا سکتا ہے۔

ابن شادی کی "مجمل التواریخ والقصص" جو تقریباً ۵۲۰ ہجری میں فارسی زبان میں تالیف کی گئی اس میں وہ پیغمبرؐ کے بعد خلافت کے حصے میں لکھتا ہے: پیغمبر علیہ السلام کے بعد ابوبکر صدیق تھے۔۔۔ اس کے بعد وہ تمام خلفا کے حالات بیان کرتا ہے۔ وہی ایک اور مقام پر ایک فصل میں اہل بیت پیغمبر علیہم السلام میں سے ایک گروہ کا ذکر کرتا ہے اور وہاں فاطمۃ الزہرا علیہا السلام سے آغاز کرتے ہوئے ان کے فرزندوں حسن اور حسین علیہما السلام کے حالات زندگی بیان کرنے کے بعد ترتیب سے ابوالقاسم محمد بن حسن عسکری علیہم السلام تک تمام اماموں کا اختصار کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔(۱)

یوسف بن فرغلی بن عبداللہ بغدادی سبط ابن ابوالفرج عبدالرحمان بن الجوزی (۵۸۱ تا ۶۵۴ ہجری) نے اپنی تالیف ''تذکرۃ الخواص'' میں اہل بیتؑ اور تمام بارہ اماموںؑ کے مناقب وفضائل بیان کیے ہیں اور اسے اس قسم کی اوّلین تالیفات میں سے ایک شمار کرنا چاہیے۔ ابن خالویہ (م ۳۷۰ ہجری) کی کتاب ''الآل'' کو بھی اسی قسم کی کتابوں میں سے ہونا چاہیے۔ ''اربلی'' نے ''کشف الغمہ'' میں بعض مقامات پر اس سے نقل کیا ہے۔ انہی میں سے ایک ممتاز ترین شخصیت ''مطالب السؤل فی مناقب آل الرسول'' جیسی گرانقدر کتاب کے مؤلف کمال الدین محمد بن طلحہ شافعی (م: ۶۵۲ ہجری) ہیں۔اربلی نے اس بنا پر ان کی مدح وستائش کی ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب میں بارہ اماموںؑ کے حالات زندگی بیان کیے ہیں۔ عبدالعزیز بن محمد المعروف بہ اخضر گنابادی (م: ۶۱۱ ہجری) نے اپنی کتاب ''معالم العترۃ النبویۃ و معارف اهل البیت الفاطمیۃ العلویۃ'' میں صرف گیارہ اماموں کا تذکرہ کیا ہے اور اسی بنا پر علی بن عیسیٰ اربلی نے ان پر تنقید کی ہے۔(۲)

کتاب "نزهۃ القلوب" اور تاریخ گزیدہ کے مصنف حمداللہ مستوفی (م: ۷۴۰ ہجری) نے اپنی ثانی الذکر کتاب میں ابتدا میں اوّلین خلفا کی تاریخ بیان کی ہے اور اس کے بعد امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے حالات زندگی بیان کیے ہیں اور ان کے فضائل کا ذکر کیا ہے۔ آگے چل کر صفحہ ۱۹۸ پر امیر المومنینؑ اور رسول اللہؐ کے نواسے امام حسن مجتبیٰؑ کی زندگی کا تذکرہ کیا ہے۔ اپنی کتاب کے تیسرے باب کی تیسری فصل کو ان الفاظ کے ساتھ دوسرے ائمہؑ سے مخصوص کیا ہے کہ: یہ فصل ان تمام معصومین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں ہے جو خلق پر حق کی حجت تھے۔ ان کی مدت امامت ۴ صفر ۴۹ ہجری سے رمضان ۲۶۴ ہجری تک دو سو پندرہ سال اور سات مہینے رہی۔ ائمہ معصومینؑ نے اگرچہ خلافت نہیں کی

۱۔ مجمل التواریخ والقصص (بہ کوشش ملک الشعراء بہار، تہران، کلالۂ خاور۔۔) ص ۴۵۳، ۴۵۸

۲۔ کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۳۶۔ گویا کتاب معالم باقی نہیں رہی ہے اگرچہ اس میں سے چند ٹکڑے ''کشف الغمہ'' میں نقل ہوئے ہیں۔ دیکھئے: علی بن عیسیٰ اربلی و کشف الغمہ۔ ص ۱۲۱

لیکن کیونکہ مستحق وہی تھے اس لیے بطور تبرک ان کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ امام زمانہ علیہ السلام کے حالات زندگی کے بیان تک جاری رہا ہے۔(۱) اسی قسم کی دو اور اہم کتابیں ابن صباغ مالکی (م:۸۵۵ ہجری) کی "**الفصول المهمة فی معرفة احوال الائمة**" اور دوسری شمس الدین محمد بن طولون (م:۹۵۳ ہجری) کی "**الشذرات الذهبية فی تراجم الائمة الاثنیٰ عشریه عندالامامية**" ہے۔

ایک اور اہم تالیف نویں صدی ہجری کے خواجہ محمد پارسا کی کتاب "فصل الخطاب" ہے، جس میں انہوں نے مذہب تسنن پر اصرار اور روافض کے خلاف سخت مؤقف اختیار کرنے کے باوجود ائمہؑ کے حالات زندگی تحریر کیے ہیں۔ کتاب کا یہ حصہ میراث اسلامی ایران کے دفتر چہارم میں شائع ہو چکا ہے۔ دسویں صدی ہجری میں عثمانی قلمرو میں تالیف کی گئی کتاب "**بهجة التواريخ**" میں خلفا اور ائمہؑ کے حالات زندگی درج ہیں۔(۲) دسویں صدی ہجری کے درویش حسین کربلائی نے اپنی کتاب "روضات الجنان و جنات الجنان" میں ایک طویل فصل ائمہؑ کے حالات زندگی کے بارے میں مخصوص کی ہے۔ یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔ فضل اللہ بن روز بہان خنجی (م:۹۲۷ ہجری) جو شیعہ مذہب اور صفوی حکومت کی مخالفت میں مشہور ہیں، انہوں نے چہاردہ معصومینؑ کے حالات زندگی پر ایک کتاب "**وسيلة الخادم الی المخدوم درشرح صلوات چهارده معصوم**" لکھی ہے۔(۳) "تحفۃ الاخبار" دسویں صدی ہجری میں دولت عثمانی کے زیر سایہ تالیف کی جانے والی کتابوں میں سے ہے، جس میں بارہ اماموں کے حالات زندگی ہیں۔(۴) ابن حجر ہیثمی کی "**الصواعق المحرقة**" جو انہوں نے روافض کی مخالفت میں لکھی ہے، یہ بھی ائمہؑ کے حالات زندگی کے بیان اور ان کے فضائل پر مشتمل ہے۔ اس اعتبار سے ایک اہم ترین شخصیت ملا حسین کاشفی ہیں، جنہوں نے اپنی کتاب "**روضة الشهداء**" میں انبیاؑ اور ائمۂ اثناعشرؑ کے مختصر حالات زندگی نیز ان کی عزاداری کے بارے میں کچھ باتیں بیان کی ہیں اور سب سے زیادہ تفصیلی گفتگو امام حسینؑ کے بارے میں کی ہے۔ اسی حوالے سے ایک اور تالیف کمال الدین خوارزمی کی "المقصد الاقصی" ہے، جس میں خلفا کے احوال کے علاوہ بارہ اماموںؑ کے حالات بھی بیان کیے گئے ہیں۔

۱۔ تاریخ گزیدہ۔ ص ۲۰۷

۲۔ ایران کے قومی کتابخانے کے خطی نسخوں کی فہرست۔ ج ۱۔ ص ۳۶۵

۳۔ اس سے پہلے یہ کتاب ہماری کوششوں سے سلسلۂ انتشارات کتابخانۂ آیت اللہ مرعشی سے شائع ہوئی تھی اس کا نیا ایڈیشن جسے ایک جدید نسخے سے ملا کر دیکھا گیا ہے انتشارات انصاریان کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔

۴۔ اس کے متعلق جاننے کے لیے دیکھئے: نشر دانش۔ سال چہاردھم۔ شمارہ اسفند۔ ص ۵۸

ساتویں تا دسویں صدی ہجری تک شیعوں کی فارسی تالیفات

اس زمانے کے فارسی زبان شیعوں کی بہت کم ایسی تالیفات باقی بچی ہیں جو اپنی حد تک قابلِ توجہ ہیں۔ ''نقض'' کے عنوان سے عبدالجلیل قزوینی رازی کی لازوال کتاب ہے' جو ایک کلامی' تاریخی کتاب ہے' جسے انہوں نے شیعوں کے خلاف لکھی گئی ایک کتاب کے جواب میں لکھا تھا۔ یہ اہم کتاب چھٹی صدی ہجری میں اس زمانے کے شیعوں اور ان کے علمی' فکری اور کسی حد تک سیاسی حالات کے حوالے سے منفرد معلومات پر مشتمل ہے۔ اسی کتاب میں وہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے ایک کتاب حدیثِ افک یا حضرت عائشہ کے دفاع میں بھی لکھی ہے۔ (۱) انہوں نے اس بات کا تذکرہ اس لیے کیا ہے تاکہ کہہ سکیں کہ شیعہ ازواجِ رسول کو طعنہ نہیں دیتے ہیں۔

بہت کام کرنے والے ایک شیعہ اہلِ قلم کی طرف سے ساتویں صدی ہجری کے اواخر میں اصفہان میں تین کتب تالیف کی گئیں' جو سب کی سب کلامی' تاریخی کتب ہیں۔ ''کامل بہائی''' ''مناقب الطاہرین'' اور ''تحفۃ الابرار'' کے مصنف عمادالدین طبری نے اہم شیعہ موضوعات پر کلامی' تاریخی نگاہ ڈالی ہے' اور گاہ بگاہ اپنے زمانے کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی ہیں۔ ۷۴۰ ہجری میں سید محمد بن ابی زید بن عربشاہ ورامینی نے ائمہ معصومینؑ کے حالاتِ زندگی کے بارے میں "احسن الکبار فی معرفۃ الائمۃ الابرار" جیسی ضخیم کتاب لکھی' جس کے نسخے کتابخانۂ آیت اللہ مرعشی نجفی (قم المقدس) اور دوسرے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ اس کتاب کا خلاصہ ''لوامع الانوار'' کے نام سے علی بن حسن زوارہ ای نے تحریر کیا ہے' جو دستیاب ہے۔ انبیا اور ائمہ کی تاریخ پر محمد بن حسین محتسب کی ایک دس جلدی کتاب ''رامش افزای آلِ محمدؐ'' تھی' جسے منتجب الدین نے دیکھا ہے اور اس کا کچھ حصہ مؤلف کے پاس پڑھا بھی ہے۔ (۲) اس میں سے دو مقامات کو ابن شہر آشوب نے ''مناقب'' میں نقل کیا ہے' ایک امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی زندگی کے بارے میں' اور دوسرا امام جعفر صادق علیہ السلام کے علم کے بارے میں۔ (۳) منتجب الدین کی ''الفہرست'' میں اس کا ذکر آیا ہے' لیکن آٹھویں صدی ہجری کے بعد سے اس کا کوئی سراغ نہیں ملا ہے۔ "مباھج المُھج فی مناھج الحجج" ممتاز شیعہ مصنف قطب الدین کیدری کی تالیف ہے' بہت زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ ان کا تعلق چھٹی صدی ہجری سے ہے۔ یہ کتاب جو عربی میں تھی' اسے حسن بن حسین شیعی سبزواری نے آٹھویں صدی ہجری میں فارسی میں ترجمہ کیا اور مترجم نے اس کا نام

۱۔ کتاب نقض۔ ص ۱۱۵' ۲۹۵

۲۔ الفہرست منتجب الدین۔ ص ۱۰۸

۳۔ دیکھیے: تعلیقات الفہرست منتجب الدین۔ طبع ارموی۔ ص ۴۳۵۔ ش ۳۹۵

"بھجة المباھج" رکھا۔ انہوں نے یہ ترجمہ خواجہ نظام الدین یحییٰ بن شمس الدین کو ہدیہ کیا تھا جو ۷۵۳ سے ۷۵۹ ہجری تک خراسان کے حکمران تھے۔ ان کا تعلق سربداران سے تھا۔ "بھجة المباھج" کو دسویں صدی ہجری میں ایک کاشانی شاعر "حیرتی تونی" نے نظم کی صورت میں ڈھالا۔(۱) حسن شیعی سبزواری نے "راحة الارواح و مونس الاشباح" کے نام سے بھی ایک کتاب تحریر کی جو پیغمبر اکرمؐ اور اہلِ بیتؑ کی زندگیوں کے بارے میں حکایات اور لطائف پر مشتمل ہے' یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔(۲)

ایک اور متن "تاریخ محمدی" یا "تاریخ رشیدی" یا "تاریخ دوازدہ امامؑ" یا "فہرست ائمہؑ" کے نام سے ہے' جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ: اس میں ترتیب وار پیغمبر اکرمؐ اور ائمہؑ کی تاریخ ولادت' اُن کے نام ونسب ولقب' اُن کی جائے ولادت اور اُن کے جائے مدفن درج ہیں اور ۲۰ ذیقعدہ ۸۱۹ ہجری کے ساتھ اس کا ایک نسخہ تبریز کے قومی کتابخانے میں نمبر ۳۶۲۶ کے ساتھ موجود ہے۔(۳) یہ ملا حسن کاشانی کی تالیف ہے' جو سلطان محمد خدابندہ کے مقربین میں سے تھے' اور اس زمانے کی شیعیت میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ انہوں نے یہ کتاب ۷۰۸ ہجری میں ساٹھ سال کی عمر میں حلہ اور بغداد میں لکھی۔(۴) "تاریخ عترت" کے نام سے ایک کتاب ۸۰۳ ہجری میں حلب میں تالیف کی گئی تھی' جس کا متن دانش پژوہ نے طبع کیا ہے۔(۵)

فارسی زبان شیعوں کے یہاں صدر اسلام کی تاریخ کے حوالے سے تفصیلی ترین کتاب "نزھة الکرام و بستان العوام" کو قرار دیا جا سکتا ہے' جو چند سال قبل محمد شیروانی کی تصحیح کے ساتھ طبع ہوئی ہے۔ یہ محمد بن حسین بن حسن رازی کی تحریر ہے' جن کا تعلق چھٹی صدی ہجری کے اواخر اور ساتویں صدی ہجری کے اوائل سے ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے' اور اکیسویں باب تک اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کے حوالے سے روایات ہیں۔ اس کے بعد تیسویں باب تک حضرت ابوبکر اور دوسرے مسائل کی خبریں ہیں۔ یہ سب پہلی جلد میں ہے۔ دوسری جلد میں ساٹھویں

۱۔ ادبیات فارسی استوری۔ ص ۸۵' ۸۶۷

۲۔ اس کے نسخوں کے لیے دیکھئے: ادبیات فارسی استوری۔ ص ۷۸۵ یہ کتاب آقائے محمد سپہری کی کوشش سے ۱۳۷۵ ش میں "انتشارات میراث مکتوب" کی جانب سے شائع ہوئی ہے۔

۳۔ فہرست نسخہ ہائے خطی فارسی منزوی۔ ص ۴۷۰۳

۴۔ استوری۔ ص ۸۹۹

۵۔ دیکھئے: مقدمہ بستان الکرام۔ ص ۱۵۔ اس مقدمے میں محقق نے اہل بیتؑ کے بارے میں عربی اور فارسی زبانوں میں اہل سنت اور شیعوں کی طرف سے کیے جانے والے کئی تحریری کاموں کو مختصراً بیان کیا ہے۔ اے کاش! وہ اس بارے میں مزید جامع معلومات پیش کرتے۔

باب تک امامِ زمانہ تک معصومینؑ کے معجزات مذکور ہیں۔ اس کتاب کو "احسن الکبار" کے ساتھ صدرِ اسلام کی تاریخ پر فارسی زبان میں شیعوں کی ایک کامل ترین کتاب سمجھنا چاہیے' جس کا تعلق تاریخِ ایران کے درمیانی دور سے ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ کتاب باوجودیکہ فارسی زبان میں ہے' لیکن اپنی اہمیت کی وجہ سے اس نے ابن طاؤس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی اور کیونکہ وہ فارسی نہیں جانتے تھے' اس لیے انہوں نے اس کا ترجمہ کروایا اور ایک مقام پر "فرج المهموم" میں اس سے نقل بھی کیا ہے۔ (۱) ابوالفاخر رازی نے چھٹی صدی ہجری میں فارسی زبان میں اشعار کی صورت میں ایک مقتل لکھا ہے' جس کے بعض باقی ماندہ اشعار کاشفی کی "روضة الشهداء" میں موجود ہیں۔

صفوی دور کے آغاز سے پہلے کی تاریخ نویسی

چھٹی اور ساتویں صدی ہجری تک اسلامی تمدن کا پرشکوہ دور گزرنے کے بعد اکثر علمی میدانوں میں تالیف کا کام جمود' تکرار اور اکثر اوقات علمی روش سے خالی فضول تشریحات کا شکار ہوگیا۔ البتہ ایسے نادر موارد بھی موجود ہیں جنھیں اس سے مستثنا کرنا چاہیے۔ مثال کے طور پر مغل دور میں تاریخ نویسی کا علم بلند مرتبے پر پہنچا ہوا تھا' اور "جامع التواریخ" یا "جوینی" کی "جہانگشا" نیز "حافظ آب رو" کی تالیفات اس بلند مرتبے کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اس کے بعد شام اور مصر کے علاوہ' جہاں ذہبی' صفدی' ابن حجر' ابن عماد حنبلی' صالحی شامی' مقریزی' کتبی اور دوسرے بہت سے علما نظر آتے ہیں' شیعوں اور سنیوں دونوں کے یہاں مشرق اس سلسلے میں بالکل خالی نظر آتا ہے۔ ابتدائی برسوں میں پیش کی جانے والی تاریخ نیشاپور' تاریخ بیہق' تاریخ جرجان اور تاریخ رے وغیرہ جیسی شاندار تالیفات' اب سامنے نہیں آرہی تھیں۔ بعض حکومتوں کے حوالے سے مقامی تاریخیں لکھنے کے سوا اس دور میں بقیہ تاریخ نویسی میں ٹھہراؤ پیدا ہوگیا تھا۔ چنانچہ تاریخ اسلام پر بھی کوئی کام نہیں ہوا۔ صوفی حضرات جن کا اس دور میں مشرق پر تسلط تھا' انہوں نے نویں صدی ہجری میں کچھ محدود تالیفات پیش کیں۔ یہ عام طور پر ان کے اقطاب کے طبقات اور سلسلۂ مشائخ کے تذکرے پر مشتمل تھیں' جن میں قدرتی طور پر تاریخ اسلام اور ائمہ معصومینؑ کی کچھ تاریخ کا ذکر بھی ہوتا تھا۔ ان تاریخوں میں صوفیانہ نقطۂ نظر کے غلبے کی وجہ سے تاریخ میں ایک قسم کے غیر تجربی رجحان' نیز شرح حال نویسی کا رواج ہوگیا' اس طرح کی تالیفات کا آغاز "طبقات الاولیاء" اور اس سے چند صدی قبل اس جیسی اور کتابوں کی تالیف سے ہوا۔ اقطاب کی زندگی' عام انسانوں کی زندگی سے بالکل مختلف انداز میں گزرتی ہے اور تمام چیزیں بارہا اپنی فطری حدود سے باہر نکل جاتی ہیں۔ اس قسم کی تاریخی تالیفات کی ایک طویل فہرست ہے' جو عام طور پر تاریخ نویسی کے حوالے سے بالکل بے اہمیت تھی اور تصوف کے ختم ہوتے ہی اس کی اہمیت بھی ختم

۱۔ کتاب خانۂ ابن طاؤس۔ ص ۳۸۲

ہوگئی۔قدیم فارسی ادب میں تاریخ کا حصہ بھی پایا جاتا ہے۔صوفی مسلک اہلِ سنت جن سے لوگ اپنے اکثر تاریخی نظریات لیتے ہیں ان کی بعض مشہورترین تالیفات یہ ہیں: "المقصد الاقصیٰ فی ترجمة المستقصیٰ" اس کے عربی متن کے بارے میں معلومات میسر نہیں ہاں اس کا ترجمہ کمال الدین حسین خوارزمی نے نویں صدی میں کیا تھا۔(۱) "المجتبیٰ من کتاب المجتبیٰ فی سیرة المصطفی"(۲) جامی کی سیر النبیؐ (۳)"مولودِ حضرت رسالت پناہ محمدیؐ" از جامی (۴) اسی طرح جامی کی "شواهد النبوة لتقوية اليقين اهل الفتوة" (۵) اس کتاب نے بہت شہرت پائی اور اس کے سینکڑوں خطی نسخے موجود ہیں۔مشہور صوفی جمال الدین احمد اردستانی المعروف بہ پیر جمال کی "بیان حقائق احوال سید المرسلینؐ" (۶) معین الدین فراہی (م ۹۰۷ ہجری) کی "معارج النبوة فی مدارج الفتوة" (۷) اس کتاب کو بھی بہت شہرت حاصل ہوئی۔امیر جمال الدین عطاءاللہ بن فضل اللہ حسینی دشتکی شیرازی کی "روضة الاحباب فی سیر النبی والآل والاصحاب" جو سن ۹۰۰ ہجری میں تالیف کی گئی اور کافی شہرت کی حامل تھی۔(۸) انہی کی ایک اور کتاب جو انہوں نے اہلِ بیتؑ کے فضائل ومناقب کے بارے میں لکھی ہے "تحفة الاحباء فی مناقب آل العباء" ہے(۹) احمد بن تاج الدین حسن بن سیف الدین استرآبادی کی تالیف "آثار احمدی"(۱۰) جو بارہ امامی سنیوں کی تالیفات میں سے ایک ہے اور حال ہی میں آقائے میر ہاشم محدث کی کوششوں سے انتشارات میراث مکتوب نے شائع کی ہے۔اس کے علاوہ اس دور میں نثر اور نظم کی متعدد کتابیں ہیں جو صوفیانہ طرز کے تقدس کی حامل ہیں جیسے نادر المعراج وبحر الاسرار حملۂ حیدری محاربۂ غضنفری۔

اس مقالے میں ان کتابوں کا تذکرہ اس لیے کیا گیا ہے کہ شیعہ تاریخ نویسی میں اس کا گہرا اثر رہا ہے۔ادب کی ان

۱۔تاریخ ادبیات فارسی استوری۔ص ۷۷۵

۲۔استوری۔ص ۷۹۱

۳۔ایضاً۔ص ۷۹۲

۴۔ایضاً۔ص ۷۹۵

۵۔ایضاً۔ص ۷۹۷، ۸۰۳

۶۔ایضاً۔ص ۷۹۲، ۷۹۳

۷۔ایضاً۔ص ۸۰۳، ۸۱۰

۸۔ایضاً۔ص ۸۱۰، ۸۱۸

۹۔ایضاً۔ص ۸۱۸

۱۰۔ایضاً۔ص ۸۱۹

دو اقسام میں ارتباط کی واضح مثال ملا حسین کاشفی کی "روضۃ الشہداء" ہے، جس نے ہرات میں رائج نظریات کو ایرانی تشیع میں منتقل کیا اور خود سینکڑوں سال تک شیعوں کے درمیان ایک مؤثر متن کی حیثیت سے رہی۔

صفوی دور میں شیعہ تاریخ نویسی

یہ بات ذہن نشین رکھنے کی ضرورت ہے کہ صفوی دور میں کچھ تاریخ نویسی کا تعلق صفوی حکومت اور بسا اوقات ان حکومتوں کے ایسے تاریخی تحولات ضبطِ تحریر میں لانے کی حد تک محدود تھا جو اس حکومت میں دخل رکھتے تھے۔ ہم یہاں پر اس قسم کی تالیفات کے بارے میں گفتگو کا ارادہ نہیں رکھتے جن کے مشہور نمونے عالم آرا (۱) کے نام سے ظاہر ہونے والی مختلف کتابیں یا خلاصۃ التواریخ وغیرہ ہیں، بلکہ ہمارا ارادہ صرف ان تاریخی کتابوں کی طرف اشارہ کرنا ہے جن میں صدرِ اسلام کی تاریخ (خواہ وہ سیرتِ رسولؐ سے متعلق ہو یا تاریخ ائمہؑ سے تعلق رکھتی ہو) کو بیان کیا گیا ہے۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ پہلی قسم کی تالیفات کے مؤلفین علمائے دین نہیں تھے، بلکہ صفوی دور کے دوسرے دانشور تھے جیسے اُن کے معتمدین (سکریٹریز)، منتظمین یا شعرا۔ یہاں ہم صفوی اور قاچاری دور پر ایک ساتھ گفتگو کریں گے جو اس اعتبار سے بھی اور دوسرے کئی پہلوؤں سے بھی ایک دوسرے کے ساتھ مکمل مشابہ ہے۔ اسماعیل اوّل کے دور میں صفوی حکومت کی تشکیل کا پہلا مرحلہ گزرنے کے بعد، اس کا دوسرا مرحلہ یعنی صفوی حکومت کے استحکام کا دور شروع ہوا، جو شاہ طہماسب کے ذریعے انجام پایا۔ اس حکومت کے بنیادی آلات میں سے ایک آلہ شیعیت کی جانب توجہ اور نئی حکومت کی ایک بنیاد کے طور پر اس کی حفاظت تھی۔ شاہ طہماسب نے اس بات کو محسوس کرتے ہوئے ایران میں شیعہ نظریے کی جڑیں گہری کرنے کا کام کیا، اور مختلف پہلوؤں سے اس امر کے استحکام کے لیے چالیس سال تک جدوجہد کی۔ تاریخ کے حوالے سے اہم مقصد ایک طرف لوگوں کو ائمہؑ کی زندگی سے آگاہ کرنا تھا اور دوسری طرف صدرِ اسلام میں ائمہؑ کے مخالفین کے کاموں پر تنقید کرنا تھا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ایران، بالخصوص اس کا مشرقی حصہ، ائمہؑ کے فضائل و مناقب سے مکمل طور پر آشنا تھا، لیکن بہرحال اس آشنائی میں اضافے نے شیعیت کے زیادہ سے زیادہ پھیلاؤ میں مدد دی۔ شاہ طہماسب کی جانب سے شیعیت کے فروغ میں دلچسپی لینے کی دلیل یہ ہے کہ اس نے تین مرتبہ گرانقدر کتاب "کشف الغمہ" کے ترجمے کا حکم دیا اور اس کا واحد مقصد لوگوں کے درمیان شیعیت کو فروغ دینا تھا۔ اس کتاب کا ترجمہ کرنے والوں میں سے ایک نعمت اللہ بن قریش رضوی ہیں۔ انہوں نے اپنے ترجمے کے مقدمے میں لکھا ہے کہ: "کیونکہ شاہ طہماسب یہ سمجھتے تھے کہ لوگوں

۱۔ مثلاً عالم آرای شاہ اسماعیل، عالم آرای شاہ طہماسب، عالم آرای صفوی، عالم آرای عباسی اور صفوی سے پہلے عالم آرای نادری اور صفویہ کے بعد عالم آرای نادری۔

کے درمیان تولی اور تبریٰ رواج پائے اور یہ بات واضح تھی کہ اس زمانے کے لوگ زیادہ تر ائمۂ طاہرینؑ کے حالات سے غافل ہیں اور انہیں ان کے مناقب کی تفصیلی معرفت نہیں ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ اگر کوئی اس باب میں جامع ترین کتاب ''کشف الغمہ فی معرفۃ الائمۃ'' کا فارسی ترجمہ کرے تو اس کا فائدہ عام ہو جائے گا اور تمام محبین ائمہ کی معرفت کامل ہو جائے گی اور یہ ایک عظیم نعمت اور عمیم برکت ثابت ہوگی۔'' اس کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے اس خدمت کا بیڑا اٹھایا۔(۱)

اس دور میں تاریخِ اسلام کی جانب توجہ کی ایک اور وجہ اخباری اور حدیثی نظریات کا فروغ تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ اہلِ سنت کے یہاں بھی اجتہاد کا دروازہ بند ہونے اور اخباریت کے غلبے نے فقہ اور عقل (فلسفہ) کو کمزور کیا' لیکن اس کے مقابل تاریخ اور علمِ رجال کو فروغ کا موقع ملا۔ شیعوں میں بھی شیخ مفید کے بعد سے فقہِ اجتہادی کو تقویت ملی' کیونکہ حدیث کا راستہ بند ہو چکا تھا اور کلام اور فلسفے کو فروغ حاصل ہوا تھا اور اس کے مقابلے میں تاریخ اور رجال محدود ہوئے۔ صفوی دور میں اخباریت کے دوبارہ فروغ کے بعد علمِ تاریخ کو بھی ایک حد تک ظہور کا موقع ملا۔ لیکن ایک دوسرا عامل کلامی مباحث' خصوصاً امامت کی ابحاث میں تاریخ سے استفادے میں رکاوٹ بنا۔ یہ وہی مباحث تھیں جو تیسری صدی میں " الاستغاثہ فی بدع الثلاثہ'' جیسی کتابوں میں سامنے آئی تھیں۔

صفوی دور کی تالیفات کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی' حتیٰ یہ خصوصیت ایران سے باہر بحرین کے شیعہ حلقوں کی بھی تھی' کہ ان کے پاس وسیع پیمانے پر تاریخی تالیفات موجود نہ تھیں۔ اس زمانے میں ان کے پاس صرف شیعہ کتابیں ہوا کرتی تھیں' جبکہ ابن طاؤس اور اربلی کے زمانے میں عراق میں اہلِ سنت کی کتابیں مکمل طور پر رائج تھیں اور شیعہ بھی ان سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ اہلِ سنت کی کتابوں سے جو کچھ "اثبات الھداۃ" یا" بحار الانوار" وغیرہ میں نقل ہوا ہے' یہ عام طور پر وہ باتیں ہیں جو ابن بطریق' ابن طاؤس اور اربلی جیسے افراد سے نقل کی گئی ہیں۔ البتہ اس سے لغات وغیرہ جیسی چند محدود کتب کو مستثنا کرنا ہوگا۔ تاریخِ طبری' یا ذہبی اور ابن کثیر کی تالیفات جیسے قدیم منابع (sources)' جو اہلِ سنت کے یہاں رائج ترین منابع تھے' وہ شیعہ علما کے پاس نہ تھے۔ آیت اللہ مرعشی نجفی کے کتابخانے کی فہرست جو بیس جلدوں پر مشتمل ہے' اس میں اب تک تاریخ طبری کا ایک نسخہ بھی دکھائی نہیں دیا ہے' اور مسعودی کی مروج الذہب کا صرف ایک نسخہ نظر آیا ہے۔ تاریخِ یعقوبی' جو ایک شیعہ تالیف ہے' اس کا بھی اس فہرست میں کوئی تذکرہ نہیں ملتا' بلکہ ایران میں اس کا کوئی

۱۔ دیکھئے: علل بر افتادن صفویان (صفویوں کے زوال کے اسباب)' مقالہ ترجمہ متونِ دینی بہ پارسی در دورۂ صفوی (صفوی دور میں دینی متون کا فارسی میں ترجمہ)۔ ص ۳۸۶' اس مقام پر دو اور ترجموں کا تعارف بھی کرایا گیا ہے۔

خطی نسخہ موجود نہیں ہے۔ یہ بات بھی معلوم ہونی چاہیے کہ شیخ مفید کی کتاب ''الجمل'' کا بھی کوئی نسخہ حتیٰ علامہ مجلسی کے پاس بھی موجود نہ تھا۔ ان سب باتوں سے پتا چلتا ہے کہ یہ زمانہ رائج تاریخی منابع کے لحاظ سے بھی انتہائی تہی دستی کا دور تھا چہ جائیکہ ''انساب الاشراف'' وغیرہ جیسے گمنام منابع کے لحاظ سے۔ صفوی دور کے دوسرے نصف میں ابومسلم کے بارے میں لکھے گئے چند رسالوں میں آج تک یہ تردد موجود ہے کہ آیا وہ ایک امامی شیعہ تھا یا عباسیوں کا مدافع! جب ایک مصنف نے چاہا کہ اسے عباسیوں کا مدافع قرار دے تو اس کے پاس صرف مروج الذہب تھی اور اس نے اس کے بارے میں ایسے تحریر کیا ہے جیسے اس نے کوئی گوہر نایاب دریافت کر لیا ہو۔(۱)

اس دور میں ائمہؑ کی سیرت اور روایات کے حوالے سے بکثرت فارسی اور عربی کتابیں لکھی گئی ہیں' لیکن اُن میں سے کوئی بھی اپنی وسعت اور ترتیب کے اعتبار سے علامہ مجلسی کی بحار الانوار کی برابری نہیں کر سکتی۔ بحار الانوار کی گیارہویں سے چودھویں جلد قصص انبیاء پر مشتمل ہے' جس کے ضمن میں اہم ترین شیعہ مصادر میں جو کچھ تحریر ہے' نیز قرآنی آیات اور ان کی تفسیر اور گاہ ان کی اپنی توضیحات سمیت تمام ضروری باتیں اس میں شامل ہیں۔ پندرہویں سے بائیسویں جلد تک آٹھ جلدیں ایک حد تک تفصیلی طور پر سیرتِ نبویؐ پر مشتمل ہیں۔ علامہ مجلسی کی تقسیم بندی کا انداز نسبتاً قابلِ توجہ ہے اور دوسرے تمام حصوں کی طرح اسے بھی انتہائی احتیاط کے ساتھ انجام دیا گیا ہے۔

پندرہویں جلد کا آغاز رسول اللہؐ کے اجداد سے ہوا ہے' اور آنحضرت کی جوانی کے ذکر تک چلا ہے۔

سولہویں جلد میں جناب خدیجہؓ کے ساتھ عقد سے لے کر آنحضرتؐ سے متعلق تمام ذاتی مسائل جیسے آپ کا اخلاق اور سنن شامل ہیں۔

سترہویں جلد کا ایک حصہ نبیؐ کی عصمت اور سہو سے متعلق ہے اور ساتھ ساتھ آپ کے معجزات کا تذکرہ ہے۔

اٹھارویں جلد کا ابتدائی حصہ رسولِ کریمؐ کے معجزات' اور اس کے بعد بعثت اور آخر میں واقعہ معراج پر مشتمل ہے۔

انیسویں جلد میں زمانہ بعثت کے واقعات سے لے کر غزوۂ بدر تک شامل ہے۔

بیسویں جلد صلح حدیبیہ تک کے غزواتِ رسولؐ اور بادشاہوں اور والیوں کو آپ کی مراسلہ نگاری پر مشتمل ہے۔

اکیسویں جلد میں حجۃ الوداع تک کی خبریں ہیں۔

بائیسویں جلد میں رسول اللہؐ کے اقربا' خصوصاً ازواجِ رسولؐ اور آپ کے بعض اصحاب اور خواص سے متعلق باتیں ہیں اور آخر میں آنحضرت کی وفات سے متعلق اخبار شامل ہیں۔

۱۔ دیکھئے: میراث اسلامی ایران (از انتشارات کتابخانہ آیت اللہ مرعشی) دفتر دوم نسہ رسالہ در بارۂ ابومسلم وابومسلم سہ ھا

تیئیسویں جلد سے لے کر ستائیسویں جلد تک کو امامت کی بحث کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ اٹھائیسویں سے اکتیسویں جلد تک خلفا کی تاریخ ہے' جو حال ہی میں طبع ہوئی ہے۔ بتیسویں سے ترپنویں جلد ائمہؑ کی سیرت اور تاریخ سے مخصوص ہے' ان جلدوں میں بعض ائمہؑ کے لیے کئی جلدیں اور بعض کے لیے صرف ایک جلد مخصوص کی گئی ہے۔ علامہ مجلسی نے ان بعض شیعی کتب (جیسے شیخ مفید کی الجمل) کو چھوڑ کر جو انہیں نہیں ملیں' اس حوالے سے جو کچھ شیعی آثار میں تھا اسے اپنی کتاب میں جمع کر دیا۔ کتاب ''عوالم العلوم'' کی صورت میں علامہ مجلسی کے کام ہی جیسا ایک کام خود ان ہی کے زمانے میں انجام دیا گیا' اس میں مختلف موضوعات پر شیعی آثار کو یکجا کیا گیا ہے' ائمہؑ کے بارے میں اس کتاب کی کچھ جلدیں موسسۃ الامام المہدیؑ کی جانب سے شائع ہو چکی ہیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ علامہ مجلسی نے چہاردہ معصومینؑ کی تاریخ کے بارے میں فارسی زبان میں کتاب ''جلاء العیون'' تحریر فرمائی' جو ان چند صدیوں میں سیرت معصومینؑ پر رائج ترین فارسی کتاب رہی ہے۔

مسئلۂ امامت اور ائمہؑ کی زندگی کے بارے میں بعض روایات کے بیان پر مشتمل شیخ حر عاملی کی کتاب ''اثبات الهداة'' اپنے انداز کی ایک جامع اور کم نظیر کتاب ہے۔ سید ہاشم بحرانی (م: ۱۱۰۷یا۱۱۰۹ ہجری) نے ''مدینۃ المعاجز'' میں معجزات پر مشتمل روایات کو جمع کر دیا ہے۔ یہ کتاب حال ہی میں آٹھ جلدوں کی صورت میں شائع ہوئی ہے۔

اس دور میں مناقب' امامت اور تاریخ ائمہؑ پر جو کتب لکھی گئیں' وہ ناقابلِ شمار ہیں اور ان کا تقریباً بڑا حصہ کسی علمی قدر و قیمت کا حامل نہیں۔ یہ صورتحال صفوی اور قاچاری دور میں یکساں تھی اور قاچاری دور میں ایران کے خارجی تعلقات بہتر ہونے' خصوصاً حج اور مقدس مقامات پر آمد و رفت کے باوجود ایران میں کتابخانوں کو فروغ حاصل نہیں ہوا اور اسی وجہ سے اس دوران کوئی نمایاں اور تازہ کام نظر نہیں آتا۔

قابلِ ذکر بات ہے کہ قاچاری دور میں نہ صرف علمائے دین' بلکہ حکومتی عہدیداروں نے بھی تاریخ اسلام اور خصوصاً مقتل نویسی کا کام کیا' اس کی مثال بدائع نگار کی ''فیض الدموع'' ہے' جو عمدہ نثر میں لکھی گئی ہے اور حال ہی میں میراث مکتوب کی جانب سے شائع کی گئی ہے' اور دوسری مثال عباس میرزا کا فرزند فرہاد میرزا معتمد دولہ ہے' جو کئی سال تک فارس اور اس کے اطراف کا حاکم رہا۔ اس نے مقتلِ امام حسینؑ میں ''قمقام زخار و صمصام بتار'' لکھی' جو کئی بار شائع ہو چکی ہے۔ (۱) اس دور کا عظیم تاریخی مجموعہ محمد تقی سپہر کی ''ناسخ التواریخ'' ہے' جس کے قاچاری دور کے حصے کے علاوہ فی الحال کوئی تاریخی اہمیت نہیں ہے اور در حقیقت یہ ناسخ التواریخ نہیں بلکہ منسوخ التواریخ ہے۔

۱۔ استوری۔ ص ۸۶۵

صفوی اور قاچاری دور میں مقتل نویسی

گزشتہ چند صدیوں میں شیعوں کے درمیان تاریخ نویسی کا اہم حصہ مقتل نویسی ہے۔ صفوی حکومت سے پہلے ایران کے مشرقی حصے میں امام حسین علیہ السلام کی عزاداری کا اہمیت اختیار کر لینا بالکل واضح نظر آتا ہے۔ کاشفی نے "روضۃ الشہداء" کو ہرات اور خراسان کے لیے لکھا تھا' اور وہ بھی اس دور میں جبکہ صفوی حکومت کو ان علاقوں میں کوئی اقتدار حاصل نہ تھا' اور وہ تازہ تازہ ایران کے مغربی حصے میں وجود میں آئی تھی۔ صفوی حکومت کے آنے سے عاشورا کی رسومات میں شدت پیدا ہوئی اور اس بارے میں نئی نئی کتابیں لکھی گئیں۔ یہ صورت روز افزوں رہی اور قاچاری دور کے اختتام تک پوری قوت کے ساتھ جاری رہی اور ہر سال نظم یا نثر میں اس بارے میں ایک یا کئی کتابوں کا اضافہ ہوتا گیا۔

بدقسمتی سے اس دور میں تاریخی گہرائی موجود نہ تھی' اور جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے' دقیق منابع (sources) سے استفادہ نہیں کیا گیا۔ اس دور کی مقتل نویسی میں جو نقطۂ نظر کارفرما نظر آتا ہے' وہ یہ ہے کہ اس سارے واقعے کو زیادہ ترغم و اندوہ اور ابتلا و مصیبت کے زاویے سے دیکھا گیا ہے' اور کوشش کی گئی ہے کہ تاریخی متن کی بجائے مجلسِ عزا میں پڑھنے کے لیے حزن آور متن تحریر کیا جائے۔ ان میں سے اکثر کتب عزاداری کی مجالس کے لیے تالیف کی گئیں اور ان کا مقصد گریہ و زاری کے لیے ماحول پیدا کرنا تھا۔ ہم ذیل میں اُن کتابوں کے نمونے نقل کر رہے ہیں جو صفوی دور اور اس کے بعد تالیف ہوئیں اور ان میں سے زیادہ تر کا تعلق قاچاری دور سے ہے:

. ابتلاء الاولیاء (استوری' ۹۹۳)' ازالۃ الاوھام فی البکاء (ذریعہ ۱۱/۶۱)' اکسیر العبادۃ فی اسرار الشہادۃ از ملا آقا دربندی (استوری' ۹۸۶)' امواج البکاء (استوری' ۹۷۹' مرعشی' ۱۶۵۷)' بحر البکاء فی مصائب المعصومین (ذریعہ ۲۶/۸۴)' بحر الحزن (استوری' ۹۹۰)' بحر الدموع (مرعشی' ۲۵۹۲)' بحر غم (استوری' ۹۶۳)' بستانِ ماتم (استوری' ۱۰۰۱)' بکاء العین (مرعشی' ۶۵۸۲)' بلاء و ابتلاء در روید اد کربلا (استوری' ۹۶۰)' بیت الاحزان (استوری' ۹۷۶)' خلاصۃ المصائب (استوری' ۱۰۱۷)' داستانِ غم (استوری' ۹۶۳' مرعشی ۲۹۱۶)' دمع العین علی خصائص الحسینؑ (استوری' ۹۹۵)' الدمعۃ الساکبۃ فی المصیبۃ الراتبۃ (الذریعہ ۸/۲۶۴)' ریاض البکاء (ذریعہ ۱/۶)' روضۂ حسینیہ (استوری' ۹۵۱' مرعشی' ۶۲۴۴' ۶۵۴۵)' روضۃ الخواص (مرعشی' ۳۰۰۱)' روضۃ الشہداء یزدی (مرعشی' ۱۵۶)' ریاض الاحزان (استوری' ۹۷۴)' ریاض الاحزان (فہرست مسجد اعظم' ص ۲۱۵)' ریاض الشہادۃ فی ذکر مصائب السادۃ (استوری' ۹۵۸)' سر الاسرار فی مصیبۃ ابی الائمۃ الاطہارؑ (استوری' ۹۹۶)' طریق البکاء (ذریعہ ۱۵/۱۶۴)' طوفان البکاء (استوری' ۹۶۷)' عمان البکاء (استوری' ۹۸۴)' عین البکاء (استوری' ۹۴۱)' عین الدموع (مرعشی' ۴۴۰)' فیض الدموع (استوری' ۹۸۸)' قبسات الاحزان

(استوری، ۹۸۹)، کنز الباکین (استوری، ۹۶۹)، کنز الباکین (مرعشی، ۴۵۵۰)، کنز المحن (استوری، ۹۹۱)، کنز المصائب (استوری، ۹۶۹، ۹۸۷)، لب عین البکاء (استوری، ۹۴۳)، لسان الذاکرین (استوری، ۹۷۰)، ماتم کدہ (استوری، ۹۶۳، ۹۷۵)، مبکی العیون (مرعشی، ۵۰۰۲)، مجالس المفجعۃ (استوری، ۹۳۵)، مجری البکاء (ذریعہ۲/۳۰)، مجمع المصائب فی نوائب الاطائب (مرعشی، ۳۳۶۹، ۵۴۴۵، ۶۶۴۳)، مجمع المصائب مازندرانی (مرعشی، ۶۵۷۲)، محرق القلوب (استوری، ۹۴۳)، محیط العزاء (استوری ۹۳۵)، مخازن الاحزان فی مصائب سید شباب اہل الجنان، مخزن البکاء (مرعشی، ۱۶۴۵، استوری، ۹۶۹)، معدن البکاء فی مقتل سید الشہداء (مرعشی، ۳۰۱۷)، مفتاح البکاء فی مصیبۃ خامس آل عبا (مرعشی، ۲۳۶۳)، مفتاح البکاء (کتابخانہ مطہری، ۵/۹۲۱)، مناحل البکاء (مرعشی، ۳۳۵۵)، منبع البکاء (ذریعہ ۲۲/۳۵۸)، مہیج الاحزان (استوری، ۹۵۹)، نجات العاصین (استوری، ۱۰۰۰)، نور العین فی جواز البکاء (ذریعہ ۲۴/۳۷۲)، وسیلۃ البکاء (مرعشی، ۵۵۰۰)، وسیلۃ النجاۃ (استوری، ۹۶۱)، ینبوع الدموع (مرعشی، ۳۰۸۳)، ہم و غم فی شہر المحرم، ملا حسین بن علی حسن (مرعشی، ۵۶۲۷)، نوحۃ الاحزان وصیحۃ الاشجان، محمد یوسف دھخوارقانی (مرعشی، ۱۷۳۱)، ابصار الابکار لانتصار سید الابرار (مجلس، ۱۲/۹)، ریاض الکونین فی مصائب الحسینؑ (کتاب خانہ شہید مطہری، ف ۵/۷۷)

ان کتابوں کے ناموں پر غور سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ ان میں چند کلیدی مفہوم پائے جاتے ہیں، جو بکاء، حزن، ابتلاء، اشک اور مصائب ہیں۔ اس دور میں کربلا کو زیادہ تر انہی مفاہیم کے زاویے سے دیکھا جاتا تھا اور جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے، اس میں بہت کم تاریخی زاویۂ نگاہ مدنظر ہوتا تھا۔

ان آثار میں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ امام حسین علیہ السلام کے اصحاب کو ناقابلِ شکست سمجھنے کی بنا پر دشمن کے مقتولوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ کیا گیا۔ اس حوالے سے ملا آقا دربندی کی "اسرار الشہادۃ" اور ملا حبیب اللہ کاشانی کی "تذکرۃ الشہداء" تک میں ایسی ہوشربا تعداد بیان کی گئی ہے جسے کسی تاریخی معیار سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اس قسم کی کتابیں حقیقت سے اتنا دور تھیں کہ میرزا حسین نوری، جو خود ایک اخباری عالم تھے، اور جنہوں نے اپنی مستدرک الوسائل میں بڑی تعداد میں ضعیف راویوں کی روایات کو جمع کیا ہے، انہیں بھی ان کتابوں کی مخالفت پر مجبور کیا اور انہوں نے کتاب "لولو و مرجان" (۱) لکھ کر اس قسم کے مقتل نویسوں اور ایسے مقتل پڑھ کر رلانے والوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا۔

جدید دور میں تاریخ نویسی میں تغیر

پورے قاجاری دور میں، حتیٰ اس کے مدتوں بعد بھی صدرِ اسلام سے تعلق رکھنے والی تاریخی کتب کی تالیف اسی قدیم

۱۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ "آدابِ اہلِ منبر" کے نام سے دستیاب ہے۔ (س ح ز)

انداز سے جاری رہی۔ اس اعتبار سے تاریخ' اکثر اپنی مذہبی رسوم و آداب کی حفاظت کے سلسلے میں عوام کی خواہشات پورا کرنے کا ایک ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ معاشرے میں مذہبی آداب ورسوم کی قوت وطاقت' اور مذہبی مورخین کی جانب سے ان کی تائید کی عوامی ضرورت کی وجہ سے تنقید اور تبصرے کا دروازہ بھی بند ہو چکا تھا۔ علاوہ ازایں' تاریخ ائمہؑ کو مقدس ماننے کی وجہ سے' اس کا تاریخ اسلام کے دوسرے ادوار کی نسبت تجزیہ وتحلیل بھی نہیں ہوتا تھا۔ مزید یہ کہ جس طرح دوسرے دینی موضوعات کو عالمانہ بحث ومباحثے کے قابل سمجھا جاتا تھا' اس طرح تاریخ کو نہیں دیکھا جاتا تھا۔ تاریخ وعظ ونصیحت کا ذریعہ تھی اور صرف کتابوں کو پڑھ کر اسے قابلِ حصول سمجھ لیا جاتا تھا' لہٰذا مدارسِ علمیہ میں اس مضمون کو ایک علمی شعبے کی حیثیت نہیں دی جاتی تھی' بلکہ اس پر گفتگو بنیادی طور پر اہلِ منبر کا کام تھی جنہیں ہمیشہ اسلامی علوم کے ماہرین سے کئی درجے پست تر سمجھا جاتا تھا۔

علمِ تاریخ پر گزشتہ چند عشروں سے زیادہ توجہ دی جارہی ہے۔ (۱) شاید اس کی اہم ترین وجوہات یہ ہوں کہ:

پہلی یہ کہ ایران کی سیاسی تبدیلیوں میں علما کی شرکت کی وجہ سے تاریخ کے تجزیے وتحلیل کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی' اور اس صورتحال نے انہیں مجبور کیا کہ وہ تاریخ اسلام پر سنجیدگی اختیار کریں۔

دوسری یہ کہ عرب ممالک خصوصاً مصر' شام اور عراق سے ایران میں آنے والی کتب اس بات کا سبب بنیں کہ شیعہ حلقے علومِ اسلامی کے درمیان تاریخ کی اہمیت محسوس کریں۔ دراصل علمِ تاریخ پر ایک نقلی علم کے عنوان سے اہلِ سنت کے یہاں بہت زیادہ توجہ دی جاتی تھی' کیونکہ وہ نقل کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتب اہلِ سنت کے علاقوں میں منظرِ عام پر آئیں اور بعد میں ان کا رُخ ایران کی طرف بھی ہوا۔

ایک اور وجہ روشن فکر افراد کی جانب سے ایسے مسائل پر روز بروز بڑھتی ہوئی تنقید تھی' جن میں سے بعض کا تعلق تاریخ اسلام سے تھا۔ اس کی مثال اسلام اور تشیع کے بارے میں کسروی کی تحریریں ہیں' جن کے جواب دینے کے لیے علما کے

۱۔ گزشتہ چند برسوں میں تاریخ اسلام کا درس ایک ثانوی حیثیت کے درس کے عنوان سے حوزوی دروس کے ساتھ حوزے کے درسی پروگرام میں شامل کرلیا گیا ہے۔ علاوہ ازایں پہلی مرتبہ ''مرکز آموزشی امام خمینیؒ'' میں راقم الحروف کی کوششوں سے گروہِ تاریخ کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اس کے بعد ''دفتر ہمکاری حوزہ ودانشگاہ'' نے بھی تاریخ کے شعبے میں اپنے تعلیمی کام کا آغاز کردیا ہے۔ مزید یہ کہ ''مرکز تحقیقات کمپیوٹری علوم اسلامی'' میں بھی تاریخ اسلام کے متون کو کمپیوٹرائزڈ کرنے کا کام شروع ہو چکا ہے اور اس سلسلے میں کچھ کام آگے بڑھا ہے۔ ان کاموں کے علاوہ بھی تاریخ کے حوالے سے تحقیقاتی مراکز کو شیعی متون پر' جن کا ایک حصہ تاریخ پر مشتمل ہے اور قم کے بعض تحقیقاتی اداروں کو تاریخ کے حوالے سے مزید تحقیقاتی کام کرنے چاہئیں۔ اس قسم کے کام مرکز تحقیقات وابستہ بہ دفتر تبلیغات اسلامی' بنیاد معارف اسلامی' موسسۂ آل البیتؑ (بالخصوص موثر جریدے تراثنا) جیسے اداروں میں جاری ہیں۔

درمیان تاریخ کے مطالعے کی ایک لہر اٹھی۔ ایک اور مثال ''بیست و سہ سال'' نامی فارسی کتاب ہے، جس نے سیرت رسولؐ کے بارے میں زیادہ سنجیدگی سے تحقیق کے لیے زمین کو ہموار کیا۔

اہل مغرب اور مارکسسٹوں کی تاریخ نویسی کے انداز کی تاثیر بھی اس لحاظ سے قابل غور ہے کہ اس کی وجہ سے ہمارے یہاں تاریخ کی طرف دوبارہ توجہ کی جانے لگی۔ اس مسئلے پر بالخصوص شیعہ تاریخ کے انقلابی گوشے کے تجزیے وتحلیل پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ شیعوں کے یہاں واضح ترین تاریخی مسئلہ تاریخِ کربلا ہے، جس کا کسی نہ کسی طور ہر سال تذکرہ ہوتا تھا۔ شیعہ معاشرے میں اس واقعے کی اہمیت اور اس کے حساس سیاسی کردار کی وجہ سے اس پر ہر دوسرے دور سے زیادہ توجہ دی گئی ہے اور اس حوالے سے بہت سی کتب منظرِ عام پر آئی ہیں۔

چہاردہ معصومینؑ کے بارے میں بعض نئی کتب

اس موقع پر ہم ان دوستوں کی رہنمائی کے لیے، جو مجموعی طور پر چہاردہ معصومینؑ کی تاریخ زندگی سے متعلق نئی کتب کے متعلق جاننا چاہتے ہیں، ان کتب پر ایک سرسری نگاہ ڈالیں گے۔ البتہ یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ ان کتابوں کا تجزیہ وتحلیل اور ان کی روشِ تالیف اور تاریخی مسائل کے تجزیے وتحلیل میں ان کے مختلف انداز ایک جداگانہ مسئلہ ہے، جس پر علیحدہ سے گفتگو کی ضرورت ہے۔ ہم سے بارہا یہ سوال کیا جاتا ہے کہ چہاردہ معصومینؑ کے حالاتِ زندگی کے بارے میں مناسب کتابیں کونسی ہیں؟ لہٰذا اس حوالے سے ہم فارسی اور عربی زبان میں لکھی جانے والی کچھ منتخب کتابوں کا تذکرہ کریں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کے بارے میں پہلا علمی اور انقلابی کام جلال الدین فارسی کی ''انقلابِ تکاملیٔ اسلام'' نامی گرانقدر کتاب ہے، جو آج بھی مطالعے کے لائق اور قابلِ استفادہ ہے۔ انہوں نے اسلامی انقلاب کے بعد تین کتابیں ''پیامبری وانقلاب'' ''پیامبری وجہاد'' اور ''پیامبری وحکومت'' تحریر کیں، جو سیرتِ نبیؐ پر ایک موضوعی مجموعہ ہیں۔ ایک اور گرانقدر کتاب، مرحوم محمد ابراہیم آیتی کی ''تاریخِ پیامبر اسلامؐ'' ہے، جو ڈاکٹر ابوالقاسم گرجی کے اضافوں کے ساتھ کئی بار طبع ہو چکی ہے۔ اس کی اہم خصوصیت تجزیے وتحلیل کے بغیر صرف متن کو نقل کر دینا ہے۔ ایک اور کام استاد جعفر سبحانی کی کتاب ''فروغِ ابدیت'' ہے۔ یہ ایک تجزیاتی کتاب ہے، جو کئی بار شائع ہو کر شائقین کی خدمت میں پیش کی جا چکی ہے۔(۱) ڈاکٹر محمود رامیار کی کتاب ''در آستانہ سالزاد پیامبر'' ہے، جو ظہورِ اسلام کے وقت جزیرہ نمائے عرب کے حالات کی ایک رپورٹ ہے۔ شہید بہشتی کی کتاب ''محیطِ پیدائشِ اسلام'' بھی اسی حوالے سے ہے۔ مصطفی طباطبائی حسینی کی کتاب

۱۔ یہ کتاب اسی نام سے اردو زبان میں شائع ہو چکی ہے۔ (س ح ز)

''خیانت در گزارشِ تاریخ'' جو تین جلدوں پر مشتمل ہے ''بیست و سہ سال'' نامی کتاب پر تنقیدی کتاب ہے۔ فضل اللہ کمپانی کی کتاب ''رحمت عالمیان'' نیز سید ہاشم رسولی محلاتی کی کتاب ''زندگانی حضرت محمد خاتم النبیین'' سیرت رسولؐ سے شناسائی کے لیے دو کتابیں ہیں۔ ''محمد خاتم پیامبران'' بیان مقالات کا مجموعہ ہے جو حسینیہ ارشاد نے سیرت نبویؐ کے بارے میں تیار کیے اور ان کے اہم لکھنے والے ملک کے ممتاز علما اور دانشور تھے۔ استاد مرتضیٰ مطہری کی کتاب ''سیری در سیرۂ نبوی'' ایک مختصر لیکن سیرت رسولؐ پر ایک قابل مطالعہ اور نئے انداز کی کتاب ہے(۱)۔ اسی عنوان ''سیرۂ نبوی'' کے تحت استاد مصطفیٰ دلشاد کی ایک کتاب ہے، جس کی اب تک تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں، جس میں تفصیل کے ساتھ سیرت نبویؐ پر استاد کے مخصوص شیوۂ تحلیل کی اتباع کی گئی ہے۔ عربی کتب میں ہاشم معروف حسنی کی ''سیرۃ المصطفیٰ'' مطالعے کے لائق ایک کتاب ہے۔(۲) محمد حسین مظفر کی کتاب ''کارنامۂ سیاسی، اجتماعی، اخلاقی محمدؐ'' جسے مصطفیٰ زمانی نے فارسی میں ترجمہ کیا ہے، سیرت نبویؐ پر ایک سرسری نگاہ ڈالتی ہے۔ ایک گرانقدر کتاب استاد سید جعفر مرتضیٰ عاملی کی ''الصحیح من سیرۃ النبی الاعظم'' ہے جس میں ہر پہلو سے سیرت نبویؐ سے حاصل کیے جانے والے نتائج پر تنقید کی گئی ہے۔ اس کتاب کی نئی طباعت دس جلدوں میں ہوئی ہے اور اس میں ہجرت کے چھٹے سال تک کے حالات شامل ہیں۔ اس کتاب میں سیرت پر موجود تاریخی روایات پر تنقید کرتے ہوئے بہت سے تازہ نکات سامنے لائے گئے ہیں۔ شیخ محمد ہادی یوسفی کی ''موسوعۃ التاریخ الاسلامی'' جس کی پہلی جلد شائع ہو چکی ہے، شیعہ روایات پر مبنی سیرت کی کتاب ہے اور اس اعتبار سے دوسری کتابوں سے ممتاز ہے۔ راقم کی کتاب ''تاریخِ سیاسی اسلام'' جس کی پہلی جلد سیرت نبویؐ کے بارے میں ہے، سیرت نبویؐ کے جائزے کی ایک عمومی کوشش ہے۔

چہاردہ معصومینؑ یا دوازدہ ائمہؑ کے حالات زندگی پر کئی مجموعے تحریر کیے گئے ہیں۔ جن میں سے ہم کچھ کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ شاید قابل توجہ ترین مجموعہ استاد باقر شریف قرشی کا مجموعہ ہو۔ اس مجموعے میں ہر امامؑ پر ایک یا دو جلدیں ''حیاۃ الامام...'' کے نام سے مخصوص کی گئی ہیں۔ میری معلومات کے مطابق اب تک حضرت علیؑ کے حالات زندگی کے سوا تمام ائمہؑ کے حالات زندگی شائع ہو چکے ہیں اور ان میں سے بیشتر فارسی زبان میں بھی طبع ہوئے ہیں۔ آیت اللہ میلانی کا مجموعہ ''قادتنا'' حیات ائمہ کا ایک جائزہ ہے۔ سید محسن امین کی کتاب سیرۂ معصومینؑ جسے دراصل ان کی تالیف ''اعیان الشیعہ'' سے لیا گیا ہے اور جس کا ترجمہ استاد علی حجتی کرمانی نے کیا ہے، اس حوالے سے یہ ایک مستحکم کتاب ہے۔ ہاشم معروف

۱۔ یہ کتاب ''سیرت نبوی، ایک مطالعہ'' کے نام سے اردو زبان میں شائع ہو چکی ہے۔ (س ح ز)

۲۔ یہ کتاب اسی نام سے اردو زبان میں شائع ہو چکی ہے۔ (س ح ز)

حسنی کی کتاب "سیرۃ الائمۃ الاثنی عشر" جو بارہ اماموں کے حالاتِ زندگی کا ایک جائزہ ہے‘ اور جسے "زندگی دوازدہ امام" کے نام سے محمد رخشندہ نے فارسی میں ترجمہ کیا ہے‘ ائمۂ اثنا عشر کی زندگی کا ایک عمومی جائزہ ہے۔(۱) علی دخیل کی کتاب "ائمتنا" میں اختصار کے ساتھ بارہ اماموں کی زندگی کا جائزہ لیا گیا ہے۔(۲) استاد مرتضیٰ مطہری کی "سیری در سیرۂ ائمۂ اطہار" بعض ائمہ کی زندگی کے تحلیلی نکات پر مشتمل ہے(۳)۔ آقائے مہدی پیشوائی کی "سیرۂ پیشوایان" بارہ اماموں کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہے۔ علامہ مرتضیٰ عسکری کی "نقش ائمہ در احیاء دین" فکری انحرافات کے مقابلے میں ائمہ کے فکری موقف کے بارے میں ایک تحلیلی کتاب ہے۔(۴) عربی زبان میں لکھی گئی کتاب "موسوعۃ المصطفیٰ والعترۃ" کے مؤلف آقائے حسین شاکری نے تفصیل کے ساتھ چہاردہ معصومینؑ کے حالاتِ زندگی کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ استاد عزیز اللہ عطاردی نے بھی "مسند الامام۔۔" کے نام سے ایک مجموعہ پیش کیا ہے‘ جس میں ہر امامؑ پر ایک یا دو جلدیں تحریر کی ہیں۔ انہوں نے شیعہ اور سنی کتابوں سے کسی امام کی روایات یا ان کے بارے میں آنے والی روایات کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب تک اس کی کئی جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ مجمع اہلِ بیتؑ کی جانب سے شائع ہونے والی کتاب "سیرۃ رسول اللہ و اھل بیتہ" چہاردہ معصومینؑ کے حالاتِ زندگی پر مشتمل کتاب ہے۔ کتاب "حیاتِ فکری وسیاسی امامانِ شیعہ" جسے دوبارہ نئے سرے سے تحریر کر کے پیش کیا گیا ہے‘ اس سے پہلے بھی شائع ہو چکی ہے‘ اور عربی زبان میں "الحیاۃ الفکریۃ و السیاسیۃ لائمۃ اھل البیتؑ" کے نام سے چھپ چکی ہے۔(۵)

خاص امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے حالاتِ زندگی پر بھی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ سید ہاشم رسولی محلاتی کی کتاب "زندگانی امیر المومنین" اس موضوع پر ایک تفصیلی کتاب ہے۔ پانچ جلدوں پر مشتمل مرحوم احمد مطہری کی کتاب "طرحہای رسالت" میں رسولِ خداؐ کی رحلت کے بعد سے امیر المومنینؑ کی شہادت تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ سید ابراہیم حسینی سعیدی کی تین جلدوں پر مشتمل کتاب "علی آئینۂ حق نما" حضرت علیؑ کی زندگی کے بارے میں ایک عمومی شرح ہے۔ احمد رحمانی ہمدانی کی کتاب "الامام علیؑ" عربی زبان میں ہے جو تحقیق کے ساتھ لکھی گئی کتاب ہے۔ "پژوهشی پیرامون زندگی علیؑ" استاد جعفر سبحانی کی تحریر ہے۔ محمد کاظم قزوینی کی تصنیف اور علی کاظمی کا ترجمہ

۱۔ یہ کتاب اردو زبان میں "سیرتِ ائمۂ اہل بیتؑ" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ (س ح ز)

۲۔ یہ کتاب بھی ہر امام کے بارے میں علیحدہ علیحدہ اردو زبان میں شائع ہو چکی ہے۔ (س ح ز)

۳۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے۔ (س ح ز)

۴۔ یہ کتاب اردو زبان میں "احیائے دین میں ائمۂ اہل بیت کا کردار" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ (س ح ز)

۵۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ (س ح ز)

''علیؑ از ولادت تا شہادت'' محمد صادق صدر کی کتاب ''حیاۃ امیر المومنین'' استاد مرتضیٰ مطہری کی جاذبہ و دافعہ علیؑ (۱) اصغر قائدان کی ''سیاستِ نظامی امام علیؑ'' ان بے شمار کتابوں میں شامل ہیں جو آپ کی زندگی کے بارے میں لکھی گئی ہیں۔ آقائے حسین شاکری نے ''علیٌ فی الکتاب و السنۃ'' نامی تین جلدی مجموعے میں امامؑ کی زندگی اور ان کے فضائل سے تعلق رکھنے والے متون (text) کو یکجا کیا ہے۔

حضرت فاطمۃ الزہرا علیہا السلام کے حالاتِ زندگی پر بھی بکثرت کتابیں لکھی گئی ہیں اور ان کی زندگی کا کتابنامہ بھی مرتب کیا جا چکا ہے۔ آپ کی زندگی کے بارے میں بعض کتابیں یہ ہیں: استاد ابراہیم امینی کی ''بانوئ نمونۂ اسلام'' (۲) سید عبدالرسول شریعتمدار جہرمی کی کتاب ''نخبۃ البیان'' مسعود پور سید آقائی کی ''زہرا و زمان شناسی'' ''چشمہ در بستر'' احمد رحمانی ہمدانی کی ''فاطمۃ الزھراءُ بھجۃ قلب المصطفیٰ'' محمد کاظم قزوینی کی ''فاطمۃ الزھراءُ من المھد الی اللحد'' توفیق ابوعلم کی تصنیف اور علی اکبر صادقی کا ترجمہ ''فاطمہ زہراؑ'' عزیز اللہ عطاردی کی ''مسند فاطمۃ الزہراؑ'' مہدی جعفری کی ''مسند فاطمہؑ'' علی اکبر بابازادہ کی ''تحلیل سیرۂ فاطمۃ الزہراؑ''۔

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی زندگی کے بارے میں استاد حسن مصطفوی نے کتاب ''الامام المجتبیٰ'' میں دستیاب منابع سے آپ کی زندگی کے بارے میں درج روایات جمع کر کے انہیں مرتب کیا ہے''۔ ''صلح الحسنؑ'' شیخ راضی آل یاسین کی گرانقدر کتاب ہے جسے آیت اللہ خامنہ ای نے ''صلحِ امام حسنؑ'' کے نام سے ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔ محمد جواد فضل اللہ کی ''صلح الامام الحسنؑ'' عربی زبان میں ایک مفید اور پڑھنے کے لائق کتاب ہے۔ مرحوم احمد مطہری کی ''زمامداری امام مجتبیٰؑ''، فضل اللہ کمپانی کی ''حسن کیست'' احمد زمانی کی ''حقائق پنہان'' علی اکبر قرشی کی ''شخصیت امام مجتبیٰؑ'' یہ سب کی سب اس حوالے سے مفید کتابیں ہیں۔ جعفر مرتضیٰ عاملی کی کتاب ''الحیاۃ السیاسیۃ للامام الحسنؑ'' میں صرف خلفا کے دور میں امام حسنؑ کی زندگی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ آقائے عطاردی کی ''مسند الامام المجتبیٰؑ'' امام حسنؑ کے بارے میں ان اکثر روایات پر مشتمل ہے جو شیعہ اور سنی منابع (sources) میں آئی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر امامؑ سے زیادہ امام حسین علیہ السلام کی زندگی کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ ہم نے اس سے پہلے کی گئی گفتگوؤں میں ان میں سے کچھ کتابوں کی جانب اشارہ کیا تھا' اب یہاں چند نئی کتابوں کا تعارف کرائیں گے۔ مقتل نویسی کے حوالے سے عبدالرزاق مقرم کی ''مقتل الحسینؑ'' بہترین اور لازوال کتابوں میں سے ہے۔ شیخ عباس قمی

۱۔ یہ کتاب اردو زبان میں اسی نام سے شائع ہو چکی ہے۔ (س ح ز)

۲۔ یہ کتاب اردو میں ''فاطمۃ الزہراؑ اسلام کی مثالی خاتون'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ (س ح ز)

کی کتاب "نفس المہموم" بھی ایک محققانہ اور منابع پر مبنی ایک کوشش ہے جسے مرحوم شعرانی نے فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ دو جلدوں پر مشتمل شیخ محمد باقر محمودی کی گرانقدر کتاب "عبرات المصطفین" امام حسینؑ اور تحریک عاشورا کے بارے میں اولین قدیم تاریخی اخبار پر مشتمل ہے۔ عمومی کتابوں میں محمد ابراہیم آیتی کی "بررسی تاریخ عاشورا" (۱) علی غفوری کی "گوشہ ای از سرگزشت وشہادت امام حسینؑ" حسین شیخ الاسلامی کی "سالار شہیدان" ابوالقاسم سحاب کی "زندگانی خامس آل عبا ابی عبداللہ الحسین سید الشہدا" سید علی فرحی کی "نہضت حسینی" محمد جواد صاحبی کی "مقتل الشمس" احمد صابری ہمدانی کی "ادب الحسینؑ وحماستہ" اسد حیدر کی "مع الحسینؑ فی نہضتہ" اور علی نظری منفرد کی "قصہ کربلا" (۲) کا نام لیا جاسکتا ہے۔

تجزیہ وتحلیل کے اعتبار سے اولین کتاب صالحی نجف آبادی کی "شہید جاوید" تھی؛ جس پر شدید ردعمل کا اظہار کیا گیا تھا اور اس پر تنقید کرتے ہوئے کئی کتابیں لکھی گئی تھیں جن میں شیخ علی پناہ اشتہاردی کی "نُغت سالہ" اور آیت اللہ صافی گلپایگانی کی "شہید آگاہ" شامل ہیں۔ تجزیہ وتحلیل پر مبنی بعض دوسری کتابیں یہ ہیں: شہید عبدالکریم ہاشمی نژاد کی "درسی کہ از حسینؑ باید آموخت" آیت اللہ محمد یزدی کی "حسین ابن علیؑ را بہتر بشناسیم" (۳) سید جعفر شہیدی کی "بعد از پنجاہ سال" (۴) محمد رضا صالحی کرمانی کی "الفبائ فکری امام حسینؑ" (۵) محمد مہدی شمس الدین کی "پژوہشی پیرامون زندگی امام حسینؑ" جسے مہدی پیشوائی نے ترجمہ کیا ہے۔

امام حسین علیہ السلام کے کلمات کے حوالے سے محمد صادق نجمی کی "سخنان حسین ابن علیؑ" (۶) محمود شریفی کی تفصیلی کتاب "موسوعۃ کلمات الامام الحسینؑ" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جواد محدثی کی "فرہنگ عاشورا" انقلاب عاشورا کے بارے میں ایک مختصر انسائیکلو پیڈیا ہے۔ شیخ محمد سماوی کی "ابصار العین" کا ترجمہ "حماسہ سازان عاشورا" شہدائے کربلا کے حالات کے بارے میں ہے۔ (۷)

امام زین العابدین علیہ السلام کی زندگی کے بارے میں متعدد کتابیں دستیاب ہیں؛ مثلاً: بنیاد پژوہشہای اسلامی

۱۔ یہ کتاب "تاریخ عاشورا" کے نام سے اردو زبان میں شائع ہو چکی ہے۔ (س ح ز)

۲۔ یہ کتاب اردو زبان میں "صحیفۂ کربلا" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ (س ح ز)

۳۔ یہ کتاب اردو زبان میں "حسینؑ شناسی" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ (س ح ز)

۴۔ یہ کتاب اردو زبان میں "بنائے کربلا" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ (س ح ز)

۵۔ یہ کتاب اردو زبان میں "فکر حسینؑ کی الف ب" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ (س ح ز)

۶۔ یہ کتاب اردو زبان میں "حسین ابن علیؑ مدینہ تا کربلا" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ (س ح ز)

۷۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ "ابصار العین فی انصار الحسینؑ" کے نام سے ہو چکا ہے۔ (س ح ز)

کے گروہ تاریخ کی "امام سجادؑ جمال نیایشگران" ڈاکٹر سید جعفر شہیدی کی "زندگانی علی بن الحسینؑ" عبدالرزاق مقرم کی "الامام زین العابدینؑ" اور اس کا فارسی ترجمہ "زندگانی امام زین العابدینؑ" از حبیب روحانی محمود البغدادی کی "النظریۃ السیاسیۃ لدی الامام زین العابدینؑ" سید محمد رضا حسینی جلالی کی "جہاد الامام السجادؑ" اور باقر شریف قرشی کی "حیاۃ الامام السجادؑ" جس کا فارسی ترجمہ "تحلیلی از زندگانی امام سجادؑ" کے نام سے شائع ہوا ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام کے بارے میں سردست دو کتابیں ہیں: ایک باقر شریف قرشی کی "حیاۃ الامام الباقرؑ" اور دوسری بنیاد پژوہشھای اسلامی کے گروہ تاریخ کی کتاب "امام باقر جلوۂ امامت در افق دانش"۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کی زندگی کے بارے میں تفصیلی ترین کتاب اسد حیدر کی "الامام الصادقؑ والمذاہب الاربعہ" ہے۔(۱) محمد حسین مظفر کی "الامام الصادقؑ" فضل اللہ کمپانی کی کتاب "حضرت صادقؑ" محمد جواد فضل اللہ کی "الامام الصادقؑ" محمد کاظم قزوینی کی "موسوعۃ الامام الصادقؑ" جو چار جلدوں پر مشتمل ہے اسی بارے میں ہے۔ اہل سنت میں ابوزہرہ اور عبدالحلیم الجندی نے "الامام الصادقؑ" کے نام سے ایک ایک کتاب لکھی ہے۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے بارے میں تفصیلی ترین کتاب "تحلیلی از زندگانی امام کاظمؑ" دو جلدوں میں ہے جو باقر شریف قرشی کی کتاب "حیاۃ الامام الکاظمؑ" کا فارسی ترجمہ ہے۔ آقائے عطاردی کی "مسند الامام الکاظمؑ" ہے جس کی تین جلدوں میں متعدد منابع سے امام موسیٰ کاظمؑ کے بارے میں تفصیلی معلومات جمع کی گئی ہیں۔

امام رضا علیہ السلام کی زندگی کے بارے میں اہم ترین کتاب استاد سید جعفر مرتضیٰ عاملی کی "الحیاۃ السیاسیۃ للامام الرضاؑ" ہے جسے پرویز اتابکی نے "زندگانی سیاسی امام رضاؑ" کے نام سے فارسی میں ترجمہ کیا ہے اور اس کا خلاصہ اور ترجمہ خلیل خلیلیان نے "زندگانی سیاسی ہشتمین امامؑ" کے نام سے کیا ہے۔(۲) امام رضاؑ انٹرنیشنل کانفرنس میں پڑھے جانے والے مقالات "مجموعۂ مقالات کنگرۂ جہانی امام رضاؑ" کے نام سے تین جلدوں میں فارسی میں اور تین جلدوں میں عربی زبان میں شائع ہوئے ہیں جن میں امام رضاؑ کے بارے میں تازہ ترین تحقیقات شامل ہیں۔ اسی حوالے سے تالیف کی جانے والی ایک اچھی کتاب محمد جواد فضل اللہ کی "الامام الرضاؑ" ہے۔

امام محمد تقی جواد علیہ السلام کی زندگی کے بارے میں ایک مختصر کتاب سید جعفر مرتضیٰ عاملی کی "الحیاۃ السیاسیۃ للامام الجوادؑ" ہے جس کا فارسی ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس حوالے سے دوسری کتابیں یہ ہیں: محمد کاظم قزوینی کی "الامامؑ"

۱۔ یہ کتاب اردو زبان میں اسی نام سے ترجمہ ہو چکی ہے۔ (س ح ز)

۲۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ "امام رضاؑ کی سیاسی زندگی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ (س ح ز)

عبدالزہرا عثمان محمد کی "الامام محمد بن علی الجوادؑ" آقائے عطاردی کی "مسند الامام الجوادؑ" اور عبدالرزاق مقرم کی "وفاۃ الامام الجوادؑ" ہے جسے پرویز لولاور نے فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔

امام علی نقی ہادی علیہ السلام کی زندگی کے بارے میں باقر شریف قرشی کی "حیاۃ الامام الہادیؑ" ہے جس کا ترجمہ محمد رضا عطائی نے "تحلیلی از زندگانی امام ہادیؑ" کے نام سے فارسی میں کیا ہے۔ محمد رسول دریائی کی "امام ہادیؑ و نہضت علویان" نامی کتاب بھی اسی حوالے سے ہے۔ محمد رضا سیبویہ کی "الامام الہادیؑ" کتاب "منہاج التحرک عند الامام الہادیؑ اور علی رفیعی کی "دھمین خورشید امامت" اسی موضوع پر کچھ اور کتابیں ہیں۔

امام حسن عسکری علیہ السلام کے بارے میں محمد جواد طبسی کی "حیاۃ الامام العسکریؑ" تفصیلی ترین کتاب ہے۔ استاد باقر شریف قرشی کی "حیاۃ الامام العسکریؑ" جو "زندگانی امام حسن عسکریؑ کے نام سے فارسی میں ترجمہ ہوئی ہے۔ آقائے عطاردی نے "مسند الامام العسکریؑ" میں امام سے متعلق روایات کو جمع کیا گیا ہے۔

امام مہدی علیہ السلام کی زندگی کے بارے میں بے شمار کتابیں تالیف کی گئی ہیں جن کی فہرست آقائے علی اکبر مہدی پور نے "کتابنامہ حضرت مہدیؑ" میں فراہم کردی ہے۔ ان میں سے بعض کتابیں یہ ہیں: سید محسن امین کی "آشنائی با امام زمانؑ" جسے "اعیان الشیعہ" سے لے کر فارسی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ استاد ابو طالب تجلیل تبریزی کی "من ہو المہدیؑ" ناصر مکارم شیرازی کی "مہدیؑ انقلابی بزرگ" (۱) آیت اللہ صافی گلپائیگانی کی "منتخب الاثر" (۲) سید ہادی خسرو شاہی کی "مصلح جہانی و مہدیؑ موعود از دیدگاہ اہل سنت" محمد مہدی خلخالی کے زیرِ نظر تالیف ہونے والی کتاب "آخرین تحول" مصنفین کے ایک گروہ کی تالیف کردہ کتاب "نور مہدیؑ" داؤد الہامی کی "آخرین امید" استاد جاسم حسین کی "تاریخ سیاسی غیبت امام دوازدہم" آخری اماموں کی زندگی اور مسئلۂ غیبت کے بارے میں تجزیہ و تحلیل پر مبنی ایک گرانقدر کتاب ہے۔ اسی حوالے سے "تاریخ الغیبۃ الصغریٰ" بھی گرانقدر اور پڑھنے کے لائق کتاب ہے۔

☆☆☆

۱۔ یہ کتاب اردو زبان میں "بہار انقلاب" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ (س ح ز)

۲۔ یہ کتاب اردو زبان میں "جمال منتظر" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ (س ح ز)

امام علی علیہ السلام

امیر المومنین علیہ السلام کے بارے میں حسن بصری کا قول ہے کہ :

"اراھم السّبیل واقامَ لھم الّذین اذا اعوجّ ."

''انہوں نے لوگوں کو راستہ دکھایا اور جب دین راستے سے ہٹا تو اسے راہِ راست پر لائے۔''

(المصنف از ابن ابی شیبہ۔ ج ۱۲۔ ص ۸۳)

امیر المومنینؑ کی ولادت

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی ولادت مشہور قول کے مطابق ۱۳ رجب سن ۳۰ عام الفیل میں (بعثت نبویؐ سے دس سال قبل اور ہجرت نبویؐ سے تیئس سال پہلے) ہوئی۔(۱) بعض کتابوں میں آپ کی ولادت کا دن ۷ شعبان‘ ۲۳ شعبان اور ۱۵ رمضان بھی بتایا گیا ہے۔(۲)

یعقوب کلینی اور کچھ دوسروں نے حضرت کی ولادت سن ۲۳ عام الفیل بیان کی ہے۔(۳) باوجود یہ کہ بہت سی روایات میں آپ کے قبول اسلام کی عمر سات سے پندرہ سال ذکر کی گئی ہے۔البتہ جو بات زیادہ مشہور اور زیادہ قابل اعتماد ہے‘ وہ دس سے بارہ سال کی عمر (میں آپ کا اسلام قبول کرنا) ہے۔(۴) آپ کی شہادت ۲۱ رمضان سن ۴۰ ہجری کو کوفہ میں ہوئی۔

آپ کے والد حضرت ابوطالب اور آپ کی والدہ فاطمہ بنت اسد ابن ہاشم ابن عبد مناف ہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں اپنی والدہ کہا کرتے تھے اور ان کی وفات کے موقع پر آنحضرتؐ نے انہیں اپنے لباس کا کفن دیا اور اُن کی تشیع جنازہ میں شرکت کی اور اُن پر گریہ فرمایا۔

امیر المومنینؑ زمانۂ رسولؐ میں

حضرت علی علیہ السلام کو یہ افتخار حاصل ہے کہ آپ نے اپنے بچپنے ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر

۱۔الارشاد۔ص ۹‘ اعلام الوریٰ۔ص ۱۵۳‘ تہذیب۔ج ۶۔ص ۱۹

۲۔مسار الشیعہ۔ص ۳۵‘ اثبات الوصیہ۔ص ۱۳۴

۳۔کافی۔ج ۱۔ص ۴۵۲‘ الارشاد۔ص ۹‘ تہذیب۔ج ۶۔ص ۱۹

۴۔تواریخ النبی والآل۔ص ۲۳

میں پرورش پائی۔(۱) اس بارے میں کافی دلچسپ روایتیں نقل ہوئی ہیں جنہیں ابن ابی الحدید نے یکجا کر دیا ہے۔ ان ہی میں سے ہے کہ زید بن علی بن حسینؑ سے نقل کیا گیا ہے کہ اس زمانے میں رسولؐ اللہ گوشت اور کھجور کو اپنے منہ سے نرم کر کے امامؑ کے دہن مبارک میں رکھتے تھے' تاکہ آپ کو کھانے میں آسانی رہے۔(۲) اسی قرابت کی وجہ سے حضرت علیؑ رسول اللہؐ پر ایمان لانے والے پہلے شخص تھے۔ آپ خود فرماتے ہیں: لم یسبقنی الا رسول اللّٰہ با لصلاۃ. (رسول اللہ کے سوا کسی اور نے مجھ سے پہلے نماز نہیں پڑھی)(۳) اس بارے میں اتنے شواہد موجود ہیں کہ منصف مزاج انسان کے لیے شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ آپ کے قبولِ اسلام کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اللہؐ نے آپ کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ یہ امر اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ اُس زمانے میں امامؑ فکری بلوغ کے حامل تھے۔(۴) مسعودی کہتا ہے کہ: بعض لوگوں نے اسلام لانے کے موقع پر آپ کی عمر کو کم لکھا ہے' تاکہ یہ کہا جاسکے کہ اسلام قبول کرتے وقت آپ محض ایک بچہ تھے۔(۵)

اسلام کی راہ میں امامؑ کی قربانیوں کی وجہ سے آپ کے فضائل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بکثرت احادیث ارشاد فرمائی ہیں۔ احمد ابن حنبل کہتے ہیں: جتنے صحیح اور قابلِ قبول فضائل حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں بیان ہوئے ہیں' اتنے کسی بھی صحابی کے بارے میں بیان نہیں ہوئے۔(۶) انہی کا کہنا ہے: ان ابی طالب لا یقاس بہ احد

۱۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۹۰

۲۔ شرح نہج البلاغہ۔ ج ۱۳۔ ص ۱۹۸۔ ۲۰۱

۳۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۲۹

۴۔ المعیار والموازنہ۔ ص ۶۹۔ ۷۰۔ اس متن میں "اسکانی" نے اس بات کی جانب اشارہ کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے حضرت علیؑ کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دینا' حضرت علیؑ کی فکری بلوغت کی نشاندہی کرتا ہے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اس زمانے میں اسلام کو بالغ اور عاقل افراد کے اسلام لانے کی ضرورت تھی' ان حالات میں حضورؐ کے لیے مناسب نہ تھا کہ آپ ایک بچے کو اسلام کی دعوت دیتے۔ وہ اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ بلوغ کی کم از کم عمر پندرہ سال ہے' لیکن بہت سے لوگ تیرہ سال کی عمر میں بالغ ہوجاتے ہیں۔ اہلِ سنت کی کتابوں میں دعوت کی روایت اس طرح آئی ہے کہ جب امام نے پیغمبر کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا' تو آپ سے اس بارے میں سوال کیا۔ حضورؐ نے فرمایا: ھذا دین اللّٰہ یا علی! (اے علی! یہ اللہ کا دین ہے)۔ اس کے بعد آپ نے حضرت علیؑ سے کہا کہ وہ بھی ایمان لے آئیں۔ امام نے جواب دیا: انظرنی حتی اتفکر فیہ اللیلۃ. فانظرہ ثم اصبح مسلما بعد الرویۃ و الفکرۃ. (مجھے مہلت دیجیے تاکہ میں آج کی رات اس بارے میں غور کرلوں۔ آنحضرتؐ نے انہیں مہلت دی۔ اور دوسرے دن صبح امام علیؑ نے اسلام قبول کرلیا۔ نیز دیکھئے: انساب الاشراف۔ ج ۱۔ ص ۱۱۲

۵۔ التنبیہ والاشراف۔ ص ۱۹۸

۶۔ مناقب احمد بن حنبل ابن جوزی۔ ص ۱۶۰' طبقات الحنابلہ۔ ج ۱۔ ص ۳۱۹

(کسی کا بھی علی ابن ابی طالبؑ کے ساتھ موازنہ نہیں کیا جا سکتا)۔(۱)

ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ: **لعلی من النبی دخلة لیست لاحد .و کان للنبی من علی دخلة لیست لاحد غیر ہ فکانت دخلة النبی من علی ان النبی کان ید خل علیھم کل یوم**۔ (علیؑ کی پیغمبر اکرمؐ کے یہاں ایسی آمد ورفت تھی جو ان کے سوا کسی اور کو نصیب نہ تھی۔ اور اسی طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علیؑ کے یہاں آنا جانا ایسا تھا کہ روزانہ ہی ان سے ملاقات کرتے تھے)۔(۲)

زید بن ثابت نے امامؑ سے کہا: **انت من رسول اللہ با لمکان الذی لا یعدلہ احد ا** (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک جو مقام آپ کو حاصل ہے' کوئی اسکی برابری نہیں کر سکتا)۔(۳) زید نے یہ بات اس زمانے میں کہی تھی جس زمانے میں وہ حضرت عثمان کے زبردست حامیوں میں سے تھے۔

اسی وجہ سے حضرت علیؑ پیغمبر اسلامؐ کی ایسی معرفت رکھتے تھے جیسی معرفت اور کسی صحابی کو حاصل نہ تھی۔(۴)

رسولِ خدا کی امامؑ پر خصوصی توجہ کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ آپ نے اپنی دختر سیدۃ نساء العالمین کو آپ کے عقد میں دیا۔ ان سے پہلے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر نے بھی حضرت فاطمہؑ کا رشتہ طلب کیا تھا لیکن آنحضرتؐ نے ان کی درخواست قبول نہیں کی تھی۔ لیکن جب امامؑ رشتے کے لیے تشریف لائے تو آنحضرتؐ نے قبول کیا اور فرمایا: **لست بد جال**. (۵) فاطمہ تمہاری (ہی زوجہ) ہیں۔

جب حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ کی شادی ہونے لگی تو حضورؐ نے آپ سے فرمایا کہ اپنے لیے ایک گھر کا بندوبست کرو۔ امامؑ کو ذرا فاصلے پر ایک گھر ملا۔ شادی کے بعد آنحضرتؐ نے امامؑ سے خواہش کی کہ آپ کے نزدیک آ کر رہیں۔

۱۔ مناقب احمد بن حنبل۔ ص ۱۶۳

۲۔ المصنف از عبد الرزاق۔ ج ۱۰۔ ص ۱۴۰' انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۹۸ اور حاشیے میں: تاریخ دمشق۔ ج ۳۸۔ ص ۳۳' امالی ابن الشیخ۔ ص ۳۳۔ حدیث سوم۔ مجلس ۲۷

۳۔ الفتوح۔ ج ۲۔ ص ۱۶۵

۴۔ دیکھئے: سبل الھدیٰ والرشاد۔ ج ۶۔ ص ۶۳۲

۵۔ طبقات الکبریٰ۔ ج ۸۔ ص ۲۲۔ اس جملے کو دو طریقوں سے پڑھا جا سکتا ہے: "لستُ" اور "لستَ"۔ ابن سعد نے پہلے طریقے سے پڑھا ہے اور تفسیر کی ہے کہ میں دجال نہیں ہوں۔ یعنی آنحضرتؐ نے پہلے ہی حضرت علیؑ کو حضرت فاطمہؑ کے ساتھ شادی کا وعدہ دے دیا تھا۔ رشتہ طلب کرنے کی روایات میں تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ وعدے کی کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس بنیاد پر اب پیغمبرؐ کے اس جملے سے کیا مراد ہو سکتی ہے؟

حارثہ بن نعمان نے اپنے گھر کی قربانی دی اور اسے امام کے سپرد کیا' یوں رسول مقبول کی یہ خواہش پوری ہوئی۔(۱) شاید اسی لیے عبداللہ بن عمر کہا کرتے تھے کہ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک علیؑ کا مقام جاننا چاہتے ہو' تو آنحضرتؐ کے گھر سے اُن کے گھر کا مقام دیکھو۔(۲) مسلمانوں کے درمیان عقدِ اخوت کی برقراری کے موقع پر رسول کریمؐ نے اپنے بھائی کے طور پر حضرت علیؑ کا انتخاب کیا۔(۳)

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطبہ ارشاد فرماتے تھے' تو حضرت علی علیہ السلام دور کھڑے ہو کر آنحضرتؐ کے جملوں کو دُہراتے تھے۔(۴) اور جب پیغمبر اکرم غضبناک ہوتے تھے تو اس موقع پر امامؑ کے سوا کسی اور کو آپ سے بات کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔(۵) لوگ اپنے مسائل کے حل کے لیے حضرت علیؑ کو واسطہ بنایا کرتے تھے۔(۶) اہلِ سنت نے حضرت عائشہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہؐ کے نزدیک عورتوں میں فاطمہؑ اور مردوں میں علیؑ محبوب ترین افراد تھے۔(۷) رسول اللہؐ نے ایک صحیح ترین حدیث (یعنی حدیثِ منزلت) میں حضرت علیؑ اور اپنے درمیان وہی نسبت قرار دی ہے جو نسبت ہارون کو موسیٰ سے تھی۔(۸) جب کبھی کوئی مشکل پیش آتی اور کسی کو معاملات کی اصلاح کے لیے بھیجنا ضروری ہوتا' تو اس موقع پر رسول کریمؐ حضرت علیؑ ہی کو بھیجا کرتے تھے۔(۹) جب امامؑ سے پوچھا گیا کہ: کیا وجہ ہے کہ دوسرے اصحاب کے مقابلے میں آپ زیادہ احادیث نقل کرتے ہیں؟ تو امامؑ نے فرمایا: **لانی کنتُ اذا سالته انبانی واذا سکتُ ابتدانی** (اس لیے کہ جب میں آنحضرتؐ سے کوئی سوال کیا کرتا تھا تو وہ مجھے جواب دیا کرتے تھے اور جب میں خاموش ہوتا تھا تو آپ خود آغازِ سخن فرماتے تھے)۔(۱۰)

۱۔ طبقات الکبریٰ۔ ج ۸۔ ص ۲۲

۲۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۱۸۰۔۱۸۱

۳۔ صحیح ترمذی۔ ج ۱۳۔ ص ۱۷۰' المصنف از ابن ابی شیبہ۔ ج ۱۲۔ ص ۶۲۔۸۲' المستدرک۔ ج ۳۔ ص ۱۴' ربیع الابرار۔ ج ۱۔ ص ۸۰۷' انساب الاشراف۔ ج ۱۔ ص ۲۷۰' ج ۲۔ ص ۱۳۵

۴۔ ربیع الابرار۔ ج ۳۔ ص ۳۲۷

۵۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۱۰۷' المستدرک۔ ج ۳۔ ص ۱۳۰

۶۔ التراتیب الاداریہ۔ ج ۱۔ ص ۵۶۔۵۸

۷۔ الاستیعاب۔ ج ۱۔ ص ۳۷۸' تاریخ جرجان۔ ص ۲۱۸

۸۔ جیسا کہ متن میں اشارہ ہو چکا ہے اس حدیث میں کسی کو شک نہیں ہے۔

۹۔ طبقات الکبریٰ۔ ج ۷۔ ص ۳۳۵' التراتیب الاداریہ۔ ج ۱۔ ص ۳۴۳۔۳۴۴' بحار الانوار۔ ج ۳۸۔ ص ۷۳۔۷۵

۱۰۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۹۸

حضرت علی علیہ السلام فرماتے تھے: مجھے جب کبھی کسی ایسی بات کا سامنا ہوتا جس کا مجھے علم نہ ہوتا' تو اسکے بارے میں رسول اللہؐ سے سوال کرتا اور اُن کے جواب کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھتا۔(۱) نیز فرمایا: میں نے جو کچھ رسول اللہؐ سے سُنا' اسے حفظ کرلیا اور کبھی کسی چیز کو نہیں بھولا۔(۲) امامؑ نے ایک خط میں تحریر فرمایا کہ: وانا من رسول اللہ کالصنو من الصنو والذراع والعضد (میں اور رسول اللہ ایک درخت سے نکلی ہوئی دوشاخوں اور بازو سے جڑے ہوئے ہاتھ کی مانند ہیں)۔(۳)

امامؑ فرماتے تھے: میں پیغمبرؐ کے پیچھے اس طرح چلا کرتا تھا جیسے اونٹنی کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے چلا کرتا ہے۔(۴) نیز فرماتے تھے: انی لم ارد علی اللہ ولا علی رسولہ ساعۃ قط۔ (میں نے ایک لمحے کے لیے بھی خدا اور اس کے رسول کی مخالفت نہیں کی)۔(۵) اعلانِ برأت کے موقع پر اللہ نے اپنے رسولؐ سے فرمایا: یہ پیغام آپ خود لوگوں تک پہنچائیں یا ایسا شخص پہنچائے جو آپ سے ہو۔ اسی لیے حضورؐ نے ابوبکر کو راستے سے واپس بلا کر وہ پیغام حضرت علیؑ کے حوالے کیا کہ وہ حج اکبر کے دن اسے لوگوں کو سنائیں۔(۶)

امامؑ نے خطبۂ قاصعہ میں رسول اللہؐ کے ساتھ اپنی قرابت کے بارے میں انتہائی خوبصورت جملے ارشاد فرمائے ہیں۔(۷) امامؑ رسول اللہؐ سے اس قدر نزدیک تھے کہ فرماتے ہیں: خدا کی قسم کوئی آیت نازل نہیں ہوئی جس کے متعلق میں یہ نہ جانتا ہوں کہ وہ کس بارے میں اور کہاں نازل ہوئی ہے۔(۸) ابن عباس کہتے ہیں: خداوند عالم نے کوئی سورہ ایسی نازل نہیں کی جس کے امیر وشریف علیؑ نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اصحابِ رسول کی سرزنش کی لیکن علیؑ کا ذکر سوائے اچھائی کے کسی اور طرح نہیں کیا۔(۹)

۱۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۲۰۸

۲۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۱۳۱

۳۔ نہج البلاغہ۔ مکتوب ۴۵

۴۔ تصنیف نہج البلاغہ۔ ص ۳۵۵

۵۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۹۵

۶۔ انساب الاشراف۔ ج ۱۔ ص ۳۸۲' ج ۲۔ ص ۱۲۳ اور ۱۵۵

۷۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۹۲

۸۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۹۹

۹۔ معرفۃ الصحابہ۔ ج ۱۔ ص ۲۹۸' معجم الکبیر۔ ج ۱۱۔ ص ۲۶۴' حلیۃ الاولیاء۔ ج ۱۔ ص ۶۴

احمد بن حنبل حضرت علیؑ کے "قسیم النار والجنۃ" (جنت و جہنم کو تقسیم کرنے والے) ہونے پر تعجب کا اظہار کرنے والے لوگوں کے بارے میں کہتے ہیں: کیا یہ روایت نہیں کی گئی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ سے فرمایا: "لا یُحِبک الا مؤمن ولا یُبغضک الا منافق." (آپ سے صرف مومن ہی محبت کرے گا اور صرف منافق ہی بغض رکھے گا) لوگوں نے کہا: ہاں! تو انہوں نے کہا: کیونکہ مومن کا مقام بہشت اور منافق کا ٹھکانہ جہنم ہے، لہٰذا علیؑ جنت اور جہنم کو تقسیم کرنے والے ہوئے۔(۱)

عمر بن عبدالعزیز نے کہا کہ: اگر یہ ناسمجھ لوگ اُن باتوں سے آگاہ ہوتے جو ہم علیؑ کے بارے میں جانتے ہیں، تو اُن میں سے دو آدمی بھی ہماری پیروی نہ کرتے۔(۲) سلمان کہا کرتے تھے کہ: اگر تمہارے درمیان سے علیؑ اٹھ گئے تو کوئی نہیں رہے گا جو تمہارے رسولؐ کے راز تمہیں بتا سکے۔(۳) ابن ابی الحدید نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ: کسی نے بھی ابو طالب اور اُن کے بیٹوں علیؑ اور جعفرؑ کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد نہیں کی ہے۔(۴) ایک مرتبہ جب کسی نے کسی مسئلے پر رسولِ خداؐ سے علیؑ کی شکایت کی، تو آپ نے تین مرتبہ فرمایا: علیؑ کو کچھ نہ کہو کیونکہ: فانّ علیاً منّی وانا منہ وھو ولیّ کل مؤمن (علی مجھ سے ہے اور میں علی سے ہوں اور وہ ہر مومن کے ولی ہیں)۔(۵)

حضرت علیؑ نے شب ہجرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان بچائی۔(۶) جنگ بدر میں تقریباً تیس مشرکوں کو قتل کیا۔ جنگ احد میں جب کہ بہت سے مسلمان میدانِ جنگ سے فرار ہو چکے تھے، آپ اللہ کے رسولؐ کے ساتھ رہے اور آپ کی جان کی حفاظت کی۔ جنگ خندق میں آپ کی ایک ضربت جو آپ نے عمرو بن عبدود کو لگائی تھی، اُسے پیغمبر اکرمؐ نے جن وانس کی عبادت سے بڑھ کر قرار دیا۔ اسی ضربت کی وجہ سے دشمن کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔(۷) آپ اکثر

۱۔ طبقات الحنابلہ۔ ج ۱۔ ص ۳۲۰

۲۔ ربیع الابرار۔ ج ۱۔ ص ۴۹۹

۳۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۱۸۳

۴۔ شرح نہج البلاغہ۔ ج ۷۔ ص ۱۷۴

۵۔ الامالی فی آثار الصحابہ۔ ص ۸۰۔ اور اس کے حاشیے میں: مسند احمد۔ ج ۴۔ ص ۴۳۷، صحیح ترمذی۔ نمبر ۳۷۹۶، مسند طیالسی۔ نمبر ۸۲۹، خصائص علی۔ سنن نسائی۔ ص ۶۵، حلیۃ الاولیاء۔ ج ۶۔ ص ۲۹۴، المستدرک۔ ج ۳۔ ص ۱۱۰، المعجم الکبیر۔ ج ۱۸۔ ص ۱۲۸ اور دیکھئے: الاستیعاب۔ ج ۳۔ ص ۳۲۲

۶۔ انساب الاشراف۔ ج ۱۔ ص ۲۶۰

۷۔ تاریخ مختصر الدول۔ ص ۹۵، شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۵۔ ص ۷

جنگوں میں لشکرِ اسلام کے علمدار ہوا کرتے تھے۔(۱)

بلاشبہ اصحاب رسولؐ میں کوئی بھی علم و دانش میں علیؑ کا ہمسر نہ تھا۔ یہ وہ حقیقت ہے جو خود رسول اللہؐ کے فرامین اور اصحاب رسولؐ کے کلمات میں بیان ہوئی ہے اور تاریخ بھی اس کی گواہی دیتی ہے۔ پیغمبر اکرمؐ کا یہ فرمان کہ: أنا مدینةُ العِلم وعليٌّ بابُها (میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں) اس حقیقت پر بہترین گواہ ہے۔ خود امامؑ کا بالائے منبر یہ اعلان کہ: سلُوني قبل أن تفقِدوني (مجھ سے پوچھ لو اس سے پہلے کہ میں تمہارے درمیان نہ رہوں) آپ کے عظیم علم و دانش کا مظہر ہے۔(۲) سعید بن مسیب کے بقول یہ دعویٰ امامؑ کے علاوہ کسی صحابی نے نہیں کیا۔(۳) پیغمبر اسلامؐ نے امامؑ کو مامور کیا کہ آپ لوگوں کو وضو اور سنت کی تعلیم دیں۔(۴) حضرت عائشہ جن کا علیؑ اور فاطمہؑ کے ساتھ معاندانہ طرزِ عمل زمانۂ رسولؐ ہی سے ظاہر تھا، کہتی ہیں: علي أعلم الناس بالسُّنة (علی لوگوں میں سنت کے سب سے بڑے عالم ہیں)۔(۵) معروف تابعی "عطا" کہتے ہیں: اصحاب رسولؐ میں فقیہ ترین شخص علیؑ ہیں۔(۶) عمر بن عبدالعزیز نے بھی امامؑ کو اصحاب رسولؐ میں زاہد ترین فرد قرار دیا ہے۔(۷)

امام علیؑ وفاتِ رسولؐ کے بعد

اگر یہ بات درست ہو کہ خود حیاتِ پیغمبرؐ ہی سے مہاجرین کے درمیان دو سیاسی دھڑے موجود تھے اور کچھ لوگ خلافت کے حصول کی تگ و دو میں تھے، تو یہ ماننا پڑے گا کہ امامؑ اور شیخین کے درمیان اُسی زمانے سے اچھے تعلقات موجود نہ تھے۔ سیرت سے متعلق روایات میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی جس سے ان کے درمیان اختلافات کا پتا چلتا ہو، لیکن ان کے دوستی اور گرم جوشی پر مبنی تعلقات کے حوالے سے بھی کوئی واقعہ نہیں ملتا۔ حضرت علیؑ کے ساتھ حضرت عائشہ کی معاندانہ روش جو خود ان کے اعتراف کے مطابق نبی اکرمؐ کے زمانے ہی سے موجود تھی، آلِ ابوبکر کے آلِ علیؑ کے ساتھ اختلافات کی ایک علامت قرار دی جا سکتی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب حضرت فاطمہ علیہا السلام کی رحلت ہوئی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

۱۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۹۱۔ ۹۴، حیاۃ الصحابہ۔ ج ۲۔ ص ۵۱۵۔ ۵۱۴
۲۔ نہج البلاغہ خطبہ۔ ۱۸۹
۳۔ تاریخ یحییٰ بن معین۔ ج ۳۔ ص ۱۴۳
۴۔ طبقات الکبریٰ۔ ج ۳۔ ص ۵۱
۵۔ تاریخ الکبیر بخاری۔ ج ۲۔ ص ۲۵۵
۶۔ مقتل الامام امیر المومنین۔ ص ۱۰۷
۷۔ مقتل الامام امیر المومنین۔ ص ۱۰۷

کی تمام ازواج نے بنی ہاشم کے سوگ میں شرکت کی' لیکن حضرت عائشہ نے بیماری کا بہانہ کیا اور شریک نہ ہوئیں' یہاں تک کہ کچھ لوگوں نے حضرت علیؑ کے گوش گزار ایسی باتیں کیں کہ گویا حضرت عائشہ نے خوشی کا اظہار کیا ہے۔(۱) بہر صورت جو کچھ بھی تھا' حضرت ابوبکر کا خلیفہ بننا اور خلافت کے لیے اپنی حقانیت کے اثبات پر امامؑ کا اصرار ان کے باہمی تعلقات میں ناخوش گواریاں پیدا ہونے کا سبب بنا۔

امامؑ کے گھر پر حملے' حضرت فاطمہ علیہا السلام کی ناراضگی اور ان کے اپنے جنازے میں شیخین کو شرکت کی اجازت نہ دینے۔(۲) نے اختلافات کو اور گہرا کیا۔ اس کے بعد امامؑ نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور ذاتی زندگی میں مصروف ہو گئے۔ حکومت کو یہ توقع تھی کہ جس طرح امامؑ نے بیعت کر لی ہے' اُسی طرح اب اپنے حق سے بھی دستبردار ہو جائیں گے اور تلوار ہاتھ میں لے کر حکومت کی بنیادیں مضبوط کرنے کے لیے ان کے مخالف مرتدوں کے ساتھ جنگ بھی کریں گے۔ امامؑ نے ان کی یہ درخواست مسترد کر دی۔ ایسی صورت میں یہ قدرتی بات تھی کہ حکومت عوام کی نگاہوں میں انہیں نیچا دکھانے کی کوشش کرے۔ اس پالیسی نے امامؑ کو مزید کنارہ کش کر دیا۔

حضرت علی علیہ السلام نے قریش پر نفرین کرتے ہوئے فرمایا: بارالہا! میں تجھ سے قریش اور قریش کی مدد کرنے والوں کے خلاف مدد چاہتا ہوں "فَاِنَّھُم قَطَعُوا رَحِمِی وَصَغَّرُوا عَظِیمَ مَنزِلَتِی وَاَجمَعُوا عَلٰی مُنَازَعَتِی اَمراً ھُوَ لِی" (انہوں نے مجھ سے قرابت کے بندھنوں کو توڑا' میرے بلند مرتبے کو پست سمجھا اور جو خلافت میرا حق تھی اُس میں مجھ سے جھگڑا کیا)۔(۳) آگے چل کر آپ فرماتے ہیں: میں نے نظر دوڑائی تو دیکھا کہ سوائے میرے اہل بیت کے نہ میرا کوئی حامی ہے نہ مددگار' تو میں نے انہیں موت کے منہ میں دینے سے بخل کیا۔ پس آنکھوں میں خس و خاشاک تھا' مگر میں نے چشم پوشی کی۔(۴)

امامؑ کے یہ الفاظ خلفا کی اس پالیسی کی طرف اشارہ ہیں جس کے تحت وہ امامؑ کی تحقیر کیا کرتے تھے۔ امامؑ نے خطبہٗ شقشقیہ میں بھی شوریٰ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: جب ان (حضرت عمر) کی زندگی پوری ہونے لگی' تو انہوں نے کچھ لوگوں کو نامزد کر دیا اور مجھے بھی ان میں شامل کر دیا۔ خدایا' یہ کیسی شوریٰ! مجھ میں پہلے ہی کے مقابلے میں کیا کمی تھی کہ

۱۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۹۔ ص ۱۹۸

۲۔ دیکھئے: المستدرک۔ ج ۳۔ ص ۱۶۲' طبقات الکبریٰ۔ ج ۸۔ ص ۳۰۔ ۲۹' التنبیہ والاشراف۔ ص ۲۵۰' وفاء الوفاء۔ ص ۹۹۶۔ ۹۹۵ اور ۱۰۰۰

۳۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۷۲' الغارات۔ ج ۱۔ ص ۳۰۹

۴۔ نہج البلاغہ خطبہ ۲۱۷۔ یہ خطبہ نہج البلاغہ میں دو مرتبہ آیا ہے اور یہاں پر کچھ اضافہ بھی ہے' مزید دیکھئے: الجمل۔ ص ۱۲۳' اور اسی کے حاشیے میں الامامۃ والسیاسۃ۔ ج ۱۔ ص ۱۵۵' الغارات۔ ص ۲۰۴

مجھے اُس کے برابر نہیں سمجھا گیا اور (اب) ان کی صف میں کھڑا کر دیا گیا۔(۱)

حضرت علی علیہ السلام کو طلحہ' زبیر اور عثمان جیسے افراد کی صف میں کھڑا کر دینا' امامؑ کی بے قدری کرنا تھا۔ اور اب یہاں بھی امامؑ کی توہین کی گئی۔ عجیب بات یہ ہے کہ جب حضرت عمر نے چھے افراد کو چنا' تو اُن میں سے ہر ایک کو کسی ایک صفت سے متہم کیا۔ اس موقع پر انہوں نے امام کی طرف جو صفت منسوب کی' وہ حد درجہ بے بنیاد ہونے کے ساتھ ساتھ حقارت آمیز بھی تھی۔ حضرتِ عمر نے امامؑ کو "فیہ دعابۃ." (ایک مذاق کرنے والا شخص ہے)(۲) قرار دیا تھا۔ حضرت عمر کے اسی سخن کی بنیاد پر بعد میں معاویہ(۳) اور عمرو عاص نے بھی امامؑ کے بارے میں "فیہ تلعابۃ." (۴) کہا تھا۔ امامؑ نے عمرو عاص کی اس تہمت کو سختی کے ساتھ مسترد کیا تھا اور یہ درحقیقت حضرت عمر کی بات کی تردید تھی۔(۵)

امامؑ کا مدینہ میں گوشہ نشین ہو جانا اس بات کا سبب بنا کہ آپ لوگوں کے لیے اجنبی ہو گئے۔ تیز رفتاری سے گزرتے زمانے میں' امامؑ صرف مدینے میں' وہ بھی قدیم اصحاب کے درمیان جانی پہچانی شخصیت کے مالک رہ گئے تھے۔ لیکن عراق اور شام میں کوئی امامؑ کو نہیں جانتا تھا۔ صرف یمن کے چند قبیلے' جنہوں نے یمن میں چند مہینوں کے سفر کے دوران آپ کو دیکھا تھا' وہ آپ کو پہچانتے تھے۔ جندب بن عبداللہ کہتا ہے: حضرت عثمان کی بیعت کے کچھ عرصے بعد میں عراق گیا۔ وہاں میں نے لوگوں کے سامنے حضرت علیؑ کے فضائل بیان کیے۔ وہاں لوگوں کی طرف سے جو سب سے اچھا جواب سننے کو ملتا تھا' وہ یہ تھا کہ: یہ باتیں ایک طرف رکھو اور ایسی چیز کے بارے میں سوچو جو تمہارے لیے فائدے مند ہو۔ میں کہتا تھا: یہ باتیں اُن چیزوں میں سے ہیں جو ہم دونوں کے لیے مفید ہیں۔ لیکن سامنے والا اٹھ کر چلا جایا کرتا تھا۔(۶)

ابن ابی الحدید کہتے ہیں کہ: محمد بن سلیمان کا تجزیہ یہ تھا کہ حضرت عثمان کے زمانے میں اختلاف کی ایک وجہ شوریٰ کی تشکیل تھی۔ کیونکہ شوریٰ کے تمام ارکان خلافت کی خواہش رکھتے تھے۔ طلحہ کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا تھا جنہیں خلافت کی توقع رہتی تھی اور زبیر اس سلسلے میں اُن کی مدد بھی کرتے تھے اور ساتھ ہی خود اپنے آپ کو بھی خلافت کا اہل سمجھتے تھے۔ انہیں حضرت علیؑ سے زیادہ خلافت ملنے کی امید تھی۔ کیونکہ شیخین نے (اُس زمانے کے) لوگوں کی نظروں میں امامؑ کی حیثیت کو

۱۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۳

۲۔ تاریخ مختصر الدول۔ ص ۱۰۳

۳۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۱۔ ص ۲۵

۴۔ الامتاع والموانسہ۔ ج ۳۔ ص ۱۸۳

۵۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۸۴' انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۱۲۷۔ ۱۳۵۔ ۱۵۱' نہج السعادہ۔ ج ۲۔ ص ۸۸

۶۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۹۔ ص ۵۸

گھٹا دیا تھا اور اُن کے نزدیک آپ کا احترام کم کر دیا تھا۔ اسی لیے آپ کو بھلا دیا گیا تھا۔ زمانۂ رسولؐ کے جو لوگ آپ کے فضائل سے واقف تھے اُن میں سے بیشتر فوت ہو چکے تھے اور ایک نئی نسل وجود میں آ چکی تھی جو آپ کو دوسرے مسلمانوں کی مانند ایک عام شخص ہی سمجھتی تھی۔ آپ کے امتیازات میں سے بس یہی ایک امتیاز باقی رہ گیا تھا کہ آپ نبی اکرمؐ کے چچازاد بھائی' آنحضرت کی بیٹی کے شوہر اور رسولِ کریمؐ کے نواسوں کے والد تھے۔ باقی باتیں فراموش کر دی گئی تھیں۔ قریش کو بھی آپ کے ساتھ ایسا بغض تھا جو کسی اور کے ساتھ نہ تھا۔ اور اسی قدر قریش کو طلحہ و زبیر سے محبت تھی۔ کیونکہ ان کے ساتھ دشمنی کی کوئی وجہ نہ تھی۔(۱)

ابن ابی الحدید اس نکتے کی طرف اشارہ کرنے کے بعد کہ لوگ صفین میں اس بات کو دیکھنا چاہتے تھے کہ عمار کس لشکر میں ہیں' تاکہ اُن کی موجودگی کو اس لشکر کی حقانیت کی دلیل سمجھیں' کہتے ہیں: ان لوگوں پر تعجب ہے جو عمار کو تو حق و باطل کے معیار کے طور پر قبول کر رہے تھے لیکن خود علیؑ جن کے بارے میں نبی اکرمؐ نے حدیثِ ولایت ارشاد فرمائی' نیز آنحضورؐ کے اس فرمان کہ: لا یحبک الا مومن ولا یبغضک الا منافق. (آپ سے کوئی محبت نہ رکھے گا سوائے مومن کے اور آپ سے کوئی بغض نہ رکھے گا سوائے منافق کے) کو معیار قرار نہیں دیتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قریش کے تمام لوگ ابتدا ہی سے علیؑ کے فضائل کو چھپانے' اُن کی یاد کو مٹانے' ان کے امتیازات کو محو کرنے اور لوگوں کے دلوں سے اُن کی عظیم منزلت کو گھٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔(۲) ابن ابی الحدید نے حضرت علیؑ سے قریش کے بغض و عداوت کے اسباب کا دلچسپ تجزیہ پیش کیا ہے۔(۳)

ایک بار کسی نے حضرت علیؑ سے پوچھا: آپ کے خیال میں' اگر رسول اکرمؐ کا کوئی بالغ بیٹا ہوتا' تو کیا عرب اپنی حکومت اس کے سپرد کر دیتے؟ امامؑ نے جواب دیا: جو طرزِ عمل میں نے اختیار کیا اگر وہ اس کے سوا کوئی اور طرزِ عمل اختیار کرتا تو عرب اسے مار ڈالتے۔ عرب حضرت محمدؐ کی حکومت سے متنفر تھے اور خدا نے جو عنایتیں اُن پر کی تھیں اُن سے حسد کیا کرتے تھے۔۔۔ اُنہوں نے آنحضرت کے زمانے ہی سے اس بات کی کوششیں شروع کر دی تھیں کہ آپ کی رحلت کے بعد یہ حکومت آپ کے اہلِ بیتؑ کے ہاتھوں میں نہ آنے پائے۔ اگر قریش کو اپنے اقتدار کے لیے ان کے نام کی ضرورت

۱۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۹۔ ص ۲۸۔ امام زین العابدین علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ قریش کو آپ کے بابا (یعنی حضرت علیؑ) سے اس قدر دشمنی کیوں تھی؟ تو آپ نے فرمایا: لانّہ اوْرَدَ اوّلھم النار و الزَمَ آخرھم العار. (کیونکہ انہوں نے ان کے اوّل کو جہنم رسید کیا تھا اور آخر کو شرمندہ کیا تھا)۔ نثر الدرر۔ ج ۱۔ ص ۳۴۰

۲۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۸۔ ص ۱۸

۳۔ ایضاً۔ ج ۱۳۔ ص ۲۹۹۔ ۳۰۰

نہ ہوتی اور وہ اسے اپنی ترقی کا زینہ نہ سمجھتے ہوتے، تو آپ کی رحلت کے بعد ایک دن کے لیے بھی خدا کی پرستش نہ کرتے اور مرتد ہو جاتے۔۔۔ کچھ ہی عرصے بعد فتوحات کا آغاز ہو گیا، بھوک کے بعد شکم سیری اور غربت کے بعد دولتمندی۔ یہ چیز اس بات کا باعث ہوئی کہ اسلام ان کی نظر میں پیارا ہو گیا اور ان میں سے بہت سے لوگوں کے دلوں میں دین نے گھر کر لیا۔ اس لیے کہ بہر حال اگر یہ حق نہ ہوتا تو یہ سب بھی نہ ہوتا۔ بعد میں ان فتوحات کو سرداروں اور گورنروں کی عقلمندی اور تدبیر سے منسوب کیا جانے لگا۔ اس دوران بعض کو بڑھا چڑھا دیا گیا اور بعض کو ذہنوں سے محو کیا گیا: فکنا ممن خمل ذکرُ و خبتْ نارُہٗ و انقطع صوتہ و صیتہ، حتی اکل الدھر علی نا و شربْ، و مضت السنون والا حقاب بما فیہٖ، ومات کثیر ممن یُعْرَف و نشا کثیر ممن لا یُعْرَف. (ہم اُن لوگوں میں سے تھے جن کی یاد کو بھلا دیا گیا تھا، جن کا نور بجھایا جا رہا تھا اور جن کی آواز کو دبا دیا گیا تھا۔ گویا زمانہ ہمیں نگل گیا تھا۔ برسہا برس اسی طرح گزر گئے بہت سے جانے پہچانے چہرے اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور جو غیر معروف تھے وہ ابھر کر سامنے آ گئے۔ اس صورت حال میں "بیٹا" کیا کر سکتا تھا۔ تم جانتے ہو کہ رسول اللہؐ رشتے داری کی وجہ سے مجھے خود سے نزدیک نہیں رکھتے تھے بلکہ جہاد اور نصیحت کی وجہ سے ایسا کیا کرتے تھے)۔(۱)

اسلامی معاشرے کا حضرت علی علیہ السلام کو بھلا دینا ہی تھا جس کی وجہ سے آپ نے اپنی خلافت کے دوران اپنے تعارف اور رسول اللہؐ کے زمانے میں اسلام کی خاطر اپنی جدوجہد سے لوگوں کو روشناس کرانے کے ہر موقع سے استفادہ کرنے کی کوشش کی۔(۲)

حضرت ابوبکر کے ساتھ امامؑ کے تعلقات انتہائی سرد تھے۔ گویا ان تعلقات کا کوئی ذکر ہی نہیں ملتا ہے۔ حضرت عمر کے ساتھ آپ کے تعلقات کے بارے میں بہت سے واقعات ملتے ہیں جو عدالتی فیصلوں میں حضرت عمر کی مدد اور اُن کے مشورہ طلب کرنے پر جواب دینے سے تعلق رکھتے ہیں، جن میں سے کچھ کا ہم گزشتہ گفتگو میں تذکرہ کر چکے ہیں۔ حضرت عمر نے امامؑ کے ساتھ عداوت سے بظاہر گریز کیا اور امامؑ کی تجاویز کا احترام بھی کیا لیکن حضرت عثمان ایسے نہیں تھے۔ وہ امامؑ کے اظہار رائے کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے ایک بار امامؑ سے کہا: تم میری نظر میں مروان بن حکم سے بہتر نہیں ہو۔(۳) حضرت عباس نے حضرت عثمان سے کہا بھی کہ امامؑ کا خیال رکھا کریں۔ لیکن حضرت عثمان نے انہیں جواب دیا کہ: میری پہلی بات تم سے یہ ہے کہ اگر علیؑ خود چاہیں تو کوئی اور میرے نزدیک ان سے بہتر نہ ہوگا۔(۴) البتہ امامؑ اس

۱۔شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ج ۲۰۔ص ۲۹۹۔۲۹۸

۲۔بطور مثال دیکھیے: نہج السعادہ۔ج ۲۔ص ۲۲۲۔۳۱۴

۳۔مروج الذہب۔ج ۲۔ص ۳۳۲

۴۔انساب الاشراف۔ج ۵۔ص ۱۴

بات پر تیار نہیں تھے کہ وہ حضرت عثمان اور اُن کے ساتھ دوستی کی وجہ سے انحرافات کو نظر انداز کر دیں۔ اسی لیے حضرت عثمان کے ساتھ امامؑ کے تعلقات ایک اعتبار سے قریبی اور ایک اعتبار سے کشیدہ ہو گئے۔(۱) ایک بار انصار کی ایک عورت کا بنی ہاشم کی ایک عورت کے ساتھ کوئی اختلاف ہو گیا۔ جب انصاری کے حق میں فیصلہ ہو گیا تو حضرت عثمان نے اس سے کہا: یہ تیرے چچازاد بھائی علیؑ کی رائے ہے۔(۲)

حکومت کی مخالفت امامؑ کے لیے ایک مشکل کام تھا۔ بالخصوص ابتدائی برسوں میں امامؑ نے کوشش کی کہ گوشہ نشینی اختیار کر کے خود کو حکومت کے مدمقابل آنے سے بچائے رکھیں۔ سعد بن عبادہ کا تجربہ سامنے تھا۔ انہوں نے بیعت نہیں کی تھی اور خلیفۂ اوّل یا دوّم کے زمانے میں اچانک اطلاع ملی کہ انہیں جنات نے قتل کر دیا ہے۔ ہم ایک مقام پر اشارہ کر چکے ہیں کہ بعض تاریخی ماخذ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ اُن کا قتل سیاسی تھا۔(۳)

ابن ابی الحدید کہتے ہیں: میں نے ابوجعفر نقیب (یحییٰ بن ابی زید) سے پوچھا: مجھے علیؑ پر حیرت ہے کہ وہ رسول اللہ کی وفات کے بعد اتنے طویل عرصے تک زندہ کیسے باقی رہے اور قریش کی اتنی دشمنیوں کے باوجود اُن کی جان کیسے محفوظ رہی؟ ابوجعفر نے مجھ سے کہا: اگر انہوں نے اپنے آپ کو اتنا چھوٹا نہ کر لیا ہوتا اور گوشہ نشینی اختیار نہ کر لی ہوتی' تو وہ بھی مار دیئے جاتے۔ لیکن انہوں نے اپنے آپ کو پس منظر میں کھینچ لیا اور عبادت' نماز اور قرآن میں مشغول کر لیا اور خود کو اُس پہلی شخصیت سے نکال لیا اور تلوار کو بھلا دیا۔ گویا (نعوذ باللہ) ایک تائب مجرم ہوں جو بیابانوں میں نکل گیا ہو جس نے پہاڑوں میں رہبانیت اختیار کر لی ہو۔ اور کیونکہ انہوں نے حکمرانوں کی اطاعت اختیار کر لی تھی اور اپنے آپ کو ان کے سامنے حقیر کر لیا تھا اس لیے انہوں نے انہیں زندہ رہنے دیا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو حکام انہیں قتل کرا دیتے اس کے بعد اس نے امامؑ کے خلاف خالد کے اقدامِ قتل کی طرف اشارہ کیا۔(۴) مومن طاق کا نظریہ بھی یہی ہے کہ اس زمانے میں امامؑ کے سیاسی جدوجہد نہ کرنے کی وجہ آپ کا یہی اندیشہ تھا کہ کہیں (سعد کی طرح) انہیں بھی جنات قتل نہ کر دیں۔(۵)

البتہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امامؑ نے مناسب موقعوں پر اپنے حق کی بازیابی کے لیے کوشش نہیں کی۔ امامؑ نے پہلے ہی مرحلے پر چند مہینوں تک بیعت سے گریز کیا۔(۶) علاوہ ازایں انہیں ابتدائی دنوں میں آپ اپنے چھنے ہوئے

۱۔ تاریخ مدینہ منورہ۔ ج ۳۔ ص ۱۰۳۶۔۱۰۳۵

۲۔ تاریخ مدینہ منورہ۔ ج ۳۔ ص ۹۶۷' منتخب کنز العمال۔ ج ۲۔ ص ۲۰۴

۳۔ دیکھئے: شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۱۷۔ ص ۲۲۳

۴۔ ایضاً۔ ج ۱۳۔ ص ۳۰۱۔۳۰۲

۵۔ ایضاً۔ ج ۱۷۔ ص ۲۲۳

۶۔ انساب الاشراف۔ ج ۱۔ ص ۵۸۵' الکامل فی التاریخ۔ ج ۲۔ ص ۳۲۵

حق کی بازیابی کے لیے اپنی بیوی اور بچوں کے ہاتھ تھام کر انصار کے گھر گھر گئے۔ آپ کا یہ اصرار اس قدر شدید تھا کہ آپ پر خلافت کے لیے حریص ہونے کا الزام لگایا گیا۔ امامؑ فرماتے ہیں: ایک شخص نے مجھ سے کہا: اے ابو طالب کے بیٹے! تمہیں اس (خلافت) کی بڑی حرص ہے۔ میں نے کہا: نہیں' خدا کی قسم تم زیادہ حریص ہو۔ تم (رسولِ خداؐ سے) دور اور میں ان کا خاص ہوں۔ میں نے تو اپنا حق مانگا ہے لیکن تم نہیں چھوڑتے اور مجھے میرے حق تک پہنچنے سے روکتے ہو۔(۱)

امامؑ نے اس قسم کے بہت سے استدلال کیے ہیں: **یا معشر قریش !انا اهل البیت احق بهذا الامر منکم' اما کان فینا من یقرء القرآن ویعرف السنه و یدین بدین الحق ؟** (اے قریشیو! ہم اہلِ بیت اس امر (خلافت) کے تم سے زیادہ حقدار ہیں۔ کیا ہمارے درمیان قرآن کا قاری' سنت کا جاننے والا اور دینِ حق پر کاربند کوئی نہیں؟)۔(۲)

خلفائے ثلاثہ کی خلافت کے بارے میں عرض ہے کہ: امامؑ کو کبھی اتنی آزادی میسر ہی نہ تھی کہ آپ شیخین کے بارے میں کسی رائے کا اظہار کرسکیں۔ اسکے برعکس حضرت عثمان کے بارے میں امامؑ کو اپنی رائے کے اظہار کا موقع ملا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کوفہ میں آپ کی سپاہ میں سے سوائے کچھ محدود لوگوں کے دوسرے سب لوگوں نے شیخین کو قبول کیا ہوا تھا اور اُن کے درمیان امامؑ شیخین کے بارے میں آزادی کے ساتھ اظہارِ رائے نہیں کرسکتے تھے۔ ایک بار جب امامؑ کو موقع ملا تو آپ کو اپنی گفتگو روکنی پڑی اور دوبارہ گفتگو کے لیے ابن عباس کے اصرار پر فرمایا: **تلک شقشقة هَدَرَتْ** یعنی نہیں' ابن عباس! یہ ایک چنگاری تھی جو شعلہ بن گئی تھی۔(۳)

امامؑ اپنی تمام تر احتیاط کے باوجود (حضرت عمر کے بعد) شوریٰ کے موقع پر خلافت کے لیے عبدالرحمٰن بن عوف کی وہ شرط قبول کرنے پر تیار نہ ہوئے جو انہوں نے خلافت آپ کے حوالے کرنے کے لیے آپ پر عائد کرنا چاہی تھی۔ ابن عوف نے شرط رکھی تھی کہ اگر امامؑ یہ بات قبول کرلیں کہ وہ سیرتِ شیخین پر چلیں گے' تو وہ خلافت اُن کے حوالے کرنے پر تیار ہے۔ لیکن امامؑ نے فرمایا: میں صرف اپنے اجتہاد پر عمل کروں گا۔ امامؑ کی جانب سے سیرتِ شیخین کی اس کھلی مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ امامؑ کے خیال میں بکثرت موقعوں پر اُن کی سیرت' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کے برخلاف اور غلط اجتہاد کی بنیاد پر تھی۔ امامؑ نے حضرت ابوبکر کی انہی باتوں کو قابلِ اطاعت سمجھا جن باتوں میں وہ خدا کی اطاعت کیا کرتے

۱۔ نہج البلاغہ خطبہ ۱۷۲' الغارات۔ ج ۱۔ص ۳۰۸

۲۔ الغارات۔ ج ۱۔ص ۳۰۷

۳۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۳' نثر الدرر۔ ج ۱۔ص ۲۷۴

تھے۔(۱) اپنے دورِ خلافت میں امامؑ کی گفتگوئیں نیز مختلف مسائل کے بارے میں امامؑ کا طرزِ عمل گزشتہ طور طریقوں کے بارے میں آپ کی ناپسندیدگی کو ظاہر کرتا ہے۔

بعد میں معاویہ نے ایک خط امامؑ کو لکھا کہ آپ نے گزشتہ خلفا سے بھی حسد کی اور اُن کے خلاف بغاوت کی۔ امامؑ نے جواب میں اُنہیں لکھا: اور تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے تمام خلفا کی برائی چاہی ہے اور اُن کے ساتھ دشمنی کی ہے۔ اگر ایسا ہے (اور تمہاری بات سچی ہے) تو تمہیں باز پرس کا کیا حق ہے؟ تم پر تو کوئی ظلم نہیں ہوا ہے کہ تم سے معذرت چاہی جائے۔۔۔ اور تم نے کہا ہے کہ وہ مجھے بیعت کے لیے نکیل ڈالے ہوئے اونٹ کی طرح کھینچتے تھے۔ خدا کی قسم! تم نے میری مذمت کرنا چاہی (لیکن) تعریف کر دی' (مجھے) ذلیل کرنا چاہا (لیکن) خود ذلیل ہوئے۔ مسلمان کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ مظلوم ہو' لیکن اپنے دین پر شک نہ کرے' اُس کا یقین مستحکم ہو اور وہ شک و شبہ سے دور ہو۔۔۔؟ اور یہ کہ میں عثمان پر اُن کی بعض بدعتوں کی وجہ سے اعتراض کیا کرتا تھا' تو میں اِس کی معذرت بھی نہیں چاہوں گا۔(۲)

امامؑ کی اِن کھلی تنقیدوں' بالخصوص شوریٰ میں امامؑ کے طرزِ عمل کے پیشِ نظر امامؑ کی حضرت عمر یا حضرت عثمان کے ساتھ بعض خاندانی رشتے داریوں کو اس بات کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا کہ آپ اُن کی حکومتوں کو برحق سمجھتے تھے۔ حتیٰ امامؑ کی جانب سے بعض خلفا کے مقابلے پر بعض خلفا کی تعریف کو بھی اُصولی طور پر امامؑ کے اِن خلفا کی خلافت قبول کرنے کی دلیل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ جب امامؑ نے یہ محسوس کر لیا کہ آپ اس گروہ سے مقابلے کی قوت نہیں رکھتے' اور کسی جنگ و جدال کا آغاز اسلام کی مصلحت میں بھی نہیں ہے' تو آپ نے مصالحت کا راستہ اختیار کیا۔ امامؑ نے کئی مواقع پر ضرورت اور مسلمانوں کے اتحاد کی حفاظت کو حضرت ابوبکر کی بیعت اور اُن کی خلافت (جسے مہاجر و انصار بھی مان چکے تھے) قبول کرنے کی بنیاد قرار دیا۔(۳) امامؑ نے اپنی خاموشی کے لیے وہی توجیہ پیش کی جو جناب ہارون نے حضرت موسیٰؑ کے سامنے پیش کی تھی کہ: اِنِّیۡ خَشِیۡتُ اَنۡ تَقُوۡلَ فَرَّقۡتَ بَیۡنَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ (مجھے تو یہ خوف تھا کہیں آپ یہ نہ کہیں کہ تم نے بنی اسرائیل میں اختلاف پیدا کر دیا ہے)۔(۴) اور سقیفہ کے حوالے سے آپ فرماتے تھے: بل عرفت انّ حق ھوا الماخوز و قد ترکتہ لھم ' تجاوز اللہ عنھم (۵) یعنی جب میں نے جان لیا کہ حق چھین لیا گیا ہے' تو

۱۔ الغارات۔ ج ۱۔ ص ۳۰۷

۲۔ نہج البلاغہ۔ مکتوب ۲۸' وقعۃ صفین۔ ص ۹۱۔ ۸۶۔ یہاں معاویہ کے خط کا مکمل متن اور امامؑ کا جواب موجود ہے۔

۳۔ دیکھئے: انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۲۸۱' الغارات۔ ص ۱۱۱۔ ۱۱۰

۴۔ سورۂ طٰہٰ ۲۰۔ آیت ۹۴' دیکھئے: المسترشد۔ ص ۱۰۹

۵۔ دیکھئے: وقعۃ صفین۔ ص ۹۱

میں نے بھی اسے ان کے لیے چھوڑ دیا۔ اللہ ان سے تجاوز فرمائے۔

ماضی میں اہلِ سنت یہ بات بھی نہیں مانتے تھے کہ اہلِ بیتؑ خود کو خلافت کے لیے دوسروں یعنی ابتدائی خلفا سے زیادہ حقدار سمجھتے تھے' لیکن اب اہلِ سنت کے کچھ روشن خیال حلقے اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے خود اپنے آپ کو خلافت کا زیادہ حقدار سمجھنے کے باوجود صرف اتحاد کی خاطر حضرت ابو بکر کی بیعت کی تھی۔(۱)

بہر صورت اِس معاشرے میں امام کی گوشہ نشینی اِس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ امامؑ اور خلفا دونوں یہ جانتے تھے کہ ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح کا طرزِ عمل نہیں رکھ سکتے جسے اُن کے نقطۂ نظر بالخصوص خلافت کے مسئلے میں حضرت کی جانب سے اُن کی تائید سمجھا جائے۔ اسی کے ساتھ مسجد میں آمد و رفت' یا رشتے داری کا قیام جیسے حضرت عمر کے ساتھ حضرت ام کلثوم کی شادی' ایک معمول کی بات تھی۔ یہ شادی بھی حضرت عمر کے اصرار پر ہوئی تھی' ابتداً امامؑ نے اس کی مخالفت کی تھی لیکن بعد میں قبول کرلیا تھا۔ جیسا کہ امامؑ نے حضرت ابو بکر کے انتقال کے بعد اُن کی بیوہ اسما بنتِ عمیس سے شادی کرلی تھی اور حضرت ابو بکر کے بیٹے محمد کی اپنے گھر میں پرورش فرمائی تھی۔

امیر المومنینؑ کے ہاتھ پر لوگوں کا بیعت کرنا

اِس بات میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ اولین تین خلفا کے زمانے میں امامؑ نے سیاسی معاملات میں فعال کردار ادا نہیں کیا' اور بعض عدالتی امور اور ان سے بھی کم کچھ سیاسی مسائل میں مشوروں کے علاوہ میدانِ سیاست میں آپ کی کوئی خاص موجودگی نظر نہیں آتی۔ بالالفاظ دیگر امامؑ خلفا کی حکومتی مشنری کے رکن نہیں تھے' اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ دورِ حزبِ اختلاف کی قیادت آپ ہی کے پاس تھی۔ حضرت عثمان کے بعد امامؑ کی کامیابی کافی حد تک قریش اور بنی امیہ کے مخالفین کے غلبے کے مترادف تھی۔ ان مخالفین کو شروع شروع میں تو عراقی قبیلوں اور مصری مہاجرین کی مدد حاصل تھی اور پھر انصار اور مدینے کی مقامی آبادی کی حمایت اور مدد میسر تھی۔ کچھ مہاجرین جن میں سرِ فہرست عمار یاسر تھے' اسی گروہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ یہ لوگ بھی ان سے حضرت عثمان کی بے توجہی اور بنی امیہ پر اُن کی خاص عنایات کی وجہ سے اُن کے مخالفین میں شامل تھے۔ اس گروہ میں سرِ فہرست طلحہ وزبیر اور حضرت عائشہ تھے۔ عمرو بن عاص جسے مصر کی حکومت سے معزول کردیا گیا تھا' وہ بھی حضرت عثمان کے خلاف سرگرم تھا۔ البتہ اِن سب کا دعویٰ تھا کہ حضرت عثمان نے سنتِ نبویؐ سے دوری اختیار کرلی ہے۔ اِس لحاظ سے اِس شورش کا مجموعی رُخ سیرتِ رسول کا احیا' عدل وانصاف کا قیام اور عوام پر ظلم اور ناانصافی سے پرہیز تھا۔

۱۔ تفسیر المنار۔ ج ۸۔ ص ۲۲۳

حضرت عثمان کے خلاف عوامی اعتراضات کے آغاز ہی سے امام علیؑ اُن (عثمان) کے اور اُن کے مخالفین کے درمیان واسطے کا کردار ادا کرتے تھے۔ بالفاظ دیگر آپ مخالفین کے ترجمان تھے اور حضرت عثمان تک لوگوں کے اعتراضات پہنچایا کرتے تھے۔ آپ نے ثالثی کے اِس کردار کے دوران بھی اعتدال کو ملحوظ رکھا۔ آپ اگرچہ خود بھی حضرت عثمان کے بعض نامناسب اعمال پر تنقید کیا کرتے تھے (۱) لیکن ثالث کی حیثیت سے آپ نے حضرت عثمان کے حقوق کا بھی خیال رکھا۔ آپ خلیفہ سوم پر اعتراض کرنے والوں کی شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُن سے عہد و پیمان لے کر مخالفین کے غم و غصے کو ٹھنڈا کرتے۔ البتہ یہ ایک قدرتی بات تھی کہ جب حضرت عثمان قتل ہو گئے اور حضرت علیؑ کی خلافت قائم ہوئی تو بنی امیہ اور قریش کے بعض گروہ اس بارے میں حضرت علیؑ ہی پر الزام لگانے لگے۔ حالانکہ اِس معاملے سے امامؑ کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کے باوجود بہت سے ایسے لوگ جو آپ کے نزدیکی اصحاب بن گئے تھے، وہ حضرت عثمان پر اعتراض کرنے والوں میں شامل تھے، اور حتیٰ اُن پر الزام تھا کہ وہ حضرت عثمان کے قتل میں براہِ راست ملوث رہے ہیں۔ جن لوگوں نے خلافت کے لیے حضرت علیؑ کا نام تجویز کیا، وہ سب کے سب حضرت عثمان کے مخالفین میں سے تھے، اور جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، یہی کوفیوں کے درمیان تشیع کی تشکیل کا نکتۂ آغاز تھا جنہوں نے اپنی اہم ترین سیاسی سرگرمی خلیفۂ سوم کی مخالفت سے شروع کی۔ گویا یہ افراد حضرت ابوبکر اور حضرت عمر سے مکمل طور پر راضی تھے۔

بہرصورت امامؑ کے حامی گروہ کی قوت، جو انصار، بہت سے صحابہ اور کوفہ کے باشندوں پر مشتمل تھی، اس قدر قوی تھی کہ اُس نے طلحہ اور زبیر کو ابھرنے کا موقع نہ دیا۔ اسی طرح سعد بن ابی وقاص کا بھی کوئی ذکر نہ ہوا۔ (۲) سعید بن میسب کی وہ طویل روایت جس میں انہوں نے حضرت عثمان کے قتل کے واقعات کو بیان کیا ہے اور جسے ہم اس سے پہلے نقل کر چکے ہیں، اُس میں آگے چل کے ذکر ہوا ہے کہ: اِس کے بعد علیؑ اپنے گھر تشریف لے آئے اور تمام لوگ آپ کے گھر کے باہر جمع ہو کر حضرت علیؑ کی خلافت کے حق میں نعرے لگانے لگے۔ وہ امامؑ سے بیعت کے لیے اپنا ہاتھ بڑھانے کی درخواست کرنے لگے۔ امامؑ نے فرمایا کہ بیعت کا تعلق تم لوگوں سے نہیں ہے، یہ اصحابِ بدر کا معاملہ ہے، وہ جس کسی کو خلیفہ بنائیں گے، وہی خلیفہ ہوگا۔ اِس کے بعد وہ تمام اصحابِ بدر جو بقیدِ حیات تھے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے آپ

۱۔ سعید بن میسب کہتے ہیں: حضرت علیؑ اور حضرت عثمان کے درمیان سخت جملوں کا تبادلہ ہوتے میں نے خود دیکھا ہے، اور بات یہاں تک جا پہنچی تھی کہ حضرت عثمان نے حضرت علیؑ پر اپنا تازیانہ بھی بلند کر لیا تھا۔ میں نے ان کے درمیان صلح و صفائی کروائی۔ دیکھیے: انساب الاشراف۔ ج ۴۔ ص ۱۳۲۔ ش ۱۱۲

۲۔ حکمیت کی کشمکش کے درمیان سعد نے کہا تھا کہ خلافت کا حق سب سے زیادہ اسی کو حاصل ہے، کیونکہ حضرت عثمان کے قتل اور ان حالیہ فتنوں میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ دیکھیے: انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۳۴۴

سے آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی درخواست کی۔(۱)

اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصرار کے باوجود امامؑ نے خلافت قبول کرنے سے اجتناب کیا۔طبری نے محمد حنفیہ سے نقل کیا ہے کہ: حضرت عثمان کے قتل کے بعد کچھ اصحاب میرے والد کے پاس آئے اور کہا: ہم کسی کو آپ سے زیادہ خلافت کا حقدار نہیں سمجھتے۔امیر المومنینؑ نے فرمایا: تمہارا امیر بننے سے بہتر ہے کہ میں تمہارا وزیر بنوں۔انہوں نے کہا: ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کے سوا کوئی اور بات نہیں مانیں گے۔(۲) امامؑ نے فرمایا کہ اُن کی بیعت خفیہ طور پر نہیں ہوگی بلکہ (اعلانیہ طور پر) مسجد میں ہونی چاہیے۔ابن عباس کہتے ہیں: مجھے ڈر تھا کہ مسجد میں کہیں کوئی مشکل پیش نہ آ جائے۔(۳) جب آپ مسجد میں تشریف لے گئے تو مہاجرین اور انصار نے مسجد میں آ کر آپ کی بیعت کی۔

ابو بشیر عابدی سے بھی نقل کیا گیا ہے کہ: حضرت عثمان کے قتل کے بعد لوگ کئی مرتبہ امامؑ کے پاس آئے اور آخر کار آپ کو خلافت قبول کرنے پر تیار کر لیا۔آپ منبر پر گئے اور فرمایا کہ مجھے خلافت کی کوئی ضرورت نہیں' میں اِسے طوعاً و کرہاً قبول کر رہا ہوں اور صرف اس صورت میں حکومت قبول کروں گا جب لوگ یہ وعدہ کریں کہ وہ مکمل طور پر میرا ساتھ دیں گے۔

ان روایات میں آیا ہے کہ لوگوں کے اِس ہجوم میں طلحہ و زبیر بھی موجود تھے۔جب سب لوگ مسجد میں جمع ہو گئے' تو سب سے پہلے طلحہ نے امامؑ کی بیعت کی۔سعد بن ابی وقاص نے بیعت سے اجتناب کیا اور کہا کہ جب تک سب لوگ بیعت نہیں کر لیتے وہ بیعت نہیں کریں گے۔عبداللہ ابن عمر نے بھی بیعت نہیں کی۔طبری میں طلحہ و زبیر کے بارے میں آنے والی یہ روایت کہ انہوں نے مالک اشتر کی تلوار کے خوف سے بیعت کی تھی' بہت سی دوسری روایتوں کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔امامؑ نے اُن سے کہا کہ وہ خلیفہ بن جائیں' آپ اُن کی بیعت کر لیں گے لیکن اُنہیں کسی طرح اپنے لیے حالات سازگار نظر نہیں آ رہے تھے' اِس لیے وہ امامؑ کی بیعت پر تیار ہو گئے' تاکہ اِس طریقے سے اپنے لیے کوئی مقام حاصل کر لیں۔اتفاقاً بعد میں خود اُن کی باتوں سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ جبراً بیعت سے اُن کی مراد یہ تھی کہ مدینے میں اُن کی بیعت کرنے والا کوئی نہ تھا' جبکہ حضرت علیؑ کو بہت سے لوگوں کی حمایت حاصل تھی۔

اس سے پہلے بیعت کی بحث میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ اصولاً امامؑ کی بیعت ایسی تھی ہی نہیں کہ وہ کسی سے زبردستی بیعت لیتے۔جیسا کہ جنگِ جمل کے بعد جب مروان نے کہا کہ اگر زبردستی کی گئی تب ہی وہ بیعت کرے گا' لہٰذا

۱۔انساب الاشراف۔ج ۳۔ص ۵۵۹۔۵۶۰۔ش ۱۴۱۹

۲۔تاریخ طبری۔ج ۳۔ص ۴۲۹' دیکھیے: انساب الاشراف۔ج ۲۔ص ۲۱۹

۳۔اسکافی کی روایت میں آیا ہے کہ ابن عباس نے کہا: مجھے اس بات کا خوف ہوا کہ کہیں کچھ احمق مسجد میں کچھ بول نہ دیں' یا جن کے باپ یا چچا رسول خداؐ کے ساتھ جنگوں میں مارے گئے ہیں' وہ اعتراض نہ کر بیٹھیں۔المعیار والموازنہ۔ص ۵۰

امامؑ نے اُس سے بیعت نہیں لی۔(۱)

طلحہ وزبیر نے بیعت کے فوراً بعد امامؑ سے بصرہ اور کوفہ کی گورنری کا مطالبہ کیا' لیکن امامؑ نے اُن کے اِس مطالبے کو قبول نہیں کیا۔ محمد بن حنفیہ کہتے ہیں: چند لوگوں کے سوا تمام انصار نے علیؑ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ مخالفین حسان بن ثابت' کعب بن مالک' مسلمۃ بن مخلد' محمد بن مسلمہ اور چند دوسرے افراد تھے جو "عثمانیہ" شمار ہوتے تھے۔ غیر انصاری مخالفین میں عبداللہ ابن عمر' زید بن ثابت اور اسامہ بن زید کا نام لیا جاسکتا ہے' کہ یہ سب کے سب لوگ حضرت عثمان کے دسترخوانِ خلافت کے خوشہ چیں تھے۔ طبری کہتا ہے: جہاں تک ہم جانتے ہیں کسی ایک بھی انصاری نے حضرت علیؑ کی بیعت سے انکار نہیں کیا۔(۲) لہٰذا ممکن ہے کہ جن بعض لوگوں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے علیؑ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی تھی' یہ وہ لوگ ہوں جنہوں نے بعد میں جمل' صفین اور نہروان کی جنگوں میں شرکت نہیں کی تھی' ایسا نہ تھا کہ انہوں نے خلیفہ تسلیم کرتے ہوئے حضرت علیؑ کی بیعت نہیں کی ہو۔(۳)

"دیاربکری" کی روایت کے مطابق جنگِ بدر میں شرکت کرنے والے وہ تمام لوگ جو اُس زمانے تک زندہ تھے' اُن سب نے علیؑ کی بیعت کی تھی۔(۴) "عبدالرحمٰن بن ابزیٰ" سے نقل کیا جاتا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ: بیعتِ رضوان میں شرکت کرنے والے ہم تقریباً آٹھ سو افراد نے جنگِ صفین میں شرکت کی اور ہم میں سے تریسٹھ افراد جن میں عماریاسر بھی شامل تھے' مارے گئے۔(۵)

"ابن اعثم" کی روایت کے مطابق امامؑ نے ابتدا میں بیعت لینے سے گریز کیا اور فرمایا: مجھے حالات اتنے ابتر نظر آرہے ہیں کہ نہ دلوں کو اِن پر اطمینان ہے اور نہ عقلوں کو اِن پر یقین۔ اس کے بعد آپ لوگوں کے ساتھ طلحہ کے پاس تشریف لے گئے اور اُن سے خلیفہ کے طور پر بیعت لینے کی درخواست کی۔ لیکن طلحہ نے کہا کہ خلافت کے لیے آپ سے زیادہ حقدار کوئی اور نہیں ہے۔ اسی طرح کی گفتگو زبیر کے ساتھ بھی ہوئی اور دونوں نے عہد کیا کہ وہ آپ کی مرضی کے

۱۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۲۶۳

۲۔ دیکھئے: تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۴۲۷۔ ۴۳۱ اور طلحہ کے ساتھ امامؑ کے کلام کے بارے میں دیکھئے: ص ۴۳۲ اور طلحہ اور زبیر کی جانب سے کوفہ اور بصرہ کی حکومت کے مطالبے کے لیے دیکھئے: انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۲۱۸

۳۔ آگے چل کر اس نظریئے کے بارے میں شواہد آئیں گے۔ یعقوبی کہتا ہے: قریش کے تین آدمیوں کے سوا سب لوگوں نے بیعت کرلی تھی؛ ان میں سے بھی ایک نے پہلے مخالفت کی' لیکن بعد میں بیعت کرلی تھی۔ دیکھئے: تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۱۷۹۔ ۱۷۸

۴۔ تاریخ الخمیس۔ ج ۲۔ ص ۲۶۱' مہاجرین اور انصار کی بیعت کے بارے میں دیکھئے: الجمل۔ ص ۱۰۲۔ ۱۱۰

۵۔ تاریخ خلیفہ بن خیاط۔ ص ۱۹۶

خلاف کوئی کام نہیں کریں گے۔(۱)

"ابن اعثم" نے حضرت علیؑ کے لیے بیعت لینے میں انصار کے کردار کے بارے میں گفتگو کی ہے اور کہا ہے کہ انصار کے نمائندوں نے مسجد میں لوگوں سے خطاب کیا' اس مجمع میں عراقی اور مصری مہاجرین کی خاصی تعداد بھی موجود تھی۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ: آپ لوگ "انصار اللہ" ہیں اور جو آپ کہیں گے' ہم اُسے قبول کریں گے۔ اِن لوگوں نے بھی خلافت کے لیے حضرت علیؑ کا نام تجویز کیا اور لوگوں نے اپنے نعروں کے ذریعے اُن کی تائید کی۔ اس روز لوگ مسجد سے چلے گئے۔ دوسرے دن امامؑ مسجد میں تشریف لائے اور فرمایا: تم اپنے امر (خلافت) کے لیے کسی اور کا انتخاب کرلو' میں بھی تمہارا اتباع کروں گا۔ لوگوں نے کہا: ہم اپنے کل کے فیصلے پر قائم ہیں۔ سب سے پہلے طلحہ نے' جن کا ہاتھ شل تھا' حضرت کی بیعت کی۔ اِسے بدشگونی قرار دیا گیا۔ پھر زبیر نے بیعت کی اور اِس کے بعد مہاجرین وانصار اور وہ تمام عرب وعجم اور موالی' جو اُس وقت مدینے میں موجود تھے' سب نے بیعت کی۔(۲)

امامؑ کیوں لوگوں سے بیعت نہیں لینا چاہتے تھے' اس بارے میں سب سے واضح ترین کلام خود امامؑ کا ہے۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ امامؑ اُس وقت کے معاشرے کو ایک ایسا فاسد معاشرہ سمجھتے تھے جس کی رہبری کرتے ہوئے آپ اپنے اصولوں اور اپنے مقاصد کو جامۂ عمل پہنانا ناممکن سمجھتے تھے۔(۳)

امامؑ کو اس بات کا احساس تھا کہ ان فتنوں کی موجودگی میں صحیح طور پر معاشرے کی رہنمائی نہیں کی جاسکتی۔ پھر جب امامؑ نے محسوس کیا کہ وہ آپ ہی کی بیعت پر مصر ہیں' تو آپ نے انکار کیا' تاکہ لوگوں سے یہ عہد لے سکیں کہ وہ اُن کی مکمل پیروی کریں گے' آپ کے احکامات کو دل وجان سے قبول کریں گے۔(۴) بعد میں پیش آنے والے حوادث وواقعات نے امامؑ کے اس خیال کی وضاحت کردی کہ "فتنوں" اور "شبہوں" کی موجودگی میں کام کرنا انتہائی دشوار ہوتا ہے۔ ایک موقع پر امامؑ نے فرمایا: اگر مجھے معلوم ہوتا کہ بات یہاں تک پہنچ جائے گی' تو میں پہلے ہی اس کام میں شامل نہ ہوتا۔(۵)

۱۔ان دونوں کے دماغ میں خلافت کا سودا سمایا ہوا تھا' اور طلحہ کو تو حضرت عائشہؓ کی حمایت بھی حاصل تھی۔ بلاذری لکھتا ہے: حضرت عائشہؓ حضرت عثمان کے قتل کے موقع پر مکہ میں تھیں اور مدینہ آرہی تھیں۔ راستے میں انہوں نے سنا کہ لوگوں نے طلحہ کے ہاتھ پر بیعت کرلی ہے۔ وہ بہت خوش ہوئیں۔ لیکن جب سنا کہ حضرت علیؑ کی بیعت ہوگئی ہے' تو وہیں سے مکہ پلٹ گئیں اور خونِ عثمان کے لیے انصاف کا نعرہ لگادیا۔ انساب الاشراف۔ ج۲۔ ص۲۱۸

۲۔الفتوح۔ ج۲۔ ص۲۴۳۔۲۴۵

۳۔نہج البلاغہ۔ خطبہ۹۲

۴۔تاریخ طبری۔ ج۳۔ ص۴۲۸

۵۔انساب الاشراف۔ ج۲۔ ص۲۱۳' اور دیکھئے: الغارات۔ ص۱۱۲

ایک مرتبہ امامؑ نے کوفہ میں "ابومریم" نامی ایک شخص کو دیکھا۔ آپ نے اُس سے کوفہ آنے کی وجہ دریافت کی' تو اُس نے کہا: میں آپ کے ساتھ کیے ہوئے اُس عہد و پیمان کی وجہ سے آیا ہوں جس میں آپ نے کہا تھا کہ اگر مجھے حکومت مل گئی تو میں فلاں فلاں کام کروں گا۔ امامؑ نے فرمایا: میں اپنے عہد پر قائم ہوں' لیکن روئے زمین کے خبیث ترین افراد میں گھرا ہوا ہوں' جو میری کسی بات پر کان نہیں دھرتے۔ (۱)

امامؑ کو درپیش دشواریاں

جب امامؑ نے زمام خلافت اپنے ہاتھ میں لی' تو آپ کے سامنے مشکلات اور دشواریوں کا ایک پہاڑ کھڑا تھا۔ یہ تمام دشواریاں اور ان کے ساتھ ساتھ حضرت عثمان کے قتل سے پیدا ہونے والی سیاسی بے چینی ایک تاریک مستقبل کی تصویر کشی کر رہی تھیں۔ یہاں ہم ان مشکلات کا ذکر کرنے کے بعد' ان کے حل کی اُن راہوں کو پیش کریں گے جو امامؑ کے سامنے موجود تھیں۔ ہر چیز سے پہلے یہ بات پیشِ نظر رہے کہ امامؑ جیسا انسان جو اصول و فروع کا لحاظ رکھنے کے بارے میں انتہائی حساس ہے' اُسے ان مشکلات کا سامنا تھا۔ اس سے پہلے ہر خلیفہ نے صرف وقتی طور پر اور فقط فتوحات میں اضافے کو ہدف بنا کر' کوئی راستہ کھولا تھا۔ لیکن اب یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ ان میں سے بہت سے راستے گمراہی کے راستے تھے' اور زمانے نے یہ بات واضح کر دی تھی۔ مثال کے طور پر حضرت عمر نے دیوان (وظائف کے رجسٹر) بناتے وقت قبائلی اصولوں کو مدِنظر رکھا تھا۔ جس کے منفی معاشرتی اور حتیٰ سیاسی اثرات اب پندرہ سال بعد واضح ہو رہے تھے۔ یہاں ہم گفتگو اور بحث کو منظم انداز میں پیش کرنے کی خاطر چند شعبوں میں امامؑ کی دشواریوں کا تذکرہ کرتے ہیں:

(۱)۔ امامؑ کی پہلی مشکل آپ کی جانب سے "اقتصادی عدالت" کو ملحوظ رکھنا تھا۔ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ حضرت عمر نے دیوان (وظائف کے رجسٹر) میں اسلام میں سبقت اور قبائلی ترکیب کو بنیاد بنایا۔ یعنی جن صحابہ نے ابتدا میں اسلام قبول کیا تھا' وہ زیادہ حصہ وصول کیا کرتے تھے۔ حضرت عثمان کے دور میں بھی یہی طریقہ جاری رہا۔ اُنہوں نے اپنی جانب سے بخششوں کا سلسلہ بھی شروع کر دیا' جس سے معاشرے کے مالدار اور غریب طبقات کے درمیان فاصلہ مزید بڑھ گیا۔ یہ ساری رقوم مالِ غنیمت کے خمس' خراج اور جزیے سے تعلق رکھتی تھیں' جو مفتوحہ زمینوں اور انفرادی طور پر لوگوں سے وصول کی جاتی تھیں' اور تمام عوام کی ملکیت تھیں۔ جب امامؑ نے زمامِ کار سنبھالی' تو ان اموال کو برابری اور مساوات کی بنیاد پر تقسیم کرنا شروع کیا۔ اپنے اس عمل پر امامؑ کی دلیل یہ تھی کہ رسول اللہؐ ایسا ہی کیا کرتے تھے۔

امامؑ نے اپنی پہلی ہی تقریر میں یہ فرما کر کہ وہ صرف سیرتِ رسولؐ پر عمل کریں گے (وانی حاملکم علی منهج

۱۔ اخبار البلدان ابن فقیہ ہمدانی۔ ص ۲۔۵

نبیکم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) اپنی مالی اور اقتصادی پالیسی واضح کردی تھی اور دوسروں پر مہاجرین وانصار کے تقدم کو ان کی معنوی اور روحانی فضیلت قرار دیا تھا' جو خدا کے نزدیک محفوظ ہے اور اس کا اجر انہیں خدا کے یہاں ملے گا' لیکن اِس دنیا میں جو شخص خدا اور اس کے رسول کی دعوت کو قبول کر کے مسلمان ہو جائے اور مسلمانوں کے قبلے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے' اسے تمام حقوق حاصل ہوں گے اور اُس پر اسلامی حدود نافذ ہوں گی۔ امامؑ نے مزید فرمایا کہ: تم اللہ کے بندے ہو اور مال بھی اللہ کا مال ہے' جو تمہارے درمیان برابر تقسیم ہوگا اور کسی کو کسی پر برتری حاصل نہیں ہوگی۔ پرہیزگاروں کے لیے خدا کے پاس بہترین اجر موجود ہے۔

امامؑ نے اپنی پالیسی پر زور دیتے ہوئے فرمایا: مبادا کل کوئی کہے کہ: "حرمنا علی ابن ابی طالب." (علی ابن ابی طالبؑ نے ہمارے حقوق روک لیے)۔(۲)

حضرت علی علیہ السلام نے اگلے دن عبداللہ بن ابی رافع کو حکم دیا کہ جو بھی آئے اُسے تین دینار دینا۔ اس موقع پر سہل بن حنیف نے کہا: یہ شخص میرا غلام تھا' جسے میں نے کل ہی آزاد کیا ہے۔ امامؑ نے فرمایا: سب کو تین دینار ملیں گے' اور ہم کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دیں گے۔ بنی امیہ کے عمائدین کا ایک گروہ اور طلحہ و زبیر بھی اپنا حصہ لینے نہیں آئے۔ اس سے اگلے روز ولید بن عقبہ کچھ اور لوگوں کے ساتھ امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور احد میں حضرت علیؑ کے ہاتھوں اپنے باپ کی ہلاکت اور وہاں سعید بن عاص کے باپ کے قتل اور عثمان کے نزدیک مروان کے باپ کی حقارت اور دوسرے امور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امامؑ سے درخواست کی کہ جو اموال اُنہیں دیے گئے ہیں کم از کم وہ اُن سے واپس نہ لیے جائیں۔ اِس کے علاوہ حضرت عثمان کے قاتلوں کا قصاص لیا جائے۔ امامؑ نے اُس کے مطالبات مسترد کر دیے اور اُس نے اپنی منافقت کا اظہار اور مخالفانہ ریشہ دوانیوں کا آغاز کر دیا۔

اِس سے اگلے دن امامؑ نے ایک مرتبہ پھر خطبہ ارشاد فرمایا اور غصے کے عالم میں تقسیم اموال کے سلسلے میں اپنے طرزِ عمل کی بنیاد کے طور پر اللہ کی کتاب کا ذکر کیا۔ امامؑ منبر سے نیچے تشریف لائے اور دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد (بات چیت کے لیے) مسجد کے ایک گوشے میں طلحہ و زبیر کے ساتھ بیٹھ گئے۔ اِن دونوں کی بنیادی شکایت یہ تھی کہ ایک تو آپ کاموں میں ہم سے مشورہ نہیں کرتے اور دوسرے تقسیم اموال میں آپ نے عمر بن خطاب کے برخلاف طرزِ عمل اختیار کیا ہے۔ آپ نے ہمیں بھی اُسی قدر حصہ دیا ہے' جس قدر حصہ اُن مسلمانوں کو دیا ہے جنہوں نے اسلام کی راہ میں کوئی تکلیف نہیں اٹھائی ہے۔

ا۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۷۔ ص ۳۶۔ ۳۷

امامؑ نے فرمایا: جب ایک بات کا حکم کتاب اللہ کے اندر موجود ہے' تو اُس بات میں مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں' اگر کوئی بات خدا کی کتاب اور سنتِ رسولؐ میں موجود نہ ہو' تو اُس میں' میں تم لوگوں سے مشورہ کروں گا۔ برابر تقسیم کے معاملے میں ہم سب شاہد ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرزِ عمل یہی تھا' اور کتابِ خدا بھی یہی حکم دیتی ہے۔(۱) اس موقع پر زبیر نے کہا: یہ ہے ہمارا صلہ؟ ہم نے ان کے لیے کام کیا' یہاں تک کہ عثمان قتل ہو گئے اور آج یہ اُن لوگوں کو ہم سے برتر قرار دے رہے ہیں جن سے ہم برتر تھے۔(۲) اس کے بعد ابن ابی حدید نے لوگوں کے حضرت عمر کی روش کے عادی ہو جانے کو اصحاب کی طرف سے امامؑ کی مخالفت کی اصل وجہ قرار دیا ہے' حالانکہ حضرت ابو بکر بھی رسول اللہؐ کے طریقے پر کاربند رہے تھے' اور کسی نے اُن کی مخالفت نہیں کی تھی۔ امامؑ نے اپنی روش پر اعتراض کرنے والے اور بطورِ سند حضرت عمر کی روش پیش کرنے والے اصحاب کے مقابل فرمایا: أَفَسُنَّةُ رَسُولِ اللهِ أَولىٰ بالاتّباعِ أَم سُنَّةُ عُمَرَ (آیا اتباع کے لیے رسول اللہ کی سنت بہتر ہے' یا سنتِ عمر؟)۔(۳)

امامؑ کی اس روش کی مخالفت میں شدت کا پیدا ہو جانا اس بات کا سبب بنا کہ خود امیر المومنینؑ کے اصحاب نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ آپ عربوں اور قریش کے اشراف کو موالیوں اور عجمیوں پر ترجیح دیں۔ امامؑ نے اِن کی یہ درخواست مسترد کر دی اور فرمایا: کیا تم مجھ سے یہ کہتے ہو کہ میں ظلم و ستم کے ذریعے کامیابی حاصل کروں؟(۴) بعد میں ابن عباس نے امام حسنؑ کے نام ایک خط میں لکھا: لوگوں نے اس لیے آپ کے والد کو چھوڑ دیا اور معاویہ کی طرف چلے گئے کہ آپ کے والد لوگوں کے درمیان مال کو برابر تقسیم کیا کرتے تھے اور انہیں (آپ کے والد کی) یہ بات برداشت نہیں تھی۔(۵)

بعض لوگوں نے تو واضح طور پر اپنی مخالفت کی یہی وجہ بیان کی تھی کہ علیؑ نے تقسیمِ اموال کے موقع پر اُن کا خیال نہیں رکھا ہے۔(۶) بہرحال امامؑ کی ایک خصوصیت جس میں آپ نے شہرت پائی یہی تھی کہ: قَسَمَ بالسَّويةِ وعَدَلَ

۱۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۷۔ ص ۳۷۔ ۴۲' المعیار والموازنہ۔ ص ۱۱۱۔ ۱۱۳' دعائم الاسلام۔ ج ۱۔ ص ۳۸۴' نہج السعادہ۔ ج ۱۔ ص ۲۱۵ اور ۳۰۰ اور وہیں پر تحف العقول۔ ص ۱۲۵' امالی ابن الشیخ۔ مجلس ۴۳۔ ص ۹۱۔ ش ۵' روضۃ الکافی۔ ش ۵۵۱ سے۔

۲۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۷۔ ص ۳۷۔ ۴۲

۳۔ دعائم الاسلام۔ ج ۱۔ ص ۳۸۴' نہج السعادہ۔ ج ۱۔ ص ۲۲۹

۴۔ الغارات۔ ج ۱۔ ص ۷۵' نثر الدرر۔ ج ۱۔ ص ۳۱۸

۵۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۱۶۔ ص ۲۳' الفتوح۔ ج ۳۔ ص ۱۴۹

۶۔ نہج الصباغہ۔ ج ۳۔ ص ۱۰۷۔ ۲۰۳

فی الرعیۃ. (آپ برابری سے تقسیم کیا کرتے تھے اور رعایا کے درمیان عدل سے کام لیتے تھے)۔(۱)

۲۔ہم ایک دوسرے مقام پر اشارہ کر چکے ہیں کہ فتوحات کے نتائج میں سے ایک نتیجہ عرب، ایرانی، نبطی، رومی اور بربر اقوام کا باہمی اختلاط تھا۔ اِن مختلف اقوام سے تعلق رکھنے والے افراد میں سے بہت سے ہجرت کر کے وہاں پہنچے تھے، یا جنگ کے مقصد سے لائے گئے تھے۔ اِن کی ایک بڑی تعداد دورانِ جنگ اسیر بنائے گئے افراد پر بھی مشتمل تھی، جو عرب قبائل سے تعلق رکھتے تھے اور شام، عراق اور حجاز کے مختلف علاقوں سے لائے گئے تھے۔ آزاد کردہ اسیروں کو ''موالی'' کہا جاتا تھا۔ اس سے مراد یہ تھی کہ یہ اسیر فلاں عرب قبیلے سے تعلق رکھتا تھا اور اب بھی ایک طرح سے اُسی قبیلے سے تعلق رکھے گا۔ قدرتی بات تھی کہ ''موالی'' عربوں سے پست سمجھے جاتے تھے، اور اُن کے مقابلے میں کمتر حقوق کے حقدار تھے۔ (امیر المومنینؑ کی) حکومت کی ایک مشکل یہ تھی کہ وہ اس مسئلے سے کس طرح نمٹے۔ یہ چیز قطعی ہے کہ جس دور میں امامؑ نے زمامِ کار ہاتھ میں لی، اُس دور کا معاشرہ ''موالی'' پر ''عرب'' کی برتری اور فوقیت کو ایک ثابت شدہ اصول تسلیم کیے ہوئے تھا۔ یہ چیز امامؑ کی عدالت طلب طبیعت کے لیے ایک بڑی مشکل تھی، اور آپ کو مذکورہ تفاوت اور امتیاز کے درست ہونے کے بارے میں دینی نقطۂ نظر سے کوئی دلیل نظر نہیں آتی تھی، بلکہ اِس کے برعکس تمام مسلمانوں کی برابری کے بارے میں واضح دلائل آپ کے پاس موجود تھے۔

حالانکہ حضرت عمر نے کہا تھا کہ عرب غلاموں کو بیت المال خرچ کر کے آزاد کرایا جائے (۲) اور اِس طرح انہوں نے مختلف اقوام کے درمیان ایک امتیاز قائم کر دیا تھا۔ لیکن امامؑ اِن کے درمیان معمولی سا فرق رکھنے پر بھی تیار نہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ دو عورتیں حضرت علیؑ کے پاس آئیں اور اپنے فقر و ناداری کا اظہار کیا۔ امامؑ نے فرمایا: اگر تمہاری بات سچ ہے، تو تمہاری مدد کرنا ہمارا فرض ہے۔ پھر آپ نے ایک شخص کو بازار بھیجا کہ اِن کے لیے لباس اور خوراک خریدے اور اِن میں سے ہر ایک کو سو سو درہم دیے۔ اِن میں سے ایک عورت نے اعتراض کیا اور کہا: میں عرب ہوں، جبکہ وہ دوسری عورت موالی ہے۔ ہمارے ساتھ یکساں سلوک کیوں ہو رہا ہے؟ امامؑ نے جواب دیا: میں نے قرآن پڑھا اور اُس میں خوب غور و خوض کیا ہے، وہاں مجھے کہیں نظر نہیں آیا کہ اولادِ اسماعیلؑ کو اولادِ اسحاقؑ پر مچھر کے پر کے برابر بھی فوقیت دی گئی ہو۔ (۳)

جب امامؑ کوئی مال تقسیم کرنا چاہتے تو فرماتے: حضرت آدمؑ کی کوئی اولاد غلام نہ تھی اور نہ کنیز۔ اللہ کے سب بندے

۱۔المعیار والموازنہ۔ص ۲۲۷، اور دیکھئے: حیاۃ الصحابہ۔ج ۲۔ص ۱۱۳

۲۔طبقات الکبریٰ۔ج ۳۔ص ۳۴۲

۳۔انساب الاشراف۔ج ۲۔ص ۱۴۱، الغارات۔ص ۷۰، (وسائل الشیعہ کے حاشیے میں: شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید اور بحار الانوار سے) تاریخ یعقوبی۔ج ۲۔ص ۱۸۳

آزاد ہیں۔۔۔اِس وقت میرے پاس کچھ مال موجود ہے' میں کالے اور گورے کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھوں گا' اور اسے سب میں برابر تقسیم کروں گا۔(۱) عرب اور عجم کے درمیان مساویانہ سلوک' عربوں کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ ایک مرتبہ حضرت علیؑ کی بہن "ام ہانی" عطایا میں سے اپنا حصہ لینے کے لیے امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ امامؑ نے انھیں بیس درہم دیے۔ امِ ہانی کی عجمی کنیز بھی آپ کے پاس آئی۔ اُسے بھی آپ نے بیس درہم دیے۔ جب ام ہانی کو یہ بات پتا چلی' تو وہ سخت ناراض ہوئیں' اور امامؑ کے پاس آ کر اعتراض کیا۔ امامؑ نے انھیں بھی یہی جواب دیا کہ میں نے قرآن میں عجم پر عرب کی برتری کا ذکر کہیں نہیں دیکھا ہے۔(۲)

ایک اور مقام پر بھی امامؑ نے مہاجرین اور انصار سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ: میں کسی کو بلاوجہ کوئی مال نہیں دوں گا اور کالے اور گورے کے درمیان مساویانہ سلوک کروں گا۔(۳) موالیوں اور عجمیوں کے ساتھ امامؑ کا عادلانہ رویہ اشعث بن قیس جیسے متعصب لوگوں کے لیے اعتراض کا باعث تھا۔ ایک مرتبہ جب امام منبر پر تشریف فرما تھے اشعث نے چلّا کر کہا: یہ سفید فام موالی ہم پر غلبہ پا گئے ہیں' اور آپ خود دیکھ رہے ہیں۔ اشعث کی یہ بات امامؑ کو ناگوار گزری۔ اس موقع پر ابن صوحان نے کہا: آج پتا چلے گا کہ عربوں کی کیا حیثیت اور منزلت ہے۔ حضرت علیؑ نے فرمایا: کون مجھے اِن موٹے جسم والے لوگوں کو سزا دینے سے روکے گا جو آدھے دن تک اپنے بستر پر کروٹیں بدلتے رہتے ہیں' جبکہ ایک قوم شب بیداری کے لیے اپنے بستر سے اٹھ کھڑی ہوتی ہے؟ مجھ سے چاہتے ہو کہ میں اُن کو دھتکاردوں اور ظالموں میں شامل ہو جاؤں؟ قسم اُس ذات کی جس نے دانے کو اُگایا اور جانداروں کو خلق کیا' میں نے حضرت محمدؐ سے سُنا ہے' آپ نے فرمایا کہ: خدا کی قسم! وہ لوگ تم (عربوں) کو ماریں گے' تا کہ تم دین کی طرف لوٹ آؤ' اُسی طرح' جیسے تم ابتدا میں انھیں دین پر لانے کے لیے مارتے تھے۔(۴)

مغیرہ ضبی کا کہنا ہے: حضرت علیؑ موالیوں سے محبت کرتے تھے اور اُن پر مہربان تھے' لیکن عمرؓ اُن سے بیزار اور دور رہا کرتے تھے۔(۵) امامؑ کے اشعار میں بھی ایک شعر ایسا ملتا ہے' جس میں آپ نے انسانی شرافت اور خدا کے نزدیک اُس کے مقام ومنزلت پر قومی اور علاقائی اثرات کی نفی کی ہے۔

۱۔ نہج السعادہ۔ ج ۱۔ ص ۱۸۹

۲۔ ایضاً۔ ج ۱۔ ص ۲۱۲

۳۔ ایضاً۔ ج ۱۔ ص ۲۱۳۔۲۱۲' الاختصاص۔ ص ۱۵۱' بحار الانوار۔ ج ۴۱۔ ص ۱۰۶' المستدرک۔ ج ۱۱۔ ص ۹۳

۴۔ الغارات۔ ص ۱۸۶۔۱۸۷' غریب الحدیث ابوعبید۔ ج ۳۔ ص ۴۸۴' شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۱۹۔ ص ۱۲۴

۵۔ الغارات۔ ص ۱۸۷ (ترجمہ فارسی)

لعمرک ما الانسان الا بدینہ   فلا تترک التقویٰ اتکالا علی الحسب
بقد رفع الاسلام سلمان فارس   و قد ھجن الشرک الشریف ابا لھب

''تیری جان کی قسم! انسان کی اہمیت اُس کے دین کے علاوہ کسی اور چیز سے نہیں ہے۔ اور تجھے حسب و نسب پر بھروسا کر کے تقویٰ کو نہیں چھوڑ دینا چاہیے۔ اسلام نے فارس کے سلمان کو عظمت دی جبکہ ابولہب کو شرک نے ذلیل کیا۔'' (۱)

۳۔ امامؑ کے سامنے ایک اور زیادہ اہم مشکل دینی انحرافات اور وہ چیز تھی جسے اصحاب نے بدعت پرستی کا عنوان دے کر حضرت عثمان کو اُس پر مورد الزام ٹھہرایا تھا۔ بدعتوں کے علاوہ ایک اور بڑی مشکل یہ تھی کہ بہت سے لوگ دین کے بارے میں صحیح آگاہی نہیں رکھتے تھے۔ اور ان کے سامنے دینی معارف پیش کرنے کے سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا تھا۔ یہاں ہم اُن تحریفات کے کچھ نمونے پیش کریں گے جن کا امامؑ کو سامنا کرنا پڑا۔

ان مسائل میں سے ایک مسئلہ جس کی جانب ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں یہ ہے کہ صحابہ میں سے چند افراد اور بعض خلفا نے قرآن مجید اور سنت رسولؐ موجود ہونے کے باوجود صرف ''مصلحت پسندی'' کی بنیاد پر کچھ احکام وضع کر لیے تھے۔ اس دوران تاریخ اور حدیث کی کتابوں میں سنت سے بے اعتنائی انتہائی واضح اور بہت سی دلیلوں کے ساتھ نظر آتی ہے۔ ایک اعتدال پسند اہل سنت ''ابوجعفر نقیب'' کی عبارت شاید اس بارے میں واضح ترین عبارت ہو۔ وہ لکھتے ہیں: صحابہ نے متحد اور متفق ہو کر بہت سی نصوص (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واضح کلمات) کو ترک کر دیا تھا اور یہ سب اُس مصلحت کی بنا پر ہوتا تھا جسے وہ تشخیص دیا کرتے تھے۔ جیسے ذوی القربیٰ اور مولفۃ قلوبہم کا حصہ۔ (۲)

امامؑ نے ایک تفصیلی خطاب میں اس اندازِ فکر پر تنقید کی ہے اور سنت سے اپنی وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ آپ نے اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہ ایک مسئلے کے حل کے سلسلے میں مختلف آراء کا اظہار کیا گیا اور لوگ اپنی اپنی آراء لے کر حاکم کے پاس آئے اور حاکم نے ان سب آراء کو درست قرار دے دیا فرمایا: '' حالانکہ ان سب کا خدا ایک ہے ان کا نبی ایک ہے اور ان کی کتاب بھی ایک ہے۔ تو کیا خدا نے ایک دوسرے سے اختلاف کا حکم دیا تھا اور وہ اختلاف کر کے اس حکم کی تکمیل کرتے ہیں؟ یا اس نے انہیں ایک دوسرے کی مخالفت سے منع کیا ہے اور یہ اختلاف کر کے عمداً (خدا کے اس حکم کی) نافرمانی کرتے ہیں؟ یا یہ کہ خدا نے دین کو ناقص چھوڑ دیا تھا اور اس کی تکمیل کے لیے ان سے مدد کا خواستگار ہوا تھا؟ یا یہ لوگ

۱۔ مختصر تاریخ دمشق۔ ج ۱۰۔ ص ۳۶

۲۔ دیکھئے: شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۱۲۔ ص ۹۰۔ ۸۳

اس کے شریک تھے اور انہیں اس کے احکام میں دخل اندازی کا حق حاصل ہے اور خدا پر لازم ہے کہ وہ (ان کے اس عمل پر) راضی رہے؟ یا یہ کہ خدا نے دین تو مکمل اتارا تھا لیکن اس کے رسولؐ نے اسے پہنچانے میں کوتاہی کی تھی؟ حالانکہ خدا تو یہ فرماتا ہے کہ: ہم نے کتاب میں کسی چیز کے بیان کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔(۱)

امامؑ اپنے ایک اور خطاب میں بعض لوگوں کی غلطیوں کے بارے میں اظہارِ تعجب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: یہ نہ نبی کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں اور نہ اس کے وصی کے عمل کی پیروی کرتے ہیں، نہ غیب پر ایمان لاتے ہیں، نہ عیب سے دامن بچاتے ہیں۔ مشکوک اور مشتبہ چیزوں پر عمل کرتے ہیں اور اپنی خواہشات کے راستے پر چلتے ہیں۔ ان کے نزدیک بس وہی چیز اچھی ہوتی ہے جسے وہ اچھا سمجھتے ہیں، اور وہی چیز بُری ہوتی ہے جسے وہ برا سمجھتے ہیں۔ مشکل گتھیاں سلجھانے میں صرف اپنے آپ پر اعتماد کرتے ہیں، اور مشتبہ چیزوں میں صرف اپنی رائے پر بھروسا کرتے ہیں۔ گویا ان میں سے ہر ایک خود اپنا امامؑ ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ جو رائے اس نے قائم کی ہے اس کے لیے اس کے پاس مضبوط ترین بنیاد اور مستحکم ترین سبب ہے۔(۲)

دلچسپ امر یہ ہے کہ خلیفۂ دوم اور سوم کے خیال میں انہیں یہ حق حاصل تھا کہ وہ بعض معاملات میں سنت کو ایک طرف رکھ کر اپنے مخصوص قوانین بھی بنا سکتے ہیں (جیسا کہ حضرت عثمان نے نبی اکرم اور حتیٰ اپنے پیشرو خلفا کے خلاف منیٰ میں پوری (چار رکعت) نماز پڑھی) لیکن زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ مسلمان خلفا کے افعال و کردار کو ایسی سنتِ شرعی کے طور پر قبول کرنے لگے جس میں خطا کا کوئی امکان نہ ہو۔ خود حضرت عمر نے اپنی وفات کے وقت کہا کہ: جانشین کا تعین نہ کرنا بھی سنتِ (رسولؐ) ہے اور جانشین معین کرنا بھی سنتِ (ابوبکر) ہے۔(۳)

یعنی اُن کی نظر میں حضرت ابوبکر کا عمل بھی "سنت" شمار ہوتا تھا۔ اُن کی وفات کے بعد عبدالرحمٰن نے یہ شرط لگائی تھی کہ خلافت اُس کے سپرد کروں گا جو سنتِ رسولؐ اور سنتِ شیخین پر عمل (کا وعدہ) کرے گا۔ امامؑ کی جانب سے اِن بدعتوں کی مخالفت کا ایک واضح ترین نمونہ نمازِ تراویح کے بارے میں آپ کا طرزِ عمل ہے۔ اس نماز کو حضرت عمر بدعت (البتہ بقولِ خود اچھی بدعت!) سمجھتے تھے، اس کے باوجود انہوں نے اسے قائم کیا۔ جس زمانے میں امامؑ کوفہ میں تھے، کچھ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے درخواست کی کہ اُن کے لیے ماہِ رمضان میں نمازِ تراویح کے لیے ایک امامِ جماعت کا تقرر فرما دیں۔ آپ نے اس عمل سے انہیں ممانعت فرمائی۔ رات کے وقت ان لوگوں نے وارمضاناہ (ہائے ماہِ رمضان!) کی صدائیں بلند کرنا شروع کر دیں۔ حارث اعور امامؑ کی خدمت میں آئے اور کہا: لوگ شور مچا رہے ہیں اور

۱۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۸

۲۔ ایضاً۔ خطبہ ۸۸

۳۔ طبقات الکبریٰ۔ ج ۳۔ ص ۳۴۲

آپ کی بات سے ناراض ہیں۔ امامؑ نے فرمایا: ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو' جو جی میں آئے کریں اور جسے چاہیں اپنے لیے امامِ جماعت مقرر کرلیں۔(۱) اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ کا کیسی قوم سے واسطہ پڑا تھا اور وہ قوم کس طرح آپ کی پیروی کیا کرتی تھی۔

امامؑ نے مالک اشتر کے نام ایک خط میں' دینداروں کی دنیاداری کے لیے صالح افراد کے انتخاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحریر کیا کہ: یہ دین اشرار (برے لوگوں) کے ہاتھوں میں اسیر تھا۔ وہ اس میں اپنی خواہشات کے مطابق عمل کیا کرتے تھے اور دین کے نام پر دنیا کے طلبگار رہا کرتے تھے۔(۲)

ایک اہم ترین انحراف' جو ایک اصول کے طور پر کئی دوسرے انحرافات کی بنیاد بنا' وہ یہ تھا کہ حدیث کو نقل اور تحریر کرنے پر پابندی لگادی گئی۔ رشید رضا کے بقول اس چیز نے اسلامی تمدن پر ایسی ضرب لگائی' جس کا ازالہ ممکن نہیں۔(۳) ہم ایک اور مقام پر اس بات کی جانب اشارہ کرچکے ہیں کہ اس فیصلے کی وجہ سنت سے بے اعتنائی تھی۔ جمع قرآن کے سلسلے میں خلفا کے اقدام اور حضرت علیؑ کے جمع کیے ہوئے قرآن کو نظر انداز کرنا' جس کے ساتھ آیات کی تفسیر اور اُن کی شانِ نزول بھی تھی' نبی کریمؐ کے کلمات وارشادات سے بے توجہی کی ایک اور دلیل ہے' جنہیں امامؑ نے اس قرآن کے ساتھ تحریر کیا تھا۔

حضرت علی علیہ السلام نے مسلمانوں کے درمیان داخلی جنگوں کا اصل سبب لوگوں میں شکوک وشبہات کا راسخ ہوجانا اور ان کی کج فکری کو قرار دیا ہے: آج ہمیں اس لیے اپنے ہی مسلمان بھائیوں سے جنگ کرنا پڑ رہی ہے کہ ان میں کجی' انحراف' شبہ اور غلط تاویلات داخل ہوگئے ہیں۔(۴) امامؑ نے شبہ کے مفہوم پر خاص تاکید کی ہے۔ آپ نے ایک اور مقام پر فرمایا ہے کہ: شبہ کو شبہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ حق سے مشابہت رکھتا ہے۔(۵)

۴۔ امامؑ کو درپیش ایک اور مشکل معاشرے میں بُرائیوں اور بدعنوانیوں کا عام ہوجانا تھا۔ دنیاوی عیش وآرام کی جانب لوگوں کا شدید رجحان معاشرے میں دینی اقدار اور اس کے مقاصدِ عالیہ سے وابستگی کے کمزور پڑ جانے کا سبب بنا۔ سوائے

۱۔ مستطرفات السرائر۔ ص ۱۳۶' اور اس کے حاشیے میں: بحار الانوار۔ ج ۹۶۔ ص ۳۸' وسائل الشیعہ۔ ج ۵۔ ص ۱۹۳' تفسیر العیاشی۔ ج ۱۔ ص ۱۷۵۔

۲۔ نہج البلاغہ۔ مکتوب ۵۳

۳۔ المنار۔ ج ۶۔ ص ۲۸۸

۴۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۲۳

۵۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ۔ ۳۸

ظاہری شکل وصورت کے دین کی کوئی قیمت نہ تھی۔ جب خلیفہ سوم شدت کے ساتھ پر آسائش زندگی کی طرف مائل ہوئے تو یہی مزاج ان کی رعایا میں بھی ظاہر ہونے لگا اور اس نے رفتہ رفتہ پورے معاشرے کو دینی حوالے سے ایک مشکل میں گرفتار کر دیا۔ ایک ایسا معاشرہ جو فتنہ وفساد میں مبتلا ہو جائے وہ آسانی کے ساتھ اخلاقی توازن کی طرف نہیں آ سکتا۔ امامؑ اپنے ایک خطاب میں اپنے معاشرے کو زمانۂ جاہلیت کے معاشرے کی مانند قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں: تم آج ایسی ہی صورتحال کا شکار ہو جیسی صورتحال کا شکار تم بعثت رسولؐ کے وقت تھے۔(۱) اسی مقام پر امامؑ نے اُس معاشرے میں اقدار کی دگرگونی اور اس صورتحال میں تبدیلی لانے کی ضرورت پر زور دیا اور فرمایا: باقاعدہ تمہاری چھان پھٹک کی جائے گی اور دیگ کی طرح تہہ سے الٹ پلٹ کیے جاؤ گے یہاں تک کہ تمہارے ادنیٰ اعلیٰ ہو جائیں اور تمہارے اعلیٰ ادنیٰ ہو جائیں اور جو پیچھے رہ گئے ہیں وہ آگے بڑھ جائیں اور جو آگے بڑھ گئے ہیں وہ پیچھے آ جائیں۔

ایک اور جگہ پر امامؑ نے فرمایا: اور یاد رکھو کہ تم (جہالت کو) خیر باد کہہ دینے (اور شریعت سے ادب آموزی) کے بعد پھر سے صحرائی بدو ہو گئے ہو اور باہمی دوستی کے بعد پھر سے مختلف گروہوں میں بٹ گئے ہو۔ تمہارا اسلام سے صرف نام کا تعلق رہ گیا ہے۔ اور ایمان میں سے صرف علامتوں کو پہچانتے ہو۔۔۔ آگاہ ہو جاؤ کہ تم نے اسلام کی پابندیوں کو توڑ ڈالا ہے اس کی حدود کو معطل کر دیا ہے اور اس کے احکام کو مردہ بنا دیا ہے۔(۲)

امامؑ نے ایک اور مقام پر زمانے کے بگاڑ کے بارے میں فرمایا: جان لو کہ اللہ تم پر رحم کرے! تم ایک ایسے دور میں زندگی بسر کر رہے ہو جس میں حق بات کرنے والے کم ہیں زبانیں سچائی کے بیان سے عاجز ہیں اور حق کے پابند لوگ ذلیل ورسوا ہیں۔ لوگ گناہ اور نافرمانی پر جمے ہوئے ہیں ظاہرداری ونفاق کی بنا پر ایک دوسرے سے صلح وصفا رکھتے ہیں۔ جوان بداطوار اور بوڑھے گناہگار ہیں۔ عالم منافق اور قاری چاپلوس ہیں۔ نہ چھوٹے بڑوں کا احترام کرتے ہیں اور نہ امیر غریبوں کی مدد کرتے ہیں۔(۳)

مسلمانوں کی سیاست کے میدان میں ایک فطین انسان کے طور پر معاویہ جیسے شخص کی آمد معاشرے کے لیے ایک بڑے فتنے اور فساد کی حیثیت رکھتی تھی۔ اسی طرح بصرہ میں عثمانی گروہ اور کوفہ میں خوارج تھے۔ ان فاسد گروہوں نے کبھی تو اپنے باطل ہونے کو جاننے کے باوجود اور کبھی یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ راہ حق پر گامزن ہیں حق کی راہ پر چلنے والوں کا راستہ بند کیا۔ معاویہ کی فتنہ انگیزیوں کے بارے میں امامؑ کا ارشاد ہے: میں نے اس معاملے کا اندر باہر سے اچھی طرح الٹ پلٹ

۱۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۶

۲۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۹۲

۳۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۲۳۳، ربیع الابرار۔ ج ۱۔ ص ۹۶

کر جائزہ لیا' تو مجھے جنگ کے سوا کوئی صورت نظر نہ آئی' یا پھر یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائے ہوئے احکام کا منکر ہو جاؤں۔(۱)

اصلاح' امامؑ کی اصولی سیاست

امامؑ اصلاح کو اپنی بنیادی ذمے داری سمجھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ دین اور سنت کے پابند انسان تھے۔ علاوہ ازایں یہ بات بھی مدِ نظر رہنی چاہیے کہ امامؑ نے بنیادی طور پر اُن لوگوں کے توسط سے امور کی باگ ڈور سنبھالی تھی جو گزشتہ خلیفہ کو بد عنوانیوں کی وجہ سے قتل کر چکے تھے' اور جنہیں اس بات کی توقع تھی کہ نیا خلیفہ خرابیوں کی اصلاح کرے گا۔ امامؑ کی شخصیت کے ساتھ ان لوگوں کے مقصد کی ہم آہنگی' اُن کے امامؑ کی طرف رُخ کرنے کی ایک بنیادی وجہ تھی۔ گزشتہ خلفا کی پالیسی یہ تھی کہ فتوحات کے دائرے کو وسعت دی جائے۔ اس عمل نے اسلام کو بھی پھیلایا' نیز یہ قدرتی طور پر خلفا کے لیے ایک مثبت نکتہ شمار ہوا' اور اس نے لوگوں کی جیبوں کو بھی درہم و دینار سے بھر دیا۔

اب امامؑ کو اس دور کی خرابیوں کا ازالہ کرنا تھا۔ یہ انتہائی دشوار کام تھا اور اس نے آپ کو بہت سے عمائدین اور صاحبانِ اثر و رسوخ کے مقابل لا کھڑا کیا۔ یہاں ہم امامؑ کے اصلاحی اقدامات کا کچھ ذکر کریں گے۔

سب سے پہلے تو یہ بات پیش نظر رہے کہ امامؑ کے یہ اقدامات دو حصوں پر مشتمل تھے: ایک حصہ زبان کے ذریعے اور پر امن معاشرتی اقدامات کا تھا اور دوسرا حصہ جنگ و جہاد کا۔ جنگ بھی صرف ان لوگوں کے ساتھ کی جاتی تھی جو معاشرے کے قانونی حاکم کا حق ادا کرنے پر تیار نہ تھے' اور سرکشی پر اتر آئے تھے۔ یہاں ہم پہلے حصے کے بعض نمونے پیش کرتے ہیں:

معاشرے میں موجود اخلاقی مشکلات میں سے ایک مشکل جس کی اصلاح کے لیے امامؑ مشغول رہے' وہ فاتحین عرب کی دنیا پرستی' عیش طلبی اور مال و دولت کی جانب ان کا بڑھا ہوا رجحان تھا۔ یہ چیز اُن کے حواسوں پر بُری طرح چھا چکی تھی۔ جنگِ جمل اسی کا نتیجہ تھی' کیونکہ امامؑ اس بات پر تیار نہ تھے کہ بیت المال سے طلحہ اور زبیر کو دوسروں سے زیادہ حصہ دیں۔ ان حالات میں امامؑ نے فیصلہ کیا کہ لوگوں کو دنیا پرستی سے پرہیز کی نصیحت کریں۔ لہٰذا آپ اپنے عہدیداروں کے نام خطوط میں اُنہیں پُر تکلف ضیافتوں میں شرکت سے منع فرماتے تھے' جو حضرت عثمان کے دور میں ایک عام سی بات بن چکی تھیں۔ اگر دنیا کی مذمت کے بارے میں امامؑ کے فرامین کو یکجا کیا جائے' تو ایک مفصل کتاب تیار ہو جائے۔(۲)

۱۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۵۴

۲۔ زمخشری نے ربیع الابرار میں جلد ا صفحہ ۴۱ پر ان میں سے بعض کو ذکر کیا ہے۔

نہج البلاغہ اس قسم کے فقرات سے بھری پڑی ہے۔ اوران کی اس کثرت سے معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ اس مسئلے پر بہت اصرار فرماتے تھے۔ ہمیں امامؑ کی طرف سے پیش کیے گئے ایک متقی مثالی انسان کا نمونہ آپ کے معروف خطبے "خطبہ ہمام" میں نظر آتا ہے۔ بعض خطبوں میں امامؑ نے واضح الفاظ میں لوگوں کی دنیا پرستی پر اُن کی مذمت کی ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں: افسوس تمہارے دلوں سے موت کی یاد نکل گئی ہے اور جھوٹی امیدوں نے اُن پر قبضہ جمالیا ہے۔ اب تمہارے اوپر آخرت سے زیادہ دنیا مسلط ہے اور وہ تمہارے لیے عاقبت سے زیادہ پرکشش ہے۔ (۱)

امامؑ نے دین کی تشریح کو اپنے اصلاحی اقدامات میں سرفہرست قرار دیا اور کوشش کی کہ سنتِ نبویؐ سامنے لا کے اور دین کے فراموش شدہ اصول وفروع کو زندہ کر کے، معاشرے کے لیے اپنے اصلاحی پروگرام پر عمل درآمد کریں۔ آپ معاشرے کی اصلاح کے لیے اپنے اقدامات کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: کیا میں نے تمہارے درمیان ثقلِ اکبر (قرآنِ مجید) پر عمل نہیں کیا؟ کیا اپنے عدل سے تمہیں لباسِ عافیت نہیں پہنایا؟ کیا اپنے قول وفعل سے نیکیوں کو تمہارے درمیان نہیں پھیلایا؟ کیا اپنے کردار سے تمہارے سامنے اخلاقِ کریمانہ پیش نہیں کیے۔ (۲)

امامؑ نے اپنے کلمات میں کتابِ خدا اور سنتِ رسولؐ پر عمل کی جانب تاکیدی اشارے فرمائے ہیں۔ سنتِ رسولؐ سے امامؑ کی یہ وفاداری آپ کی اصلاحی سیاست کا ایک اہم ترین نکتہ ہے۔ دراصل آپ سنتِ رسولؐ سے روگردانی کو انحراف کی ایک واضح علامت بلکہ انحرافات کی بنیاد سمجھتے تھے۔ جب آپ کی خلافت کے ابتدائی دنوں ہی میں طلحہ اور زبیر نے آپ سے شکوہ کیا کہ آپ معاملات میں اُن سے مشورہ نہیں کرتے، تو آپ نے اُن سے فرمایا کہ: خدا کی قسم! مجھے تو کبھی بھی اپنے لیے خلافت اور حکومت کی خواہش اور حاجت نہیں رہی۔ تم ہی لوگوں نے مجھے اس کی دعوت دی اور اس پر آمادہ کیا۔ جب یہ میرے ہاتھ میں آگئی تو میں نے اس سلسلے میں اللہ کی کتاب کو نظر میں رکھا اور جو لائحہ عمل اُس نے ہمارے سامنے پیش کیا اور جس طرح فیصلہ کرنے کا اُس نے حکم دیا، میں نے اُسی کا اتباع کیا اور اس طرح رسولِ اکرمؐ کی سنت کی اقتدا کی۔ اس میں مجھے نہ تو تم سے اور نہ ہی کسی اور سے رائے لینے کی ضرورت تھی۔ (۳)

جب ایامِ حج میں عمرے کا احرام باندھنے یا عمرے اور حج دونوں کے لیے احرام باندھنے کے مسئلے پر امامؑ کا حضرت عثمان سے اختلاف ہوا تو آپ نے سنتِ رسول کا خیال رکھنے کے بارے میں فرمایا: ما كنت لادعَ سنّةَ رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم لاحدٍ من الناس. (میں کسی بھی شخص کی خاطر سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو

۱۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۱۳

۲۔ ایضاً۔ خطبہ ۸۷

۳۔ ایضاً۔ خطبہ ۲۰۵

نہیں چھوڑوں گا)۔(۱) اُن برسوں' میں جن میں حضرت عثمان منیٰ میں پوری نماز پڑھا کرتے تھے' ایک برس وہ بیمار ہو گئے۔ لہٰذا انہوں نے امامؑ سے نماز پڑھانے کی درخواست کی۔ امامؑ نے فرمایا: اگر وہ نماز پڑھائیں گے' تو رسول اللہ کی طرح سے نماز پڑھائیں گے۔ حضرت عثمان نے کہا نہیں' نہیں' جس طرح میں نماز پڑھاتا ہوں' اُس طرح سے۔ اس پر امامؑ نے اُن کی درخواست مسترد کر دی۔(۲) امامؑ خود فرماتے تھے کہ: اگر میں تمہارے درمیان سے چلا جاؤں' تو کیا کوئی ہے جو تمہارے درمیان اس سیرت پر عمل کرے؟(۳)

مطرف بن عبداللہ کہتے ہیں: رسول اللہؐ کے ایک صحابی عمران بن حصین کے ساتھ میں حضرت علیؑ کی اقتدا میں نماز پڑھ رہا تھا۔ نماز کے بعد عمران نے میرا ہاتھ تھاما اور کہا: **لقد صلّی صلاۃ محمّد ' ولقد ذکّرنی صلاۃ محمد.** (انہوں نے محمد کی طرح نماز پڑھی ہے۔ انہوں نے مجھے محمد کی نماز یاد دلا دی ہے)۔(۴) ابو موسیٰ اشعری جس نے امامؑ کی کوفہ آمد کے موقع پر اُن کی اقتدا میں نماز پڑھی تھی' کہتا ہے: **ذکرنا علی ابن ابی طالب صلاۃ النبی.** (علی ابن ابی طالب نے ہمیں نبی کی نماز یاد دلا دی)۔(۵) امامؑ کی اصلاحی پالیسی کے لیے سیرتِ نبوی کا احیا بہت اہمیت کا حامل تھا۔ امامؑ کے مخلص اصحاب بھی اس حقیقت کا احساس رکھتے تھے۔ عمار' امامؑ کے تعمیری اقدامات کے بارے میں کہا کرتے تھے: **لو انَّ علیاً لم یعمل عملاً ولم یصنع شیئاً الا انه احیا التکبیر تین عند السجود ' لکان قد اصاب بذلک فضلاً عظیما** (اگر علی نے سجدے سے سر اٹھاتے وقت دو تکبیریں کہنے (کی سنت) کو زندہ کرنے کے علاوہ کوئی کام بھی نہ کیا ہوتا' تو صرف اسی ایک عمل کی بنا پر آپ کو فضیلتِ عظمیٰ مل جاتی)۔(۶)

امامؑ نے حدیثِ رسول کی کتابت پر پابندی کے بارے میں حضرت عمر اور حضرت عثمان کی پالیسی کی مخالفت کرتے ہوئے برسرِ منبر اعلان کیا کہ: جو لوگ اس بات پر مائل ہیں کہ علم کو تحریر کریں' وہ کاغذ اور قلم تیار کر لیں۔ حارث اعور نے کاغذ اور قلم کا بندوبست کیا اور جو کچھ امامؑ بیان فرماتے' وہ لکھتے جاتے تھے۔(۷) آپ کے بعد امام حسنؑ بھی اپنے بچوں کو

۱۔ تاریخ مدینہ منورہ۔ ج ۳۔ ص ۱۰۴۳۔۱۰۴۴

۲۔ الامالی فی آثار الصحابہ۔ ص ۵۰

۳۔ المصنف عبدالرزاق۔ ج ۱۰۔ ص ۱۴۴

۴۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۱۸۰

۵۔ تاریخ الکبیر بخاری۔ ج ۳۔ ص ۳۴' الغدیر۔ ج ۹۔ ص ۲۶ اور ج ۱۰۔ ص ۲۰۱

۶۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۱۷۹' المصنف ابن ابی شیبہ۔ ج ۱۔ ص ۲۰۴ (طبع ہندوستان)

۷۔ تقیید العلم۔ ص ۹۰' ربیع الابرار۔ ج ۳۔ ص ۲۲۶ اور ۲۹۳' تاریخ بغداد۔ ج ۸۔ ص ۳۵۷' التراتیب الاداریہ۔ ج ۲۔ ص ۲۵۹' طبقات الکبریٰ۔ ج ۶۔ ص ۱۱۶

حدیثِ رسول لکھنے کی تاکید فرماتے تھے۔(۱) یہ بات بھی سامنے رہے کہ حضرت علیؑ خود بھی احادیثِ رسول لکھا کرتے تھے۔ آپ کے بعد آپ کی تحریر کی ہوئی یہ احادیث کتابی صورت میں اہل بیتؑ کے پاس ہوتی تھیں اور وہ باقاعدگی سے شیعوں کے لیے ''کتاب علیؑ'' میں سے احادیث نقل کیا کرتے تھے۔(۲)

ہم دیکھتے ہیں کہ خلیفۂ دوم کے زمانے میں ایک طرف تو حدیث کی کتابت پر پابندی تھی' جبکہ دوسری طرف قصہ گویوں کو اجازت حاصل تھی کہ وہ مسجد میں آ کر سابقہ انبیا کے بارے میں یہودیوں اور عیسائی راہبوں کے قصے سنائیں۔ امامؑ نے حدیث کی کتابوں کو رواج دیتے ہوئے قصہ گوئی کے خلاف سخت اقدامات اٹھائے اور شدت کے ساتھ اس کی ممانعت فرمائی۔ دراصل امامؑ یہودیوں کے آثار نقل کرنے کے مخالف تھے۔ آپ سے منقول ہے کہ: جس کسی کے پاس گزشتہ لوگوں کی کتابیں ہیں' وہ انہیں ضائع کر دے۔(۳) کسی نے یہودی کتابوں سے حضرت داؤد علیہ السلام اور اوریا کے قصے کو نقل کیا' تو آپ نے اس کا برا منایا اور فرمایا: اگر کسی نے اسے نقل کیا' تو اس پر حد جاری کروں گا۔(۴) ہم جانتے ہیں کہ اس قصے میں حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں کہا گیا ہے کہ (نعوذ باللہ) وہ قتلِ عمد اور زنا کے مرتکب ہوئے تھے۔ جب امامؑ بصرہ تشریف لائے' تو آپ نے قصہ گویوں کو مسجد سے نکال دیا۔(۵) آپ کے بعد امام حسنؑ نے بھی قصہ گوئی سے منع فرمایا۔(۶) امام زین العابدین علیہ السلام نے بھی حسن بصری کو' جو ایک زمانے میں قصہ گو تھے' اس عمل سے منع فرمایا اور انہوں نے بھی امامؑ کی بات کو قبول کیا۔(۷)

امامؑ نے اپنے ایک ابتدائی خطبے میں ارشاد فرمایا: **انی حاملکم علی منهج نبیکم صلی الله علیه و آله.** (میں

۱۔ ترجمۃ الامام الحسنؑ از ابن سعد۔ ص ۱۵۶

۲۔ ''کتاب علی باملاء نبیؐ'' کے موضوع کے بارے میں استاد احمدی میانجی نے 'مکاتیب الرسولؐ' میں تفصیل سے تحقیق کی ہے اور وہ مقامات جہاں ائمہ معصومینؑ نے اس کتاب سے احادیث نقل کی ہیں انہیں استخراج کیا ہے۔

۳۔ جامع بیان العلم و فضلہ۔ ج ۱۔ ص ۴۲

۴۔ مجمع البیان۔ ج ۸۔ ص ۴۷۲

۵۔ قوت القلوب۔ ج ۲۔ ص ۳۰۲' وسائل الشیعہ۔ ج ۲۔ ص ۵۱۵' تہذیب۔ ج ۲۔ ص ۴۸۶' کافی۔ ج ۲۔ ص ۳۱۲' اور دیکھئے: نثر الدرر۔ ج ۱۔ ص ۳۱۲' اخبار اصبہان۔ ج ۱۔ ص ۸۹

۶۔ تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۲۲۸۔ ۲۲۷

۷۔ وفیات الاعیان۔ ج ۱۔ ص ۷۰' دوسرے ائمہؑ کے موقف کے بارے میں دیکھئے: پژوهشی در نقش دینی و اجتماعی قصہ خوانان در تاریخ اسلام۔ ص ۱۱۱۔ ۱۱۷ (طبع قم ۱۳۷۰ ھ ش)

تمہارے درمیان نبی کا طرزِ عمل لے کے چلوں گا میں تمہیں سنتِ نبویؐ پر چلاؤں گا)۔(۱) تاریخی کتابوں میں دوسرے اصحابِ رسولؐ سے زیادہ حضرت علیؑ کی زبانِ مبارک سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق اور ان کی شخصیت کے فضائل نقل ہوئے ہیں۔ اس کا ایک سبب یہی ہے کہ امام ہی سب سے زیادہ آنحضرت کی روش کے پیروکار تھے۔ اسی لیے ابتدا ہی سے آپ نے پیغمبر اکرم کی تمام حرکات و سکنات کو اپنے ذہن نشین کیا تھا اور بعد میں بہترین الفاظ کے ذریعے آنحضورؐ کی شخصیت کی توصیف کیا کرتے تھے۔(۲)

کسی نے حسن بصری سے امام کے بارے میں دریافت کیا' تو انہوں نے جواب دیا: اراهم السبیل واقام لهم الدین اذا اعوجّ . (انہوں نے لوگوں کو راستہ دکھایا اور جب دین راستے سے ہٹا تو اسے سیدھی راہ پر لگایا)۔(۳)

حسن بصری کا یہ جملہ انتہائی موزوں اور ٹھیک اُس پالیسی کا آئینہ دار ہے جس کا امامؑ نے اپنی حکومت کے دوران مظاہرہ کیا۔ ایک شاعر نے آپ کو مخاطب کر کے کہا ہے: اوضحت من دیننا ما کان مشتبها جزاک ربک عنا فیه احسانا. (دین کی جو باتیں ہمارے لیے مشتبہ تھیں آپ نے اُن کی وضاحت کی۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے)۔(۴)

حضرت ابوذر غفاری' امامؑ کی تعریف میں کہا کرتے تھے: علی زرّ الدین. (علیؑ دین کا ستون ہیں)۔(۵) خود امامؑ نے بھی اپنی سیرت کی سیرتِ رسولؐ کے ساتھ مطابقت کا بارہا ذکر کیا ہے۔ جنگِ جمل کے بعد اہلِ بصرہ کے ساتھ اپنے طرزِ عمل کے بارے میں فرمایا: میں نے اہلِ بصرہ کے ساتھ وہی طرزِ عمل اختیار کیا' جو طرزِ عمل اہلِ مکہ کے ساتھ پیغمبرؐ نے اختیار کیا تھا۔(۶) حضرت علیؑ نے احیائے سنت کو امامؑ کی ایک ذمے داری قرار دیا۔(۷) ایک دوسرے مقام پر آپ خدا کا بہترین بندہ اُس امامِ عادل کو قرار دیتے ہیں جو احیائے سنت کے لیے سعی میں مشغول ہو۔ اور اسی طرح اس ظالم امام کو خدا کا بدترین بندہ سمجھتے ہیں جو سنت کا خاتمہ کرے۔(۸)

۱۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۷۔ ص ۳۶

۲۔ اس کا ایک تفصیلی نمونہ دیکھئے: نہج السعادہ۔ ج ۱۔ ص ۹۷۔۹۷' اور وہاں نقل کیے جانے والے دوسرے حوالوں کو ہم نے دوسرے منابع سے کتاب کی پہلی جلد میں "نقشِ تاریخی رسولِ خداؐ" کے عنوان کے ذیل میں بیان کیا ہے۔

۳۔ المصنف ابن ابی شیبہ۔ ج ۱۲۔ ص ۸۳

۴۔ نقض۔ ص ۲۹۶' تحف العقول۔ ص ۳۳۲۔۳۳۸' مسند الامام الہادیؑ۔ ص ۲۰۷' بحار الانوار۔ ج ۳۸۔ ص ۲۳۵

۵۔ الفائق فی غریب الحدیث۔ ج ۲۔ ص ۱۰۸

۶۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۲۷۳

۷۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۰۵

۸۔ ایضاً۔ خطبہ ۱۶۴

امامؑ بدعت سے مکمل طور پر پرہیز کیا کرتے تھے۔اس سلسلے میں آپ نے فرمایا: ہر بدعت کے آنے سے ایک سنت کو چھوڑنا پڑتا ہے۔(۱)

امامؑ نے اپنی وصیت کے طور پر دو باتوں کا تذکرہ فرمایا' ایک خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا اور دوسرے سنت رسول کو ضائع و برباد نہ کرنا۔(۲) امامؑ ایسے لوگوں کو منافق قرار دیتے تھے' جو فتنے کے سمندر میں اترے ہوئے ہوں' اور سنتوں کو چھوڑ کر بدعتوں میں پڑ چکے ہوں۔(۳) جبکہ آپ کی نظر میں اولیا اللہ وہ لوگ ہیں جو یحیون سنن اللہ و سنن رسوله. (اللہ اور اُس کے رسول کی سنت کو زندہ کرتے ہیں)۔(۴) امامؑ کے نزدیک لوگوں کے دو گروہ ہیں: متبع شرعة ومبتدع بدعة. (ایک شریعت کی پیروی کرنے والا اور دوسرا بدعتیں ایجاد کرنے والا)۔(۵)

نہج البلاغہ میں موجود مذکورہ فقرات اور ان ہی جیسے دوسرے کلمات سنت کی پیروی اور بدعت سے پرہیز کے سلسلے میں امامؑ کی ذہنیت کی عکاسی کرتے ہیں۔آپ کا یہ موقف ان لوگوں کے بالکل برعکس تھا جنہوں نے کم از کم کچھ مواقع پر (تو یقیناً) بدعتیں ایجاد کی تھیں اور جب اُن کے اس عمل پر اعتراض کیا جاتا تھا' تو وہ کہتے تھے کہ اگر یہ بدعت ہے' بھی' تو اچھی بدعت ہے۔

امامؑ دین کے معاملے میں کسی بے جا نرمی کے قائل نہ تھے۔آپ فرماتے تھے: واللہ لا ادھنت فی دینی. (خدا کی قسم! میں نے دین کے معاملے میں کبھی بے جا نرمی سے کام نہیں لیا)۔(۶) ایک مرتبہ بنی اسد کے ایک شخص کو' اس پر حد جاری کرنے کی غرض سے آپ کے پاس لایا گیا۔بنی اسد کے لوگوں نے امامؑ سے درخواست کی کہ اس پر حد جاری کرنے سے صرف نظر فرمائیں۔امامؑ نے اُن سے فرمایا: جس چیز کا اختیار میرے پاس ہے' وہ تم مجھ سے طلب نہ کرو' اُسے میں ضرور دوں گا۔وہ لوگ خوشی خوشی باہر نکل آئے۔امامؑ نے اس پر حد جاری کی اور فرمایا: یہ خدا کا کام تھا' میرے ہاتھ میں اس کا اختیار نہیں تھا کہ میں تمہیں دے سکتا۔(۷)

۱۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۴۵

۲۔ ایضاً۔ خطبہ ۱۴۹

۳۔ ایضاً۔ خطبہ ۱۵۴

۴۔ ایضاً۔ خطبہ ۱۹۴

۵۔ ایضاً۔ خطبہ ۱۷۶

۶۔ نہج السعادہ۔ ج ۲۔ص ۵۳۷

۷۔ ربیع الابرار۔ ج ۱۔ص ۵۳۹

امام امت کی ہدایت کے سلسلے میں اپنے کردار کے بارے میں فرماتے ہیں: اے لوگو! میں نے تمہیں وہ نصیحتیں کی ہیں جو انبیا اپنی امتوں کو کرتے چلے آئے ہیں اور ان چیزوں کو تم تک پہنچایا ہے جو اوصیا اپنے بعد والوں کو پہنچاتے رہے تھے' میں نے تمہیں اپنے تازیانے سے ادب سکھانا چاہا مگر تم سیدھے نہ ہوئے' لعنت ملامت سے تمہیں ہنکایا مگر تم یکجانہ ہوئے۔ اللہ ہی تمہیں سمجھے! کیا میرے علاوہ کسی اور امام کی توقع میں ہو' جو تمہیں سیدھی راہ پر چلائے گا اور صحیح راستہ دکھائے گا؟(۱)

اسی طرح اپنے بارے میں فرماتے ہیں: بے شک میں تمہارے درمیان ایسے ہوں جیسے اندھیرے میں جلتا چراغ۔ جو کوئی اس میں داخل ہو گا وہ اس سے روشنی حاصل کرے گا۔(۲)

بہر صورت امامؑ سنت رسولؐ کے ٹھیک ٹھیک نفاذ کے اس قدر مشتاق تھے کہ آپ کی کوشش ہوا کرتی تھی کہ آپ کی تمام حرکات وسکنات بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مانند ہوں۔ جب آپ پر اعتراض کیا گیا کہ آخر آپ کیوں مسجد میں تو لوگوں کو اچھا کھانا دیتے ہیں لیکن خود گھر کے اندر بھوسی کی روٹی کھاتے ہیں؟ تو امامؑ نے گریہ کرتے ہوئے فرمایا: خدا کی قسم! میں نے کبھی نبی اکرمؐ کے گھر میں بغیر بھوسی کی روٹی نہیں دیکھی۔(۳) اس بات کا مفہوم یہ ہے کہ امامؑ کی کوشش ہوتی تھی کہ آپ کی غذا بھی ویسی ہی ہو جیسی غذا رسولِ خداؐ استعمال کیا کرتے تھے۔

بیعت توڑنے والوں کے مقابل امامؑ کا طرزِ عمل (جنگِ جمل)

۳۶ ہجری میں امامؑ کے زمامِ کار سنبھالنے کے چند ماہ بعد ہی' اسی سال کے ماہِ جمادی الثانی میں مسلمانوں کے درمیان پہلی داخلی جنگ چھڑی۔ یہ جنگ طلحہ وزبیر کی قیادت میں ایک بیعت شکن گروہ اور حضرت عائشہ کے ایما پر ہوئی۔ اس عہد شکن گروہ نے اس سلسلے میں چند باتوں کو بہانا بنایا تھا۔

پہلی بات یہ کہ حضرت عثمان کو مظلوم قتل کیا گیا ہے۔ حالانکہ جس ہنگامے اور احتجاج کے نتیجے میں حضرت عثمان قتل ہوئے تھے اسکے آغاز میں طلحہ وزبیر اور حضرت عائشہ کا بہت بڑا حصہ تھا۔ لیکن اس موقع پر یہ لوگ انتہائی بے پروائی سے کہنے لگے کہ ہم نے توبہ کرلی ہے اور اب ہم اپنے اس عمل کی تلافی کے لیے مظلوم خلیفہ کے قتل کا انتقام لینا چاہتے ہیں۔ یقینی طور یہ باتیں حقیقتِ حال سے بے خبر لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے تھیں۔

دوسری بات یہ تھی کہ وہ کہنے لگے کہ ہم نے مدینہ میں مجبوراً بیعت کی تھی۔ لہٰذا وہ بیعت صحیح نہیں تھی اور کم از کم ان کی

۱۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۸۲

۲۔ ایضاً۔ خطبہ ۱۸۷

۳۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۱۸۷

نظر میں امام علیؑ کی حکومت جائز نہیں ہے۔ اور اسی طرح کیونکہ ان سے (بقول ان کے) زبردستی بیعت لی گئی تھی اس لیے وہ خلیفہ کی اطاعت کے بھی پابند نہیں ہیں۔ اس صورتحال سے نجات کے لیے ان لوگوں نے یہ راہ حل تجویز کی کہ معاملے کو نمٹانے کے لیے وہی کیا جائے جو حضرت عمر کی وفات کے وقت کیا گیا تھا' یعنی شوریٰ۔ جب حضرت عائشہ نے طلحہ و زبیر سے اپنی ذمے داری کے بارے میں دریافت کیا' تو انہوں نے کہا: آپ لوگوں سے کہیے کہ حضرت عثمان کو مظلوم قتل کیا گیا ہے اور اب خلافت کا معاملہ مسلمانوں کی ایک شوریٰ کے سپرد کیا جائے' جیسا کہ حضرت عمر نے اپنے بعد کے لیے کیا تھا۔ (۱)

ایسی شوریٰ جس کے رکن طلحہ و زبیر بھی تھے' اس کا دوبارہ بننا انہیں اپنی خلافت کے لیے امید کی کرن دکھائی دیتا تھا۔ اسی شوریٰ کی وجہ سے طلحہ و زبیر بلکہ سعد بن ابی وقاص تک یہ سمجھنے لگے تھے کہ وہ بھی خلافت کے لیے مکمل اہلیت رکھتے ہیں۔ زبیر نے جنگِ جمل کے دوران حضرت علیؑ سے کہا تھا کہ: ہم سمجھتے ہیں کہ آپ خلافت کے لیے ہم سے زیادہ اہلیت نہیں رکھتے۔ (۲)

ادھر حضرت عائشہ کی خواہش یہ تھی کہ خلافت بنی تیم کے پاس واپس آجائے۔ جب حضرت عثمان کی مخالفت عروج پر پہنچی تو حضرت عائشہ حج کے ارادے سے مکہ روانہ ہو چکی تھیں۔ وہاں انہوں نے سنا کہ عثمان قتل ہو گئے ہیں اور ان کی جگہ طلحہ نے لے لی ہے۔ یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئیں اور مدینہ کی جانب چل پڑیں اور "سرف" کے مقام پر پہنچ گئیں۔ وہاں انہوں نے سنا کہ لوگوں نے علیؑ کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے۔ یہیں سے وہ مکہ واپس لوٹ گئیں اور حضرت عثمان کی مظلومیت کا نعرہ بلند کیا۔ (۳)

جب حضرت عائشہ نے سنا کہ لوگوں نے علیؑ کی بیعت کر لی ہے' تو کہا: عثمان کی ایک رات علیؑ کی پوری زندگی کے برابر ہے۔ (۴) امامؑ کی شہادت کے بعد بھی عالم یہ تھا کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہ کے پاس ایک نومولود کو لایا گیا تو انہوں نے بچے کا نام "عبدالرحمٰن" رکھا۔ (۵) جنگِ جمل کی شکست کے بعد حضرت عائشہ نے ابن عباس سے کہا: میری نظر میں

۱۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۲۲۳۔ جنگِ جمل کے بارے میں بنیادی حوالہ شیخ مفید کی کتاب "الجمل" ہے۔ کیونکہ انہوں نے اپنی اس کتاب کو ان دسیوں منابع کی مدد سے تیار کیا ہے جو انہیں اس زمانے میں میسر تھے۔ ہم نے بھی اسی کتاب سے اور اس سے پہلے تالیف کی گئی چند کتب سے استفادہ کیا ہے۔

۲۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۲۵۵

۳۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۲۱۷۔ ۲۱۸' اور ج ۵۔ ص ۹۱' شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۶۔ ص ۲۱۵

۴۔ انساب الاشراف۔ ج ۵۔ ص ۹۱

۵۔ الجمل۔ ص ۱۶۰' اور اسی کے حاشیے میں الشافی جلد ۴ صفحہ ۳۵۶ اور بحار الانوار جلد ۳۲ صفحہ ۳۴۱ سے۔

اس شہر سے زیادہ ناپسندیدہ شہر کوئی نہیں جس میں تم بنی ہاشم رہتے ہو۔(۱)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری ایام میں آپ کے تشریف لانے کے بارے میں ایک روایت حضرت عائشہ سے نقل کی جاتی ہے جس میں وہ کہتی ہیں کہ: دو افراد نے نبی کو اُن کے شانوں کے نیچے سے تھام رکھا تھا۔ ان میں سے ایک قثم بن عباس تھے اور ایک کوئی دوسرا شخص تھا۔ اس روایت کا راوی کہتا ہے کہ دوسرے آدمی سے مراد علی ہیں۔(۲) البتہ کبھی کبھی وہ یہ اعتراف بھی کرتی تھیں کہ پیغمبر اکرمؐ کے نزدیک عزیز ترین مرد علی اور عزیز ترین عورت فاطمہؑ تھیں۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ پھر آپ نے ایسا کیوں کیا؟ تو اپنی چادر کا کنارہ اپنے منہ پر ڈال کر کہا: بس ایک کام ہونا تھا جو ہو گیا۔(۳) شیخ مفید نے اپنی کتاب "الجمل" کے آخر میں ایک فصل شامل کی ہے جس میں حضرت علیؑ کے ساتھ حضرت عائشہ کی پرخاش کے اسباب بیان کیے ہیں۔(۴) بعد میں جب امام حسنؑ کو نبی اکرمؐ کے نزدیک دفن کرنا چاہا' تو حضرت عائشہ نے اس کی مخالفت کی اور کہا: تم ایسے شخص کو میرے گھر میں کیوں دفن کرنا چاہتے ہو جسے میں پسند نہیں کرتی۔(۵) احمد امین نے بھی جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کے ساتھ حضرت عائشہ کی عداوت کے اسباب بیان کیے ہیں۔(۶)

طلحہ اور زبیر مکہ آ گئے اور انہوں نے اچھی طرح یہ بات جان لی کہ حضرت عائشہ کے بغیر اُن کی منشا پوری نہ ہو سکے گی۔(۷) لہٰذا انہوں نے حضرت عائشہ سے کہا: اگر بصرہ کے لوگ آپ کو دیکھیں گے' تو وہ سب آپ کے ساتھ ہو جائیں گے۔(۸) امامؑ نے حضرت عائشہ کے بارے میں فرمایا: لوگوں کے درمیان ایسی شخصیت جس کی لوگ سب سے زیادہ اطاعت کیا کرتے تھے۔(۹) متعدد مرتبہ مذاکرات کے بعد حضرت عائشہ نے اُن کے ساتھ بصرہ جانا قبول کیا۔ حضرت امِ سلمہ نے اُن کو اس سفر سے روکنے کی بہت کوشش کی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ حضرت عائشہ نے اُنہیں بھی بصرہ چلنے کی دعوت دی تھی۔ انہوں نے امِ سلمہ سے کہا: عبداللہ بن عامر نے مجھ سے کہا ہے کہ بصرہ میں ایک لاکھ تلواریں تیار ہیں۔ کیا تم اس

۱۔ الفتوح۔ ج ۲۔ ص ۳۳۷' نثر الدر۔ ج ۳۔ ص ۳۱

۲۔ مسند احمد۔ ج ۶۔ ص ۳۴۔ ۳۸

۳۔ ربیع الابرار۔ ج ۱۔ ص ۸۲۱

۴۔ ایضاً۔ ص ۴۲۵۔ ۴۳۳

۵۔ ایضاً۔ ص ۴۳۸

۶۔ ظہر الاسلام۔ ج ۴۔ ص ۳۸۔ ۳۹

۷۔ تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۴۵۱

۸۔ اخبار الطوال۔ ص ۱۴۴

۹۔ انساب الاشراف۔ ج ۲ ص ۲۲۸

صورتحال کی اصلاح کے لیے ہمارے ساتھ چلوگی؟ ام سلمہ نے کہا: خونِ عثمان کے انتقام کے لیے؟! جبکہ آپ خود اُن کے شدید ترین مخالفوں میں سے تھیں۔ کیا آپ ہی نے انہیں "نعثل" نہیں کہا تھا؟ اس کے بعد حضرت ام سلمہ نے اُن کے سامنے حضرت علیؑ کے کچھ فضائل بیان کیے اور اُن سے کہا کہ مہاجر اور انصار جس شخص کی بیعت کر چکے ہیں، آپ اُس کی مخالفت نہ کریں۔ انہوں نے نبی اکرمؐ کے اس فرمان کی جانب بھی اشارہ کیا کہ آپ نے فرمایا تھا: علي ولي كل مومن و مومنة. (علیؑ ہر مومن اور مومنہ کے ولی ہیں)۔ عبداللہ ابن زبیر، جو دروازے پر کھڑے تھے، بولے: ہم نے حضورؐ سے ایسی کوئی بات نہیں سنی۔ ام سلمہ نے کہا: لیکن تمہاری خالہ نے سنی ہے۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا: علي خليفتي علي كم في حياتي و مماتي. (میری زندگی اور موت میں علیؑ تم پر میرا خلیفہ ہے)۔ حضرت عائشہ نے بھی تائید کی کہ انہوں نے یہ باتیں سنی ہیں۔ (۱)

حضرت عائشہ کا کہنا یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے معاملات کی اصلاح کے لیے اٹھی ہیں۔ انہوں نے حفصہ کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ حفصہ نے کہا: میری وہی رائے ہے جو عائشہ کی ہے۔ اور وہ بصرہ جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔ لیکن عبداللہ ابن عمر نے انہیں اصحابِ جمل کے ساتھ جانے سے روک دیا۔ (۲)

اس وقت مدینہ پر بنی ہاشم کا کنٹرول تھا اور شورشی وہاں نہیں آسکتے تھے۔ شام، معاویہ کے ہاتھوں میں تھا اور صاف نظر آ رہا تھا کہ وہاں جانا ان کے لیے کسی طرح سودمند نہیں۔ (۳) کیونکہ وہاں مکمل طور پر معاویہ کی حکمرانی تھی اور وہ صرف ان کے آلۂ کار بن کر رہ جاتے۔ دوسری طرف ان کا اور معاویہ کا مشترکہ مقصد امام علیؑ کو خلافت سے روکنا تھا۔ اب جبکہ شام معاویہ کے قبضہ میں ہے، عراق پر سے امامؑ کی خلافت کو ختم کرنا چاہیے۔ اسی لیے وہ لوگ بصرہ روانہ ہو گئے۔

حضرت عائشہ نے یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ وہ ام المومنین ہیں، اور مسلمانوں پر اُن کی ماں کا حق رکھتی ہیں، لوگوں کو شورشیوں کے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ (۴) جب یہ لوگ بصرہ میں داخل ہوئے، تو اس وقت قبیلۂ ازد کے سردار "کعب بن سور" نے ان سے الگ ہونا چاہا۔ حضرت عائشہ اس کے پاس آئیں اور اسے شورشیوں کے ساتھ رہنے کی دعوت دی۔ وہ جو ابتدا میں الگ ہونے پر مصر تھا، بولا: میں اپنی ماں کی بات مسترد نہیں کرسکتا۔ (۵) بہر صورت لوگوں کو جذب کرنے کے

۱۔ الفتوح۔ ج ۲۔ ص ۲۸۲۔ ۲۸۳

۲۔ تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۴۵۱، الفتوح۔ ج ۲۔ ص ۲۸۳

۳۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۲۲۱

۴۔ نثر الدر۔ ج ۴۔ ص ۱۵۔ ۱۶

۵۔ اخبار الطوال۔ ص ۱۴۴، الجمل۔ ص ۳۲۲

لیے حضرت عائشہ کا نام بہت موثر تھا۔ بعد میں طلحہ نے بھی بصرہ میں اپنے خطاب میں کہا: اللہ نے عائشہ کو بھی تمہارے ساتھ کر دیا ہے۔ تم جانتے ہو کہ ان کی رسول اللہؐ کے نزدیک کیا حیثیت تھی' اور جانتے ہو کہ اُن کے والد کا اسلام میں کیا مقام تھا۔

صرف حضرت عائشہ ہی کی وجہ سے اہلِ بصرہ نے شورشیوں کی حمایت کا اعلان کیا تھا۔(۱) طلحہ نے جنگ کے آغاز کے موقع پر بھی کہا تھا کہ: اے لوگو! علی مسلمانوں کا خون بہانے کے لیے آئے ہیں۔ یہ نہ کہو کہ وہ نبیؐ کے چچازاد بھائی ہیں۔ تمہارے ساتھ رسول اللہ کی بیوی اور ابوبکر صدیق کی بیٹی ہے' وہ ہستی جس کے والد رسول اللہؐ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ تھے۔(۲)

شورشیوں نے بصرہ کے کچھ علاقے پر قبضہ کرنے کے بعد' بصرہ میں امامؑ کے گورنر عثمان بن حنیف کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کیے کہ امامؑ کے آنے تک اس شرط کے ساتھ صبر کیا جائے کہ دارالامارہ' بیت المال اور مسجد عثمان بن حنیف کے اختیار میں رہے گی۔ اس معاہدے کے باوجود شورشیوں نے اس ڈر سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ امامؑ پہنچ جائیں اور وہ ان کا مقابلہ نہ کرسکیں' معاہدہ توڑ دیا اور رات کے وقت جب عثمان بن حنیف نمازِ عشا میں مشغول تھے' مسجد میں داخل ہوئے اور انہیں گرفتار کرلیا۔ انہوں نے عثمان کے سر اور داڑھی کے بال مونڈ دیئے اور صرف ان کے بھائی سہل بن حنیف کے خوف سے' جنہیں امامؑ مدینہ میں اپنے قائم مقام کے طور پر چھوڑ کر اس طرف آرہے تھے' انہیں قتل کرنے سے اجتناب کیا اور انہیں شہر سے باہر نکال دیا۔(۳) انہیں اس حال میں دیکھ کر امامؑ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔(۴) شورشیوں نے تقریباً پچاس افراد(۵) اور بیت المال کے رکھوالے کو قتل کرنے کے بعد اس کی لوٹ مار شروع کردی۔

جب مدینہ میں امامؑ کو شورشیوں کی اطلاع ملی' تو آپ نے سہل بن حنیف کو اپنا قائم مقام بنایا اور اصحاب پیغمبر کی ایک بہت بڑی تعداد اور دوسرے مسلمانوں کے ہمراہ' جن کی تعداد ایک نقل کے مطابق چار ہزار تھی' تیزی سے عراق کی جانب روانہ ہوئے۔(۶) سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ: انصار سے تعلق رکھنے والے آٹھ سو افراد' اور چار سو وہ لوگ جو بیعت

۱۔ الجمل۔ ص۳۰۴

۲۔ ایضاً۔ ص۳۲۹

۳۔ ایضاً۔ ص۲۸۳

۴۔ ایضاً۔ ص۲۸۵

۵۔ المعارف۔ ص۲۰۸

۶۔ تاریخ خلیفہ بن خیاط۔ ص۱۸۳

رضوان میں موجود تھے‘ جنگ جمل میں علیؑ کے ہمراہ تھے۔(۱)

حضرت علیؑ علیہ السلام کی ہر صورت یہ خواہش تھی کہ یہ جنگ واقع نہ ہو۔لہٰذا آپ بصرہ پہنچنے کے تین دن بعد تک‘ بار ہا اپنے پیغامات کے ذریعے شورشیوں سے یہ مطالبہ کرتے رہے کہ ”جماعت“ اور ”اطاعت“ کی طرف واپس آ جائیں‘ لیکن آپ کو اُن کی طرف سے مثبت جواب نہ ملا۔(۲)

آپ نے صعصعہ بن صوحان کو ایک خط دے کر بصرہ روانہ کیا۔انہوں نے طلحہ اور زبیر کے ساتھ بات چیت کی۔ لیکن جب حضرت عائشہ کے ساتھ گفتگو کی تو انہیں محسوس ہوا کہ وہ تو ان دونوں سے زیادہ جنگ کی طرف مائل ہیں۔اُن کے واپس آنے کے بعد امامؑ نے عبداللہ ابن عباس کو بصرہ بھیجا۔انہوں نے طلحہ سے کہا: کیا تم نے بیعت نہیں کی تھی؟ طلحہ نے کہا: (اُس وقت) میرے سر پر تلوار لٹک رہی تھی۔ابن عباس نے کہا: میں نے خود دیکھا تھا کہ تم نے اپنے اختیار سے بیعت کی تھی۔طلحہ نے خونِ عثمان کی بات چھیڑ دی۔اس پر ابن عباس بولے: عثمان دس دن تک اپنے گھر کے کنویں کا پانی پیتے رہے‘ لیکن تم نے انہیں میٹھا پانی استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی۔اس موقع پر علیؑ تمہارے پاس آئے اور تم سے کہا کہ انہیں پانی استعمال کرنے کی اجازت دو۔

اس کے بعد ابن عباس نے حضرت عائشہ اور زبیر سے بھی بات چیت کی۔حضرت عائشہ کو اپنی کامیابی کا اتنا یقین تھا کہ انہوں نے معمولی سی بھی لچک کا مظاہرہ نہیں کیا۔ابن عباس نے مضبوط دلائل کے ذریعے کوشش کی کہ اُن لوگوں کو اُس خطرے سے دور رکھیں جو مستقبل میں اُن کا منتظر ہے‘ لیکن وہ لوگ نہیں مانے۔(۳)

ہر صورت سے امامؑ اس بات پر مصر تھے کہ جنگ نہ ہو۔آپ نے اپنے اصحاب کو جنگ کا آغاز کرنے سے روکا۔ باضابطہ اعلان کیا کہ کسی کو جنگ شروع کرنے کی اجازت نہیں ہے۔(۴) حتیٰ جس دن جنگ شروع ہوئی‘ اُس دن بھی ظہر سے پہلے امامؑ نے ابن عباس کے ہاتھ ایک قرآن دے کر انہیں طلحہ و زبیر کے پاس بھیجا تاکہ وہ انہیں قرآن کی جانب دعوت دیتے ہوئے ان سے گفتگو کریں۔ابن عباس نے طلحہ و زبیر سے گفتگو کی۔لیکن حضرت عائشہ نے اس گفتگو کی بھی اجازت نہیں دی اور کہا: اپنے صاحب سے کہہ دو کہ ہمارے اور اُن کے درمیان صرف تلوار ہی فیصلہ کرے گی۔(۵) ابن عباس

۱۔ تاریخ خلیفہ بن خیاط۔ص ۱۸۴

۲۔اخبار الطوال۔ص ۱۴۷

۳۔الجمل۔ص ۳۱۴۔۳۱۸

۴۔وقعۃ الجمل۔ص ۳۶

۵۔الجمل۔ص ۳۳۶۔۳۳۹

کہتے ہیں: ابھی میں ان سے دور بھی نہیں ہوا تھا کہ ان کے تیر بارش کی طرح ہماری جانب برسنے لگے۔

دس جمادی الاولیٰ (۱) کی صبح امامؑ کا لشکر آمادہ ہوا۔ ادھر حضرت عائشہ اونٹنی پر رکھے ہوئے ایک ہودج میں سوار تھیں جسے ذرہ سے ڈھک دیا گیا تھا۔ وہ میدان میں آئیں اور تقریر کی اور مسلسل حضرت عثمان کی مظلومیت کا ذکر کرتی رہیں۔ امامؑ نے ابتدا میں قبیلہ عبد القیس کے ایک شخص کو قرآن ہاتھ میں دے کر میدان میں بھیجا تاکہ وہ شورش کرنے والوں کو قرآن کی جانب بلائے اور انہیں تفرقہ انگیزی سے پرہیز کی دعوت دے۔ شورشیوں نے اسے تیر مار کر شہید کر دیا۔ اس جوان کی ماں، جو وہیں موجود تھی، اس نے خود کو اپنے بیٹے کے جنازے پر گرا دیا۔ اصحاب کی مدد سے یہ جنازہ اٹھا کر امامؑ کے پاس لایا گیا۔ (۲) امامؑ جنہوں نے اب تک یہ حکم دے رکھا تھا کہ ان کی فوج جنگ کا آغاز نہ کرے، اس شہادت کے بعد، انہوں نے محمد بن حنفیہ کو دشمن کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ (۳)

ظہر سے لے کر رات تک جنگ جاری رہی۔ سب سے زیادہ جنگ حضرت عائشہ کی اونٹنی کے اطراف میں ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس اونٹنی کی لگام تھامنے والے ستر سے زیادہ ہاتھ کٹے۔ حضرت عائشہ نے لوگوں کی سادگی سے فائدہ اٹھانے کی خاطر ایک مٹھی خاک اٹھائی اور رسول اللہ کی طرح اس خاک کو حضرت علیؑ کے لشکر کی طرف پھینکا اور کہا: شاهت الوجوه. امامؑ نے انہیں مخاطب کر کے فرمایا: وما رميت اذ رميت ولكن الشيطان رمى. (جب تم نے پھینکا، تو دراصل تم نے نہیں بلکہ شیطان نے پھینکا)۔ (۴) جب شورشیوں کو شکست ہونے لگی، تو مروان بن حکم نے تیر مار کر طلحہ کو قتل کر دیا، کیونکہ وہ انہی کو عثمان کا قاتل سمجھتا تھا۔ (۵)

دلچسپ بات یہ ہے کہ ابن خیاط کہتا ہے: جب جنگ کا آغاز ہوا، تو پہلا مقتول طلحہ تھا۔ (۶) یہ اس بات کی علامت ہے کہ مروان اس جنگ میں دراصل طلحہ ہی کو قتل کرنے کے لیے آیا تھا۔ وہ بعد میں اس پر فخر بھی کرتا رہا ہے۔ اُس نے خود امام زین العابدین علیہ السلام کو یہ بات بتائی تھی۔ (۷) کہتے ہیں کہ امیر المومنینؑ نے میدانِ جنگ میں طلحہ کو آواز دے کر

۱۔ الجمل۔ ص ۳۳۶۔ بلاذری کی روایت کے مطابق جنگ ۱۰ جمادی الثانی کو ہوئی تھی۔ دیکھئے: انساب الاشراف۔ ص ۲۳۸۔ اہلِ کوفہ کے نام امامؑ کے خط کی تاریخ جس میں آپ نے انہیں اصحابِ جمل پر فتح کی خبر دی تھی، جمادی الاولیٰ ہے۔ دیکھئے: الجمل۔ ص ۳۹۹

۲۔ ایضاً۔ ص ۳۳۹۔ ۳۴۰، المصنف ابن ابی شیبہ۔ ج ۷۔ ص ۵۳۷، انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۲۴۱

۳۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۲۴۰۔ ۲۴۱

۴۔ الجمل۔ ص ۳۴۸، شرح نہج البلاغہ۔ ج ۱۔ ص ۲۵۷

۵۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۲۴۶۔ ۲۴۷

۶۔ تاریخ خلیفہ بن خیاط۔ ص ۱۸۵

۷۔ الجمل۔ ص ۳۸۳

اُن سے کہا تھا کہ: اے ابومحمد! کیا تمہیں یاد ہے کہ رسول اللہؐ نے میرے بارے میں یہ فرمایا تھا کہ: اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ؟ (اے اللہ! جو اسے دوست رکھے تو اسے دوست رکھ اور جو اس سے دشمنی کرے تو اس سے دشمنی کر) طلحہ نے کہا: استغفر اللہ! اگر مجھے یاد ہوتا تو خروج نہ کرتا۔(۱)

زبیر بھی اپنے بیٹے کی ضد کی وجہ سے میدان میں رہے اور امامؑ کی باتوں کے باوجود انہوں نے میدان نہیں چھوڑا۔ ایک موقع پر امامؑ نے انہیں نبی اکرمؐ کے جملے یاد دلائے کہ آپ نے فرمایا تھا: تمہاری پھوپھی کا بیٹا' یعنی زبیر' تمہارے خلاف بغاوت کرے گا۔ زبیر نے اس خبر کی تصدیق کی۔(۲) زبیر میدان سے فرار ہوئے یا پشیمان ہو کے میدانِ جنگ سے گئے' اس بارے میں تاریخ نویسوں کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔(۳)

امامؑ نے جب اونٹنی کے گرد بصرہ والوں کی شدید جنگ دیکھی' تو اونٹنی کو مار ڈالنے کا حکم دیا۔ امامؑ کے چند اصحاب نے اونٹنی کو گھیر کر اسے مار دیا۔ بعد میں حضرت عائشہ کہا کرتی تھیں کہ: میں ہودج کے اندر سے علیؑ کو دیکھتی تھی کہ وہ خود جنگ میں مشغول تھے اور پکار پکار کر کہہ رہے تھے: الجمل الجمل۔ (۴) امامؑ ہودج کے قریب تشریف لائے اور حضرت عائشہ کو یا شقیراء کہہ کر سرزنش کی۔(۵) ایک قابلِ ذکر نکتہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ ہودج میں کیے گئے ایک سوراخ سے باہر کا نظارہ کیا کرتی تھیں۔ ایک بار انہوں نے اونٹنی کی لگام تھامنے والے شخص سے پوچھا: کیا علیؑ بھی لوگوں کے درمیان موجود ہیں؟ اس نے جواب دیا: ہاں! ۔ حضرت عائشہ نے کہا: مجھے بتاؤ وہ کہاں ہیں؟ جب اس نے نشاندہی کی تو حضرت عائشہ نے کہا: یہ اپنے بھائی سے کس قدر مشابہ ہیں! اس شخص نے پوچھا: آپ کی مراد کون ہیں؟ انہوں نے کہا: رسول اللہؐ۔ اس شخص نے جیسے ہی یہ بات سنی' فوراً ہی اونٹنی کی لگام چھوڑ کر امامؑ کے لشکر میں شامل ہو گیا۔(۶)

جنگ ختم ہونے کے بعد حضرت عائشہ کو ہودج سے نکالا گیا' جو اس کے اندر کسی مردے کی مانند بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھیں۔ پھر انہیں ان کے بھائی محمد بن ابی بکر کے ساتھ بصرہ بھیج دیا گیا' تاکہ چند دنوں بعد بصرہ سے چلی جائیں۔ اس

۱۔ وقعۃ الجمل' ضامن بن شدقم المدنی۔ ص ۳۲' تاریخ مختصر دمشق۔ ج ۱۱۔ ص ۲۰۲

۲۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۲۵۵' اخبار الطوال۔ ص ۱۴۷

۳۔ ابومخنف کی تعبیر یہ ہے کہ زبیر شکست کے بعد میدان چھوڑ کر مدینہ کی طرف چل پڑے تھے' کہ قتل ہو گئے۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۲۵۴۔ اس کا مطلب فرار کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔

۴۔ الجمل۔ ص ۳۷۹

۵۔ ایضاً۔ ص ۳۶۹

۶۔ سمط النجوم العوالی۔ ج ۲۔ ص ۴۴۰

کے بعد انہیں بصرہ کے چند مردوں اور عورتوں کے ساتھ مدینہ روانہ کر دیا گیا۔(۱) بعد میں پشیمان ہو کر انہوں نے کئی مرتبہ اپنے اس اقدام پر اظہارِ ندامت کیا۔(۲) جب کبھی آیت وَقَرْنَ فِی بُیُوتِکُنَّ پڑھتیں تو اس قدر روتیں کہ اُن کی چادر تر ہو جاتی۔(۳)

ابن قتیبہ کہتا ہے: ایک دن ایک عورت حضرت عائشہ کے پاس آئی اور پوچھا: اُس عورت کے بارے میں آپ کیا فرماتی ہیں جس نے اپنے کم سن بچے کو قتل کر دیا ہو؟ حضرت عائشہ نے کہا: اس پر جہنم لازم ہے۔ اس عورت نے کہا: ایسی عورت کے بارے میں آپ کیا کہتی ہیں جس نے اپنے بیس ہزار بڑے بچوں کو قتل کر دیا ہو؟(۴) خود حضرت عائشہ نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں کہا: میں نے پیغمبرؐ کے بعد کئی حوادث جنم دیے۔ مجھے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک نہیں) دوسری بیویوں کے ساتھ دفن کرنا۔(۵) ایک اور جگہ منقول ہے کہ حضرت عائشہ کہتی تھیں: میرا جنگِ جمل میں شرکت نہ کرنا میرے لیے اس سے بہتر تھا کہ پیغمبرؐ سے مجھے دس بیٹے ہوتے۔(۶)

جنگ کے اختتام کے بعد امامؑ نے حکم دیا کہ کسی کا تعاقب نہ کیا جائے۔ جو ہتھیار ڈال دے اسے قتل نہ کیا جائے نہ ہی کسی زخمی کو مارا جائے۔ امامؑ نے حتیٰ مروان اور حضرت عثمان کے بیٹوں کو بھی آزاد کر دیا۔ اس موقع پر مروان نے کہا: اگر بیعت پر مجبور نہ کیا گیا تو وہ اب بھی بیعت نہ کرے گا۔ امامؑ نے فرمایا: اگر وہ بیعت کر بھی لے تب بھی یہودیوں کی طرح بیعت توڑ ڈالے گا۔(۷) امامؑ نے دشمن کی صرف وہ چیزیں اٹھانے کا حکم دیا جنہیں اُس نے جنگ میں استعمال کیا تھا' لوگوں کی ذاتی چیزیں اٹھانے کی اجازت نہیں دی۔ یہ بات ان لوگوں کے لیے انتہائی تعجب خیز تھی جو اب تک ہر جنگ کی فتح کے بعد بہت سامالِ غنیمت حاصل کرتے تھے۔ اس بارے میں امامؑ پر اعتراض کیا گیا۔ امامؑ نے اعتراض کرنے والوں کو یہ کہہ کر شرمندہ کر دیا کہ اگر مال کی تقسیم کی جائے' تو حضرت عائشہ تم میں سے کس کے حصے میں آئیں گی؟ اس پر عربوں کے سادہ اذہان میں یہ مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی کا خون بہانا تو جائز ہو لیکن اس کا مال لینا جائز نہ ہو؟(۸)

۱۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۲۳۹
۲۔ ایضاً۔ ج ۲۔ ص ۲۶۵
۳۔ ایضاً۔ ج ۲۔ ص ۲۶۶
۴۔ عیون الاخبار۔ ج ۱۔ ص ۲۰۲
۵۔ طبقات الکبریٰ۔ ج ۸۔ ص ۷۴
۶۔ الفتوح۔ ج ۲۔ ص ۳۳۱' طبقات الکبریٰ۔ ج ۵۔ ص ۶
۷۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۲۶۳ (متن اور حاشیہ)
۸۔ اخبار الطوال۔ ص ۱۵۱

جنگ کا ہنگامہ ختم ہونے کے بعد امامؑ جامع مسجد تشریف لائے اور بصرہ کے لوگوں کی عہد شکنی کی مذمت کی۔ کیونکہ یہ وہ لوگ تھے جو سب سے پہلے اپنے امامؑ کے مقابل کھڑے ہوئے تھے۔ امامؑ نے انہیں عورت کا لشکر اور جانوروں کا پیروکار کہہ کر پکارا۔(۱) امامؑ نے بصرہ کا ماجرا لکھ کر چند خطوط مدینہ اور کوفہ ارسال کیے۔(۲) اس کے بعد بیت المال کھولنے کا حکم دیا اور اسے اپنے اصحاب کے درمیان تقسیم کر دیا' جو کہا جاتا ہے کہ بارہ ہزار افراد تھے۔ جب طلحہ و زبیر نے بیت المال کو دیکھا تھا تو کہا تھا: یہ وہی خدا اور رسول کا وعدہ ہے۔ لیکن ان کے برخلاف امامؑ نے ان چیزوں کو دیکھ کر فرمایا: اے سونا! اے چاندی! مجھے نہیں' کسی اور کو دھوکا دے۔(۳)

اس کے بعد آپ نے چند دن بصرہ میں قیام فرمایا اور پیر کے دن بارہ یا سولہ رجب ۳۶ ہجری (۴) کو عبداللہ ابن عباس کو بصرہ کا حاکم مقرر کرنے کے بعد کوفہ روانہ ہو گئے۔ کوفہ میں آپ کی آمد کا دن پیر بارہ رجب ذکر کیا گیا ہے۔(۵)

بیعت توڑنے والوں کی شورش ختم کرنے کے بعد امامؑ کوفہ گئے اور وہیں قیام فرمایا۔ مدینہ چھوڑنا امامؑ کے لیے بہت دشوار تھا۔ لیکن کوفہ میں قیام کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح رسول اللہؐ نے مکہ کے تمام تر تقدس اور وطن کی محبت کے احساس کے باوجود اسے چھوڑ کر مدینہ میں رہائش اختیار کی تھی۔ یہاں ٹھہرنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ حجاز میں عراق یا شام کا مقابلہ کرنے کی سکت نہ تھی' علاوہ ازایں مدینہ کی مختصر آبادی شام کے لشکر کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی تھی۔

صفین میں ظالموں سے جنگ

کوفہ پہنچنے کے بعد امامؑ حاکم کے محل میں نہیں گئے۔ یہ محل گزشتہ کئی برسوں کے دوران ایک عالیشان قصر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ جب لوگوں نے آپ سے محل میں جانے کا تقاضا کیا تو آپ نے فرمایا: نہیں' الوؤں کے مسکن میں نہیں۔ پھر آپ مسجد کوفہ کے صحن میں چلے گئے اور اسے اپنا عارضی مسکن بنایا۔ کچھ عرصے بعد آپ اپنی بہن ام ہانی کے بیٹے جعدہ کے(۶)

۱۔ اخبار الطوال۔ ص ۱۵۱؛ الجمل۔ ص ۴۰۷؛ ربیع الابرار۔ ج ۱۔ ص ۳۰۸

۲۔ الجمل۔ ص ۳۹۵۔۳۹۹

۳۔ ایضاً۔ ص ۴۰۱۔۴۰۲

۴۔ الفتوح۔ ج ۲۔ ص ۴۷۶؛ اخبار الطوال۔ ص ۱۵۲؛ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۲۷۴؛ قابل ذکر ہے کہ کوفہ کے حاکم قرظہ بن کعب کے نام فتح کی خبر پر مشتمل امامؑ کا خط اسی سال رجب میں لکھا گیا ہے۔ دیکھئے: الجمل۔ ص ۴۰۴

۵۔ اخبار الطوال۔ ص ۱۵۳

۶۔ وقعۃ صفین۔ ص ۳۔ ۵؛ الفتوح۔ ج ۲۔ ص ۳۳۹۔ قابل ذکر ہے کہ واقعۂ صفین کے بارے میں جامع ترین کتاب نصر بن مزاحم (م ۲۱۲) کی وقعۃ صفین ہے۔ ابن اعثم نے صفین کی روایات کے لیے اکثر اسی کتاب سے استفادہ کیا ہے اور اس کی تلخیص کی ہے۔ طبری اور بلاذری جیسے منابع نے چند متفرق روایات کے علاوہ زیادہ تر ابو مخنف سے باتوں کو نقل کیا ہے۔

گھر منتقل ہوگئے۔ اہلِ کوفہ نے فتح مند قوم کی طرح بصرہ میں امامؑ کا شاندار استقبال کیا۔(۱) اس زمانے میں امامؑ کے سامنے سب سے اہم مسئلہ شام کا تھا۔

اس زمانے میں شام کے سوا دوسرے تمام علاقے امامؑ کی بیعت کر چکے تھے۔(۲) اور امامؑ کوفہ سے عراق اور ایران کے مختلف علاقوں کے لیے حاکم معین کر کے انہیں روانہ کر رہے تھے۔(۳) مالکِ اشتر کو جزیرہ (جس میں موصل، نصیبین، دارا، سنجار، آمد، ہیت اور عانات شامل تھے) بھیجا گیا۔ یہ بہت حساس علاقہ تھا۔ کیونکہ شام سے نزدیک تھا۔ اور دوسری طرف معاویہ کی جانب سے ضحاک بن قیس کی حکومت تھی۔ جزیرہ کے علاقے کے لوگ عثمانی العقیدہ تھے (۴) اور کوفہ اور بصرہ سے فرار ہونے والے عثمانیوں نے جزیرہ کے ان علاقوں میں پناہ لے رکھی تھی جن پر معاویہ کا کنٹرول تھا۔(۵) ضحاک کے زیرِ کنٹرول علاقوں میں رقّہ، رُحا اور قرقیسا شامل تھے۔ جب مالکِ اشتر جزیرہ پہنچے تو انہوں نے ایک لشکر تیار کر کے "حران" پر حملہ کر دیا۔ اس حملے میں ضحاک کے لشکر کے ساتھ گھمسان کی جنگ ہوئی اور مالک اس علاقے پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئے۔(۶)

قابلِ ذکر ہے کہ امامؑ نے کوفہ پہنچتے ہی اس بات کی کوشش کی کہ مختلف مسائل کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں سے شکوک وشبہات دور کریں اور مستقبل میں پیش آنے والی حالات کے دوران انہیں اپنی پشت پناہی کے لیے تیار کریں۔ آپ عمائدین اور سرداروں سے گفتگو فرماتے اور انہیں معاویہ کے مقابلے میں اپنی حمایت کے لیے تیار کرتے۔

اس زمانے میں کوفہ پر انہی سرداروں کا تسلط تھا۔ قبائلی سردار حاکمِ شہر سے زیادہ طاقتور ہوتے تھے اور انہیں اپنے ساتھ ملائے بغیر امامؑ معاملات کی اصلاح نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود امامؑ کا طریقۂ کار یہ تھا کہ آپ عوام سے مشورہ کیے بغیر کام کو آگے نہیں بڑھاتے تھے۔ یہ چیز سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے لوگوں میں تعاون کا اور زیادہ شوق پیدا کرتی تھی۔ جب امامؑ نے یہ فرمایا کہ وہ معاویہ کو ایک خط لکھ کر اسے اپنی اطاعت کی دعوت دینے کا ارادہ رکھتے ہیں، تو لوگوں نے آپ سے کہا کہ آپ کے ہر اقدم میں، ہم آپ کی اطاعت کریں گے۔ ہم رسول اللہ کی اطاعت کی طرح آپ کی اطاعت

۱۔ الفتوح۔ ج ۲۔ ص ۳۴۷

۲۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۲۱۲

۳۔ وقعۃ صفین۔ ص ۱۲۔ ۱۳

۴۔ الفتوح۔ ج ۲۔ ص ۳۵۰

۵۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۲۹۷

۶۔ الفتوح۔ ج ۲۔ ص ۳۵۰، وقعۃ صفین۔ ص ۱۳، اخبار الطوال۔ ص ۱۶۷

کریں گے۔(۱)

امام نے کوفہ سے معاویہ کے نام خط لکھ کر انہیں مسلمانوں کے امام کی اطاعت پر قائل کرنے کی کوشش کی۔ امام نے ایک خط میں معاویہ کو لکھا کہ اس زمانے تک موجود معیارات کی روشنی میں اُن کی خلافت میں کوئی خامی نہیں پائی جاتی' اور انہیں چاہیے کہ آپ کی خلافت قبول کرلیں۔ امام نے اس خط میں تحریر کیا: اما بعد' بے شک جو بیعت مدینہ میں لوگوں نے میرے ہاتھ پر کی ہے' اُس کی پابندی تم پر بھی' جو شام میں مقیم ہو' لازم ہے۔ کیونکہ جن لوگوں نے ابوبکر' عمر اور عثمان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور جس بنیاد اور طریقہ کار کے مطابق انہوں نے اُن کی بیعت کی تھی' اُسی طرح اُن لوگوں نے میرے ہاتھ پر بھی بیعت کی ہے۔ لہٰذا کسی بھی حاضر شخص کے لیے بیعت اختیار کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں' اور کسی بھی غائب شخص کے لیے اسے مسترد کرنے کا کوئی راستہ نہیں۔ شوریٰ صرف مہاجرین اور انصار کا حق ہے۔ اور جب مہاجرین اور انصار کی شوریٰ تشکیل پا جائے اور وہ کسی شخص کی قیادت پر متفق ہو جائیں' اور اسے قائد قرار دے لیں' تو اسی انتخاب پر خدا راضی ہوتا ہے(۲)۔ اگر تم نے اپنے آپ کو بلا سے دوچار کیا (اور سرکشی جاری رکھی) تو میں تم سے جنگ کروں گا اور تمہارے خلاف خدا سے مدد طلب کروں گا۔ تم نے قاتلانِ عثمان کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ بات جان لو کہ مسلمانوں نے جو راستہ اختیار کیا ہے' تم بھی اسی پر آ جاؤ اور پھر ان کے ساتھ میرے پاس فیصلے کے لیے آؤ تاکہ میں تمہیں اور انہیں کتاب خدا کی طرف لے جاؤں۔۔۔۔۔ اور جان لو کہ تمہارا شمار طلقا میں ہوتا ہے اور آزاد شدہ اسیروں کو خلافت اور شوریٰ میں شرکت کا حق نہیں ہے۔(۳)

جب جریر بن عبداللہ نے امام کا خط معاویہ کو دیا اور اُن سے کہا کہ فتنہ انگیزی سے باز آ جائیں اور مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ ملحق ہو جائے' تو معاویہ نے لوگوں کو مسجد میں جمع کیا اور ارضِ مقدس کے طور پر شام کی تعریف کرنے کے بعد کہا: میں تمہارے اوپر عمر بن خطاب اور عثمان کا خلیفہ ہوں۔ میں خونِ عثمان کا ولی ہوں' جو مظلوم مارے گئے ہیں۔ قتلِ عثمان کے بارے میں تمہاری رائے کیا ہے؟ سب لوگوں نے خونِ عثمان کا انتقام لینے کے لیے اُس کی حمایت کا اعلان کیا۔ یہ معاویہ کا امام کو جواب تھا۔ معاویہ کی اس تقریر میں سب سے زیادہ توجہ طلب بات ان کا یہ کہنا ہے کہ انہیں حضرت عمر

۱۔ الفتوح۔ ج ۲۔ ص ۳۵۲

۲۔ عبدالرحمٰن بن غنم ازدی جنہیں اہلِ شام کا سب سے بڑا فقیہ کہا جاتا تھا' انہوں نے شام میں شرحبیل سے کہا: حتیٰ اگر علی نے عثمان کو قتل کیا ہوتا (تب بھی) کیونکہ مہاجرین اور انصار نے ان کی بیعت کی ہے اور وہ "لوگوں پر حاکم" ہیں' لہٰذا وہ مسلمانوں کے خلیفہ ہیں۔ دیکھیے: وقعۂ صفین۔ ص ۴۵

۳۔ وقعۂ صفین۔ ص ۲۹' الفتوح۔ ج ۲۔ ص ۳۷۴۔۳۷۵' اور دیکھیے: اخبار الطوال۔ ص ۱۵۷

نے شام پر متعین کیا تھا۔(۱)

معاویہ نے امامؑ کی جانب سے آنے والے جریر بن عبداللہ سے کہا کہ: علیؑ کو لکھ دو کہ شام اور مصر کو میرے لیے کر دیں اور جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوں، تو میرے کاندھے پر کسی کی بیعت نہ رکھیں۔ اس صورت میں، میں معاملات کو اُن کے سپرد کر دوں گا اور انہیں خلیفہ مان لوں گا۔ جریر نے یہ باتیں امامؑ کو لکھ بھیجیں۔ اس پر امامؑ نے جواب دیا: مغیرہ نے مدینہ میں مجھے یہ تجویز دی تھی اور میں نے اسے مسترد کر دیا تھا: لَم یَکُنِ اللہُ لیَرانی اتّخذ المُضلّین عضُداً. (خدا مجھے ایسی حالت میں نہیں دیکھے گا کہ میں نے گمراہ کرنے والوں کو اپنا دست وبازو بنایا ہوا ہو)۔(۲)

معاویہ اور امامؑ کے درمیان اہم نکات پر مشتمل اور بھی خطوط کا تبادلہ ہوا تھا۔ معاویہ نے امامؑ کے نام اپنے خط میں لکھا کہ: رسولِ خداؐ کے بعد آنے والے تمام خلفا سے آپ حسد کیا کرتے تھے اور ان سب کے مقابل آپ نے سرکشی کی۔ اور ہم اس نافرمانی کو آپ کی غضبناک آنکھوں میں، نامناسب گفتگوؤں میں، دل سے نکلنے والی آہوں میں اور خلفا سے (بیعت کرنے میں) تاخیر میں محسوس کرتے تھے۔ اور (دیکھتے تھے کہ) جس طرح جانور کی ناک میں نکیل ڈال کر کھینچا جاتا ہے، اسی طرح (زبردستی) آپ کو بیعت کے لیے کھینچا جاتا تھا۔ آگے چل کر معاویہ نے حضرت عثمان کے ساتھ امامؑ کی دشمنی کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ آپ کے گھر کے قریب مارے گئے لیکن آپ نے کوئی آواز نہیں اٹھائی اور اگر آپ چاہتے تو اس قتل کو روک سکتے تھے۔ اور اگر آج بھی آپ سچے ہیں تو حضرت عثمان کے قاتلوں کو میرے حوالے کر دیں، میں آپ کی بیعت کر لوں گا۔

امامؑ نے ان کے جواب میں اُس کامیابی کا ذکر کرتے ہوئے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو دی تھی اور ان کے دشمن کو ذلیل کیا تھا، فرمایا: اسی (معاویہ) کا خاندان رسولؐ کے خلاف تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والا تھا۔ امامؑ نے مزید فرمایا کہ: ہم اہلِ بیت، رسول اللہؐ پر سب سے پہلے ایمان لائے۔ جبکہ اُس کا گھرانہ ہمارے رسولؐ کے قتل کا ارادہ رکھتا تھا، اور چاہتا تھا کہ ہماری جڑیں کاٹ ڈالے اور ہمارے دلوں پر غم واندوہ کا بارِگراں ڈال دے۔ انہوں نے ہمارے ساتھ ناروا سلوک کیا، ہمیں مناسب خوراک اور صاف پانی سے محروم رکھا اور ہمیں خوف و دہشت سے دوچار کیا۔ ہم پر جاسوس لگائے اور ہمیں سخت اور ناہموار پہاڑ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ ہمارے لیے جنگ کی آگ بھڑکائی اور اپنے درمیان یہ عہد کیا کہ نہ ہمارے ساتھ کھائیں گے، نہ پئیں گے، نہ شادی کریں گے، نہ خرید وفروخت۔ نہ ہمارے ہاتھوں میں ہاتھ دیں گے اور نہ ہمیں امان دیں گے۔ جب تک کہ ہم پیغمبر کو ان کے حوالے نہ کر دیں تاکہ وہ انہیں قتل کر ڈالیں۔

اس کے بعد امامؑ نے اُن صعوبتوں کا ذکر کرتے ہوئے، جو انہوں نے زمانۂ رسولؐ میں ہونے والی جنگوں کے

۱۔ الفتوح۔ ج ۲۔ ص ۳۸۰

۲۔ وقعۂ صفین۔ ص ۵۲، الفتوح۔ ج ۲۔ ص ۳۹۲

دوران اٹھائی تھیں فرمایا: تم نے میرے خلفا سے حسد کرنے' اُن کی بیعت میں تاخیر کرنے اور ان کے خلاف میری سرکشی کا ذکر کیا ہے۔ جہاں تک سرکشی کا تعلق ہے' اگر کسی صورت ایسا تھا تو اس سے خدا کی پناہ' اور جہاں تک ان کا ساتھ دینے میں تاخیر اور ان کے کاموں سے ناپسندیدگی کا تعلق ہے' تو میں اس معاملے میں کسی سے عذرخواہ نہیں ہوں۔

آگے چل کر امامؑ نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ خلافت ان کا حق تھی۔ اس کے بعد آپ نے اس بات کا تذکرہ کیا کہ حضرت عثمان کے قتل میں اُن کا کوئی ہاتھ نہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے سقیفہ کے ماجرے میں ابوسفیان کی اس گفتگو کا ذکر کیا جس میں اس نے امامؑ سے کہا تھا کہ آپ خلافت ابوبکر کے پاس نہ جانے دیں' بلکہ مجھے اس بات کی اجازت دیں کہ میں آپ کی بیعت کروں۔ اس پر امامؑ نے فرمایا: میں نے اس عمل سے گریز کیا' کیونکہ لوگ زمانۂ کفر سے قریب تھے اور میں مسلمانوں کے درمیان اختلاف ڈالنے سے ڈرتا تھا۔ (۱) یہ خط خلفا کے ساتھ امامؑ کے طرزِ عمل اور اپنے آپ کو خلافت کا حقدار سمجھنے کے بارے میں ایک اہم سند کی حیثیت رکھتا ہے۔

امامؑ نے اس کے بعد بھی معاویہ اور عمرو بن عاص کے نام خطوط لکھے اور کوشش کی کہ ان لوگوں کو اس باطل راستے پر چلنے سے روکیں جس پر وہ لوگ گامزن تھے۔ (۲)

امامؑ نے معاویہ کے ساتھ جہاد کا پختہ عزم کرلیا۔ آپ کئی بار یہ بات دُہرا چکے تھے کہ: **امرت بقتال الناکثین والقاسطین والمارقین.** (مجھے ناکثین (عہد شکنوں)' قاسطین (ستم کاروں) اور مارقین (خوارج) سے جنگ کا حکم دیا گیا ہے)۔ (۳) چنانچہ اب قاسطین کے ساتھ جہاد کی باری تھی۔ آپ نے مہاجرین اور انصار سے تعلق رکھنے والے اپنے ممتاز اصحاب کو جمع کیا اور شام جانے کے بارے میں اُن سے اُن کی رائے دریافت کی۔ سعد بن ابی وقاص کے بھتیجے ہاشم بن عتبہ نے کہا کہ یہ لوگ خونِ عثمان کے جھوٹے مدعی ہیں' یہ دنیا طلب لوگ ہیں اور ہمیں جلد از جلد ان کی سرکوبی کے لیے نکل جانا چاہیے۔ عمار نے بھی اصرار کیا کہ جتنا جلد نکلیں اتنا ہی بہتر ہے۔ انہوں نے ایک شعر میں کہا:

سیروا الی الاحزاب اعداء النبی   سیروا فخیر الناس اتباع علی (۴)

''چلو اس گروہ کی طرف جو دشمنانِ نبیؐ ہیں' چلو کہ بہترین لوگ پیروانِ علیؑ ہیں۔''

۱۔ وقعۂ صفین۔ ص ۸۶۔۹۱' انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۲۷۷۔۲۸۲' شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۱۵۔ ص ۷۳' الفتوح۔ ج ۲۔ ص ۳۷۴۔۳۷۵' نہج السعادہ۔ ج ۴۔ ص ۱۸۵

۲۔ وقعۂ صفین۔ ص ۱۱۰۔۱۱۱' الفتوح۔ ج ۲۔ ص ۳۷۷۔۳۸۰

۳۔ الفتوح۔ ج ۲۔ ص ۳۶۰

۴۔ وقعۂ صفین۔ ص ۱۰۱' الفتوح۔ ج ۲۔ ص ۳۶۰

قیس بن سعد نے کہا: اُن کی نظر میں ان لوگوں کے خلاف جہاد ترکوں اور رومیوں کے خلاف جہاد سے زیادہ واجب ہے۔ سہل بن حنیف نے بھی امامؑ کی ہمراہی کے لیے انصار کی آمادگی اور ان کے آپ کی اطاعت پر تیار ہونے کا اعلان کیا۔ اس دوران ایک شخص نے اعتراض کیا، اور بولا: کیا ہمیں اپنے شامی بھائیوں کے قتل کے لیے روانہ کرنا چاہتے ہیں، جس طرح کل ہمیں اپنے بھائیوں کے قتل کے لیے بصرہ لے گئے تھے۔ لوگوں نے اس شخص کو برا بھلا کہنا شروع کیا، تو وہ وہاں سے بھاگ نکلا۔ لوگ اس کے پیچھے دوڑے اور وہ لوگوں کی اس ہنگامہ آرائی میں بازار کے اندر مارا گیا۔ (۱)

اس کے بعد مالک اشتر گویا ہوئے: اور کہا اس غدار اور شقی انسان کی باتیں آپ کے لیے باعثِ آزار نہیں ہونی چاہئیں، یہ تمام لوگ آپ کے پیرو ہیں۔ (۲) اس زمانے میں کوفہ کی فضا اس قدر سازگار تھی کہ کسی میں مخالفت کی جرأت نہ تھی، حتیٰ کوئی مخالفانہ رائے کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بہت سے قبیلوں کے لیے یہ بات باعثِ ننگ و عار تھی کہ ان کے قبیلے کا کوئی آدمی (جہاد سے) کنارہ کشی کا موقف اختیار کرے۔ ایسی ہی رائے کا اظہار کرنے والے لوگوں میں حنظلہ بن ربیع نامی شخص بھی شامل تھا، جس پر اس کے قبیلے والوں نے اس قدر دباؤ ڈالا کہ وہ راتوں رات معاویہ کی طرف فرار ہو گیا۔ اگرچہ بظاہر اس نے جنگ میں بھی شرکت نہیں کی تھی۔ (۳)

اس صورتحال میں اچھے خاصے مناسب لوگوں کے دل میں بھی کچھ نہ کچھ شک و تردد پیدا ہونے لگا تھا۔ چنانچہ ابوزُبَیب بن عوف نے امامؑ سے درخواست کی کہ آپ باقاعدہ طور پر اس بات کی گواہی دیں کہ لشکرِ شام کے ساتھ دوستی توڑ کر اس کی جگہ انہیں اپنا دشمن سمجھنا ہی راہِ حق ہے۔ امامؑ نے اس بات کی شہادت دی۔ اس کے بعد عمار نے بھی گواہی دی اور وہ ان دو گواہیوں کی بنیاد پر مطمئن ہو گیا۔ (۴)

عبداللہ ابن مسعودؓ جو کسی زمانے میں کوفہ کے بیت المال کے ذمے دار تھے، اُن کے کچھ ساتھی امامؑ کے پاس آئے اور کہا: ہم آپ کے ساتھ چلیں گے، لیکن ہماری لشکرگاہ علیحدہ ہوگی۔ تاکہ ہم دیکھ لیں کہ کون باطل پر ہے اور بغاوت کر رہا ہے؟ امامؑ نے ان کی بات مان لی۔ ربیع بن خُثَیم کی سربراہی میں چار سو افراد کے ایک گروہ نے اس جنگ کے بارے میں شک و تردد کا اظہار کرتے ہوئے امامؑ سے درخواست کی کہ وہ انہیں کسی سرحد پر بھیج دیں۔ امامؑ نے اُن کی درخواست قبول کر کے انہیں "رے" کی سرحد پر بھیج دیا۔ اسی طرح آپ نے "باهلہ" نامی قبیلے کے افراد کے ساتھ بھی کیا، جن سے نہ امامؑ

۱۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۲۹۳، الفتوح۔ ج ۲۔ ص ۳۶۲، ۳، اخبار الطوال۔ ص ۱۶۴۔ امامؑ نے اس کی دیت بیت المال سے ادا کی۔

۲۔ وقعۂ صفین۔ ص ۹۲۔ ۹۶

۳۔ ایضاً۔ ص ۹۸۔ ۹۹، الفتوح۔ ج ۲۔ ص ۴۴۴

۴۔ وقعۂ صفین۔ ص ۱۰۱

خوش تھے اور نہ وہ امام سے راضی تھے۔ انہیں امام نے ان کے عطایا دے کر "دیلم" کی سرحد پر بھیج دیا۔(۱)

"عبداللہ بن بدیل" نے بھی امام کے موقف کی تائید کرتے ہوئے آپ سے عرض کیا: آپ کے ساتھ ان کی دشمنی کی وجہ وہ ضربیں ہیں جو وہ اس سے پہلے آپ کے ہاتھوں کھا چکے ہیں۔ اس کے بعد عبداللہ نے لوگوں کی طرف رخ کر کے کہا: معاویہ کس طرح علی کے ہاتھ پر بیعت کر سکتا ہے جبکہ اس کا بھائی حنظلہ ماموں ولید اور نانا عتبہ ایک ہی معرکے میں مارے گئے ہیں۔(۲) حجر بن عدی اور عمرو بن حمق نے بھی شامیوں سے اظہار برأت کیا اور ان پر لعنت کی۔ امام نے انہیں بلایا اور ان سے فرمایا: میں نہیں چاہتا کہ آپ لوگ لـعّــان (بہت زیادہ لعنت کرنے والے) اور شـتّـام (بہت زیادہ گالم گلوچ کرنے والے) کی حیثیت سے پہچانے جائیں۔ اس کے بجائے اللہ سے دعا مانگیں کہ خونریزی نہ ہو اور صلح وصفائی برقرار ہو جائے۔ عمر بن حمق نے ہر حال میں امام سے محبت اور ان سے دوستی کا وعدہ کیا۔ آپ نے بھی اُن کے حق میں دعا فرمائی۔(۳) عمرؓ جزیرہ میں معاویہ کے مقرر کردہ حاکم ابن ام الحکم کے ہاتھوں شہادت تک اپنے اس عہد پر قائم رہے۔

جب امامؑ کو یقین ہو گیا کہ معاویہ صرف طاقت کی زبان ہی سمجھتے ہیں اور دوسری طرف آپ نے یہ جانچ لیا کہ کوفہ کے عمائدین شام کے ساتھ آپ کی جنگ میں آپ کی حمایت کریں گے تو آپ نے جلسہ عام میں عوام الناس کو جہاد کی دعوت دی۔ آپ کے بعد امام حسنؑ نے تقریر کی اور اس میں فرمایا: اپنے دشمن معاویہ اور اس کے لشکر کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ کیونکہ وہ اب تیار ہو چکا ہے۔ اپنے جذبہ جنگ میں تلواروں اور نیزوں کے مقابل ثابت قدمی تعاون باہمی کی ضامن اور شکست سے بچاؤ ہے۔ اس کے بعد امام حسینؑ نے بھی تقریر کی اور لوگوں کو شامیوں کے خلاف جنگ پر ابھارا۔(۴)

حضرت علی علیہ السلام نے ابن عباس کو خط لکھا کہ اہل بصرہ کو بھی ساتھ چلنے کی دعوت دیں۔ اس دعوت کے بعد بصرہ کے بہت سے لوگ ابن عباس کے ساتھ کوفہ آئے۔ ابن عباس نے ابوالاسود دئلی کو بصرہ میں اپنا قائم مقام مقرر کیا۔ امام نے مخنف بن سلیم کو ایک خط لکھا کہ اصفہان میں اپنی جگہ کسی کو مقرر کر کے آپ کے پاس آ جائیں۔ لہٰذا انہوں نے ایسا ہی کیا۔

کوفہ شام کے خلاف جنگ کے لیے تیار ہو گیا' امامؑ نے جنگجوؤں کو حکم دیا کہ وہ کوفہ کی فوجی چھاؤنی نخیلہ میں جمع

ا۔ وقعۃ صفین۔ ص ۱۱۵' اخبار الطوال۔ ص ۱۶۵۔ گویا یہ وہی خواجہ ربیع ہیں جن کا مزار اس وقت مشہد میں کافی آباد اور "عقیدتمندوں" سے پر رہتا ہے۔

۲۔ وقعۃ صفین۔ ص ۱۰۲' الفتوح۔ ج ۲۔ ص ۴۴۷

۳۔ وقعۃ صفین۔ ص ۱۰۳' الفتوح۔ ج ۲۔ ص ۴۴۷۔ ۴۴۸' اخبار الطوال۔ ص ۱۶۵

۴۔ وقعۃ صفین۔ ص ۱۱۴۔ ۱۱۵

جائیں۔ یہ دیکھ کر معاویہ نے بھی شام کے منبر پر حضرت عثمان کا خون آلود لباس سجادیا' اس حال میں کہ اسکے گرد ستر ہزار بوڑھے گریہ وزاری کر رہے تھے۔ اور یوں شامیوں کو عراقی لشکر کے ساتھ جنگ پر تیار کیا۔ (۱) نصر بن مزاحم کے مطابق ۳۷ ہجری کے دوسرے مہینے سے جنگِ صفین کا آغاز ہوا' اور یہ جنگ اگلے سال ماہِ صفر تک جاری رہی۔ جب عراق کا لشکر شام کے نزدیک پہنچا' تو دیکھا کہ شامیوں نے پہلے ہی پڑاؤ ڈالا ہوا ہے اور وہ اُس سخت زمین پر بھی قابض ہیں جو دلدل کے درمیان سے گزرتی ہے اور انہوں نے گھاٹ پر عراقیوں کی آمد ورفت روکنے کے لیے تیراندازوں اور سواروں کو مقرر کیا ہوا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ شامی لشکر ایک لاکھ بیس ہزار سے زائد افراد پر مشتمل تھا۔ (۲) کوفہ سے نکلتے وقت امامؑ کی فوج کی تعداد بھی اسی ہزار افراد پر مشتمل تھی اور راستے میں مدائن کے بھی کچھ لوگوں کا اس میں اضافہ ہوا تھا۔ (۳)

جنگ ہوئی تو مالک اشتر کی دلاوری (۴) سے عراقی لشکر پانی پر قابض ہو گیا لیکن امامؑ نے حکم دیا کہ شامیوں کو بے روک ٹوک پانی استعمال کرنے دیا جائے۔ معاویہ نے یہ خبر اڑا کر (یہ خبر امامؑ کے لشکر کی جانب ایک تیر پھینک کر دی گئی تھی جس کی نوک میں ایک خط پیوست تھا۔ یہ واضح نہیں تھا کہ اس خط کو کس نے بھیجا ہے' کسی دوست نے یا دشمن نے) کہ جو زمین امامؑ کی فوج کے قبضے میں ہے' اُس پر پانی چھوڑ دیا جائے گا' امامؑ کی فوج کو وہاں سے ہٹا دیا۔ اگرچہ امامؑ لشکر کے وہ مقام چھوڑنے کے مخالف تھے' لیکن عراقیوں کی ضد کے آگے مجبور ہو گئے۔ جس کے نتیجے میں عراقی لشکر کو پانی پر قبضے کے لیے ایک بار پھر جنگ کرنا پڑی۔

ماہِ محرم کا اختتام ہوتے ہی' حرام مہینے ختم ہوئے اور صفر کے مہینے کی پہلی تاریخ سے' جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بدھ کا دن تھا' مالک اور حبیب بن مسلمہ کے درمیان جنگ سے پوری طرح جنگِ صفین کا آغاز ہوا۔ (۵) جنگ شروع ہونے سے ایک رات قبل امامؑ نے اپنے پورے لشکر کو اس بات کی تاکید کی کہ: **لا تقاتلو القوم حتی یبدء وکم** (جب تک وہ لوگ شروع نہ کریں تم ابتدا نہ کرنا)۔ (۶)

۱۔ وقعۂ صفین۔ ص ۱۲۷

۲۔ الفتوح۔ ج ۲۔ ص ۴۳۹

۳۔ اخبار الطوال۔ ص ۱۶۶۔ ۱۶۷

۴۔ الفتوح۔ ج ۳۔ ص ۱۳

۵۔ ایضاً۔ ص ۲۱۴' انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۳۰۲

۶۔ الفتوح۔ ج ۳۔ ص ۴۴۔ ۴۵

یہاں بھی امامؑ کا مقصد یہ تھا کہ شامیوں کے پاس آخری لمحے تک حق کی طرف پلٹ آنے کا موقع باقی رکھیں۔ اپنی سپاہ کو امامؑ کی تاکید یہ تھی کہ: جب تک وہ جنگ کا آغاز نہ کریں' تم ان سے جنگ نہ کرنا۔ کیونکہ بحمد اللہ تم لوگوں کی حجت مکمل ہے اور جب تم انہیں اس وقت تک ان کے حال پر چھوڑے رکھو گے' جب تک وہ خود جنگ کا آغاز نہ کریں' تو یہ تمہارے حق میں اور ان کے خلاف ایک اور حجت ہوگی۔ اور اگر تم جنگ کرو اور دشمن کو شکست دے دو' تو کسی بھاگنے والے کو نہ مارنا' نہ کسی زخمی کو قتل کرنا' نہ کسی کو برہنہ کرنا اور نہ کسی لاش کا مثلہ کرنا۔ اگر تم دشمن کے کسی ٹھکانے پر پہنچ جاؤ تو کوئی پردہ چاک نہ کرنا اور میرے حکم کے بغیر کسی گھر کے اندر داخل نہ ہونا اور لشکر گاہ میں موجود اشیا کے علاوہ کوئی چیز نہ اٹھانا۔ کسی عورت کو تکلیف اور اذیت نہ پہنچانا' اگرچہ وہ تمہاری ناموس کو برا بھلا کہیں اور تمہارے سرداروں اور نیک لوگوں پر گالم گلوچ کریں۔ کیونکہ عورتیں نفسیاتی اور عقلی اعتبار سے کمزور ہوتی ہیں اور ہمیں حکم تھا کہ اس زمانے (یعنی رسول اکرمؐ کے زمانے) میں بھی جبکہ وہ مشرک عورتیں تھیں' انہیں تکلیف پہنچانے سے اجتناب کریں۔(۱)

بہر طور بدھ کے روز' صفر کی پہلی تاریخ (۲) کو جنگ کا آغاز ہوا اور دونوں لشکروں کی جانب سے ایک دوسرے پر زبردست حملے ہونے لگے۔ لشکر کی اگلی صفوں کی کمان کی ذمے داری ہر روز امامؑ کے سپہ سالاروں میں سے کسی ایک کے پاس ہوتی تھی۔ پہلے دن مالک' دوسرے دن ہاشم بن عتبہ' تیسرے دن عمار بن یاسر' چوتھے دن محمد حنفیہ اور پانچویں دن عبداللہ ابن عباس نے سپہ سالاری کی ذمے داری سنبھالی۔(۳) اگلی جمعرات کو جنگ شدت اختیار کر گئی' اس دوران عراقی لشکر کا بایاں بازو شکست سے دوچار ہوا لیکن خود امامؑ اور مالک اشتر کی دلیری سے جلد ہی اس شکست کا تدارک ہو گیا۔(۴)

خود امامؑ لشکر کے درمیان موجود تھے اور مسلسل دعائیں اور خطبے پڑھ کر سپاہیوں کو ثابت قدمی کی ترغیب دیتے تھے۔(۵)

جنگ کے دوران امامؑ نے اپنے ایک سپاہی کے ہاتھ میں قرآن دیا' تاکہ وہ شامی لشکر کے پاس جا کر انہیں قرآن کو حَکَم قرار دینے کی دعوت دے۔ لیکن لشکرِ شام نے اسے قتل کر ڈالا۔(۶) امامؑ نے معاویہ سے کہا کہ ہم دونوں آپس میں مقابلہ

۱۔ وقعۃ صفین۔ ص ۲۰۳۔۲۰۴

۲۔ باوجود یہ کہ چند ماخذ میں یہ تاریخ بیان ہوئی ہے' بلاذری (انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۳۲۳) نے بارہ صفر کو جمعے کا دن قرار دیا ہے' جو اس تاریخ کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ لیکن نصر کی روایت کے مطابق' جس نے کہا ہے کہ حکمیت کا معاہدہ سترہ صفر بروز بدھ لکھا گیا تھا' بلاذری کا یہ قول درست ہو سکتا ہے کہ بارہ صفر کو جمعے کا دن تھا۔

۳۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۳۰۴۔۳۰۵

۴۔ ایضاً۔ ج ۲۔ ص ۳۰۵۔۳۰۶

۵۔ وقعۃ صفین۔ ص ۲۳۰۔۲۳۲

۶۔ ایضاً۔ ص ۲۴۴

کر لیتے ہیں۔ اس مقابلے میں جو بھی کامیاب ہو وہی حکومت کا حقدار ٹھہرے۔ لیکن معاویہ نے یہ تجویز قبول نہیں کی۔ (۱) ایک موقع پر امامؑ اور عمرو بن عاص کا آمنا سامنا ہوا تو عمرو نے اپنی شرمگاہ برہنہ کر کے امامؑ کی حیا سے فائدہ اٹھایا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ (۲) ایسا ہی بسر بن ارطاۃ کے ساتھ بھی پیش آیا۔ (۳) اس جنگ میں امامؑ کے کئی ممتاز ساتھی' جیسے حضرت عمار یاسر بھی شہید ہوئے۔ صفین کے شہدا میں اویس قرنی (۴) جیسے نامور عارف بھی شامل ہیں' جنہیں مسلمانوں کے درمیان عظیم مرتبہ حاصل ہے۔ ابن اعثم نے صفین میں ان کی شہادت کا ذکر کرتے ہوئے' ان کا تذکرہ کیا ہے۔ (۵)

ہاشم بن عتبہ' المعروف ہاشم المرقال' جو جنگوں کے دوران اپنی ایک آنکھ سے محروم ہو چکے تھے' صفین میں شہید ہونے والے امامؑ کے جانثار ترین ساتھیوں میں سے ایک تھے۔ وہ سعد بن ابی وقاص کے بھتیجے تھے لیکن اپنے چچا کے موقف کے برخلاف' جنھوں نے کسی کی حمایت نہیں کی تھی' انہوں نے پورے اطمینان کے ساتھ امامؑ کے شانہ بشانہ جنگ کی اور درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ (۶) صفین میں شہادت پانے والے آپ کے ایک اور صحابی خزیمہ تھے۔ خزیمہ صحابیٔ رسولؐ تھے' جن کی ایک گواہی کو آنحضرتؐ نے دو گواہیوں کے طور پر قبول کیا تھا۔ اور اسی لیے وہ "ذوالشہادتین" کے نام سے مشہور تھے۔

جنگ کے آخری دنوں میں ایک مرتبہ اتنی زبردست لڑائی چھڑی کہ نمازِ فجر کے بعد سے شروع ہونے والی جنگ آدھی رات تک جاری رہی۔ اس پوری مدت میں مالک اشترؓ امامؑ کے لشکر کو جوش دلانے اور اسے جنگ پر ابھارنے میں مصروف رہے۔ اس رات کو "لیلۃ الھریر" کہا جاتا ہے۔ آدھی رات سے دوبارہ لڑائی کا آغاز ہوا' جو اگلے دن ظہر کے وقت تک جاری رہی۔ امامؑ نے ایک خطبے میں فرمایا: دشمن کی صرف ایک سانس باقی رہ گئی ہے۔

معاویہ اور عمرو بن عاص نے جب اپنا کام تمام ہوتے دیکھا' اور جب انہیں اس بات کا احساس ہو گیا کہ اب سپاہِ شام سے کوئی امید نہیں رکھی جا سکتی ہے' تو انہوں نے حیلہ و فریب کا سہارا لیا۔ لیلۃ الھریر کے اگلے دن' جس کے وقت ظہر

۱۔ وقعۃ صفین۔ ص ۲۷۴' اخبار الطوال۔ ص ۱۷۶

۲۔ وقعۃ صفین۔ ص ۴۰۷' انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۳۳۰' اخبار الطوال۔ ص ۱۷۷

۳۔ الفتوح۔ ج ۳۔ ص ۱۷۳۔۱۷۴

۴۔ وقعۃ صفین۔ ص ۳۲۴' انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۳۲۰۔ بلاذری نے اویس کی شہادت کی خبر پر شک کا اظہار کرتے ہوئے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کی تصحیح کرنے والے محترم صاحب نے صفحہ ۳۲۰ سے ۳۲۲ تک متعدد ماخذ کا ذکر کیا ہے' جن میں اس خبر کو یقینی اور غیر مشکوک قرار دیا گیا ہے۔

۵۔ الفتوح۔ ج ۲۔ ص ۳۵۱۔۳۶۰

۶۔ اس کی تفصیلی روایت وقعۃ صفین میں آئی ہے۔ اس کے لیے دیکھیے: ص ۳۲۶۔۳۵۶

تک جنگ جاری رہی تھی (۱)' شامیوں نے پانچ سو قرآن نیزوں پر بلند کر دیئے۔ اس موقع پر یہ نعرے لگائے جا رہے تھے کہ اے عرب کے لوگو! اپنی عورتوں اور بیٹیوں کے بارے میں سوچو! اگر تم مارے گئے' تو کل رومیوں' ترکوں اور ایرانیوں کے مقابلے میں کون کھڑا ہوگا؟ (۲)

اس اقدام کے نتیجے میں لشکرِ عراق کے درمیان آہستہ آہستہ یہ بات پھیلنے لگی کہ دشمن نے قرآن کی حکمیت کو قبول کر لیا ہے اور اب ہمیں ان کے خلاف جنگ کا کوئی حق نہیں۔ امامؑ نے سختی کے ساتھ اس بات کی مخالفت کی اور اعلان کیا کہ یہ سوائے دھوکا اور فریب کے کچھ اور نہیں ہے۔ صعصہ کے بقول: معاویہ نے یہ اقدام اس وقت اٹھایا جب اس نے سنا کہ لیلۃ الھریر میں اشعث بن قیس نے عورتوں اور بچیوں کا ذکر کیا اور کہا ہے کہ عرب نابود ہو رہے ہیں۔ (۳) جنگ جاری رکھنے کے مسئلے میں جس شخص نے سب سے پہلے امام کی مخالفت کی وہ بھی اشعث ہی تھا۔

سپاہِ امامؑ کے درمیان اختلاف بڑھنے نے معاملے کو سخت دشوار بنا دیا۔ امامؑ نے محسوس کیا کہ اب قیادت ان کے ہاتھ میں نہیں رہی ہے' بلکہ لوگوں نے ان کے ہاتھ باندھ دیئے ہیں اور خود ان پر امیر بن گئے ہیں۔ اس حال میں امامؑ کھڑے ہوئے اور فرمایا: ''میں کتابِ خدا کی حکمیت قبول کرنے کے سزاوار ترین افراد میں سے ہوں۔ لیکن معاویہ اور اس کے ساتھی اصحابِ دین اور اصحابِ قرآن نہیں ہیں۔ میں انہیں تم سے بہتر جانتا ہوں۔ میں بچپن سے ان کے ساتھ رہا ہوں۔'' اس موقع پر عراقی فوج کے تقریباً بیس ہزار افراد آپ کے پاس آئے اور آپ کو امیر المومنینؑ کے لقب سے مخاطب کیے بغیر آپ سے مطالبہ کیا کہ آپ قرآن کی حکمیت قبول کر لیں۔ قاریوں کا ایک گروہ' جو قرآن کی تلاوت کو پسند کرتا تھا' اور ان میں سے بہت سوں نے (بعد میں) خوارج مسلک اختیار کر لیا تھا' ان افراد میں شامل تھا۔ (۴) اس وقت مالک اشتر اگلی صفوں میں معاویہ کی لشکر گاہ کے قریب جنگ میں مصروف تھے۔ جنگ کے مخالفین نے امامؑ سے مطالبہ کیا کہ آپ مالک اشتر کو واپس آنے کا حکم دیں۔ امامؑ نے یزید بن ہانی کو مالک اشتر کے پاس بھیجا۔ مالک نے جواب دیا: یہ واپس آنے کا وقت نہیں ہے۔ مخالفین نے (امامؑ سے) کہا: آپ نے انہیں جنگ جاری رہنے پر ابھارا ہے۔ اگر مالک واپس نہ آئے' تو ہم آپ کو قتل کر دیں گے۔ یہ اطلاع پاتے ہی مالک اشتر واپس لوٹ آئے اور جنگ رک گئی۔ امامؑ نے معاویہ کے نام خط میں' یہ بات تحریر کر کے کہ ہم جانتے ہیں تم اہلِ قرآن نہیں ہو' قرآن کی حکمیت قبول کرنے کا عندیہ دیا۔ (۵)

۱۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۳۲۲
۲۔ وقعۃ صفین۔ ص ۴۷۸
۳۔ ایضاً۔ ص ۴۸۱
۴۔ ایضاً۔ ص ۴۸۹
۵۔ ایضاً۔ ص ۴۹۰۔ ۴۹۳

اشعث' معاویہ کے پاس گیا اور اس سے پوچھا کہ حکم قرآن کے نفاذ کی کیا صورت ہوگی؟ اس نے کہا: بہتر ہے کہ ایک آدمی ہماری جانب سے اور ایک آدمی تمہاری جانب سے بیٹھ جائے اور اس مسئلے پر حکم قرآن کے بارے میں اپنی اپنی رائے کا اظہار کرے۔ اشعث نے معاویہ کی یہ رائے امامؑ کے گوش گزار کی۔ پھر شام اور عراق کے قاریوں کا ایک گروہ دونوں لشکروں کے درمیان کھڑا ہوا اور کچھ دیر تک قرآن کی تلاوت کی اور اس بات پر اتفاق کیا کہ جس چیز کو قرآن نے زندہ کیا ہے اسے زندہ کریں گے۔ اس کے بعد شامیوں نے عمرو عاص کا انتخاب کیا۔ اشعث اور کچھ دوسرے لوگوں نے جو بعد میں خوارج کی صورت میں ظاہر ہوئے' ابوموسیٰ اشعری کا نام تجویز کیا۔

امامؑ جنگِ جمل کے موقع پر ابوموسیٰ کی جانب سے اپنی مخالفت کی وجہ سے اُسے اپنی طرف سے حکم قبول کرنے پر تیار نہ تھے۔ لیکن اُن لوگوں نے اس پر اصرار کیا۔ امامؑ کی تجویز تھی کہ ابن عباس یا مالکِ اشتر کو اُن کی طرف سے حکم مقرر کیا جائے۔ لیکن اُن لوگوں نے کہا کہ مالکِ اشتر تو جنگ کے حامی ہیں' ابن عباس کو بھی نہیں ہونا چاہیے' کیونکہ عمرو بن عاص مُضری ہے' لہٰذا اس کے مقابل جانے والے کو یمنی ہونا چاہیے۔ لا و الله لایحکم فیھا مضریان حتیٰ تقوم الساعة (خدا کی قسم! دو مُضری قیامت تک ان پر حکم نہیں ہو سکتے)۔(۱) امامؑ نے جب دیکھا کہ ان سے اصرار کرنا بے سود ہے' تو فرمایا: جو جی میں آئے کرو۔(۲) بعد میں ابن عباس کہا کرتے تھے کہ اگر اس موقع پر جنگ میں ثابت قدمی دکھانے والے اصحاب ہوتے' تو کامیابی نزدیک تھی۔(۳)

اس طرح طے پایا کہ ایک تحریر لکھی جائے' جس میں شامیوں اور عراقیوں کی جانب سے ان دو افراد کی تقرری کی جانب اشارہ کیا گیا اور لکھا گیا کہ یہ ان دونوں گروہوں کے درمیان پیدا ہونے والے اختلاف کے بارے میں اپنی اپنی رائے دیں گے۔ "اس شرط کے ساتھ کہ یہ دونوں اس مضبوط ترین اور عظیم ترین صورت کے ساتھ جس کی پابندی کا عہد و پیمان خدا نے اپنی ہر مخلوق سے لیا ہے' اور دونوں جس کام کے لیے مقرر کیے گئے ہیں اس میں قرآن کو مدنظر اور جو کچھ قرآن میں لکھا گیا ہے' اپنا فیصلہ دیتے وقت اس سے تجاوز نہیں کریں گے۔ اور اگر قرآن میں نہ ملے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کی جامع سنت سے رجوع کریں گے اور کسی بھی صورت میں اس کے خلاف کو سند نہیں بنائیں گے اور اس بارے میں اپنی خواہش کی پیروی کر کے شبہوں میں گرفتار نہ ہوں گے۔"

یہ بھی طے پایا کہ اگر فیصلے سے پہلے ان میں سے کسی ایک کا انتقال ہو جائے' تو اس جانب کا حاکم کسی دوسرے شخص کا

۱۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ جنگِ صفین میں "مضریوں" اور "یمنیوں" کی رقابت نے مشکلات پیدا کیں۔ دیکھئے: الفتوح۔ ج ۳۔ ص ۱۶۳

۲۔ وقعۂ صفین۔ ص ۴۹۹۔ ۵۰۰

۳۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۳۳۷

انتخاب کر سکتا ہے۔ اور اگر اس دوران ان دو میں سے کسی حاکم کا انتقال ہو جائے' تو اس جانب کے لوگ اس کی جگہ کسی دوسرے انصاف پسند شخص کا انتخاب کریں گے۔

مزید تحریر تھا کہ: "حکم افراد پر واجب ہے کہ عہد و پیمانِ الٰہی کا لحاظ رکھیں گے اور (قرآنی نص کے مقابل) اپنا اجتہاد نہیں کریں گے۔ جان بوجھ کر ظلم نہیں کریں گے۔ شبہ میں مبتلا نہ ہوں اور اپنے فیصلے میں حکمِ قرآن اور سنتِ رسولؐ سے تجاوز نہ کریں گے۔ اور اگر انہوں نے ان شرائط کی پابندی نہ کی' تو امت ان کا فیصلہ قبول نہیں کرے گی اور جو عہد و ذمے داری ان لوگوں نے اپنے ذمے لی ہوگی' اسے نہیں مانے گی۔"

اس تحریر میں حکمیت کی تاریخ ماہِ رمضان کے آخر (صفر سے رمضان تک آٹھ ماہ بعد) تک چھوڑی گئی اور طے پایا تھا کہ ہر صورت میں یہ مسئلہ ایامِ حج سے قبل نمٹا لیا جائے گا۔ "اگر ایامِ (حج) کے آخر تک کتابِ خدا اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کیا گیا' تو مسلمان جس طرح پہلے تھے' اسی طرح حالتِ جنگ میں باقی رہیں گے اور ان دو گروہوں کے درمیان کوئی شرط نہ ہوگی۔" یہ تحریر بروزِ بدھ (ابومخنف کے مطابق بروزِ جمعہ)۔ (۱) ۱۷ صفر سن ۳۷ ہجری کو لکھی گئی۔ (۲)

اس تحریر میں امامؑ اور معاویہ کے مساوی حقوق قرار دیئے گئے تھے۔ ابتدا میں امامؑ کے نام کے ساتھ امیر المومنینؑ لکھا گیا تھا' جسے معاویہ نے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اشعث نے اصرار کیا کہ اس لقب کو حذف کر دیا جائے۔ امامؑ نے فرمایا: سبحان اللہ! وہی انداز ہے جب مشرکین کے نمائندے سہل بن عمرو نے اصرار کیا تھا کہ صلحِ حدیبیہ کی دستاویز سے "رسول اللہ" کا لفظ حذف کیا جائے۔ (۳)

بہر صورت یہ تحریر لکھ لی گئی' لیکن امامؑ کے لشکر کے ایک دھڑے میں ایسا ہنگامہ برپا ہوا جو فرقۂ خوارج کے وجود میں آنے کا سبب بنا۔ کچھ لوگوں نے اسی وقت اس تحریر کی مخالفت کی۔ امامؑ کی خاطر صرف ان لوگوں نے تحکیم کو برداشت کیا جو آپ کے حقیقی شیعہ تھے۔ ان لوگوں میں مالکِ اشتر بھی شامل تھے۔ جب امامؑ کو بتایا گیا کہ مالک اس معاہدے سے خوش نہیں ہیں' تو امامؑ نے فرمایا: جب میں راضی ہو جاؤں گا تو مالک بھی راضی ہو جائیں گے۔ اور میں راضی ہو گیا ہوں۔ یہ جو تم کہہ رہے ہو کہ وہ مجھ سے دور ہو گئے ہیں' مجھے اُن سے یہ توقع نہیں ہے۔ تمہارے درمیان دو آدمی بلکہ ایک آدمی بھی ایسا نہیں ہوگا جو اُن کی طرح اپنے دشمن کے بارے میں سوچ رکھتا ہو۔ (۴)

۱۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۳۳۷ اور دیکھئے: ص ۳۳۸
۲۔ اخبار الطوال۔ ص ۱۹۴۔۱۹۶' وقعۂ صفین ص ۵۰۴۔۵۰۷' اور دیکھئے: انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۳۳۴۔۳۳۵
۳۔ وقعۂ صفین۔ ص ۵۰۸' تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۱۸۹
۴۔ وقعۂ صفین۔ ص ۵۲۱' اور دیکھئے: انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۳۳۶

امام ربیع الاول سن ۳۷ ہجری کو اپنے لشکر کے ہمراہ کوفہ واپس گئے۔(۱) کوفہ کے ہر گھر سے گریہ وزاری کی آواز بلند تھی اور امام ان کے مقتولوں کی شہادت کی گواہی دیتے ہوئے انہیں تسلی دیتے تھے۔آخرکار امام نے ابوموسیٰ کو تحکیم کے مقام پر روانہ کیا۔عمرو بن عاص کی مکاری سے حکمیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے ابوموسیٰ نے حضرت علیؑ کو خلافت سے معزول کیا اور عمرو عاص جس نے طے کیا تھا کہ وہ معاویہ کو معزول کرے گا' اس نے اسے معزول کرنے کی بجائے مقرر کردیا۔

خوارج کے خلاف جنگ

ٹھیک اُسی وقت جبکہ اشعث بن قیس تحکیم کی وہ تحریری دستاویز لشکر کے مختلف گروہوں کو پڑھ کر سنا رہا تھا' سپاہ امام کا ایک گروہ اس کے سامنے نعرے لگانے لگا لَا حُکْمَ اِلَّا لِلّٰہِ. (۲) نصر بن مزاحم کے بقول بنی مراد بنی راسب اور بنی تمیم کے کچھ لوگ دین کے معاملے میں لوگوں کی حکمیت کی مخالفت میں بلند آواز سے نعرے لگاتے ہوئے کہنے لگے کہ: حکمیت صرف خدا کا حق ہے۔ان لوگوں میں عمرو بن اُدَیہ (ایک دوسری روایت کے مطابق عروۃ بن جدیر)(۳) نے اشعث پر حملہ کیا۔اس کی تلوار کا وار آہستہ سے اشعث کے گھوڑے پر پڑا۔جب اشعث امام کے پاس آیا اور اُنہیں بتایا کہ چند ایک کے سوا تمام لوگ راضی ہیں' تو اُس کے کچھ ہی دیر بعد لَا حُکْمَ اِلَّا لِلّٰہِ کے نعرے اور تیزی سے بلند ہونے لگے۔یہ نعرے لگانے والے لوگ پوچھ رہے تھے کہ: پس ہمارے مقتولوں کا کیا ہوگا؟ اللہ تعالیٰ کی جانب سے معاویہ کے بارے میں واضح حکم موجود ہے اور خدا کا فیصلہ اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ لشکر شام کی سرکوبی کی جائے۔

صفین سے لوٹتے ہوئے لوگ دو دھڑوں میں تقسیم ہوگئے۔ایک گروہ حکمیت کے خلاف تھا اور دوسرا گروہ اُن پر (مسلمانوں کی) جماعت سے علیحدہ ہوجانے کا الزام لگا رہا تھا۔(۴) کوفہ کے نزدیک پہنچتے پہنچتے ایک گروہ لشکر سے جدا ہو گیا اور کوفہ سے نصف فرسخ دور ''حروراء'' کے مقام پر چلا گیا۔(۵) اسی لیے بعد میں انہیں ''حروریہ'' کہا گیا۔

خوارج کے ممتاز ترین افراد حُرقوص بن زہیر تمیمی' شریح بن اوفی العبسی' فروۃ بن نوفل اشجعی' عبداللہ بن شجرۃ سُلمی' حمزہ بن سنان اسدی اور عبداللہ بن وہب راسبی تھے۔امام کے کوفہ پہنچنے کے بعد یہ لوگ جب آپ کے پاس آئے اور آپ

۱۔انساب الاشراف۔ج ۲۔ص ۳۳۷

۲۔اخبار الطوال۔ص ۱۹۶

۳۔انساب الاشراف۔ج ۲۔ص ۳۳۹

۴۔ایضاً۔ج ۲۔ص ۳۴۲

۵۔تاریخ یعقوبی۔ج ۲۔ص ۱۹۱

سے مطالبہ کیا کہ حکمیت کے لیے ابوموسیٰ اشعری کو نہ بھیجیں۔ امامؑ نے فرمایا: ہم نے ایک چیز قبول کر لی ہے' اب اُس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔(۱) جیسا کہ ان کے ناموں سے ظاہر ہے' عراق کی کوئی بھی مشہور شخصیت ان میں شامل نہ تھی۔ بلکہ اس کے برعکس ان کا تعلق بکر بن وائل اور بنی تمیم جیسے بدوی قبائل سے تھا۔(۲)

اکثر خوارج کا تعلق اُن بدوؤں سے تھا جو بنیادی طور پر امامت کے بارے میں قبیلائی طرز فکر سے بلند ہو کر نہیں سوچتے تھے۔ انہوں نے اپنے اس طرز فکر کو لَا حُکْمَ اِلَّا لِلّٰہِ کے نعرے کی صورت میں اس سے انحرافی مفہوم اخذ کر کے ظاہر کیا تھا۔ خوارج میں عتریس بن عرقوب شیبانی بھی شامل تھا' جو عبداللہ ابن مسعود کے ساتھیوں میں سے تھا۔(۳)

خوارج نے چند اہم سوال اٹھائے۔ ان کا پہلا سوال یہ تھا کہ: امامؑ نے کس طرح اس بات پر رضامندی کا اظہار کیا کہ "دین" کے معاملے میں "اشخاص" حکمیت کریں؟ ان کا دوسرا سوال یہ تھا کہ: امامؑ اپنے خلافتی لقب "امیرالمومنین" کو حذف کرنے پر کیوں راضی ہوئے؟ یعقوبی نے جو تعبیر استعمال کی ہے' وہ یہ ہے کہ امامؑ نے اپنے اس اقدام سے "وصایت" کو ضائع کر دیا ہے۔(۴) اُن کا ایک اور سوال یہ تھا کہ: امامؑ نے ناکثین (اصحاب جمل) پر فتح حاصل کرنے کے بعد ان کے مال غنیمت کی تقسیم کی اجازت کیوں نہیں دی؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ اُن کو قتل کرنا تو جائز ہو لیکن ان کا مال اسباب لینا حلال نہ ہو؟(۵)

امامؑ نے "امیرالمومنین" کا لقب حذف کرنے کے بارے میں صلح حدیبیہ میں "رسول اللہؐ" کا لقب حذف کرنے کو دلیل کے طور پر پیش کیا۔ حکمیت کے بارے میں بھی فرمایا: میں ابتدا ہی سے اس حکمیت کا مخالف تھا۔ بعد میں بھی' جب لوگوں کے مجبور کرنے پر اسے قبول کرنے پر راضی ہوا' تب بھی میں نے شرط رکھی تھی کہ اگر وہ کتاب خدا کے مطابق فیصلہ کریں گے' تو میں اس فیصلے کی پابندی کروں گا۔ کیونکہ میں نے دراصل قرآن کی حکمیت کو قبول کیا تھا' نہ کہ افراد کی حکمیت کو۔ اس کے علاوہ امامؑ نے خراج جمع کرنے کے بعد شامیوں کے ساتھ دوبارہ جنگ جاری رکھنے کے عزم کا اعلان بھی کیا۔ اس طرح خوارج کے ساتھ ہو جانے والے بہت سے لوگ' امامؑ کی متابعت کرنے والوں میں شامل ہو گئے۔(۶)

۱۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۳۵۹

۲۔ ایضاً۔ ج ۲۔ ص ۳۵۰

۳۔ ایضاً۔ ج ۲۔ ص ۳۶۳

۴۔ تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۱۹۲

۵۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۳۶۰

۶۔ ایضاً۔ ج ۲۔ ص ۳۳۹

لیکن اب بھی بہت سے لوگ اپنے نظریے پر قائم تھے۔ یہ لوگ لَا حُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ کی بنیاد پر حکمیت کی مخالفت میں کھڑے ہو گئے۔ یہ خوارج کی ایک خصوصیت تھی کہ وہ قرآن کے ظاہری معنی و مفہوم کو لے کر "ضرب القرآن بعضہ ببعض" (قرآن کے ذریعے قرآن کی کاٹ کرتے) اور یوں آیات قرآنی سے افراطی معانی نکالتے تھے۔ امامؑ نے اس گروہ کے جواب میں، جس نے مسجد میں آپ پر اعتراض کیا تھا اور جو یہی نعرہ لگا رہا تھا، فرمایا: کلمۃ حق یراد بھا الباطل (یہ بات درست ہے لیکن اس سے مراد باطل لی گئی ہے)۔ امامؑ نے خوارج سے تعلق رکھنے والے مخالفین سے اپنے طرزِ عمل کے بارے میں فرمایا: اگر یہ خاموش رہے تو ہم انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں گے۔ اگر انہوں نے پروپیگنڈا کیا اور اس حوالے سے گفتگو کی تو ہم ان کے مقابل گفتگو کریں گے اور اگر انہوں نے ہم پر خروج کیا تو ہم ان سے جنگ کریں گے۔ اس موقع پر ایک خارجی اٹھا اور بولا: خدایا! ہم دین کے معاملے میں ذلت قبول کرنے سے تیری پناہ چاہتے ہیں۔ یہ سستی ہے جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ غضبناک ہو گا۔ (۱)

امامؑ اور ان کے اصحاب کی جانب سے بار بار کی جانے والی گفتگو بھی خوارج کے ایک گروہ کو ان کے اختیار کردہ راستے سے پلٹا نہ سکی۔ شوال سن ۳۷ ہجری میں خوارج زید بن حُصَین کے گھر جمع ہوئے اور وہاں عبداللہ بن وہب راسبی کو اپنا قائد منتخب کر کے (۲) اپنی سیاسی اور عسکری تنظیم کی۔ یہ فیصلہ اس ماہِ رمضان کے بعد ہوا تھا جس میں ابو موسیٰ کو حکمیت کے لیے بھیجا جا چکا تھا حکمیت کے بعد انہوں نے کوفہ میں رہنا جائز نہ سمجھتے ہوئے مدائن کا رخ کیا۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے بصرہ میں موجود اپنے ہم خیال لوگوں کو اپنی طرف دعوت دی۔ ان میں سے بعض نے مدائن میں شیعیانِ علیؑ کی موجودگی کی وجہ سے وہاں جانا مناسب نہ سمجھا اور اس کی بجائے نہروان کا انتخاب کیا۔ (۳) حکمیت کا نتیجہ سامنے آنے کے بعد، امامؑ نے اس کے نتیجے کی مخالفت کا اعلان کر دیا اور لوگوں کو قاسطین کے خلاف جنگ کے لیے لشکر گاہ میں جمع ہونے کی دعوت دی۔ (۴) امامؑ نے خوارج کو پیغام بھیجا اور فرمایا: ان دو حکموں (ثالثوں) نے قرآن کے برخلاف عمل کیا ہے اور میں شام کی طرف جا رہا ہوں۔ تم لوگ بھی ہمارے ساتھ چلو۔ (۵) انہوں نے کہا: ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ہم آپ کو اپنا امام بنائیں۔ نخیلہ میں جمع ہونے کے بعد عراق کی سپاہ انبار شہر کی جانب روانہ ہوئیں، وہاں سے قریہ شاہی اور اس کے بعد

۱۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۳۵۲

۲۔ ایضاً۔ ج ۲۔ ص ۳۶۴

۳۔ اخبار الطوال۔ ص ۲۰۲۔۲۰۳

۴۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۳۶۰ اور اسی کے حاشیے میں: الامامہ والسیاسہ۔ ج ۱۔ ص ۱۴۳ سے۔

۵۔ اخبار الطوال۔ ص ۲۰۶

دبا ہوا اور پھر دمام تک گئیں۔(۱)

خوارج' جو اس زمانے میں نہروان میں جمع تھے' راستے میں اُنہیں خبّاب بن ارت کا بیٹا عبداللہ ملا۔ اُنہوں نے عبداللہ سے حضرت علیؑ کے بارے میں اُس کی رائے معلوم کی۔ عبداللہ نے کہا: علیؑ امیر المومنین اور امام المسلمین ہیں۔ خوارج نے عبداللہ اور اُس کی حاملہ بیوی کو قتل کر دیا۔ کہتے ہیں کہ خوارج کو راستے میں جو بھی نظر آتا' اس سے حکمیت کے بارے میں سوال کرتے' اور اگر وہ ان سے متفق نہ ہوتا' تو اسے قتل کر دیتے۔(۲) ان کی اس حرکت کی وجہ سے امامؑ نے ان کے خلاف جنگ کا فیصلہ کیا۔(۳)

اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت علی علیہ السلام کوفہ کی عورتوں اور بچوں کو ان سنگدل اور بے رحم لوگوں کی موجودگی میں تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتے تھے۔ امامؑ مدائن تک گئے اور وہاں سے نہروان روانہ ہوئے۔ امامؑ نے خوارج کو خط لکھ کر انہیں جماعت کے ساتھ آ ملنے کی دعوت دی۔ جواب میں عبداللہ بن وہب نے اب تک کے واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دین کے بارے میں امامؑ کے شک کرنے اور آپ پر توبہ کے لازم ہونے کی وہی پرانی بات دُہرائی۔ قیس بن سعد اور ابو ایوب انصاری ان کے پاس گئے اور ان سے درخواست کی کہ معاویہ کے خلاف جنگ کے لیے وہ اُن کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ خوارج نے کہا کہ وہ امام علیؑ کی امامت کو نہیں مانتے' صرف اس صورت میں ساتھ چلنے کو تیار ہوں گے جب عمر جیسا کوئی شخص ان کا قائد ہو۔(۴) جب امامؑ نے دیکھا کہ یہ لوگ کسی صورت ماننے والے نہیں ہیں' تو آپ نے اپنے لشکر کو' جو چودہ ہزار افراد پر مشتمل تھا' خوارج کے مقابل کھڑا کر دیا۔ اس موقع پر فروہ نوفل پانچ سو افراد کے ساتھ خوارج سے الگ ہو کر بند نیجین اور دسکرہ میں مقیم ہو گیا۔(۵)

رفتہ رفتہ کچھ اور لوگ بھی ان سے جدا ہوئے' یہاں تک کہ عبداللہ بن وہب کے ساتھ صرف اٹھارہ سو سوار اور پندرہ سو پیادے رہ گئے۔(۶) اس مرتبہ بھی امامؑ نے اپنے اصحاب سے کہا کہ وہ جنگ کا آغاز کرنے والے نہ بنیں(۷) خوارج نے جنگ کا آغاز کر دیا۔ یہ لوگ بہت ہی جلد کمزور پڑ گئے اور ان کے قائدین مارے گئے۔ امامؑ کے لشکر کے دس سے بھی کم

۱۔ انساب الاشراف۔ ج۲۔ ص۳۶۷
۲۔ اخبار الطوال۔ ص۲۰۶
۳۔ انساب الاشراف۔ ج۲۔ ص۳۶۲۔۳۶۸
۴۔ انساب الاشراف۔ ج۲۔ ص۳۷۰' اخبار الطوال۔ ص۲۰۷
۵۔ اخبار الطوال۔ ص۲۱۰
۶۔ انساب الاشراف۔ ج۲۔ ص۳۷۱
۷۔ اخبار الطوال۔ ص۲۱۰

سپاہی کام آئے۔(۱) فرار ہونے والوں کے علاوہ جو چار سو افراد میدان میں رہ گئے تھے' انہیں اُن کے خاندانوں کے حوالے کیا گیا۔ یہ جنگ ۹ صفر سن ۳۸ ہجری کو واقع ہوئی۔(۲)

جب یہ جنگ ختم ہوگئی تو امامؑ نے لوگوں سے کہا کہ وہ قاسطین کے خلاف جنگ کے لیے شام چلیں۔ لیکن لوگوں نے تھکن کا اظہار کیا اور اشعث بن قیس کی تقریر اس بات کا سبب بنی کہ امام نخیلہ واپس لوٹ گئے۔ وہاں سے لوگ کوفہ چلے گئے اور صرف تین سو افراد امامؑ کے ساتھ رہے۔(۳) مجبوراً امامؑ بھی کوفہ پلٹ آئے۔ اس کے بعد امام تھوڑے تھوڑے عرصے بعد اپنے خطبوں کے ذریعے لوگوں کو شامیوں کے خلاف جہاد کی دعوت دیتے' لیکن کوئی بھی مثبت جواب نہ دیتا۔ یہاں سے آخر وقت تک امامؑ اپنے طویل خطبوں میں اہلِ کوفہ کی مذمت کرتے اور بار بار ان کی بے وفائی کا تذکرہ کرتے۔

آخری کوششیں

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے' جنگِ نہروان کے بعد امامؑ نے کوشش کی کہ عراقیوں کو شام کے خلاف دوبارہ جنگ کے لیے تیار کریں' لیکن امامؑ کا ساتھ دینے کے لیے تیار لوگوں کی تعداد بہت کم تھی۔ امامؑ اپنے خطبوں میں مسلسل لوگوں سے ساتھ دینے کا مطالبہ کرتے رہے' لیکن بہت کم مثبت جواب پایا۔ آپ نے ایک خطبے میں فرمایا: ''میں ایسے لوگوں میں پھنس گیا ہوں کہ جب اُنہیں حکم دیتا ہوں تو اُسے مانتے نہیں' اور جب بلاتا ہوں تو لبیک نہیں کہتے۔ تمہارا برا ہو! اب اپنے اللہ کی نصرت کے لیے کس بات کے منتظر ہو؟ کیا دین تمہیں ایک جگہ اکٹھا نہیں کرتا؟ کیا غیرت وحمیت تمہیں جوش میں نہیں لاتی؟ میں تمہارے درمیان کھڑا چلا چلا کر مدد کے لیے پکارتا ہوں' لیکن نہ تم میری کوئی بات سنتے ہو' نہ میرا کوئی حکم مانتے ہو۔ یہاں تک کہ حالات کے بدترین نتائج کھل کر سامنے آ جائیں۔ نہ تمہارے ذریعے کسی خون کا بدلہ لیا جا سکتا ہے اور نہ تمہاری مدد سے کسی مقصود تک پہنچا جا سکتا ہے۔ میں نے تمہیں تمہارے ہی بھائیوں کی مدد کے لیے پکارا تھا۔ مگر تم اُس اونٹ کی طرح بلبلانے لگے جس کی ناف میں درد ہو رہا ہو' اور اُس لاغر اور کمزور شتر کی طرح ڈھیلے پڑ گئے جس کی پیٹھ زخمی ہو۔ اس کے بعد تمہارے اندر سے ایک مختصر سی کمزور' پریشان حال سپاہ برآمد ہوئی' اس طرح جیسے انہیں موت کی طرف دھکیلا جا رہا ہو

۱۔ ان میں سے ایک یزید بن نویرہ انصاری تھے' جن کے لیے رسول اللہؐ نے دو مرتبہ جنتی ہونے کی بشارت دی تھی (الاصابہ۔ ج ۶۔ ص ۳۴۸) اس جنگ میں شہید ہونے والوں کے ناموں کی فہرست کو ابن اعثم نے (ج ۳۔ ص ۱۲۷ پر) اور ابن ابی الحدید نے (ج ۲۔ ص ۲۹ پر) ذکر کیا ہے۔ شہدا کے ناموں کے بارے میں ان کی روایت کو دیکھیے: انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۳۷۲ پر (حاشیے میں)

۲۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۳۷۲۔ ۳۷۵۔ الفتوح کی جلد ۳ صفحہ ۱۲۷ پر آیا ہے کہ جب امامؑ خوارج کے ساتھ جنگ سے فارغ ہو کر کوفہ آئے تو رمضان کے سترہ دن باقی تھے۔

۳۔ ایضاً۔ ج ۲۔ ص ۳۷۹

اور یہ بے کسی سے اپنی موت کا نظارہ کر رہے ہوں۔"(۱)

امامؑ نے ایک خطبے میں فرمایا: "اے علیحدہ علیحدہ طبیعتوں اور پراگندہ دل و دماغ والے لوگو! جن کے بدن تو حاضر ہیں لیکن عقلیں غائب ہیں۔ میں تمہیں نرمی اور شفقت سے حق کی طرف بلاتا ہوں اور تم اس طرح فرار ہوتے ہو جیسے شیر کی دھاڑ سے بھیڑ بکریاں بھاگتی ہیں۔ افسوس کہ تمہارے ذریعے عدل کی تاریکیوں کو کیسے روشن کیا جاسکتا ہے اور حق میں پیدا ہونے والی کجی کو کس طرح سیدھا کیا جاسکتا ہے۔"(۲)

امامؑ نے ایک اور خطبے میں فرمایا: "اے وہ گروہ جسے میں حکم دیتا ہوں تو اطاعت نہیں کرتا اور آواز دیتا ہوں تو لبیک نہیں کہتا۔ اگر تمہیں کچھ مہلت ملتی ہے تو خوب ڈینگیں مارنے لگتے ہو اور اگر جنگ چھڑ جاتی ہے تو بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہو۔ جب لوگ امام پر ایکا کر لیتے ہیں تو تم اعتراض کرنے لگتے ہو۔ اور جب گھیر کر مقابلے کی طرف لائے جاتے ہو تو راہِ فرار اختیار کرتے ہو۔ تمہارے دشمنوں کا برا ہو! آخر تم میری نصرت اور اپنے حق کے لیے جہاد میں کس چیز کا انتظار کر رہے ہو؟ موت کا یا ذلت کا؟ خدا کی قسم اگر میری موت کا دن آ گیا' جو بہر حال آنے والا ہے' تو میرے اور تمہارے درمیان اس حال میں جدائی ہوگی کہ میں تمہاری صحبت سے دل برداشتہ ہوں گا اور تمہاری موجودگی سے کسی کثرت کا احساس نہ کروں گا۔ خدا تمہارا بھلا کرے! کیا تمہارے پاس کوئی دین نہیں ہے جو تمہیں متحد کر سکے؟ اور نہ کوئی غیرت ہے جو تمہیں آمادہ کر سکے؟ کیا یہ بات حیرت انگیز نہیں ہے کہ معاویہ اپنے ظالم اور بدکار ساتھیوں کو آواز دیتا ہے تو وہ کسی امداد اور عطا کے بغیر بھی اس کی اطاعت کرتے ہیں اور میں تم کو دعوت دیتا ہوں اور تم سے عطیوں کا وعدہ بھی کرتا ہوں' مگر تم مجھ سے الگ ہو جاتے ہو اور میری مخالفت کرتے ہو۔۔۔۔۔ اب تو میرے لیے محبوب ترین شئے جس سے میں ملنے کا مشتاق ہوں صرف موت ہے۔(۳)

یہ خطبات امامؑ کے ان متعدد خطبات کا نمونہ ہیں جو آپ نے سن ۳۹' اور سن ۴۰ ہجری کے دوران لوگوں کے سامنے ارشاد فرمائے۔ یہ کلمات قاسطین کے مقابل آپ کے عزمِ راسخ کی علامت ہیں۔ معاویہ جو یقیناً عراق کے حالات سے باخبر تھے اور عراقیوں کی سستی سے بھی آگاہ تھے' انہوں نے فیصلہ کیا کہ جزیرۃ العرب میں امامؑ کے زیر کنٹرول علاقوں کے نواح پر اور حتیٰ عراق پر بھی حملے کر کے امامؑ کی قوت کو کمزور کریں اور عراق پر قبضے کے لیے راستہ ہموار کریں۔ ان حملوں کے ذریعے معاویہ جو مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے' اُسے اِن الفاظ میں بیان کرتے ہیں: یہ قتل و غارتگری عراقیوں کو خوفزدہ کر دے گی۔ اور جو لوگ (علیؑ کے) مخالفین میں شامل ہیں' اور جو لوگ اُن سے الگ ہونا چاہتے ہیں' انہیں دلیر کر دے گی۔ اور

۱۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۳۹

۲۔ ایضاً۔ خطبہ ۱۳۱

۳۔ ایضاً۔ خطبہ ۱۸۰

جو لوگ اس کشمکش سے ڈرتے ہیں' انہیں ہمارے پاس لے آئے گی۔(۱) یہ حملے جنہیں ''غارات'' کہا جاتا تھا' ہر کچھ عرصے بعد کیے جاتے تھے اور ہر علاقے میں امامؑ کے مخلص شیعہ شہید کردیے جاتے تھے۔ ان غارتگریوں کی فہرست کو ابو اسحاق ثقفی نامی ایک شیعہ (م:۲۸۳) نے تیسری صدی میں اسی نام (غارات) سے تالیف کی جانے والی ایک کتاب میں قلمبند کیا ہے' خوش قسمتی سے یہ کتاب آج بھی موجود ہے۔

حضرت علیؑ کی شہادت

جب امامؑ اس بات کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ صفین جاکر معاویہ کے خلاف ایک اور جنگ کا آغاز کیا جائے' اسی زمانے میں آپ ۱۹ رمضان المبارک ۴۰ ہجری کی صبح کو شقی ترین انسان' عبدالرحمٰن ابن ملجم مرادی کے ہاتھوں زخمی ہوئے اور تین دن بعد' یعنی ۲۱ رمضان المبارک کے دن آپ کی شہادت واقع ہوئی۔

ابن سعد کے بقول' خوارج سے تعلق رکھنے والے تین افراد عبدالرحمٰن ابن ملجم' برک بن عبداللہ تمیمی اور عمرو بن بکیر نے مکہ میں یہ باہمی عہد کیا کہ وہ حضرت علیؑ' معاویہ اور عمرو بن عاص کو قتل کردیں گے۔ چنانچہ عبدالرحمٰن کوفہ آیا اور خوارج سے تعلق رکھنے والے اپنے دوستوں سے ملاقاتیں کرنے لگا۔ ایک بار وہ قبیلہ ''تیم الرباب'' کے ایک گروہ سے ملنے گیا' وہاں اس کی ملاقات ''قطام بنت شجنۃ بن عدی'' نامی ایک عورت سے ہوئی' جس کا باپ اور بھائی نہروان میں قتل ہو گئے تھے۔ ابن ملجم نے اس سے شادی کی درخواست کی۔ اس عورت نے اپنا مہر تین ہزار (دینار) اور امام علیؑ کا قتل قرار دیا۔ ابن ملجم نے کہا کہ اتفاقاً وہ اسی مقصد سے کوفہ آیا ہے۔(۲) اس نے کچھ عرصے تک اپنی تلوار کو زہر میں بجھایا۔ پھر اسی تلوار سے امامؑ کے سر پر وار کیا۔ چنانچہ تلوار کے گہرے زخم اور زہر کے اثر سے امامؑ شہید ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ اس رات ابن ملجم اشعث ابن قیس کے گھر پر تھا۔(۳)

متعدد روایات یہ بتاتی ہیں کہ ابن ملجم نے امامؑ پر (مسجد کے اندر) داخل ہونے والے راستے میں حملہ کیا تھا۔(۴) بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ امامؑ جس وقت لوگوں کو نماز کے لیے بیدار کر رہے تھے' اس وقت حملے کا نشانہ بنے۔(۵) موجود تاریخی کتابوں میں سے زیادہ تر میں پہلی روایت کا ذکر آیا ہے۔ اس کے مقابلے میں ایسی روایات بھی موجود ہیں جن کے

۱۔ الغارات۔ص ۱۷۶(ترجمہ فارسی)
۲۔ طبقات الکبریٰ۔ج ۳۔ص ۳۵۔۳۸
۳۔ مقتل الامام امیر المومنین۔ص ۳۶۔ش ۱۳
۴۔ ایضاً۔ص ۲۹۔ش ۲' اور ص ۳۵۔ش ۱۲
۵۔ ایضاً۔ص ۲۸۔۳۳۔ش ۱۱

مطابق ابن ملجم کے حملے کے وقت امام نماز میں مشغول تھے۔ میثم تمار سے منقول ایک روایت میں ہے کہ امام نے فجر کی نماز شروع کی تھی اور سورہ انبیا کی گیارہ آیتیں تلاوت فرما چکے تھے کہ ابن ملجم نے امام کے سر پر تلوار سے ضرب لگائی۔ (۳۰۶)

ام ہانی کے بیٹے جعدۃ بن ہبیرہ جو بعض اوقات امام کی جگہ نماز کی امامت کیا کرتے تھے اور بعض روایات کے مطابق ضربت کے بعد انہی نے آگے بڑھ کر نماز پڑھائی تھی ان کے ایک پوتے سے ایک روایت نقل کی جاتی ہے کہ: جس وقت ابن ملجم نے وار کیا' اُس وقت امام نماز پڑھ رہے تھے۔ (۱) شیخ طوسی نے بھی ایک روایت نقل کی ہے' جو مذکورہ بات ہی کی تائید کرتی ہے۔ (۲) متقی ہندی نے ایک روایت نقل کی ہے' جس میں آیا ہے کہ ابن ملجم نے اس وقت وار کیا جب امام سجدے سے سر اٹھا رہے تھے۔ (۳) ایک اور روایت جو ابن حنبل سے منقول ہے (۴) اور جسے ابن عساکر (۵) نے بھی نقل کیا ہے' وہ بھی اسی بات کی تائید کرتی ہے۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں: اس بات میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ ابن ملجم نے نماز میں وار کیا تھا یا اس سے پہلے' نیز یہ کہ امام نے اس وقت کسی کو اپنا جانشین بنایا تھا یا خود ہی نماز پوری کی تھی۔ زیادہ تر کا کہنا یہ ہے کہ امام نے اپنے بعد جعدۃ بن ہبیرہ کو اپنی جگہ مقرر کیا کہ وہ نماز پوری کرائیں۔ (۶)

اہل بیت اور اہل سنت کے طریقوں سے متعدد روایات نقل ہوئی ہیں' جن میں اس رات' جس کی صبح امام کو ضربت لگی تھی امام کی خاص روحانی کیفیت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ انہی میں سے امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ایک روایت ہے جسے ابن ابی الدنیا نے نقل کیا ہے' جو واضح طور پر یہ بتاتی ہے کہ امام اپنی شہادت سے آگاہ تھے۔ (۷) جب امام کو ضربت لگی تو آپ نے بلند آواز سے فرمایا: فزت و رب الکعبه. (رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا)۔ (۸)

ابن ابی الدنیا نے مختلف طریقوں سے امام کی وصیت کو نقل کیا ہے۔ اس کا کچھ حصہ مالی معاملات کے حوالے سے ہے اور کچھ آپ کی دینی وصیتیں ہیں۔ اس وصیت میں امام نے چند مسائل کی تاکید کی ہے۔ ان میں صلۂ رحم' یتیموں اور

۱۔ مقتل الامام امیر المومنین۔ ص ۳۰۔ ش ۵

۲۔ ایضاً۔ ص ۳۰۔ ش ۶

۳۔ الامالی الجزء ثالث۔ ش ۱۸

۴۔ کنز العمال۔ ج ۱۵۔ ص ۱۷۰ (طبع دوم) الامالی فی آثار الصحابہ۔ ص ۱۰۳۔ ۱۰۴

۵۔ الفضائل۔ ص ۳۸۔ ش ۶۳

۶۔ ترجمۃ الامام علی ابن ابیطالبؑ۔ ج ۳۔ ص ۳۶۱ (طبع دوم)

۷۔ الاستیعاب (الاصابہ کے حاشیے میں) ج ۳۔ ص ۵۹

۸۔ ایضاً۔ ص ۳۳۔ ۳۴۔ ش ۱۲' ابو نعیم نے ایک روایت نقل کی ہے (اور دوسروں نے بکثرت نقل کیا ہے) کہ رسول اللہؐ نے امام کو آپ کی شہادت کی خبر دے دی تھی۔ معرفۃ الصحابہ۔ ج ۱۔ ص ۲۹۵۔ ۲۹۶

۸۔ ایضاً۔ ص ۳۹۔ ش ۴۰' اور وہیں پر حاشیے میں: الامامۃ والسیاسۃ۔ ص ۱۶۰' انساب الاشراف۔ ج ۲ ص ۴۹۹ سے۔

ہمسایوں سے حسنِ سلوک، قرآن پر عمل، دین کے ستون کے طور پر نماز کا قیام، حج، روزہ، جہاد، زکات، اہل بیت رسول، غلاموں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر شامل ہیں۔ اس روایت میں آیا ہے کہ امامؑ ماہِ رمضان کی اکیسویں شب کے آغاز میں لا الٰہ الا اللہ اور آیتِ قرآن فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَه وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَه پڑھتے ہوئے اپنے معبود کے دیدار کے لیے روانہ ہوئے۔ (۱) ایک اور روایت کے مطابق امامؑ کی شہادت کے بعد آپ کو حسن و حسین، محمد حنفیہ، عبداللہ بن جعفر اور اہلِ بیت سے تعلق رکھنے والے چند دوسرے افراد نے رات کے وقت کوفہ سے باہر (وہ مقام جو بعد میں نجف کہلایا) لے جاکر خفیہ طور پر دفن کیا۔ یہ اس لیے کیا گیا تھا تاکہ خوارج یا دوسرے (بنی امیہ) آپ کی قبر کی بے حرمتی نہ کریں۔ (۲)

امامؑ کی شہادت سے متعلق روایات میں آیا ہے کہ مدائن میں رہنے والے کچھ غالیوں نے امامؑ کی شہادت کی خبر سننے کے بعد اس خبر کو ماننے سے انکار کردیا۔ یہ لوگ شیعوں کے درمیان غلو آمیز نظریات کا سبب بنے جن کی جانب ہم بعد میں اشارہ کریں گے۔ اس بارے میں ابن ابی الدنیا نے جو روایتیں نقل کی ہیں، اُن سے قبیلہ ہمدان کے ابن السوداء نامی ایک شخص کی موجودگی کا پتا چلتا ہے، جسے عبداللہ بن سبا کہتے ہیں۔ ایک اور روایت میں عبداللہ بن وہب السبائی کا ذکر ہے جس نے مدائن میں یہ دعویٰ کیا تھا۔ (۳) ان دو روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حتیٰ اس شخص کا نام بھی واضح نہیں تھا۔ اس شخص کے بارے میں ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اسے "حضرت عثمان کے مخالفین" کے عنوان سے ہم نے جو گفتگو کی ہے، اُس میں دیکھیے۔

حضرت علیؑ کے اوصاف

ایک نمونۂ عمل (ideal) کے طور پر امامؑ کی زندگی کا جائزہ لینا تو یہاں ممکن نہیں، لیکن اپنی کتاب کو ان مثالوں میں سے بعض کے ذریعے متبرک کرنے کی خاطر، ان میں سے چند کی طرف اشارہ کررہے ہیں۔

امامؑ کی سیاسی اور اجتماعی زندگی مدینۂ فاضلہ کی حد تک نمونہ ہے۔ کبھی کبھی آپ کی حیاتِ مبارک میں حکمِ خدا پر استقامت کے ایسے نمونے دکھائی دیتے ہیں جن کی پیروی کرنا دوسروں کے لیے انتہائی دشوار دکھائی دیتا ہے۔ جیسا کہ خود امامؑ نے اپنے ایک خط میں اس نکتے کی جانب اشارہ کیا ہے۔ (۴) اسی لیے آپ کی زندگی ان لوگوں کے لیے ایک انتہائی اعلیٰ نمونہ ہے جو اس راہ پر چلنے کے خواہشمند ہیں، ایسا نمونہ جس سے ہمیشہ درس لینا چاہیے اور اس تک پہنچنے کے لیے اب

۱۔ مقتل الامام امیر المومنین۔ ص ۳۵۔ ۳۶

۲۔ ایضاً۔ ص ۹۷۔ ش ۶۸

۳۔ ایضاً۔ ص ۹۲۔ ش ۸۵، ص ۹۶۔ ش ۹۱

۴۔ نہج البلاغہ۔ مکتوب ۴۵

بھی ایک طویل راستہ طے کرنا باقی ہے۔

بالفاظ دیگر امامؑ کی سیرت' حیات انسانی میں اب تک سامنے آنے والے بہترین طرز ہائے زندگی میں سے ایک ہے۔ایک ایسے انسان کامل کی زندگی ہے جو الٰہی انسان کا ایک سچا نمونہ ہے اور آپ کا شمار ان نادر و نایاب افراد میں ہوتا ہے جو زمین پر خلیفۂ خدا کے معنی میں ایک انسان کہے جانے کے مستحق ہیں۔یہ زندگی اتنی جاذب ہے کہ آپ کے دوست کو آپ سے دوستی کی انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیتی ہے اور آپ کے دشمن کو آپ سے دشمنی کے آخری درجے پر لے جاتی ہے۔یہ وہ ہیں کہ جن کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: یھلک فیک رجلان محب مفرط و مبغض مفرط (تمہارے بارے میں دو قسم کے لوگ ہلاک ہوں گے۔تم سے حد سے زیادہ محبت رکھنے والے اور تم سے حد سے زیادہ دشمنی رکھنے والے)(۱) دشمن راہِ حق پر آپ کی استقامت کی وجہ سے آپ سے اس قدر بغض رکھتا ہے کہ اپنی دشمنی میں افراط کا شکار ہو جاتا ہے اور دوست آپ کی اسی خصوصیت کی وجہ سے آپ سے اس قدر محبت کرتا ہے کہ کبھی کبھی افراط کر بیٹھتا ہے۔

آپ سے محبت کرنے والا شخص' ایک مخلص شیعہ کا بلند مقام حاصل کر لیتا ہے' لیکن اگر یہی شخص تھوڑی سی غفلت کا شکار ہو جائے تو غلو آمیز رجحانات میں مبتلا ہو سکتا ہے۔بہت کم دیکھا گیا ہے کہ کسی انسان کی زندگی ہی میں اسے خدا کہا جانے لگا ہو۔لیکن ایک ایسا معاشرہ جس میں خداوند عالم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اپنا عبد اور بندہ ہونے پر اس قدر زیادہ زور دیا' اُس معاشرے میں علیؑ کو خدا کہا جانے لگا' اگرچہ امامؑ نے ایسا کہنے والوں کے خلاف انتہائی سخت رویہ اختیار کیا۔

امامؑ کی زندگی کا ایک اہم ترین پہلو آپ کا زہد ہے' جس نے آپ کی پوری زندگی کو گھیرا ہوا ہے۔ایک ایسا زاہد جس کے پاس ہر چیز ہے اور وہ ہر چیز حاصل کر سکتا ہے' لیکن ان سب سے پرہیز کرتا ہے۔ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے عمر بن عبدالعزیز کے سامنے زاہدوں کا ذکر کیا اور آپس میں زاہد ترین شخص کے بارے میں پوچھنے لگے۔وہاں موجود بعض لوگوں نے حضرت ابوذر غفاری اور حضرت عمر کا نام لیا۔عمر بن عبدالعزیز نے کہا: ازھد الناس علی ابن ابی طالب. (زاہد ترین انسان علی ابن ابی طالبؑ ہیں)۔(۲)

امامؑ فقیر و نادار افراد کو اپنے پاس بلا کر ان کے ساتھ لطف و مہربانی سے پیش آتے تھے۔(۳) کبھی ایسا بھی ہوتا تھا

۱۔یہ حدیث ان احادیث میں سے ہے جن کا تذکرہ بارہا منابع میں کیا گیا ہے اور امامؑ بھی فرماتے ہیں: یھلک فی رجلان محب مفرط ... و مبغض مفرط. نہج البلاغہ۔خطبہ ۱۲۷

۲۔المعیار والموازنہ۔ص ۲۳۰

۳۔ایضاً۔ص ۲۳۰

کہ نماز کے وقت آپ کا واحد لباس گیلا ہوتا تھا اور آپ اُسی کو زیب تن فرما لیتے' اور اسی حال میں خطبہ دیا کرتے۔(۱) امامؑ نے نہج البلاغہ میں بار بار اپنی سادگی کا ذکر کیا ہے۔ ایک مرتبہ آپ کے ایک صحابی نے آپ کی انتہائی سادہ اور معمولی خوراک کو دیکھا تو کہا: آپ عراق میں ایسا کر رہے ہیں' جہاں بہترین غذائیں موجود ہیں۔(۲) امامؑ خود ان باتوں کا بہترین مصداق تھے جن کی خلاف ورزی پر آپ نے نہج البلاغہ میں عثمان بن حنیف پر اعتراض کیا ہے یا جیسا آپ اپنے عمومی خطبوں میں لوگوں سے دنیا کے بارے میں فرمایا کرتے تھے۔

اسود بن قیس کہتا ہے کہ حضرت علیؑ مسجد کوفہ کے صحن میں لوگوں کو کھانا دیا کرتے تھے' لیکن خود اپنے گھر میں کھانا تناول فرماتے تھے۔ آپ کے ایک صحابی کہتے ہیں: میں نے سوچا کہ علیؑ اپنے گھر میں اس کھانے سے زیادہ لذیذ کھانا کھاتے ہوں گے جو وہ لوگوں کو مسجد میں کھلاتے ہیں۔ میں نے اپنا کھانا چھوڑا اور ان کے پیچھے چل پڑا۔ انہوں نے گھر جا کر فضہ کو آواز دی۔ جب وہ آئیں تو آپ نے انہیں کھانا لانے کو کہا۔ فضہ ایک روٹی اور لسی کا برتن لے آئیں اور بھوسی والی روٹی کے ٹکڑے لسی میں بھگوئے۔ میں نے امیر المومنینؑ سے عرض کیا: اگر آپ بغیر بھوسی کے آٹے کی روٹی لانے کو کہتے تو بہتر ہوتا۔ امامؑ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور فرمایا: خدا کی قسم! میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ رسول اللہؐ کے گھر میں بغیر بھوسی کے آٹے کی روٹی کھائی گئی ہو۔(۳)

عقبہ بن علقمہ کہتے ہیں: میں حضرت علیؑ کے پاس آیا' تو آپ کے سامنے کھٹی لسی رکھی ہوئی تھی' جس کی کھٹاس اور پانی کی زیادتی سے مجھے تکلیف ہو رہی تھی۔ میں نے عرض کیا: کیا یہ لسی نوش فرمائیں گے؟ امامؑ نے فرمایا: اے ابا الجنوب! میں نے پیغمبر کو دیکھا ہے کہ آپ اس سے بھی زیادہ بدتر غذا نوش فرماتے تھے اور میرے لباس سے بھی زیادہ کھردرا لباس زیب تن کرتے تھے۔ مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ جو کام وہ کرتے تھے اگر میں نہیں کروں گا تو ان سے ملحق نہیں ہو سکوں گا۔(۴) ایک مرتبہ آپ کے لیے فالودہ لایا گیا' اسے دیکھ کر آپ نے فرمایا: جو چیز پیغمبر نے نہیں کھائی میں بھی نہیں کھاؤں گا۔(۵) اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان چیزوں کا کھانا صحیح نہیں' بلکہ ہر اعتبار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مطلق پیروی امامؑ کی نظر میں اہمیت کی حامل تھی۔

۱۔ المعیار والموازنہ۔ ص ۲۳۱

۲۔ ایضاً۔ ص ۲۳۹

۳۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۱۸۷ اور دیکھئے: الغارات۔ ج ۱۔ ص ۸۵۔۸۷۔۸۸

۴۔ الغارات۔ ج ۱۔ ص ۸۵

۵۔ ایضاً۔ ص ۸۸۔۸۹ اور دیکھئے: انہی صفحات کا حاشیہ

اس سلسلے کی ایک اور روایت اپنی اہمیت کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ اسے پیش کیا جائے۔

ابوالشیخ انصاری (م:۳۶۹) کہتے ہیں: امامؑ نے عمرو بن سلمہ کو اصفہان کا حاکم مقرر کیا۔ جب عمرو (کوفہ) کی جانب آنے لگے' تو راستے میں خوارج سے اُن کا سامنا ہوا۔ وہ خلوان نامی شہر میں ٹھہر گئے' جبکہ ان کے پاس خراج اور تحائف بھی تھے' جب خوارج وہاں سے دور چلے گئے' تو انہوں نے خراج کو خلوان میں چھوڑا' اور تحائف لے کر کوفہ آ گئے۔ امامؑ نے حکم دیا کہ ان تحائف کو مسجدِ کوفہ کے صحن میں رکھ دیا جائے۔ اور عمرو کو مقرر کیا کہ انہیں مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دیں۔ جنابِ ام کلثوم نے کسی کو عمرو کے پاس بھیج کر کہلوایا کہ: جو شہد وہ لے کر آئیں ہیں اُس میں سے تھوڑا سا مجھے بھی دیں۔ عمرو نے اُس شہد کے دو کنستر (Tin) امامؑ کی صاحبزادی کو بھجوا دیئے۔

جب امامؑ نماز کے لیے مسجد میں تشریف لائے' تو دیکھا کہ ان میں سے دو کنستر کم ہو گئے ہیں۔ آپ نے عمرو کو آواز دی اور ان دو کنستروں کے بارے میں پوچھا۔ اُنہوں نے جواب دیا: نہ پوچھئے کیا ہوا ہے۔ پھر وہ گئے اور شہد کے دو کنستر وہاں لا کر رکھ دیئے۔ امامؑ نے فرمایا: میں جاننا چاہتا ہوں کہ ان دو کنستروں کا معاملہ کیا ہے؟ اُنہوں نے کہا: ام کلثوم نے کسی کو میرے پاس بھیجا تھا اور میں نے دو کنستر اُنہیں دے دیے تھے۔ امامؑ نے فرمایا: کیا میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ یہ تحائف لوگوں کے درمیان تقسیم کر دو؟ اس کے بعد آپ نے وہ دونوں کنستر لانے کے لیے ایک آدمی کو ام کلثوم کے پاس بھیجا۔ جب وہ آئے تو آپ نے دیکھا کہ اُن میں سے کچھ شہد کم ہو گیا ہے۔ امامؑ نے اُنہیں ایک تاجر کے پاس بھیجا تاکہ وہ کم ہونے والے شہد کی قیمت کا تعین کرے۔ یہ قیمت تقریباً تین درہم سے کچھ زیادہ بنی۔ امامؑ نے کسی کو ام کلثوم کے پاس بھیجا کہ وہ یہ رقم ادا کر دیں اور اس کے بعد وہ شہد لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیا۔(۱)

اس قسم کے کئی واقعات ''الغارات'' اور دوسری کتابوں میں موجود ہیں۔ خود امامؑ کا یہ جملہ: **انا الذی اَھَنْتُ الدنیا** (میں ہوں جس نے دنیا کو ذلیل کر دیا)۔(۲) دنیا کے بارے میں امامؑ کے طرزِ عمل کی نشاندہی کرتا ہے۔

امامؑ کی زندگی کا ایک اور پہلو سرکاری اہلکاروں کے ساتھ آپ کا رویہ ہے۔ آپ کے اس طرزِ عمل کے متعدد نمونے تاریخی کتابوں میں درج ہیں۔ امامؑ ہر اعتبار سے اپنے اہلکاروں کے اعمال پر نظر رکھتے تھے اور اپنے مختصر دورِ حکومت میں آپ نے ان کے نام متعدد تنبیہی خطوط تحریر کیے۔ حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد عمارہ ہمدانی کی بیٹی ''سودہ'' کی معاویہ سے ملاقات ہوئی۔ وہ صفین کی جنگ میں موجود لوگوں میں سے تھیں۔ معاویہ نے اُن سے صفین کے بارے میں کچھ باتیں کیں۔ اُنہوں نے معاویہ سے مطالبہ کیا کہ بسر بن ارطاۃ کو اس کے عہدے سے الگ کر دیں' کیوں کہ وہ اُن پر ظلم و ستم کیا

۱۔ طبقات المحدثین باصبہان۔ ج۱۔ ص ۲۷۸۔ ۲۷۹' اور دیکھئے: اخبار اصبہان۔ ج۱۔ ص ۷۲

۲۔ حیاۃ الصحابہ۔ ج۲۔ ص ۳۱۰

کرتا ہے۔ معاویہ نے اُن کی یہ درخواست قبول نہ کی۔ سودہ کچھ دیر کے لیے سجدے میں گر گئیں اور پھر سر اٹھایا۔ معاویہ نے پوچھا: یہ سجدہ کس لیے تھا؟ سودہ نے جواب دیا: ایک مرتبہ میں اس آدمی کی شکایت لے کر علیؑ کے پاس گئی تھی جسے انہوں نے ہمارے صدقات پر مقرر کیا تھا' وہ نماز میں مشغول تھے۔ نماز کے بعد انہوں نے پوچھا: کس لیے آئی ہو؟ میں نے اس آدمی کی شکایت کی۔ امامؑ نے اسی وقت اپنی جیب سے ایک کھال نکالی اور عدل وانصاف کو ملحوظ رکھنے کی دعوت دیتے ہوئے اس شخص کو تحریر کیا کہ جب یہ خط تمہارے پاس پہنچے تو اس کے مندرجات پر عمل کرو' یہاں تک کہ میں کسی کو بھیجوں جو معاملات کو تمہارے ہاتھ سے لے لے۔ پھر وہ تحریر آپ نے میرے حوالے کی' میں نے وہ اس شخص کو پہنچائی اور وہ معزول ہو گیا۔(۱)

☆☆☆

maablib.org

۱۔ الفتوح۔ ج ۳۔ ص ۹۰۔ ۹۲

امام حسن علیہ السلام

"قیل للحسن بن علی: "فیک عظمة. قال: لا بل عزّةٌ. قال اللّٰہ تعالیٰ:

وَلِلّٰہِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ."

"حسن ابن علی سے کہا گیا: آپ عظیم ہیں۔ فرمایا: نہیں عزیز ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عزت اللہ کے لیے اس کے رسول کے لیے اور مومنین کے لیے ہے۔"

(ربیع الابرار۔ ج ۳۔ ص ۱۷۷)

امام حسنؑ کی شخصیت

امام حسن علیہ السلام تین ہجری پندرہ رمضان المبارک کی رات یا دن کے وقت دنیا میں تشریف لائے (۱) اگرچہ بعض روایات میں (آپ کی ولادت کا سال) دو ہجری نقل ہوا ہے (۲) جو درست دکھائی نہیں دیتا۔ آپ کی ولادت کے دن اور مہینے میں کوئی اختلاف بیان نہیں ہوا ہے۔ آپ کی شہادت بھی بعض روایات میں بغیر کوئی دن متعین کیے ماہِ صفر میں قرار دی گئی ہے۔ (۳) کلینی اور نوبختی کی روایت میں ہے کہ آپ کی رحلت ماہِ صفر کے آخری دن واقع ہوئی تھی۔ (۴) شیخ طوسی نے ایک روایت میں آپ کی رحلت کا دن اٹھائیس صفر بیان کیا ہے۔ (۵) یعقوبی کے خیال میں آپ کی شہادت کا سال سن ۴۹ ہجری اور مہینہ ربیع الاول تھا اور انہوں نے آپ کی عمر مبارک ۴۷ سال بتائی ہے۔ (۶) آپ کی شہادت سن ۴۹ ہجری میں واقع ہوئی اس بارے میں بہت سے ماخذ (sources) متفق ہیں۔ (۷) بعض نے ۵۰ ہجری (۸) اور بعض نے ۵۱ ہجری بھی (۹) لکھی ہے۔

امام حسن علیہ السلام کے فضائل کے بارے میں بکثرت روایات نقل ہوئی ہیں۔ ان روایات کے راوی بہت سے

۱۔ ارشاد۔ ص ۲۰۵، اثبات الوصیہ۔ ص ۱۵۳، تاریخ بغداد۔ ج ۱۔ ص ۱۴۱، نسب قریش زبیر بن بکار۔ ص ۴۰، الجدی۔ ص ۱۳

۲۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۳۶۱، تہذیب۔ ج ۶۔ ص ۳۹، ایک روایت میں ہے کہ امام حسنؑ کی ولادت جنگ بدر سے ۱۹ دن قبل ہوئی تھی اس طرح سال ولادت ۲ ہجری ہوگا۔ الجدی۔ ص ۱۳

۳۔ ارشاد۔ ص ۲۱۱، تہذیب۔ ج ۶۔ ص ۳۹

۴۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۳۶۱، فرق الشیعہ۔ ص ۴۴

۵۔ مصباح المتہجد۔ ص ۷۳۲، مسار الشیعہ۔ ص ۲۷

۶۔ تاریخ یعقوبی۔ ص ۲۲۵

۷۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۳۶۱، تہذیب۔ ج ۶۔ ص ۳۹، المعارف ابن قتیبہ۔ ص ۱۳۲

۸۔ اثبات الوصیہ۔ ص ۱۶۰، مصباح المتہجد۔ ص ۷۳۲

۹۔ مقاتل الطالبین۔ ص ۴۹، تاریخ بغداد۔ ج ۱۔ ص ۱۴۰

علمائے اہلِ سنت اور علمائے شیعہ ہیں۔(۱) تاریخ کے متعدد ادوار میں ایسی بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں امام حسنؑ کے فضائل کو جمع کیا گیا ہے' لیکن افسوس کی بات ہے کہ آپ کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں حالیہ زمانے تک بھی بہت کم قابلِ توجہ کاوشیں منظرِ عام پر آئی ہیں۔ بلکہ اکثر دوسرے اور تاریخی ادوار کی مانند' اُس دور کے حوادث بھی بغیر کسی سنجیدہ تحقیق اور بنا کسی گہرے تجزیے و تحلیل کے اکٹھے کر دیے گئے ہیں۔ امام حسنؑ کے بارے میں نقل ہونے والے بہت سے فضائل سے یہ پتا چلتا ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان دو بھائیوں (حسنین) سے بہت زیادہ محبت تھی' اور آپ علیٰ الاعلان ان سے اپنی محبت کا اظہار کیا کرتے تھے۔ حسنینؑ سے آنحضرتؐ کے اظہارِ محبت کا انداز' آپ کا منبر سے نیچے اترنا اور ان کے بوسے لے کر دوبارہ منبر پر تشریف فرما ہونا' اس بات کی علامت ہے کہ یہ انداز اور اظہارِ محبت ایک مقصد کے تحت تھا۔(۲) علاوہ ازایں رسول اللہؐ سے منقول ہے کہ آپ نے امام حسنؑ کے ساتھ اپنی محبت کے اظہار کے موقع پر فرمایا کہ: دیکھنے والے اس اظہارِ محبت سے اُن لوگوں کو مطلع کریں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔(۳) یا آپ فرمایا کرتے تھے کہ: میں اِس سے محبت کرتا ہوں' اور اُس سے بھی محبت کرتا ہوں جو اِس سے محبت کرتا ہے۔'' (۴)

''مباہلے'' میں امام حسنؑ کی موجودگی' اور آپ کا اصحابِ کساء میں سے ہونا' رسولِ خداؐ کے نزدیک آپ کی اہمیت اور آپ کے اعتبار کی علامت ہے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ امام حسن مجتبیٰ بیعتِ رضوان میں موجود تھے اور نبی اکرمؐ نے اُن سے بیعت لی تھی۔(۵)

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک روایت میں آیا ہے کہ: **''لو کان العقل رجلاً لکان الحسن.''** (اگر عقل کسی انسان کی صورت میں مجسم ہوتی تو وہ حسن ہوتے)۔(۶) ناکثین کی شورش کے موقع پر اہلِ کوفہ کو جنگ پر ابھارنے کے سلسلے میں امام حسنؑ کی کامیابی(۷) اس شہر کے لوگوں کے نزدیک آپ کی اہمیت اور اعتبار کی علامت ہے۔ رسول اللہؐ کی

۱۔ بطورِ نمونہ یہ کتابیں ہیں: ابن عساکر کی ''ترجمۃ الامام الحسنؑ'' جو ان کی ''تاریخ دمشق'' میں شامل ہے اور دوسری ابن سعد کی ''ترجمۃ الامام الحسنؑ'' جو اُن کی ''طبقات الکبریٰ'' میں ہے۔

۲۔ نور الابصار۔ ص ۱۹۱۔۱۲۰' مناقب ابن شہر آشوب۔ ج ۳۔ ص ۲۳' نظم درر السمطین۔ ص ۱۹۵

۳۔ المستدرک حاکم نیشاپوری۔ ج ۳۔ ص ۱۷۳٬۱۴۷' الاتحاف بحب الاشراف۔ ص ۳۴

۴۔ ترجمۃ الامام الحسنؑ ابن سعد۔ ص ۱۳۳۔ رایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم واضعًا الحسن حبوتہ و ھو یقول: مَن احبّنی فلیحبّہ ولیُبلّغ الشاھدُ منکم الغائبَ ولولا عزمۃُ رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ ماحدّثتُ احدًا شیئًا ثم قعَدَ.

۵۔ الحیاۃ السیاسیہ للامام الحسنؑ۔ ص ۴۴٬۴۳

۶۔ فرائد السمطین۔ ج ۲۔ ص ۶۸

۷۔ ترجمۃ الامام الحسنؑ ابن سعد۔ ص ۴۹

ایسی ہی احادیث کی وجہ سے مسلمان، فاطمہ زہرا علیہا السلام کے بچوں کو اولادِ رسول سمجھتے تھے اور بنی امیہ اور ان کے بعد بنی عباس کے انکار کے باوجود مسلمانوں میں اس بات میں کوئی معمولی سا بھی شک پیدا نہیں ہوا تھا۔(۱)

انہی عظیم خصوصیات کی وجہ سے، حضرت علیؑ جیسی ہستی نے لوگوں میں اپنے جانشین کے طور پر آپ کا تعارف کرایا۔ عراق اور بہت سے دوسرے علاقوں کے لوگوں نے باضابطہ خلیفہ کی حیثیت سے آپ کی بیعت کی۔ اس کے باوجود مخصوص مفادات رکھنے والوں کی جانب سے مختلف علاقوں میں امامؑ کی شخصیت کو داغدار کرنے کی کوشش کی گئی، اور آپ کو ایک طرف تو تدبیر وسیاست سے بے بہرہ اور دوسری جانب (نعوذ باللہ) دنیا پرست اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کے موقف کو حضرت علیؑ اور امام حسینؑ کے موقف کے برخلاف ظاہر کیا گیا۔ مثال کے طور پر یہ کوشش کی گئی کہ بے بنیاد خبریں گھڑ کر امام حسنؑ کا تعارف ایک ایسے شخص کے طور پر کرایا جائے، جو ہمیشہ شادیاں کرنے اور طلاق دینے میں مصروف رہا کرتے تھے۔(۲) ایک اور موقع پر دیکھتے ہیں کہ صلح سے متعلق روایات میں اس طرح ظاہر کیا گیا ہے جیسے امام صرف چند ایسے وعدوں پر جن کا تعلق مال ودولت سے تھا، حکومت سے کنارہ کش ہونے پر آمادہ ہوگئے تھے۔ یعنی آپ صرف ''دارابجرد'' اور ''اہواز'' کا خراج اور کوفہ کے بیت المال میں موجود مال ودولت کا حصول چاہتے تھے۔(۳)

انہی روایات میں یہ بات پیش کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ امامؑ اپنے آپ کو خلافت کا حقدار نہیں سمجھتے تھے۔ اسی لیے آپ نے اسے معاویہ کے حوالے کردیا۔ حالانکہ یہ محض ایک تہمت ہے۔ کیونکہ امامؑ نے بارہا اس نکتے کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ''خلافت صرف ان کا حق ہے، اور آپ جبراً اسے معاویہ کے حوالے کررہے ہیں۔''(۴) امامت وولایت کے مخالفین امامؑ کی جانب یہ مؤقف منسوب کرکے آپ کی کردارکشی (جو زیادہ تر بنی عباس کی جانب سے کی گئی کیونکہ بنی حسنؑ ان کے لیے مشکلات کھڑی کررہے تھے) کے ساتھ ساتھ ایک اور فائدہ اٹھایا کرتے تھے اور وہ حضرت علیؑ اور حتیٰ آپ کے بھائی حسین ابن علیؑ کی مذمت کو صحیح قرار دینا تھا۔ چنانچہ امامؑ کی زبانی یہ جھوٹا قول نقل کیا گیا ہے کہ: ''میں ملک کی خاطر معاویہ سے جنگ کرنے پر تیار نہیں ہوں۔''(۵) یہ بات حضرت علیؑ کی جنگوں کی مذمت کے لیے اہلِ سنت کے

۱۔ الحیاۃ السیاسیہ للامام الحسنؑ۔ ص ۲۷، کشف الغمہ (ج ۱۔ ص ۵۵۰) میں ایک روایت آئی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ معاویہ کا اصرار تھا کہ حسنینؑ کو حضرت علیؑ کی اولاد کہا جائے فرزندِ رسول نہیں پکارا جائے۔

۲۔ الاتحاف۔ ص ۳۳

۳۔ آگے چل کر ہم اس مسئلے کا تجزیہ کریں گے۔

۴۔ امالی شیخ طوسی۔ ج ۲۔ ص ۱۷۲، نہج الصباغہ۔ ج ۳۔ ص ۳۲۸، حیاۃ الحیوان۔ ج ۱۔ ص ۵۸، بحار الانوار۔ ج ۴۳۔ ص ۳۰۔ ۵۶، مناقب ابن شہر آشوب۔ ج ۴۔ ص ۳۴

۵۔ ذخائر العقبیٰ۔ ص ۱۳۹، درر نظم السمطین۔ ص ۱۹۵

متعصب افراد کے کام آ سکتی تھی۔

اسی بنا پر یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ امام حسنؑ کی ولادت کے وقت آپ کے والد آپ کا نام "حرب" رکھنا چاہتے تھے۔(۱) اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت علیؑ ابتداہی سے فطری طور پر جنگ وجدال کو پسند کیا کرتے تھے۔ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ امام حسنؑ نے فرمایا: "عرب کی تمام طاقت میرے ہاتھ میں ہے، صلح کروں یا جنگ کروں سب میرے ساتھ ہوں گے۔"(۲) اس کے علاوہ یہ کہ: "ایک لاکھ یا چالیس ہزار افراد نے آپ کی بیعت کی اور حتیٰ لوگ انہیں اُن کے بابا سے بھی زیادہ پسند کیا کرتے تھے۔"(۳) اگر کوئی ان خلاف حقیقت روایات کو قبول کرلے تو قدرتی طور پر وہ یہی سمجھے گا کہ امامؑ نے حکومت راضی خوشی معاویہ کے حوالے کی ہے، نہ کہ مجبوراً یہ کام کیا ہے۔ ان دو نظریات کا فرق بالکل واضح ہے۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ مورخین کا یہ گروہ اپنی تاریخی روایات کے ذریعے یہ بات ثابت کرنا چاہتا ہے کہ ان دونوں بھائیوں میں باہمی اختلاف پایا جاتا تھا، یہاں تک کہ امام حسینؑ نے اپنے بھائی کے موقف کو قبول نہیں کیا تھا اور ان کا نقطۂ نظر کچھ اور تھا۔

ایک اور روایت میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: حسن مجھ سے ہے اور حسین علی سے۔"(۴) حالانکہ امام حسینؑ کے بارے میں ایک فضیلت جو بار بار دُہرائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ (رسول کریم کا ارشاد ہے): "حسین منی و انا من حسین." (حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں)۔ مذکورہ بالا روایت گھڑنے کا مقصد یہ ہے کہ حضرت علیؑ کو ان کے بیٹے حسینؑ سے اس طرح جوڑا جائے کہ جیسے یہ دونوں ہی قتل وخونریزی چاہنے والے تھے۔

ان دو بھائیوں کے درمیان اسی فرق کو ثابت کرنے کے لیے یہ روایت بھی لاتے ہیں کہ: امام حسینؑ نے اپنے بھائی سے کہا: "کاش آپ کے سینے میں میرا دل ہوتا اور میرے منہ میں آپ کی زبان۔"(۵) حضرت ابوبکر کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ جب وہ حسن ابن علیؑ کو دیکھتے تو کہتے تھے کہ: بابی شبیہٌ بالنبی ... لیس شبیھاً بعلی (بے شک ----- آپ نبی سے مشابہ ہیں، ----- نہ کہ علی سے)۔(۶)

۱۔ ترجمۃ الامام الحسن ابن سعد۔ ص ۱۳۶
۲۔ ایضاً۔ ص ۱۶۷، ذخائر العقبیٰ۔ ص ۱۳۹
۳۔ تہذیب التہذیب۔ ج ۲۔ ص ۲۹۹، ذخائر العقبیٰ۔ ص ۱۳۸۔۱۳۹، تاریخ دمشق۔ ج ۴۔ ص ۲۱۲، الاتحاف۔ ص ۳۵
۴۔ ذخائر العقبیٰ۔ ص ۱۳۲
۵۔ کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۲۴۳، ترجمۃ الامام الحسین ابن عساکر۔ ص ۱۳۵۔۱۳۶
۶۔ مناقب ابن شہر آشوب۔ ج ۴۔ ص ۱۳۱

ان باتوں کو متاخرین نے فضیلت کے طور پر بیان کیا ہے' جبکہ ان میں سے متعدد اسی مقصد کے لیے گھڑی گئی ہیں جس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ حضرت علیؑ اور عاشورا کا چہرہ بگاڑنے کے لیے اس قسم کی تصویر کشی عثمانی مکتب کے حامی افراد کے کام آ سکتی ہے۔ امامؑ پر لگایا جانے والا ایک اور الزام یہ ہے کہ آپ حضرت عثمان کے طرفدار تھے۔ اس الزام کا خلاصہ یہ ہے کہ امام اپنے والد کے مخالف تھے اور داخلی جنگوں میں خونریزی کو پسند نہیں کرتے تھے۔

اس قسم کے الزام کی وجہ' صلح کے مفہوم کو درست طور پر نہ سمجھنا ہے۔ اور غلط طور پر یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ امامؑ نے کافی قدرت وطاقت موجود ہونے کے باوجود حکومت کو معاویہ کے حوالے کیا تھا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی بات ایک جھوٹا الزام ہے۔ یہ الزام اس قدر عام تھا کہ حتیٰ یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے اپنے والد پر حضرت عثمان کے قتل میں شریک ہونے کا الزام لگایا تھا۔(۱)

گزشتہ مباحث میں ہم نے اشارہ کیا ہے کہ سوائے بنی امیہ کے' جو اپنے سیاسی مقصد کی خاطر حضرت علیؑ پر قتلِ عثمان میں شرکت کا الزام لگاتے تھے کسی اور نے امامؑ پر یہ الزام نہیں لگایا۔ اس صورت میں کس طرح ممکن ہے کہ امامؑ کا بیٹا آپ پر قتلِ عثمان میں شرکت کا الزام عائد کرے؟ دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض مورخین نے کہا ہے کہ: امامؑ نے اپنے بیٹے کو حضرت عثمان کی حفاظت کے لیے اُن کے گھر بھیجا تھا۔ اگر یہ بات درست ہو(۲) تو اس کا مقصد حضرت عثمان کے قتل کو روکنا تھا۔ علاوہ ازایں خود امام حسنؑ اُن لوگوں میں سے تھے جنہوں نے جنگِ جمل میں' جو بنیادی طور پر عثمانیوں کے خلاف تھی' اہم کردار ادا کیا تھا۔ آپ کوفیوں کو جنگ پر اُکسانے اور انہیں میدانِ جنگ میں لانے کے لیے حضرت علیؑ کے نمائندے تھے۔ آپ مسجدِ کوفہ میں اپنی تقریر کے ذریعے تقریباً دس ہزار افراد کو عثمانیوں کے خلاف میدانِ جنگ میں لانے میں کامیاب ہوئے۔(۳) آپ نے اس سے پہلے حضرت عثمان کے ساتھ حضرت ابوذر کے تنازع میں بھی حضرت ابوذر کا ساتھ دیا تھا اور جلاوطنی کے وقت حضرت ابوذر کو وداع کرتے ہوئے اُن سے فرمایا تھا کہ: ''ان لوگوں کی طرف سے آپ کو کچھ مسائل کا سامنا کرنا پڑا' جنہیں آپ دیکھ رہے ہیں۔۔۔۔ آپ صبر کیجیے یہاں تک کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس حال میں ملاقات کریں کہ وہ آپ سے راضی ہوں۔''(۴) جنگِ صفین کے دوران عبید اللہ ابن عمر (جو ہرمزان اور

۱۔ دیکھئے: انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۱۲۔ اس تاریخی روایت میں آیا ہے کہ ''حسن'' نے امام علیؑ پر اعتراض کیا ہے۔ گویا خود خبر تو درست ہے لیکن یہ حسن ''حسن بصری'' ہیں نہ کہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام۔

۲۔ ہمارے استاد سید جعفر مرتضیٰ نے اس بارے میں شک کا اظہار کیا ہے۔ الحیاۃ السیاسیہ للامام الحسنؑ۔ ص ۱۳۹۔ ۱۵۹

۳۔ وقعۂ صفین۔ ص ۱۵' العقد الفرید۔ ج ۵۔ ص ۶۳

۴۔ الحیاۃ السیاسیہ للامام الحسنؑ۔ ص ۱۱۳' شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۸۔ ص ۲۵۳' الغدیر۔ ج ۸۔ ص ۳۰۱' تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۱۷۲

ابولولو کے بیوی بچوں کے قتل کی وجہ سے حضرت علیؑ کے ہاتھوں قصاص سے بچنے کے لیے فرار ہو کر معاویہ کے پاس چلا گیا تھا) نے امام حسنؑ کو اُن کے بابا کے خلاف اُکسانے کی احمقانہ کوشش کی۔ امامؑ نے اس کے مطالبے کو سختی کے ساتھ مسترد کر دیا۔ اسی کے بعد معاویہ نے کہا تھا کہ: وہ بھی اپنے باپ ہی کے بیٹے ہیں۔(۱)

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام جنگِ صفین میں لوگوں کو قاسطین کے لشکر کے خلاف جنگ پر ابھارتے تھے۔ آپ نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا: "فاحتشدوا فی قتال عدوّکم معاویة وجنوده، فانه قدحضر ولا تخاذلوا فان الخذلان یقطع نیاط القلوب." (اپنے دشمن معاویہ اور اس کے سپاہیوں کے خلاف جنگ پر متحد ہو جاؤ اور سستی نہ کرو کیونکہ سستی دل کی رگوں کو کاٹ ڈالتی ہے)۔(۲)

امامؑ نے اپنی خلافت کے آغاز میں معاویہ کے نام لکھے گئے اپنے ایک خط میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد اہلِ بیتؑ کی حقانیت اور اُن کی مظلومیت کا ذکر کیا تھا۔

یہ تمام چیزیں اس بات کی مضبوط دلیل ہیں کہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام تمام مراحل میں اپنے والد امام علی علیہ السلام کے یاور و مددگار رہے تھے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ: ایک مرتبہ حضرت ابوبکر منبر پر بیٹھے ہوئے تھے کہ امام حسنؑ نے اُن سے کہا: "انزل عن منبر ابی." (میرے بابا کے منبر سے نیچے اتریے) اس موقع پر حضرت علیؑ نے فرمایا: "ان هذا لشیءٌ عن غیر ملأ منا." (یہ وہ مقام ہے جس کے ہمارے غیر حقدار نہیں ہیں)۔(۳)

مسندِ خلافت پر متمکن ہونے کے بعد معاویہ کے خلاف جنگ کے معاملے میں امام حسنؑ کا واضح مؤقف آپ کے اور امام علیؑ کے مؤقف کی یکسانیت کا گواہ ہے۔ بنی امیہ کے ساتھ امام حسنؑ کی مخالفت اس قدر شدید تھی کہ آپ کی تدفین کے موقع پر مروان نے آپ کو رسولِ خداؐ کے نزدیک دفن ہونے کی اجازت نہیں دی اور کہا: "کیسے ممکن ہے کہ عثمان تو بقیع سے باہر دفن ہوں لیکن حسن ابن علی کی تدفین پیغمبر اکرمؐ کے پہلو میں ہو؟(۴)

یہ تمام باتیں اموی فکر کی مخالفت میں امام حسنؑ کے دوٹوک اور سخت مؤقف کی نشاندہی کرتی ہیں۔ لیکن جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، صلح کے مسئلے کو بنیاد بنا کر اور معاویہ کی حکومت کو جائز قرار دینے کے لیے امام کے موقف کو غلط رنگ دیا

۱۔ وقعۂ صفین۔ ص ۲۹۷، شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۵۔ ص ۲۳۳، مناقب ابن شہر آشوب۔ ج ۳۔ ص ۱۸۶۔ ۱۹۹

۲۔ وقعۂ صفین۔ ص ۱۱۳

۳۔ ترجمۃ الامام الحسن ابن سعد۔ ص ۱۶۰، انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۲۶، ابن سعد نے اسی روایت کو امام حسینؑ کے حضرت عمر کے ساتھ برتاؤ میں ذکر کیا ہے۔

۴۔ نظم درر السمطین۔ ص ۲۰۵، روضۃ الواعظین۔ ص ۱۶۸، مناقب ابن شہر آشوب۔ ج ۴۔ ص ۴۴، ذخائر العقبیٰ۔ ص ۱۴۲

گیا ہے۔

امام حسنؑ اور مسئلۂ امامت

مذہب اہلِ سنت میں اموی افکار کے جگہ پا لینے کی ایک علامت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی چھ ماہ کے عرصے پر محیط خلافت سے بے توجہی ہے۔ وہ نہ تو اسے خلفائے راشدین کے عہد میں شمار کرتے ہیں اور نہ عہدِ ملوکیت میں۔(۱) دراصل وہ اس خلافت کو باضابطہ طور پر مانتے ہی نہیں ہیں۔ حالانکہ کوفہ میں مقیم اُس وقت تک باقی ماندہ مہاجرین و انصار کے ساتھ ساتھ عراقیوں اور سرزمینِ اسلام کے مشرقی علاقوں کے لوگوں نے خلیفۂ مسلمین کی حیثیت سے امام حسنؑ کی اطاعت کو قبول کیا تھا۔ لیکن واضح ہے کہ مسلمانوں کے درمیان ایک گہرا شگاف پڑ چکا تھا اور اسی زمانے میں معاویہ بھی شام میں خلافت کے دعویدار تھے۔ اگرچہ خود اُن کے بقول انصار میں سے صرف ایک آدمی اُن کے ساتھ تھا۔(۲)

واضح ہے کہ خلافت کے ٹکڑوں میں تقسیم ہو جانے کا اصول نہ صرف اس زمانے میں قابلِ قبول نہ تھا' بلکہ تاریخ خلافت کے آخری دور تک بھی یہ بات قبول نہیں کی گئی تھی کہ عالمِ اسلام میں ایک ہی وقت میں دو خلیفہ موجود ہوں۔

جس وقت امام حسن علیہ السلام خلافت پر متمکن ہوئے' اُس زمانے میں شام کے مقابلے میں عراق بدترین حالات کا شکار تھا۔ حکمیت کے معاملے میں عراقیوں کے حصے میں جو شکست آئی تھی' اس کے ساتھ ساتھ خوارج کی شورش نے بھی عراقی فوج کو انتہائی کمزور کر دیا تھا اور تین جنگوں کے بعد لوگ تھکن اور بے حالی کا شکار ہو چکے تھے۔ حضرت علی علیہ السلام کی زندگی کے آخری ایام میں لوگوں سے بہت تقاضا کیا گیا کہ وہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیں لیکن بہت ہی کم لوگوں نے اس بات کو قبول کیا۔(۳) اب حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد اور شام کے تسلط کے بارے میں عراقیوں میں پائی جانے والی شدید تشویش کی وجہ سے اُس بات کی امید ہو چلی تھی کہ وہ اب سنجیدگی سے اس کا مقابلہ کریں گے۔ ان کے لیے ضروری تھا کہ اس کام کے لیے کسی امام کا انتخاب کریں اور جیسا کہ اشارہ کیا گیا' ان کے سامنے امام حسنؑ کے انتخاب کے سوا کوئی دوسرا

۱۔ البتہ تاریخی کتابوں میں عام طور پر آپ کا ذکر حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد ایک ایسی شخصیت کے طور پر کیا گیا ہے جو اہلِ کوفہ کی بیعت سے خلیفہ بنے۔ دیکھیے: تاریخ الخلفاء سیوطی۔ مسعودی کہتے ہیں کہ میں نے بعض تاریخی کتابوں میں دیکھا ہے کہ امام حسنؑ کی خلافت کو شمار کرنے سے "الخلافة بعدی ثلاثون سنة" والی روایت درست ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ خود ہر خلیفہ کی مدت کا ذکر کرتے ہوئے اس حساب کو پیش کرتے ہیں۔ مروج الذہب۔ ج ۲۔ ص ۴۲۹۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ عثمانی لوگ جو بعد میں اہلِ سنت مذہب کے بانی اور باعث بنے' وہ تیسری صدی ہجری کے اوائل تک حضرت علیؑ کی خلافت کو بھی نہیں مانتے تھے۔

۲۔ طبقات الشعراء۔ ص ۱۰۹' اور دیکھیے: الامتاع والمؤانسۃ۔ ج ۳۔ ص ۱۷۰

۳۔ دیکھیے: شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۱۰۔ ص ۶۷

راستہ نہیں تھا۔ قیس ابن سعد اور عبداللہ ابن عباس کی بیعت نے امام حسنؑ کے ہاتھوں پر عراقیوں کی بیعت کے لیے زمین ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ عراق کی بیعت کے بعد حجازیوں نے بھی قدرے تامل کے بعد امام حسنؑ کی بیعت کر لی۔

عوام الناس کے ساتھ ساتھ ایسے شیعہ بھی تھے جو دراصل امام حسنؑ کی امامت کے معتقد تھے اور اسی بنیاد پر انہوں نے آپ کی بیعت کی تھی۔ دراصل کوفہ کا مذہبی رجحان (اس معنی میں کہ وہ حضرت عثمان کو قبول نہیں کرتے تھے اور حضرت علیؑ کی حکومت کی تائید کرتے تھے) تشیّع کی طرف تھا۔ یہ لوگ امام علیؑ کی پانچ سالہ حکومت کے دوران امامؑ اور ان کے اصحاب کے زیر اثر علویُ الرائے ہو گئے تھے اور عثمانی رجحان سے متنفر ہو چکے تھے۔ حضرت علیؑ ہی کے زمانے میں کوفہ میں حضرت عثمان کی مخالفت کا عالم یہ تھا کہ جریر بن عبداللہ بجلی نے کہا تھا کہ: میں اس شہر میں نہیں رہوں گا جس میں باقاعدہ طور پر عثمان کو برا بھلا کہا جاتا ہے۔ (۱)

حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد لوگ امام حسنؑ کے علاوہ اور کس کا انتخاب کر سکتے تھے؟ البتہ مہاجرین و انصار اور حیِّ قریش میں سے بھی کچھ اصحاب کوفہ میں موجود تھے اور خود عبداللہ ابن عباس جیسی شخصیت بھی وہاں موجود تھی' اس کے باوجود امام حسنؑ کے انتخاب میں معمولی سا تامل بھی نہیں کیا گیا اور کسی اور شخص کا نام تک نہیں لیا گیا۔ البتہ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ عراق کے لوگ ''حسن ابن علیؑ کو ان کے والد سے زیادہ پسند کرتے تھے'' (۲) بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ اُن کے پاس اسکے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ یہ یاددہانی اس لیے کرائی گئی ہے کہ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ امام حسنؑ کے لیے تمام مواقع موجود تھے' خود انہوں نے ہی مقابلہ جاری نہ رکھنا چاہا۔

جہاں تک شیعہ نظریہ امامت کا تعلق ہے' تو ایسے شواہد موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ نے امام حسنؑ کو اپنے جانشین کی حیثیت سے متعارف کرایا تھا۔ اگرچہ اہلِ سنت نے ان شواہد کا تذکرہ ولایتِ عہدی کے عنوان سے نہیں کیا ہے۔ (۳) اس حوالے سے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک روایت متعدد کتابوں میں نقل ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ: "الحسن و الحسین امامان. قاما او قعدا." (حسن اور حسین دونوں امام ہیں چاہے قیام کریں' چاہے قیام نہ کریں)۔ (۴) مذکورہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ان دونوں بھائیوں کی امامت منصوص تھی۔ اس بارے میں تاریخی اعتبار سے بھی ایسی روایتیں موجود ہیں جو امام حسن مجتبیٰ کی امامت کے بارے میں شیعی نظریہ امامت پر دلیل ہیں۔

۱۔ مختصر تاریخ دمشق۔ ج ۶۔ ص ۳۰' اور ج ۷۔ ص ۳۸۲

۲۔ ترجمۃ الامام الحسن ابن عساکر۔ ص ۱۷۱

۳۔ ابن ابی الدنیا نے ایک روایت نقل کی ہے' کہ علیؑ نے اپنے کسی جانشین کا تعارف نہیں کرایا تھا' دیکھئے: مقتل امیر المومنینؑ۔ ص ۶۱

۴۔ مجمع البیان۔ ج ۲۔ ص ۳۰۳' کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۱۵۹' ارشاد۔ ص ۲۲۰

نصر بن مزاحم کی روایت کے مطابق حضرت علی علیہ السلام کے زمانے میں "اعور شنی" نے امامؑ سے کہا: اللہ آپ کی کامیابی اور شادکامی میں اضافہ فرمائے۔ آپ نے نورالٰہی میں مشاہدہ کیا۔۔۔ آپ امام ہیں اور اگر آپ شہید ہوگئے تو آپ کے بعد رہبری ان دو (یعنی حسنؑ وحسینؑ) کے لیے ہے۔ میں نے چند اشعار کہے ہیں انہیں سماعت فرمایے: اے ابوالحسن! آپ نصف النہار کا چمکتا سورج ہیں اور یہ دو (آپ کے بیٹے) خلائق کے درمیان دمکتے چاند ہیں۔ آپ اور یہ دو بیٹے آخری سانسوں تک کانوں اور آنکھوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہیں۔ آپ بلند مقام پر فائز ایسے نیک لوگ ہیں جن کے دامانِ عزت تک کسی انسان کی رسائی نہیں۔(۱)

منذر بن جارود نے بھی میدانِ صفین میں امام علی علیہ السلام سے کہا: "**فان تهلک فهذان الحسن والحسین ائمتنا من بعدک.**" (اگر آپ مارے گئے تو یہ حسنؑ اور حسینؑ آپ کے بعد ہمارے امام ہیں) انہوں نے ایک شعر میں کہا:

ابا حسن انت شمس النهار — و هذان فی الداجیات القمر
و انت و هذان حتی الممات — بمنزلة السمع بعد البصر (۲)

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام ہی کے زمانے سے آپ کے اصحاب آپ کے بعد حسنین علیہما السلام کی رہبری کے قائل تھے اور ہم جانتے ہیں کہ امام حسن مجتبیٰ کی شہادت کے بعد شیعیان کوفہ نے امام حسینؑ کے نام مکتوب ارسال کیے، جن میں انہیں اپنا امام تسلیم کیا گیا تھا۔

عبداللہ ابن عباس نے بھی لوگوں کو امام حسنؑ کی طرف دعوت دی اور کہا کہ: وہ تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرزند اور تمہارے امام کے وصی ہیں۔ ان کی بیعت کرو۔ (۳) امام حسنؑ نے بھی معاویہ کے نام اپنے ایک خط میں لکھا: "جب میرے والد کا آخری وقت آیا تو انہوں نے یہ "امر" اپنے بعد میرے حوالے کیا۔" (۴) ہیثم بن عدی نے اپنے متعدد بزرگوں سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: حسن ابن علیؑ اپنے والد کے وصی تھے۔ (۵) ابوالاسود دئلی جو بصرہ میں تھے،

۱۔ وقعۃ صفین۔ ص۳۲۴۔۳۲۵ (پیکار صفین۔ ص۵۸۰)، طبقات الکبریٰ۔ ج۳۔ ص۳۴

۲۔ الفتوح۔ ج۳۔ ص۱۴۷

۳۔ ارشاد۔ ج۲۔ ص۸ (وہ متن جو ابن ابی الحدید جلد۱۶ صفحہ ۳۰۔۳۱ اور مقاتل الطالبین صفحہ ۳۳ میں آیا ہے اس میں لفظ "وصی" نہیں ہے)

۴۔ الفتوح۔ ج۴۔ ص۱۵۱ (اصفہانی [مقاتل الطالبین صفحہ ۳۶] اور ابن ابی الحدید جلد ۱۶ صفحہ ۲۴ میں آیا ہے کہ: **ولانی المسلمون الامر من بعده**۔ ان دونوں نصوص کا فرق بالکل واضح ہے)

۵۔ العقد الفرید۔ ج۴۔ ص۴۷۴

انہوں نے بھی امام حسنؑ کے لیے بیعت لیتے وقت کہا: وہ اپنے والد کی جانب سے ''وصایت اور امامت'' تک پہنچے ہیں۔(۱) لوگوں نے بھی امامؑ سے کہا کہ آپ اپنے والد کے جانشین اور وصی ہیں اور ہم آپ کے اطاعت گزار ہیں۔(۲)

بہرصورت' مجموعی طور پر یہ بات تسلیم کیے جانے کے قابل ہے کہ امام علیؑ نے اپنے بیٹے کو ایک ایسی شخصیت کے طور پر پیش کیا تھا جسے وہ اپنے جانشین کی حیثیت سے قبول کرتے ہیں۔(۳) ایک مرتبہ جمعے کے دن جبکہ آپ کچھ بیمار تھے آپ نے حکم دیا کہ حسنؑ نماز پڑھائیں۔(۴) اس بات سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ کوفہ کے شیعہ اپنے مذہبی رجحان کی وجہ سے امام حسنؑ کی طرف آئے' اس مرحلے پر اہلِ بیتؑ اور مقام امامت کے بارے میں خاص شیعہ تعلیمات بھی پیش نظر رہنی چاہئیں' تمام کتب میں نقل ہونے والا امام حسنؑ کا پہلا خطاب انہی سے متعلق ہے: ''جو کوئی مجھے پہچانتا ہے' وہ تو پہچانتا ہی ہے' اور جو مجھے نہیں پہچانتا (تو جان لے کہ) میں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرزند حسن ہوں' میں بشیر و نذیر کا فرزند ہوں۔ میں خدا کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے والے کا فرزند ہوں۔ میں اس کا فرزند ہوں جس کا لقب سراج منیر (روشن چراغ) ہے۔ میں اُن اہلِ بیت میں سے ہوں جن سے خدا نے رجس و پلیدی کو دور اور انہیں پاک و پاکیزہ کیا ہے' وہ لوگ جن کی دوستی کو خدا نے اپنی کتاب میں واجب قرار دیا ہے (خداوند عالم نے فرمایا ہے: کہہ دو کہ میں تم سے اس رسالت کا کوئی اجر طلب نہیں کرتا سوائے اپنے قرابتداروں کے ساتھ محبت کے)۔(۵) اور جو کوئی بھی نیک کام کرے گا ہم اس کی نیکی میں اضافہ کریں گے۔ پس نیک کام ہم اہلِ بیت سے محبت رکھنا ہے۔''(۶)

مسعودی نے امام حسنؑ کے خطبوں میں سے ایک خطبے کا کچھ حصہ نقل کیا ہے' جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ:

''ہم حزب اللہ کامیاب ہیں' ہم رسول اللہؐ کے نزدیکی قرابتدار ہیں' ہم اہلِ بیت طیب و طاہر اور ''ثقلین'' میں سے ایک ہیں جنہیں رسولِ خداؐ نے تمہارے درمیان چھوڑا ہے' جبکہ (اس میں سے) دوسری وہ کتاب

۱۔ الاغانی۔ ج ۱۱۔ ص ۱۱۶

۲۔ بحار الانوار۔ ج ۴۳۔ ص ۴۳

۳۔ دیکھئے: الحیاۃ السیاسیہ للامام الحسنؑ۔ ص ۴۸۔ ۴۹

۴۔ مروج الذہب۔ ج ۲۔ ص ۴۳۱

۵۔ بریکٹ میں موجود عبارت اس آیت کا پہلا حصہ ہے جس سے استناد کیا گیا ہے' اور جو اصل روایت میں نہیں ہے اور آیت کا اگلا حصہ پہلے حصے پر تکیہ کرتے ہوئے ذکر کیا گیا ہے۔

۶۔ مقاتل الطالبیین۔ ص ۳۳' شرح نہج البلاغۃ ابن ابی الحدید۔ ج ۱۶۔ ص ۳۰۔ ۳۱' ترجمۃ الامام الحسنؑ ابن سعد۔ ص ۱۶۷' انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۲۸' حیاۃ الصحابہ۔ ج ۳۔ ص ۵۲۶۔ ۵۲۷

خدا ہے جس میں کسی طرف سے باطل کے داخلے کی گنجائش نہیں ہے۔۔۔۔ پس ہماری اطاعت کرو کہ ہماری اطاعت واجب ہے۔ کیونکہ یہ خدا، رسولؐ اور اولی الامر کی اطاعت سے ملحق ہے۔ اگر کسی چیز میں نزاع کر بیٹھو تو اسے خدا اور رسولؐ کے پاس لے جاؤ۔۔۔۔ اور اگر رسول اور اولی الامر کے پاس لے جایا جائے تو یقیناً جو اہل استنباط علم ہیں وہ اسے جان لیں گے۔"(۱)

ہلال بن یساف کہتا ہے: میں حسن ابن علیؑ کے خطبے میں موجود تھا' آپ فرما رہے تھے: اے اہل کوفہ! ہمارے بارے میں خدا سے ڈرو۔ ہم تمہارے امیر اور تمہارے مہمان ہیں۔ ہم وہ اہل بیت ہیں جن کے بارے میں خدا نے فرمایا ہے: اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَ یُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا۔ (۲) گویا یہ خطبہ اس واقعے کے بعد تھا جس میں ساباط کے مقام پر امامؑ زخمی ہوئے تھے۔

امام حسن علیہ السلام بھی گزشتہ خلفا کی بیعت کے سلسلے میں انصار اور مہاجرین کے طرز عمل کے باوجود اپنے والد کی طرح خلافت کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ معاویہ کے نام امام حسنؑ کا مکتوب حضرت علیؑ کے اُن بعض اظہارات کی مانند ہے' جن میں آپ نے گزشتہ خلفا کے انتخاب پر اعتراض کیا تھا۔ اس خطبے میں امامؑ سقیفہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رشتے داری پر مبنی قریش کے استدلال اور عربوں کی جانب سے اس استدلال کو قبول کر لینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "ہم نے بھی قریش پر یہی استدلال کیا تھا لیکن عربوں نے قریش کے مقابل جو انصاف کیا' انہوں نے ہمارے لیے اس کا اظہار نہیں کیا۔ ان سب نے مل کر ہم پر ظلم روا رکھا اور ہماری دشمنی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔" اسکے بعد امامؑ فرماتے ہیں: "ہم نے منافقین اور دوسرے گروہوں کے خوف سے سب کچھ برداشت کیا اور کچھ نہیں بولے' یہاں تک کہ آج ہم تم جیسے شخص کے ہاتھوں مشکلات میں گرفتار ہو گئے ہیں' ایسا شخص جس کا نہ دین میں کوئی سابقہ ہے اور جس کا باپ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُن کی کتاب کا بدترین دشمن تھا۔" اس کے بعد امامؑ نے معاویہ سے مطالبہ کیا کہ بیعت کرنے والے دوسرے لوگوں کے ساتھ وہ بھی اُن کے ہاتھ پر بیعت کر لیں۔ معاویہ نے اس خط کے جواب میں سقیفہ کے مسئلے پر امامؑ کے طرز عمل کے حوالے سے لکھا: اس طرح آپ نے صراحت کے ساتھ ابوبکر' عمر اور ابوعبیدہ کو مورد الزام ٹھہرایا ہے' نہ صرف انہیں بلکہ مہاجرین وانصار کے نیک لوگوں کو بھی۔ آج ہم آپ کی فضیلت اور سبقت کا انکار نہیں کرتے۔ اس وقت ان لوگوں نے یہ تشخیص دی کہ اسلام کی حفاظت کے لیے اُن لوگوں کا انتخاب کیا جائے نہ کہ آپ کا۔

۱۔ مروج الذہب۔ ج ۲۔ ص ۳۳۲ (سورۂ نساء ۴۔ آیت ۸۳)

۲۔ ترجمۃ الامام الحسن ابن سعد۔ ص ۱۶۷

آج میرے اور آپ کے درمیان وہی اختلاف ہے جو ابو بکر اور آپ کے والد کے درمیان رسولِ خدا کی وفات کے بعد تھا۔ اگر میں جانتا کہ آپ رعایا پروری' امت کی حفاظت' اچھی سیاست' مال (و دولت) کی فراہمی اور دشمن سے روبرو ہونے کی قوت میں مجھ سے بہتر ہیں' تو میں آپ کی بیعت کر لیتا۔ لیکن میں نے طویل عرصے تک حکومت کی ہے' بہت زیادہ تجربہ رکھتا ہوں۔ عمر میں بھی آپ سے بڑا ہوں' اس لیے سزاوار ہے کہ آپ میری حکمرانی قبول کر لیں۔ اگر آپ ایسا کر لیں تو میں اپنے بعد حکومت آپ کے حوالے کر دوں گا اور عراق کے بیت المال سے آپ کو کثیر مال و دولت عطا کروں گا اور عراق کے جس حصے کا خراج چاہیں گے' وہ آپ کے اختیار میں دے دوں گا۔(۱)

حضرت علیؑ اور اُن کے فرزند کے ساتھ اپنے تنازع کے حضرت ابو بکر اور حضرت علیؑ کے درمیان اختلافات کے مشابہ ہونے کی طرف معاویہ نے اپنی اور محمد ابن ابو بکر کے درمیان ہونے والی خط و کتابت میں بھی اشارہ کیا ہے۔(۲) معاویہ اپنے آپ کو حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کا جانشین سمجھتے تھے اور شدت کے ساتھ اُن کا دفاع کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے اس عمل سے سیاسی فائدہ بھی اٹھانا چاہتے تھے۔ حضرت علیؑ کے ساتھ اپنی محاذ آرائی کے زمانے میں بھی انہیں لکھا تھا کہ: آپ نے خلفا کے خلاف "بغاوت" کی ہے۔ اور امامؑ نے جواب دیا تھا کہ: "اگر انہوں نے ایسا کیا بھی ہے' تو اس پر وہ معاویہ سے معذرت طلب نہیں کریں گے۔ مزید یہ کہ انہوں نے بغاوت نہیں کی' البتہ اُن کے کچھ اقدامات پر تنقید کی ہے اور اس بارے میں وہ کسی سے معذرت نہیں کریں گے۔"(۳)

بہر طور مختلف عوامل اس بات کا سبب بنے کہ عراق اور حجاز کے لوگوں نے امام حسن علیہ السلام کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ کہا گیا ہے کہ قیس بن سعد نے بیعت کے وقت کہا کہ: میں کتابِ خدا' سنتِ رسولؐ اور ظالموں کے خلاف جہاد پر ان کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں۔ لیکن امامؑ نے صرف کتاب و سنت کو قبول کیا اور فرمایا: یہ ہر شرط سے بڑھ کر ہیں۔(۴) مدائنی کہتا ہے: حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد ابن عباس گھر سے باہر آئے اور کہا کہ علیؑ سے ایک باقی رہ گیا ہے (وقد ترک خلفاً) اگر پسند کرو' تو وہ (بیعت کے لیے) باہر تشریف لائیں اور اگر تمہیں پسند نہیں' تو کسی کو کسی پر کوئی

۱۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۱۶۔ ص ۳۳-۳۶ (تلخیص کے ساتھ)' الفتوح۔ ج ۴۔ ص ۱۵۱-۱۵۳' مقاتل الطالبین۔ ص ۶۴-۶۸

۲۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۳۱' معاویہ نے محمد بن ابی بکر کو لکھا: میں اور تمہارے والد' علیؑ کی برتری سے واقف تھے' لیکن جب رسولِ خدا کی وفات ہوئی' تو "فکان ابوک وفاروقہ اول من ابتز حقہ وخالفہ علی امرہ۔" تو تمہارے والد اور فاروق وہ پہلے افراد تھے جنہوں نے ان کا حق چھین لیا اور ان کی خلافت کی مخالفت کی۔ مروج الذہب۔ ج ۳۔ ص ۱۱-۱۳

۳۔ نہج البلاغہ۔ مکتوب ۲۸

۴۔ تاریخ طبری۔ ج ۵۔ ص ۱۵۸

حق نہیں ہے۔ لوگ حضرت علیؑ پر رونے لگے اور اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ امام حسنؑ گھر سے باہر تشریف لائے' اور خطبے کے دوران اہلِ بیتؑ کے بارے میں آیۂ تطہیر کی تلاوت فرمائی اور لوگوں نے ان کی بیعت کی۔ (۱) اسکے بعد امام نے لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''تم لوگوں نے مجبور ہو کر نہیں' بلکہ اپنے اختیار سے میری بیعت کی ہے۔'' (۲) اصفہانی کی روایت میں آیا ہے کہ: ابن عباس نے لوگوں کو امام حسنؑ کی بیعت کی دعوت دی اور انہوں نے کہا کہ اُن کی نظر میں کوئی اُن سے زیادہ محبوب اور اُن سے زیادہ خلافت کا حقدار نہیں ہے۔ اسکے بعد لوگوں نے امام کے ہاتھ پر بیعت کی۔ (۳)

یہاں ایک اور مسئلہ قابلِ توجہ ہے اور وہ یہ کہ خلافت کے معاملے میں حرمین (مکہ و مدینہ) کے رہنے والوں کی بیعت ایک مانا ہوا سیاسی اصول تھا۔ اس زمانے میں جبکہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کو تقریباً تیس سال گزر چکے تھے اور صحابہ کی ایک بڑی تعداد فتوحات اور جنگ جمل وصفین کے نتیجے میں اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھی' مزید یہ کہ اب مدینہ بھی خلافت کا مرکز نہیں رہا تھا' اس صورت میں مذکورہ اصول یعنی مدینہ میں رہنے والے مہاجرین اور انصار کی بیعت' کو ان دو اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس طرح اس مسئلے میں ایک مشکل پیدا ہو گئی جو خود اس بات کی علامت ہے کہ حالات بدل رہے ہیں۔ ہم دیکھیں گے کہ اس اصول کے ختم ہوتے ہی اسکی جگہ پر معاویہ کی جانب سے ولی عہدی کا اصول پیش کیا گیا۔ اسکے ساتھ ساتھ اس بات کا اضافہ بھی کیا جائے کہ قریش کے سرداروں میں کم ہی کوئی ایسا شخص باقی رہا تھا جو خلافت کا مدعی ہو سکے۔ معاویہ نے ابن عباس کے نام خط میں لکھا: اب قریش کے معاملے میں خدا سے ڈرو! اُن میں سے صرف چھ افراد باقی بچے ہیں' دو افراد شام میں جو میں اور عمرو بن عاص ہیں' دو حجاز میں جو سعد بن ابی وقاص اور عبداللہ بن عمر ہیں اور دو عراق میں جو تم اور حسن ابن علیؑ ہو۔ (۴)

ایسے حالات میں عراق صرف فرزندِ علیؑ ہی پر اعتماد کر سکتا تھا اور اُس نے ایسا ہی کیا۔ البتہ اہلِ عراق کچھ ایسی مشکلات کا شکار تھے' جن کی بنا پر وہ اپنی منتخب کردہ راہ پر ثابت قدم نہ رہ سکے۔ امام حسنؑ کی بیعت کے موقع پر وہ لوگ جنہیں معاویہ کے ساتھ جنگ پر اصرار تھا' اُن کی رائے تھی کہ بیعت کی شرائط میں معاویہ کے خلاف جنگ کو بھی شامل کیا جائے۔ یعنی ہم معاویہ کے خلاف جنگ کے لیے آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام یہ شرط قبول کرنے پر تیار نہیں ہوئے' اور فرمایا: ''اُن سے صرف اس شرط پر بیعت لیں کہ ہم جس سے جنگ کریں گے' وہ بھی اُس سے

۱۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۱۶۔ ص ۲۲' اور دیکھئے: ص ۴۸

۲۔ الفتوح۔ ج ۴۔ ص ۱۵۶

۳۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۱۶۔ ص ۳۱

۴۔ الامامہ والسیاسہ۔ ج ۱۔ ص ۱۳۳' انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۱۰۵۔ ش ۳۱۵

لڑیں گے اور ہم جس سے صلح کریں گے وہ بھی اس سے صلح کریں گے۔''(۱) قدرتی بات ہے کہ معاشرے کا رہبر ایسی کسی شرط کی بنیاد پر کسی سے بیعت نہیں لے سکتا۔ بلکہ اس کو جنگ اور صلح جیسے اہم معاملات میں بااختیار ہونا چاہئے۔ امام کی اس بات (جیسا کہ بعض لوگوں نے اس سے یہی مراد لی ہے) کے معنی یہ نہیں ہیں کہ امام ابتدا ہی سے جنگ کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔(۲) کیونکہ امام کے بعد کے اقدامات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ خود اُن لوگوں میں سے تھے جنہیں معاویہ کے خلاف جنگ پر اصرار تھا۔ اس شرط کو قبول نہ کرنے کا اصل مقصد معاشرے کے رہبر کی حیثیت سے اپنے اختیار اور اقتدار کی حفاظت کرنا تھا۔ ان کی شرط کو قبول کرنے کا مطلب یہ تھا کہ ان لوگوں نے ایک فوجی سپہ سالار کا انتخاب کیا ہے نہ کہ معاشرے کے لیے کسی امام کا۔ شیخ مفید کی تحریر کے مطابق: امامؑ کے ہاتھ پر بیعت 'بروز جمعہ ۲۱ ماہ مبارک رمضان' سن ۴۰ ہجری کو ہوئی تھی۔(۳)

اہلِ کوفہ کی مذہبی اور سیاسی خصوصیات

غیر مناسب نہ ہوگا اگر امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے زمانے کے سیاسی مسائل بیان کرتے ہوئے' آغاز میں عراق کی عمومی صورتحال کی طرف کچھ اشارہ کر دیا جائے۔ عراق ابتدائی اور اہم اسلامی سرزمینوں میں سے ایک سرزمین ہے جس نے خلافت کے پورے دور میں کئی صدیوں تک عالمِ اسلام پر حکمرانی کی ہے اور جس نے اپنے سینے میں اہم انقلابات اور بے شمار حوادث و واقعات کو محفوظ کیا ہوا ہے۔

ابتدا میں عراق بصرہ اور کوفہ کے دو شہروں کی صورت میں ''عـراقین'' کے نام سے وجود میں آیا اور بعد میں بغداد کے وجود میں آنے کے بعد عالمِ اسلام میں زیادہ اہم کردار کا حامل ہوا۔ جن برسوں کا ہم ذکر کر رہے ہیں' یہ وہ زمانہ ہے کہ ابھی بغداد کی تاسیس میں سو سال باقی ہیں۔ واقعہ' جمل کے بعد بصرہ مدتوں تک ''عثمانی مذہب'' شہر رہا تھا۔(۴) اگرچہ بعد میں وہاں ''معتزلہ'' کے اثر و رسوخ کی وجہ سے ایک حد تک توازن آ گیا تھا۔ اس کے مقابلے میں شہر کوفہ' ہمیشہ ایک شیعہ مرکز کے طور پر پہچانا جاتا تھا اور اسکی یہ شہرت بنی امیہ کے پورے دورِ حکومت کے دوران جاری رہی اور بعد میں بھی اس

۱۔ ترجمۃ الامام الحسن' ابن سعد۔ ص ۱۵۴۔۱۵۵' تاریخ طبری۔ ج ۵۔ ص ۱۵۸' انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۲۹

۲۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۲۹

۳۔ ارشاد۔ ج ۲۔ ص ۹

۴۔ مسند ابن جعد۔ ج ۱۔ ص ۵۴۷۔ اس روایت میں آیا ہے کہ قتادہ نے دوسری صدی ہجری میں سنا کہ بصرہ میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہوئے ہیں جو علی کو عثمان پر ترجیح دیتے ہیں تو اس نے کہا: خدا کی قسم اس سے پہلے اس شہر کے لوگ ایسے نہیں تھے۔

شہر کے لوگ اپنے شیعہ عقیدے پر قائم تھے۔اسکے باوجود یہ شہر مختلف موقعوں پر کبھی "مذمت وملامت" اور کبھی "تعریف و تمجید" کا مستحق بنارہا۔اسی لیے اس شہر کے لوگوں کے بارے میں مختلف قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔اس مسئلے کی حقیقت کا درج ذیل چند نکات سے سراغ لگایا جاسکتا ہے:

الف:اس شہر کے لوگ مختلف زمانوں میں مختلف موقف رکھتے تھے: تاریخ کے ایک زمانے میں انہوں نے اہل بیتؑ کے دفاع کا موقف اختیار کیا اور بے مثال شجاعت کے ساتھ علوی گروہ کو مضبوط کیا۔جیسا کہ جمل کے واقعے میں انہی لوگوں کی مدد سے حضرت علی علیہ السلام ناکثین کو شکست دینے میں کامیاب ہوئے۔لیکن حضرت علیؑ کی خلافت کے ٹھیک آخری ایام میں اہل کوفہ نے امامؑ کی مدد میں سستی دکھائی اور حق کی شکست اور باطل کی کامیابی کا سبب فراہم کیا۔بعد میں باوجودیکہ ان کے درمیان بہت سے شیعہ تھے(۱) لیکن عوام الناس نے حسن ابن علیؑ کی مدد کرنے میں کوتاہی کا مظاہرہ کیا اور انہیں تنہا چھوڑ دیا۔یہی محرم ۶۱ ہجری میں بھی دُہرایا گیا۔اس کے باوجود ان میں سے توابین کے نام سے ایک بڑے گروہ نے اپنے گزشتہ کردار سے توبہ کی اور ان میں سے بیشتر لوگ قیام توابین کے دوران شہید ہوگئے۔ان (کوفیوں) میں سے بہت سے لوگوں کا امام حسین علیہ السلام کے قاتلوں سے انتقام لینے کے لیے مختار بن ابی عبیدہ کا ساتھ دینا ان کے شیعہ موقف کی ایک اور علامت ہے۔اس کے مقابلے میں سن ۱۲۲ ہجری میں زید بن علیؑ کا ساتھ دینے کے سلسلے میں ان کی کوتاہی کو علویوں کے ساتھ ان کی بے وفائی قرار دیا گیا ہے۔

ب:اہل کوفہ کے بارے میں ان متضاد آراء کی ایک اور وجہ اس شہر میں مختلف سیاسی اور مذہبی گروہوں کی موجودگی ہے۔ان میں سے ایک گروہ "خارجی" افکار کا حامل تھا۔"اشراف" کے عنوان سے ان کا ایک اور گروہ کم وبیش بنی امیہ کے ساتھ ہم آہنگ تھا۔تیسرا گروہ یعنی "شیعہ" اہل بیتؑ کے فدائی تھے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے اچھے لوگ اپنے صحیح اعمال کی وجہ سے بہترین تعریفوں کے حقدار بنے اور ان کے گمراہ عناصر فرزند رسول کو قتل کرنے کی حد تک آگے بڑھ گئے۔

ج: کوفہ کی قبائلی ترکیب بھی اہل کوفہ کے اس قدر تیزی سے بدلتے موقفوں میں موثر تھی۔قبائلی تعصبات نے انہیں شدت پسند نفسیات کا شکار کردیا تھا۔یہاں تک کہ انتہائی عارضی امور کو دیکھ کر فیصلے کرلیا کرتے تھے۔یہ فیصلے زیادہ تر ان کے قبائلی مفادات کی خاطر ہوتے تھے۔یہ خود اہل کوفہ میں یکجہتی کے فقدان کی ایک وجہ شمار ہوتی تھی۔یہ وہ چیز ہے جس سے بنی امیہ نے بارہا فائدہ اٹھایا۔

۱۔یہ لوگ امام حسنؑ کو خدا کی طرف سے مقرر کیا جانے والا امام نہیں مانتے تھے بلکہ زیادہ تر سیاسی شیعہ تھے۔

جس چیز کا اس وقت یہاں ذکر ضروری ہے' وہ امام حسن علیہ السلام کی امامت کے وقت اہلِ عراق کے حالات سے شناسائی ہے۔ ہمارے خیال میں اگر ان لوگوں کو اچھی طرح پہچان لیا جائے' تو بعد میں عراق میں پیش آنے والی تبدیلیوں کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

شیخ مفید' امام حسن علیہ السلام کے اصحاب کے بارے میں تجزیہ کرتے ہوئے' ان لوگوں کو چند گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں: پہلا گروہ شیعیانِ علیؑ کا تھا' دوسرا گروہ خوارج کا' جو معاویہ کے ساتھ جنگ کرنا چاہتے تھے اور کیونکہ امام حسنؑ شام کے خلاف جنگ کا ارادہ رکھتے تھے' اس لیے وہ آپ کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ تیسرا گروہ اُن لالچی لوگوں کا تھا جو مالِ غنیمت کے خواہشمند رہتے تھے۔ چوتھا گروہ وہ عوام الناس تھے جنہیں کچھ نہیں معلوم تھا کہ کیا کریں؟ پانچواں گروہ ان لوگوں کا تھا جو قبائلی تعصب کی بنا پر' دین پر توجہ کے بغیر صرف اپنے سرداروں کے تابع تھا۔(۱)

ان میں سے تیسرا گروہ تعداد میں سب سے زیادہ تھا۔ عراق کی سرزمین مشرق کی فتوحات کا مرکز شمار ہوتی تھی اور تمام ہی جنگوں میں بہت سا مالِ غنیمت ان کے حصے میں آتا تھا۔ لیکن جب سے حضرت علیؑ اس علاقے میں آئے تھے' اُس وقت سے یہ لوگ داخلی جنگوں میں پھنس گئے تھے' اور اسی وجہ سے یہ لوگ اولادِ علیؑ کو اپنا مقروض سمجھتے تھے۔(۲) نئے حالات میں وہ جنگِ نہروان کے بعد کسی نئی جنگ کے آغاز کو اپنی مصلحت کے خلاف سمجھتے تھے۔ معاویہ کی پھیلائی ہوئی افواہوں کے نتیجے میں (وہ یہ کام عراق میں موجود اپنے جاسوسوں کے ذریعے کیا کرتا تھا) عراقیوں میں شک وشبہ پھیل گیا تھا۔ خوارج کی پیدائش نے اس تردد میں مزید اضافہ کیا اور بہت سے لوگ ان حالات کے صحیح تجزیے اور تحلیل کی قوت سے محروم ہو چکے تھے۔

مندرجہ بالا باتوں سے ہٹ کر ایک اور قابلِ بیان حقیقت یہ ہے کہ بنیادی طور پر عراقیوں نے سو سال تک اپنے حکمرانوں کے ساتھ اپنے طرزِ عمل میں اپنی طبیعت کا اظہار کیا تھا۔ ایران کی فتح کے برسوں میں ان لوگوں میں جو فخر و ناز پیدا ہوا تھا' وہ اس بات کا سبب تھا کہ یہ لوگ (مرکزِ خلافت) مدینۃ النبیؐ پر بھی حاوی ہو گئے تھے اور جب بھی وہ کسی گورنر کو معزول کرنا چاہتے' تو حتیٰ حضرت عمر جیسے خلیفہ کو بھی اسے معزول کرنے پر مجبور کر دیا کرتے تھے۔ لہٰذا وہ شخصیات جو مکار اور فریبی نہیں ہوا کرتی تھیں' وہ ان سے مغلوب نظر آتی ہیں۔ عمار بن یاسر ایک پاک باز شخصیت کے طور پر اور سعد بن ابی وقاص ایک غیر سیاسی فرد کی حیثیت سے ان افراد میں سے ہیں جو زیادہ عرصے کوفہ میں نہ رہ سکے۔ لیکن مغیرۃ بن شعبہ ایک طاقتور

۱۔ ارشاد۔ ج ۲۔ ص ۱۰' الفصول المہمہ۔ ص ۱۴۷' بحار الانوار۔ ج ۴۴۔ ص ۳۶' ۵۶' مناقب ابن شہر آشوب۔ ج ۴۔ ص ۳۲' صلح الامام الحسنؑ۔ ص ۶۸۔۶۹

۲۔ بعد میں آپ دیکھیں گے کہ امام حسنؑ نے اس بات کو صراحت سے بیان کیا ہے۔

فاجرانسان کی حیثیت سے (جیسا کہ حضرت عمر نے اس کی یہی خصوصیت بیان کی تھی) مدتوں کوفہ کا حاکم بنا رہا۔

بعد میں جب حضرت علی علیہ السلام نے مدینہ سے اس شہر میں ہجرت فرمائی' تو کوفہ نے وسعت اختیار کرلی اور عالم اسلام میں اس کا کردار کئی گنا بڑھ گیا۔ حضرت علیؑ کی اخلاقی اور علمی ساکھ اور اسلام کی خاطر آپ کی قربانیوں کی وجہ سے لوگ آپ کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپ کے لشکر میں آپ کے نزدیکی ساتھیوں اور اصحاب رسول کی شمولیت سے آپ کے تقدس میں مزید اضافہ ہوگیا اور اسی وجہ سے ایک مدت تک وہ لوگ آپ پر حاوی نہ ہوسکے' لیکن صفین میں حکمیت کے مسئلے کے بعد انہیں حضرت علیؑ کی مخالفت کے لیے ایک دینی بہانہ مل گیا اور خوارج کی سرکوبی کے بعد اپنے تھک جانے کا بہانہ کرکے انہوں نے خود کو جہاد سے کنارہ کش کرلیا۔ یہاں تک کہ امامؑ کو کہنا پڑا کہ: ''تمام دنیا کی قومیں اپنے حکام کے ظلم سے خوفزدہ ہوتی ہیں اور میں اپنی رعایا کے ظلم سے پریشان ہوں۔'' (۱)

لوگوں کے اندر یہ نئی کیفیت جنم لیتے دیکھ کر امامؑ نے اعلان کردیا کہ آپ ان کی اصلاح نہیں کرسکتے۔ البتہ آپ لوگوں پر جبرواستبداد کے ذریعے حکومت کرسکتے تھے' لیکن امام علیؑ کو اس طریقے سے استفادہ کرنا پسند نہ تھا۔ آپ نے خود اپنے ایک انتہائی شیریں کلام میں لوگوں کی اس نفسیات کا ذکر کیا ہے: ''اے اہلِ کوفہ! میں نے تمہیں مواعظِ قرآنی کے ذریعے سرزنش کی' لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا' چھڑی سے تمہیں مودب بنانے کی کوشش کی' لیکن تم سیدھے نہ ہوئے' تازیانے (جس سے حد جاری کی جاتی ہے) کے ذریعے تمہیں مارا' تب بھی تم نے خیال نہ کیا' وہ واحد چیز جو تمہاری اصلاح کرسکتی ہے تلوار ہے' لیکن میں تمہاری اصلاح کے لیے اپنے آپ کو فساد میں مبتلا نہیں کروں گا۔' (۲)

عراق کے لوگ صرف تلوار ہی سے رام ہوتے تھے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کی تائید تاریخ کرتی ہے۔ اس سرزمین میں اگر کوئی شخص طاقت اور جبرواستبداد سے کام نہ لے' اور علیؑ اور ان کے فرزند کی طرح' بقول خود ان کے جس چیز کو لوگ ناپسند کرتے ہیں وہ ان پر مسلط نہ کرے' تو وہ کامیابی کی امید نہیں رکھ سکتا۔

اس کے بعد بھی عراق صرف اسی زمانے میں سکون سے رہتا تھا جب اس پر زیاد' اس کے بیٹے عبیداللہ یا حجاج کی حکومت ہوتی تھی۔ اس طرح صرف جبرواستبداد ہی کے ذریعے اس علاقے کی سیاسی بغاوت کو کچلا جاسکتا تھا۔ مختار نے بھی کچھ عرصے سیاست کے ذریعے اس علاقے کی باگ ڈور سنبھالی۔ لیکن وہ بھی صرف اسی لیے کہ استبدادی طرز عمل اختیار کرنا نہیں چاہتا تھا' کوفہ کو متحد نہ کرسکا' چہ جائے کہ وہ عراق کو متحد کرتا۔

۱۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۹۷

۲۔ ارشاد۔ ج ۱۔ ص ۲۸۱: "وما كنت متحريا صلاحكم بفساد نفسي."

ان لوگوں کی ذہنیت کے بارے میں، خود امیر المومنین علیہ السلام کے جملے حقیقت کو عیاں کرنے والے ہیں۔ ایک جملے میں امامؑ انہیں ایک ایسی حاملہ عورت سے تشبیہ دیتے ہیں جو حمل کی تکلیفیں اور درد برداشت کرنے کے بعد آخر میں اپنے حمل کو گرا دیتی ہے۔(۱) ایک مرتبہ آپ انہیں ایسے لاوارث اونٹوں سے تشبیہ دیتے ہیں جو ایک طرف سے جمع ہو کر دوسری طرف سے منتشر ہو جاتے ہیں۔(۲)

ایسے مزاج کے لوگ، طبعیتاً ایک ایسے ٹھنڈے مزاج اور اصلاح طلب حاکم کو برداشت نہیں کر سکتے جو منطقی اور انسانی راستوں کا بھی پابند ہو۔ آخری ایام میں حضرت علیؑ ان لوگوں سے بھرپور اصرار کرتے تھے کہ وہ شام کے خلاف متحد ہو جائیں، لیکن اُن کا حال یہ تھا کہ وہ خود عراق کے دفاع کے لیے بھی کوئی کوشش نہیں کرتے تھے۔ ایسے ہی موقع پر امامؑ کی زبان اُن کی مذمت کے لیے کھل جاتی تھی:

"ایتها الفرقة التی اذا امرت لم تطع واذا دعوت لم تجب'.... لله انتم'اما دین یجمعکم'اما حمیة تشحذ کم؟اولیس عجبا'أن معاویة یدعوا الجفاة الطغام فیتبعونه علی غیر معونة ولا عطاء وانا ادعوکم وانتم تریکة الاسلام 'انه لا یکرج الیکم من امری رضاً ترضونه ولا سُخط فتجتمعون علیه وان احبُّ ما انا لاق الی الموت."

"اے وہ لوگو! جنہیں جب کوئی حکم دیتا ہوں تو اسکی اطاعت نہیں کرتے اور جب پکارتا ہوں تو میری آواز پر لبیک نہیں کہتے۔۔۔۔ اللہ تمہیں سمجھے، کیا کوئی دین تمہیں ایک مرکز پر جمع نہیں کرتا؟ اور غیرت تمہیں (خدا کی خاطر حرکت پر) آمادہ نہیں کرتی؟ کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ معاویہ جاہل گنواروں کو دعوت دیتا ہے اور وہ بغیر کسی امداد واعانت اور بخشش وعطا کے اُس کی پیروی کرتے ہیں۔ اور میں تمہیں دعوت دیتا ہوں جبکہ تم اسلام کے رہے سہے افراد اور مسلمانوں کا بقیہ ہو، تو تم نہ میرے کسی فرمان پر راضی ہوتے ہو اور نہ اس پر متحد اور جو چیزیں مجھے ناگوار گزرتی ہیں ان کے خلاف میرا ساتھ دینے پر تیار نہیں ہوتے۔ ان حالات میں، میں صرف موت سے ملاقات کا خواہشمند ہوں۔"(۳)

یہ لوگ شاندار اور درخشاں ماضی رکھنے والے علیؑ کے مقابل اس طرز عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں، اور ایسا رویہ اپناتے ہیں کہ امامؑ موت کی آرزو کرنے لگتے ہیں۔ البتہ امامؑ بھی معاویہ کی طرح غیر اسلامی طریقے اختیار کر کے لوگوں کو اپنی طرف

۱۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۷

۲۔ ارشاد۔ ج۱۔ ص ۲۸۳ "یا اشباه الابل غاب عنها رعاتها کلما اجتمعت من جانب تفرقت من جانب اخری."

۳۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۱۰۔ ص ۶۷

جذب کر سکتے تھے یا انہیں زبردستی جنگ پر بھیج سکتے تھے لیکن امام کا طریقہ کار یہ تھا کہ اب جبکہ لوگ "نہ لڑنے" کو پسند کر رہے ہیں تو انہیں ایسے کام پر مجبور نہ کریں جس کو وہ نہیں چاہتے۔(۱) کیونکہ اگر وہ ایسا کریں تو ان کی رہبری "امامت" نہیں بلکہ "بادشاہی" کہلائے گی اور یہ وہی چیز ہے جس پر معاویہ فخر کیا کرتے تھے۔

بہر طور حسن ابن علی علیہما السلام کی خلافت کے وقت انہیں ایسے ہی لوگوں کا سامنا تھا۔ یہی لوگ تھے جو عراق کے دفاع کے لیے اپنے امام کا حکم ماننے پر تیار نہ ہوئے اور جب جنگ نہروان کے بعد آرام کی غرض سے اپنے گھروں کو گئے تو پھر واپس نہ لوٹے۔(۲)

اس موقع پر مزید مشکلات بڑھ چکی تھیں اور شام میں معاویہ کو پہلے سے زیادہ قوت حاصل ہو گئی تھی۔ شام کے لوگ جو حکمیت سے پہلے معاویہ کو امیر کہتے تھے اب انہیں "امیر المومنین" سمجھنے لگے تھے۔ اس کے مقابلے میں عراق اب اس اتحاد واتفاق سے محروم ہو چکا تھا جو اسے جنگ صفین کے موقع پر حاصل تھا۔ صفین اور نہروان میں بہت سے عراقیوں کے مارے جانے نے (۳) ان کے حوصلوں کو انتہائی پست کر دیا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ حسنؑ بھی علیؑ ہی کے بیٹے تھے۔ ان سب مسائل نے مل کر حالات کو بہت دشوار کر دیا تھا۔ اس کے باوجود عراق کو شام کے تسلط سے خوف لاحق تھا۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے اپنے امام کی اطاعت نہیں کی لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ امام شہید ہو جائیں۔ بالفاظ دیگر ان کے لیے عراق پر معاویہ کا تسلط نا قابل قبول تھا اسی لیے ان کے پاس فرزند علیؑ کی بیعت کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔ ان حالات میں عراق پر حکمرانی کے لیے امام حسنؑ کے سوا اور کسی کے لیے حالات سازگار نہ تھے اور اگر بالفرض وہ نہ ہوتے تو قدرتی طور پر عراق پر بنی امیہ کی حکومت ہو جاتی۔ اس کے باوجود عراقیوں کی اس خواہش میں اتنا خلوص نہ تھا کہ وہ نئے قائد کے ساتھ اپنے عہد و پیمان کے وفادار رہتے بلکہ آخر کار جیسا کہ واقع ہوا جب انہیں دو میں سے ایک راہ کے انتخاب کا موقع ملا تو انہوں نے (جبراً ہی سہی لیکن) بنی امیہ کی حکومت کے ساتھ رہنے کو قبول کیا۔ اس طرح امامؑ کے پاس ان لوگوں کے ساتھ رہنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور مجبوراً امام حسنؑ مدینہ تشریف لے گئے۔

امام حسنؑ اور معاویہ کے اوّلین اقدامات

اس سے پہلے ہم معاویہ کے نام امام حسنؑ کے ایک خط اور معاویہ کی جانب سے اس کے جواب کی جانب اشارہ

۱۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۱۱۔ ص ۲۹: "وقد اوحيتم البقاء وليس لى ان احملكم على ما تكرهون."

۲۔ ایضاً۔ ج ۲۔ ص ۱۹۳ مروج الذہب۔ ج ۲۔ ص ۴۱۸

۳۔ اگرچہ امامؑ کے طرفدار کم مارے گئے تھے لیکن اس جنگ میں مارے جانے والے اکثر خوارج اہل کوفہ کے عزیز رشتے دار تھے۔

کر چکے ہیں۔ یہ خطوط جن کا تبادلہ ہوا اور جن کے متن کو اصفہانی نے نقل کیا ہے(۱) 'نتیجہ خیز نہیں رہے۔ اس حوالے سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ امام جانتے تھے کہ معاویہ ان خطوط کے ذریعے مان جانے والے افراد میں سے نہیں ہے۔ آپ کے پیش نظر اہم بات یہ تھی کہ یہ خطوط تاریخ میں ایک سند کے طور پر باقی رہ جائیں اور اپنے اپنے مؤقف کے جواز کے لیے دونوں فریقین کے دلائل کی نشاندہی کریں۔

معاویہ نے جاسوسوں کو بھیج کر کوفہ اور بصرہ کے حالات جاننے کی کوشش کی۔ یہ جاسوس پہچان لیے گئے اور سب کے سب مارے گئے۔ (۲) اس بارے میں امام حسنؑ اور عبداللہ ابن عباس نے معاویہ کو خطوط تحریر کیے اور انہیں ان کی سرکشی سے آگاہ کیا۔ امامؑ کا آخری انتباہ یہ تھا کہ اگر معاویہ نے اطاعت نہ کی تو آپ مسلمانوں کا لشکر لے کر اس کی طرف روانہ ہو جائیں گے: فحاکمتک الی اللہ حتی یحکم اللہ بیننا وبینکم وھو خیر الحاکمین. (۳)

جب امامؑ اور معاویہ کے درمیان خطوط کے تبادلے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو امامؑ نے معاویہ کو لکھا کہ ان کے اور معاویہ کے درمیان (تنازع کا) فیصلہ صرف تلوار ہی کے ذریعے ہوگا۔ (۴) اس کے بعد معاویہ نے مختلف علاقوں میں اپنے اہلکاروں کو خط لکھا جس میں حضرت علیؑ کی شہادت اور اس بات پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہ ان کا دشمن بغیر کسی مشکل کے ختم ہو گیا ہے انہیں اس بات سے بھی مطلع کیا کہ کوفہ کے حالات دگرگوں ہیں اور علیؑ کے ساتھی اختلاف کا شکار ہو گئے ہیں۔ انہوں نے (جھوٹ یا سچ) یہ بھی لکھا کہ کوفہ کے سرداروں اور سرکردہ افراد نے مجھے خط لکھا ہے اور اپنے اور اپنے خاندان والوں کے لیے امان کی درخواست کی ہے۔ میرا خط ملتے ہی اپنے لشکر کے ساتھ میری جانب روانہ ہو جاؤ کہ انتقام کا وقت آپہنچا ہے۔

جب معاویہ اپنے لشکر کے ساتھ پل منبج تک پہنچ گئے تو امام حسنؑ نے عوام اور اپنے اہلکاروں کو جنگ کے لیے تیار کرنے کی غرض سے حجر ابن عدی کو روانہ کیا۔ کوفہ میں ایک اجتماع منعقد ہوا اور امامؑ نے آیت قرآن وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ. (۵) کی تلاوت کے بعد فرمایا: اے لوگو! تم اپنی نظر میں ناپسندیدہ امر سے اپنے پسندیدہ امر تک صبر کے علاوہ کسی اور چیز کے ذریعے نہیں پہنچ سکتے۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ معاویہ ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ تم سب نخیلہ کی طرف

۱۔ مقاتل الطالبیین۔ ص ۶۲۔ ۶۸

۲۔ مقاتل الطالبیین۔ ص ۶۳' شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۱۶۔ ص ۳۱' ارشاد۔ ج ۲۔ ص ۹

۳۔ مقاتل الطالبیین۔ ص ۶۶

۴۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۱۶۔ ص ۳۶

۵۔ سورۂ انفال ۸۔ آیت ۴۶

روانہ ہو جاؤ۔(۱) اصفہانی کہتے ہیں کہ: آپ کی گفتگو سے اس بات کا اظہار ہوتا تھا کہ جیسے آپ لوگوں کی سستی سے پریشان ہوں۔ کسی نے کچھ نہیں کہا۔ عدی بن حاتم نے گفتگو کی اور فرمایا: میں حاتم کا بیٹا ہوں۔ یہ کیسا برا حال ہے؟ کیا تم لوگ اپنے امامؑ اور اپنے رسولؐ کے بیٹے کی دعوت قبول نہیں کرو گے؟ اس کے بعد انہوں نے امام کی طرف رخ کیا اور اپنی اطاعت کا اعلان کرتے ہوئے نخیلہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ ان کے ساتھ قبیلۂ طی کے کچھ لوگ بھی چل پڑے، جن کی سرداری عدی بن حاتم کے ہاتھ میں تھی۔ یعقوبی کی نقل کے مطابق قبیلۂ طی میں ایک ہزار جنگجو تھے جو عدی کا حکم نہیں ٹالتے تھے۔(۲) اس کے بعد قیس بن سعد معقل بن قیس اور زیاد بن صعصعہ نے تقریریں کیں اور یوں تقریباً بارہ ہزار کا لشکر نخیلہ میں تیار ہو گیا اور امامؑ "دیر عبدالرحمن" تک ان کے ساتھ گئے۔(۳)

بہرصورت اس بات کی جانب متوجہ رہنے کی ضرورت ہے کہ حکمیت کے واقعے کے بعد عراقیوں کے حوصلے ٹوٹ گئے تھے۔ انہوں نے اپنے اذہان کو قاسطین کے ساتھ امکانی صلح کے لیے تیار کر لیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود جب وہ عراق پر معاویہ کے تسلط کے بارے میں سوچتے تھے، تو ان کے بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ اسی کشمکش میں کچھ لوگوں نے خود کو بے تعلق ظاہر کیا، کچھ لوگ سخت شک وشبہ کا شکار ہو گئے اور صرف ایک انتہائی قلیل تعداد نے امام حسنؑ کا ساتھ دیا۔

امامؑ خود لشکر گاہ کی طرف روانہ ہوئے اور اپنے چچازاد بھائی مغیرہ بن نوفل کو کوفہ میں چھوڑا تاکہ وہ لوگوں کو نخیلہ جانے کی ترغیب دلائیں۔ حارث ہمدانی کہتے ہیں: جو لوگ امام کا ساتھ دینے کا عزم رکھتے تھے، وہ نخیلہ روانہ ہو گئے، لیکن ایک بہت بڑی تعداد نے وہاں جانے سے گریز کیا۔ ان میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جو اس سے پہلے تعاون کا وعدہ کر چکے تھے۔(۴) اسی روایت کے مطابق، امامؑ خود کوفہ واپس آئے، تاکہ لوگوں کو جنگ پر جانے کے لیے تیار کریں۔

امامؑ کا یہ موقف زہری اور بعض دوسروں کے بیان کے برخلاف ہے، جو کہتے ہیں کہ: **كان الحسن لا يؤثر القتال ويميل الى حقن الدماء.** (حسنؑ نے قتال کو ترجیح نہیں دی۔ وہ خونریزی سے بچنے کی طرف مائل تھے)۔(۵) **ولم يكن فى نية الحسن ان يقاتل احداً ولكن غلبوه على راية.** (۶) (حسنؑ کسی کے ساتھ لڑنا نہیں چاہتے

۱۔ مقاتل الطالبیین۔ ص ۶۹

۲۔ تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۱۸۱

۳۔ مقاتل الطالبیین۔ ص ۷۰۔ ۷۱

۴۔ بحار الانوار۔ ج ۴۴۔ ص ۴۴

۵۔ تاریخ طبری۔ ج ۵۔ ص ۱۵۸، تذکرۃ الخواص۔ ص ۱۹۶

۶۔ البدایہ والنہایہ۔ ج ۸۔ ص ۱۴

تھے لیکن دوسرے لوگ ان کی رائے پر غالب آ گئے)۔یعنی امام حسنؑ جنگ کی طرف مائل نہ تھے۔علاوہ ازایں امامؑ نے اپنے لشکر کا حوصلہ بڑھانے کے لیے ان کی تنخواہوں میں اضافہ کیا۔(۱) خلافت کے ابتدائی ایام ہی میں یہ اضافہ قدرتی طور پر ان میں شامیوں سے مقابلہ کرنے کی آمادگی پیدا کرنے کے لیے تھا۔

مجموعی طور پر بارہ ہزار افراد نخیلہ گئے۔ان میں سے ایک گروہ پروپیگنڈے کے زیر اثر اور ایک گروہ اپنے سرداروں کی اطاعت میں لشکر گاہ پہنچا تھا۔اگرچہ اس تعداد کو اکثر تاریخی کتابوں میں صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے لیکن بعض نے کہا ہے کہ چالیس ہزار افراد نخیلہ گئے تھے۔کہا گیا ہے کہ:امام کا لشکر چالیس ہزار افراد پر مشتمل تھا' جو "دیر عبدالرحمن" گیا اور وہاں سے ایک ہزار افراد" قیس بن سعد" کے ساتھ ہراول دستے کے طور پر روانہ کیے گئے۔(۲) یہ تعداد صحیح نہیں ہوسکتی کیونکہ:

۱۔تاریخی روایات واضح طور پر بیان کرتی ہیں کہ دعوت کی ابتدا میں ایک آدمی نے بھی مثبت جواب نہیں دیا تھا۔لہٰذا کس طرح ممکن ہے کہ یکایک ان کی تعداد اتنی زیادہ ہو جائے؟

۲۔اگر امامؑ کے اتنے زیادہ طرفدار موجود تھے' تو امامؑ کو لشکر جمع کرنے کے لیے مدائن جانے اور اپنے لشکر کو اکیلا چھوڑنے میں جو خطرہ درپیش تھا اسے مول لینے کی ضرورت نہ تھی۔

۳۔مورخین کی کثیر تعداد' جس نے لشکر کی روانگی کا احوال پوری باریک بینی کے ساتھ بیان کیا ہے' انہوں نے بارہ ہزار ہی کی تعداد لکھی ہے۔ان میں یعقوبی' ابوالفرج اصفہانی اور ابن عساکر شامل ہیں۔(۳)

۴۔زیادہ امکان یہ ہے کہ اس قول کی بنیاد وہ جعلی روایت ہو جس میں حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے وقت اُن کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں کی تعداد کا ذکر ہے اور جن کے بارے میں طے پایا تھا کہ وہ شام کی سپاہ کے خلاف جنگ کے لیے جائیں گے۔اس روایت میں ان افراد کی تعداد چالیس ہزار ہی بیان ہوئی ہے۔(۴) بعض لوگوں کے خیال میں (۵) اس روایت کی وجہ سے کچھ لوگوں نے یہ گمان کیا کہ یہ لوگ حسن ابن علیؑ کے ساتھ تعاون کرنے پر تیار تھے' اگرچہ اتنی بڑی تعداد کے امیر المومنینؑ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے بارے میں بھی بہت زیادہ

۱۔مقاتل الطالبیین۔ص ۶۴

۲۔الفتوح۔ج ۳۔ص ۱۵۳' الکامل فی التاریخ۔ج ۳۔ص ۶۱

۳۔مقاتل الطالبیین۔ص ۷۱' تاریخ یعقوبی۔ج ۲۔ص ۲۱۴' ترجمۃ الامام الحسنؑ ابن عساکر۔ص ۱۶۷

۴۔ذخائر العقبیٰ۔ص ۱۳۸۔۱۳۹

۵۔صلح الحسنؑ آل یاسین۔ص ۱۲۳

شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں۔

۵۔شام کے خلاف جنگ میں ساتھ نہ دینے پر اہل کوفہ کی مذمت میں نہج البلاغہ اور دوسری کتابوں میں حضرت علی علیہ السلام کی متعدد گفتگوؤں کی موجودگی میں یہ بات باور نہیں کی جاسکتی کہ اتنی بڑی تعداد اُن کے فرزند کے ساتھ ہوجائے۔

۶۔جیسا کہ بعد میں ہم دیکھیں گے' صلح قبول کرنے کی اہم ترین وجہ لوگوں کا عدم تعاون تھا۔یہ بات امامؑ نے کئی مرتبہ صراحت کے ساتھ بیان فرمائی ہے اور واضح ہے کہ چالیس ہزار افراد کی موجودگی میں ایسے کلمات امامؑ سے نقل نہیں ہونے چاہیے تھے۔

امام حسن علیہ السلام کے لشکر کے سپہ سالار ''عبیداللہ ابن عباس'' تھے۔زہری نے غلطی سے ''عبداللہ ابن عباس'' کو لشکر کا سپہ سالار سمجھا ہے۔(۱) کچھ لوگوں نے ''قیس بن سعد'' کو لشکر کا سپہ سالار قرار دیا ہے۔(۲) البتہ عبیداللہ کے فرار ہوجانے کے بعد قیس نے لشکر کی قیادت سنبھالی تھی۔گویا اس بات میں کوئی شک نہیں کہ امامؑ نے عبیداللہ کا انتخاب کیا تھا۔(۳) عبیداللہ کے انتخاب کی اہم ترین وجہ یہ تھی کہ شکوک وشبہات کی اس فضا میں امامؑ نے بہترین صورت یہی دیکھی کہ لشکر کی قیادت کے لیے اپنے خاندان ہی کے ایک فرد کا انتخاب کریں۔علاوہ ازایں' عبیداللہ کے دل میں معاویہ سے شدید دشمنی بھی موجود تھی' کیونکہ کچھ ہی دن پہلے معاویہ کے ایک سپہ سالار ''بُسر بن ارطاۃ'' نے حجاز پر حملے کے دوران' عبیداللہ کے دو بیٹوں کا ان کی ماں کی آنکھوں کے سامنے سر قلم کیا تھا۔اس کے باوجود امامؑ نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا' اور عبیداللہ کے لیے دو معاون بھی منتخب کیے تھے۔ایک ''قیس بن سعد' اور دوسرے ''سعید بن قیس''۔

امامؑ نے انہیں دشمن کی طرف بھیجا اور خود ''ساباط مدائن'' روانہ ہوگئے۔انہیں روانہ کرنے سے پہلے امامؑ نے عبیداللہ کو نصیحتیں کیں: الن جانبک ' اپنا رویہ نرم رکھنا' ابسط وجھک ' اپنے چہرے پر مسکراہٹ رکھنا' افرش لھم جناحک ' لوگوں کو اپنی محبت کے سائے میں رکھنا' ادنھم من مجلسک ' انہیں اپنی مجلس سے نزدیک رکھنا' وشاور ھذین ' ان دو افراد کے ساتھ مشورہ کرنا' فلا تقاتله حتی یقاتلک ' اُس وقت تک جنگ کا آغاز نہ کرنا جب تک دشمن جنگ میں پہل نہ کرے۔امامؑ نے انہیں یہ بھی تاکید کی کہ یہ وہ باقی ماندہ لوگ ہیں جو حضرت علیؑ کی نظر میں قابل اعتماد تھے۔اس کے بعد اُن سے فرمایا کہ ''فرات'' کی طرف سے جائیں' وہاں سے ''مسکن'' کی راہ لیں اور معاویہ

۱۔ترجمۃ الامام الحسنؑ ابن سعد۔ص ۱۶۸

۲۔ترجمۃ الامام الحسنؑ ابن عساکر۔ص ۱۷۶

۳۔انساب الاشراف۔ج ۳۔ص ۳۴

کے مقابل کھڑے ہو جائیں۔ اور پھر خود امامؑ کے وہاں پہنچنے تک وہیں ٹھہرے رہیں۔(۱)

خود امامؑ "ساباط مدائن" روانہ ہوئے۔ دینوری کہتا ہے: معاویہ نے ایک لشکر "عبداللہ بن عامر بن کریز" کی قیادت میں "انبار" کی طرف روانہ کیا' تاکہ وہ وہاں سے "مدائن" کی طرف پیش قدمی کرے۔ امامؑ نے جب یہ صورتحال دیکھی تو خود "مدائن" کی طرف روانہ ہوئے۔(۲)

جو حادثہ وہاں پیش آیا اور تمام مورخین نے اسے نقل کیا ہے' وہ امامؑ پر خوارج کا حملہ ہے۔ دینوری' بلاذری اور ابوالفرج اصفہانی جیسے مورخین (حتیٰ شیخ مفید جنہوں نے اپنی روایت کو اصفہانی سے لیا ہے) نے بھی کہا ہے کہ امامؑ نے اپنے خطاب میں اس انداز سے گفتگو فرمائی جس سے صلح کی بو آ رہی تھی۔ اسی لیے خوارج نے آپ کے ساز وسامان پر حملہ کر دیا۔ یہ بات ظاہری واقعات کے ساتھ ہم آہنگ نظر نہیں آتی۔ امامؑ جو کہ مدائن پر دشمن کا حملہ روکنے یا لشکر تیار کرنے کی غرض سے وہاں آئے تھے' کس طرح بغیر کسی وجہ کے اور ابھی جبکہ جنگ کا آغاز بھی نہیں ہوا ہے ایسی باتیں کر سکتے ہیں جن سے صلح کی بو آتی ہو؟ یہاں یعقوبی نے ایک روایت ہمارے لیے محفوظ کر لی ہے' جس سے ماجرا واضح ہوتا ہے۔ معاویہ جو کسی بھی وقت حیلہ گری سے باز نہیں آتے تھے' انہوں نے "مغیرۃ ابن شعبہ" اور "عبداللہ بن عامر" کو صلح کے بارے میں امامؑ سے بات چیت کے لیے ساباط بھیجا۔ جب وہ امامؑ کے پاس سے (نامراد) پلٹے' تو (خوارج کو اُکسانے کے لیے) اس انداز سے کہ لوگ سُن سکیں' زیرِ لب یہ کہتے ہوئے نکلے کہ: خدا نے فرزندِ رسولؐ کے وسیلے سے لوگوں کا خون بہنے سے بچا لیا اور ان کے واسطے سے فتنہ دب گیا اور انہوں نے صلح کو قبول کر لیا۔ یعقوبی مزید کہتے ہیں کہ: ان باتوں سے لشکر میں اضطراب پیدا ہو گیا اور لوگوں نے ان کی سچائی میں کسی قسم کا شبہ نہیں کیا۔ اسی کے بعد انہوں نے امام حسنؑ کے خلاف شورش کر دی اور آپ کے ساز وسامان کو لوٹ لیا۔(۳)

شیعوں نے امامؑ کو اپنے حصار میں لے کر معرکے سے دور کیا۔ اسی دوران "جراح بن سنان" نے یہ نعرہ لگاتے ہوئے کہ تم بھی اپنے باپ کی طرح (نعوذ باللہ) مشرک ہو گئے ہو' امامؑ کی ران پر ضرب لگائی۔ شیعوں نے جراح پر حملہ کر کے اسے مار ڈالا۔ امامؑ "ساباط" کے امیر (مختار کے چچا) "سعد بن مسعود ثقفی" کے گھر چلے آئے اور علاج معالجے کے لیے وہیں مقیم رہے۔(۴) مدائن کی شورش کے بارے میں یعقوبی کی عبارت پر غور کرنے سے ایک بہت اہم نکتہ واضح ہو

۱۔ مقاتل الطالبین۔ ص ۷۱' شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۱۶۔ ص ۴۰

۲۔ اخبار الطوال۔ ص ۲۱۶

۳۔ تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۲۱۵

۴۔ مقاتل الطالبین۔ ص ۷۲

جاتا ہے' اور وہ یہ کہ مدائن کا حادثہ بھی معاویہ اور اُن کے سالاروں کی سازش کا نتیجہ تھا' جن میں مغیرۃ ابن شعبہ جیسا فاسق شخص سرفہرست تھا۔

زخمی ہونے کے بعد امام نے ایک خطبے میں لوگوں سے فرمایا: اے عراق کے لوگو! اتقوا اللّٰہ فینا' فانا امراء کم وضیفانکم' (ہمارے بارے میں خدا سے ڈرو کہ ہم تمہارے امیر اور تمہارے مہمان ہیں) اھل البیت الذین قال اللّٰہ (ہم وہ اہلِ بیت ہیں جن کے بارے میں خدا نے فرمایا ہے: اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَ یُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا. راوی کہتا ہے کہ اس وقت امام کا خطاب سننے والا ہر شخص رورہا تھا۔ (۱)

لشکر جمع کرنے یا شام کے حملوں سے بچانے کے لیے مدائن کو تیار کرنے کی خاطر امام کی اپنے لشکر سے دوری کی وجہ سے خاص قسم کی مشکلات پیدا ہوگئیں۔ دونوں لشکر "مسکن" کے گاؤں "حبوبیہ" میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ گئے۔ معاویہ ہمیشہ کی طرح اپنے حیلہ گرانہ طریقوں سے امام کے لشکر کو فریب دینے کی کوشش کرنے لگے۔ انہوں نے "عبدالرحمٰن بن سمرہ" کو یہ افواہ پھیلانے کے لیے عبیداللہ اور اُن کے سپاہیوں کی طرف بھیجا کہ حسنؑ نے صلح کی درخواست کی ہے۔ لیکن لوگوں نے اس کی بات کو جھوٹ قرار دیا اور اسے برا بھلا کہا۔ (۲)

اس کے بعد انہوں نے خفیہ طور پر عبیداللہ بن عباس کے پاس کسی کو بھیجا اور پیغام دیا کہ: حسنؑ نے ہم سے صلح کی درخواست کی ہے۔ اگر تم ابھی ہمارے ساتھ مل گئے تو تمہیں دس لاکھ درہم دوں گا۔ نصف ابھی دیئے جائیں گے اور بقیہ نصف کوفہ میں داخل ہونے کے بعد۔ عبیداللہ رات کے وقت معاویہ سے جا ملے' لوگ نمازِ فجر کے وقت اُن کی آمد کے منتظر رہے۔ قیس بن سعد نے لوگوں کو نماز پڑھائی اور اس کے بعد عباس کو برا بھلا کہنا شروع کیا کہ کس طرح بدر میں انہوں نے مشرکوں کا ساتھ دیا اور پھر اسیر ہوئے۔ اس کے بعد عبیداللہ کے خلاف بولنا شروع کیا کہ کس طرح انہوں نے یمن میں بُسر بن ارطاۃ کے مقابلے سے بھاگ کر اسے اپنے دو بیٹوں کے قتل کا موقع فراہم کیا۔ (۳)

لوگوں کو رقم دینے' نیز دوسرے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاویہ نے امام حسنؑ کی جانب سے صلح کی درخواست کے معاملے میں جھوٹ سے کام لیا تھا۔ اگر واقعاً امامؑ نے صلح قبول کرلی تھی' تو معاویہ کی طرف سے عبیداللہ ابن عباس کو دس لاکھ درہم دینے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ بہت سے عراقی اس بات کی تاک میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اگر وہ امام حسنؑ کو صلح کی طرف مائل دیکھیں گے' تو فوری طور پر امامؑ کے لشکر سے نکل جائیں گے۔ عبیداللہ کے جانے سے عراقی فوج کا دو تہائی حصہ

۱۔ ترجمۃ الامام الحسنؑ ابن سعد۔ ص ۱۶۷' ۱۶۹' ۱۷۰' المعجم الکبیر۔ ج ۳۔ ص ۹۶۔ ش ۲۷۶۱' مجمع الزوائد۔ ج ۹۔ ص ۱۶۷

۲۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۳۷

۳۔ مقاتل الطالبیین۔ ص ۷۳

معاویہ کے ساتھ جاملا۔(۱) اس طرح قیس بن سعد کے ساتھ صرف چار ہزار افراد باقی رہ گئے۔

معاویہ نے سمجھا تھا کہ عبید اللہ اور عراقی لشکر کی اتنی بڑی تعداد کے آ جانے کے بعد اب (امامؑ کے لشکر میں) کچھ باقی نہیں بچا ہوگا۔ لہٰذا انہوں نے بُسر بن ارطاۃ کو باقی ماندہ عراقی لشکر کی طرف بھیجا۔ لوگ تیار تھے اور انہوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ بُسر پلٹ گیا اور ایک لشکر کے ساتھ پھر حملہ کیا۔ اس مرتبہ بھی قیس اور ان کے ساتھی میدان میں ڈٹے رہے اور حملہ آوروں کو پیچھے دھکیل دیا اور اس جنگ کی وجہ سے کچھ لوگ مارے گئے۔(۲) معاویہ نے قیس کو بھی دھوکا دینے کی کوشش کی۔ لیکن قیس نے کہا کہ وہ اپنے دین میں دھوکا نہیں کھائیں گے۔ اس کے بعد معاویہ نے اُن کو ذلیل کرنا شروع کیا اور انہیں یہودی اور یہودی باپ کی اولاد کہا۔ معاویہ نے یہ بھی کہا کہ: دیکھو' کس طرح تمہاری قوم نے تمہارے باپ کو تنہا چھوڑ دیا تھا' یہاں تک کہ وہ تنہا ہو کر حوران شام میں مر گئے تھے۔ جواب میں قیس نے انہیں وثن بن وثن (بت ابن بت) کہا اور انہیں لکھا کہ: تم نے ابتدا ہی سے مجبوراً اسلام قبول کیا تھا اور مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ڈالنے کے سوا تم نے کوئی کام بھی نہیں کیا ہے اور پوری رغبت کے ساتھ اس سے خارج (بھی) ہو گئے ہو۔ تم نے ہمیشہ خدا اور رسولؐ کے خلاف جنگ کی اور تم مشرکین کے گروہوں میں سے ایک گروہ تھے۔(۳) اصفہانی اس ماجرے کو نقل کرنے کے فوراً بعد ایک وفد کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو معاویہ نے امام حسنؑ کے ساتھ بات چیت کے لیے ساباط روانہ کیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاویہ نے عبید اللہ ابن عباس کے ساتھ جو کیا وہ صرف انہیں دھوکا دینے کے لیے تھا۔

معاویہ کو سپاہِ عراق سے پہلے ہی اپنے بہت سے جاسوسوں کی موجودگی کی وجہ سے امام حسنؑ کے زخمی ہونے کی اطلاع مل گئی تھی۔ یہ خبر سنتے ہی انہوں نے قیس کو پیغام بھیجا کہ تمہارے اصرار کا کوئی فائدہ نہیں ہے (کیونکہ) حسنؑ کے ساتھیوں نے ان سے اختلاف کیا ہے اور وہ ساباط میں زخمی ہو گئے ہیں۔ یہ امر اس بات کا سبب بنا کہ قیس ٹھہر گئے اور امامؑ کی طرف سے کسی قطعی خبر کا انتظار کرنے لگے۔(۴) عراق کے مالدار لوگوں اور سرداروں نے جب یہ صورتحال دیکھی اور انہیں معاویہ کی فتح کا امکان قوی نظر آنے لگا' تو وہ یکے بعد دیگرے معاویہ سے ملحق ہونے لگے' یا اپنی بیعت کا پیغام بھیجنے لگے۔ بلاذری کہتا ہے: عراق کے عمائدین معاویہ کے پاس آ آ کر بیعت کر رہے تھے۔ ان میں پہلا آدمی خالد بن معمر تھا۔ اس نے کہا: اس کی بیعت کا مطلب قبیلۂ ربیعہ کے تمام افراد کی بیعت ہے۔ بعد میں کسی شاعر نے معاویہ سے مخاطب ہو کر

۱۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۳۸

۲۔ ایضاً۔ ج ۳۔ ص ۳۸

۳۔ مقاتل الطالبیین۔ ص ۷۲' انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۳۹۔۴۰

۴۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۳۸

کہا تھا: خالد بن معمر کا احترام کر کہ اگر وہ نہ ہوتا تو 'تو امیر نہ بن پاتا۔(۱)

جس پالیسی سے معاویہ نے خوب فائدہ اٹھایا' وہ اُن افواہوں سے استفادہ کرنا تھا جنہیں وہ خود تین علاقوں کوفہ' ساباط اور میدانِ جنگ میں پھیلایا کرتے تھے۔کوئی یہ سمجھتے تھے کہ کام تمام ہو گیا ہے اور میدانِ جنگ میں یہ بات پھیل گئی ہے کہ تمہارے امامؑ نے صلح کی درخواست کی ہے۔ادھر ساباط میں بھی عبید اللہ اور لشکر کے بڑے حصے کے چلے جانے کی خبر امامؑ تک پہنچی' یہاں تک کہ یہ افواہ بھی پھیلی کہ قیس بن سعد نے بھی صلح کر لی ہے۔مورخین میں وہ واحد شخصیت جس نے ان گوناگوں افواہوں کی طرف گہری توجہ دی ہے' وہ یعقوبی ہیں۔وہ لکھتے ہیں کہ: معاویہ کچھ لوگوں کو امامؑ کی لشکر گاہ میں بھیجتے تھے تاکہ وہ کہیں کہ قیس بن سعد نے صلح قبول کر لی ہے۔دوسری طرف کچھ لوگوں کو قیس کے لشکر میں بھیجا کرتے تھے' تاکہ وہ وہاں جا کر کہیں کہ حسنؑ نے معاویہ کے ساتھ صلح کر لی ہے۔(۲) افسوسناک بات یہ ہے کہ بعض مورخین نے انہی افواہوں کو تاریخی خبر کے طور پر لکھ دیا ہے۔ان میں سے ایک محمد بن سعد نے مغیرۃ ابن شعبہ کی مکاری کو' جس کے نتیجے میں کچھ لوگوں نے ساباط و مدائن میں شورش کر دی تھی' تاریخی خبر کے طور پر اس طرح لکھا ہے کہ اس موقع پر معاویہ نے جو کچھ عہد کیا' امامؑ نے اسے مان لیا۔(۳)

عراق کے بہت سے بڑے لوگ معاویہ کے ساتھ مل گئے۔حتیٰ انہوں نے یہ تک کہا تھا کہ وہ حسنؑ کے ہاتھ باندھ کر اُنہیں معاویہ کے حوالے کرنے پر تیار ہیں۔ابن اعثم کی تحریر کے مطابق' جب قیس نے ایک خط میں امامؑ کو عراقی لشکر کی بڑی تعداد کے چلے جانے کے بارے میں تحریر کیا' تو امامؑ نے اپنے بزرگ اصحاب کو بلایا اور فرمایا: ''اے عراق کے لوگو! میں تم لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کروں؟ یہ قیس ابن سعد کا خط ہے' اس نے لکھا ہے کہ تمہارے بڑے لوگ اور سردار معاویہ سے جا ملے ہیں۔خدا کی قسم' یہ تمہاری جانب سے کوئی نئی بات نہیں ہے۔تم نے صفین میں میرے بابا کو حکمیت پر مجبور کیا اور جب انہوں نے اس کو مان لیا تو تم نے ان پر اعتراض کیا۔انہوں نے دوسری بار پھر تمہیں معاویہ کے خلاف جنگ کے لیے بلایا' لیکن تم نے سستی دکھائی' یہاں تک کہ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ان کے بعد تم نے بغیر کسی جبر اور زبردستی کے میری بیعت کی' میں نے تمہاری بیعت کو قبول کیا اور اس راہ پر قدم رکھ دیا۔خدا جانتا ہے کہ میرا مقصد کیا تھا۔لیکن دیکھو تم نے کیا کیا ہے؟ اے عراقیو! یہی میرے لیے کافی ہے' مجھے میرے دین میں فریب نہ دو۔''(۴)

۱۔انساب الاشراف۔ج ۳۔ص ۳۹

۲۔تاریخ یعقوبی۔ج ۲۔ص ۲۱۵

۳۔ترجمۃ الامام الحسن ابن سعد۔ص ۱۶۹

۴۔الفتوح۔ج ۳۔ص ۱۵۷۔ان باتوں کا امامؑ کے ان تحریف شدہ کلمات سے موازنہ کیجیے جو انساب الاشراف جلد ۳ صفحہ ۳۹ میں آئے ہیں۔

امام کی اس واضح گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ کو جنگ کرنے کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہ تھا لیکن لوگوں کی نامناسب حرکات نے انہیں پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔

معاویہ اور صلح کی درخواست

وہ نکتہ جو امامؑ کے موقف کی وضاحت کے سلسلے میں اہمیت کا حامل ہے' وہ یہ ہے کہ صلح کی درخواست امام حسنؑ کی جانب سے سامنے نہیں آئی تھی۔ یہ معاویہ تھے جو کسی مزاحمت کے بغیر عراق پر قبضہ کرنا چاہتے تھے' لہٰذا انہوں نے امامؑ کو حکومت سے کنارہ کش ہو جانے پر راضی کرنے کے لیے اصرار کیا۔ اس نقطۂ نظر کے بالمقابل بعض کتابوں میں اسی زمانے میں پھیلی ہوئی افواہوں کی پیروی میں (جنہیں کچھ راویوں نے ایک مسلمہ تاریخی خبر کی حیثیت سے نقل کر دیا ہے) اس طرح ظاہر کیا گیا ہے جیسے خود امامؑ نے صلح کی پیشکش کی ہو اور طبعاً آپ یہی رجحان رکھتے ہوں۔ (۱) اس نقطۂ نظر کے خلاف کچھ شواہد موجود ہیں' جن کی جانب ہم اشارہ کر رہے ہیں۔ پہلا شاہد یعقوبی کی خبر ہے' وہ کہتے ہیں: معاویہ نے کچھ لوگوں کو ساباط مدائن روانہ کیا' تاکہ امام حسنؑ سے صلح کے بارے میں بات چیت کریں۔ یہ وہی ملاقات ہے' جس میں امامؑ نے صلح کو مسترد کر دیا تھا۔ (۲) یوں امامؑ نے معاویہ کی جانب سے کی جانے والی صلح کی پہلی درخواست کو مسترد کر دیا تھا۔ دوسرا شاہد امامؑ کے وہ خطوط ہیں جو انہوں نے ابتدا میں تحریر فرمائے تھے اور جن میں سے ہر خط میں امامؑ نے جنگ ہی پر اصرار کیا تھا اور ان میں معاویہ کو دھمکی دی گئی تھی کہ اگر انہوں نے سر تسلیم خم نہ کیا تو امامؑ اپنے لشکر کے ساتھ ان کا سامنا کریں گے۔ امامؑ نے معاویہ کے قاصد سے بھی فرمایا تھا کہ: معاویہ سے کہنا کہ ہمارے اور اس کے درمیان صرف تلوار ہی فیصلہ کرے گی۔

یہ سب چیزیں اس بات کی علامت ہیں کہ امامؑ کا موقف جنگ تھا۔ ایک اور شاہد یہ بھی ہے کہ امامؑ نے لوگوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے صراحت کے ساتھ اس نکتے پر زور دیا تھا کہ معاویہ نے ہم سے ایک ایسی صلح کی درخواست کی ہے جس میں کوئی عزت وشرافت نہیں ہے۔ اگر تم لوگ جنگ کے لیے تیار ہو' تو میں تمہارے ساتھ ہوں' لیکن اگر تمہیں زندہ رہنا پسند ہے' تو بتادو' تاکہ اسکی طرف سے صلح کی پیشکش کو قبول کرلیں۔ (۳) سبط ابن جوزی لکھتا ہے: جب امام حسنؑ نے دیکھ لیا کہ لوگ ان کے گرد سے چھٹ چکے ہیں اور کوفیوں نے ان کے ساتھ خیانت کی ہے' تب آپ صلح کی طرف مائل ہوئے۔

۱۔ دیکھئے: البدایہ والنہایہ۔ ج ۸۔ ص ۱۴' الکامل فی التاریخ۔ ج ۳۔ ص ۴۰۵

۲۔ تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۲۱۵

۳۔ ترجمۃ الامام الحسنؑ ابن عساکر۔ ص ۱۷۸۔ ۱۷۹' الکامل فی التاریخ۔ ج ۳۔ ص ۴۰۶' اعلام الدین۔ ص ۱۸۱' بحار الانوار۔ ج ۴۳۔ ص ۲۱' تذکرۃ الخواص۔ ص ۱۹۹

اس سے پہلے معاویہ نے انہیں صلح کی دعوت دی تھی لیکن امام نے اسے قبول نہیں کیا تھا۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ: یہ معاویہ تھے جنہوں نے صلح کے بارے میں امام کے ساتھ خط وکتابت کی تھی۔ (۱) شیخ مفید نے بھی لکھا ہے کہ: معاویہ نے صلح کے بارے میں امام کو خط لکھا تھا۔ (۲)

ہماری رائے کے مطابق جس طرح ہم نے دوسرے مقامات پر بھی بیان کیا ہے معاویہ کی جانب سے صلح کے بارے میں پھیلائی جانے والی افواہیں اس بات کا سبب بنیں کہ بعض مورخین یہ کہنے لگے کہ خود امام نے صلح کی پیشکش کی تھی۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ معاویہ نے امام کے ہراول دستے میں اپنے جاسوس بھیجے تا کہ وہ یہ افواہ پھیلائیں کہ حسنؑ نے خطوط لکھ کر معاویہ سے صلح کی درخواست کی ہے تم کیوں اپنی جان خطرے میں ڈالتے ہو؟ (۳) معاویہ نے عبید اللہ ابن عباس کو فریب دینے کے لیے انہیں لکھا کہ: ان الحسن قد راسلنی فی الصلح. (حسن نے مجھ سے صلح کے سلسلے میں خط وکتابت کی ہے)۔ (۴) یہی افواہیں بعد میں تاریخی روایتیں بن گئیں اور حقیقت کو بدل کر رکھ دیا۔

صلح قبول کرنے کی وجوہات

متعدد وجوہات اس بات کا سبب بنیں کہ امام حسن علیہ السلام اپنا اصل مقصد یعنی معاویہ کے خلاف ایک آبرومندانہ جنگ حاصل نہ کر سکے۔ لہٰذا آپ نے ضروری سمجھا کہ خود اسلام کی حفاظت اور بے نتیجہ خون خرابہ روکنے کے لیے جنگ سے گریز کریں۔ اب صلح قبول کرنے کی چند وجوہات عرض ہیں:

الف: امام کی حمایت کے سلسلے میں لوگوں کا سستی دکھانا امام کی طرف سے نیا موقف اختیار کرنے کی ایک اہم وجہ تھی۔ کوئی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ معاویہ کے ساتھ امام جنگ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ آپ کے کلمات اور اقدامات مکمل طور پر اسکے بالکل برعکس ثابت کرتے ہیں۔ ساباط کا ماجرا جنگ جاری نہ رکھنے کے بارے میں لوگوں کی عدم قابلیت واضح کرنے کی اہم ترین علامتوں میں سے ہے۔ شیخ مفید کے بقول: یہی وہ مقام تھا جہاں امام نے سمجھ لیا کہ لوگوں نے انہیں تنہا کر دیا ہے۔ (۵)

۱۔ تذکرۃ الخواص۔ ص ۱۹۷

۲۔ بحار الانوار۔ ج ۴۴۔ ص ۳۸

۳۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۱۱۔ ص ۴۲

۴۔ ایضاً

۵۔ ارشاد۔ ج ۲۔ ص ۱۳

بہت سے لوگ جمل' صفین اور نہروان کی جنگوں میں حضرت علیؑ کا ساتھ دیتے ہوئے مارے جا چکے تھے۔ اب وہ جنگ وجدال سے تھک گئے تھے اور انہیں اپنے اندر جنگ جاری رکھنے کی سکت نظر نہیں آ رہی تھی' بلکہ وہ حکومت کو اپنا مقروض سمجھتے تھے اور اہل بیت سے اپنے خون کا مطالبہ کر رہے تھے۔ وہ امام کو اپنے مقتولوں کے خون کا ذمے دار قرار دیتے تھے۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ جب امام کے کانوں میں لشکر کے کچھ سپاہیوں کے فرار کی خبر پہنچی' تو آپ نے لوگوں کی طرف رُخ کیا اور فرمایا: ''تم لوگوں نے (جنگ جاری رکھنے کے بارے میں) میرے بابا کی مخالفت کی اور معاملے کو حکمیت تک پہنچا دیا' حالانکہ میرے بابا اس کے حامی نہیں تھے۔ انہوں نے تمہیں جنگ جاری رکھنے کی دعوت دی اور تم نے اس سے پہلو تہی کی' یہاں تک کہ وہ اپنے پروردگار کے دیدار کو سدھار گئے۔ اس کے بعد تم میرے پاس آئے اور بیعت کی اور یہ طے پایا کہ میں جس کسی سے جنگ کروں گا' تم بھی اسکے خلاف جنگ کرو گے اور میں جس کسی سے صلح کروں گا' تم بھی اس سے صلح کرو گے۔ آج مجھے اطلاع ملی ہے کہ تمہارے بزرگ اور سردار معاویہ کی طرف گئے ہیں اور اس کے ساتھ بیعت کر لی ہے۔ میرے لیے یہی کافی ہے۔ مجھے میرے دین اور میری زندگی کے بارے میں فریب نہ دو۔'' (۱)

جاحظ امام حسن علیہ السلام کے کنارہ کش ہو جانے کی وجہ کے بارے میں لکھتا ہے: جب آپ نے اپنے ساتھیوں کے بکھر جانے کا مشاہدہ کیا اور اپنے لشکر کی ٹوٹ پھوٹ کو دیکھا' تو کیونکہ آپ اپنے والد کے ساتھ ان لوگوں کے طرح طرح کے سلوک سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ یہ لوگ ہر روز ایک نئے رنگ اور نئے انداز کا طرزِ عمل اختیار کر لیتے ہیں' اس لیے آپ حکومت سے کنارہ کش ہو گئے۔ (۲)

امام سمجھ چکے تھے کہ ان لوگوں پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ عدم اعتماد صرف ان لوگوں کے ساتھ نہ دینے کے بارے ہی میں نہ تھا' بلکہ امام فرماتے تھے: والله لو قاتلت معاويه لأخذوا بعنقي حتى يدفعوني اليه سَلَماً. (خدا کی قسم اگر میں معاویہ کے ساتھ قتال کرتا' تو یہ لوگ میری گردن پکڑ کر مجھے معاویہ کے حوالے کر دیتے)۔ (۳) ایک اور جگہ پر امام نے فرمایا: و رأيت أهل العراق 'لايثق بهم أحد أبداً الا غُلب. (عراق والے ایسے لوگ ہیں کہ جس کسی نے ان پر اعتماد کیا وہ مغلوب ہوگا۔ کیونکہ ان میں سے کوئی بھی اپنی سوچ اور خواہشات میں دوسرے سے موافق نہیں ہے۔ یہ لوگ نیکی یا بدی کسی بھی معاملے میں سنجیدہ نہیں ہیں)۔ (۴) ایسے لوگوں کے ساتھ شامیوں کے خلاف جنگ کرنا ممکن نہ تھا' کیونکہ

۱۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۱۶۔ ص ۲۲

۲۔ رسالۃ جاحظ فی بنی امیہ جو ''عصر المامون'' نامی کتاب کی جلد ۳ صفحے پر شائع ہوا ہے۔

۳۔ اعلام الوریٰ۔ ص ۲۰۵' بحار الانوار۔ ج ۴۴۔ ص ۲۰' عوالم العلوم۔ ج ۱۶۔ ص ۱۷۵

۴۔ الکامل فی التاریخ۔ ج ۳۔ ص ۴۰۵

شامیوں کے درمیان مکمل اتحاد و اتفاق پایا جاتا تھا اور وہ اپنے مقصد کے بارے میں یکسو تھے۔ جبکہ اہل کوفہ منتشر، متذبذب اور بے ارادہ لوگ تھے۔

سن ۳۹ اور ۴۰ ہجری میں امام علی علیہ السلام نے لوگوں کو خطاب کر کے جو دردناک خطبے ارشاد فرمائے انہیں دیکھ کر ہر منصف مزاج شخص اس بات کا قائل ہو جائے گا کہ عراق کو شام کے حوالے کرنے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ امام حسنؑ اپنے آپ کو اور گنتی کے چند شیعوں کو ایسے شامیوں کے حوالے نہیں کر سکتے تھے جن کا سرغنہ بُسر بن ارطاۃ جیسا خونخوار شخص تھا۔ اب صلح کے ذریعے عراق کو لوٹ مار اور غارت گری سے محفوظ رکھنے کا ایک راستہ موجود تھا۔ یہ ممکن تھا کہ امامؑ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ جنگ کرتے اور شہید ہو جاتے لیکن اس کا نتیجہ واضح نہ تھا۔ معاویہ نے حضرت عثمان کے خون کے انتقام کا نعرہ لگا کر ایک زہریلی فضا پیدا کر دی تھی۔ اُس وقت شام کے علاوہ مصر اور دوسرے کئی علاقے بھی معاویہ کے کنٹرول میں تھے۔ اس کے مقابلے میں امامؑ اپنے تمام تر درخشاں ماضی اور اپنے مؤقف کی صداقت کے باوجود کوئی پیشرفت نہ کر سکے تھے اور اس صورتحال کی وجہ سے شام کے مقابلے پر عراق کی ناکامی کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان حالات میں امامؑ کی شہادت بھی رائیگاں جاتی۔ غلط طور پر بعض اوقات یہ بھی کہا گیا ہے کہ امامؑ خونریزی کو ناپسند کرتے تھے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ آپ جنگِ جمل اور جنگِ صفین کے دوران میدانِ جنگ میں بنفسِ نفیس موجود تھے۔ آپ اپنے بابا کی سیرت کی بھی مکمل تائید کرتے تھے۔ جو بات امام حسنؑ کو پسند نہ تھی وہ ایسی بے نتیجہ خونریزی تھی جس کا کوئی واضح سیاسی نتیجہ برآمد نہ ہو۔

ب: دوسرا نکتہ جو امامؑ کے نقطہ نظر سے صلح کی وجہ کی وضاحت کرتا ہے یہ ہے کہ بنیادی طور پر عام حالات میں جنگ کرنا لوگوں کی موجودگی سے وابستہ ہوتا ہے اور حکمران صرف ایک خاص حد تک لوگوں کو جنگ پر مجبور کر سکتا ہے۔ درحقیقت دو نکات کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ہوگا۔ ایک یہ کہ کیا مسلمانوں کا حاکم ہر صورت میں حتیٰ لوگوں کی اکثریت کی کھلی مخالفت کے باوجود جنگ کا آغاز کر سکتا ہے؟ اگر وہ ایسا کر سکتا ہے تو کن شرائط میں؟ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اگر بالفرض حاکم ایسا کر سکتا ہے تو کیا ایسا عمل مسلمانوں کی مصلحت میں ہے یا نہیں؟

اصولاً رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت یہ تھی کہ آپ جنگ کے معاملے میں مسلمانوں سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ ہم آنحضرتؐ کے زمانے کی جنگوں کے جائزے کے دوران اس بات کا ذکر کر چکے ہیں یہ اس حال میں تھا جبکہ اولاً رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابتدا ہی میں لوگوں سے بیعت لے چکے تھے اور ثانیاً یہ کہ جہاد کا شمار اسلام کے فروعات میں ہوتا ہے اور اصولاً مسلمانوں کی ذمے داری ہے کہ وہ نماز کی طرح اس حکم پر بھی عمل کریں۔ پھر کیوں آنحضرتؐ ان دو نکات کے باوجود جنگ کے معاملے میں لوگوں سے مشورہ کیا کرتے تھے؟ اس کی پہلی دلیل یہ ہے کہ جنگ کا بوجھ بہت

بھاری ہوتا ہے اور یہ بارگراں لوگوں کو ہی اپنے کاندھوں پر اٹھانا ہوتا ہے۔ نماز ایک ایسی عبادت ہے جو مسلمان کا صرف ایک محدود وقت لیتی ہے۔ لیکن جنگ کی وجہ سے مسلمانوں کو جان و مال سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں اور بسا اوقات انہیں بے وطنی اور خانہ بدوشی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جنگ کے اس قسم کے نتائج کے ہوتے ہوئے کہ ایک انسان کی شہادت سے پورا قبیلہ خوفزدہ اور پریشان ہو جاتا ہے' فطری بات ہے کہ لوگ خود اس معاملے میں شریک رہیں اور اس مسئلے پر مشورے کے ذریعے ایک حد تک اس نقصان کا بوجھ برداشت کریں۔ باوجود یہ کہ جہاد اسلام کے فروعات میں شامل ہے' رسول اللہؐ نے بدر سے پہلے ہونے والی جنگوں میں انصار سے' جنہوں نے آنحضرتؐ کے ساتھ جنگوں میں شرکت کا وعدہ نہیں دیا تھا' کوئی استفادہ نہیں کیا۔ بدر کے موقع پر بھی انصار کے سرداروں کے جنگ کے لیے تیار ہونے کے اعلان کے بعد آنحضرت نے ان سے استفادہ کیا۔ بعد میں احد اور احزاب میں بھی مشوروں کا سلسلہ نظر آتا ہے۔

لیکن جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کیا جنگ کے معاملے میں کسی کام کو لوگوں پر مسلط کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ حضرت علیؑ کی سیرت یہ تھی کہ صرف نصیحت یا کبھی کبھار تازیانہ ہاتھ میں لیکر لوگوں کو آمادہ کیا کرتے تھے۔ لیکن امامؑ اس بات پر تیار نہیں تھے کہ لوگوں کو جنگ میں شریک کرنے کے لیے تشدد اور تلوار سے کام لیں۔(۱) آپ واضح الفاظ میں فرماتے تھے: ''کل تک میں فرمان دیا کرتا تھا' آج مجھے فرمان دیتے ہیں۔ کل تک میں انہیں روکا کرتا تھا' آج وہ مجھے روکتے ہیں۔ تم لوگ زندہ رہنا پسند کرتے ہو اور لیس لی ان احملکم ما تکرھون. (میں تمہیں ایسی بات پر مجبور نہیں کروں گا جسے تم پسند نہیں کرتے ہو)۔(۲) امام حسن علیہ السلام بھی اسی سیرت پر کاربند تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ لوگ اُن جیسا امامؑ قبول کرنے پر تیار ہی نہیں ہیں' اور شام کے مقابلے میں اپنے مقام و حیثیت کی حفاظت کرنے کے لیے آمادہ ہی نہیں ہیں' تو قدرتی بات ہے کہ اُن ضروری نصیحتوں کے بعد' جن میں سے زیادہ تر آپ کے بابا پہلے ہی ان لوگوں کو کر چکے تھے آپ عراق چھوڑ کر مدینہ تشریف لے جائیں۔

حضرت علی علیہ السلام عراقیوں کو ان کے دشوار مستقبل سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ لہٰذا آپ نے فرمایا: ''جان لو کہ تم میرے بعد تین بلاؤں میں گرفتار ہو گے۔ ہمہ جہت ذلت و خواری' مہلک تلوار اور ظالموں کا ظلم و استبداد۔ ان حالات میں مجھے یاد کرو گے اور آرزو کرو گے کہ کاش میرا ساتھ دیتے اور میری مدد کرتے اور میرے دفاع کے لیے اپنا خون نچھاور کر دیتے۔''(۳)

۱۔ الغارات۔ ص ۳۰۷ (فارسی ترجمہ)

۲۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۲۰۸' شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۲۔ ص ۲۲۰ اور ج ۱۱۔ ص ۲۹

۳۔ الغارات۔ ص ۱۸۵

امام حسن علیہ السلام نے عراق کے دشوار حالات اور جنگ کے لیے آپ کی اپیلوں سے لوگوں کی بے اعتنائی اور آپ کے کنارہ کش ہو جانے کے لیے معاویہ کے اصرار کے موقع پر ایک تقریر میں اپنا موقف بیان کیا۔ امام نے ابتدا میں اس بات کا اعلان کیا کہ آپ شام کے خلاف جنگ کے بارے میں کسی بھی قسم کے شک وشبہ کا شکار نہیں ہیں: **واللہ لا یثنینا عن اھل الشام شک ولا ندم، وانما نقاتل اھل الشام بالصبر والسلامۃ.** (شک اور پشیمانی ہمیں شامیوں کے خلاف جنگ سے نہیں روک سکتے' بلکہ ہم بردباری اور وقار کے ساتھ ان کے خلاف جنگ کریں گے)۔ اسکے بعد امام لوگوں کی نفسیات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: تم لوگ پہلے جیسے نہیں رہے ہو۔ جب تم صفین کی طرف گئے تھے تو تمہارا دین تمہارے آگے آگے تھا' لیکن آج تمہاری دنیا تمہارے دین پر مقدم ہے۔ مزید فرمایا: تم لوگ دو خطرناک جنگوں' صفین اور نہروان کے درمیان آ گئے ہو' اپنے مقتولوں پر روتے ہو اور ان کا انتقام لینا چاہتے ہو۔۔۔ **الا وان معاویۃ دعانا الی امر لیس فی عز ولا نصفۃ.** (اور اب معاویہ نے ہم سے صلح کا تقاضا کیا ہے' ایک ایسی صلح جس میں نہ کوئی سرافرازی ہے' نہ کوئی شرافت اور نہ انصاف)۔ امام نے اپنے اس بیان سے عراقیوں پر واضح کر دیا کہ صلح کے عمل میں شریک ہونا کسی بھی صورت عراقیوں کے مفاد میں نہیں ہے۔ اس کے بعد امام نے لوگوں سے چاہا کہ وہ ان کی ذمے داری واضح کریں: **فان أردتم الموت رددناہ علیہ وحاکمناہ الی اللہ عزوجل بظبی السیوف، وان أردتم الحیاۃ قبلناہ وأخذنا لکم الرضی.** (اگر تم لوگ جنگ کے لیے تیار ہو' تو ہم اس کی طرف سے صلح کو مسترد کر کے اور اپنی تلواروں پر بھروسا کر کے اس کے معاملے کو خدا پر چھوڑ دیں گے۔ لیکن اگر زندگی کے خواہاں ہو' تو اس کی طرف سے صلح کی پیشکش کو قبول کر لیتے ہیں اور تمہارے لیے امان حاصل کر لیتے ہیں)۔ یہ سُن کر مسجد میں ہر طرف سے آوازیں بلند ہونے لگیں کہ ہم زندگی چاہتے ہیں' ہم زندگی چاہتے ہیں اور اس طرح انہوں نے صلح کو قبول کر لیا۔(۱)

امام حسن علیہ السلام نے ایک اور مقام پر فرمایا: **انی رأیت ھوی عظم الناس فی الصلح، وکرھوا الحرب فلم أحبّ أن أحملھم علی ما یکرھون.** (میں نے زیادہ تر لوگوں کو صلح کا خواہاں اور جنگ سے گریزاں دیکھا۔ مجھے یہ بات پسند نہ آئی کہ انہیں ان کی نظر میں ناپسندیدہ کام پر مجبور کروں)۔(۲)

ایک دوسرے مقام پر فرمایا: **أری أکثرکم قد نکل عن الحرب وفشل فی القتال ولست أری أحملکم علی ما تکرھون.** (میں نے دیکھا کہ تم میں سے اکثر لوگ جنگ سے منہ موڑ چکے ہو' اور لڑائی میں سست ہو اور

۱۔ ترجمۃ الامام الحسن ابن عساکر۔ ص ۱۷۸۔۱۷۹' الکامل فی التاریخ۔ ج ۳۔ ص ۴۰۶' اعلام الدین۔ ص ۱۸۱' بحار الانوار۔ ج ۴۴۔ ص ۲۱' تذکرۃ الخواص۔ ص ۱۹۹

۲۔ اخبار الطوال۔ ص ۲۲۰

میں ایسا نہیں ہوں کہ تمہیں اُس کام پر مجبور کروں جسے تم پسند نہیں کرتے۔(۱)

امام نے لوگوں کے عدم تعاون کو خلافت معاویہ کے حوالے کر دینے کی وجہ بتایا ہے۔ عام حالات میں اس کا اسکے سوا کوئی اور حل موجود نہیں ہے۔

آپؑ نے ایک اور مقام پر فرمایا: **واللّٰہ انی سلّمت الامر لأنی لم أجد أنصاراً ولو وجدت أنصاراً لقاتلته لیلی ونهاری حتی یحکم اللّٰہ بیننا وبینه.** (خدا کی قسم! میں نے اس لیے یہ امر (خلافت) اس کے حوالے کر دیا کہ میرا کوئی مددگار نہیں تھا۔ اگر میری مدد کرنے والے ہوتے تو اس کے خلاف دن رات لڑتا یہاں تک کہ خدا میرے اور اس کے درمیان فیصلہ کر دیتا)۔(۲)

ج: صلح قبول کرنے کے لیے امام حسن علیہ السلام کی ایک اور دلیل یہ تھی کہ یہ اقدام شیعوں کی حفاظت کے لیے اٹھایا گیا تھا۔ امام پر اعتراض کرنے والوں کے دو گروہ تھے ایک شدت پسند خوارج جو اسی وجہ سے حضرت علیؑ کے ساتھ بھی الجھ گئے تھے اور دوسرے وہ انقلابی جوشیلے مزاج کے حامل شیعہ جو کسی صورت پیچھے ہٹنے کے قائل ہی نہ تھے۔ یہ لوگ صلح کے مخالف تھے اور گاہے بگاہے امام پر اعتراض کیا کرتے تھے۔ اعتراض کرنے والوں میں کچھ ایسے لوگ بھی شامل تھے جو امامؑ کو (نعوذباللہ) "**مذل المؤمنین**" (مومنوں کو ذلیل کرنے والے) کہا کرتے تھے۔ اس کے برخلاف امام صلح قبول کرنے کو "باعث عزت" سمجھتے تھے اور اپنے آپ کو "**معز المؤمنین**" (مومنوں کو عزت دینے والا) متعارف کرایا کرتے تھے۔ اور اس کی دلیل یہ بتاتے تھے کہ: **انی لما رأیتک لیس بکم علیهم قوة سلمت الأمر لأبقی انا وأنتم بین أظهرکم.** (جب میں نے دیکھا کہ تمہارے پاس ضروری طاقت نہیں ہے تو میں نے خلافت کو اس کے حوالے کر دیا تاکہ میں اور تم بچ جائیں)۔ آپ کی دوسری گفتگوؤں سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے اور ان کے بچ جانے سے آپ کی مراد تشیع کی حفاظت تھی۔ امام نے اپنے ایک کلام میں اپنے اس اقدام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس صاحب علم ساتھی کے کشتی میں سوراخ کر دینے کی مانند قرار دیا ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح کشتی کو اس کے مالکوں کے لیے محفوظ رکھا جائے۔(۳)

امامؑ ایک اور کلام میں فرماتے ہیں: **فصالحت بُقیاً علی شیعتنا خاصة من القتل فرأیت دفع هذه الحروب الی یوم مّا فانّ اللّٰہ کل یوم هو فی شان.** (میں نے اپنے شیعوں کو قتل ہونے سے بچانے کی خاطر صلح

۱۔ اخبار الطوال۔ ص ۲۱۷

۲۔ بحار الانوار۔ ج ۴۴۔ ص ۱۴۷ اور دیکھئے: ص ۳۵۔ ۳۶

۳۔ بحار الانوار۔ ج ۴۴۔ ص ۱۹، تحف العقول۔ ص ۲۲۷، عوالم العلوم۔ ج ۱۶۔ ص ۱۷۵، فرائد السمطین۔ ج ۲۔ ص ۱۲۰

اور اپنے مخلص ساتھیوں کی جانوں کی حفاظت کروں)۔(۱)

اعتراض کرنے والے عام طور پر محبانِ اہلِ بیتؑ ہی تھے' اور ان میں سے حجر ابن عدی جیسے لوگ تو خلافت کو صرف آلِ علیؑ ہی کا حق مانتے تھے۔ اس کے باوجود اسلام سے امویوں کی دشمنی سے واقفیت اور اپنے انقلابی مزاج کی وجہ سے ان کی خواہش تھی کہ ہر صورت میں ان کے مقابل کھڑا ہونا چاہیے۔ مندرجہ بالا جملات جنہیں ہم نے قصداً تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے' اچھی طرح اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ امامؑ کا نقطۂ نظر انتہائی مضبوط اور منطقی تھا۔ آپ اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ معاویہ نے حق طلبی کا جو نقاب اوڑھ رکھا ہے اور احمقوں کا جو عظیم لشکر اُن کے اختیار میں ہے' اس کی مدد سے وہ عراق کی محدود تحریک کو کچل سکتے ہیں اور وہ خاندانِ علوی کے اہم افراد اور شیعوں کو حضرت عثمان کے قتل کے بہانے ٹھکانے لگا دیں گے۔ معاویہ نے اس منصوبے کی تمام ظاہری باتوں کو اپنے مفاد میں ڈھال لیا تھا۔ اس وقت نامور اصحاب میں سے کم ہی ایسے لوگ بچے ہوں گے جو معاویہ کے مقابلے میں کھڑے ہونے کی قدرت رکھتے ہوں۔ اس وقت تک انہوں نے عراق کو بھی شک وشبہ میں ڈالنے کی قدرت حاصل کر لی تھی۔

اسی وجہ اور دوسری وجوہات کی بنا پر انہوں نے عراقیوں کو امامؑ کے گرد سے منتشر کر دیا تھا۔ اس بات کا تصور کرنا دشوار نہیں ہے کہ اگر معاویہ حضرت علیؑ کے آخری زمانے میں عراق پر قبضہ کرنا چاہتے' تو حضرت علیؑ بھی اس کے سوا کچھ اور نہیں کر سکتے تھے' جیسا ان کے فرزند امام حسنؑ نے کیا۔ چند مخلص لیکن تعداد میں کم افراد کی موجودگی اس بات کے لیے کافی نہیں تھی کہ امام حسنؑ جنگ کا آغاز کر دیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے کہ اگر ان حالات میں حضرت علیؑ ہوتے' تو اُن کے لیے بھی اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ ہوتا' حکمیت کے مسئلے پر امامؑ کا طرزِ عمل قابلِ توجہ ہے۔ حضرت علیؑ نے حکمیت قبول کرنے پر اعتراض کرنے اور جنگ جاری رکھنے پر اصرار کرنے والے چند لوگوں کے جواب میں فرمایا: "تم دیکھ رہے ہو کہ میرے سپاہی کس طرح میری مخالفت پر اتر آئے ہیں۔ تم لوگ اس قسم کی اکثریت کے درمیان ایک چھوٹا سا گروہ ہو۔ اگر ہم نے جنگ کا آغاز کیا' تو جنگ کی مخالف یہی اکثریت شامیوں سے زیادہ تمہاری دشمن ثابت ہوگی۔ جس وقت اہلِ شام اور یہ لوگ باہم متحد ہو گئے' تو تم سب کو ختم کر دیں گے۔ خدا کی قسم! خود میں بھی اس حکمیت پر خوش نہیں ہوں' لیکن میں نے اکثریت کے مطالبے کو تسلیم کیا ہے' کیونکہ مجھے تمہاری جانوں کی طرف سے خطرہ تھا۔"(۲)

بہر طور اپنے طرفداروں کی حفاظت ایک ایسی ضرورت تھی جس نے امامؑ کو مجبور کر دیا کہ آپ ایک ایسا اقدام قبول

۱۔ عوالم العلوم۔ ج ۱۶۔ ص ۱۶۹۔ ۱۷۰

۲۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۳۳۸' اور دیکھئے: ترجمۃ الامام الحسنؑ ابن عساکر۔ ص ۲۰۳ (حاشیہ)

کرلیں جسے انجام دینے کے لیے ایک خاص جرأت درکار ہے۔ امام اور اصولاً ہر نظریاتی انسان کے لیے اہمیت اس بات کی ہوتی ہے کہ وہ اپنی شرعی ذمے داری پر عمل کرے یہ نہیں کہ لوگوں کی طعنہ زنی کے خوف سے وہ اپنے آپ کو ایسے جال میں پھنسالے جس سے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی بربادی کے سوا کچھ اور حاصل ہونے والا نہیں۔ امام حسنؑ نے اپنی صلح کے بارے میں فرمایا: واللہ الذی عملت خیرٌ لشیعتی مما طلعت علیہ الشمس او غربت. (خدا کی قسم! جو کام میں نے کیا ہے وہ میرے شیعوں کے لیے ہر اس چیز سے بہتر ہے جس پر سورج طلوع یا غروب ہوتا ہے)۔(۱) اور امام حسنؑ کے اس اقدام کے بارے میں امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا ہے: واللہ 'الذی صنع الحسن بن علی' کان خیراً لھذہ الامۃ مما طلعت علیہ الشمس. (خدا کی قسم جو کام حسن ابن علیؑ نے کیا وہ اس امت کے لیے ہر اس چیز سے بہتر ہے جس پر سورج طلوع ہوتا ہے)۔(۲)

امام حسینؑ اور صلح

ہم اس سے پہلے اشارہ کرچکے ہیں کہ کچھ مورخین اور محدثین نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ ان دو بھائیوں (یعنی امام حسنؑ اور امام حسینؑ) کو دو متضاد فکر رکھنے والی شخصیات کے طور پر پیش کریں۔ اس طرزِ فکر کی بنیاد ہی غلط ہے۔ صلح کے بارے میں ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ گویا امام حسینؑ صلح کے قائل نہ تھے اور انہوں نے اس بابت اپنے بھائی سے اعتراض کیا تھا۔ ان لوگوں کے اس خیال کی بنیاد یہ ہے کہ امام حسینؑ اپنے والدِ گرامی کی روش کے حامی تھے جبکہ امام حسنؑ کو جنگ کا راستہ پسند نہیں تھا۔ ہم نے اس سے قبل اشارہ کیا ہے کہ امام حسنؑ جنگ کے حامی تھے اور یہ بات آپ کے کلمات سے بالکل واضح ہے۔

امام حسینؑ سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے اپنے بھائی پر اعتراض کرتے ہوئے کہا: اُعیذک باللہ ان تکذّب علیاً فی قبرہ وتصدّق معاویۃ. (میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ آپ قبر میں (نعوذ باللہ) علیؑ کی تکذیب اور معاویہ کی تصدیق کریں)۔(۳) مدائنی سے منقول ہے کہ حسینؑ نے صلح قبول کرنے سے انکار کیا یہاں تک کہ آپ کے بھائی نے آپ سے بات کی۔(۴) اس دعوے کے مقابلے میں ایسے شواہد بھی نقل ہوئے ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ امام حسینؑ

۱۔ فرائد السمطین۔ ج ۲۔ ص ۱۲۳' بحار الانوار۔ ج ۴۴۔ ص ۱۹

۲۔ بحار الانوار۔ ج ۴۴۔ ص ۲۵' روضۃ الکافی صفحہ ۳۳۰ سے

۳۔ ترجمۃ الامام الحسن ابن عساکر۔ ص ۱۷۸

۴۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۱۶ ص ۲۳' اور دیکھیے: البدایہ والنہایہ۔ ج ۸۔ ص ۲۶' اسد الغابہ۔ ج ۲۔ ص ۲۰' کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۲۳۷' تذکرۃ الخواص۔ ص ۹۷

کو بھی صلح سے بہتر کوئی اور راستہ نظر نہیں آتا تھا اور آپ لوگوں کو اپنے بھائی کی اطاعت کی دعوت دیا کرتے تھے۔

۱۔ امام حسین علیہ السلام نے عملاً ان باتوں اور اقدامات سے لاتعلقی اور بے توجہی برتی جن کے ذریعے یہ کوشش کی گئی تھی کہ انہیں ان کے بھائی کے مؤقف کی مخالفت پر ابھارا جائے اور انہیں شیعیانِ عراق کے رہنما کے طور پر پیش کیا جائے۔ آپ اپنے بھائی کی زندگی کے آخری لمحات تک اُن کے ساتھ رہے اور انہی کی طرح مدینہ میں مقیم رہے۔ حتیٰ امام حسنؑ کی شہادت کے بعد بھی گیارہ سال تک آپ کا وہی مؤقف رہا' جو آپ کے بھائی کا تھا۔ یہ سیرت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ آپ کو صلح کے معاملے میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔

۲۔ انتہا پسند شیعہ صلح کے فیصلے سے ناراض ہو کر امام حسینؑ کے پاس آئے اور آپ سے درخواست کی کہ آپ ان کی قیادت اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ علی بن محمد بن بشیر ہمدانی کہتا ہے: ہم سفیان بن ابی لیلیٰ کے ساتھ مدینہ آئے اور حسن ابن علیؑ کے پاس پہنچے۔ اس وقت مسیب بن نجبہ اور کچھ دوسرے لوگ ان کے پاس موجود تھے۔ میں نے ان سے کہا: یـا مذل المؤمنین! امامؑ نے فرمایا: ''تم پر سلام ہو' بیٹھ جاؤ' میں مذل المؤمنین (مومنین کو ذلیل کرنے والا) نہیں بلکہ معز المومنین (مومنین کو عزت دلانے والا) ہوں۔ صلح سے میرا مقصد تمہاری جانوں کی حفاظت کے سوا کچھ اور نہ تھا۔۔۔''

وہ مزید کہتا ہے: ہم ان کے بھائی امام حسینؑ کے پاس گئے اور انہیں وہ باتیں بتائیں جو امام حسنؑ نے کہی تھیں۔ امام حسینؑ نے فرمایا: **صدق ابو محمد' فلیکن کل رجل منکم جلساً من أحلاس بیته مادام هذا الانسان حیاً فان یُهلک وأنتم احیاء رَجَوْنا أنْ یُخِیرَ اللّٰه لنا ویؤتنا رشد نا ولا یکلنا الی انفسنا.** (ابو محمد (امام حسنؑ) درست فرماتے ہیں۔ تم میں سے ہر شخص اس وقت تک اپنے گھر میں بیٹھا رہے جب تک یہ شخص (معاویہ) زندہ ہے۔ اگر وہ مر گیا اور تم زندہ ہوئے' تو امید ہے کہ اللہ ہمارے سامنے وہ چیز لے کر آئے گا جس میں ہماری بہتری ہے اور ہمیں اپنے حال پر نہیں چھوڑے گا)۔(۱)

ایک اور شخص' جس نے امام حسین علیہ السلام سے تحریک چلانے کی درخواست کی تھی' امامؑ نے اس کے جواب میں فرمایا: **اما أنا' فلیس رأیی الیوم ذلک 'فالصقوا رحمکم اللّٰه بالارض واکمنوا البیوت واحترسوا الظنة مادام معاویة حیاً.** (اس وقت میری یہ رائے نہیں ہے۔ خدا تم پر رحمت کرے' جب تک معاویہ زندہ ہے' اپنے گھروں میں رہو اور ایسے کاموں سے پرہیز کرو جن سے تم پر شک کرنے لگیں)۔(۲)

۱۔ انساب الاشراف۔ ج ۱۔ ص ۱۵۰' اخبار الطوال۔ ص ۲۲۱' الامامۃ والسیاسۃ۔ ج ۱۔ ص ۱۸۷

۲۔ اخبار الطوال۔ ص ۲۲۲

معاویہ کی زندگی کی جانب امام کا اشارہ کرنا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ آپ بھی ان حالات سے واقف تھے جو صلح پر منتج ہوئے تھے۔ اس تجزیے میں معاویہ ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ بہر حال جب صلح کا ماجرا ختم ہوا' تو دونوں بھائی کوفہ چھوڑ کر مدینہ لوٹ آئے۔

صلح نامے کا متن

امام حسن علیہ السلام اور معاویہ کے درمیان جس صلح نامے پر دستخط ہوئے تھے' تاریخی مصادر (sources) میں اسکے مواد پر مکمل اتفاقِ رائے نہیں پایا جاتا۔ نہ صرف اس زمانے میں پھیلی ہوئی افواہیں بلکہ مورخین اور راویوں کے مفادات بھی صلح نامے کے متن کی روایتوں میں پائے جانے والے اختلاف پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ بعض نکات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا' بعض کو چھپا دینا' غیر حقیقی اور جھوٹے نکات گھڑنا' مختلف حوالوں سے بنیادی شرائط کے ذکر سے بے توجہی وہ تحریفات ہیں جو ان تاریخی روایتوں میں نظر آتی ہیں۔ (۱) ان باتوں سے قطع نظر' اس صلح نامے کے مواد کے بارے میں ایسی مختلف اور منتشر روایتیں موجود ہیں' جن میں سے ہر ایک میں اصل متن کا کچھ حصہ بیان کیا گیا ہے۔ آلِ یاسین اور کچھ دوسرے حضرات نے ان روایتوں کو اکٹھا کیا ہے اور ان سب کو ایک جگہ جمع کر لیا ہے۔ ہم یہاں اس کا اصل متن نقل کرنے کے بعد اُن بعض نکات کا تذکرہ کریں گے جو منتشر طور پر ملتے ہیں۔

بعض قدیم مصادر (sources) ایک ابن اعثم کوفی' دوسرے بلاذری اور تیسرے ابن شہر آشوب نے صلح نامے کا پورا متن ایک باضابطہ معاہدے کی صورت میں تحریر کیا ہے۔ اس متن کے بارے میں جو مقدمات بیان کیے گئے ہیں' وہ اس متن کی صداقت کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ابن اعثم نے لکھا ہے: جب امامؑ اور معاویہ کے درمیان جنگ کا انجام صلح پر ہوا' تو امام حسنؑ نے عبداللہ بن نوفل کو طلب کیا اور اُن سے فرمایا: معاویہ کے پاس جاؤ اور اُن سے کہو کہ اگر لوگوں کی جان و مال' اولاد اور عورتوں کو امان ہے' تو میں تمہاری بیعت کروں گا۔ بصورتِ دیگر تمہاری بیعت نہیں کروں گا۔ عبداللہ معاویہ کے پاس گئے اور (اپنی جانب سے) اُن سے کہا: صلح کی کچھ شرائط ہیں جن کو تمہیں قبول کرنا ہو گا۔ پہلی یہ کہ خلافت اس صورت میں تمہارے حوالے کر دی جائے گی کہ تم اسے اپنے بعد امام حسنؑ کے حوالے کرو گے۔ دوسری بات یہ کہ بیت المال میں سے سالانہ ۵۵ ہزار درہم ان کے لیے مخصوص کرو گے۔ اس کے علاوہ "دارابجرد" کا خراج بھی ان کو دیا جائے گا۔ لوگوں کو بھی مکمل امان حاصل ہو گی۔

معاویہ نے یہ شرائط قبول کر لیں اور ایک سادہ کاغذ منگوا کر اس کے نیچے دستخط کر دیے۔ اور وہ کاغذ حسن ابن علیؑ کے

۱۔ مثال کے طور پر" ترجمۃ الامام الحسن ابن عساکر صفحہ ۱۶۸ پر زہری کی روایت ملاحظہ کیجیے۔

پاس بھجوادیا۔ جب عبداللہ بن نوفل امام کے پاس واپس آئے اور جو مسائل وہاں پیش آئے تھے وہ بتائے' تو امام نے اُن سے فرمایا: جہاں تک معاویہ کے بعد خلافت کا تعلق ہے' تو اس بارے میں یہ کہوں گا کہ مجھے اس کی خواہش نہیں ہے۔ مالی شرائط جو تم نے پیش کی ہیں' تو معاویہ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ مسلمانوں کے مال میں سے میرے لیے کوئی وعدہ کرے۔

اس کے بعد امام نے اپنے کاتب کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ معاہدے کا متن اس طرح سے ترتیب دے:

"بسم الله الرحمن الرحيم. هذا ما اصلح عليه الحسن بن علي بن ابی طالب' معاوية بن ابی سفيان. صالحه على أن يسلم اليه ولاية أمر المسلمين على أن يعمل فيهم بكتاب الله وسنة نبيه محمد صلى الله عليه واله وسلم وسيرة الخلفاء الصالحين' وليس لمعاوية بن أبي سفيان أن يعهد لأحد من بعده عهداً' بل يكون الأمر من بعده شورى بين المسلمين' وعلى أن الناس آمنون حيث كانوا من أرض الله شامهم وعراقهم وتهامهم وحجازهم' وعلى أن أصحاب علي وشيعته آمنون على أنفسهم واموالهم ونسائهم واولادهم' وعلى معاوية بن أبي سفيان بذلك عهد الله وميثاقه وما أخذ الله على أحد من خلقه بالوفاء بما أعطى الله من نفسه' وعلى أنه لا يبغي للحسن بن علي ولا لأخيه الحسين ولا لأحد من اهل بيت النبي صلى الله عليه واله وسلم' غائلة سراً وعلانيةً ولا يخيف أحداً منهم في أفق من الافاق." (۱)

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ حسن ابن علی ابن ابیطالب اور معاویہ ابن ابی سفیان اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ حسن اس شرط پر معاویہ کو مسلمانوں پر حکومت کا حق دیتے ہیں کہ وہ اللہ کی کتاب' اسکے رسول کی سنت اور خلفائے صالحین کی سیرت پر عمل کریں گے۔ نیز معاویہ کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ اپنے بعد کسی کو اپنا ولی عہد نامزد کریں' بلکہ ان کے بعد حکومت مسلمانوں کے مشورے سے قائم ہوگی۔ اور یہ کہ اللہ کی زمین پر بسنے والے تمام انسان خواہ وہ شامی ہوں یا عراقی' حجازی ہوں یا تہامی سب معاویہ کی طرف سے امان میں رہیں گے۔ اور یہ کہ علی کے اصحاب اور ان کے شیعوں کی جان و مال اور اہل و عیال محفوظ رہیں گے۔ پس معاویہ اس امر پر اللہ سے عہد و پیمان کرتے ہیں اور اسے پورا کرنے کے لیے ایسا وعدہ کرتے ہیں جیسا اللہ نے کسی سے لیا ہو' اور اللہ نے اس پر عائد کیا ہو اور نہ حسن بن علی اور نہ ان کے بھائی حسین اور نہ اہل بیت

۱۔ الفتوح۔ ج ۴۔ ص ۱۵۸۔ ۱۶۰

نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم میں سے کسی کے خلاف اعلانیہ یا خفیہ طور پر کوئی زیادتی نہیں کریں گے اور وہ روئے زمین پر کسی بھی جگہ ہوں انہیں خوفزدہ نہیں کریں گے۔"

بلاذری کہتا ہے: معاویہ نے خود صلح نامہ تحریر کر کے حسن ابن علی کے پاس بھجوایا اور وہ یہ تھا کہ: میں آپ سے اس شرط پر صلح کرتا ہوں کہ میرے بعد خلافت آپ کی ہوگی اور یہ کہ میں آپ کے خلاف کوئی سازش نہ کروں گا اور "دارابجرد" اور "فسا" کے خراج کے علاوہ ہر سال بیت المال سے دس لاکھ درہم بھی آپ کو ادا کروں گا۔ اس متن کی محمد ابن اشعث کندی اور عبداللہ ابن عامر جیسے گواہوں نے تائید کی اور اسے تحریر کرنے کی تاریخ ربیع الثانی سن ۴۱ ہجری ہے۔

جب امام نے مذکورہ متن کا مطالعہ کیا تو فرمایا: وہ مجھے ایسی چیز کی لالچ دے رہا ہے کہ اگر مجھے اس کی تمنا ہوتی تو میں حکومت اس کے حوالے ہی نہ کرتا۔ پھر آپ نے عبداللہ بن حرث بن نوفل (بن حرث بن عبدالمطلب) کو معاویہ کے پاس بھیجا اور ان سے فرمایا: معاویہ سے کہہ دو کہ اگر لوگوں کو امان حاصل ہے تو میں اس کی بیعت کرلوں گا۔ معاویہ نے انہیں ایک سفید کاغذ دیا اور کہا: جو چاہو اس پر لکھ دو! امام حسنؑ نے وہی متن تحریر کیا جسے ہم اس سے پہلے نقل کر چکے ہیں۔ (۱) اس متن کا ذکر ابن شہر آشوب نے مناقب میں کیا ہے۔ (۲) مدائنی نے بھی عبداللہ ابن نوفل کے جانے اور جن شرائط کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں ان کا ذکر کیا ہے۔ (۳) اسی طرح ابن صباغ مالکی نے بھی ان باتوں کا ذکر کیا ہے۔ (۴)

متعدد دوسرے مصادر (sources) نے کسی خاص متن کی طرف اشارہ کیے بغیر معاویہ کے بعد امام حسنؑ کی جانشینی کی شرط کا ذکر کیا ہے۔ (۵) بعض دوسرے مصادر میں بھی دارابجرد فسا اور اہواز کے خراج یا دس لاکھ درہم سالانہ کی ادائیگی کا ذکر آیا ہے۔ (۶) اسی طرح یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایک شرط یہ بھی تھی کہ معاویہ امیر المومنین علیہ السلام پر سب و شتم نہیں کریں گے۔ (۷)

۱۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۴۱-۴۲

۲۔ المناقب۔ ج ۴۔ ص ۳۳

۳۔ شرح نہج البلاغۃ ابن ابی الحدید۔ ج ۱۶۔ ص ۲۲

۴۔ الفصول المہمہ۔ ص ۱۶۲-۱۶۳؛ عوالم العلوم۔ ج ۱۶۔ ص ۱۷۲

۵۔ ترجمۃ الامام الحسن ابن عساکر۔ ص ۱۷۲، ۱۷۸

۶۔ تاریخ الخلفاء۔ ص ۱۹۲؛ ترجمۃ الامام الحسنؑ۔ ص ۱۷۶-۱۷۷؛ اخبار الطوال۔ ص ۲۱۷-۲۱۸

۷۔ ترجمۃ الامام الحسن ابن عساکر۔ ص ۱۷۶؛ اعلام الوریٰ۔ ص ۲۰۶

یہاں ہم دو شرائط کے بارے میں دو نکات کی جانب اشارہ ضروری سمجھتے ہیں۔ ایک مالی شرط کے بارے میں اور دوسرے خلافت کی شرط کے بارے میں۔ مالی شرط' جس کا ذکر متعدد مصادر میں آیا ہے' حتیٰ بعض شیعوں نے مختلف طریقوں سے اس کی توجیہ بھی کی ہے(۱) اس کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا بنیادی طور پر تو ہم صرف اسی مذکورہ متن کو درست مانتے ہیں۔ اس بنیاد پر ہم صلح نامے میں ایسی کسی شرط کے وجود ہی کو درست نہیں سمجھتے۔ اس بارے میں ایک اہم دلیل یہ ہے کہ جب امام نے سنا کہ عبداللہ بن نوفل نے معاویہ کے سامنے اپنی طرف سے ایسی شرط رکھی ہے' تو آپ ناراض ہوئے اور فرمایا: "معاویہ مسلمانوں کے بیت المال میں سے میرے لیے کسی چیز کی ذمے داری نہیں لے سکتے۔"

ائمہ' کرام علیہم السلام کی جس سیرت اور روش سے ہم واقف ہیں' اس کی روشنی میں یہ استدلال بخوبی سمجھ میں آتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مورخین نے اس شرط کو کہاں سے اخذ کیا؟ اس سوال کا جواب گزشتہ بیان کی گئی باتوں سے واضح ہو جاتا ہے۔ ابن اعثم کی روایت میں آیا تھا کہ یہ شرط عبداللہ بن نوفل نے پیش کی تھی۔ بلاذری نے لکھا تھا کہ معاویہ نے خود کچھ شرائط لکھی تھیں اور انہی میں مالی شرط بھی پیش کی تھی۔ اس کے علاوہ' ایسا دکھائی دیتا ہے کہ امام کی شخصیت کو خراب کرنے کے لیے معاویہ کے جاسوسوں کی جانب سے افواہیں بھی پھیلائی گئی ہوں گی' جنہیں بعد میں درباری مورخین نے منتشر کر دیا ہوگا۔ گویا وہی وفد جو معاویہ کی جانب سے صلح کے بارے میں مذاکرات کے لیے ساباط مدائن آیا تھا' اسی نے مالی شرط کو پیش کیا ہوگا۔ (۲) ایک اور نکتہ جو صلح نامے میں مالی شرط کے نہ پائے جانے کی دلیل ہے' وہ یہ ہے کہ صلح کے بعد سلیمان بن صرد خزاعی نے امام حسنؑ پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ تھا کہ: آپ نے "عطایا" میں اپنے لیے کوئی حصہ کیوں نہیں رکھا۔ (۳)

معاویہ کے بعد امام حسنؑ کی جانشینی کی شرط کے بارے میں بھی اسی قسم کے استدلال موجود ہیں۔ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ صلح نامے کی بنیاد پر یہ طے پایا تھا کہ امام حسنؑ معاویہ کے جانشین ہوں گے۔ حتیٰ یہ تک کہا گیا ہے کہ اس صلح نامے

۱۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ آیت: "مَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ ... فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ" (سورۂ حشر ۵۹۔ آیت ۷) کی بنیاد پر امام کا بیت المال میں ایک حق تھا' لہٰذا اس طرح سے آپ اپنا حق حاصل کرنا چاہتے تھے' دیکھیے: بحار الانوار جلد ۴۴ صفحہ ۱۰ کا حاشیہ۔ ایک اور توجیہ یہ بھی کی گئی ہے کہ امام نے دارابجرد کا خراج جمل اور صفین کے شہیدوں کے اہل خانہ کے لیے لینا چاہا تھا۔ دیکھیے: بحار الانوار۔ ج ۴۴۔ ص ۳' عوالم العلوم۔ ج ۱۶۔ ص ۱۸۲' ۱۸۷' ۱۸۸

۲۔ تہذیب تاریخ دمشق۔ ج ۴۔ ص ۲۲۴' تذکرۃ الخواص۔ ص ۱۹۸

۳۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۴۸' بحار الانوار۔ ج ۴۴۔ ص ۲۹

میں لکھا گیا تھا کہ اگر امام حسنؑ کا انتقال ہو جائے' تو ان کے بھائی معاویہ کے جانشین ہوں گے۔(۱) اس حوالے سے بھی 'عبداللہ بن نوفل نے جو کچھ پیش کیا تھا (یا بلاذری اور کچھ دوسرے مورخین (۲) کے بقول خود معاویہ نے جس کی پیشکش کی تھی) امام حسنؑ اسے قبول کرنے پر تیار نہ ہوئے۔ اس کے مقابل' خود امام حسنؑ نے جو متن مرتب کیا تھا' اس میں معاویہ سے سرے سے ولی عہد کے تعین کا حق ہی لے لیا تھا۔ اس متن میں امامؑ کی تاکید اس بات پر تھی کہ معاویہ خلافت کے معاملے کو مسلمانوں پر چھوڑ دیں۔ معاویہ کے بارے میں امامؑ جو تصور رکھتے تھے' وہ یہ تھا کہ وہ ہر صورت میں خلافت کو موروثی بنانے کی کوشش کریں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ اس صلح نامے میں ان کے ہاتھوں کو باندھ دیا جائے۔ اگر امامؑ اپنی جانشینی کا ذکر کرتے' تو یہ خود موروثی نظام کی تائید ہو جاتی۔ مسلمانوں کے مشورے (شوریٰ المسلمین) کی تعبیر اگرچہ کسی حد تک کلی ہے' لیکن یہ خلافت کو موروثی ہونے سے بچانے کا ایک راستہ ہے۔ ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ اس قسم کی بات شیعہ عقیدے کی رو سے امامت کے بارے میں "نص" کے ہونے کے برخلاف ہے۔ اس بارے میں پہلی بات تو ہم یہ کہیں گے کہ جن لوگوں کے درمیان امامؑ زندگی گزار رہے تھے' ان کی اکثریت "نص" پر اعتقاد نہیں رکھتی تھی۔ ایسے لوگوں کے لیے اس کے علاوہ کوئی اور راستہ موجود نہ تھا۔ علاوہ ازایں' اگر شرعی جواز نص ہی سے ممکن ہو' تب بھی یہ اس اصول کے منافی نہیں ہے کہ بہرصورت معاشرے کی قیادت کے مقام پر نیز حکومتی امور کو ہاتھ میں لینے کے لیے لوگوں کا حکمراں کی قیادت کو قبول کرنا ایک بدیہی اور واضح امر ہے۔

اس صلح نامے میں چند قابلِ غور باتیں پائی جاتی ہیں:

۱۔ پہلا اہم نکتہ کتابِ خدا' سنتِ رسولؐ اور خلفائے صالح کی سیرت پر عمل ہے۔ اس مؤقف پر امامؑ کی جانب سے اصرار کی وجہ یہ تھی کہ ہر صورت میں معاویہ کو کچھ حدود کا پابند کیا جائے۔ معاویہ کی کوفہ آمد کے بعد' امامؑ نے مسجدِ کوفہ میں جو تقریر کی تھی' اُس میں بھی ان الفاظ میں اس جانب اشارہ فرمایا تھا: **انما الخليفة من سار بسيرة رسول الله وعمل بطاعته و ليس الخليفة من دان بالجور و عطّل السنن و اتخذ الدنيا أباً و اُمّاً.** (خلیفہ وہ ہے جو سیرتِ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر عمل کرے اور اس کی اطاعت کرے۔ خلیفہ وہ نہیں ہے جو ستم ڈھائے اور سنتوں کو معطل کرے اور دنیا کو ہی اپنا ماں باپ بنا لے)۔ آگے جا کر فرمایا: **وان أدري لعله فتنة لكم ومتاع الى حين.** (اور کیا معلوم' یہ تمہارے لیے آزمائش ہو اور (معاویہ کے لیے) ایک متاعِ قلیل۔ یہی

۱۔ الفتوح۔ ج۵۔ ص۱۴؛ عمدۃ الطالب۔ ص ۶۷

۲۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج۱۶۔ ص۴۱

وہ مقام ہے جہاں معاویہ امامؑ کی گفتگو پر پیچ پا ہوئے۔(۱) امامؑ نے اسی خطبے میں فرمایا تھا: معاویہ نے ایک ایسے حق پر مجھ سے نزاع کیا ہے، جو میرا تھا۔ لیکن میں نے امت کی مصلحت اور خون خرابے سے بچنے کے لیے اسے چھوڑ دیا۔(۲)

۲۔ دوسرا اہم نکتہ، امام حسن علیہ السلام کی جانب سے خلافت کے موروثی ہونے کی مخالفت تھی، جس کی طرف ہم اس سے پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔

۳۔ شیعوں کے لیے امان کا حصول، اس صلح نامے کا ایک اہم نکتہ تھا۔ ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ امامؑ نے جو پیغام مذاکرات کے آغاز ہی میں معاویہ کو ارسال کیا تھا، اس میں فرمایا تھا کہ: اگر معاویہ یہ عہد کریں کہ وہ لوگوں کو امان دیں گے، تو میں اُن کی بیعت کرلوں گا۔ بعض روایتوں میں جو عبارت آئی ہے، اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ امامؑ نے ''احمر واسود'' (ہر شخص) کے لیے امان لے لی تھی۔ شاید اس عبارت کا استعمال، اُن موالیوں کو بھی امان دینے کے لیے کیا گیا تھا، جن کا حضرت علیؑ بہت خیال رکھتے تھے۔

۴۔ امامؑ کی ایک اور شرط یہ تھی کہ معاویہ، امام حسنؑ یا آپ کے بھائی امام حسینؑ کے خلاف کوئی خفیہ یا علانیہ سازش نہیں کریں گے۔ یہ مسئلہ بھی خاص اہمیت رکھتا تھا۔

معاویہ نے کسی پیشگی شرط کے بغیر صلح نامے کو قبول کرلیا۔ اُن کی خواہش تھی کہ جس قدر جلد ہو سکے عراق پر قبضہ کرلیں۔ معاویہ (اور خود امامؑ بھی) اچھی طرح جانتے تھے کہ شرائط چاہے کچھ بھی رکھی جائیں، وہ انہیں پامال اور ایک طرف ڈال سکتے ہیں۔ معاویہ نے صلح نامے کی کسی ایک بھی شرط کی پابندی نہیں کی۔ انہوں نے نہ صرف کتابِ خدا اور سنتِ رسولؐ پر عمل نہیں کیا، بلکہ انہوں نے یزید کو اپنا ولی عہد بنا دیا۔ شیعیانِ اہلِ بیتؑ کا امن و سکون چھین لیا اور ''زیاد'' اور دوسرے ظالموں کو اُن پر مسلط کردیا۔ حصین بن منذر کہا کرتے تھے کہ: معاویہ نے حسنؑ کے ساتھ کی گئی کسی شرط پر عمل نہیں کیا۔ انہوں نے حجر اور اُن کے ساتھیوں کو قتل کیا، اپنے بیٹے کو اپنا جانشین بنا دیا، خلافت کو شوریٰ کے حوالے نہیں کیا اور حسنؑ کو زہر بھی دیا۔(۳)

خود معاویہ جب کوفہ آئے تو کہا: الا انی کنت شرطت شروطاً اردت بها الألفة ووضع الحرب، الا

۱۔ ترجمۃ الامام الحسن ابن سعد۔ ص ۱۷۱۔۱۷۲

۲۔ ذخائر العقبیٰ۔ ص ۱۴۰، النظم درر السمطین۔ ص ۲۰۰۔۲۰۱، بحار الانوار۔ ج ۴۴۔ ص ۳۲، المحاسن والمساوی۔ ج ۱۔ ص ۵۳، ترجمۃ الامام الحسن ابن سعد۔ ص ۱۷۳، انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۴۳

۳۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۴۷۔۴۸

وانها تحت قدمي. (یاد رکھو! میں نے یہ شرائط جنگ روکنے اور لوگوں کو اکٹھا کرنے کے لیے قبول کی تھیں۔ خبردار! اب میں ان شرائط کو اپنے پیروں تلے روندتا ہوں)۔ (۱) ایک اور عبارت میں اس طرح نقل ہوا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے تم سے اس لیے جنگ نہیں کی تھی کہ تم لوگ نماز پڑھو، روزہ رکھو، حج بجالاؤ یا زکات ادا کرو، بلکہ اس لیے جنگ کی تھی کہ تم پر حکومت کروں۔ اور خدا نے مجھے یہ عطا کر دی ہے، حالانکہ تم اسے ناپسند کرتے تھے۔ (۲)

اہلِ بصرہ کا ایک گروہ ''حمران بن ابان'' کی قیادت میں معاویہ کے خلاف شورش کرنا چاہتا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کو امام حسینؑ کی بیعت کی دعوت دیتا تھا۔ معاویہ نے عمرو بن ارطاۃ یا اس کے بھائی بُسر کو ان کی سرکوبی کے لیے بصرہ بھیجا۔ (۳) اس طرح معاویہ کو عراق پر غلبہ حاصل ہو گیا۔ انہوں نے کوفہ کی حکومت مغیرۃ بن شعبہ کے حوالے کی، جو ان کے بعد نو سال تک اس شہر پر حاکم رہا۔ بصرہ عبداللہ بن عامر کے سپرد کیا گیا جو اس سے پہلے بھی معاویہ کی جانب سے وہاں حکومت کیا کرتا تھا۔

امام حسن علیہ السلام کی خلافت کا آغاز سن چالیس ہجری کے ماہِ رمضان میں ہوا اور سات مہینے بعد ربیع الثانی اکتالیس ہجری میں اختتام پذیر ہوئی۔ (۴)

کچھ باتیں امام حسن مجتبیٰ کے بارے میں

امام حسن علیہ السلام کی ولادت پندرہ رمضان المبارک سن تین ہجری کو ہوئی۔ آپ اپنے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت زیادہ شباہت رکھتے تھے۔ (۵) اپنے والدِ گرامی کی شہادت کے بعد آپ نے شیعوں کی قیادت کی ذمے داری سنبھالی۔ ''ابی رزین'' سے منقول ہے کہ امام حسن علیہ السلام ہمیں اس حال میں خطبہ دے رہے تھے کہ آپ سیاہ لباس زیبِ تن کیے ہوئے تھے اور آپ کے سر پر سیاہ عمامہ تھا۔ (۶) امام حسنؑ ایک ممتاز اخلاقی شخصیت ہیں جن کی رفتار و کردار راہِ ہدایت کو روشن کرتی ہے۔ ہم اس سے پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعدد کلمات میں اپنے فرزند امام حسنؑ کے ساتھ اپنی بے پناہ محبت کا ذکر کیا ہے، اور دوسروں سے بھی کہا ہے کہ وہ ان سے محبت کریں۔

۱۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۴۴۔ ۴۶، الفتوح۔ ج ۴۔ ص ۱۶۳، شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۱۶۔ ص ۴۶

۲۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۱۶۔ ص ۴۶

۳۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۵۲، الفتوح۔ ج ۴۔ ص ۱۶۸

۴۔ دیکھئے: انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۵۴

۵۔ ترجمۃ الامام الحسن ابن سعد۔ ص ۱۳۰۔ ۱۳۱

۶۔ ایضاً ابن سعد۔ ص ۱۶۳

"اللھم انی قد احببته فاحبّه و احبّ من یحبه" (بارالہا! میں ان سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان سے محبت فرما اور جو کوئی ان سے محبت کرتا ہے اس سے بھی محبت فرما)۔(۱) "من احبّنی فلیحبه، ولیبلغ الشاهد منکم الغائب." (جو کوئی مجھ سے محبت کرتا ہے اُسے چاہیے کہ ان سے بھی محبت کرے)۔(۲) "من احب الحسن و الحسین فقد احبنی، و من ابغضهما فقد ابغضنی." (جس نے حسن اور حسین سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا اس نے مجھ سے عداوت کی)۔(۳) "من سرّہ ان ینظر الی سید شباب اهل الجنة فلینظر الی الحسن بن علی." (جو کوئی اہل جنت کے سردار کو دیکھ کر مسرور ہونا چاہتا ہے اُسے چاہیے کہ حسن ابن علی کو دیکھے)۔(۴) یہ جملات ان جملوں کا ایک نمونہ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اس فرزند کے بارے میں فرمائے ہیں۔

امام حسن علیہ السلام کی عبادی خصوصیات کے بارے میں بھی کچھ باتیں نقل ہوئی ہیں ان ہی باتوں میں سے آپ کے متعدد پاپیادہ حج ہیں جن کے بارے میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا: انی لأستحی من ربی أن ألقاه ولم أمش الی بیته فمشی عشرین مرة من المدینة علی رجلیه. (مجھے خدا سے اس بات پر شرم محسوس ہوتی ہے کہ میں اُس سے اس حال میں ملاقات کروں کہ اس کے گھر پیدل چل کر نہ گیا ہوں)۔ لہٰذا آپ بیس مرتبہ پیدل مدینہ سے خانۂ خدا کی زیارت کو گئے۔(۵) ایک اور روایت میں آیا ہے کہ آپ نے پچیس مرتبہ حج کا سفر پیدل کیا۔(۶) ابن سعد نے پندرہ مرتبہ لکھا ہے۔(۷)

امامؑ کی ایک اور اخلاقی خصوصیت خدا کی راہ میں آپ کی سخاوت تھی جس کا چرچا خاص و عام کی زبان پر تھا۔ جب اسماعیل بن یسار، عبداللہ بن انس کے ہمراہ پیسے لینے کے لیے معاویہ کے پاس شام گئے اور انہیں کچھ نہ ملا تو اسماعیل نے ایک شعر کے ذریعے اپنے دوست ابن انس سے خطاب کر کے کہا:

۱۔ ترجمۃ الامام الحسن ابن سعد۔ ص ۱۳۹، سنن ترمذی۔ ج ۵۔ ص ۲۶۱

۲۔ ترجمۃ الامام الحسن ابن سعد۔ ص ۱۳۸، مسند احمد۔ ج ۵۔ ص ۳۶۶، مستدرک۔ ج ۳۔ ص ۱۷۳

۳۔ ترجمۃ الامام الحسن ابن سعد۔ ص ۱۳۸، ۱۴۳، مسند طیالسی۔ ش ۲۵۰۲، مسند احمد۔ ج ۲۔ ص ۴۴۰، المستدرک۔ ج ۳۔ ص ۱۶۶

۴۔ ترجمۃ الامام الحسن ابن سعد۔ ص ۱۳۸، البدایہ والنہایہ۔ ج ۸۔ ص ۳۵

۵۔ اخبار اصبہان۔ ج ۱۔ ص ۴۴

۶۔ تاریخ الخلفاء۔ ص ۷۳

۷۔ ترجمۃ الامام الحسن ابن سعد۔ ص ۱۵۹

لعمرک ما الی حسن رحلنا ولا زرنا حسینا یابن انس (۱)

''اے ابن انس! تیری جان کی قسم ہم حسنؑ کے پاس نہیں گئے اور نہ حسینؑ سے ملاقات کی۔''

ان کا مقصد یہ تھا کہ ان دو بھائیوں کی زیارت پر جانے سے زائر خالی ہاتھ نہیں پلٹتا۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ ایک شخص امام حسنؑ کی خدمت میں آیا اور اپنی ضرورت کا اظہار کیا۔ امامؑ نے اس سے فرمایا: اپنی ضروریات لکھوا اور مجھے دے دو۔ جب وہ لکھ کر لایا تو امامؑ نے اس کی ضرورت سے دوگنا عطا کیا۔ (۲) ایک اور روایت میں آیا ہے کہ امامؑ نے اپنی زندگی میں تین مرتبہ اپنے تمام مال کا نصف حصہ راہ خدا میں دیا۔ (۳) ابو ہارون کہتا ہے: ہم سفر حج کے دوران مدینہ گئے۔ سوچا کہ فرزند رسولؐ سے بھی ملاقات کرلیں اور انہیں سلام عرض کریں۔ ہم آنجناب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے سفر کے بارے میں بتایا۔ جب ہم واپس آ گئے تو آپ نے ہم میں سے ہر ایک کے لیے چار سو بھجوائے۔ ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہمارے حالات اچھے ہیں (ہمیں اس مال کی ضرورت نہیں)۔ آپ نے فرمایا: لا تردوا علیّ معروفی. (میری نیکی مجھے واپس نہ کرو)۔ (۴)

امام حسن علیہ السلام سے کہا گیا: فیک عظمة. (آپ صاحب عظمت ہیں)۔ امامؑ نے فرمایا: لا بل عزة. قال اللّٰہ تعالیٰ: وَ لِلّٰہِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ. (یہ عظمت نہیں بلکہ عزت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: عزت خدا اس کے نبی اور مومنین کے لیے ہے)۔ (۵)

امامؑ جو صلح کے بعد آٹھ نو سال تک مدینہ میں رہے، حج کے لیے حجاز آنے والے کوفہ کے شیعوں سے باقاعدہ ملاقاتیں کیا کرتے تھے۔ قدرتی بات ہے کہ یہ لوگ آپ کو اپنا امام مانتے تھے اور اپنے دینی امور میں آپ سے استفادہ کیا کرتے تھے۔

ایک شامی کہتا ہے: ایک دن میں نے مدینہ میں ایک ایسے شخص کو دیکھا جس کا چہرہ باوقار اور انتہائی خوبصورت تھا، اسکے بدن کا لباس انتہائی مناسب اور آراستہ تھا اور جو گھوڑے پر سوار تھا۔ میں نے اس کے بارے میں پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ حسن ابن علی ابن ابیطالبؑ ہیں۔ یہ سن کر میرا پورا وجود غصے کی آگ میں جلنے لگا اور علی ابن ابی طالبؑ پر حسد

۱۔ الاغانی۔ ج ۳۔ ص ۳۱۹

۲۔ المحاسن والمساوی۔ ص ۵۵

۳۔ ترجمۃ الامام الحسن ابن سعد۔ ص ۱۵۹، تاریخ الخلفاء۔ ص ۷۳، تذکرۃ الخواص۔ ص ۱۹۶

۴۔ ترجمۃ الامام الحسن ابن سعد۔ ص ۱۵۵

۵۔ ربیع الابرار۔ ج ۳۔ ص ۱۷۷

کرنے لگا کہ کیسے ان کا ایک ایسا بیٹا ہے۔ میں ان کے نزدیک گیا اور پوچھا کہ کیا آپ علی کے بیٹے ہیں؟ جب انہوں نے تائید کی تو میرے منہ سے ان کی طرف سب وشتم کے شعلے برسنے لگے۔ جب میں برا بھلا کہہ چکا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا: کیا تم مسافر ہو؟ میں نے کہا: ہاں۔ فرمایا: میرے ساتھ آؤ۔ اگر تمہارے پاس رہائش نہیں ہے تو میں تمہیں رہائش دوں گا' اگر پیسہ نہیں ہے تو میں تمہاری مدد کروں گا اور اگر تمہاری کوئی ضرورت ہے تو میں تمہاری یہ ضرورت پوری کروں گا۔ (اس کے بعد) میں ان سے اس طرح جدا ہوا کہ روئے زمین پر مجھے ان سے بڑھ کر کوئی محبوب نہ تھا۔(۱)

امام حسنؑ کی شہادت

معاویہ کا ایک اور ناقابلِ بخشش جرم' باغ نبوت کے پھول امام حسن علیہ السلام کو شہید کرنا ہے۔ تاریخی اعتبار سے اس میں معمولی سے بھی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ معاویہ نے ایک سازشی منصوبے کے ذریعے امامؑ کو ان کی زوجہ جعدہ بنت اشعث بن قیس کے ذریعے شہید کرایا۔ جب سن تریسٹھ ہجری میں واقعۂ حرہ میں مدینہ تاراج ہوا' تو اس عورت کا گھر بھی لوٹ لیا گیا۔ لیکن اس خدمت کی بنا پر جو اس نے اپنے شوہر امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو قتل کر کے انجام دی تھی' اس کا مال اس کو واپس کر دیا گیا۔ بے شمار مصادر نے معاویہ کی سازش سے جعدہ بنت اشعث کے ذریعے امامؑ کی شہادت کا ذکر کیا ہے۔(۲) ہیثم بن عدی نے کہا ہے کہ معاویہ کے اکسانے اور سہیل بن عمرو کی بیٹی کے توسط سے حسنؑ کو زہر دیا گیا تھا۔(۳) آپ زہر خورانی کے بعد چالیس دن تک بیمار رہے' یہاں تک کہ آپ نے شہادت پائی۔(۴) ام بکر بنت مسور کہتی ہے: امامؑ کو کئی بار زہر دیا گیا تھا۔ ہر مرتبہ آپ اس سے بچ جاتے تھے' یہاں تک کہ آخری مرتبہ زہر اتنا شدید تھا کہ امامؑ کے جگر کے ٹکڑے حلق کے راستے باہر آنے لگے تھے۔(۵)

امامؑ کی شہادت کے بعد' آپ کی وصیت کے مطابق' آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر کے نزدیک دفن

۱۔ الکامل فی الادب۔ ج ۱۔ ص ۲۳۵

۲۔ ترجمۃ الامام الحسن ابن سعد۔ ص ۱۷۵۔۱۷۶' انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۸۸'۵۵۔ استاد محمودی نے مذکورہ صفحات کے حاشیے میں اس خبر کو متعدد منابع سے نقل کیا ہے۔ جبکہ ابن خلدون فرقہ وارانہ تعصب برتتے ہوئے ان تمام تاریخی شواہد کے برخلاف کہتا ہے کہ: "وحاشا لمعاویہ ذلک" (معاویہ ایسا نہیں کر سکتے) تاریخ ابن خلدون۔ ج ۲۔ ق ۲۔ ص ۱۸

۳۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۵۹

۴۔ ترجمۃ الامام الحسن ابن سعد۔ ص ۱۷۶

۵۔ المنتخب من ذیل المذیل۔ ص ۵۱۴

کرنا چاہتے تھے لیکن حضرت عائشہ نے یہ کہہ کر کہ یہ میرا گھر ہے اور میں انہیں دفن کرنے کی اجازت نہیں دیتی' (۱) اس کام میں رکاوٹ ڈال دی۔ مروان نے بھی اعلان کر دیا کہ وہ اس کام کی اجازت نہیں دے گا۔

امام حسن علیہ السلام نے وصیت کی تھی کہ اگر کوئی مسئلہ پیدا ہو جائے تو انہیں بقیع میں اپنی مادر گرامی کے نزدیک دفن کر دیا جائے۔ (۲) حضرت عائشہ نے ایک بار پھر فاطمہ زہرا علیہا السلام اور ان کی اولاد کے ساتھ اپنی عداوت کا مظاہرہ کیا۔ لہٰذا جب امامؑ کو دفن کرنے کے لیے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر کے نزدیک لے گئے' تو حضرت عائشہ نے کہا: ھذا الامر لایکون ابداً (ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا)۔ (۳) ابو سعید خدری اور ابو ہریرہ نے مروان سے کہا: کیا حسنؑ کو ان کے نانا کے پہلو میں دفن ہونے سے روکتے ہو' حالانکہ رسول اللہؐ نے انہیں جوانانِ جنت کا سردار کہا ہے۔ مروان نے ان کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا: اگر تم جیسے لوگ حدیث رسول کی روایت نہ کرتے تو وہ ضائع ہو چکی ہوتی۔ (۴)

محمد بن حنفیہ کہتے ہیں: جب امام حسن علیہ السلام نے وفات پائی' تو پورے مدینہ پر غم کے بادل چھا گئے اور سب لوگ رو رہے تھے۔ مروان نے امامؑ کی وفات کی خبر معاویہ کو بھجوائی اور کہا: وہ لوگ حسنؑ کو نبیؐ کے پہلو میں دفن کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جب تک میں زندہ ہوں وہ اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوں گے۔ امام حسینؑ قبرِ رسولؐ کے نزدیک آئے اور فرمایا: اس جگہ کو کھودو۔ سعید بن عاص جو مدینہ کا حاکم تھا' اس نے اپنے آپ کو دور کر لیا۔ لیکن مروان نے بنی امیہ کو آمادہ کر کے مسلح کر دیا۔ مروان نے کہا: یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ امام حسینؑ نے فرمایا: تیرا اس سے کیا تعلق؟ کیا تو والیٔ شہر ہے؟ مروان نے کہا: نہیں! لیکن جب تک میں زندہ ہوں اس کام کی اجازت نہیں دوں گا۔ امام حسینؑ نے ان لوگوں سے مدد طلب کی جو حلف الفضول میں بنی ہاشم کے ساتھ تھے۔

اس موقع پر بنی تیم' بنی زہرہ' بنی اسد اور بنی جعونہ کے کچھ لوگ مسلح ہو گئے۔ امام حسینؑ کے ہاتھ میں پرچم تھا اور مروان کے ہاتھ میں بھی۔ ان کے درمیان تیر اندازی بھی ہوئی۔ بہر صورت کچھ لوگوں نے امام حسینؑ سے درخواست کی کہ

۱۔ تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۲۲۵۔ حضرت عائشہ اس حال میں کہ خچر پر سوار تھیں آگے آئیں اور یہ بات کہی۔ یعقوبی کی روایت کے مطابق (اس موقع پر) قاسم بن محمد بن ابی بکر ان کے پاس آئے اور کہا یا عمة ما غسلنا رؤوسنا من یوم الجمل الاحمر' اترید ین ان یقال یوم البغلة الشہباء" (اے پھوپھی! ابھی ہم نے سرخ اونٹ پر بیٹھنے سے اپنے سر نہیں دھوئے ہیں۔ اب آپ چاہتی ہیں کہ ایک دن خچر کا بھی مشہور ہو جائے۔ اس وقت عائشہ لوٹ گئیں)

۲۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۶۱' ۶۴' نیز صفحہ ۶۱ اور ۶۲ کا حاشیہ بھی دیکھیے۔

۳۔ ترجمۃ الامام الحسنؑ ابن سعد۔ ص ۱۸۳

۴۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۶۵' اسی کی مانند ترجمۃ الامام الحسنؑ ابن سعد صفحہ ۱۸۴ اور ۱۸۵ میں بھی ہے۔

آپ اپنے بھائی کی وصیت کی خاطر جنہوں نے فرمایا تھا کہ اگر خون خرابے کا خطرہ ہو تو مجھے بقیع میں میری ماں کے پہلو میں دفن کردینا' اس امر پر اصرار نہ کریں۔(۱) ایک اور روایت میں آیا ہے کہ مروان' جو اس زمانے میں معزول تھا' اپنے اس اقدام کے ذریعے معاویہ کو خوش کرنا چاہتا تھا۔(۲) مروان نے پیغمبرؐ کے پہلو میں امام حسنؑ کو دفن ہونے سے روکنے کے بعد یہ خبر بڑی آب وتاب کے ساتھ معاویہ کو لکھ کر بھیجی۔(۳) وہ کہتا تھا: کیسے عثمان کے قاتل کا بیٹا پیغمبرؐ کے پہلو میں دفن ہو' جبکہ عثمان بقیع میں؟(۴) بے شک مروان بنی امیہ میں سے بدترین انسان تھا' جو مدینہ میں اپنی حکومت کی پوری مدت کے دوران اپنے سخت لہجے اور گندی زبان سے حضرت علی اور بنی ہاشم کو برا بھلا کہتا رہا۔

ایک روایت کے مطابق امام حسن علیہ السلام کی شہادت ربیع الاوّل ۴۹ ہجری میں اور دوسری روایت کے مطابق ربیع الاوّل ۵۰ ہجری میں واقع ہوئی۔(۵)

ہمیں ۴۹ ہجری ہی درست معلوم دیتی ہے۔ جب امام حسن علیہ السلام شہید ہوئے' تو بنی ہاشم نے انصار کو اس خبر سے مطلع کرنے کے لیے مدینہ کے مختلف مقامات اور اطراف میں افراد کو روانہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ سب لوگ اپنے گھروں سے نکل پڑے۔(۶) بنی ہاشم کی عورتیں ایک مہینے تک روزانہ ان کے لیے مجلسِ عزا برپا کرتی رہیں۔(۷) طبری نے امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ اہلِ مدینہ نے سات دن فرزندِ رسول کی وفات پر سوگ منایا اور بازار بند رکھے۔(۸) وہ کہتا ہے: بقیع میں امام کی تدفین کے موقع پر لوگوں کا ایسا ازدحام تھا کہ اگر اوپر سے سوئی پھینکی جاتی' تو وہ زمین پر نہیں پہنچتی۔(۹) بصرہ میں بھی آپ کی شہادت کی خبر نے اس شہر کے شیعوں کو غمگین کر دیا۔(۱۰)

۱۔ ترجمۃ الامام الحسنؑ ابن سعد۔ ص ۱۷۷۔ ۱۷۹

۲۔ ایضاً۔ ص ۱۸۰ اور دیکھیے: ص ۱۸۷

۳۔ ایضاً۔ ص ۱۸۸

۴۔ ایضاً۔ ص ۱۸۳۔ حضرت عثمان بقیع میں دفن نہیں ہو سکے تھے' اس لیے کہ لوگوں نے اس بات کی اجازت نہیں دی تھی۔

۵۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۶۶' ترجمۃ الامام الحسنؑ ابن سعد۔ ۱۸۳' ۱۸۹' ۱۹۰

۶۔ ترجمۃ الامام الحسنؑ ابن سعد۔ ص ۱۸۱' ترجمۃ الامام الحسنؑ ابن عساکر۔ ص ۳۷۱

۷۔ ترجمۃ الامام الحسنؑ ابن سعد۔ ص ۱۸۲' ترجمۃ الامام الحسنؑ ابن عساکر۔ ص ۳۳۸

۸۔ ترجمۃ الامام الحسنؑ ابن سعد۔ ص ۱۸۲

۹۔ المنتخب من ذیل المذیل۔ ص ۵۱۴' المستدرک علی الصحیحین۔ ج ۳۔ ص ۱۷۳' ترجمۃ الامام الحسنؑ ابن سعد۔ ص ۱۸۲' ترجمۃ الامام الحسنؑ ابن عساکر۔ ص ۳۷۲

۱۰۔ مختصر تاریخ دمشق۔ ج ۵۔ ص ۳۲۳

امام حسن علیہ السلام کی وفات کے بعد کوفہ کے شیعوں نے امام حسینؑ کو تعزیتی خط ارسال کیا۔ اس خط میں تحریر تھا کہ امامؑ کی وفات ایک طرف تو پوری امت کے لیے اور دوسری جانب آپ کے لیے اور وھذہ الشیعة خاصة۔ (یہ خاص طور پر شیعوں کے لیے ایک بڑی مصیبت ہے)۔ یہ تعبیر پچاس ہجری کے آس پاس "شیعہ" گروہ کی تشکیل، حتیٰ لفظ شیعہ کے ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کی نشاندہی کرتی ہے۔ انہوں نے اپنے اس خط میں امام حسن علیہ السلام کا ذکر ان القاب کے ساتھ کیا: "علم الھدیٰ و نور البلاد" ایسا شخص جس سے اقامۂ دین اور سیرتِ صالحین کے اعادے کی امید ہے۔ انہوں نے اس امید کا اظہار بھی کیا کہ اللہ امام حسینؑ کو ان کا حق واپس لوٹائے گا۔ (۱) اس خط کو کوفہ میں اعتقادی اور امامتی شیعیت کی تشکیل کی ایک سند سمجھنا چاہیے۔

عمرو بن بعجہ کہتا ہے: امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی وفات عرب پر آنے والی سب سے پہلی ذلت تھی۔ (۲)

☆☆☆

۱۔ تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۲۲۸

۲۔ ترجمۃ الامام الحسن ابن سعد۔ ص ۱۸۳

امام حسین علیہ السلام

امام حسینؑ نے فرمایا: ''انا أهل بيت النبوة و معدن الرسالة و مختلف الملائكة و مهبط الرحمة و بنا فتح الله و بنا يختم.''

''ہم اہلِ بیتِ نبوت، معدنِ رسالت، فرشتوں کی رفت و آمد کا مقام اور نزولِ رحمت کی منزل ہیں۔ اللہ نے ہم ہی سے ابتدا کی ہے اور ہم ہی پر اختتام کرے گا۔''

(الفتوح۔ ج۵۔ ص۱۷)

امام حسینؑ کربلا سے پہلے

امام حسین علیہ السلام کی صفات و خصوصیات کے بارے میں بہت زیادہ گفتگو کی گئی ہے۔ ہم بھی خیر و برکت کی خاطر امامؑ کے بعض خصائل کی جانب اشارہ کریں گے۔

یہ عظیم امامؑ تین شعبان (۱) سن چار ہجری (۲) کو اس دنیا میں تشریف لائے۔ اپنے نانا رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ گزارے ہوئے ایامِ حیات میں آپ ان کے ساتھ ساتھ رہا کرتے تھے' حتیٰ نماز کے وقت بھی آپ اُن سے جدا نہیں ہوتے تھے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی آپ اور آپ کے بھائی کے ساتھ شدید اظہارِ محبت کیا کرتے تھے اور ان کے بارے میں اپنے ارشادات کے ذریعے اپنے اصحاب کے سامنے ان کے بعض فضائل کا تذکرہ فرماتے تھے۔ آج بھی احادیث کی کتابوں میں امام حسینؑ کے بکثرت فضائل منقول ہیں' جن میں سے بہت سے مثلاً "الحسن و الحسین سید الشباب اھل الجنة." (حسن اور حسین جوانانِ جنت کے سردار ہیں) متواتر ہیں' یا کثرت سے نقل ہوئے ہیں۔ حسنؑ اور حسینؑ سے رسولِ کریم کی محبت تمام اصحاب کے لیے واضح تھی اور جیسا کہ امام حسنؑ کے بارے میں گزر چکا ہے کہ پیغمبر اکرم کوشش کیا کرتے تھے کہ لوگوں کو ان دو اماموں سے اپنی محبت کے بارے میں آگاہ کریں۔ حتیٰ آپ فرماتے تھے: "من احبنی فلیحب ھذین." (خدایا! جو ان کو دوست رکھے تو ان کو دوست رکھ)۔ (۳) اور فرمایا: "من احبّ الحسن و الحسین فقد أحبنی و من ابغضھما فقد أبغضنی." (جس نے حسن اور حسین

۱۔ مسار الشیعہ۔ ص ۷'۳۲ مصباح المتہجد۔ ص ۵۸'۷ ابو الفرج اصفہانی (مقاتل الطالبین۔ ص ۵۱) اور شیخ مفید نے کتاب "ارشاد" صفحہ ۲۱۸ پر آپ کی ولادت کا دن پانچ شعبان تحریر کیا ہے۔

۲۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ کچھ لوگوں نے امام حسنؑ کی ولادت سن ۲ ہجری قرار دی ہے' جس کے نتیجے میں امام حسینؑ کی ولادت سن ۳ ہجری میں ماننا پڑے گا۔ کلینی (کافی۔ ج ۱۔ ص ۴۶۳) اور شیخ طوسی (التہذیب۔ ج ۶۔ ص ۴۱) کا بھی یہی خیال ہے۔

۳۔ ترجمۃ الامام الحسین ابن سعد۔ ص ۱۳۵

سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے ان دونوں سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھا)۔(۱) آنحضرتؐ نے ان دو بھائیوں کے بارے میں فرمایا: "هما ریحانی من الدنیا." (یہ دونوں دنیا میں میرے پھول ہیں)(۲) امام حسینؑ کے بارے میں کئی مخصوص فضائل بھی نقل ہوئے ہیں جن میں سے مشہور ترین یہ روایت ہے: "حسین منی و انا من حسین." (حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں)۔(۳)

یحییٰ بن سالم موصلی جو امام حسین علیہ السلام کا ایک موالی تھا، کہتا ہے: ہم امامؑ کے ساتھ جا رہے تھے کہ آپ ایک گھر کے دروازے پر پہنچے اور پانی طلب فرمایا۔ ایک کنیز پانی سے بھرا برتن لے کر باہر آئی۔ امامؑ نے پانی نوش کرنے سے پہلے ایک چاندی (کا سکہ) نکال کر اسے دیا اور فرمایا: یہ اپنے مالک کو دے دو اور اسکے بعد پانی نوش فرمایا۔(۴)

ابوبکر بن محمد بن حزم کہتا ہے: امام حسین علیہ السلام ایک چبوترے کے پاس سے گزر رہے تھے کہ آپ نے دیکھا کہ کچھ فقیر وہاں کھانا کھانے میں مشغول ہیں۔ ان فقیروں نے آپ کو اپنے ساتھ کھانا کھانے کی دعوت دی۔ امامؑ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ پھر نیچے اترے اور ان کے ساتھ کھانا تناول فرمایا۔ اس کے بعد ان سے فرمایا: تم نے مجھے دعوت دی اور میں نے قبول کی اب میں تمہیں دعوت دیتا ہوں اور تم قبول کرو۔ اس کے بعد آپ نے رباب کی طرف رخ کر کے فرمایا: جو کچھ تیار کیا ہے لے آؤ۔(۵)

امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ امام حسینؑ حج کا سفر پا پیادہ کیا کرتے تھے اور آپ کی سواری کے جانور آپ کے پیچھے پیچھے چلا کرتے تھے۔(۶)

امام حسینؑ جنگ جمل، جنگ صفین اور جنگ نہروان میں موجود تھے اور اپنے بابا کے ہمراہ عہد توڑنے والوں اور ستم کاروں کے خلاف برسر پیکار تھے۔ جنگ صفین کے موقع پر آپ کا ایک خطبہ بھی نقل ہوا ہے جس میں آپ نے لوگوں کو جنگ کی ترغیب دی تھی۔(۷) امام حسینؑ جنگ صفین کے ابتدائی مرحلے میں شامیوں کے قبضے سے پانی کا گھاٹ چھڑانے

۱۔ ترجمۃ الامام الحسین ابن سعد۔ ص ۱۳۶

۲۔ ایضاً۔ ص ۱۳۱

۳۔ ایضاً۔ ص ۱۲۷۔ ان دو عظیم ائمہ کے فضائل جاننے کے لیے گرانقدر کتاب "فرائد السمطین" کا مطالعہ کیجیے۔ ابھی حال ہی میں شائع ہونے والی کتابوں میں سے کتاب "فضائل الخمسہ فی صحاح الستہ" میں اہل بیتؑ کے فضائل کو اہل سنت کی مشہور کتابوں سے اکٹھا کر کے پیش کیا گیا ہے۔

۴۔ ترجمۃ الامام الحسین ابن سعد۔ ص ۱۳۶

۵۔ ایضاً۔ ص ۱۳۹

۶۔ ایضاً۔ ص ۱۳۵

۷۔ بحار الانوار۔ ج ۳۲۔ ص ۴۰۵

کی کارروائی میں شریک تھے۔ اس کامیابی کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا تھا: "هذا اوّل فتح ببركة الحسين." (یہ پہلی فتح حسین کی برکت سے ہوئی ہے)۔(۱) جب عبیداللہ ابن عمر نے صفین میں امام کو آواز دے کر کہا کہ آپ کے والد نے قریش کے ساتھ ایسا ایسا کیا ہے، تو امام نے اس پر قاسطین کی پیروی کا الزام لگاتے ہوئے فرمایا کہ انہوں نے مجبوراً اسلام قبول کیا تھا لیکن دراصل مسلمان نہیں ہوئے ہیں۔(۲)

امام حسین علیہ السلام اپنے بھائی کے دورِ امامت میں مکمل طور پر ان کی سیاست کی حمایت کرتے تھے۔ آپ نے عراقیوں کی طرف سے کوفہ تشریف لے آنے کی مسلسل درخواستوں کو مسترد کر دیا۔ یہاں تک کہ اپنے بھائی کی شہادت کے بعد بھی آپ اہلِ عراق کی رائے ماننے پر تیار نہ ہوئے، اور فرمایا: جب تک معاویہ زندہ ہے، کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ امام نے دس سال تک مجبوراً معاویہ کی حکومت کو برداشت کیا تھا۔ یہ امام حسینؑ کے سیاسی موقف کا وہ اہم نکتہ ہے، جس کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ہم امام حسینؑ کو زیادہ تر کربلا میں ان کے انقلابی اقدام ہی کی وجہ سے پہچانتے ہیں۔

امام حسین علیہ السلام اور معاویہ کے درمیان روابط اور مختلف مواقع پر ہونے والی گفتگوئیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ امامؑ نے سیاسی اعتبار سے معاویہ کی حکومت کو قطعی طور پر قانونی تسلیم نہیں کیا۔ اس کی ایک اہم ترین دلیل معاویہ کے نام امام کا ایک تفصیلی خط ہے، جس میں اور دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ شیعیانِ علیؑ پر معاویہ کے ظلم و ستم کے بارے میں متعدد حقائق کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ امامؑ نے اس خط میں معاویہ کو لکھا: میں تمہارے خلاف جنگ، اور تمہاری مخالفت کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اسکے بعد فرمایا:

> "وأيم اللّٰه لقد تركت ذلك وأنا أخاف اللّٰه في تركه وما أظن اللّٰه راضياً مني بترك محاكمتك اليه ولا عاذري دون الاعتذار اليه فيك وفي اولیائك القاسطين الملحدين حزب الظالمين وأولياء الشياطين ... أولست قاتل حجر بن عدى وأصحابه المصلين العابدين الذين ينكرون الظلم ويستعظمون البدع ولا يخافون لومة لائم، ظلماً وعدواناً بعد اعطائهم الأمان بالمواثيق والأيمان المغلظة، أولستَ قاتل عمرو بن الحمِق الخزاعي، صاحب رسول اللّٰه الذى أبلته العبادة وصفرت لونه وانحلت جسمه... أولستَ المدعي زياد بن سمية المولود على فراش عبيد عبد

۱۔ بحار الانوار۔ ج ۴۴۔ ص ۲۶۶

۲۔ الفتوح۔ ج ۳۔ ص ۳۵

ثقیف وزعمت أنه ابن أبیک وقد قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه واله وسلم: الولد للفراش وللعاهر الحجر' فترکت سنة رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه واله وسلم وخالفت أمره متعمدًا واتّبعت هواک مکذبًا بغیرهدی من اللّٰہ ثم سلطه علی العراقین فقطع أیدی المسلمین وسمل اعینهم وصلبهم علی جذوع النخل' أولست صاحب الحضرمیین الذی کتب الیک ابن سمیّه أنهم علی دین علی' فکتبت الیه' اُقتل من کان علی دین علی ورأیه' فقتلهم ومثل بهم بأمرک: ودین علی' دین محمد صلی اللّٰہ علیه واله وسلم الذی کان یضرب علیه أباک والذی انتحالک ایاه اجلسک مجلسک هذا ولو لا هموا (۱) کان أفضل شرفک تجشم الرحلتین فی طلب الخمور... فلا أعلم لنفسی ودینی أفضل من جهادک' فان أفعله فهو قربة الی ربی وان أترکه فذنب استغفر اللّٰہ منه فی کثیر من تقصیری... فابشرْ یا معاویة بالقصاص وأیقن بالحساب واعلم انّ للّٰہ کتاب لایغادر صغیرة ولا کبیرة الا أحصاها ولیس اللّٰہ بناسٍ لک أخذک بالظّنة وقتلک أولیائه علی الشبهة والتهمة وأخذک الناس بالبیعه لابنک غلام سفه یشرب الشراب ویلعب بالکلاب ولا أعلمک الاقد خسرت نفسک وأوبقت دینک وأکلت أمانتک وغششت رعیتک وتبوأت مقعدک النار فبعداً لقوم الظالمین." (۲)

"خدا کی قسم! میں نے تمہارے خلاف جنگ کو ترک کیا ہے' جبکہ میں اس بارے میں خدا سے ڈرتا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ تمہارے اور ملحدوں' ظالم اور شیطان کے دوستوں کے محاکے کو ترک کرنے پر خدا مجھ سے راضی ہوگا۔ کیا تم وہی نہیں ہو جس نے ظلم و ستم سے حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر ڈالا کہ جنہوں نے ظلم کے خاتمے اور بدعتوں کی مخالفت کے لیے قیام کیا تھا اور وہ کسی چیز سے خوفزدہ نہیں ہوئے تھے؟ اور وہ بھی بڑی بڑی قسمیں کھا کر ان کو امان دینے کے بعد؟ کیا تم عمرو بن حمق خزاعی کے قاتل نہیں ہو؟ وہ جو اصحاب پیغمبرؐ میں سے تھے اور عبادت نے انہیں ضعیف' ان کے چہرے کو زرد اور ان کے بدن کو لاغر کر دیا

۱۔ متن میں یہی مذکور ہے' لیکن ممکن ہے "هم" ہو۔

۲۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۱۵۳۔۱۵۵ (حاشیہ) اور دیکھیے: اخبار الطوال۔ ص ۲۲۳' الامامہ والسیاسہ۔ ج ۱۔ ص ۱۸۰۔۱۸۱' الاحتجاج۔ ج ۲۔ ص ۲۰' ۲۸/۲۹' الدرجات الرفیعہ۔ ص ۴۳۳' اختیار معرفۃ الرجال۔ ج ۲۔ ص ۱۲۱۔ خط کا کچھ حصہ المحبر۔ ص ۴۷۹ میں ہے۔ یہاں امامؑ نے جن دو حضرمیوں کی شہادت کی طرف اشارہ کیا ہے' وہاں ان کے نام بھی آئے ہیں جن میں سے ایک کا نام "مسلم بن زبیر" اور دوسرے کا "عبداللہ بن نجی" ہے۔

تھا۔۔۔ کیا تم وہی نہیں ہو جس نے زیاد بن سمیہ کے اپنا بھائی ہونے کا دعویٰ کیا؟ ایسا شخص جو عبید عبد ثقیف کے بستر پر دنیا میں آیا اور تم نے کہا کہ وہ تمہارے باپ کا بیٹا ہے، حالانکہ رسول اللہ کا فرمان ہے کہ: ''بچہ اس کا ہے جس کے بستر پر وجود میں آئے اور زانی کو سنگسار کر دینا چاہیے۔'' تم نے پیغمبر اسلام کی سنت کو ترک کیا اور ان کے احکام کی عمداً مخالفت کی اور الٰہی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کے پیچھے چل پڑے۔ اس کے بعد تم نے زیاد کو بصرہ اور کوفہ پر مسلط کر دیا۔ جبکہ وہ مسلمانوں کے ہاتھوں کو کاٹتا، ان کی آنکھوں کو پھوڑتا اور انہیں کھجور کے تنوں پر لٹکایا کرتا تھا۔ کیا تم ان دو حضرمیوں (حضر موت سے منسوب) کے قاتل نہیں ہو؟ جن کے بارے میں زیاد نے تمہیں لکھا تھا کہ وہ ''دین علیؑ'' پر ہیں، اور تم نے اسے لکھا تھا کہ جو بھی علیؑ کے دین پر اور اُن کا ہم خیال ہو وہ اُسے قتل کر دے۔ اس نے تمہارے حکم پر انہیں قتل کر کے مثلہ (جاہلیت کی ایک رسم جس میں مقتول کے ناک کان کاٹ دیے جاتے تھے) کر دیا۔ کیا دین علیؑ دین محمدؐ کے سوا کچھ اور ہے؟ وہی جن کے خلاف تمہارے باپ نے جنگ کی تھی۔ وہی دین جس کی وجہ سے آج تم ان کی جگہ پر مسند نشین ہو اور اگر یہ نہ ہوتا تو سردیوں اور گرمیوں میں دشوار گزار سفروں کے ذریعے شراب کا حصول ہی تمہاری سب سے بڑی فضیلت ہوتی۔۔۔ میں اپنے اور اپنے دین کے لیے کسی چیز کو تمہارے خلاف جہاد سے بڑھ کر نہیں سمجھتا۔ اگر میں نے ایسا کیا تو اپنے پروردگار سے نزدیک ہو جاؤں گا اور اگر انجام نہ دے سکا تو گناہ اور اس معاملے میں کوتاہی کی وجہ سے مجھے خدا سے استغفار کرنی چاہیے۔۔۔ اے معاویہ! تمہیں (حجر کے قتل پر) قصاص کی بشارت ہو۔ یقین کرو اور جان لو کہ خدا کے پاس ایک ایسی کتاب ہے جس میں ہر چھوٹا بڑا گناہ لکھ دیا جاتا ہے۔ خدا تمہیں بدگمانی کی بنیاد پر لوگوں کو گرفتار کرنے اور شبہ اور بے جا الزام پر انہیں قتل کر دینے اور لوگوں کو اپنے احمق، شرابی اور سگ باز بیٹے کی بیعت پر مجبور کرنے پر فراموش نہیں کرے گا۔ میں تمہارے بارے میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہوں گا کہ تم نے اپنا نقصان کیا، اپنے دین کو ضائع کیا اور جو امانت تمہارے ہاتھ میں ہے اس سے غلط استفادہ کیا اور اپنی رعایا کو دھوکا دیا اور اپنے ٹھکانے کو آگ سے بھر دیا۔ لعنت ہو ظالموں پر!''

ایک مقام پر بلاذری نے اس خط کا خلاصہ بیان کیا ہے، جس میں مزید ایک جملہ موجود ہے۔ وہاں پر ہے کہ امام نے معاویہ کو لکھا کہ: ''وما اعلم فتنة أعظم من ولايتک هذه الامة.'' (مجھے اس امت کے لیے تمہاری حکومت سے بڑھ کر کوئی فتنہ نظر نہیں آتا)۔(۱)

۱۔ ترجمۃ الامام الحسینؑ ابن عساکر۔ ص ۱۹۸

بعد میں جب معاویہ اور امام حسینؑ کا آمنا سامنا ہوا تو انہوں نے امامؑ سے کہا: کیا آپ نے سنا ہے کہ ہم نے حجر اور ان کے اصحاب اور آپ کے والد کے شیعوں کا کیا حشر کیا ہے؟ امامؑ نے فرمایا: تم نے کیا کیا ہے؟ معاویہ نے کہا: ہم نے انہیں قتل کیا' انہیں کفن دیا' ان کی نماز پڑھی اور انہیں دفن کر دیا۔ امامؑ نے فرمایا: لیکن اگر ہم نے تمہارے ساتھیوں کو قتل کیا' تو نہ انہیں کفن دیں گے اور نہ ان پر نماز پڑھیں گے اور نہ انہیں دفن کریں گے۔(۱)

بہر صورت معاویہ اپنے مخالفین کی آواز دبانے کے لیے ہر راستہ اختیار کرتے تھے۔ وہ مقدس ترین افراد کو بھی لالچ دے کر ان کا امتحان لیتے تھے۔ ایک زمانے میں انہوں نے شام میں حضرت ابوذر غفاری کو اسی طریقے سے رام کرنے کی کوشش کی۔ اس مقام پر امام حسینؑ کے مقابلے میں معاویہ کی پالیسی کی ایک دلچسپ مثال موجود ہے' جس کے تحت معاویہ نے کوشش کی تھی کہ بیش بہا تحائف بھیج کر بنی امیہ کے بارے میں امام حسینؑ کے غیظ و غضب کو ٹھنڈا کریں۔

اصمعی کہتا ہے: معاویہ کے پاس ایک خوبصورت کنیز لائی گئی۔ اس کی قیمت پوچھی' تو کہا: ایک لاکھ درہم! معاویہ نے وہ کنیز خرید لی۔ اس کے بعد عمرو بن عاص کی طرف دیکھا اور بولے: اس کنیز کا حقدار کون ہے؟ عمرو نے کہا: امیر المومنین۔ وہاں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں نے بھی یہی کہا۔ معاویہ بولے: نہیں' یہ حسین ابن علیؑ کے لیے مناسب ہے۔ کیونکہ خاندانی شرافت کے مالک ہونے کی بنا پر بھی اور ہمارے اور ان کے والد کے درمیان موجود کدورت کو دور کرنے کے حوالے سے بھی وہی اس کے زیادہ حقدار ہیں۔ پھر انہوں نے حکم دیا کہ اس کنیز کو تیار کر کے تحفے کے طور پر امامؑ کی خدمت میں لے جائیں۔ چالیس دن گزرنے کے بعد اسے سفر کے لیے تیار کیا گیا اور اس کے ساتھ بہت سا مال و دولت' کثیر تعداد میں ملبوسات اور دوسری چیزیں امامؑ کے لیے بھیجی گئیں۔ معاویہ نے ایک خط بھی امامؑ کے نام تحریر کیا' جس میں لکھا کہ: امیر المومنین نے ایک کنیز خریدی اور وہ انہیں اچھی لگی' لیکن انہوں نے آپ کو خود پر ترجیح دی۔ جب کنیز امامؑ کی خدمت میں لائی گئی' تو امامؑ نے اس سے پوچھا: تیرا نام کیا ہے؟ کنیز بولی: ہویٰ۔ امامؑ نے فرمایا: حق یہ ہے کہ اسم اور مسمّیٰ ایک دوسرے سے مناسب ہیں۔ کیا تو کچھ پڑھ سکتی ہے؟ کنیز نے کہا: جی ہاں! میں قرآن بھی پڑھ سکتی ہوں اور شعر بھی۔ امامؑ نے فرمایا: قرآن پڑھ۔ کنیز نے شروع کیا: وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ... (اور اس کے پاس غیب کے خزانے ہیں جنہیں اس کے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا۔ سورۂ انعام ۶۔ آیت ۵۹) امامؑ نے اس سے کہا کہ اگر شعر جانتی ہو تو وہ بھی پڑھو۔ کنیز بولی: کیا مجھے امان حاصل ہے؟ امامؑ نے فرمایا: ہاں۔ کنیز نے یہ شعر پڑھے:

انت نعم المتاع لو کنت تبقی غیر ان لا بقاء للانسان

۱۔ الدرجات الرفیعہ۔ ص ۴۲۹' تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۲۳۱۔۲۳۲

امامؑ شعر کے مضمون کی طرف متوجہ ہو کر رونے لگے اور فرمایا: تو آزاد ہے' وہ تمام اموال جو معاویہ نے بھیجا ہے وہ بھی تیرا ہوا۔ کیا تو نے معاویہ کے بارے میں بھی کچھ کہا ہے؟ کنیز بولی: جی ہاں!

رایت الفتیٰ یمضی و یجمع جهده　　رجاء الغنیٰ والوارثون قعود
و ما للفتیٰ الا نصیب من التقی　　اذا فارق الدنیا علیه یعود (۱)

امامؑ نے حکم دیا کہ اسے مزید ایک ہزار دینار دیئے جائیں۔ پھر فرمایا: میرے بابا نے بھی اس بارے میں یہ کہا ہے:

و من یطلب الدنیا لحال تسره　　فسوف لعمری عن قلیل یلومها
اذاادبرت کانت علی المرء فتنة　　و ان اقبلت کانت قلیلا دوامها (۲)

اس کے بعد امامؑ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آپ نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ (۳)

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ ایک کنیز نے امام حسین علیہ السلام کو ایک گلدستہ پیش کیا۔ اس کے عوض امامؑ نے اسے آزاد کر دیا۔ حضرت سے کہا گیا کہ آپ نے صرف ایک گلدستے کے عوض اسے آزاد کر دیا؟ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن میں یہ تعلیم دی ہے کہ: اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا۔ (جب تمہیں کوئی تحفہ پیش کیا جائے تو اس سے بہتر تحفہ دو یا اسی کو لوٹا دو۔ سورۂ نساء ۴۔ آیت ۸۶) اسے آزاد کرنا گلدستے سے بہتر (تحفہ) تھا۔ (۴)

اس سے پہلے ہم خلافت کے موروثی ہونے کی گفتگو کے دوران' اس معاملے میں معاویہ کے اقدام کے مقابلے میں امامؑ کے موقف کو نقل کر چکے ہیں۔ اس معاملے میں امامؑ معاویہ کے سخت ترین مخالفین میں سے تھے اور آپ نے اس بارے میں اپنی مخالفت کے اظہار میں کسی کوشش سے دریغ نہیں کیا۔

جن برسوں میں امام حسین علیہ السلام اور ان کے بھائی مدینہ میں تھے' کافی عرصے تک مروان اس شہر کا حاکم تھا۔ وہ بدزبان اور کینہ پرور انسان تھا اور معمولی سا موقع ملنے پر حضرت علی علیہ السلام کو برا بھلا کہنے اور انہیں دشنام دینے کی کوشش کرتا تھا۔ ابو یحییٰ کہتا ہے: میں بیٹھا ہوا تھا' مروان اور امام حسینؑ میں تکرار ہو رہی تھی اور امام حسنؑ اپنے بھائی کو روک رہے تھے۔ مروان نے اس قدر جسارت کی کہ بولا: تم اہلِ بیت (نعوذ باللہ) ملعون ہو۔ یہ الفاظ مروان کی گہری خباثت کا پتا دے

۱۔ میں نے ایک جوان کو دیکھا جو دولتمندی کی امید پر محنت مشقت میں مشغول تھا' جبکہ اس کے لواحقین سکون سے بیٹھے تھے۔
۲۔ جو دنیا کو مسرت کے لیے حاصل کرتا ہے' وہ بہت جلد اپنی عمر کی قسم دنیا کو ملامت کرتا ہے' اگر دنیا اس سے منھ پھیر لے تو یہی اس کے لیے آزمائش بن جاتی ہے اور اگر دنیا اس کا رخ کرے تب بھی اس کی مدت مختصر ہے۔
۳۔ تاریخ مدینہ دمشق تراجم النساء۔ ص ۳۶۹۔ ۳۷۰
۴۔ نثر الدر۔ ج ۱۔ ص ۳۳۵

رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی امام حسنؑ نے مروان سے کہا: "واللہ لقد لعن اللہ أباک علی لسان نبیہ وأنت فی صلبہ" (خدا کی قسم! اللہ نے اپنے نبی کے ذریعے اس وقت تیرے باپ پر لعنت کی ہے جب تو اس کے صلب میں تھا)۔(۱) مروان اس طرح نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے انتقام لیا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ معاویہ نے یہ کوشش بھی کی کہ اپنے بیٹے یزید کے لیے عبداللہ ابن جعفر ابن ابیطالب کی بیٹی کا رشتہ طلب کرے۔ عبداللہ نے امام حسین علیہ السلام سے مشورہ کیا۔ آپ نے فرمایا: "أتزوّجہ وسیوفھم تقطر من دمائنا؟" (کیا تم اپنی بیٹی کو اس کے عقد میں دو گے حالانکہ ان کی تلواروں سے ہمارا خون ٹپک رہا ہے؟ اپنی بیٹی اپنے بھتیجے "قاسم بن محمد" کے عقد میں دے دو)۔(۲) جیسا کہ ایک اور روایت میں آیا ہے کہ اس اقدام سے معاویہ کا مقصد بنی امیہ اور بنی ہاشم کے درمیان امن کا قیام تھا یا بالفاظ دیگر ہاشمیوں کو امویوں کے سامنے جھکانا تھا۔(۳)

امام حسین علیہ السلام کے اخلاق کے بارے میں بھی ایک روایت کا ذکر مناسب نظر آتا ہے۔ "ابن ابی الدنیا" نے نقل کیا ہے کہ امام حسین علیہ السلام فقیروں کے ایک گروہ کے پاس سے گزرے جن کا دستر خوان بچھا ہوا تھا اور اس پر معمولی غذا چنی ہوئی تھی۔ جب ان فقرا نے امام کو دیکھا تو انہیں دعوت دی۔ آپ سواری سے نیچے اترے اور فرمایا: اِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ. (۴) پھر ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد فرمایا: آپ لوگوں نے مجھے دعوت دی اور میں نے قبول کی اب میں آپ کو دعوت دیتا ہوں جسے آپ کو قبول کرنا ہوگا۔ اس کے بعد آپ نے رباب سے کہا کہ جو کچھ تیار کیا ہے وہ لے آیئے تاکہ سب اکٹھے کھانا کھائیں۔(۵)

یزید کی خلافت کے بارے میں امامؑ کی مخالفت

سن ساٹھ ہجری کے ماہ رجب میں معاویہ کی موت کے بعد طے شدہ پروگرام کے مطابق یزید خلیفہ بن گیا۔ یہ خبر ابھی مدینہ نہیں پہنچی تھی۔ یزید نے اپنے اُن مخالفین سے بیعت لینے کی ہر ممکن کوشش شروع کر دی جن کی مخالفت اس کے خلاف کسی شورش کا باعث بن سکتی تھی۔(۶) یزید نے مدینہ میں اپنے گورنر ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کو لکھا کہ جلد از جلد

۱۔ ترجمۃ الامام الحسین ابن سعد۔ ص ۱۳۵۔۱۳۶

۲۔ ترجمۃ الامام الحسینؑ ابن سعد۔ ص ۱۳۹

۳۔ ایضاً۔ ص ۱۵۰

۴۔ سورۂ نحل ۱۶۔ آیت ۲۳

۵۔ کتاب التواضع والخمول۔ ص ۱۳۲

۶۔ اخبار الطوال۔ ص ۲۲۷

عبداللہ ابن زبیر اور حسین ابن علی سے بیعت لو۔ مروان نے ولید کو آمادہ کیا کہ وہ اسی رات ان کے پاس اپنے آدمی بھیجے اور اگر وہ بیعت نہ کریں، تو وہیں ان کی گردن جدا کر دے۔ کیونکہ اس کے خیال میں اگر یہ رات گزر گئی تو ان لوگوں کو موقع مل جائے گا اور وہ مخالفت کرتے ہوئے لوگوں کو اپنی طرف دعوت دیں گے۔(۱)

گورنر کی طرف سے بلائے جانے سے امام حسین علیہ السلام کو معاویہ کی موت کا اندازہ ہو گیا۔ لہٰذا آپ اپنے بعض ساتھیوں اور عزیزوں کو مسلح کر کے اپنے ساتھ محل میں لائے، تاکہ اگر کوئی خطرہ درپیش ہو تو وہ لوگ امام کے قتل میں رکاوٹ بنیں۔ امام نے ولید کی جانب سے یزید کے لیے بیعت کے مطالبے کے جواب میں فرمایا کہ ان جیسے شخص کے لیے خفیہ طور پر بیعت کرنا مناسب نہیں ہوگا، بلکہ ضروری ہے کہ لوگوں کے سامنے اور مسجد کے اندر بیعت کی جائے۔ ولید نے امام کی بات مان لی، لیکن مروان نے دھمکی آمیز الفاظ استعمال کرتے ہوئے ولید کو امام کی گرفتاری پر اُکسانے کی کوشش کی۔ امام نے بھی مروان کو سخت جواب دیا اور دربار سے باہر نکلتے ہوئے ولید کی طرف رُخ کر کے فرمایا:

"ایھا الأمیر !انا أھل بیت النبوۃ ومعدن الرسالۃ ومُختلف الملائکۃ ومھبطِ الرحمۃ وبنا فتح اللّٰہ وبنا یختم، ویزید رجل فاسق، شارب خمر، قاتل النفس المحرمۃ، معلن بالفسق ومثلی لا یبایع مثلہ."

"اے امیر! ہم اہلِ بیت نبوت ہیں، معدنِ رسالت ہیں، فرشتوں کی رفت و آمد کی جگہ ہیں، نزولِ رحمت کا مقام ہیں۔ خدا نے ہم ہی سے آغاز کیا اور ہم پر ہی اختتام کیا ہے۔ یزید ایک فاسق، شرابی، بے خطا افراد کا قاتل اور برسرِ عام فسق و فجور کا مرتکب ہونے والا شخص ہے۔ مجھ جیسا اُس جیسے کی بیعت نہیں کر سکتا۔"

اسی مجلس میں جب مروان نے بیعت لینے پر اصرار کیا، تو امام نے فرمایا: اگر یزید جیسا شخص مسلمانوں کا حکمراں بن جائے، تو اسلام پر فاتحہ پڑھ لینی چاہیے: "وعلی الاسلام السلام." (اور اسلام کا خدا ہی حافظ ہو) آپ نے آیہ تطہیر سے استدلال کرتے ہوئے خلافت کے لیے اہلِ بیت علیہم السلام کی لیاقت کا اظہار فرمایا۔(۲) یہ وہ استدلال ہے جسے ہم حضرت علی علیہ السلام اور ان کے فرزند امام حسن علیہ السلام سے بھی نقل کر چکے ہیں۔

اسی رات ابن زبیر مدینہ سے نکل گئے، اور دوسرے دن حکومت کے مامور کردہ لوگ اُن کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔ اگلی رات امام حسین علیہ السلام نے بھی مدینہ چھوڑ دیا۔(۳) اس سفر میں تمام اہلِ بیت آپ کے ساتھ تھے، صرف

۱۔ الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۱

۲۔ الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۷

۳۔ دینوری (اخبار الطوال)۔ ص ۲۲۸

محمد بن حنفیہ مدینہ میں باقی رہے تھے۔(۱) امامؑ کی روانگی کی تاریخ تین شعبان ساٹھ ہجری بیان کی گئی ہے' جو آپ کی ولادت کی تاریخ بھی ہے۔

جب امامؑ مکہ پہنچے تو وہاں کے لوگ بہت خوش ہوئے۔ حتیٰ ابن زبیر' جو خود بھی قیادت کے دعویدار تھے' امامؑ کی نماز اور آپ کی مجلسِ حدیث میں شرکت کرتے تھے۔(۲) مکہ اسلام کا دینی مرکز تھا اور قدرتی طور پر وہاں کثرت کے ساتھ لوگوں کی آمدورفت رہتی تھی۔ امامؑ کا مختلف لوگوں اور شخصیتوں سے رابطہ تھا اور آپ نے اُن سے یزید کی بیعت نہ کرنے کا سبب بیان کیا تھا۔

کوفہ کے شیعوں نے جب امامؑ کی جانب سے یزید کی مخالفت اور آپ کی مکہ آمد کی خبر سنی تو وہ بہت خوش ہوئے' کیونکہ وہ سالہا سال سے اس دن کے منتظر تھے۔ انہوں نے امام حسنؑ کی شہادت کے بعد امام حسینؑ کو تعزیتی خط بھیجا تھا' جس میں انہیں تحریک شروع کرنے کی دعوت بھی دی تھی' لیکن امامؑ نے اسے قبول نہیں کیا تھا۔ اب انہوں نے ایک اجلاس منعقد کیا' جس میں چند شیعہ رہنماؤں نے خطاب کیا جن میں سلیمان بن صرد خزاعی بھی شامل تھے' اور امامؑ کو عراق آنے کی دعوت دینے کا مسئلہ چھیڑا۔ سب نے اس پر اتفاق کیا۔ سلیمان نے تاکید کے لیے ہر ایک سے عہد لیا کہ وہ پیچھے نہیں ہٹیں گے اور سب نے ثابت قدم رہنے کا عہد کیا۔(۳) اس کے بعد چند شیعہ رہنماؤں نے امامؑ کو خط لکھا اور انہیں کوفہ آنے کی دعوت دی۔ خط لکھنے والے ان لوگوں میں سلیمان' مسیب بن نجبہ' حبیب ابن مظاہر' رفاعہ بن شداد' عبداللہ بن وال بھی شامل تھے'(۴) امامؑ نے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے بعد ایک کے بعد ایک خطوط کا تانتا بندھ گیا۔ قیس بن مسہر صیداوی اور حتیٰ عبداللہ بن وال اور کچھ دوسرے لوگ بنفس نفیس مکہ آئے۔ دوسروں کے خطوط بھی یکے بعد دیگرے امامؑ کے پاس پہنچتے گئے' یہاں تک کہ صورتحال یہ ہوگئی (۵) کہ اب امامؑ کے لیے دعوت دینے والوں کی طرف سے بے توجہی ممکن نہ رہی۔ ہانی بن ہانی' جو مکہ آئے ہوئے تھے' انہوں نے لوگوں کی آمادگی' حتیٰ کوفہ کے سربرآوردہ افراد اور ان کی آمادگی کے بارے میں ایسی باتیں بیان کیں جن سے خطوط کے مضمون کی مزید تائید اور تاکید ہوگئی۔

۱۔ الکامل فی التاریخ۔ ج ۴۔ ص ۱۶' انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۱۵

۲۔ الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۳۷

۳۔ تاریخ طبری۔ ج ۵۔ ص ۲۶۰۔ ۲۶۱' الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۳۶۔ یہ اس شہرت کی وجہ سے تھا کہ انہوں نے علیؑ اور ان کے بیٹے حسنؑ کی حمایت نہیں کی تھی۔ اور اب وہ اسی کی تاکید کے لیے یہ عہد کر رہے تھے۔

۴۔ خط کا متن الکامل فی التاریخ۔ ج ۴۔ ص ۲۰

۵۔ الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۴۹۔ ۵۰

مسلمؑ کی کوفہ روانگی

امامؑ نے سب سے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ حضرت مسلم بن عقیلؑ کو کوفہ روانہ کیا۔ امامؑ نے اُن سے مخاطب ہو کے فرمایا:
''وان رأیت الناس مجتمعین علی بیعتی فالعجل لی بالخبر حتی أعمل علی حسب ذلک.''(۱) (اگر تم دیکھو کہ لوگ میری بیعت کے لیے متحد ہیں' تو جلد از جلد مجھے اطلاع دینا تاکہ میں اس کے مطابق عمل کروں)

مسلمؑ جو اس وقت تقریباً چالیس برس کے تھے' اور جن کا تعلق اہلِ بیتؑ سے تھا' وہ اس اہم کام کے لیے بھیجے گئے۔ مورخین کہتے ہیں کہ مسلمؑ مکہ سے مدینہ گئے اور وہاں سے عراق جاتے ہوئے ایک رات راستہ گم کر بیٹھے اور ان کے ایک یا دونوں گائڈ مر گئے۔ مسلمؑ نے واپس لوٹ جانے کا ارادہ کیا لیکن انہیں اپنے بھیجے ہوئے خط کے جواب میں امامؑ کا خط موصول ہوا کہ وہ اس ماموریت کو انجام دیں۔ (۲)

مسلمؑ کوفہ پہنچے اور وہاں مختار کے گھر پر قیام کیا' جو وہاں کے شیعوں میں ایک اہم مقام رکھتے تھے۔ اس کے بعد آپ نے بیعت لینا شروع کی۔ کتابِ خدا اور سنتِ رسولؐ کی طرف دعوت' ظالموں کے خلاف جہاد' کمزوروں کا دفاع' محرومین کی مدد' مسلمانوں کے درمیان بیت المال کی عادلانہ تقسیم' اہلِ بیتؑ کی مدد' جن کے ساتھ وہ صلح کریں ان کے ساتھ صلح اور جن کے ساتھ وہ جنگ کریں ان کے ساتھ جنگ کرنا' گفتار و کردارِ اہلِ بیتؑ کی پیروی کرنا اور اس کے برخلاف عمل نہ کرنا' اس بیعت کی شرائط میں سے تھیں۔ (۳)

مسلمؑ کے کوفہ پہنچنے کے تقریباً ۳۵ روز بعد (پانچ شوال ساٹھ ہجری) تک تقریباً اٹھارہ ہزار افراد نے اُن کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ ان لوگوں میں شیعوں کے علاوہ دوسرے بہت سے عام افراد بھی شامل تھے۔ محمد بن بشیر جیسے شخص نے بھی بیعت کی جس نے کہا کہ: ''میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ خدا میرے ساتھیوں کی مدد کرے' لیکن میں مرنا نہیں چاہتا۔ مجھے جھوٹ بولنا بھی پسند نہیں ہے۔'' معاویہ کے مرنے کے بعد عراق میں اور امویوں کے مخالفین کے درمیان جو خلا پیدا ہوا تھا وہ مسلمؑ کی آمد سے پُر ہو گیا۔ سب مسلمؑ کے گرد جمع ہو گئے۔ حکومت کی گرفت سخت کمزور پڑ گئی اور مسلمؑ پہلے کے مقابلے میں زیادہ کھل کر لوگوں سے ملنے جلنے لگے۔

۱۔ الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۵۳

۲۔ تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۲۶۳۔ ۲۶۴۔ بعض محققین ان باتوں کو نہیں مانتے۔ مبعوث الحسین۔ ص ۹۰

۳۔ الشہید مسلم۔ ص ۱۰۳۔ تاریخی کتابوں میں بالکل یہی عبارتیں تو نہیں آئی ہیں' لیکن مرحوم مقرم نے بیعتِ عقبہ اور روزِ فتحِ مکہ وغیرہ کی نصوص کی مدد سے ایک قریب قریب شکل فراہم کی ہے۔

بنی امیہ کے جاسوس' جو نعمان بن بشیر کی کارکردگی سے سخت نالاں تھے' انہوں نے یزید کے نام ایک خط میں لکھا: اگر تمہیں کوفہ کی ضرورت ہے' تو اس کے بارے میں جلد از جلد کوئی مناسب فیصلہ کرو۔(۱) مسلمؑ جنگ کے لیے ضروری اسلحہ اور طاقت جمع کرنے میں مصروف تھے۔ ابو ثمامہ صائدی کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ: "یشتری لھم السلاح وکان بہ بصیرا۔" (کیونکہ وہ اسلحہ کے بارے میں جانتے تھے' اس لیے اسلحہ کی خریداری انہی کے ذمے تھی)۔(۲)
بعد میں ایک موقع پر ابن زیاد نے ہانی سے کہا تھا: تمہارا گھر مسلمؑ کے ساتھیوں کی پناہ گاہ اور اسلحہ کا گودام تھا۔(۳)

یزید نے کوفہ کے لیے ابن زیاد کا انتخاب کیا۔ اس زمانے میں ابن زیاد بصرہ کا گورنر تھا' اب کوفہ بھی اس کے حوالے کر دیا گیا۔ مورخین نے لکھا ہے: معاویہ نے اپنی ایک وصیت میں' جو اس کے غلام کے پاس تھی اور بعد میں یزید کو دی گئی' ابن زیاد کو عراق کی ممکنہ شورش کے مقابلے کے لیے معین کیا تھا۔(۴) ابن زیاد جس نے بصرہ میں امام حسینؑ کے قاصد کو قتل کیا تھا' کوفہ کے لیے روانہ ہوا' تا کہ اپنے باپ سے میراث میں ملی ہوئی سخت گیری کے ذریعے اس شہر کے شورشیوں کو سرکوب کرے۔

عراقیوں کی سرکوبی کے لیے ابن زیاد کا اہم ترین حربہ اور کارآمد ترین ہتھیار دھمکی تھا۔ اُس نے ابتدا ہی میں شہر کے عمائدین کو بلایا اور اُن سے کہا: وہ اُسے اجنبیوں اور وہ لوگ جن کی گرفتاری یزید کو مطلوب ہے' نیز خوارج اور وہ لوگ جو اختلاف پیدا کرنا چاہتے ہیں' کے متعلق بتائیں اور اُن کے نام لکھ کر دیں۔ اگر اس بارے میں کسی نے اپنی ذمے داری پر عمل نہیں کیا' تو ایسے افراد کے انجام دیے ہوئے اعمال کی ذمے داری اُس پر عائد ہوگی۔ اور حاکم بھی اُن پر سے اپنی ذمے داری اٹھا لے گا۔ اس صورت میں ان کا خون بہانا اور ان کا مال لوٹنا جائز ہوگا۔(۵)

ابن زیاد کے ان اقدامات کے مقابل' مسلم بن عقیل اپنی اقامت گاہ تبدیل کرنے اور خفیہ سرگرمیوں پر مجبور ہو گئے۔ نئی جگہ ہانی ابن عروہ کا مکان تھا' جو قبیلۂ مذحج کے ایک سردار تھے' اور بظاہر ان کا گھر زیادہ محفوظ جگہ نظر آتا تھا۔ ابن زیاد سراسیمگی کے عالم میں مسلمؑ کی تلاش میں تھا۔ اس نے ایک جاسوس کے ذریعے' جو اہلِ بیتؑ سے دوستی کا دعویدار تھا' مسلمؑ کے خفیہ ٹھکانے کا پتا چلا لیا۔ ابن زیاد نے پہلے تو ہانی کو گرفتار کیا اور اُن سے مطالبہ کیا کہ وہ مسلمؑ کو اس کے حوالے کریں۔ اس

۱۔ الفتوح۔ ج۵۔ ص۵۹۔۶۰

۲۔ تاریخ طبری۔ ج۴۔ ص۲۷۱

۳۔ ایضاً۔ ج۴۔ ص۲۷۳' الکامل فی التاریخ۔ ج۴۔ ص۲۸

۴۔ تاریخ طبری۔ ج۴۔ ص۲۶۵' الکامل فی التاریخ۔ ج۴۔ ص۲۱

۵۔ تاریخ طبری۔ ج۴۔ ص۲۶۷' الکامل فی التاریخ۔ ج۴۔ ص۲۴۔۲۵

دوران مذحجیوں نے معمولی سی شورش کی۔ قاضی شریح نے اپنے خائنانہ کردار کے ذریعے انہیں اطمینان دلایا کہ ہانی زندہ ہیں اور ابن زیاد کے مہمان ہیں۔ یہ سن کر مذحجی منتشر ہو گئے۔(۱)

مسلمؑ نے اقدام کا آغاز کیا اور کچھ لوگ اپنے گرد جمع کر کے ''یا منصور امت'' کا نعرہ لگا کر اپنے ساتھیوں کو پکارا۔ یہ نعرہ جنگوں کے دوران پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نعروں میں سے ایک نعرہ تھا۔ ابن زیاد مسجد میں تقریر کر رہا تھا کہ اس نے ان نعروں کی آوازیں سنیں۔ وہ اپنے محل کی طرف لپکا اور دروازے بند کر دیے۔ مسلمؑ کے سپاہیوں نے اس کے محل کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن کسی وجہ سے جس کا سبب ہم پر واضح نہیں، محل کا عقبی دروازہ محاصرے میں نہیں آیا۔ کوفہ کے سردار وہاں سے مسلسل ابن زیاد سے رابطے میں تھے۔ یہ دروازہ ''رومیوں کا دروازہ'' کے نام سے مشہور تھا۔ مسلمؑ کے ساتھ موجود لوگوں کی تعداد ابتدا میں اتنی زیادہ تھی کہ انہوں نے ابن زیاد اور اس کے آدمیوں کو ہراساں اور انہیں محل کے اندر محصور ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔(۲)

ابن زیاد کے اُکسانے پر کوفہ کے سرداروں نے لوگوں کو دھمکانا شروع کر دیا۔ انہوں نے لوگوں سے کہا کہ: کل شامی لشکر آ پہنچے گا اور تمہارا برا حشر کر دے گا۔(۳) ایک گروہ نے اپنے قبیلے کے لوگوں کو مسلمؑ کے لشکر سے جدا کر لیا۔ عورتیں اپنے شوہروں اور بچوں کے پاس گئیں اور کہنے لگیں کہ ''والناس یکفونک۔'' (دوسرے لوگ تمہاری جگہ پُر کر دیں گے)۔(۴) کچھ ہی دیر بعد مسلمؑ کے اردگرد سے لوگ چھٹ گئے اور ''وصلی المغرب ومامعه الا ثلاثون رجلاً۔'' (آپ کے ساتھ مغرب کی نماز میں صرف تیس افراد نے شرکت کی)۔(۵) اسکے بعد یہ لوگ بھی منتشر ہو گئے۔

ابن زیاد جس میں ڈر کے مارے باہر نکلنے کی جرأت نہ تھی اُس نے حکم دیا کہ محل کی چھت کے اوپر سے مسجد کے اندر جھانک کر دیکھو کہ کوئی اس کے اندر ہے یا نہیں؟ مسجد محل سے بالکل متصل تھی۔ محل سے ایک مشعل جلا کر نیچے پھینکی گئی، اور جب انہیں اطمینان ہو گیا کہ وہاں کوئی نہیں ہے، تو مسلمؑ کو شہر میں تلاش کرنا شروع کیا۔ ابن زیاد نے حکم دیا کہ پورے کوفہ کی گھر گھر تلاشی لی جائے اور مسلمؑ کو گرفتار کیا جائے۔(۶)

۱۔ تذکرۃ الخواص۔ ص ۲۴۲۔ بعد میں شریح نے کہا کہ ابن زیاد نے مجھ پر ایک سپاہی کو کھڑا کیا ہوا تھا اور میں خوف کی وجہ سے مذحجیوں کے نام ہانی کا وہ پیغام لوگوں کو نہ پہنچا سکا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ ان پر زیادتی کی جا رہی ہے۔

۲۔ الکامل فی التاریخ۔ ج ۳۔ ص ۳۱

۳۔ ارشاد۔ ص ۲۱۰۔ تقریباً چار ہزار افراد کا ذکر ہے۔

۴۔ تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۲۷۷، الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۸۷، الکامل فی التاریخ۔ ج ۴۔ ص ۳۱

۵۔ تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۲۷۷

۶۔ ارشاد۔ ص ۲۱۲

آخر کار مسلمؑ کو ڈھونڈ لیا گیا اور ایک مختصر جھڑپ کے بعد انہیں ابن زیاد کے پاس لے گئے۔ ابن زیاد نے ان سے کہا: "یاشاق! اخرجت علی امامک وشققت عصی المسلمین." (اے شقی! تو نے اپنے امام پر خروج کیا اور مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کیا؟ مسلمؑ نے کہا: ہم معاویہ اور اس سے بڑھ کر اس کے بیٹے یزید کی خلافت کو قبول نہیں کرتے۔ کیونکہ انہوں نے زبردستی وصی پیغمبر سے خلافت کو غصب کیا ہے)۔(۱) نیز یہ بھی کہا کہ: اس شہر کے لوگوں کا خیال ہے کہ تیرے باپ نے ان کے اقربا کو قتل کیا ہے' ان کا خون بہایا ہے اور قیصر و کسریٰ کی طرح ان کے ساتھ سلوک کیا ہے۔ ہم نفاذ عدالت اور لوگوں کو حکم خدا اور رسول کی طرف دعوت دینے کے لیے آئے ہیں۔(۲) ابن زیاد نے مکاری دکھاتے ہوئے اور لوگوں کے سامنے مسلمؑ کی شخصیت کو داغدار کرنے کی غرض سے اُن سے کہا: تم مدینہ میں شراب پیا کرتے تھے! مسلمؑ نے انتہائی باوقار انداز سے جواب دیا: تجھ جیسا انسان' جس کے لیے کسی بے گناہ کو قتل کرنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا' شراب خوری کا مجھ سے زیادہ حقدار ہے۔(۳)

مسلمؑ جو امام حسینؑ کی طرف سے پریشان تھے' انہوں نے عمر ابن سعد سے جو قریشی تھا اور بہر طور مسلمؑ کے ساتھ رشتے داری کا دعویدار بھی تھا' وصیت کرنا چاہی۔ آپ کی پہلی وصیت یہ تھی کہ کسی کو امام حسینؑ کے پاس بھیج دے اور انہیں کوفہ آنے سے منع کردے۔ دوسری وصیت یہ تھی کہ ان کے جنازے کو کفن دینے کے بعد دفن کردے۔ تیسری وصیت یہ تھی کہ ان کی تلوار اور دوسرا سامان فروخت کر کے ان کا قرض ادا کردے۔

مسلمؑ کو شہید کر دیا گیا۔ بے شک مسلمؑ ایک انتہائی پاکدامن اور متقی انسان تھے۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے ان پر امام حسینؑ کے اعتماد کے علاوہ' کوفہ میں آپ کے قرض کی طرف بھی اشارہ کیا جاسکتا ہے' کہ آپ کسی سے پیسے لینے پر راضی نہیں تھے۔(۴) اس دوران آپ نے اپنے اخراجات کے لیے سات سو درہم قرض لیا تھا' جس کی ادائیگی کے لیے شہادت کے وقت انہوں نے اپنا ساز وسامان فروخت کے لیے پیش کردیا۔

اس حوالے سے دوسرا نکتہ وہ موقع ہے جب حضرت مسلمؑ ابن زیاد کو ختم کر سکتے تھے' لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ جب ابن زیاد کوفہ آیا' تو بصرہ کے ایک شیعہ "شریک ابن اعور" بھی اس کے ساتھ کوفہ آئے تھے۔ شریک کوفہ میں بیمار ہو کر ایک شیعہ "ہانی ابن عروہ" کے گھر رہنے لگے۔ اسی زمانے میں مسلمؑ بھی اس گھر میں روپوش تھے۔ ابن زیاد نے شریک کی

۱۔ الکامل فی التاریخ۔ ج۵۔ ص۹۸

۲۔ ایضاً۔ ج۳۔ ص۳۵

۳۔ الفتوح۔ ج۵۔ ص۹۸۔۹۹' تاریخ طبری۔ ج۳۔ ص۲۸۳

۴۔ الفتوح۔ ج۵۔ ص۵۷' مقتل الحسینؑ۔ ج۱۔ ص۱۹۷' مبعوث الحسینؑ۔ ص۱۲۳

عیادت کا فیصلہ کیا' اس کے آنے سے پہلے شریک نے مسلمؑ سے کہا کہ مناسب موقع پر اور ایک خاص اشارہ پا کر (جو ایک شعر کا پڑھنا تھا) وہ ابن زیاد پر حملہ کر کے اسے ختم کر ڈالیں۔ لیکن مسلمؑ نے ایسا نہیں کیا۔ ابن زیاد کے جانے کے بعد جب شریک نے ان پر اعتراض کیا' تو انہوں نے کہا کہ ہانی راضی نہیں ہیں کہ ابن زیاد ان کے گھر میں مارا جائے۔ اس کے بعد مسلمؑ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ''الایمان قید الفتک.'' کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: اسلامی اخلاق کے اعتبار سے اس طرح قتل کرنا پسندیدہ عمل نہیں ہے۔(۱)

پہلی بات ہانی کے بارے میں ہرگز قابلِ قبول نہیں ہوسکتی۔ سوائے یہ کہ ہم یہ امکان ظاہر کریں کہ ہانی اس بات سے خوفزدہ تھے کہ کہیں بعد میں شامیوں کے آنے کے بعد ان کا سب کچھ تباہ و برباد نہ کر دیا جائے۔ جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے' تو اگر مسلمؑ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہو' تب بھی اس پر غور و فکر کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس موقع پر ابن زیاد کا قتل بعد میں عراق اور کربلا میں رونما ہونے والی صورتحال کو یکسر بدل سکتا تھا۔ ابن زیاد ایک فاسد اور قاتل انسان تھا۔ خود نبی اکرمؐ نے بھی مدینہ سے کچھ لوگوں کو مکہ بھیجا تھا' تا کہ وہ اسی انداز سے ابوسفیان کو قتل کر دیں' اگرچہ وہ لوگ اس مہم میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ کعب بن اشرف اور ابوعفک کو اسی طرح راستے سے ہٹایا گیا تھا۔ بعض نے یہ اشارہ کیا ہے کہ ابن زیاد کو قتل نہ کرنے کی ایک سیاسی وجہ تھی اور وہ یہ کہ اس کے بعد شام کے لوگ انتقام لینے کے لیے آتے اور کوفہ کو غارت کر دیتے۔(۲)

اس حوالے سے عرض ہے کہ اگر امام حسین علیہ السلام جنگ میں کامیاب ہو بھی جاتے' تب بھی شامی لشکر ہر صورت میں آتا اور ان کے اس آنے کا ابن زیاد کے قتل سے کوئی تعلق نہ ہوتا۔ بعد میں ابن زیاد کے محل کے محاصرے کے دوران بھی یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ لوگوں نے اتنی آسانی سے مسلمؑ کا ساتھ کیوں چھوڑ دیا؟ کیا اس معاملے میں سارا قصور کوفیوں کا ہے؟ یا یہ کہ اس تحریک کے قائد جوش دلا کر لوگوں کو میدان میں جما کر نہیں رکھ سکے تھے؟ ایک اور دلچسپ نکتہ مسلمؑ کی خفیہ پناہ گاہ کا پتا چل جانا ہے۔ ابن زیاد نے اپنے ایک غلام کو پیسے دیے اور اس سے کہا کہ وہ مسلمؑ کے خفیہ ٹھکانے کا پتا لگائے۔ غلام مسجد کوفہ میں گیا اور شیعوں کی پہچان کا جو معیار اس کے پاس تھا' اس کے مطابق اس نے کسی شیعہ کو تلاش کرنا شروع کیا۔ اس کی نگاہ ایک شخص پر پڑی جو مسلسل نماز پڑھ رہا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں کہا: **ان ھؤلاء الشیعة یکثرون الصلاة واحسب ھذا منھم.** (شیعہ ہی اتنی زیادہ نمازیں پڑھتے ہیں' میرے خیال میں یہ بھی انہی میں سے ہے)۔(۳) یہ شخص مسلم ابن

۱۔ الکامل۔ ج ۳۔ ص ۲۷

۲۔ مبعوث الحسین۔ ص ۱۵۲۔ ۱۵۳

۳۔ اخبار الطوال۔ ص ۲۳۹

عوبجہ تھے۔ وہ ابن زیاد کے اس غلام کے فریب میں آ گئے' انہوں نے کئی طرح سے اسکی آزمائش کی لیکن وہ اپنی خباثت پوشیدہ رکھنے میں کامیاب رہا۔ لہٰذا وہ اسے مسلمؑ کے پاس لے گئے۔ اس غلام کے ان الفاظ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُس دور کے شیعہ زہد و عبادت میں مشہور تھے۔

عراق کی جانب امامؑ کی روانگی

امام حسین علیہ السلام کے باضابطہ نمائندے نے کوفیوں کی آمادگی کی تائید کر دی تھی' اور اب تامل کی گنجائش نہیں تھی۔ کیونکہ کوفیوں اور مسلمؑ کے خطوط کے بعد یہ اطمینان حاصل ہو گیا تھا کہ بنی امیہ کے خلاف قیام کے لیے حالات سازگار ہیں۔ امامؑ نے جلد از جلد کوفہ پہنچنا چاہا' لہٰذا آپ آٹھ ذی الحج کو' یعنی عین اعمالِ حج کے درمیان' عمرۂ تمتع کو' عمرۂ مفردہ میں تبدیل کر کے عراق کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایک لمحے کی تاخیر بھی عراق کے حالات کو دگرگوں کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ امامؑ کو مکہ ہی میں قتل کر دیے جانے کا بھی امکان تھا اور آپ کا مکہ میں رہنا کسی بھی صورت میں مصلحت کے مطابق نہیں تھا۔ کہتے ہیں کہ امامؑ کے ساتھ اسّی افراد تھے' لیکن بعض دوسری روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ تعداد اس سے زیادہ تھی۔ امکان ہے کہ یہ تعداد ان لوگوں کی ہو گی جو کربلا تک امامؑ کے ساتھ رہے۔

راستے میں سب سے پہلے امامؑ کا سامنا اُس قافلے سے ہوا جو یمن سے شام کی طرف رواں دواں تھا۔ یہ قافلہ یزید کے دربار کے لیے تحائف لے کر شام جا رہا تھا۔ امامؑ نے تحائف لے جانے والے اس قافلے کو اپنے تصرف میں لے لیا اور ان لوگوں کو دعوت دی کہ اگر چاہیں تو وہ ان کے ساتھ عراق چلیں' بصورتِ دیگر واپس لوٹ جائیں۔ (۱) امامؑ "تنعیم" کے علاقے سے' جہاں اس قافلے سے آپ کا سامنا ہوا تھا' الصفاح کی جانب چل پڑے۔ اس مقام پر آپ کی ملاقات فرزدق سے ہوئی' جو اس زمانے میں ایک جوان شاعر تھا۔ امامؑ نے اس سے کوفہ کے حالات کے بارے میں پوچھا' تو اس نے جواب دیا: قلوب الناس معک و سیوفهم علیک. (لوگوں کے دل تو آپ کی طرف ہیں لیکن ان کی تلواریں آپ کے خلاف ہیں) اسکے بعد بطن الرمہ کا علاقہ تھا' اس مقام سے آپ نے کوفیوں کے نام ایک خط لکھا جس میں حضرت مسلمؑ کے خط کی جانب اشارہ کرتے ہوئے' اُن سے کہا کہ ان کی آمد کے لیے تیار ہو جائیں۔ (۲) یہ خط آپ نے قیس بن مسہّر کے سپرد کیا گیا تاکہ وہ اسے اہلِ کوفہ تک پہنچائیں۔ راستے میں قیس کو حصین بن نمیر کے لشکر کا سامنا کرنا پڑا اور وہ اس کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ قیس نے اسی وقت خط نگل لیا اور بعد میں کوفہ جا کر ابن زیاد کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔

۱۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۱۶۴' اخبار الطوال۔ ص ۲۴۵' تاریخ طبری۔ ج ۴۔ ص ۲۸۹۔ ۲۹۰

۲۔ اخبار الطوال۔ ص ۲۴۵

اس کے بعد "زرود" نامی مقام پر امام حسین علیہ السلام کی زہیر بن قین سے ملاقات ہوئی۔ زہیر عثمانی ہونے کے باوجود امام کی دعوت اور اپنی اہلیہ کی تحریک پر امام کے ایک مخلص ساتھی بن گئے۔ انہوں نے اپنے دوستوں سے بھی کہا کہ ان میں سے جو کوئی شہادت کا خواہشمند ہے وہ ان کے ساتھ آجائے بصورتِ دیگر مکہ کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھیں۔ (۱)

"ذاتِ عرق" نامی مقام پر بنی اسد کے ایک شخص نے امام حسین علیہ السلام کو ہانی اور مسلم کی شہادت کی خبر دی۔ (۲) کہتے ہیں کہ امام واپسی کا ارادہ رکھتے تھے لیکن مسلم کے بھائی آڑے آگئے اور امام نے اپنا سفر جاری رکھا۔ بظاہر یہ ممکن نظر نہیں آتا کہ مسلم کے بھائیوں نے ایسا مطالبہ کیا ہو یا امام کی مخالفت کے باوجود انہیں کوفہ جانے پر مجبور کر دیا ہو بالخصوص جبکہ دوسرے لوگوں نے امام کو کوفہ جانے کا مشورہ دیا اور آپ سے کہا کہ: واللہ ما انت مثل مسلم بن عقیل ولو قدمت الکوفة لکان الناس الیک اسرع. (خدا کی قسم آپ مسلم بن عقیل کی طرح نہیں ہیں اگر آپ کوفہ پہنچ گئے تو لوگ آپ کی جانب تیزی سے لپک کر آئیں گے)۔ (۳) امام خود کوفہ جانے پر مصمم تھے۔

"زبالہ" کے مقام پر امام کو مسلم کا وہ پیغام ملا جسے انہوں نے اپنی شہادت کے وقت عمر ابن سعد سے امام کو پہنچانے کی درخواست کی تھی۔ (۴) ابھی کچھ ہی آگے چلے تھے کہ امام کو قیس بن مسہر (۵) اور اپنے دودھ شریک بھائی عبد اللہ ابن یقطر کی شہادت کی خبر موصول ہوئی۔ یہ اطلاعات اس بات کی نشاندہی کر رہی تھیں کہ کوفہ کے حالات پلٹ گئے ہیں اور وہ کیفیت جو مسلم نے بتائی تھی اب مکمل طور پر تبدیل ہو چکی ہے۔ اس موقع پر امام نے اپنے ساتھ موجود افراد کو جمع کیا اور فرمایا: "ایها الناس! قد خذلتنا شیعتنا فمن اراد منکم الانصراف فلینصرف." (اے لوگو! ہمارے شیعوں نے ہمیں تنہا چھوڑ دیا ہے۔ تم میں سے جو جانا چاہے وہ یہیں سے واپس چلا جائے)۔ (۶) یہی وہ مقام ہے جہاں پر وہ لوگ امام کا ساتھ چھوڑ گئے جو راستے میں امام کے ساتھ ہو لیے تھے لیکن امام کے خاص اصحاب آپ کے ساتھ رہے۔ (۷) یہ وہ

۱۔ اخبار الطوال۔ ص ۲۴۷

۲۔ الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۲۰

۳۔ تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۳۰۰

۴۔ یہ پیغام یہ تھا کہ جس قدر جلد ہو سکے امام حسین حجاز واپس لوٹ جائیں اور کوفہ تشریف نہ لائیں۔

۵۔ اخبار الطوال۔ ص ۲۴۷۔ ۲۴۸

۶۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۱۶۹

۷۔ اخبار الطوال۔ ص ۲۴۸

لوگ تھے جو مکہ سے امامؑ کے ساتھ تھے(۱) یا اس سے بھی پہلے مدینہ ہی سے آپ کے ساتھ آئے تھے۔(۲) آپ کو چھوڑ کر جانے والے لوگ وہ بدو (دیہاتی) تھے' جو یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ حسین ابن علی علیہما السلام کے ساتھ ایک ایسے شہر میں جا رہے ہیں جہاں سب ان کی اطاعت میں سر تسلیم خم کر چکے ہیں۔(۳) اب جب انہیں معلوم ہوا کہ ان کا یہ خیال درست نہیں تھا' تو وہ وہیں سے واپس لوٹ گئے۔

اس مرحلے کے بعد بھی امامؑ نے اپنا سفر جاری رکھا۔ اس مقام پر امامؑ کے لیے بالکل واضح ہو چکا تھا کہ سیاسی تجزیوں کے مطابق اب کوفہ جانا درست نہیں ہے' اور طبعاً سیاست اور سیاسی مسائل سے ماورا کچھ اور باتیں بھی تھیں' جنہیں سیاسی تجزیوں سے جدا رکھنا ہوگا۔ امامؑ "شراف" کے مقام کی جانب روانہ ہوئے اور رات وہیں بسر کی۔ اگلے دن ایک مرتبہ پھر سفر کا آغاز کیا۔ اسی دن دوپہر کے وقت دور سے ابن زیاد کے سپاہی حر ابن یزید ریاحی کی سربراہی میں نمودار ہوئے اور امامؑ کا راستہ روک لیا۔

واقعۂ کربلا اور اہلِ کوفہ

اب مناسب ہے کہ ہم کربلا کے واقعے کے بارے میں کوفیوں کے موقف کا جائزہ لیں۔

تاریخی کتابوں میں اور عوام کے درمیان بھی اہلِ کوفہ کو غدار اور خائن قرار دیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کے یہاں اپنے عہد و پیمان سے وفاداری شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے۔ ہم اس سے قبل اہلِ کوفہ کی نفسیات کی جانب اشارہ کر چکے ہیں اور کہہ چکے ہیں کہ اہلِ کوفہ "عجلت پسند" واقع ہوئے تھے اور "فیصلہ کرنے" میں ان کی یہی "جلد بازی" ہمیشہ خود ان کے اور ان کے حکمرانوں کے ضرر کا باعث بنی تھی۔ جلد بگڑ جانے کے ساتھ ساتھ جلد مطمئن ہو جانا' جلد گھٹنے ٹیک دینا اور جلد سرکشی پر اتر آنا اُن کے مزاج کا حصہ شمار کیا جاتا ہے۔(۴)

ہم اب یہاں واقعۂ کربلا میں اُن کے موقف کے بارے میں چند نکات پیش کریں گے:

کوفہ کی آبادی مختلف قبائل کا مجموعہ تھی۔ مختلف حکمرانوں کے دور میں اس آبادی کی ترکیب مختلف تھی۔ قبائل کی تقسیم بندی میں یہ تبدیلی حکمرانوں کی مصلحتوں کی مناسبت سے ہوا کرتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود زیادہ تر حکمران ان قبیلوں

۱۔ انساب الاشراف۔ ج۳۔ ص۱۶۹

۲۔ تاریخ طبری۔ ج۴۔ ص۳۰۰۔۳۰۱

۳۔ ایضاً۔ ج۴۔ ص۳۰۰

۴۔ دیکھئے: خلافت امام حسنؑ کے آغاز میں اہلِ کوفہ کی خصوصیات سے شناسائی کی بحث۔

کے سرداروں اور بزرگوں کا بھی خیال رکھتے تھے اور جانتے تھے کہ بہت سے معاملات میں ان کی طاقت اس شہر کے حکمرانوں کی طاقت سے زیادہ ہوتی ہے۔

شیعہ اس شہر کی آبادی کا صرف ایک حصہ تھے۔ یہ بات درست ہے کہ بعض قبائل شیعیت کی شہرت رکھتے تھے' لیکن کسی بھی قبیلے کو سو فیصدی شیعہ قبیلہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ شیعہ مختلف قبیلوں میں بکھرے ہوئے تھے اور ان کے درمیان کوئی اتحاد موجود نہیں تھا۔ اپنے قبیلے کی مخصوص نفسیات کے علاوہ' ایک خاص کوفی نفسیات بھی ان پر غالب تھی۔ لہٰذا یہ دوسروں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھے۔

اُس زمانے میں شیعوں کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی۔ کہتے ہیں کہ جب ''حجر بن عدی'' نے مسجد میں ''زیاد'' کی باتوں کی مخالفت کی' تو مسجد میں موجود نصف یا ایک تہائی لوگوں نے ان کا ساتھ دیا۔ اس شہر کے شیعوں کی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے اور یہ جانتے ہوئے کہ بہرصورت اس شہر کے کچھ لوگ سیاسی تشیع کی بنیاد پر' یعنی صرف سیاسی مسائل میں کسی حد تک اولادِ علیؑ کا ساتھ دیا کرتے تھے' یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں کی آبادی کا کم از کم ایک چوتھائی حصہ شیعیت کا حامل تھا۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اہلِ کوفہ نے امام حسین علیہ السلام کو دعوت دی' لیکن اُن کی مدد نہیں کی اور بعد میں اُن کے قتل میں بھی شامل رہے۔ اس کے باوجود یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ کون لوگ تھے؟ کن لوگوں نے خطوط لکھے اور کوفہ کے کتنے لوگوں نے امام حسینؑ کے خلاف جنگ میں شرکت کی؟

ابتدا ہی میں اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ بعد میں کوفہ علوی مذہب رکھنے والے شیعوں کا مرکز بن گیا تھا' حتیٰ اس نے آلِ علیؑ کی حاکمیت غصب کرنے کی وجہ سے بنی عباس کے خلاف بھی آواز بلند کی تھی۔ اسی وجہ سے نہ صرف بنی امیہ سے وابستہ مورخین اور محدثین اہلِ کوفہ سے متنفر تھے' بلکہ بنی عباس سے وابستہ لوگوں کے دلوں میں بھی ان سے دشمنی موجود تھی۔ شیعوں کی مظلومیت کی حد صرف سیاسی مظالم کی حد تک محدود نہیں تھی' بلکہ علمی لحاظ سے بھی یہ مظالم کا شکار رہے تھے۔ بہرحال بنی عباس سے وابستہ علمی فضا میں یہ بات ایک طبعی اور بدیہی امر ہے۔ لہٰذا ہمیں واقعات کا جائزہ لیتے وقت اس بات کو ذہن میں رکھنا ہوگا کہ ان واقعات کو نقل کرتے وقت شیعہ ہونے کی وجہ سے اہلِ کوفہ سے نفرت کا رنگ غالب رہا ہے۔

مندرجہ بالا نکتے کو مدنظر رکھتے ہوئے' اس جانب اشارہ ضروری ہے کہ ایسے مورخین یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ شیعہ وعدوں کے پابند نہیں ہوتے۔ بالالفاظ دیگر شیعوں کے دشمن یہ چاہتے ہیں کہ اہلِ کوفہ کے امام حسینؑ کا ساتھ نہ دینے کا گناہ شیعوں کے سر ڈال دیں۔ حالانکہ درج ذیل وضاحتیں کسی حد تک اس بات کی نشاندہی کریں گی کہ اس وقت کوفہ کی آبادی کا صرف ایک ہی حصہ شیعہ تھا اور وہ بھی ایسے حالات میں پھنس گئے تھے کہ امام حسینؑ کا دفاع نہیں کر سکے' اگرچہ اگر وہ ایثار کی حد تک قربانی دینا چاہتے' تو ایسا کر سکتے تھے۔ یہ وہ بات ہے جس کے بارے میں ہمیں مختصر طور پر کچھ

شواہد پیش کرنے چاہئیں۔

اس زمانے میں کوفہ کے حالات کی جو تصویر کشی کی جاسکتی ہے وہ یہ ہے:

یزید ایک ایسا شخص تھا جس کو برداشت کرنا شامیوں کے لیے تو آسان تھا لیکن عراقیوں کے لیے اسے برداشت کرنا بڑی حد تک مشکل نظر آتا تھا۔ جب وہ حاکم بنا' تو کوفہ کے شیعوں نے اسکی مخالفت کا آغاز کر دیا۔ کوفہ کے بہت سے دوسرے لوگوں کو بھی کیونکہ یزید کی جگہ لانے کے لیے کوئی اور نظر نہیں آرہا تھا' اس لیے عمومی فضا کے زیر اثر ان کی نگاہِ انتخاب بھی حسین ابن علیؑ ہی پر ٹھہری۔ علاوہ ازیں ان حالات میں جبکہ عراق' شامی حکومت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا' جب شیعوں کی جانب سے امام حسینؑ کے لیے دعوت کا آغاز ہوا' تو نہ صرف عام عوام نے (اپنی مخصوص نفسیات کے تحت) اسکی حمایت کا اظہار کیا' بلکہ وہ لوگ بھی جنہیں اپنا مقام خطرے میں نظر آرہا تھا' یا دوسروں کے جذبات سے متاثر ہو کر' انہوں نے بھی حسین ابن علیؑ کی حمایت کا اظہار کیا۔ (۱) اس کے نتیجے میں امام حسینؑ کی حمایت میں ایک جھوٹی لیکن عمومی فضا پیدا ہوگئی۔ یہ وہ فضا تھی کہ معاویہ کی موت سے پیدا ہونے والے سیاسی خلا کو بنی امیہ کے لوگ بھی ایک مدت تک پر نہیں کر سکے تھے۔ خاص طور سے کوفہ پر نعمان بن بشیر جیسے نرم خو انسان کی حکومت کی وجہ سے اس فضا میں اضافہ ہوا اور جب تک ابن زیاد کوفہ نہیں آ گیا' یہ فضا مسلسل بڑھ رہی تھی۔

امام حسین علیہ السلام کی ایک حدیث کو مدِنظر رکھتے ہوئے' سرداروں کی جانب سے دعوت دیے جانے کے لیے یہ احتمال بھی قبول کیا جاسکتا ہے کہ ان لوگوں نے جانتے بوجھتے یہ فضا پھیلائی تھی' تاکہ امام کو عراق بلا کر انہیں وہاں شہید کر دیں۔ امامؑ کی وہ حدیث یہ ہے: "وما كانت كتب الى الا مكيدة لى و تقرباً الى ابن معاويه۔" (انہوں نے مجھے دھوکا دینے اور معاویہ کے بیٹے کا قرب حاصل کرنے کے لیے خطوط لکھے تھے)۔ (۲) بہرحال یہ بات یقینی ہے کہ اس فضا کا بڑا حصہ بظاہر مثبت نظر آتا تھا اور جب مسلمؑ وہاں پہنچے اور یہ فضا دیکھی' تو انہوں نے امامؑ کو خط لکھا اور ان سے درخواست کی کہ جتنا جلد ہو سکے کوفہ تشریف لے آئیں۔

اہلِ کوفہ پر ابن زیاد کا دباؤ

بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کسی ایسے آمر کی مخالفت کریں اور اسکے خلاف اعلانِ بغاوت کریں جسے اقتدار پر

۱۔ عمرو بن حجاج اور شبث ابن ربعی جیسے لوگ جو کربلا میں ابن زیاد کے لشکر کے کمانڈر تھے ان لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے امام حسینؑ کو خطوط لکھے تھے۔ دیکھیے: الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۵۰۔۵۱

۲۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۱۸۵ الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۲۹

مکمل کنٹرول حاصل ہو اور جو ظالم اور بے باک ہو۔ جب نعمان بن بشیر کوفہ کا حاکم تھا تو لوگ اس کی نرم خوئی کی وجہ سے اطمینان کے ساتھ اپنے شیعہ ہونے کا اظہار کرتے تھے اور جب مسلمؑ کوفہ تشریف لائے تو شدت کے ساتھ ان کی حمایت کرتے تھے۔ حاکم کی تبدیلی اور ابن بشیر کی جگہ ابن زیاد کی آمد نے صورتحال کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ ابن زیاد کی سخت گیری نے بہت سے لوگوں کو خوفزدہ کر دیا اور جو لوگ جلد پریشان ہو جایا کرتے تھے اور جلد بازی میں فیصلے کرتے تھے وہ نہ صرف ابن زیاد کی جانب سے اپنے آپ کو خطرے میں محسوس کر کے بلکہ بہت جلد پہنچنے والے شامی لشکر کے بارے میں ابن زیاد کے پروپیگنڈے کو سن کر حواس باختہ ہو گئے۔

ابھی چند دن بھی نہ گزرے تھے کہ مسلمؑ کے حامی تیزی کے ساتھ پسپا ہونے لگے۔ شہر کے سردار اور بڑے لوگ جنہیں اب اطمینان ہو گیا تھا کہ کوفہ کی حکومت مستحکم ہے اور جو اموی حکومت کی مضبوطی کو واضح طور پر دیکھ رہے تھے انہوں نے مکمل کر امویوں کی حمایت شروع کر دی۔ یہ لوگ اس پورے عرصے کے دوران خاموش رہے تھے۔ قدرتی بات ہے کہ بہت سے لوگ قبیلے کے سرداروں کی مخالفت کو اپنے مفاد میں نہیں سمجھتے تھے۔ جب مسلمؑ نے ابن زیاد کے محل پر حملہ کیا تو انہی سرداروں نے ڈرا دھمکا کر اور لالچ دے کر مسلمؑ کے ساتھیوں کی تعداد کو کم سے کم کر دیا اور اس بات کو واضح کر دیا کہ انہیں لوگوں پر کنٹرول حاصل ہے۔(۱)

ابن زیاد کے ظلم واستبداد کے مقابلے میں اگر کوئی ایک بھی سردار مخالفت کرتا تو اس کے قبیلے والوں میں اسکی حمایت کی جرأت نہ تھی۔ نئے حالات میں یہ کوفہ کی صورتحال تھی۔ جب بنی مراد کے سربراہ ہانی ابن عروہ کو گرفتار کیا گیا۔ مورخین کے بقول "چار ہزار سوار اور آٹھ ہزار پیادے ان کے حامی تھے۔" اور اگر قبیلۂ کندہ سے تعلق رکھنے والے بنی مراد کے حلیفوں کا اضافہ کر لیا جائے تو ان کی مجموعی تعداد تیس ہزار افراد ہو جاتی تھی۔ اس کے باوجود جب انہیں گرفتار کیا گیا اور بازار میں زمین پر گھسیٹا گیا تو اپنی مدد کے لیے اُن کی پکار پر کم ہی افراد سامنے آئے۔(۲) تھوڑی ہی دیر بعد انہیں شہید کر دیا گیا اور کسی نے مخالفت نہیں کی۔

جب امام حسین علیہ السلام کربلا میں روک لیے گئے تو ابن زیاد نے ایک تقریر میں اہلِ کوفہ سے کربلا جانے کے لیے کہا۔ اس نے دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ: **فایما رجلٍ وجدناہ بعد یومنا ھذا متخلّفا عن العسکر برئت منہ الذمۃ**. (آج کے بعد جو کوئی بھی لشکر سے روگرداں پایا گیا میں اس سے بری الذمہ ہوں گا)۔(۳) اس کے معنی یہ تھے کہ

۱۔ تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۲۷۷، ابن اعثم۔ خط لکھنا میرے خلاف سازش اور یزید سے تقرب کے لیے تھا۔

۲۔ مروج الذہب۔ ج ۳۔ ص ۵۹

۳۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۱۷۸، اخبار الطوال۔ ص ۲۵۴۔ ۲۵۵

ایسے شخص کی سزا قتل ہے۔ ابن زیاد نے قعقاع ابن سوید کو حکم دیا کہ وہ کوفہ کا گشت کرے اور دیکھے کہ کسی نے لشکر سے روگردانی تو نہیں کی ہے۔ قعقاع نے تلاش کے دوران قبیلہ ہمدان سے تعلق رکھنے والے ایک شخص کو پکڑا جو اپنے باپ کی میراث لینے کے لیے کوفہ آیا ہوا تھا۔ قعقاع اسے ابن زیاد کے پاس لے گیا جس نے اس کے قتل کا حکم صادر کیا۔ اس کے بعد: فلم یبق محتلم بکوفه الا خرج الی العسکر بالنخیله. (کوئی بالغ مرد کوفہ میں دکھائی نہ دیتا تھا' سب کے سب کوفہ سے نکل کر نخیلہ کی لشکر گاہ میں چلے گئے تھے)۔(۱)

یہی وہ موقع تھا جب تمام تلواریں امام حسینؑ کے خلاف حرکت میں آ گئیں' حالانکہ یہ بات اطمینان کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اگر لوگ خود اپنی مرضی سے فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتے' تو وہ ہرگز یہ نہ کرتے اور اکثر لوگ اسی طرح کے تھے۔(۲) اب ہم اہلِ کوفہ کی توصیف میں فرزدق کے ان جملوں کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں جو انہوں نے امامؑ سے کہے تھے کہ: قلوبهم معک و سیوفهم علیک. (ان کے دل آپ کے ساتھ ہیں لیکن تلواریں آپ کے خلاف)۔(۳) یا یہ کہا تھا کہ: انت احب الناس الی الناس و القضاء فی السماء و السیوف مع بنی امیه. (آپ لوگوں کے نزدیک محبوب ترین انسان ہیں لیکن قضا آسمان پر ہے اور تلواریں بنی امیہ کے ساتھ)۔(۴) اس فقرے کی وضاحت کے لیے انہی کوفیوں میں سے امامؑ کے ساتھ ملحق ہو جانے والے ایک شخص مجمع بن عبداللہ العائذی کے کہے ہوئے ایک جملے کو بطور سند پیش کیا جا سکتا ہے' انہوں نے کہا کہ: تمام بااثر افراد آپ کے خلاف ہیں' لیکن بقیہ لوگوں کے دل آپ کے ساتھ ہیں' اگرچہ وہ کل آپ پر تلواریں تان کر کھڑے ہو جائیں گے۔(۵) ان حالات میں ممکن نہ تھا کہ لوگ کربلا جانے سے انکار کریں کیونکہ کربلا نہ جانا جان سے ہاتھ دھونے کے مترادف تھا۔ شیعوں اور ان لوگوں کے لیے جو ایسا نہیں کرنا چاہتے تھے' صرف دو ہی راستے تھے: یا امامؑ سے جا ملیں یا پھر کوفہ اور کربلا دونوں جگہوں سے دور ہو جائیں۔

۱۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۱۷۹

۲۔ ایران کے خلاف عراق کی جنگ میں ہم نے دیکھا کہ کس طرح عراقیوں کو ایرانی مسلمانوں کے خلاف جنگ پر مجبور کیا جاتا تھا۔ البتہ وہ لوگ بھی قصوروار ہیں۔ ہم کوفیوں کو بے قصور ٹھہرانا نہیں چاہتے۔ لیکن لوگوں کے آزادی کے ساتھ جنگ لڑنے جانے اور جبراً جنگ پر جانے میں فرق ہے۔ ہر چند بہت سے سردارِ قبائل کے سربرآوردہ افراد اور بنی امیہ سے وابستہ لوگ' جنہیں بعد میں زینبؑ اور ام کلثومؑ نے سخت ملامت کی تھی' اپنی مرضی سے کربلا آئے تھے۔

۳۔ تاریخ طبری۔ ج ۴۔ ص ۲۹۰' الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۲۰۔ ۱۲۳' اخبار الطوال۔ ص ۲۴۵' انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۱۶۵

۴۔ ترجمۃ الامام الحسین ابن سعد۔ ص ۷۱' ترجمۃ الامام الحسین ابن عساکر۔ ص ۲۰۶

۵۔ الکامل فی التاریخ۔ ج ۳۔ ص ۴۸

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو زبردستی امام حسینؑ سے جنگ کے لیے کربلا بھیجا جاتا تھا' وہ بیچ راستے سے فرار ہو جاتے تھے اور ان میں بہت سے لوگ کربلا نہیں پہنچتے تھے۔ عام طور پر کربلا میں ابن زیاد کے لشکر کی جو تعداد بتائی جاتی ہے' اُن اعداد و شمار پر مبنی ہے جو اس لشکر کو کربلا روانہ کرتے وقت تحریر کیے گئے تھے۔ حالانکہ لشکر میں سے بہت سے افراد راستے ہی سے فرار ہو گئے تھے۔ لہٰذا کربلا میں تقریباً دس ہزار یا شاید اس سے بھی کم افراد ہوں گے جو کوفہ کی آبادی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک بہت کم تعداد ہے۔ کہتے ہیں کہ مسجدِ کوفہ میں چالیس ہزار افراد جمع ہو سکتے تھے۔(۱) پس پتا چلتا ہے کہ بہت سے لوگ یا تو کوفہ ہی میں روپوش ہو جاتے تھے' یا راستے سے فرار ہو جاتے تھے۔

بلاذری نے لکھا ہے: **وكان الرجل يُبعث في الف فلا يصل الا في ثلاث ماة او اربع ماة و اقل من ذلک کراهة منهم لهذا الوجه.** (ایک سپہ سالار کو ایک ہزار کے لشکر کے ساتھ بھیجا جاتا تھا' لیکن جب وہ کربلا پہنچتا تھا تو اسکے ساتھ تین سو یا چار سو حتیٰ' اس سے بھی کم لوگ ہوتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگ کربلا جانا پسند نہیں کرتے تھے)۔(۲)

دینوری لکھتا ہے: جب ابن زیاد کسی سپہ سالار کو بہت سے لوگوں کے ساتھ کربلا کی جانب بھیجتا تھا تو: **يصلون الى كربلا و لم يبق منهم الا القليل 'كانوا يكرهون قتال الحسين فيرتدعون فيتخلفون.** (بہت کم لوگ کربلا پہنچتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حسینؑ کے ساتھ جنگ کو پسند نہیں کرتے تھے' اس لیے وہ لشکر سے جدا ہو کر پلٹ جاتے تھے)۔(۳)

لشکرِ یزید سے فرار کے علاوہ' کچھ لوگ امام حسینؑ کی مدد کے لیے آپ سے آملنے کی کوشش میں بھی مصروف تھے۔ جس دن امامؑ کربلا پہنچے' اُس دن سے آپؑ کے روزِ شہادت تک آٹھ دن کا فاصلہ تھا۔ بہت سے لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ امام حسینؑ کے ساتھ جنگ یا اُن کی شہادت کی نوبت آجائے گی۔ ہم جانتے ہیں کہ حر ابن یزید ریاحی کو بھی صبح عاشور ہی معاملے کی سنگینی کا اندازہ ہوا تھا اور وہ امامؑ کے ساتھ آملے تھے۔ شاید بہت سے لوگ حر ہی کی طرح سوچ رہے ہوں۔ حر نے امامؑ سے کہا: **بابي أنت وامي !ما ظننت الامر فينتهي بهؤلاء القوم الى ما ارى و ظننت انهم سيقبلون منک احدى الخصال التي عرضتها عليهم فقلتُ في نفسي لا اُبالي ان اطيع القوم في بعض امورهم.** (میرے ماں باپ آپ پر فدا! میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان لوگوں کا معاملہ یہاں تک جا پہنچے گا

۱۔ تشیع در مسیر تاریخ۔ ص ۱۶۰

۲۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۱۷۹

۳۔ اخبار الطوال۔ ص ۲۵۴

جو میں دیکھ رہا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ آپ نے جو تجاویز اُن کے سامنے رکھی ہیں وہ اُن میں سے ایک نہ ایک تو مان ہی لیں گے۔ میں نے سوچا تھا کہ بعض معاملات میں ان کی اطاعت میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن اب۔۔۔۔)۔(۱)

صرف حری تھے جو چند لوگوں کے ہمراہ امامؑ کی طرف چلے آئے۔ دوسرے لوگوں کے ذہن میں اگر یہ خیال آیا بھی تو وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ اسی لیے اگر شیعہ حمایت کرنا چاہتے تھے تو بھی انہوں نے تیزی نہیں دکھائی اور صرف کچھ خاص لوگوں نے یہ سوچا اور ابتدا ہی میں امامؑ سے آملنے میں کامیاب ہو گئے۔ نافع بن ہلال مرادی، عمر بن خالد صیداوی، عمر بن خالد کے ایک موالی سعد اور قبیلہ مذحج کے مجمع بن عبداللہ العائذی امامؑ سے ملحق ہو گئے۔(۲)

عاشورا سے قریب کے دنوں میں مسلم بن عوسجہ اور حبیب ابن مظاہر بھی امامؑ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ابن سعد نے بھی تحریر کیا ہے کہ صبح عاشور تقریباً بیس افراد امامؑ سے ملحق ہوئے تھے۔(۳) ابن قتیبہ نے ایسے افراد کی تعداد تیس لکھی ہے۔(۴) مورخین نے کچھ دوسرے ناموں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔(۵)

لوگوں کے یوں بھاگ بھاگ کر امامؑ کے ساتھ جا ملنے نے ابن زیاد کو مجبور کر دیا کہ وہ لوگوں کو اس عمل سے باز رکھے۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایک کام کیا۔ ابن سعد جو ایک بہت قدیم راوی ہے، وہ لکھتا ہے کہ: **وجعل الرجل والرجلان والثلاثة يتسللون الى حسين من الكوفه.** (لوگ ایک ایک، دو دو اور تین تین کی صورت میں کوفہ سے نکل کر امامؑ کے ساتھ ملتے جا رہے تھے۔ جب یہ اطلاع ابن زیاد تک پہنچی تو اس نے حکم دیا کہ لشکرگاہ کو تیار کیا جائے، اور عمرو بن حریث کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو نخیلہ جانے پر مجبور کرے۔ اس نے یہ بھی حکم دیا کہ پل کی نگرانی کی جائے تاکہ کوئی اس علاقے سے فرار نہ ہو سکے)۔(۶)

اُس نے حصین بن نمیر سے بھی کہا کہ وہ قادسیہ اور قطقطانہ کے درمیانی علاقے کی نگرانی کرے، اور کسی کو اس راستے سے حجاز کی سمت جانے کی اجازت نہ دے۔ کیونکہ ممکن تھا کہ اس راستے سے کچھ لوگ امامؑ کے ساتھ جا ملیں۔(۷) ابن زیاد

۱۔ تجارب الامم۔ ج ۲۔ ص ۷۰

۲۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۱۷۲

۳۔ ترجمة الامام الحسین ابن سعد۔ ص ۱۷۸

۴۔ الامامہ والسیاسہ۔ ج ۲۔ ص ۷

۵۔ الکامل فی التاریخ۔ ج ۳۔ ص ۲۷۳

۶۔ ترجمة الامام الحسین ابن سعد۔ ص ۱۷۸۔۱۷۹

۷۔ اخبار الطوال۔ ص ۲۴۳

نے بصرہ میں اپنے والی کو لکھا کہ وہ تمام راستوں پر پہرے دار بٹھا کر انہیں کنٹرول کرے' اور اگر کوئی وہاں سے گزرے' تو اسے گرفتار کر لے۔(۱)

واضح ہے کہ اس کی مراد ایسے افراد تھے جو ممکن ہے امامؑ کی مدد کے لیے جارہے ہوں۔ اسی طرح ابن زیاد نے یہ بھی حکم دیا تھا کہ شام کی جانب بصرہ تک واقصہ کے درمیانی راستوں کو بھی کنٹرول کرے اور نہ کسی کو وہاں پر جانے دے اور نہ کسی کو وہاں سے نکلنے دے۔(۲)

ایک موقع پر حبیب ابن مظاہر نے قبیلۂ بنی اسد کو' جو وہیں نزدیک میں سکونت پذیر تھا' امامؑ کی مدد کے لیے آمادہ کیا' لیکن عبید اللہ کا لشکر ان کے ستر افراد اور امامؑ کے درمیان حائل ہو گیا اور کسی کو امامؑ کے ساتھ ملحق ہونے کی اجازت نہیں دی۔(۳) اس زمانے میں بہت سے لوگ قید بھی تھے' جن کی ایک مثال مختار ابن ابی عبیدہ ثقفی ہیں۔ ابن زیاد نے انہیں گرفتار کر کے کوڑے مارے تھے۔ انہی کوڑوں کی وجہ سے مختار کی ایک آنکھ کی بینائی ہمیشہ کے لیے ضائع ہو گئی تھی۔(۴) یہ انتہائی سخت کنٹرول اہلِ کوفہ کی طرف سے امامؑ کا ساتھ نہ دینے کی ایک بڑی وجہ شمار ہوتا ہے۔

ابن زیاد نے دھمکیوں کے ساتھ ساتھ لالچ دینے سے بھی کام لیا تھا۔ اُس نے لوگوں کے جانے سے پہلے ان سے کہا تھا کہ یزید نے مجھے چار ہزار دینار اور دو لاکھ درہم بھجوائے ہیں' تاکہ تمہارے درمیان تقسیم کروں اور تمہیں اس کے دشمن سے لڑنے کے لیے لے جاؤں۔(۵) مالی بخششوں کی جانب لوگوں کی رغبت' ان میں سے بعض کو کربلا میں امام حسینؑ کے خلاف اُکسا سکتی تھی۔ جب امامؑ نے دیکھا کہ لوگ واقعاً انہیں قتل کرنے کے درپے ہیں' تو آپ نے فرمایا: "**یا ھؤلاء! اسمعوا یرحمکم اللّٰہ 'مالنا ولکم' ما ھذا بکم یا اھل الکوفۃ؟ قالوا خفنا العطاء.**" (اے لوگو! سنو' خدا تم پر رحم کرے' میرے اور تمہارے درمیان کیا ہے؟ اے اہلِ کوفہ تم کو کیا ہو گیا ہے؟ انہوں نے کہا: ہمیں "ان سے ملنے والے عطیوں" سے محروم ہو جانے کا خوف ہے)۔ امامؑ نے جواب دیا: "**ما عند اللّٰہ من العطاء خیر لکم.**" (جو عطا خدا کے پاس ہے وہ تمہارے لیے بہتر ہے)۔(۶) لیکن کسی نے بھی امامؑ کی بات پر کان نہ دھرے۔

۱۔ تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۲۹۳۔ اس سے پہلے امامؑ ایک خط میں بصرہ کے بعض شیعہ عمائدین سے مدد کی درخواست کر چکے تھے۔ ج ۳۔ ص ۴۴

۲۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۱۷۳' ۱۷۹' تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۲۹۵

۳۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۱۸۰' الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۵۹۔ ۱۶۰

۴۔ المحبر۔ ص ۳۰۳

۵۔ الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۵۷

۶۔ ترجمۃ الامام الحسین ابن سعد۔ ص ۱۷۸

یہ سارے شواہد اس نکتے کی نشاندہی کے لیے پیش کیے گئے ہیں کہ درحقیقت کچھ لوگ' جن میں وہاں کے سردار اور ان سے وابستہ افراد بھی شامل ہیں' ایسے مجرم ہیں جو ملامت کرنے والوں کی ہر قسم کی ملامت کے لائق ہیں۔ لیکن اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے کہ اس وقت ایک خاص قسم کی آمریت اور استبداد کی فضا حاکم تھی بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو امامؑ کے ساتھ مل جانے کا ارادہ رکھتے تھے' لیکن ایسا نہ کر سکے۔

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ بلاذری لکھتا ہے: سعد بن عبیدہ کہتا تھا: کوفیوں میں سے ہمارے بہت سے بوڑھے ایک ٹیلے پر کھڑے یہ دعا کر رہے تھے کہ: "اللھم انزل علیہ نصرک." (بارالہا! حسینؑ پر اپنی نصرت نازل فرما)۔ سعد کہتا ہے' میں نے اُن سے کہا: "یا اعداء اللّٰہ الا تنزلون فتنصرونہ." (اے دشمنانِ خدا! تم نیچے اتر کر ان کی مدد کیوں نہیں کرتے؟)۔(۱)

بہرحال اس بات میں انکار کی گنجائش نہیں کہ کوفیوں نے امامؑ کو شہید کیا ہے۔ جبکہ اُن کے درمیان صرف ایک شامی تھا۔(۲) لیکن اس کے باوجود تمام کوفیوں کو ایک واحد گروہ نہیں سمجھنا چاہیے۔

امام حسینؑ کے عراق کی جانب سفر کا تجزیہ

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ جو کچھ ہونے والا تھا اس کو مدنظر رکھتے ہوئے امامؑ کا عراق کی جانب سفر مصلحت کے مطابق تھا یا نہیں؟ یہاں ہم چاہتے ہیں کہ واقعۂ کربلا کے ''غیبی'' پہلو سے صرفِ نظر کرتے ہوئے' امام حسینؑ کے عراق کی جانب سفر کا مختصر سیاسی تجزیہ کیا جائے۔

پہلا سوال یہ ہے کہ عراق جانے کے سوا امام حسینؑ کے پاس کوئی اور راستہ بھی تھا یا نہیں؟ اور کیا عراق میں یزید کے خلاف کسی انقلاب اور مخالفت کی بنیاد رکھی جا سکنے کا کوئی امکان موجود تھا؟

اگر رائج تاریخی کتابوں کو دیکھا جائے' تو ان میں بار بار کیے جانے والے ایسے اعتراضات نظر آتے ہیں جن کا مضمون یہ ہے کہ عراق جانا کسی بھی صورت میں قرینِ مصلحت نہ تھا۔ یہ اعتراضات ابتدا ہی سے کیے جا رہے ہیں۔ جب امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی شہادت کے بعد اہلِ کوفہ نے امام حسین علیہ السلام کو کوفہ آنے کی دعوت دی' تو امامؑ نے انہیں جواب دیا: ''جب تک معاویہ زندہ ہے' میں کسی انقلابی تحریک کے حق میں نہیں۔''(۳) ممکن ہے آپ کی نظر میں اسکی

۱۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۲۲۶

۲۔ الکامل فی التاریخ۔ ج ۴۔ ص ۲۸' مروج الذہب۔ ج ۳۔ ص ۶۱ (حتیٰ اس ایک آدمی کا بھی ذکر نہیں کیا ہے)

۳۔ ترجمۃ الامام الحسینؑ ابن عساکر۔ ص ۱۹۷' اخبار الطوال۔ ص ۲۲۲۔ ۲۲۳

وجہ یہ ہو کہ اہلِ کوفہ میں معاویہ کے حیلوں کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں۔ یہ اور ماضی میں آپ کے والد علی ابن ابیطالبؑ اور بھائی حسنؑ کے زمانے میں معاویہ کے مقابلے میں اہلِ کوفہ کو آزمایا جا چکا تھا۔

جب امام نے بیعت سے انکار کے ذریعے اپنی مخالفت کا اظہار کرنے کے بعد مکہ کی جانب سفر اختیار کیا' تب بھی عراق کی جانب آپ کے سفر کا امکان پیشِ نظر تھا۔ لہٰذا بعض راویوں کے مطابق' عبداللہ بن مطیع نے مدینہ سے مکہ جاتے ہوئے راستے میں امام کو کوفہ جانے سے گریز کی تاکید کی تھی۔(۱)

جب امام مکہ پہنچے تو بہت زیادہ لوگوں نے امام کے کوفہ کی جانب سفر کی مخالفت کی۔ عبداللہ ابن عباس نے مشورہ دیا کہ امام عراق جانے سے صرفِ نظر کریں' اور یمن کی طرف چلے جائیں' کیونکہ ایک تو وہ پہاڑی علاقہ ہے اور دوسرے وہاں آپ کے والد کے شیعہ بھی بکثرت موجود ہیں اور وہ آپ کے لیے ایک خاص محفوظ مقام ہوگا۔(۲) ابن اعثم نے یہ بات ابن حنفیہ کے حوالے سے نقل کی ہے۔(۳) عمرو بن عبدالرحمان ابن ہشام کہتا تھا: لوگ درہم و دینار کے غلام ہیں اور یہ دونوں بھی حکمرانوں کے پاس ہیں' (لہٰذا) کہیں آپ عراق نہ چلے جایئے گا۔(۴) عبداللہ ابن عمر کو بھی اعتراض تھا۔ وہ خونریزی سے خوف زدہ تھا۔(۵) عبداللہ ابن جعفر نے بھی عراق میں آپ کے قتل کر دیے جانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ: اگر آپ قتل ہو گئے' تو: انی اخاف ان یطفی ء نور الارض و انت روح الھدیٰ و امیر المؤمنین' فلا تعجل الی العراق فانی آخذ لک الامان من یزید. (مجھے اس بات کا خوف ہے کہ کہیں آپ کے مارے جانے کے نتیجے میں زمین کا نور بجھ نہ جائے' آپ ہدایت کی روح اور امیر المومنین ہیں۔ پس آپ عراق جانے میں جلدی نہ کریں۔ میں یزید سے آپ کے لیے امان لے لوں گا)۔(۶) ابوسعید خدری سے بھی منقول ہے کہ انہوں نے کہا: لا تخرج علی امامک . (اپنے امام کے خلاف خروج نہ کیجیے)۔(۷) مسور بن مخرمہ بھی اعتراض کرنے والوں

۱۔ الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۳۶۔ ۳۷' اخبار الطوال۔ ص ۲۲۸' ۲۲۹' الکامل فی التاریخ۔ ج ۴۔ ص ۱۹۔ صفحہ ۱۴۱ پر مکہ سے کوفہ کے راستے میں ابن مطیع کے ساتھ امام کی ملاقات کا ذکر ہوا ہے۔

۲۔ اخبار الطوال۔ ص ۲۴۴' الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۱۳' تاریخ طبری۔ ج ۴۔ ص ۲۸۷' انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۱۶۱' الکامل فی التاریخ۔ ج ۴۔ ص ۳۹

۳۔ ابن اعثم۔ ج ۵۔ ص ۳۲

۴۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۱۶۱' الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۱۰' تاریخ طبری۔ ج ۴۔ ص ۲۸۷

۵۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۱۶۳' الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۳۹' ترجمۃ الامام الحسین ابن سعد۔ ص ۱۶۶

۶۔ ابن اعثم۔ ج ۵۔ ص ۱۱۶' تاریخ طبری۔ ج ۴۔ ص ۲۹۱' ابن اثیر۔ ج ۴۔ ص ۴۰

۷۔ ترجمۃ الامام الحسین ابن سعد۔ ص ۱۶۷

میں شامل تھا۔ اس نے امامؑ کو لکھا: آپ عراقیوں کے دھوکے میں نہ آئیں۔(۱) ابو واقد لیثی نے بھی اسی قسم کی بات کی تھی۔(۲) فرزدق بھی جو عراق سے حجاز جارہا تھا' وہ بھی اس سفر کے مخالفین میں سے تھا۔(۳)

تاریخ کی کتابوں نے ان اعتراضات اور کچھ دوسرے اعتراضات کا ذکر کیا ہے اور امکان ہے کہ بعض مفاد پرست راویوں نے انہیں بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کوشش بھی کی ہو' تاکہ یہ ظاہر کرسکیں کہ واقعاً امامؑ دھوکے میں آگئے تھے اور بلاوجہ عراق کی جانب روانہ ہوئے تھے۔

عراق جانے کی ضرورت کے بارے میں خود امامؑ کا جواب نقل کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ ہم ایک مقدمہ ذکر کریں' تاکہ امامؑ کا جواب بہتر طور پر سمجھ میں آسکے۔

تاریخِ سیاست اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ کسی انقلابی فرد نے یقینی کامیابی کے امکان کے ساتھ سیاسی عمل انجام دیا ہو اور بغیر کسی خطرے کا سامنا کیے اسے مقصد کا حصول ممکن نظر آتا ہو۔ جو لوگ حصولِ اقتدار کے لیے سرگرمِ عمل ہوتے ہیں (چاہے اُن کا مقصد اچھا ہو یا بُرا) اُنہیں ہمیشہ مختلف امکانات کا سامنا ہوتا ہے۔ دنیائے سیاست میں کامیاب ترین لوگوں اور مقبول ترین افراد کے سامنے بھی ہمیشہ مشکلات' حتیٰ سب کچھ ہاتھ سے نکل جانے کا امکان موجود ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ تصور نہیں رکھنا چاہیے کہ صرف سو فیصدی یقینی کامیابی کے امکان کی صورت ہی میں قدم اٹھانا چاہیے۔ یہ بات تاریخی حقائق سے کوسوں دور اور سیاسی عمل کی ماہیت کے بارے میں سادگی پر مبنی سوچ کا نتیجہ ہے۔

امام حسین علیہ السلام کے مسئلے میں بھی یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ امامؑ کو اس سفر کی کامیابی کا سو فیصدی یقین ہونا چاہیے تھا۔ جو لوگ امامؑ کے کوفہ جانے کو خلافِ مصلحت سمجھتے ہیں' اُنہیں صرف ایسی باتوں کو مدنظر نہیں رکھنا چاہیے جن سے شکست کا امکان دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً یہ بات کہ اہلِ کوفہ کی اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ آزمائش ہوچکی تھی۔ اسی طرح وہ شخص جو امامؑ کے کوفہ جانے کا حامی ہے' اُسے بھی یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ شکست کا کوئی امکان نہ تھا۔ ان چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے' اُن حالات میں اُس صورتحال کا جائزہ لینا چاہیے جس کا امامؑ کو سامنا تھا اور اس کے بعد تاریخی شواہد اور امامؑ کے کلمات کی روشنی میں آپ کے عراق جانے کے مسئلے کا تجزیہ کرنا چاہیے۔(۴)

امامؑ کسی بھی صورت میں یزید اور اس کی حکومت کی تائید نہیں کرنا چاہتے تھے' چاہے اس مخالفت کا نتیجہ آپ کی

۱۔ ترجمۃ الامام الحسینؑ ابن سعد۔ ص ۱۶۷

۲۔ ایضاً۔ ص ۱۶۶

۳۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۱۶۵

۴۔ جیسا کہ گفتگو کے آغاز میں بھی ذکر ہوا' یہ موضوع علمِ امامت کی کلامی بحث سے خارج ہے۔

شہادت کی صورت ہی میں برآمد ہو۔ ساتھ ہی امامؑ اس کوشش میں بھی تھے کہ اگر ممکن ہو تو یزید کے خلاف ایک انقلاب برپا کر کے معاشرے پر اپنی حکومت قائم کر لیں۔ یہی امامؑ کی تمنا کا دائرہ تھا اور اسی دائرے میں رہتے ہوئے امامؑ کو دستیاب امکانات میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا اور قدرتی بات ہے کہ آپ کو مختلف مشوروں اور اعتراضات پر ردِ عمل بھی ظاہر کرنا تھا۔ امامؑ کا یہ دائرۂ عمل کسی بھی صورت میں تبدیل نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا ہر ایسی تجویز جو کسی بھی طور پر اسے نقصان پہنچاتی تھی' وہ امامؑ کی نظر میں مذموم اور ناقابلِ قبول تھی۔

اُس زمانے میں سیاسی حوالے سے عالمِ اسلام ایک خاص صورتحال سے دوچار تھا۔ امامؑ پر لازم تھا کہ اس طرح کام کریں کہ اس صورتحال میں کامیابی کے ساتھ اپنا مقصد حاصل کر لیں' جو اسلام کا دفاع اور عدل و انصاف پر مبنی حکومت کا قیام تھا۔ قدرتی طور پر امامؑ نے بھی حالات کے لحاظ سے ایک سے زیادہ مقاصد کو پیشِ نظر رکھا ہوگا۔ حکومت کا حصول وہ سب سے بڑی کامیابی ہو سکتی ہے جس کے بارے میں امامؑ نے سوچا ہوگا۔ اگر اس کا حصول ممکن نہ ہو' تو بہر صورت امامؑ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے کی حیثیت سے اپنی ذمے داری ادا کرنے میں کامیاب رہتے۔ اور اگر بالفرض اس حد تک بھی کامیابی حاصل نہ ہو' تو امامؑ کو یہ اطمینان تو ہونا چاہیے کہ آپ نے اپنا خون بہا کر شجرِ اسلام کی آبیاری کر دی ہے اور لوگوں کو اس بات سے آگاہ کر دیا ہے کہ وہ اس وقت کن بُرے حالات میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اُس وقت کی صورتحال یہ تھی کہ یزید امام حسینؑ جیسی کسی شخصیت کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا تھا کہ وہ اُسکی بیعت کیے بغیر آرام و سکون کے ساتھ زندگی گزار سکے۔ کیونکہ امام حسینؑ آرام کے ساتھ بیٹھے رہنے والے انسان نہ تھے۔ اس صورت میں اگر امامؑ اُسکی بیعت نہ کریں' تو یزید کے پاس آپ کو قتل کر دینے کے سوا کوئی اور راستہ نہ تھا۔ دوسری طرف شام سے قطع نظر خود مکہ اور مدینہ اور مجموعی طور پر حجاز کے حالات ایسے نہ تھے کہ وہ امامؑ کو قتل کرنے کے یزید کے ارادے کے سامنے کوئی مزاحمت ظاہر کرے۔

امامؑ کے لیے لازم ہو گیا تھا کہ وہ کسی اور علاقے کے بارے میں سوچیں۔ عارضی اور وقتی طور پر مکہ چلے جانا مناسب دکھائی دیتا تھا۔ کیونکہ بہر صورت یہ شہر حرم شمار ہوتا تھا اور کچھ عرصے تک وہاں امن و امان کے ساتھ رہا جا سکتا تھا۔ لیکن اس شہر کو مستقل مورچہ بنانے کے بارے میں نہیں سوچا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اہلِ مکہ نے نہ صرف امامؑ کی کوئی خاص حمایت نہیں کی تھی' حتیٰ انہوں نے امیر المومنینؑ کی بیعت بھی تاخیر سے کی تھی۔ اس صورت میں صرف عراق ہی کے بارے میں سوچا جا سکتا تھا جو امامؑ کے شیعوں کا مرکز تھا۔ اس علاقے کے لوگ کچھ دوسری وجوہات کی بنا پر بھی شام سے متنفر تھے۔ اہلِ کوفہ کی طرف سے امامؑ کو جو دعوت نامے موصول ہوئے اُن سے اس امکان کو اور تقویت ملی اور کامیابی کے امکان میں اضافہ کیا۔

اس تجزیے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عراق میں امامؑ کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر امامؑ کسی جگہ مستقل ٹھکانا

بنانا چاہیں‘ تو انہیں اس کے لیے کس مقام کا انتخاب کرنا چاہیے؟

کیا امام حسینؑ بیعت کر سکتے تھے؟

کیا یزید امام حسینؑ کو بغیر بیعت کیے زندہ رہنے دیتا؟

اگر امام حسینؑ عراق تشریف نہ لے جاتے‘ تو اس صورت میں کیا تمام مورخین یہ نہ لکھتے کہ اگر وہ عراق چلے جاتے تو کامیاب ہو جاتے؟

کیا یہ نہ لکھا جاتا کہ امامؑ نے لوگوں کے خطوط کا مثبت جواب کیوں نہ دیا؟

آپ نے کیوں اس بات کی اجازت دی کہ حجاز میں یزید کے کارندوں کے ہاتھوں قتل ہو جائیں اور کوئی قدم نہ اٹھایا؟

اگر امامؑ کوفہ کا سفر اختیار نہ کرتے‘ تو یہ اور اس قسم کے اور سوالات ہر عقلمند انسان کے ذہن میں ضرور پیدا ہوتے۔

یہ بات بھی مدنظر رہے کہ امامؑ پر اعتراض کرنے والے وہ لوگ جن کی خواہش تھی کہ امامؑ ''خروج نہ کریں'' اُن کی گفتگو کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ چاہے وقتی طور پر ہی سہی لیکن یزیدی حکومت کو قبول کر لیا جائے۔ اور یہ امامؑ کے لیے ممکن نہ تھا۔ حتیٰ عبداللہ بن جعفر کی گفتگو بھی اسی چیز پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ یزید سے امان لینا قدرتی طور پر امامؑ کے بیعت کر لینے ہی سے مشروط تھا اور یہ امامؑ کے لیے کسی صورت قابلِ قبول نہ تھا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ خود امامؑ کا جواب اور تاریخی شواہد کس طرح اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

وہ نکات جن کی جانب امامؑ نے متعدد مواقع پر اشارہ فرمایا ہے‘ اُن میں سے ایک یہ ہے کہ یزید اور اس کے کارندے انہیں مکہ میں زندگی گزارنے کی اجازت نہیں دیں گے اور ہر صورت میں انہیں قتل کر دیں گے۔ امامؑ نے ابن عباس کے اعتراض کے جواب میں فرمایا: **"لأن اقتل خارجاً منها بشبرين احب الي من ان اقتل خارجاً منها بشبر."** (میرا مکہ سے دو بالشت دور جا کر قتل ہونا مکہ سے ایک بالشت دور جا کر قتل ہونے سے بہتر ہے)۔(۱) اس جملے میں مکہ کی حرمت کی حفاظت کی جانب اشارے کے ساتھ ساتھ اس نکتے کی جانب توجہ بھی نظر آتی ہے کہ امامؑ کی جان خطرے میں تھی اور امامؑ کو اس بارے میں کوئی قدم اٹھانا چاہیے تھا۔

امامؑ نے ابن عمر کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: **"انّ القوم لا يتركوني... فلا يزالون حتى اُبايع واني كاره فيقتلوني."** (یہ لوگ مجھے نہیں چھوڑیں گے۔۔۔ یہ لوگ مجھ سے بیعت لینے پر مصر ہیں اور میں بیعت نہیں

۱۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۱۶۴‘ تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۲۸۹‘ الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۱۳‘ ترجمۃ الامام الحسین ابن عساکر۔ ص ۱۹۰‘ المعرفۃ و التاریخ۔ ج ۱۔ ص ۵۴۱‘ مجمع الزوائد۔ ج ۱۔ ص ۱۹۲‘ مروج الذھب۔ ج ۳۔ ص ۵۵‘ الکامل فی التاریخ۔ ج ۳۔ ص ۳۸

کرنا چاہتا۔ لہٰذا یہ لوگ مجھے قتل کر ڈالیں گے)۔(۱) یہ جملہ امامؑ کی حالت اور اس وقت موجود زمینی حقائق کی بخوبی نشاندہی کرتا ہے۔ ایک اور مقام پر امامؑ نے فرمایا: "ولو کنت فی جُحر ھامة من ھوام الارض لا سْتخرجونی و یقتلوننی." "(اگر میں صحرائی جانوروں کے بل میں بھی جا چھپوں تو یہ مجھے وہاں سے بھی نکال کر قتل کر دیں گے)۔(۲) جب امامؑ سے پوچھا گیا کہ آپ روانگی میں جلدی کیوں کر رہے ہیں تو آپ نے فرمایا: "لو لم اعجل لاخُذت." (اگر میں عجلت نہیں کروں گا تو مجھے گرفتار کر لیا جائے گا)۔(۳) ایک اور موقع پر فرمایا: "ان بنی امیہ اخذوا مالی فصبرتُ وشتموا عرضی فصبرت وطلبوا دمی فھربْتُ." (بنی امیہ نے میرا مال لے لیا میں نے صبر کیا میری عزت پر ہاتھ ڈالا میں نے صبر سے کام لیا اب وہ میرا خون بہانا چاہتے ہیں تو میں نے گریز اختیار کیا)۔(۴)

یہ روایات اس بات کی سچائی کی گواہ ہیں کہ وہ لوگ ہر صورت میں امامؑ کو قتل کرنا چاہتے تھے اور بغیر بیعت کیے امامؑ کے زندہ رہنے کی کوئی امید نہ تھی۔

اس معاملے کا دوسرا رُخ امامؑ کا عراق کی جانب روانہ ہونا ہے۔ جب امامؑ نے مکہ سے نکل جانے کا فیصلہ کیا تو اسکے بعد آپ کو سکونت کے لیے کس جگہ کا انتخاب کرنا چاہیے تھا؟

ماہِ شعبان سے ماہِ ذی الحجہ تک کے عرصے میں جب امامؑ مکہ میں تھے عراق سے آپ کو مسلسل خطوط موصول ہو رہے تھے۔ یہ خطوط اس طرح کے تھے کہ بعد میں یہی عراق جانے کے لیے امامؑ کی سب سے بڑی دلیل بنے۔ متعدد مقامات پر جب امامؑ کے کوفہ جانے پر اعتراض کیا جاتا تھا تو امامؑ ان خطوط کا ذکر فرماتے تھے۔(۵) جب امامؑ کا سامنا حر سے ہوا تو آپ نے انہی خطوط کو اپنے کوفہ آنے کی دلیل بیان کیا تھا۔ جب عمر ابن سعد نے امامؑ کے عراق آنے کی وجہ پوچھی تھی تو آپ کا جواب یہی خطوط تھے۔

جب بجیر بن شداد نے امامؑ سے کوفہ جانے کی وجہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا: "ھذه کتب وجوه اھل المصر." "(یہ اس شہر کے بڑوں کے خطوط ہیں)۔(۶) صبحِ عاشور بھی آپ نے اپنے کوفہ آنے کی وجہ انہی خطوط کو قرار

۱۔ الکامل فی التاریخ۔ ج ۴۔ ص ۳۸

۲۔ الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۱۶، الکامل فی التاریخ۔ ج ۴۔ ص ۳۸

۳۔ تاریخ طبری۔ ج ۴۔ ص ۲۹۰

۴۔ الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۲۳

۵۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۱۶۳۔۱۶۵

۶۔ ترجمۃ الامام الحسینؑ ابن سعد۔ ص ۱۷۳

دیا۔ (۱) آپ نے عبد اللہ ابن عمر کو بھی یہی خطوط دکھائے۔ (۲) اور آپ ہر مقام پر اعتراضات کے جواب میں یہی فرماتے تھے کہ: "خلفی مملوءۃ بالکتب." (میرے گھوڑے پر بندھا ہوا تھیلا ان کے خطوط سے بھرا ہوا ہے)۔ (۳)

اتنے بڑے پیمانے پر دی گئی یہ دعوت سنجیدگی پر مبنی دکھائی دیتی تھی۔ خاص طور پر جبکہ عوام الناس کے علاوہ اکثر خطوط کوفہ کے سرداروں کی جانب سے ارسال کردہ تھے۔ یعنی اُن لوگوں کے خطوط تھے جن کی عوام اتباع کیا کرتے تھے۔ ان میں شیعوں کے علاوہ دوسرے بہت سے سردار بھی شامل تھے۔ اگر صرف شیعوں کے خطوط ہوتے' تو ممکن ہے ان پر زیادہ توجہ نہ دی جاتی۔ کیونکہ کوفہ میں ان کی تعداد قابلِ توجہ نہ تھی۔ اتنے بڑے پیمانے پر خطوط' اپنی دعوت میں اہلِ کوفہ کی سنجیدگی ثابت کر رہے تھے۔

ایک طرف اہلِ کوفہ کی یہ دعوتیں تھیں اور دوسری طرف ان کے دو سابقہ امتحان' جو انہوں نے امام علیؑ اور امام حسنؑ کے ادوار میں دیے تھے اور دونوں ہی میں ناکام رہے تھے۔ اب امام حسینؑ کو ان میں سے کس کا انتخاب کرنا چاہیے تھا۔ ان لوگوں کے بُرے ماضی کو یا ان کی موجودہ حالت کو؟

اپنی گزشتہ گفتگو کو مدنظر رکھتے ہوئے' اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ کامیابی کا امکان پچاس فیصد سے بھی کم تھا' تو کیا امامؑ کے پاس کوئی دوسرا راستہ تھا؟

بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عام طور پر جن سیاسی شرائط اور حالات کو سامنے رکھا جاتا ہے' ان کے مطابق کامیابی کے امکانات کوفہ سے زیادہ کسی اور جگہ دکھائی نہیں دیتے۔ حتیٰ یمن جانے میں بھی کامیابی کا امکان نظر نہ آتا تھا۔ کیونکہ یقینی طور پر یمن میں کوفہ سے زیادہ شیعہ نہ تھے' اس کے علاوہ یمن بنی امیہ کی دسترس میں بھی تھا' حتیٰ اس زمانے میں بھی جبکہ وہاں حضرت علیؑ کا گورنر ہوا کرتا تھا' شام کے لشکر نے وہاں حملہ کر کے کثیر تعداد میں شیعوں کو قتل کر دیا تھا۔

کامیابی کے امکان کی پہلی دلیل خطوط تھے' جو یہ بتا رہے تھے کہ بہت بڑی تعداد میں لوگ نہ صرف امامؑ کی حفاظت کریں گے' بلکہ آپ کے دشمنوں کے خلاف جنگ لڑیں گے۔ اس کے مقابل کسی اور جگہ سے آپ کو نہیں بلایا گیا تھا۔ جن لوگوں نے کوفہ سے آپ کو خطوط لکھے' وہ پہلے مرحلے میں سلیمان بن صرد' مسیب بن نجبہ' حبیب ابن مظاہر' رفاعہ بن شداد وغیرہ جیسے شیعہ تھے۔ امامؑ نے اس محدود موقع پر ایک معقول راستے کا انتخاب کیا۔ آپ نے اس ابتدائی مرحلے میں ان

۱۔ ترجمۃ الامام الحسین ابن سعد۔ ص ۱۸۱

۲۔ ترجمۃ الامام الحسین ابن عساکر۔ ص ۱۹۲

۳۔ ایضاً۔ ص ۲۰۹۔ ۲۱۰

خطوں کا کوئی جواب نہ دیا' اس کے بعد مکہ میں یکے بعد دیگرے آنے والے خطوط کا ڈھیر لگ گیا۔ اس کے علاوہ ان گروہوں کے نمائندے بھی مکہ پہنچے اور بالمشافہ درخواست کی۔ مکہ پہنچنے والے ہر خط کے نیچے کئی کئی دستخط اور نام لکھے ہوتے۔ بعض روایات میں خطوط کی تعداد ڈیڑھ سو بتائی گئی ہے۔ اس کے باوجود امامؑ نے آخر وقت تک ان درخواستوں کا کوئی جواب نہ دیا۔ (۱) اور اس کے بعد بھی صرف مسلمؑ کو بھیجنے پر راضی ہوئے۔

امامؑ نے یہ دیکھنے کے لیے کہ کوفہ کے کتنے لوگ آپ کے حمایتی ہیں اپنے براہِ راست نمائندے مسلم بن عقیلؑ کو کوفہ بھیجا' جو ایک انتہائی قابلِ اعتماد فرد تھے۔ آپ نے اہلِ کوفہ کے نام ایک خط میں لکھا: "**انی بعثت الیکم اخی وابن عمی وثقتی من اهل بیتی مسلم بن عقیل وقد امرته ان یکتب الی بحالکم ورایکم فقدموا مع ابن عمی وبایعوه وانصروه.**" (میں نے اپنے بھائی' اپنے چچازاد اور اپنے اہلِ بیت میں سے اپنے قابلِ اعتماد مسلم بن عقیلؑ کو تمہاری جانب بھیجا ہے اور ان سے کہا ہے کہ وہ تم لوگوں کی کیفیت مجھے لکھ بھیجیں۔ ان کا ساتھ دو' ان کی بیعت کرو اور ان کی مدد کرو)۔ (۲)

جب مسلمؑ کوفہ پہنچے تو لوگوں نے جوق در جوق اُن کے ہاتھ پر بیعت کی۔ مسلمؑ نے ان لوگوں کے نام لکھے اور ان سے عہد لیا کہ وہ مکاری اور غداری کا مظاہرہ نہیں کریں گے اور امامؑ کی حمایت کریں گے۔ جو تعداد انہوں نے لکھی وہ بیس اور کچھ ہزار افراد تھی۔ (۳) مسلمؑ نے جب یہ حالت دیکھی' تو ایک خط میں امام حسینؑ کو لکھا: "**فانی اُخبرک انه قد بایعک من الکوفة نیف وعشرون الفا فاذا بلغک کتابی هذا فالعجل.**" (میں آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ کوفہ میں بیس ہزار سے زائد افراد نے آپ کی بیعت کر لی ہے۔ جوں ہی آپ کو یہ خط ملے فوراً روانہ ہو جایے)۔ (۴) کہتے ہیں کہ جب امامؑ روانہ ہوئے' تو آپ کے پاس اٹھارہ ہزار افراد کے نام پہنچ چکے تھے' جنہوں نے مسلمؑ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ (۵)

یہ خط پاکر امامؑ کو کیا کرنا چاہیے تھا؟ جب تک آپ نے حضرت مسلم بن عقیلؑ کو کوفہ نہیں بھیجا تھا' اس وقت تک آپ

۱۔ دیکھیے: الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۳۶' ۴۹' ۵۰' ۵۱' تاریخ طبری۔ ج ۴ ص ۲۶۲

۲۔ دیکھیے: الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۵۲' تاریخ طبری۔ ج ۴۔ ص ۲۶۲

۳۔ دیکھیے: الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۶۸' اور دیکھیے: تاریخ طبری۔ ج ۴۔ ص ۲۵۹' ترجمۃ الامام الحسینؑ ابن عساکر۔ ص ۲۰۷' مروج الذہب۔ ج ۳۔ ص ۵۴ (تعداد بارہ ہزار لکھی ہے)' اور دیکھیے: الامامہ والسیاسہ۔ ج ۲۔ ص ۵ (تعداد تیس ہزار لکھی ہے)

۴۔ ترجمۃ الامام الحسینؑ ابن سعد۔ ص ۷۴' تاریخ طبری۔ ج ۴۔ ص ۲۸۱' الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۷۷

۵۔ ایضاً۔ ص ۷۴

وہاں کے حالات سے مکمل طور پر مطمئن نہیں تھے۔ لیکن اب آپ کے اپنے ہی نمائندے کا خط مل چکا تھا' جو امامؑ کے ساتھ اہلِ کوفہ کی بیعت کی بہترین دلیل تھا۔ لہٰذا آخری مرحلے میں ابنِ عباس کے اعتراض کے جواب میں امامؑ نے فرمایا: میں جانتا ہوں کہ تم میرے خیر خواہ ہو۔ لیکن "مسلم بن عقیل کتب الیّ باجتماع اهل المصر علی بیعتی و نصرتی وقد اجمعت علی المسیر الیه." (مسلم بن عقیل نے مجھے خط لکھا ہے کہ اس شہر کے لوگوں نے میری بیعت اور نصرت پر اجتماع کرلیا ہے اور میں نے بھی اس راستے پر چلنے کا فیصلہ کرلیا ہے)۔(۱) ایک اور روایت میں آیا ہے کہ مسلمؑ نے امامؑ کو لکھا تھا: "والناس کلهم معک لیس لهم فی آل معاویه رای ولاهوی." (تمام لوگ آپ کے ساتھ ہیں اور آلِ معاویہ کی طرف نہ ان کی کوئی رائے ہے اور نہ رجحان)۔(۲) یہ وہ چیز تھی جسے مسلمؑ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور پورے اطمینان کے ساتھ اس کا احوال بیان کیا تھا۔ انہوں نے اہلِ کوفہ کی معاویہ سے بے رغبتی اور آلِ علیؑ کی طرف ان کے رجحان کو محسوس کیا تھا اور اس بات پر یقین کیا تھا' لیکن وہاں ابنِ زیاد کی آمد اور اس کی حکومت کے ظلم وستم نے کایا پلٹ دی۔ کوفہ کی شورش بنی امیہ کے لیے انتہائی خطرناک سمجھی گئی۔ جاسوسوں نے یزید کو خطوط لکھے کہ "قد بایع مسلم الترابیة." (ترابیہ نے مسلم کے ہاتھ پر بیعت کرلی ہے)۔(۳) (ترابیہ سے مراد شیعہ ہیں کیونکہ حضرت علیؑ کی ایک کنیت ابوتراب تھی) اور اس سے درخواست کی کہ جلد از جلد کوفہ کی خبر لے۔ عبید اللہ کو اسی لیے بھیجا گیا تھا۔ کیونکہ ان کو اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ اگر انہوں نے ذرا سی بھی دیر کی تو کوفہ اُن کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔(۴) خصوصاً اس لیے بھی کہ نعمان بن بشیر نہ صرف اس صورتحال سے بے تعلق تھا بلکہ ایک روایت کے مطابق اس نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ: لَابْنُ بِنْتِ رسول الله احبُّ الینا من ابن بجدل. (ہمیں فرزندِ رسولؐ ابن بجدل کے بیٹے سے زیادہ محبوب ہے)۔(۵)

ابن اعثم نے نقل کیا ہے کہ مسلمؑ کے کوفہ آنے کے بعد محل میں نعمان تنہا رہ گیا تھا۔ نہ کوئی نماز جمعہ میں آتا تھا اور نہ کوئی اُسے خراج ادا کرتا تھا۔ وہ جس کسی کو بلاتا وہ اس کے بلاوے پر کان نہ دھرتا' اور جو کوئی حکم دیتا لوگ اس پر عمل نہیں کرتے تھے۔(۶) یہ ساری باتیں اس بات کی گواہ ہیں کہ ابن زیاد کے آنے سے پہلے کوفہ کا مسئلہ بنی امیہ کے لیے انتہائی

۱۔ مروج الذہب۔ ج ۳۔ ص ۵۴۔ ۵۵

۲۔ تاریخ طبری۔ ج ۴۔ ص ۲۸۱

۳۔ الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۲۰

۴۔ الامامۃ والسیاسۃ۔ ج ۲۔ ص ۵

۵۔ "ابن بجدل" یزید کی جانب اشارہ ہے۔

۶۔ الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۴۸

خطرناک ہو چکا تھا۔ لہٰذا مناسب تھا کہ امام حسینؑ کوفہ روانہ ہو جاتے۔

امامؑ کا عراقی فوج سے سامنا

عراقی لشکر کے ساتھ امامؑ کا پہلا سامنا ایک ہزار سپاہیوں پر مشتمل حر ابن یزید ریاحی کے لشکر کے ساتھ ہوا۔ اس وقت حر اپنے آپ کو ابن زیاد کا ایک معمولی سپہ سالار سمجھتا تھا اور مسئلے کے سیاسی معاملات میں بالکل دخل نہیں دیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب امام حسینؑ نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو امام کا معتقد ہونے کی وجہ سے حر بھی اپنے سپاہیوں کے ساتھ آپ کی اقتدا میں نماز کی ادائیگی کے لیے کھڑا ہو گیا۔ حر کی ذمے داری یہ تھی کہ امامؑ کو کوفہ لے جائے بالخصوص انہیں واپس لوٹ جانے کی اجازت نہ دے۔ امامؑ نے نمازیوں کے سامنے جو خطبہ دیا اس میں فرمایا: ''میرا اس علاقے میں آنے کا کوئی ارادہ نہ تھا' یہاں تک کہ تمہارے خطوط اور قاصد میرے پاس آئے (اور مجھ سے یہاں آنے کی درخواست کی)۔ اب اگر تم مجھ سے یہ وعدہ کرتے ہو کہ میرے خلاف مزاحمت نہیں کرو گے تو میں تمہارے شہر چلتا ہوں' بصورتِ دیگر جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس پلٹ جاؤں گا۔ (۱)

ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام مسلمؑ کا خط پاتے ہی تیزی کے ساتھ مکہ سے نکلے اور کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ سفر مسلمؑ کی شہادت کی خبر ملنے تک اسی طرح تیز رفتاری سے جاری رہا۔ لیکن مسلمؑ کی شہادت کی خبر ملنے کے بعد (۲) قافلے کی رفتار سست ہو گئی اور امامؑ اُن کے اہلِ بیت سے تعلق رکھنے والے افراد اور آپ کے اصحاب کے درمیان کچھ گفتگوئیں ہوئیں۔ کہتے ہیں کہ امام واپس لوٹ جانا چاہتے تھے' لیکن مسلمؑ کے بھائی تیار نہیں ہوئے اور کہنے لگے کہ ہمیں اپنے بھائی کے خون کا انتقام لینے کے لیے اس سفر کو جاری رکھنا چاہیے۔ (۳)

اگر بالفرض انہوں نے ایسا کہا بھی ہو تو یقیناً انہیں ''کامیابی'' کی امید تھی۔ اور شاید یہی وہ دلیل تھی جس کی بنا پر بظاہر امامؑ بھی سفر جاری رکھنے پر راضی ہو گئے تھے۔ یہ بات عقل قبول نہیں کرتی کہ وہ شکست کا یقین رکھنے کے باوجود اپنے بھائی کے خون کا انتقام لینے کی فکر میں تھے۔ سیاسی کامیابی کے علاوہ ایک اور بات بھی تھی' اور وہ یہ کہ بالآخر امامؑ کو یزید کے مقابلے میں کوئی نہ کوئی موقف تو اختیار کرنا ہی تھا' اگرچہ وہ موقف شہادت ہی ہو' ایسی شہادت جو ان کی نظر میں یزید کی

۱۔ اخبار الطوال' اور دیکھیے: انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۱۷۰' الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۳۵

۲۔ اخبار الطوال۔ ص ۲۴۷۔ لکھا ہے کہ بنی اسد سے تعلق رکھنے والے دو افراد' جو کوفہ سے آرہے تھے' وہ یہ خبر لائے تھے۔ یہ جو لکھتے ہیں کہ فرزدق نے حضرت مسلم کی شہادت کی خبر دی' یا حر نے اس سے مطلع کیا' قطعاً غلط ہے۔ دیکھیے: مروج الذہب۔ ج ۳۔ ص ۶۱' الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۲۵

۳۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۱۶۸' تاریخ طبری۔ ج ۴۔ ص ۲۹۲' ترجمۃ الامام الحسین ابن سعد۔ ص ۱۷۶' الامامۃ والسیاسۃ۔ ج ۲۔ ص ۶

شکست کی علامت ہو۔

شاید کچھ اور لوگوں نے بھی کامیابی کے امکان کی تائید کی ہے۔ جیسے کہ نقل ہوا ہے کہ کچھ لوگوں نے کہا: آپ مسلم بن عقیل کی طرح نہیں ہیں' اگر اہلِ کوفہ آپ کو دیکھیں گے' تو سب کے سب آپ کی طرف آ جائیں گے۔ (۱) ان کی مراد یہ تھی کہ شاید مختلف وجوہات کی بنا پر مسلمؑ لوگوں کو اپنی جانب جذب نہیں کر سکے ہیں۔ لیکن آپ کی شخصیت کو ایک اور ہی قسم کی جذابیت حاصل ہے۔ ان حالات میں امامؑ کو جو اہمیت حاصل تھی اور مسلسل دس سال سے امامؑ کے پاس آنے والے اہلِ کوفہ کے خطوط اور اُن کی درخواستوں کی موجودگی میں یہ بات بعید نظر نہیں آتی تھی۔ اسی لیے امامؑ نے سفر کو جاری رکھنا قبول کیا۔

فتوح کی روایت سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امامؑ نے جو خط قیس بن مسہر کے ذریعے اہلِ کوفہ کے نام بھیجا تھا اور جس میں اُن سے اپنے عہد و پیمان پر قائم رہنے کا تقاضا کیا گیا تھا۔ (۲) احتمال یہ ہے کہ یہ خط مسلم بن عقیل کی شہادت کے بعد بھیجا گیا تھا۔ باوجودیکہ لشکرِ امامؑ میں اہلِ کوفہ کے بارے میں شکوک وشبہات کی زمین کافی ہموار ہو چکی تھی' لیکن واپس پلٹ جانے کے حوالے سے اس کا اثر صرف اس وقت نمایاں ہوا جب حر کے لشکر سے امامؑ کا سامنا ہوا۔ حر اور اس کے سپاہیوں کا آنا' دشمن کے لشکر کے چار ہزار سپاہیوں کے قادسیہ پہنچ جانے کی خبر کا ملنا اور کوفہ کے بارے میں پہلے ملنے والی اطلاعات (خصوصاً ابن سعد کے قاصد کا پہنچنا جسے مسلمؑ نے وصیت کی تھی) وہ باتیں تھیں جن کی وجہ سے امامؑ یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ کوفہ جانے سے گریز کیا جائے۔ مسلمؑ جنہوں نے اپنی گرفتاری اور اپنے اطراف سے لوگوں کے چھٹ جانے سے اس حقیقت کو محسوس کر لیا تھا' انہوں نے کوشش کی کہ جس طرح انہوں نے امامؑ کو کوفہ آنے کی تحریک دلائی تھی' اب ایک پیغام کے ذریعے ان کو یہاں آنے سے باز رکھیں۔ اس لیے انہوں نے شہادت کے وقت عمر ابن سعد کو جو قریشی تھا' یہ وصیت کی کہ وہ کسی کو بھیج کر یہ پیغام امامؑ تک پہنچا دے۔

یہ پیغام پہنچنے کے کچھ ہی عرصے بعد آغازِ محرم میں' سرزمینِ عراق میں امامؑ کا قافلہ اور حر کا لشکر آمنے سامنے تھے۔ اس صورتحال میں امامؑ نے واپسی کا فیصلہ کیا۔ لیکن حر نے آپ کا راستہ روک لیا۔ اسے لشکرِ امامؑ کو کوفہ لے جانے پر مامور کیا گیا تھا۔ امامؑ جواب کوفہ کے حالات سے آگاہ ہو چکے تھے' انہوں نے اس کی درخواست ماننے سے انکار کیا۔ حر جنگ سے بچنے کے لیے (جو اس کی ذمے داریوں میں شامل نہیں تھی) اس بات پر راضی ہو گیا کہ لشکرِ امامؑ کربلا کی جانب سفر جاری

۱۔ تاریخ طبری۔ ج ۴۔ ص ۳۰۰' الکامل فی التاریخ۔ ج ۴۔ ص ۴۲

۲۔ الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۳۰۴

رکھے ایک خشک سرزمین کی طرف اب نہ حجاز واپس لوٹنا ہے اور نہ کوفہ جانا ہے۔ (۱)

قطع نظر اسکے کہ عملی طور پر کیا ہوا' جب امام کا حر سے سامنا ہوا' تو آپ نے اپنے لوٹ جانے کی تجویز پیش کی' اور آپ نے اُس سے مطالبہ کیا کہ وہ آپ کو واپس جانے دے۔ (۲) اس کے بعد ابن سعد کے سامنے بھی آپ نے اسی تجویز کا اعادہ کیا (۳) اور بار ہا فرمایا کہ: "یا ایها الناس! إذا کرِهتُمونی فدعونی انصرف عنکم الی مامَنِیَ الارض۔" (اگر تم میری مدد کرنا نہیں چاہتے' تو مجھے سرزمینِ امن (یعنی مکہ) لوٹ جانے دو)۔ (۴) بعض مورخین نے لکھا ہے کہ امامؑ نے تین تجاویز پیش کی تھیں: ایک حجاز لوٹ جانے کی۔ دوسری شام چلے جانے کی اور تیسری مملکت اسلامیہ کی مشرقی سرحدوں میں سے کسی ایک کی جانب روانہ ہو جانے کی۔

چند سطر قبل نقل شدہ روایت میں' نیز دوسرے صریح جملات میں تاکید کی گئی ہے کہ امامؑ نے شام جانے کی بات نہیں کی تھی اور آپ نے صرف حجاز (مکہ یا مدینہ) لوٹ جانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ بلاذری نے صراحت کے ساتھ نقل کیا ہے کہ آپ نے عمر ابن سعد کے سامنے صرف مدینہ لوٹ جانے کی بات کی تھی۔ (۵) اسی طرح عقبہ بن سمعان سے سند کے ساتھ منقول ہے کہ اس نے کہا کہ: میں تمام مراحل میں حسین ابن علیؑ کے ساتھ ساتھ تھا۔ بعض کہنے والوں کے برخلاف حسینؑ نے کسی بھی مرحلے پر یزید کے پاس جانے اور اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی بات نہیں کی۔ آپ نے صرف یہ فرمایا تھا: "دعونی ارجع الی مکان الذی اقبلت منه' او دعونی اذهب فی هذه الارض العریضة حتی ننظر الی ما یصیر الیه امر الناس۔" (مجھے چھوڑ دو تاکہ میں اسی سرزمین میں واپس چلا جاؤں جہاں سے آیا تھا' یا مجھے چھوڑ دو تاکہ میں خدا کی وسیع زمین پر چلوں اور دیکھوں کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوتا ہے)۔ (۶) بلاذری نے لکھا ہے کہ امامؑ شام جانا چاہتے تھے' اسی طرح آپ نے حر کے سپاہیوں سے درخواست کی تھی کہ مجھے اجازت دو کہ میں شام چلا جاؤں اور وہاں یزید کے ہاتھ پر بیعت کرلوں۔ (۷)

۱۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۱۷۰' الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۳۹' الکامل فی التاریخ۔ ج ۳۔ ص ۴۷۔ ۴۸

۲۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۱۷۰' الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۳۵' اخبار الطوال۔ ص ۲۵۰

۳۔ تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۳۱۱' الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۵۵

۴۔ تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۳۲۳

۵۔ تاریخ طبری۔ ج ۲۔ ص ۱۸۲

۶۔ الکامل فی التاریخ۔ ج ۳۔ ص ۵۴

۷۔ ایضاً۔ ص ۱۷۳۔ حاشیے میں تصحیح کرنے والے کی جانب سے اس روایت کی تکذیب کی گئی ہے۔

سامنے کی بات ہے کہ امام یہ غریب الوطنی یزید کے ہاتھ پر بیعت نہ کرنے ہی کی وجہ سے برداشت کر رہے تھے۔ اگر یہ روایت درست ہو تب بھی کم از کم اس قسم کی کسی درخواست کی یہ تفسیر نہیں کی جا سکتی کہ امام یزید کی حکومت تسلیم کرنے پر تیار تھے۔ بلکہ امکان قوی یہ ہے کہ آپ چاہتے تھے کہ ابن زیاد جیسے بے شرم فاسق کی حکومت کی حدود سے دور چلے جائیں۔ امام اچھی طرح جانتے تھے کہ بیعت نہ کرنے کی صورت میں خود یزید بھی آپ کو قتل کر دے گا۔ لہٰذا یہ بات منطقی نظر نہیں آتی کہ امام جانتے بوجھتے شام جانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ خود یزید نے ولید کو لکھا تھا کہ: ولیکن جوابک الیّ راس الحسین۔" (میرے لیے تیرا جواب حسینؑ کا سر ہونا چاہیے)۔(۱) اگرچہ خود ولید یہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے ہاتھوں سے امامؑ کو قتل کرے لہٰذا بعد میں اس نے امامؑ کے قتل پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔(۲) اس بنیاد پر اگر آپ نے یہ بات کہی بھی ہو تب بھی یہ بات قابل قبول نہیں کہ آپ یزید کی بیعت کرنا چاہتے تھے یا آپ سرے سے شام جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

جب امامؑ نے حر کے سامنے یہ وضاحت کی کہ آپ اہل کوفہ کے خطوط آنے کے بعد ہی اس طرف آئے ہیں تو حر نے جواب دیا کہ اسے ان خطوط کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ جب آپ نے خطوط اس کے سامنے ڈھیر کر دیئے تو اس نے پھر اسی جانب اشارہ کیا کہ اس کی ذمے داری آپ کو کوفہ لے جانا ہے۔ امامؑ کوفہ جانے پر راضی نہیں ہوئے اور حجاز کی طرف چل پڑے۔(۳) اس موقع پر حر کے لشکر نے امامؑ کا راستہ روک لیا۔ پھر انہوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ درمیانی راستہ اختیار کرتے ہیں ایسا راستہ جو نہ کوفہ جاتا ہو اور نہ حجاز۔ لہٰذا وہ العذیب کی طرف چل پڑے۔(۴)

اسی مقام پر طرماح بن عدی نے امامؑ سے درخواست کی کہ "طی" کے پہاڑوں کی طرف نکل جائیں۔ لیکن حر کے سپاہیوں کے سائے کی طرح ساتھ ہونے اور امامؑ کے عذیب کی جانب جانے کے وعدے نے امامؑ کو ابن عدی کی درخواست قبول کرنے سے روک دیا۔(۵) راستے میں امامؑ کی کوشش تھی کہ صحرا کی طرف مڑ جائیں اور جس حد تک ہو سکے اپنے آپ کو کوفہ سے دور رکھیں۔ لیکن حر اس کوشش کی راہ میں حائل رہا۔ یہاں تک کہ وہ قصر بنی مقاتل پہنچ گئے اور وہاں سے نینویٰ تک آگے بڑھ گئے۔(۶) اسی مقام پر ابن زیاد کی طرف سے حر کو قافلے کو اتار لینے کا حکم ملا۔ ولا تحلّہ الا

۱۔ الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۲۶

۲۔ ترجمۃ الامام الحسینؑ ابن سعد۔ ص ۱۹۲

۳۔ ترجمۃ الامام الحسینؑ ابن سعد۔ ص ۲۵۰

۴۔ ایضاً۔ ص ۲۵۰، الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۳۰، ۱۳۱، ج ۲۔ ص ۱۷۰

۵۔ تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۳۰۷، انساب الاشراف بلاذری۔ ج ۲۔ ص ۱۷۳۔ قبیلہ بنی طی حاتم طائی کا قبیلہ ہے جن کا بیٹا عدی رسول اللہؐ اور ان کے بعد حضرت علیؑ کے اصحاب میں سے تھا۔ یہاں ان کا بیٹا "طرماح" اپنے تشیع کی وجہ سے یہ پیشکش کر رہا تھا۔

۶۔ اخبار الطوال۔ ص ۲۵۰۔ ۲۵۱

بالعراء علی غیر خضر و لا ماء. (انہیں ایسے خشک صحرا میں رکھو جہاں نہ سبزہ ہو اور نہ پانی)۔(۱) اس مقام پر کوفہ کے بعض شیعہ آپ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور حر کی مخالفت کے باوجود امامؑ کے ساتھ آ ملے۔(۲)

جس دوران امامؑ اور حر ساتھ ساتھ چل رہے تھے' زہیر ابن قین نے امامؑ سے کہا تھا کہ ان پر حملہ کر دیں' کیونکہ اُس موقع پر اُن کی تعداد کم تھی۔ لیکن امامؑ نے یہ بات قبول نہ کی اور فرمایا: "انی اکرہ ان ابدئهم بالقتال." (مجھے جنگ میں پہل کرنے والا بننا پسند نہیں ہے)۔(۳) حر کا لشکر اور امامؑ کا قافلہ ماہِ محرم کی دوسری تاریخ کو (بدھ یا جمعرات کے دن) کربلا پہنچے۔ دینوری کا کہنا ہے کہ یکم محرم بروز بدھ کربلا پہنچے۔(۴)

مسعودی نے لکھا ہے کہ جب امامؑ کربلا پہنچے تو پانچ سو سوار اور ایک سو پیادے آپ کے ہمراہ تھے۔(۵) یہ لوگ آٹھ دنوں کے دوران اور خاص طور پر عاشور کی شب کہ جس سے اگلے روز جنگ یقینی تھی' امامؑ کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اگرچہ ممکن ہے کہ اس شب ان لوگوں کی تعداد اس سے کم ہو جتنی مسعودی نے لکھی ہے۔ لیکن بلاشبہ اس دوران کچھ لوگ امامؑ کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

امامؑ کے کربلا پہنچنے کے اگلے ہی دن سے رفتہ رفتہ ابن زیاد کے سپاہی وہاں جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ابن زیاد کا اصرار تھا کہ کوفہ کے تمام لوگ اس جنگ میں موجود ہوں۔ لہٰذا تمام قبیلے جوق در جوق روانہ ہونے لگے۔ یہ پالیسی مستقبل میں صرف چند قبیلوں کو الزام سے بچانے اور تمام قبیلوں کو قتلِ حسینؑ میں ملوث کرنے کے لیے اختیار کی گئی تھی۔ یہ بات کوفیوں کو علویوں کی حمایت میں چلنے والی تحریکوں میں شرکت سے روک سکتی تھی۔ ابن اعثم کی روایت کے مطابق' تقریباً بائیس ہزار افراد بھیجے گئے۔(۶) اگرچہ بلاذری (۷)' دینوری (۸) اور ابن سعد کی روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ

۱۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۱۷۶' اخبار الطوال۔ ص ۲۵۱

۲۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۱۷۲

۳۔ اخبار الطوال۔ ص ۲۵۲

۴۔ ایضاً۔ ص ۲۵۳

۵۔ مروج الذہب۔ ج ۲۔ ص ۶۱

۶۔ حر ایک ہزار افراد کے ساتھ' حصین بن نمیر چار ہزار افراد کے ساتھ' شبث بن ربعی ایک ہزار افراد کے ساتھ اور شمر بن ذی الجوشن چار ہزار افراد کے ساتھ۔۔۔ الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۵۹

۷۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۱۷۹

۸۔ اخبار الطوال۔ ص ۲۵۴

لوگ بیچ راستے سے فرار ہو گئے تھے۔

ابن زیاد نے اعلان کر دیا تھا کہ: ایما رجل وجدناه بعد یومنا هذا متخلفاً عن العسکر برئت منه الذمة. (آج کے بعد جو کوئی لشکر میں آنے سے روگردانی کرے گا' میں اُس سے بری الذمہ ہوں گا)۔(۱) اس دھمکی کی وجہ سے اتنی بڑی تعداد کربلا روانہ ہوئی۔

عمر ابن سعد بن وقاص' جو دیلمان کے مشرکوں سے جنگ کرنے کے لیے "رے" جا رہا تھا' طے کیا گیا کہ وہ پہلے کربلا کے مسئلے سے نمٹ لے اور اس کے بعد "رے" جائے۔ مختصر یہ کہ اس نے خود اپنی اور بنی زہرہ کی ناپسندیدگی کے باوجود (۲) فرزند رسولؐ کے خون کی قیمت پر "رے" کی حکومت کا انتخاب کیا اور لشکرِ کوفہ کی سپہ سالاری قبول کر کے کربلا روانہ ہو گیا۔ (۳)

ابتدا میں عمر سعد نے ایک نمائندہ امامؑ کے پاس بھیجا اور امامؑ سے وہاں آنے کی وجہ دریافت کی۔ جواب میں امامؑ نے اپنے نام اہلِ کوفہ کی طرف سے ارسال کیے گئے خطوط پیش کیے۔ اس کے بعد امامؑ نے فرمایا: اگر وہ لوگ نہیں چاہتے' تو میں جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس چلا جاؤں گا۔ عمر ابن سعد جو خود اس مسئلے سے جان چھڑانے کا راستہ تلاش کر رہا تھا' اس نے امامؑ کی یہ تجویز ابن زیاد کو لکھ بھیجی اور کہا: حسینؑ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ واپس لوٹ جائیں گے' یا کسی اسلامی سرحد پر جا کر ایک عام آدمی کی حیثیت سے زندگی گزاریں گے' اور: هذا لک رضا و للامة صلاح. (یہ بات تمہارے اطمینان کا موجب اور اس امت کی مصلحت میں ہے)۔(۴) لیکن شمر نے اس تجویز کو جامۂ عمل نہ پہننے دیا اور ابن زیاد جو اس پیشکش کو قبول کرنے کی طرف مائل تھا' اُس سے اس کا یہ ارادہ بدلوا دیا۔ اس نے ابن زیاد سے کہا: اگر حسینؑ چلے گئے' تو پھر کبھی ہاتھ نہ آئیں گے۔ اس پر ابن زیاد نے ایک خط میں عمر سعد کو لکھا: ہم نے تمہیں اُن سے گفت و شنید کے لیے نہیں بھیجا تھا' بلکہ جلد از جلد اُن کے سامنے یزید کی بیعت پیش کرو' اور اگر وہ نہ مانیں' تو انہیں قتل کر دو۔ (۵) جب یہ پیغام امامؑ کو دیا گیا' تو آپ

۱۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۱۷۸

۲۔ شرف الامام الحسینؑ۔ ص ۱۷۸

۳۔ امامؑ نے ابن سعد کے پاس ایک نمائندہ بھیجا' تاکہ اسے روکیں' لیکن نمائندہ اس کا جو جواب لیکر آیا وہ یہ تھا: ابن "رضی ابن سعد ان یقتلک بملک الری." "ابن سعد ملک "رے" کے لیے آپ کو قتل کرنے پر تیار ہے۔ الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۷۳

۴۔ ارشاد۔ ص ۲۲۹

۵۔ "فانظر فان نزل الحسین و اصحابه علی الکم فابعث بهم الی سلما وان ابوفازحف الیهم حتی تقتلهم و تمثل بهم فانهم مستحقون لذلک." الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۲۲' انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۱۸۳

نے فرمایا: "لا اُجب ابن زیاد لا ذلک ابداً فهل هو الا الموت فمرحباً به." (میں کسی صورت ابن زیاد کی بات تسلیم نہیں کروں گا۔ کیا اس کا نتیجہ موت کے سوا کچھ اور ہوگا؟ اگر ایسا ہے تو ایسی موت کو مرحبا!)۔(۱)

عاشورا سے چند دن پہلے ہی ابن زیاد کی جانب سے تاکیدی حکم ملا تھا کہ امام حسینؑ کو پانی تک پہنچنے سے روکا جائے: حل بین الحسین و الماء فلا یذوقوا منه قطرة کما صنع بالتقی الزکی عثمان. (حسینؑ اور پانی کے درمیان اس طرح حائل ہو جاؤ کہ وہ پانی کا ایک قطرہ بھی نہ پا سکیں جیسا کہ انہوں نے متقی اور نیک عثمان کے ساتھ کیا تھا)۔(۲) اسی طرح اس نے ابن سعد کو بھی لکھا کہ: میں نے سنا ہے کہ حسینؑ اور اُن کے اصحاب کو پانی تک رسائی حاصل ہے اور انہوں نے کنویں کھود لیے ہیں۔ یہ خط ملتے ہی حتیٰ الامکان انہیں کنویں کھودنے سے روکو اور پوری سخت گیری کے ساتھ انہیں فرات کے پانی سے بھی استفادے کی اجازت نہ دو۔(۳)

آخری ایام میں امامؑ نے ابن سعد کے ساتھ کچھ خفیہ ملاقاتیں بھی کی تھیں اور کوشش کی تھی کہ وہ اپنا مؤقف تبدیل کر لے۔ لیکن تاریخی روایات کے مطابق ابن سعد "رے" کی حکومت کی خواہش دل سے نہ نکال سکا۔

حضرت عباس ابن علیؑ کی والدہ کے ساتھ شمر کی رشتے داری تھی اس بنا پر شمر نے حضرت عباسؑ اور اُن کے دوسرے بھائیوں کے لیے ابن زیاد سے ایک امان نامہ حاصل کر لیا تھا۔ لیکن وہ لوگ امام حسینؑ کو چھوڑنے پر تیار نہ ہوئے۔(۴) ایک اور مقام پر حضرت علی اکبرؑ کے لیے بھی ایک امان نامے کا ذکر آیا ہے اور وہ بھی ان کی والدہ کے تعلق سے تھا۔ لیکن حضرت علی اکبرؑ نے کہا: "اما والله لقرابة رسول الله (ص) کانت اولی ان ترعی من قرابة ابی سفیان." (۵)

۱۔ اخبار الطوال۔ ص ۲۵۳

۲۔ یہ حکم امامؑ کی کربلا آمد کے تین دن بعد موصول ہوا تھا۔ دیکھئے: اخبار الطوال۔ ص ۲۵۵، انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۱۸۰۔ جو کچھ ابن زیاد نے عثمان کے بارے میں کہا ہے وہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت عثمان کے مخالفین کی جانب سے ان کے محاصرے کے دوران یہ حضرت علیؑ ہی تھے جنہوں نے انہیں پانی بھیجا تھا۔ ہم اس سے پہلے اس بارے میں بات کر چکے ہیں۔

۳۔ الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۶۲، تاریخ طبری۔ ج ۴۔ ص ۳۱۱۔ کنویں کی جانب اشارہ ان لوگوں کے اعتراض کا جواب ہو سکتا ہے جو یہ کہہ رہے تھے کہ کربلا کی سرزمین میں دو تین میٹر زمین کھود کر پانی حاصل کیا جا سکتا ہے اور پانی کے لیے فرات کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا وہاں پیاسے رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ واضح ہے کہ ابن زیاد کا لشکر اتنا سنگدل تھا کہ اس نے کنواں کھودنے کی بھی اجازت نہیں دی تھی۔ اس کے باوجود یہ درست ہے کہ عاشورے سے ایک دو دن پہلے تک امامؑ کا لشکر لڑائی کے ذریعے متعدد مرتبہ فرات سے پانی لانے میں کامیاب رہا تھا۔

۴۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۱۸۴، الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۶۸

۵۔ ترجمۃ الامام الحسینؑ۔ ص ۱۸۲

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ قرابتداری کا لحاظ رکھنا ابوسفیان کے ساتھ قرابتداری کا خیال رکھنے سے زیادہ بہتر ہے)

ابن زیاد کا لشکر نو محرم کی شام ہی کو حملہ کرنا چاہتا تھا' لیکن امام کی اس درخواست پر کہ لڑائی کو اگلے دن تک مؤخر کیا جائے' اگلے دن جنگ پر اتفاق ہوگیا۔ اس رات امام نے اپنے اصحاب سے گفتگو کی اور اُن سے فرمایا کہ انہوں نے اُن کی گردنوں سے اپنی بیعت اٹھالی ہے' اب وہ جاسکتے ہیں' حتیٰ وہ اُن کے خاندان کے کچھ افراد کو بھی اپنے ساتھ لے جائیں۔ لیکن اصحاب نے امام کے ساتھ ڈٹے رہنے کا اعلان کیا۔(۱)

شب عاشور امامؑ نے حکم دیا کہ خیموں کی ایک طرف کو چھوڑ کر باقی تینوں طرف خندق کھودی جائے' تا کہ دشمن آپ پر چاروں طرف سے حملہ نہ کر سکے۔ صبح عاشور سے دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہو گئے۔ امام کے سپاہیوں میں کسی قسم کا ضعف اور کم ہمتی نظر نہیں آ رہی تھی۔

امام حسین علیہ السلام کا اپنے اہل بیت کو ساتھ لانا' باطنی حقائق اور تقدیر الٰہی کی جانب امامؑ کی توجہ' یا امام حسینؑ کی شہادت کے بعد اس عمل سے حاصل ہونے والے سیاسی فوائد سے قطع نظر' اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ امام حسینؑ یزید کے ہاتھوں سے اس کی حکومت کو چھین لینا چاہتے تھے۔ حتیٰ انہیں مکہ سے کوفہ لے جانا بھی بظاہر ایک سیاسی اطمینان کی وجہ ہی سے تھا' جس سے معلوم ہوتا تھا کہ کوفہ والے امام کے مطیع ہیں۔ اس لیے ان کو حجاز میں چھوڑ دینا' امامؑ کی نظر میں سیاسی طور پر خلافِ مصلحت تھا۔ کیونکہ عراق میں کامیابی کے بعد ممکن تھا کہ حجاز امویوں کے قبضے میں رہتا اور یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں کہ وہ امام کے اہل بیتؑ کے ساتھ کیا سلوک کرتے۔

امامؑ نے شب عاشورا اپنے اصحاب سے فرمایا کہ کل شہادت کے سوا کچھ اور نہیں ہوگا۔

"فانتم فی حلّ منّی وهذا اللیل قد غیشکم' فمن کانت له منکم قوة فلیضم رجلاً من اهل بیتی الیه وتفرقوا فی سوادکم' فعسی اللّٰه ان یاتی بالفتح او امر من عنده فیصبحوا علی ما اسرّوا فی انفسهم نادمین."

''میری طرف سے تم لوگ آزاد ہو' رات نے تمہیں ڈھانپ رکھا ہے۔ تم میں سے جس کے بس میں ہو وہ اس اندھیرے میں میرے اہل بیت میں سے بھی کسی فرد کو اپنے ہمراہ لے جائے۔ یہاں تک کہ اللہ ہمیں کامیابی عطا کرے' یا اللہ کی جانب سے کوئی اور امر پیش آ جائے اور ان لوگوں کو ان کے کیے ہوئے اس

۱۔ ترجمۃ الامام الحسینؑ ابن سعد۔ ص ۷۸' الکامل فی التاریخ۔ ج ۳۔ ص ۵۸۔۵۹

ارادے سے پشیمان کردے۔"(۱)

یہاں اس نکتے کی جانب اشارہ ہوا ہے کہ ممکن ہے اُن کو کامیابی نصیب ہو یا دشمن اپنے مقصد کو ترک کردے۔ لہٰذا سیاسی اعتبار سے کامیابی کا ایک کمزور احتمال یا دشمن کے ارادے میں تبدیلی کا ایک ہلکا سا امکان ضرور موجود تھا۔ اگرچہ ان حالات میں یہ احتمال بہت خفیف تھا اور دشمن نے شہادت کے علاوہ ان کے سامنے کوئی اور راستہ نہ چھوڑا تھا۔

امامؑ کی طرف سے اپنا سیاسی نقطۂ نظر واضح کر دینے کے باوجود صبح عاشور حر کا تمیں افراد کے ساتھ امامؑ کے لشکر میں آجانا (۲) اس بات کی علامت ہے کہ ایسی تبدیلی کا امکان موجود تھا۔ لیکن عمر ابن سعد کی خباثت' جس کا باپ لاتعلقی کا مسلک اختیار کرنے والوں میں شامل تھا (۳) اور اس کے ساتھ شمر جیسے خوارج صفت لوگوں کا ذاتی خبث (۴) نیز ابن زیاد کا دباؤ اس بات کا سبب بنا کہ عالمِ اسلام میں ایک ہولناک ترین جرم سرزد ہوا۔

ابن سعد نے لکھا ہے کہ امامؑ کے ساتھ پچاس افراد تھے اور بیس دوسرے افراد لشکرِ یزید سے نکل کر اُن کے ساتھ مل گئے تھے۔ (۵) جنگ شروع ہونے سے پہلے' امامؑ نے دشمن کے لشکر کے سامنے ایک خطاب فرمایا: "میں تمہاری اور تم جیسے لوگوں کی خواہش پر یہاں آیا تھا۔ تم لوگوں نے لکھا تھا کہ سنت مٹ گئی ہے' نفاق نے سر ابھارا ہے اور مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں اپنے نانا کی امت کی اصلاح کے لیے یہاں آؤں۔ اب اگر تمہیں پسند نہیں' تو مجھے یہیں سے واپس چلا جانے دو۔ تم اپنے آپ سے سوال کرو' کیا تم فرزندِ رسول کا خون بہانا جائز سمجھتے ہو؟ میں رسولؐ کے چچازاد بھائی اور اُن پر سب سے پہلے ایمان لانے والے کا بیٹا ہوں' حمزہؑ' جعفرؑ' عباس میرے ہی چچا ہیں۔ کیا تم نے میرے اور میرے بھائی کے بارے میں پیغمبرؐ کا یہ کلام نہیں سنا کہ آپ نے فرمایا تھا: "ھذان سیدا شباب اھل الجنۃ۔" (یہ دونوں جنت کے جوانوں کے سردار ہیں) اگر تمہیں میری بات قبول نہیں' تو جابر انصاری' ابوسعید خدری اور زید ابن ارقم سے پوچھ لو۔" (۶) ابن حضیر (۷)

۱۔ ترجمۃ الامام الحسین ابن سعد۔ ص ۱۷۹۔۱۸۰

۲۔ ایضاً۔ ص ۱۷۸' ۱۸۱' الامامہ والسیاسہ۔ ج ۲۔ ص ۷

۳۔ ایسے لوگ جنہوں نے حضرت علیؑ کی خوبصورت تعبیر کے مطابق "خذلوا الحق ولم ینصروا الباطل" یعنی "حق کو چھوڑ دیا اور باطل کی بھی مدد نہ کی۔"

۴۔ ماضی میں خارجی مشہور تھا۔

۵۔ ترجمۃ الامام الحسین ابن سعد۔ ص ۱۷۸

۶۔ ترجمۃ الامام الحسین ابن سعد۔ ص ۱۸۱' الکامل فی التاریخ۔ ج ۳۔ ص ۶۱۔۶۰

۷۔ الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۸۲

نے بھی اسی قسم کے دلائل دیے۔اسی طرح معروف شخصیت زہیر ابن قین نے بھی لوگوں پر اتمام حجت کی۔(۱)

اس وقت تک حر ابن یزید ریاحی کا خیال تھا کہ بات خونریزی تک نہیں پہنچے گی' بالخصوص فرزندِ رسولؐ کے ساتھ ایسا سلوک تو اُن کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ یہ صورتحال دیکھ کر انہیں ہوش آتا ہے۔ ابن سعد کے پاس جاتے ہیں اور کہتے ہیں: کیا ان میں سے کوئی بھی بات تمہیں مطمئن کرنے کے لیے کافی نہیں ہے؟ عمر ابن سعد کہتا ہے: اگر میرے ہاتھ میں ہوتا' تو میں انہیں قتل نہ کرتا! لیکن اب کوئی راستہ نہیں ہے۔ حر یہ باتیں سن کر فالفور امامؑ کی خدمت میں چلے آتے ہیں۔ توبہ کرتے ہیں اور امامؑ کے دفاع کے لیے کمربستہ ہو جاتے ہیں اور دو افراد کو قتل کرنے کے بعد خود بھی جامِ شہادت نوش کرتے ہیں۔(۲) یزید بن ابی زیاد بھی ان لوگوں میں شامل تھے جو اس موقع پر امامؑ سے آملے اور آپ کی رکاب میں شہید ہوئے۔(۳)

حضرت علی علیہ السلام کی سیرت تھی کہ آپ جنگ کا آغاز نہیں کیا کرتے تھے۔ امام حسینؑ نے بھی کربلا میں جنگ کا آغاز نہیں کیا۔ بلکہ عمر ابن سعد تھا جس نے پہلا تیر اپنی کمان میں چڑھا کر امامؑ کے لشکر کی جانب پھینکا۔ یہ کام کرنے کے بعد اس نے (وہاں موجود لوگوں سے) کہا: ابن زیاد کے سامنے یہ گواہی دینا کہ سب سے پہلا تیر میں نے پھینکا تھا۔(۴)

جنگ کی ابتدا میں امامؑ کے سپاہی ایک ایک کر کے میدان میں اترے۔ کچھ ہی دیر بعد دشمن کے مقتولوں کی تعداد شہیدوں سے زیادہ تھی۔ لہٰذا عمرو بن حجاج نے اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہ تم لوگ (معمولی لوگوں سے نہیں بلکہ) عرب کے شہسواروں سے لڑ رہے ہو' کہا: اگر تم نے ان پر تیروں کی برسات نہ کی' تو سب کے سب مارے جاؤ گے۔(۵)

اس کے بعد تیروں کی زبردست بارش کی گئی اور چند جھڑپوں کے بعد پہلے امامؑ کے اصحاب اور بعد میں ایک ایک کر کے امامؑ کے خاندان کے لوگ شہید ہو گئے۔ ابن سعد نے طبقات میں اور دوسروں نے مختلف کتب میں ان حملوں کی جزیات تحریر کی ہیں۔ امامؑ اور آپ کے ستر سے زیادہ اصحاب کی شہادت اور سپاہِ دشمن کے تقریباً اٹھاسی افراد کی موت کے بعد کربلا کا واقعہ اختتام پذیر ہوا۔(۶)

۱۔ الکامل فی التاریخ۔ ج ۳۔ ص ۶۳

۲۔ ایضاً۔ ج ۳۔ ص ۶۴۔ ۶۵

۳۔ ایضاً۔ ج ۳۔ ص ۷۳

۴۔ تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۳۲۶' الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۸۳

۵۔ تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۳۳۱' الکامل۔ ج ۳۔ ص ۶۷

۶۔ ترجمۃ الامام الحسینؑ ابن سعد۔ ص ۱۸۳' اور دیکھیے: مروج الذہب۔ ج ۳۔ ص ۶۳۔ یہی تاریخی نقل صحیح ہے اور اس زمانے میں دونوں طرف حالات اور دونوں کے برتاؤ کے مطابق بھی ہے۔

کربلا میں اپنی شہادت سے آگہی

کربلا کے عقیدتی جہاد کے تاریخی پہلو میں جس مسئلے کو انتہائی اہمیت حاصل ہے وہ مسئلۂ "غیب" ہے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس کی وجہ سے اس تاریخی واقعے کا تجزیہ و تحلیل کرتے ہوئے بعض اختلافات پیش آئے اور اکثر ایک عقیدتی (کلامی) معاملے اور ایک تاریخی مسئلے کے درمیان مقابلے کی صورت سامنے آئی ہے۔ اس بارے میں بکثرت روایات موجود ہیں جن میں سے اکثر میں ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امام حسینؑ کی شہادت کی خبر دے دی تھی۔ علامہ امینی نے ان میں سے بعض روایات کو اپنی کتاب "سیرتنا و سنتنا" میں جمع کیا ہے۔ اہلِ سنت کی کتابیں بھی ان روایات سے بھری پڑی ہیں۔(۱)

یہ روایات جو تاریخی پہلو کی حامل ہیں ان کے علاوہ (۲) بھی ایسی روایات نقل ہوئی ہیں جن میں اشارتاً یا صراحتاً واقعۂ کربلا سے پہلے اسکے وقوع میں آنے کی اطلاع دی گئی ہے۔ یہ روایات تاریخی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں جن میں سے کچھ کی جانب ہم ذیل میں اشارہ کر رہے ہیں:

ایک روایت میں آیا ہے کہ جس دن امامؑ نے مدینہ سے مکہ کی جانب ہجرت کی اس سے ایک رات قبل آپ قبرِ رسولؐ پر تشریف لائے۔ وہاں آپ کی آنکھ لگ گئی۔ اس حال میں آپ نے خواب میں پیغمبر اکرمؐ اور چند فرشتوں کو دیکھا۔ حضورؐ نے آپ کو اپنی آغوش میں لے کر فرمایا: **"یاحسین! کانک عن قریب اراک مقتولاً مذبوحاً بارض کرب و بلا من عصابة من امتی و انت فی ذلک عطشان لاتسقی... یا حسین ان اباک و امک قد قدموا علیّ و هم الیک مشتاقون و ان لک فی الجنّة درجات لن تنالها الا بالشهادة."** (اے حسین! میں دیکھ رہا ہوں کہ جلد ہی تمہیں میری امت کے ایک گروہ کے ہاتھوں زمینِ کرب و بلا پر پیاسا قتل کر دیا جائے گا۔۔۔ اے حسین! تمہارے بابا اور تمہاری مادر میرے پاس آئے ہیں اور وہ تم سے ملنے کے مشتاق ہیں۔ بہشت میں تمہارے لیے ایک ایسا مقام ہے جہاں تم شہادت کے بغیر نہیں پہنچ سکتے) ایک اور روایت میں آیا ہے کہ امام حسینؑ نے مکہ میں فرمایا: **"انّی رایت جدی (ص) فی منامی وقد امرونی بامر و انا ماض لامره."** (میں نے خواب میں اپنے نانا کو دیکھا ہے۔ انہوں نے مجھے ایک حکم دیا ہے جسے انجام دینے کے لیے میں جا رہا ہوں)۔(۳) امامؑ نے سعید بن عاص

۱۔ ان میں سے اکثر روایات کو نئے مصادر و منابع کے ساتھ علامہ شیخ محمد باقر محمودی نے "عبرات المصطفین" کی پہلی جلد میں جمع کیا ہے۔

۲۔ دیکھیے: ترجمة الامام الحسین ابن سعد۔ ص ۱۵۲۔۱۶۱ اور انہی صفحات کا حاشیہ۔

۳۔ ترجمة الامام الحسین ابن سعد۔ ج ۵۔ ص ۵۱

کے نام اپنے خط میں اسی خواب کو بنیاد بنا کر لکھا: "واُعلمک انّی رایت جدی فی منامی مخبرنی بامر وانا ماض لہ." (میں تمھیں یہ بات بتا رہا ہوں کہ میں نے اپنے نانا کو خواب میں دیکھا ہے۔ انہوں نے مجھے ایک امر کے بارے میں بتایا ہے اور میں اسی کو انجام دینے کی خاطر نکلا ہوں)۔(۱)

منزلِ خزیمیہ میں حضرت زینبؑ امامؑ کے پاس تشریف لائیں اور عرض کیا: میں نے آدھی رات کے وقت ایک فریاد سنی ہے۔ امامؑ نے پوچھا: کیا سنا ہے؟ حضرت زینبؑ نے کہا: ایک ہاتف صدا دے رہا تھا:

الا یا عین فاحتفلی بجھد و من یبکی علی الشھداء بعدی

و علی القوم تسوقھم المنایا بمقدار الی انجاز وعدی

"اے آنکھ اشک فشانی کی کوشش کر کہ میرے بعد ان شہروں پر کون گریہ کرے گا جن کی طرف موت بڑھ رہی ہے، گویا خدا نے مقرر کر دیا ہے تا کہ اس کا وعدہ پورا ہو جائے۔"

امامؑ نے فرمایا: اللہ نے جو مقدر کر دیا ہے وہی واقع ہوگا۔(۲)

ایک اور موقع وہ ہے جب امامؑ کربلا پہنچے۔ وہاں پہنچ کر جب آپ نے اس سرزمین کا نام معلوم کیا اور لوگوں نے بتایا تو آپ نے فرمایا: "لقد مرّ ابی بھذا المکان عندہ مسیرہ الی صفین وانا معہ فوقف فسال عنہ فاُخبر باسمہ فقال ھاھنا محطُّ رکابھم وھاھنا مھراق دمائھم. فسُئل عن ذلک. فقال: ثقل لآل البیت محمد ینزلون ھاھنا." (میرے بابا صفین جاتے ہوئے اسی مقام سے گزرے تھے، میں بھی اُن کے ساتھ تھا۔ آپ ٹھہر گئے تھے اور اس جگہ کے بارے میں پوچھا۔ جب آپ کو اس جگہ کا نام بتایا گیا تو آپ نے فرمایا: یہی ان کے پڑاؤ کی جگہ ہے اور اسی مقام پر ان کا خون بہے گا۔ جب اس بارے میں آپ سے پوچھا گیا تو فرمایا: اہلِ بیتِ محمدؐ میں سے کچھ لوگ یہاں پڑاؤ کریں گے)۔(۳)

منزلِ ثعلبیہ پر ظہر کے بعد امامؑ آرام کرنے کے لیے لیٹے اور سو گئے۔ بیدار ہونے کے بعد گریہ کرنے لگے۔ حضرت علی اکبرؑ نے رونے کی وجہ دریافت کی تو فرمایا: "انّی رایت فارساً علی فرس حتی وقف علیّ فقال: یاحسین! انکم تسرعون المسیر والمنایا لکم تسرع الی الجنّۃ فعلمت ان انفسنا قد نعیت الینا." (میں نے ایک گھڑ سوار کو دیکھا جو ہمارے پاس آ کر ٹھہر گیا اور بولا: اے حسینؑ! آپ سرعت کے ساتھ اس سفر کو

۱۔ ایضاً۔ ج ۵۔ ص ۱۱۶ اور دیکھیے: تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۲۹۱۔ اسی بات کو عبداللہ بن جعفر سے بھی لکھا ہے۔ دیکھیے: ترجمۃ الامام الحسینؑ۔ ص ۲۰۲

۲۔ الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۳۲

۳۔ اخبار الطوال۔ ص ۲۵۳

کربلا میں اپنی شہادت سے آگہی

کربلا کے عقیدتی جہاد کے تاریخی پہلو میں جس مسئلے کو انتہائی اہمیت حاصل ہے وہ مسئلہ ''غیب'' ہے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس کی وجہ سے اس تاریخی واقعے کا تجزیہ و تحلیل کرتے ہوئے بعض اختلافات پیش آئے اور اکثر ایک عقیدتی (کلامی) معاملے اور ایک تاریخی مسئلے کے درمیان مقابلے کی صورت سامنے آئی ہے۔ اس بارے میں بکثرت روایات موجود ہیں جن میں سے اکثر میں ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امام حسینؑ کی شہادت کی خبر دے دی تھی۔ علامہ امینی نے ان میں سے بعض روایات کو اپنی کتاب ''سیرتنا و سنتنا'' میں جمع کیا ہے۔ اہلِ سنت کی کتابیں بھی ان روایات سے بھری پڑی ہیں۔(۱)

یہ روایات جو تاریخی پہلو کی حامل ہیں ان کے علاوہ (۲) بھی ایسی روایات نقل ہوئی ہیں جن میں اشارتاً یا صراحتاً واقعۂ کربلا سے پہلے اسکے وقوع میں آنے کی اطلاع دی گئی ہے۔ یہ روایات تاریخی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں، جن میں سے کچھ کی جانب ہم ذیل میں اشارہ کر رہے ہیں:

ایک روایت میں آیا ہے کہ جس دن امامؑ نے مدینہ سے مکہ کی جانب ہجرت کی اس سے ایک رات قبل آپ قبرِ رسولؐ پر تشریف لائے۔ وہاں آپ کی آنکھ لگ گئی۔ اس حال میں آپ نے خواب میں پیغمبر اکرمؐ اور چند فرشتوں کو دیکھا۔ حضورؐ نے آپ کو اپنی آغوش میں لے کر فرمایا: "یاحسین! کانک عن قریب اراک مقتولاً مذبوحاً بارض کرب و بلا من عصابة من امتی و انت فی ذلک عطشان لاتسقی ... یا حسین ان اباک و امک قد قدموا علیّ و هم الیک مشتاقون و ان لک فی الجنّة درجات لن تنالها الا بالشهادة." (اے حسین! میں دیکھ رہا ہوں کہ جلد ہی تمہیں میری امت کے ایک گروہ کے ہاتھوں زمین کرب و بلا پر پیاسا قتل کر دیا جائے گا۔۔۔ اے حسین! تمہارے بابا اور تمہاری مادر میرے پاس آئے ہیں اور وہ تم سے ملنے کے مشتاق ہیں۔ بہشت میں تمہارے لیے ایک ایسا مقام ہے جہاں تم شہادت کے بغیر نہیں پہنچ سکتے) ایک اور روایت میں آیا ہے کہ امام حسینؑ نے مکہ میں فرمایا: "انّی رایت جدی(ص) فی منامی وقد امرونی بامر و انا ماض لامره." (میں نے خواب میں اپنے نانا کو دیکھا ہے۔ انہوں نے مجھے ایک حکم دیا ہے جسے انجام دینے کے لیے میں جا رہا ہوں)۔(۳) امامؑ نے سعید بن عاص

۱۔ ان میں سے اکثر روایات کو نئے مصادر و منابع کے ساتھ علامہ شیخ محمد باقر محمودی نے ''عبرات المصطفین'' کی پہلی جلد میں جمع کیا ہے۔

۲۔ دیکھئے: ترجمة الامام الحسین ابن سعد۔ ص ۱۵۴۔۱۶۱ اور انہی صفحات کا حاشیہ۔

۳۔ ترجمة الامام الحسین ابن سعد۔ ج ۵۔ ص ۵۱

کے نام اپنے خط میں اسی خواب کو بنیاد بنا کر لکھا: "واُعلمک انی رایت جدی فی منامی مخبرنی بامر وانا ماض لہ." (میں تمہیں یہ بات بتا رہا ہوں کہ میں نے اپنے نانا کو خواب میں دیکھا ہے۔ انہوں نے مجھے ایک امر کے بارے میں بتایا ہے اور میں اسی کو انجام دینے کی خاطر نکلا ہوں)۔(۱)

منزل خزیمیہ میں حضرت زینبؑ امامؑ کے پاس تشریف لائیں اور عرض کیا: میں نے آدھی رات کے وقت ایک فریاد سنی ہے۔ امامؑ نے پوچھا: کیا سنا ہے؟ حضرت زینبؑ نے کہا: ایک ہاتف صدا دے رہا تھا:

الا یا عین فاحتفلی بجهد و من یبکی علی الشهداء بعدی

و علی القوم تسوقهم المنایا بمقدار الی انجاز وعدی

"اے آنکھ اشک فشانی کی کوشش کر کہ میرے بعد ان شہیدوں پر کون گریہ کرے گا جن کی طرف موت بڑھ رہی ہے' گویا خدا نے مقرر کر دیا ہے تا کہ اس کا وعدہ پورا ہو جائے۔"

امامؑ نے فرمایا: اللہ نے جو مقدر کر دیا ہے وہی واقع ہوگا۔(۲)

ایک اور موقع وہ ہے جب امامؑ کربلا پہنچے۔ وہاں پہنچ کر جب آپ نے اس سرزمین کا نام معلوم کیا اور لوگوں نے بتایا' تو آپ نے فرمایا: "لقد مرّ ابی بهذا المکان عنده مسیرة الی صفین وانا معه فوقف فسال عنه فاُخبر باسمه فقال هاهنا محطّ رکابهم وهاهنا مهراق دمائهم .فسُئل عن ذلک .فقال: ثقل لآل البیت محمد ینزلون هاهنا." (میرے بابا صفین جاتے ہوئے اسی مقام سے گزرے تھے' میں بھی اُن کے ساتھ تھا۔ آپ ٹھہر گئے تھے اور اس جگہ کے بارے میں پوچھا۔ جب آپ کو اس جگہ کا نام بتایا گیا' تو آپ نے فرمایا: یہی ان کے پڑاؤ کی جگہ ہے اور اسی مقام پر ان کا خون بہے گا۔ جب اس بارے میں آپ سے پوچھا گیا تو فرمایا: اہل بیت محمدؐ میں سے کچھ لوگ یہاں پڑاؤ کریں گے)۔(۳)

منزل ثعلبیہ پر ظہر کے بعد امامؑ آرام کرنے کے لیے لیٹے اور سو گئے۔ بیدار ہونے کے بعد گریہ کرنے لگے۔ حضرت علی اکبرؑ نے رونے کی وجہ دریافت کی' تو فرمایا: "انّی رایت فارساً علی فرس حتی وقف علیّ فقال: یاحسین! انکم تسرعون المسیر والمنایالکم تسرع الی الجنّة فعلمت ان انفسنا قد نعیت الینا." (میں نے ایک گھڑسوار کو دیکھا جو ہمارے پاس آ کر ٹھہر گیا اور بولا: اے حسینؑ! آپ سرعت کے ساتھ اس سفر کو

۱۔ ایضاً۔ ج۵۔ ص۱۱۶ اور دیکھئے: تاریخ طبری۔ ج۳۔ ص۲۹۱۔ اسی بات کو عبداللہ بن جعفر سے بھی لکھا ہے۔ دیکھئے: ترجمۃ الامام الحسینؑ۔ ص۲۰۲

۲۔ الفتوح۔ ج۵۔ ص۱۲۲

۳۔ اخبار الطوال۔ ص۲۵۳

طے کر رہے ہیں اور موت آپ کے لیے زیادہ تیزی کے ساتھ جنت کی طرف جا رہی ہے۔ میں نے جان لیا کہ ہماری جانیں ہم سے جدا ہونے والی ہیں)۔(۱)

صبحِ عاشور امامؑ نے اپنی بہن سے فرمایا: "یا اُختاه! انی رایت جدی فی المنام و ابی علیاً و فاطمه اُمی واُخی الحسن علیهم السلام. فقالوا: انک رائح الینا عن قریب وقد واللّٰه یا اُختاه دنا الامر فی ذلک لاشک." (اے بہن! میں نے خواب میں اپنے نانا کو دیکھا ہے اور اپنے بابا علیؑ، ماں فاطمہ اور بھائی حسن (علیہم السلام) کو بھی دیکھا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ: تم بہت جلد ہمارے پاس آ جاؤ گے۔ اے بہن! بے شک اور خدا کی قسم اب وہ وقت قریب ہے)۔(۲)

اسی طرح شبِ عاشور کے بارے میں منقول ہے کہ امامؑ نے فرمایا: میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے بعض اصحاب کے ساتھ دیکھا۔ آپ نے مجھ سے فرمایا: "یا بنی! انت شهید آل محمد و قد استبشرت بک السماوات و اهل الصفیح الاعلیٰ فلیکن افطارک عندی اللیلة. تعجل و لاتؤخر." (اے میرے بیٹے! تو شہید آلِ محمدؐ ہے۔ آسمانوں اور اعلیٰ آسمانوں کے رہنے والوں نے تجھے بشارت دی ہے۔ تجھے آج رات میرے ساتھ افطار کرنا ہے۔ جلدی کرو، دیر مت لگاؤ)۔(۳)

ایک اور مقام پر مجاہد کی نقل کے حوالے سے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے کوفہ میں منبر پر فرمایا: "کیف انتم اذا اتاکم اهل بیت نبیکم یحمل قویهم ضعیفهم." (تم اُس وقت کیا کرو گے جب تمہارے نبی کے اہل بیت تمہارے پاس اس حال میں لائے جائیں گے کہ ان کا طاقتور ان میں کے کمزور کو اٹھائے ہوئے ہوگا؟) لوگوں نے کہا: ہم یہ کردیں گے وہ کردیں گے۔ امامؑ نے اپنا سر ہلا کر فرمایا: "تـوردون ثم تعرّدون ثم تطیعون البرائة ولابرائة لکم." (۴)

یہ ان روایات کے نمونے تھے جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ امام حسینؑ اپنی شہادت سے پہلے ہی واقعۂ کربلا سے آگاہ تھے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ صرف امام حسین علیہ السلام ہی نہیں بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اپنی سیاسی زندگی میں غیب سے استفادہ نہیں کرتے تھے، سوائے اُن مواقع کے جب نبوت یا امامت کو ثابت کرنا مقصود ہو۔ نبی اکرمؐ اور ائمہ کرامؑ

۱۔ ترجمۃ الامام الحسین۔ ص ۱۷۷، الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۲۳

۲۔ الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۷۵۔۱۷۶

۳۔ الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۸۱

۴۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۸۲

" کا سیاسی طرزِ عمل وہی ہوا کرتا تھا جس کا ہم نے اپنی تحلیل میں تذکرہ کیا ہے۔ غیب سے اس آگہی کے مواقع وہ ہیں جب اللہ تعالیٰ (جبرئیل یا خواب وغیرہ جیسی چیزوں کے ذریعے) کسی طریقے سے انہیں غیب سے آگاہ فرمادیا کرتا تھا۔ کیونکہ غیب بنیادی طور پر صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ہمارے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ علیہم السلام معروضی حالات کی بنیاد پر اسوۂ عمل ہوتے ہیں نہ کہ غیب کی بنیاد پر۔ زندگی کے طبیعی حالات میں تمام انبیا اور ائمہ کا طرزِ عمل یہی رہا ہے۔

اس حوالے سے کثرت کے ساتھ تاریخی اور کلامی بحثیں ہوئی ہیں' جن کی اس کتاب میں گنجائش نہیں اور اس بارے میں ایک جداگانہ مقالے کی ضرورت ہے۔ اس کے باوجود ہم اجمالی طور پر اس کے بعض پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہیں۔

کربلا اور دینی انحرافات

جس وقت کربلا کا واقعہ پیش آیا' اس وقت اسلامی معاشرہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارک کے آخری برسوں کے معاشرے سے بہت مختلف ہو چکا تھا۔ یہ بات درست ہے کہ انحرافات تدریجی طور پر آگے بڑھ رہے تھے' لیکن بہت سے محققین کی نظر میں ان کی بنیادیں رحلتِ رسولؐ کے بعد کے ابتدائی برسوں ہی میں پڑ چکی تھیں۔ یہ انحرافات ان معاملات میں تھے جن سے اہلِ سیاست آسانی سے فائدہ اٹھا سکتے تھے' اور لوگوں کو بے وقوف بنانے اور اپنے ظلم وستم کی توجیہ کے لیے ان سے استفادہ کر سکتے تھے۔ ان انحرافات کی پیدائش اور ان کے پھیلاؤ میں بنی امیہ نے اہم کردار ادا کیا۔ خصوصاً یزید کی حکومت کے قیام سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ بنی امیہ کی نظر میں اسلام کی کوئی اہمیت نہیں' اور اس پر اعتقاد کا اظہار اپنی توجیہات پر نقاب ڈالنے اور لوگوں سے اپنا اقتدار قبول کرانے کے لیے تھا۔

امام حسین علیہ السلام بنی امیہ کو ظالم اور دشمنِ اسلام قرار دینے کے ساتھ ساتھ (۱) انہیں ایسے لوگ سمجھتے تھے جنہوں نے "شیطان کی اطاعت کو قبول کیا ہوا ہے' اللہ کی اطاعت کو چھوڑے ہوئے ہیں' فساد کو ظاہر کیا ہے' حدودِ الٰہی کو معطل اور بیت المال پر ڈاکا ڈالا ہے۔" (۲) ان لوگوں نے فساد پیدا کرنے اور حدودِ الٰہی کو معطل کرنے کے علاوہ' بہت سے دینی مفاہیم کی تحریف بھی کی تھی یا ناجائز باتوں کے لیے ان سے استفادہ کرتے تھے۔ یہاں ہم تاریخی شواہد کے ساتھ اُن مفاہیم کے کچھ نمونے پیش کر رہے ہیں جو کربلا کے واقعے اور اس کی پیدائش میں موثر ثابت ہوئے:

۱۔ الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۳۷

۲۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۱۷۱' الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۳۴۔۱۳۵' تاریخ طبری۔ ج ۴۔ ص ۳۰۴۔ دوسری عبارتوں میں امام نے فرمایا: "الا ترون ان الحق لایعمل به و ان الباطل لایتناهی عنه." تاریخ طبری۔ ج ۴۔ ص ۳۰۵' ترجمۃ الامام الحسینؑ ابن عساکر۔ ص ۲۱۴۔ اسی طرح امام نے فرمایا: "فان السنة قد امیتت و ان البدعة قد احییت." تاریخ طبری۔ ج ۴۔ ص ۲۶۶

تین مفہوم" اطاعتِ امام" التزامِ جماعت اور بیعت توڑنے کا حرام ہونا" وہ رائج ترین سیاسی اصطلاحات تھیں' جن سے خلفا استفادہ کیا کرتے تھے۔ شاید یہ کہا جاسکے کہ مذکورہ تین مفہوم خلافت کی بنیاد اور اس کی بقا کے ضامن ہوا کرتے تھے۔ یہ تینوں اصطلاحات' صحیح اصول تھے جو بہر طور اسلام کے دینی سیاسی مفاہیم میں شمار ہوتے تھے' اور عقلی اعتبار سے بھی معاشرے کی بقا اور حفاظت کے لیے ان کو ملحوظ رکھنا ضروری تھا۔

اطاعتِ امام سے مراد مقتدر نظام کی پیروی ہے۔ اہم سوال یہ ہے کہ حاکم کی پیروی کس حد تک کی جانی چاہیے؟ کیا صرف امامِ عادل کی اطاعت واجب ہے یا یہ کہ ظالم بادشاہ کی بھی اطاعت کرنی چاہیے؟ اس سے پہلے ہم حضرت عثمان کی خلافت کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے تفصیل کے ساتھ یہ نکتہ بیان کرچکے ہیں' آپ اسے وہیں پر دیکھ سکتے ہیں۔

التزامِ جماعت' یعنی بغاوت اور شورش سے پرہیز' ہر ایسے اقدام سے اجتناب جس سے اتحاد و اتفاق کو نقصان پہنچے اور اسلامی معاشرے کے عدمِ استحکام کی راہ ہموار ہو۔ اس حوالے سے اہم سوال یہ ہے کہ کیا ظالم حکومت اور فاسق حکمراں کے سامنے بھی ہر صورت میں خاموش رہا جائے؟ اور کیا ہر مخالف آواز کو یہ کہہ کر کہ وہ "جماعت" میں رخنہ ڈالنے اور "تفرقے" کا سبب ہے مورد الزام ٹھہرایا جاسکتا ہے؟

بیعت نہ توڑنے کو اسلام میں اس عنوان سے سراہا گیا ہے کہ یہ اپنے عہد سے وفاداری ہے۔ بیعت اور عہد توڑنے کی بہت زیادہ مذمت کی گئی ہے اور واضح ہے کہ یہ بات سیاسی مسائل میں انتہائی مثبت کردار ادا کرتی ہے۔ لیکن کیا یزید جیسے خلیفہ کی بیعت نہ کرنا یا اسکی بیعت توڑ دینا اور مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ پڑ جانا بھی عہد توڑنے کی حرمت کے طور پر دیکھا جائے گا؟ یا ہمیں ایسی صورتحال کو مستثنیٰ شمار کرنا چاہیے؟ جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے' بنی امیہ اور ان کے بعد بنی عباس کے خلفا نے بھی ان مفاہیم کی تحریف شدہ شکل سے استفادہ کرتے ہوئے (جس میں کوئی قید و شرط نہیں تھی) لوگوں کو اپنی حکومت قبول کرنے پر آمادہ کیا۔

جب معاویہ اپنے بیٹے یزید کے لیے بیعت لے رہے تھے تو مخالفین کو یزید کی بیعت پر آمادہ کرنے کے لیے وہ مدینہ آئے۔ حضرت عائشہ بیعت کے مخالفوں میں شامل تھیں' کیونکہ بہر حال اُن کے بھائی محمد بن ابو بکر معاویہ کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے۔ جب بیعت کی بات شروع ہوئی تو معاویہ نے حضرت عائشہ سے کہا: میں نے یزید کے لیے تمام مسلمانوں سے بیعت لے لی ہے۔ کیا آپ اس بات کی اجازت دیں گی کہ "ان یخلع الناس عهودهم." میں لوگوں کو اُن کے کیے ہوئے عہد و پیمان سے خلاص کردوں؟ حضرت عائشہ نے کہا: انی لا اری ذلک ولکن علیک بالرفق والتانی. (۱)

۱۔ الفتوح۔ ج ۴۔ ص ۲۳۷' الامامۃ والسیاسۃ۔ ج ۱۔ ص ۱۸۳

(میں اس بات کو جائز نہیں سمجھتی' لیکن تم بھی لوگوں کے ساتھ نرمی اور ملائمت سے پیش آؤ)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مفہوم کے زیرِ اثر کس طرح حضرت عائشہ بھی راضی ہو گئیں۔

اب آیئے اسی حوالے سے ایک اور نمونہ ملاحظہ فرمایئے:

ابو اسحاق کہتا ہے: **کان شمر یُصلّي معنا ' ثم یقول :اللھم انک تعلم انی شریف فاغفرلی. قلت: کیف یغفر اللّٰہ لک وقد اعنْتَ علی قتل ابن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم. قال: ویحک کیف نصنع' ان ھؤلاء امرونا بامر فلم نخالفھم' ولو خالفنا ھم کنّا شرامن ھذہ الحمر السقاۃ. قلت: ان ھذا لعذر قبیح فانّما الطاعۃ فی المعروف.** (شمر ابن ذی الجوشن ہمارے ساتھ نماز پڑھا کرتا تھا۔ وہ نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر خدا سے دعا کیا کرتا تھا کہ بارالہا! تو جانتا ہے کہ میں ایک شریف انسان ہوں' مجھے بخش دے۔ میں نے اس سے کہا: خدا تجھے کیسے بخشے گا' حالانکہ تو نے فرزندِ رسولؐ کے قتل میں مدد کی ہے؟ شمر نے کہا: ہم نے کیا کیا ہے؟ ہمارے امیروں نے ہمیں حکم دیا کہ ایسا کرو' ہم ان کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ اگر ہم اُن کی مخالفت کرتے تو پانی لانے والے گدھوں سے بدتر ہوتے۔ میں نے اس سے کہا: یہ ایک قبیح عذر ہے۔ اطاعت صرف نیک کاموں میں ہوتی ہے)۔(۱)

ابن زیاد نے بھی حضرت مسلم بن عقیل کی گرفتاری کے بعد اُن سے کہا تھا: **یا شاق! خرجت علی امامک وشققت عصا المسلمین.** (اے نافرمان! تو نے اپنے امام پر خروج کیا اور مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالی)۔(۲) لیکن حضرت مسلمؑ جو اس انحرافی طرزِ فکر کے ماننے والے نہ تھے' انہوں نے اسے بالکل درست جواب دیا' اور فرمایا کہ معاویہ نے خلافت کو امت کے اجماع سے حاصل نہیں کیا تھا' بلکہ وصی پیغمبرؐ کے ساتھ چالاکی کر کے غلبہ حاصل کیا اور خلافت کو غصب کیا تھا۔

جب امام مکہ سے روانہ ہو رہے تھے' تو اس وقت حاکمِ مکہ عمرو بن سعید بن عاص کے نمائندوں نے آپ سے کہا: **الا تتقی اللّٰہ تخرج عن الجماعۃ وتفرّق بین ھذہ الامّۃ.** (کیا آپ کو خدا کا خوف نہیں کہ آپ مسلمانوں کی

۱۔ لسان المیزان۔ ج ۳۔ ص ۱۵۱ (طبع جدید۔ ج ۳۔ ص ۵۰۲)' ترجمۃ الامام الحسین کے صفحہ ۱۹۷ میں عبارت اس طرح سے ہے: "**کان شمر بن ذی الجوشن الضبابی لایکاد اولایحضر الصلوٰۃ معنا' فیجی بعد الصلوٰۃ فیصلّی ثم یقول: اللھم اغفرلی فانی کریم لم تلدنی اللئام. قال: فقلت لہ: انک لسیّء الرأی یوم تسارع الی قتل ابن بنت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم. قال: دعنا منک یا ابا اسحاق فلو کنا کما تقول واصحابک کنّا شرّا من الحمیر السقّاءات.**"

۲۔ الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۹۸

جماعت سے نکل کر امت کے درمیان اختلاف پیدا کر رہے ہیں؟)۔(۱)

ابن زیاد کا ایک سپہ سالار عمرو بن حجاج فخریہ کہا کرتا تھا: ہم نے امام کی اطاعت کو نہیں چھوڑا اور جماعت سے کنارہ کشی اختیار نہیں کی۔(۲) وہ ابن زیاد کے سپاہیوں کو بھی نصیحت کیا کرتا تھا کہ: **الزموا طاعتکم وجماعتکم ولاترتابوا فی قتل من مرق عن الدین وخالف الامام.** (اطاعت اور جماعت کے پابند رہو اور ایسے شخص کو قتل کرنے میں کسی شک وشبہ میں مبتلا نہ ہو جو دین سے خارج ہو گیا ہے اور جس نے امام کی مخالفت کی ہے)۔(۳)

عبداللہ ابن عمر جیسے افراد' جو اہل سنت کے فقہا اور روایات کے محدثین میں شمار ہوتے ہیں' سمجھتے تھے کہ اگر لوگ یزید کی بھی بیعت کر لیں' تو وہ بھی اسے قبول کر لیں گے۔ انہوں نے معاویہ سے وعدہ کیا تھا کہ: **فاذا اجتمع النّاس علی ابنک یزید لم اُخالف.** (جب سب لوگ تیرے بیٹے یزید کی بیعت کر لیں گے' تو میں بھی اُسکی مخالفت نہیں کروں گا)۔(۴) وہ امام حسینؑ سے بھی کہا کرتے تھے: آپ مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ نہ ڈالیے۔(۵) عبدالرحمٰن بن عوف کی بیٹی عمرہ' جیسے لوگوں نے بھی امامؑ کو لکھا کہ ''اطاعت'' کی حرمت کا پاس رکھیے اور جماعت اور اس کی حفاظت کے پابند رہیے۔(۶)

اسلامی معاشرے میں ایک اور دینی انحراف ''عقیدۂ جبر'' تھا۔ اس عقیدے سے واقعۂ کربلا سے پہلے بھی فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔ لیکن ابتدائے اسلام میں معاویہ اس کے مجدِّد تھے اور ابو ہلال عسکری کے بقول' معاویہ اس کے بانی تھے۔(۷) قاضی عبدالجبار نے بھی اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہ معاویہ ''مجبرہ'' کے موسس تھے' اس بات کی تائید میں معاویہ کے

۱۔ تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۲۸۹۔ اسی پروپیگنڈے کی وجہ سے بہت سے لوگ خصوصاً اہل شام امام حسینؑ کو خارجی (امام پر خروج کرنے والا) سمجھتے تھے اور ان کی (نعوذ باللہ) تکفیر کیا کرتے تھے۔

۲۔ ایضاً۔ ص ۳۲۵

۳۔ ایضاً۔ ص ۳۳۱

۴۔ ترجمۃ الامام الحسینؑ۔ ص ۱۶۷۔ خود معاویہ کے بقول ابن عمر ایک بزدل انسان تھا (ابن اعثم۔ ج ۳۔ ص ۲۶۰) اس نے امام حسینؑ سے بھی کہا: خروج نہ کیجیے' صبر سے کام لیجیے اور اس صلح میں شامل ہو جائیے جس میں سب لوگ داخل ہو گئے ہیں۔ دیکھئے: الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۳۹' ترجمۃ الامام الحسینؑ۔ ص ۱۶۶

۵۔ الکامل فی التاریخ۔ ج ۳۔ ص ۱۷

۶۔ ترجمۃ الامام الحسینؑ۔ ص ۱۶۷

۷۔ الاوائل عسکری۔ ج ۲۔ ص ۱۲۵

چند دلچسپ فقرے نقل کیے ہیں۔(۱)

یزید کی بیعت کے متعلق معاویہ کا کہنا تھا: ان امر یزید قضاء من القضاء' ولیس للقضاء الخیرة من امرھم. (یزید کا مسئلہ قضائے الٰہی میں سے ایک قضا ہے' اور کسی کو اس میں اختیار حاصل نہیں ہے)۔(۲)

عبیداللہ ابن زیاد نے بھی امام سجاد علیہ السلام سے کہا تھا: اولم یقتل اللّٰہ علیاً؟ (کیا خدا نے علی (اکبر) کو قتل نہیں کیا؟) امام نے فرمایا: "کان لی اخ یقال لہ علی 'اکبر منی قتلہ الناس." (میرا ایک بھائی تھا جسے علی کہتے تھے' وہ مجھ سے بڑا تھا' اُسے لوگوں نے قتل کر دیا)۔(۳)

جب عمر ابن سعد پر اعتراض کیا گیا کہ اُس نے "رے" کی حکومت کی خاطر امام حسینؑ کو کیوں قتل کیا؟ تو اُس نے کہا: یہ کام خدا کی جانب سے مقدر ہو چکا تھا۔(۴)

کعب الاحبار بھی جب تک زندہ تھا' غیب گوئی کیا کرتا تھا کہ حکومت بنی ہاشم کو نہیں ملے گی۔ (حالانکہ بعد میں عباسیوں اور علویوں دونوں کو مثلاً طبرستان میں اقتدار ملا) اسی بات کو عبداللہ ابن عمر سے بھی نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا تھا: فاذا رایت الھاشمی قد ملک الزمان فقد ھلک الزمان. (جب تم دیکھو کہ کسی ہاشمی فرد کو اقتدار ملا ہے' تو سمجھ لو کہ زمانہ اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے)۔(۵) ان انحرافات کا نتیجہ آگے چل کر یہ برآمد ہوا کہ اہل سنت نے امام حسینؑ کے قیام کو کبھی بھی فساد اور بدعنوانیوں کے خلاف قیام نہ سمجھا بلکہ اسے صرف ایک غیر قانونی "شورش" قرار دیا۔(۶)

شیعوں پر واقعۂ کربلا کے سیاسی اثرات

تاریخ میں واقعۂ کربلا کا شمار تشیع کو تشکیل دینے والے حوادث میں ہوتا ہے۔ اس سے پہلے اشارہ ہو چکا ہے کہ تشیع کے بنیادی عقائد اور خصوصاً اس کا بنیادی ترین اصول یعنی امامت' خود قرآن و سنت میں ملتا ہے۔ لیکن معاشرے میں موجود دوسرے گروہوں سے شیعوں کی علیحدہ شناخت بتدریج عمل میں آئی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام کے دور خلافت کی خاص سنت اور افکار نے شیعوں کو فکری لحاظ سے کافی حد تک منظم کیا تھا۔ بنی امیہ اپنے خود ساختہ اسلام کی حمایت کیا کرتے تھے اور

۱۔ فضل الاعتزال وطبقات المعتزلہ۔ ص ۱۴۳

۲۔ الامامہ والسیاسہ۔ ج ۱۔ ص ۱۸۳ تا ۱۸۷

۳۔ ترجمۃ الامام الحسینؑ۔ ص ۱۸۸

۴۔ طبقات الکبریٰ۔ ج ۵۔ ص ۱۴۸

۵۔ ترجمۃ الامام الحسینؑ ابن عساکر۔ ص ۱۹۳

۶۔ تاریخ اسلام کیمبرج یونیورسٹی۔ ج ۱ ص ۸۱ (انگریزی متن) اور دیکھئے: الاختلاف فی اللفظ۔ ص ۴۷۔ ۴۹

اس وقت تک معاویہ کی پالیسیوں کی وجہ سے حقیقی اسلام سے اس کا فاصلہ اور دونوں کی ماہیت میں فرق سامنے نہیں آسکا تھا۔ لیکن یزید کے خلیفہ بننے نے اس فرق کو بالکل واضح کردیا۔ واقعۂ کربلا کے نتیجے میں اموی اسلام سے متاثر تمام اسلامی گروہوں سے شیعوں کا اختلاف اور امتیاز کھل کر سامنے آ گیا۔ اس کے بعد دوسرے گروہوں سے شیعوں کو (ایک ایسے گروہ کی حیثیت سے جو حضرت علیؑ اور اُن کے جانشینوں کی سنت اور سیرت کا پیرو ہے) مکمل طور پر جدا اور علیحدہ پہچاننا ممکن ہوگیا تھا۔

شیعوں کے درمیان ایک گروہ ہر اعتبار سے ائمہ علیہم السلام کا تابع تھا' وہ انہیں وصیِ رسول سمجھتے تھے اور اس بات کے قائل تھے کہ ائمہ کو خود رسولِ کریمؐ نے منتخب کیا ہے۔ دوسری طرف عراق اور بعض دوسرے علاقوں کے کچھ گروہ ایسے بھی تھے جو صرف علویوں کی امویوں پر برتری کے قائل تھے اور اُن کی شیعیت بس اسی حد تک محدود تھی۔ (۱) کربلا میں امام حسینؑ کے ساتھ شہید ہونے والے لوگ' وہ شیعہ تھے جو امامت کو صرف حضرت علیؑ اور ان کی اولاد کا حق سمجھتے تھے۔ خود امام حسینؑ نے کئی مرتبہ لوگوں سے کہا تھا کہ حق کو اس کے حقدار کے حوالے کریں اور اُن کی مدد کریں' کیونکہ امویوں نے اس حق کو غصب کرلیا ہے۔ (۲) ایک موقع پر آپ نے فرمایا: "ایھا الناس! انا ابن بنت رسول اللّٰہ' ونحن اولی بولایة ھذہ الأمور علیکم من ھؤلاء المدعین ما لیس لھم." (اے لوگو! میں تمہارے رسول کی بیٹی کا بیٹا ہوں اور تم پر ان امور کی ولایت کے لیے ہم ان لوگوں سے زیادہ حقدار ہیں جو ایسی چیز کا دعویٰ کر رہے ہیں جو ان کی نہیں)۔ (۳) ایک اور جگہ پر آپ نے فرمایا: "وانا احقُّ من غیری لقرابتی من رسول اللّٰہ." (رسول اللہ سے قرابت کی وجہ سے میں کسی اور سے زیادہ حقدار ہوں)۔ (۴)

امامؑ کے علاوہ آپ کے اصحاب نے بھی مختلف موقعوں پر اسی اعتقاد کو نثر اور نظم کے ذریعے بیان کیا۔ چنانچہ حضرت مسلم بن عقیل نے ابن زیاد سے کہا: خدا کی قسم معاویہ خلیفۂ برحق نہیں ہے' بلکہ اس نے مکاری سے وصیِ پیغمبرؐ پر غلبہ کر کے ان کی خلافت کو غصب کیا ہے۔ (۵) کربلا میں امامؑ کے ایک صحابی عبدالرحمن بن عبداللہ یزنی کہتے تھے:

۱۔ ہم نے اپنی کتاب "تاریخ تشیع در ایران" میں اس بارے میں کافی حد تک گفتگو کی ہے۔
۲۔ انساب الاشراف۔ ج ۳۔ ص ۱۰۷' الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۳۵
۳۔ الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۳۷
۴۔ ایضاً۔ ج ۵۔ ص ۱۴۴' ۱۳۵
۵۔ ایضاً۔ ج ۵۔ ص ۹۸

انا ابن عبد اللّٰہ من آل یزن

دینی علی دین حسین و حسن

''میں آل یزن سے عبداللہ کا بیٹا ہوں اور میرا دین وہی ہے جو حسنؑ اور حسینؑ کا دین ہے۔'' (۱)

اسی طرح حجاج بن مسروق نے امام حسینؑ سے مخاطب ہو کر کہا:

الیوم القی جدک النبیا

ثم اباک ذی الندی علیّا

ذلک الذی نعرفہ وصیّا (۲)

''آج میں آپ کے جد نبی اکرم کا دیدار کروں گا۔ پھر آپ کے والد علی مرتضیٰ سے ملاقات کروں گا کہ جنہیں ہم وصی رسول سمجھتے ہیں۔''

ہلال بن نافع بَجَلی ایک شعر میں کہتے ہیں:

انا الغلام التمیمی البجلی

دینی علیٰ دین حسین و علی

''میں بنی تمیم اور بَجَلی کا جوان ہوں اور میرا دین وہی ہے جو حسینؑ اور ان کے بابا علیؑ کا دین ہے۔'' (۳)

عثمان بن علی بن ابیطالبؑ نے بھی شعر میں کہا:

انی انا عثمان ذو المفاخر   شیخی علیٌّ ذو الفعال الطاھر

ابن عم النبی الطاھر   اخو حسین خیرۃ الاخائر

و سید الکبار و الاصاغر   بعد الرسول و الوصی الناصر

''میں عثمان صاحب مفاخر ہوں۔ میرے والد پاک کردار والے علیؑ ہیں۔ میں پیغمبر طاہرؐ کے چچازاد کا بیٹا ہوں۔ حسینؑ کا بھائی ہوں جو منتخب شدہ لوگوں میں سے منتخب ترین ہیں۔ پیغمبر اکرمؐ اور وصی کے بعد چھوٹوں بڑوں کے سید و سردار ہیں۔'' (۴)

۱۔ الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۹۳

۲۔ الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۱۹۹

۳۔ الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۲۰۱

۴۔ الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۲۰۶

نافع بن ہلال نے کہا:

انا الجملی انا علی دین علی.

• "میں جملی ہوں اور علیؑ کے دین پر ہوں۔"

ان کے مقابلے میں دشمن کی فوج کے ایک سپاہی نے کہا: "انا علی دین عثمان." "میں دین عثمان پر ہوں۔(۱)

ان اشعار اور اسی طرح دوسرے اشعار سے جو عباس ابن علیؑ اور دوسروں سے منقول ہیں بخوبی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ اصحاب امامؑ کا شیعی عقیدہ صرف سیاسی حمایت کی حد تک نہیں تھا بلکہ اس میں اُس کا اعتقادی پہلو بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔

امام حسینؑ کی شہادت کی حکمت

کربلا کی تحریک' ایک مقدس مذہبی تحریک کے عنوان سے' نیز ایک انقلابی قسم کی سیاسی تحریک کے طور پر شیعوں کی سیاسی فکر میں اَن مٹ نقوش کی حامل تحریک ہے۔ یہ تحریک احکامِ دین کے احیا' دینی اور سیاسی انحرافات کے خاتمے اور اموی نظام کی جگہ علوی حکومت اور نظامِ امامت کے قیام کے لیے ایک انقلاب تھا۔

کربلا کی تحریک اپنے مقاصد کے حصول کے زاویے (angle) سے ایک قسم کی شکست سے دوچار اور ایک قسم کی کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ اس تحریک کا مقصد اموی حکومت کا خاتمہ اور حکومتِ علوی کا قیام تھا' تو یہ سیاسی لحاظ سے شکست سے دوچار ہوئی۔ لیکن اگر اسلامی معاشرے میں بنیادی معنوی اور دینی اہداف کے استحکام کو مدنظر رکھا جائے' تو یہ تحریک ایک معنوی کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ جو شخص اموی حکومت کے خاتمے کو امام حسینؑ کے مقاصد میں شمار نہیں کرتا' وہ شاید سیاسی شکست کے نظریے کو بھی قبول نہ کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ کربلا کی تحریک کو اولادِ علیؑ کو اُن کی حکومت دلانے کی انتہائی ممکنہ سیاسی کوشش قرار دینا چاہیے۔ اس بات کی وضاحت کے لیے ذرا تفصیل سے بیان کی ضرورت ہے:

اس بات میں معمولی سا بھی شک نہیں کہ حضرت علیؑ رسول اللہؐ کے بعد اپنے آپ کو اپنے حق سے محروم سمجھتے تھے۔ لیکن آپ نے بعض وجوہات کی بنا پر خاموشی اختیار کی۔ آپ کو حضرت عمر کے بعد اس بات کی توقع تھی کہ حق حقدار کو مل جائے گا۔ اس بارے میں خود آپ نے اور مقدادؓ اور عمارؓ جیسے آپ کے مخلص شیعوں نے کوشش بھی کی۔ لیکن ان کوششوں کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس کے بعد حضرت عثمان کے دور میں امامؑ نے محسوس کیا کہ اب ان نئے حالات میں معاشرے کی

۱۔ تاریخ طبری، ج ۴، ص ۳۳۱، ۳۳۲

قیادت کے لیے کامیابی کا امکان بہت کم ہے۔ اس کے باوجود لوگوں کے اصرار نے آپ کی امید میں اضافہ کیا۔ لیکن معاشرے کی صحیح قیادت کے لیے آپ کے چار سال نو ماہ کے سخت اقدامات کے بعد یہ امید بھی ٹوٹ گئی۔ امام حسنؑ نے نئی امید کے ساتھ جو محدود کوششیں کیں وہ بھی جلد ہی ناکامی سے دوچار ہوئیں۔ اب یہاں معاویہ کے مرنے تک بیس سال انتظار کرنا تھا۔ امام حسینؑ نے اس مدت میں صبر کیا۔ اگرچہ اس دوران آپ معاویہ پر سیاسی حوالے سے اور خاص طور پر بعض شیعوں کے قتل کے حوالے سے اعتراضات کرتے رہتے تھے۔

معاویہ کی زندگی کے آخری برسوں میں یزید کی ولی عہدی کا معاملہ پیش آیا۔ امام حسینؑ نے اس کی مخالفت کی، لیکن کوئی امید نہیں تھی۔ اس کے باوجود امام حسین علیہ السلام امام ہونے کی حیثیت سے اس بات کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

یزید کے مسند نشیں ہونے کے بعد اس صورتحال پر اعتراض کے طور پر امام مکہ تشریف لے آئے۔ یہ وہ موقع تھا جب مشرق کی جانب سے امید کی کرن دکھائی دی۔ عراق سے کئی مرتبہ ناخوش کن تجربات ہوئے تھے، لیکن ان حالات میں کیا کیا جا سکتا تھا؟ اگر کوئی اقدام کرنا تھا، تو یہ شام یا حجاز میں نہیں بلکہ صرف عراق میں ہی ممکن تھا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ عراقی مسلمانوں کی مدد سے، جن میں شیعہ بھی تھے، اموی حکومت کا تختہ الٹ کر علوی حکومت قائم کی جاتی؟ بظاہر حالات یعنی وسیع پیمانے پر وہ حمایت جس کی خبریں امام کو مل رہی تھیں وہ کسی حد تک اس بات کی تائید کر رہے تھے۔ امام نے وقت ضائع نہیں کیا، لیکن جب آپ کوفہ کے نزدیک پہنچے تو حالات بدل چکے تھے۔ آپ ابن زیاد کے لشکر کے مقابل تھے۔ سرِ تسلیم خم کرنے اور بیعت کر لینے کا مطالبہ ہوا لیکن امامؑ نے قبول نہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ اپنے محدود ساتھیوں کے ہمراہ سرزمین کربلا پر شہید ہو گئے۔

یہ وضاحت اس بات کی تشریح کے لیے کی گئی ہے جس کی جانب ہم نے ابھی چند سطر پہلے اشارہ کیا تھا اور وہ یہ کہ کربلا کی تحریک ایک ایسے معاشرے میں جو اُس دور میں مسلمانوں کا معاشرہ کہلاتا تھا علوی حکومت کے قیام کے لیے انتہائی ممکنہ سیاسی کوشش تھی۔

کربلا میں خاندانِ ابوطالب کے ممتاز افراد شہید ہوئے۔ اس زمانے میں اس خاندان کے ممتاز افراد میں سے محمد بن حنفیہ، علی بن الحسینؑ اور عبداللہ بن جعفر کے علاوہ کوئی زندہ نہیں بچا۔ لہٰذا تصور کیا جا سکتا ہے کہ یہ اقدام کس قدر خطرناک تھا کہ اس سے پورے خاندانِ نبوت کے خاتمے کا اندیشہ تھا۔

اب اس خاندان کے باقی ماندہ افراد کو کیا کرنا چاہیے تھا؟ اگر کوئی امام زین العابدینؑ کی زندگی سے واقفیت رکھتا ہو، تو وہ بآسانی یہ کہہ سکتا ہے کہ امامؑ نے عسکری پالیسی کو مکمل طور پر خیرباد کہہ دیا تھا۔ اس دور میں کسی سیاسی (فوجی) اقدام کو کالعدم سمجھ لیا گیا تھا۔ امامؑ نے نہ تو کسی اور سیاسی قیام کے بارے میں سوچا اور نہ اس عرصے میں بنی امیہ کی مخالف سیاسی

(عسکری) تحریکوں' حتیٰ علویوں کے طرفداروں سے بھی تعاون نہ کیا۔ اگرچہ شاید امام کو اُن سے ہمدردی ہو۔ اس بارے میں امام کا فیصلہ اس قدر اٹل تھا کہ آپ مدینہ میں ایک مقبول علمی شخصیت کے طور پر علمی کاموں میں مشغول رہے' اور اسلامی معاشرے کے ہر طبقے کو اپنے پر برکت علمی دسترخوان سے مستفیض کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر امام کے اقدامات میں معمولی سی بھی سیاسی بو محسوس کی جاتی' تو آج ابن شہاب زہری اور اس جیسے دوسرے افراد کے کلام میں آپ کی اتنی تعریف وتمجید نظر نہ آتی۔ اس طرزِ عمل کے باوجود امام اپنے شیعوں کے لیے بطور امام باقی رہے۔ امام کی فقہ' امام کی دعائیں اور امام کی شخصیت شیعی امامت کے ایک آئیڈیل کی حیثیت سے شیعوں میں قبول کی گئی۔

امام زین العابدینؑ کے بعد شیعہ تحریک دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک نے آپ ہی کے نقشِ قدم کی پیروی کی اور دوسرے نے انقلابی راستہ اپنایا۔ پہلے گروہ کی قیادت امام زین العابدینؑ کے بڑے بیٹے امام محمد باقرؑ (م: ۱۱۴ یا ۱۱۷ ہجری) کے پاس تھی اور دوسرے گروہ کی قیادت امام سجادؑ کے چھوٹے بیٹے زید بن علیؒ (م: ۱۲۲ ہجری) کے ہاتھ میں تھی۔ شہادت کے وقت ان کی عمر چالیس برس سے کچھ ہی زیادہ تھی۔ زید اپنے بھائی کا احترام کیا کرتے تھے' لیکن انقلابی طرزِ عمل پر پورا یقین بھی رکھتے تھے۔ جس زمانے میں انہوں نے اپنی عسکری تحریک کا آغاز کیا' اُس زمانے میں اُن کے بھائی اس دنیا میں نہیں رہے تھے اور اُن کے والد گرامی کے شاگردوں کی قیادت اسی پالیسی کے مطابق اُن کے فرزند امام جعفر صادقؑ کے ہاتھ میں تھی۔

کوفہ کے شیعہ دو حصوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ کچھ لوگ زید کی حمایت میں انقلابی طرزِ عمل کے معتقد تھے' جبکہ کچھ لوگ امام جعفر صادقؑ کا اتباع کرتے ہوئے امام زین العابدینؑ اور امام محمد باقرؑ کی سیاست پر گامزن تھے۔ دوسرے گروہ سے تعلق رکھنے والے لوگ زید کے لیے مکمل احترام کے قائل تھے اور اُن کی شخصیت کی تعریف کرتے تھے' حتیٰ اُن کے قیام کو بھی خلوصِ نیت پر مبنی قرار دیتے تھے' لیکن انقلابی طرزِ عمل کے قائل نہ تھے۔ امام جعفر صادقؑ جو اُس وقت امامی شیعوں کی تنظیم و تشکیل کے ذمے دار تھے' انہیں اس تحریک کا نتیجہ شہادت کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا تھا۔

قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ زید نے جب یہ دیکھا کہ خود شیعوں کا ایک گروہ اُن کے ساتھ تعاون نہیں کر رہا' یا اس وجہ سے کہ اُن کے ساتھیوں کی تعداد کم ہے' انہوں نے دوسرے تمام گروہوں سے مدد کی درخواست کی۔ لہٰذا اس بات کے بکثرت شواہد پائے جاتے ہیں کہ تمام فرقوں کے افراد اُن کے قیام میں شریک ہوئے تھے' اور اُن کے ساتھ ہمدردی کے جذبات رکھتے تھے۔

یہ مسئلہ یعنی غیر شیعوں کی قیام میں شرکت' اُن حدود سے نکلنے کے مترادف تھا جو شیعوں نے اپنے لیے بنائی ہوئی تھیں۔ واقعۂ کربلا کے بعد شیعوں کا عام مسلمان معاشرے پر سے اعتماد ختم ہو چکا تھا۔ بالفاظِ دیگر وہ انہیں صحیح اسلامی

راستے سے دور سمجھتے تھے۔ اب زیدان حدود سے باہر نکل چکے تھے اور حتیٰ خوارج میں سے بھی کچھ لوگوں نے اُن کے قیام میں شرکت کی تھی۔ اگر امامی شیعہ بھی "اصحاب سیف" بننا چاہتے' تو اُن کے پاس بھی صرف وہی راستہ تھا جو زید نے اختیار کیا۔ کیونکہ شیعوں کی محدود تعداد کے پاس ایک بڑی تحریک برپا کرنے کی قوت نہ تھی۔

اب یہاں مشکل یہ پیش آرہی تھی کہ اگر کوئی انقلابی تحریک تمام فرقوں کے تعاون سے چلائی جاتی' تو نہ صرف یہ کہ اس کی پائیداری مشکوک ہوتی' بلکہ یہ بھی ضروری ہو جاتا کہ تشیع اپنی اعتقادی اور فقہی حدود سے دوری اختیار کرے۔ علاوہ ازایں' اگر ایسی کوئی تحریک کامیابی سے ہمکنار ہو جاتی' تو کامیابی کے بعد اس کے پاس صرف وہی راستہ ہوتا جس پر بنی عباس چلے تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ بنی عباس نے شیعہ تحریک کو منظم کیا تھا' لیکن جب وہ کامیاب ہوئے' تو ایک سنی معاشرے پر شیعہ حکومت قائم نہیں کر سکے۔ اس وقت صرف یہ بات ممکن تھی کہ ایک انتہائی سخت اقدام کے ذریعے معاشرے کو بالجبر دوسرے راستے پر ڈالا جائے۔

اس مقدمے کو مدنظر رکھتے ہوئے اب سوال یہ ہے کہ شیعیان ائمہ نے جو راستہ اختیار کیا اور جو "اصحاب سیف" کی بجائے "اصحاب الامامت" کے طور پر پہچانے جانے لگے' تو تحریک کربلا کس عنوان اور کس تحلیل کے ساتھ شیعوں میں باقی رہی؟ بالفاظ دیگر' زیدیوں کے لیے تو کربلا ایک مسلح انقلابی تحریک کا عنوان رکھتی تھی' جس کی زید اور ان کے بیٹے یحییٰ کی تحریک کے ذریعے پیروی کی گئی' لیکن شیعیان ائمہ نے کس طرح واقعۂ کربلا کی تحلیل کی؟

ہم نے یہ فرض کیا ہوا ہے کہ اصولی طور پر واقعۂ کربلا کے حوالے سے دو طرح کے نظریات پائے جاتے ہیں' اور دونوں طرح کے نظریات کے درمیان دوسرے نقطہ ہائے نظر بھی موجود ہیں' جو ان دونوں میں سے کسی ایک کی طرف مائل ہیں۔ ایک نظریے کی رو سے واقعۂ کربلا صرف امام حسینؑ کے ساتھ مخصوص ایک ایسا واقعہ ہے جس کے خاص مقاصد ہیں۔ دوسرے نظریے کے مطابق کربلا کی تحریک ایک سیاسی تحریک ہے' جو عملی طور پر حکومت کی سرنگونی یا کسی بھی دوسرے سیاسی مقصد کو سامنے رکھ کر چلائی گئی تھی۔ یہاں ہمارا مقصد اس بات کی نشاندہی کرنا ہے کہ صوفیانہ نظریات کے پنپنے کی زمین کس طرح ہموار ہوئی تھی۔ فی الحال ہمیں اس نکتے کو قبول کرنا پڑے گا کہ ہر زمانے میں شیعوں کو درپیش اندرونی یا بیرونی مسائل اور دشواریوں کی وجہ سے شیعوں کے درمیان ان میں سے کوئی ایک نظریہ غالب رہا ہے۔ یہاں ہم ان تغیرات کے بارے میں تجزیہ کرتے ہوئے تاریخی روش کو ایک طرف رکھ کر زیادہ تر فکری مسائل کا تذکرہ کریں گے۔

جذباتی اور سیاسی نقطۂ نظر

واقعۂ کربلا کا ایک پہلو جذبات اور احساسات کا پہلو ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ کربلا میں خاندانِ رسالتؐ کے سولہ

سے زیادہ افراد کے انتہائی المناک انداز میں قتل کیے جانے اور اس واقعے کی بے رحمانہ کیفیت کی وجہ سے شیعہ معاشرے کے سینے پر ایک گہرا اور بڑا زخم پیدا ہو گیا تھا۔ یہ حادثہ ہر اعتبار سے اہم اور قابلِ توجہ تھا۔ فوراً ہی شیعوں میں اس کا جذباتی اثر ظاہر ہو گیا تھا۔ توابین وہ پہلا گروہ تھا جنہیں اس واقعے کے جذباتی پہلو نے متاثر کیا، اور کیونکہ وہ اس سلسلے میں اپنے آپ کو قصوروار سمجھتے تھے لہٰذا بغیر کسی واضح سیاسی فکر کے انہوں نے اپنے آپ کو شہادت کے لیے پیش کر دیا۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ کوفہ سے شام روانہ ہونے سے پہلے امام حسینؑ کے مزار پر آئے اور وہاں کئی دنوں تک گریہ و زاری میں مصروف رہے۔ یہ اس زمانے کے معاشرے میں ایک نئی بات تھی۔ بہر طور پیغمبرؐ کے گھرانے سے تعلق رکھنے والے سولہ افراد کی ایسے المناک اور دردناک ترین انداز سے شہادت ایک غیر معمولی بات تھی اور اس سے پیدا ہونے والا غم و اندوہ شیعوں کے دل میں ایک دائمی دکھ کی صورت بیٹھ گیا۔

ائمہ علیہم السلام کی احادیث میں عزاداری برپا کرنے اور امام حسین علیہ السلام کی مرقدِ مطہر کی زیارت کرنے کے بارے میں جو کچھ آیا ہے اس پر نگاہ ڈالی جائے، تو یہ بات محسوس کی جا سکتی ہے کہ کربلا کے جذباتی اور احساساتی پہلو نے انتہائی سرعت کے ساتھ شیعہ معاشرے میں جگہ بنالی تھی، حتیٰ اہلِ سنت کے بعض گروہوں کو بھی اپنی جانب جذب کر لیا تھا۔ رفتہ رفتہ سالانہ عزاداری کا سلسلہ شروع ہوا۔ شیعی ادب بھی اس واقعے نیز شیعوں (چاہے وہ زیدی ہوں یا امامی) کو پیش آنے والے دوسرے خونی واقعات سے متاثر ہوا اور مرثیے پر مبنی ادب بن گیا۔

اس بنیاد پر ہمیں شیعہ معاشرے میں اس جذباتی (ادبی) تحریک کے آثار کا جائزہ لینا چاہیے۔ اس کے بعد امام حسینؑ کا نام آنسوؤں کے ساتھ لیا جانے لگا اور عاشورا تاریخ کا اہم ترین غم انگیز حادثہ شمار کیا جانے لگا۔ امام حسینؑ پر رونا اور آپ کے روضے کی زیارت کو جانا بے حد و حساب اجر و ثواب کا باعث ہو گیا۔ جذبات و احساس کا یہ پہلو رفتہ رفتہ بڑھتا گیا اور دوسرے ائمہؑ کے ایامِ وفات بھی ایامِ عزا کے طور پر منائے جانے لگے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بعد میں ''کاشفی'' نے اس مجلسِ عزا کو تمام انبیا تک وسعت دے دی۔

کربلا کے جذباتی اور احساساتی پہلوؤں کا تذکرہ ہمارے پیشِ نظر گفتگو میں بھی مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ ہمارا سوال یہ تھا کہ واقعۂ کربلا کے بارے میں سیاسی نقطۂ نظر اور صوفیانہ نقطۂ نظر کی بنیاد کیا ہے اور ان میں سے کس کو شیعوں کے درمیان زیادہ قوت حاصل رہی ہے؟ یہ بات یقینی ہے کہ جذباتی پہلو کا تذکرہ بالواسطہ طور پر ایک واقعے کی یاد کو زندہ رکھ سکتا ہے اور اس میں موجود سیاسی پہلو کو بھی منتقل کر سکتا ہے۔ لیکن یہ بات پیشِ نظر رہے کہ اس طرح کے تذکرے میں براہِ راست سیاسی نقطۂ نظر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ براہِ راست سیاسی نقطۂ نظر سے ہماری مراد یہ ہے کہ امام حسینؑ کی یہ تحریک ایک ایسی قابلِ تقلید تحریک میں ڈھل جائے جس کی پیروی بعد میں بھی کی جا سکتی ہو۔ اگر جذباتی اور احساساتی پہلو کا تذکرہ کسی تحریک کو اسکی

ماہیت اور آثار کے لحاظ سے محدود کر دے اور اس تذکرے کے دوران صرف کلیات کو اہمیت دینے پر اکتفا کیا جائے (یعنی بطور کلی محض ظلم کے خلاف اقدام کی اہمیت کا ذکر ہو) تو یہ تذکرہ کسی طور سیاسی نقطۂ نظر سے سازگار نہیں ہوتا۔

صلح اور انقلاب کے دو تجربے

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ائمۂ اثنا عشر علیہم السلام سے نسبت رکھنے والی شیعیت میں تمام ائمہؑ کے اعمال ایک ہی طرح کی شرعی حجیت رکھتے ہیں۔ واقعۂ کربلا سے پہلے امام حسنؑ کی صلح کا واقعہ پیش آ چکا تھا۔ یہ واقعہ خاص حالات میں ظالم حکومت کے ساتھ نباہ کرنے کا درس دیتا ہے۔ اگر ہم ان باتوں کو مان لیں جو امام حسنؑ کی صلح اور امام حسینؑ کے قیام کے زمانے میں اسلامی معاشرے کی عمومی صورتحال کے مختلف ہونے کے بارے میں کہی گئی ہیں' تو اس صورت میں کم از کم اتنا ضرور ہوگا کہ ہم دو مختلف طرح کے حالات میں مختلف اور متفاوت لائحۂ عمل اختیار کرنے کے قائل ہو جائیں گے۔ یہ بات بذاتہٖ منطقی اور معقول ہے' لیکن ایک سوال پیش آتا ہے' اور وہ یہ کہ بعد کے زمانوں میں ان دونوں میں سے کونسا طرزِ عمل دوسرے ائمہؑ کی زندگی میں دُہرایا گیا؟

جیسا کہ ہم نے گفتگو کی ابتدا میں اشارہ کیا تھا کہ شیعہ ائمہؑ نے انقلابی جدوجہد کے نقطۂ نظر سے کربلا کے نمونۂ عمل سے امن و آشتی (compromise) پر مبنی راہ کا انتخاب کیا' جبکہ زیدیہ کے امام اسی کو نمونۂ عمل بناتے ہوئے مسلحانہ اور عسکری راستے پر چل پڑے۔ ہم ان دو طرح کی تحریکوں کے نتائج پر بات نہیں کر رہے' بلکہ ہم اس بارے میں گفتگو کر رہے ہیں کہ ائمہؑ نے اپنی تحریک کی بنیاد انقلابی انداز پر رکھنے کی بجائے اپنی تشخیص کردہ ضرورت کے مطابق بظاہر صلح و آشتی پر استوار کی۔ بلاشبہ یہ وہ حقیقت ہے' جس کی تائید تاریخ سے ہوتی ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس کے معنی یہ نہیں کہ ائمہؑ ان حکومتوں کو جائز سمجھتے تھے' حتیٰ اس سے مراد یہ بھی نہیں ہے کہ ائمہؑ معاشرے میں سیاست اور امامت کے اپنے شرعی حق کا انکار کرتے تھے' بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ائمہؑ نے کوئی خاص مسلحانہ یا انقلابی قدم نہیں اٹھایا۔ یہی بات ہمیں مختلف زمانوں سے تعلق رکھنے والے شیعہ علما و فقہا کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔ ایک تاریخی واقعے کا جائزہ لینے کے لیے ہم نئی نئی قائم ہونے والی صفوی حکومت کی حمایت اور تائید کے سلسلے میں شیخ ابراہیم قطیفی کے ساتھ محقق کرکی کے مذاکرات اور گفت و شنید کو سامنے رکھ سکتے ہیں۔ اس موقع پر صفوی حکومت کے حامی محقق کرکی کے استدلال کی بنیاد امام حسنؑ کا طرزِ عمل تھا۔(۱)

ان وضاحتوں کے ذریعے کربلا کے بارے میں ''سیاسی نقطۂ نظر'' اور ''صوفیانہ نقطۂ نظر'' کے حوالے سے ایک اور

۱۔ دین و سیاست در دورۂ صفوی' رسول جعفریان۔ طبع قم۔ ص ۳۵۔۳۶

نکتہ سامنے آ سکتا ہے اور وہ یہ کہ اس طرح دیکھنے کی صورت میں واقعۂ کربلا پر سے سیاسی نقطۂ نظر کا اثر کم اور اس پر صوفیانہ نقطۂ نظر کا اثر زیادہ ہو جائے گا۔

اس مقام پر ہم فوراً اس نکتے پر زور دیں گے کہ ہمارا مقصد ائمہ کے اقدامات کی خصوصیات بیان کرنا نہیں ہے۔ اگر ہم اس بات کی وضاحت کرنا چاہتے تو واقعۂ کربلا کے بعد ائمہ کے اقدامات کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ایک: امام جعفر صادق علیہ السلام کے عہد تک مکتب کی تشریح و توضیح کے لیے ائمہ کے ''علمی اقدامات'' اور دوسرا: امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے دور سے ''وکالت'' کے نظام کی تاسیس۔ اس سے پہلے بنی عباس کے یہاں ''داعی'' بھیجنے کا نظام موجود تھا۔ ان کے ساتھ ساتھ امامی شیعوں اور ان کے بعد اسماعیلیوں نے بھی اس کا تجربہ کیا۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ ان دونوں تحریکوں نے زیدیوں ہی کی مانند کسی طرح کے ''علمی اقدامات'' کا دور نہیں گزارا تھا۔

سیاسی عمل یا علمی اور فکری کام کا تجربہ

یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ ائمہ کی وہ سیاسی روش جس کے تحت انہوں نے علمی اور فکری کاموں کو بنیادی مقام دیا اور سیاسی معاملات میں سرگرمی کے ساتھ حصہ نہ لیا (اکثر اس دن کی امید پر جب وہ ایک شیعہ معاشرہ قائم کر پائیں گے اور اس دور میں شیعوں کی اُس معاشرے میں حفاظت اور اُن کی رہنمائی کیا کرتے تھے) بعد میں شیعہ امامیہ پر یہ اثر مرتب کیا کہ وہ اسلامی معاشرے میں جاری سیاست کو کوئی اہمیت نہیں دیا کرتے تھے۔ یعنی امامی شیعہ امامِ غائب اور بالفاظ دیگر امام قائم کے ظہور کے انتظار میں رہتے تھے۔ اس صورت میں انہیں سیاسی معاملات میں مداخلت کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ رفتہ رفتہ تقیے کی بنیاد پر بلکہ اس روش کی بنیاد پر جسے خود شیعوں نے ائمہ کے زمانے ہی سے نظامِ خلافت میں اپنے نفوذ کے لیے اختیار کر رکھا تھا اور روز بروز اس کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا' انہوں نے اپنے آپ کو حکمرانوں سے نزدیک کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ سیاسی طور پر اہم مقام رکھنے کے باوجود شیعوں نے رفتہ رفتہ صوفیانہ رنگ اختیار کر لیا' یا کم از کم ان کی فقہ سیاست سے خالی ہو گئی۔

ان حالات میں امام حسینؑ کی شہادت کی کیا تحلیل کی جاتی؟

کیا صوفیانہ تحلیل کی تائید و تقویت کے سوا کوئی اور راستہ ممکن تھا؟

حمید عنایت لکھتا ہے: (اور اس کی اس تحریر کو تحفظات کے ساتھ قبول کرنا چاہیے) شیعوں میں مصالحت طلب تقیے کے بڑھتے ہوئے رجحان' اور حاکم نظام کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے کی روش کی وجہ سے' امام حسینؑ کی شہادت کا مسئلہ اس عنوان سے کہ انہوں نے اپنے آپ کو امت پر فدا کر دیا' شیعوں میں مزاحمتی ہدف کے دب جانے کا باعث بنا۔ اسکے ساتھ

ساتھ امام حسینؑ اور ان کے مجاہدانہ کردار کی یاد منانے کا واحد مقصد رہنمائی اور سیاسی شعور کی بیداری کی بجائے محض رونا اور رلانا رہ گیا۔

پہلے مرحلے میں یہ نکتہ واقعۂ کربلا کے تذکرے پر مشتمل کتب اور مقاتل کے ناموں ہی سے ظاہر ہوتا ہے' مثلاً: مفتاح البکاء' طوفان البکاء' محیط البکاء (محیط یعنی سمندر)' مثیر الاحزان (غموں کو ابھارنے والا)' لھوف (رنج وغم)۔ یا بہت کم ایسی روایات کا ملنا جن سے انتقام لینے یا مسلح بدلہ لینے کی بو آتی ہو۔ واقعات کربلا کی غم انگیز اور دردناک تصویر کشی کا رجحان ہی غالب تھا۔ (۱)

یاد رہے کہ تاریخ شیعہ میں ہر دور میں ایسے افراد موجود رہے ہیں جو سیاسی نقطۂ نظر پر زور دیا کرتے تھے' لیکن جو چیز اہمیت کی حامل ہے وہ یہ ہے کہ اکثریت کی سوچ کیا تھی۔

امامت کا مفہوم

وہ تیسرا نکتہ جو اس بحث میں ہماری مدد کرتا ہے' وہ یہ ہے کہ بنیادی طور پر شیعہ امامی نظریے کی رو سے سیاست اور معنویت کے شعبوں میں ''امام'' کو کیا حیثیت اور مقام حاصل ہے؟

ہم جانتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام اور ان کے فرزند امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے سوا کسی امامؑ کے پاس کسی قسم کا سیاسی عہدہ نہیں تھا۔ اس استثنا میں امام علی رضا علیہ السلام کو بھی شامل کرنا چاہیے' اس فرق کے ساتھ کہ امام رضا علیہ السلام نے کھل کر مامون کی خواہش کو مسترد کر دیا تھا' اور اسکے مجبور کر دینے ہی پر ولی عہدی قبول کی تھی۔ علاوہ ازیں آپ نے یہ شرط بھی لگا دی تھی کہ آپ کسی سیاسی اور غیر سیاسی معاملے میں کسی قسم کا عمل دخل نہیں رکھیں گے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ائمہؑ کے سیاسی قیادت سے کنارہ کش ہو جانے نے' شیعی نظریۂ امامت کے مفہوم پر کیا اثرات مرتب کیے؟ قدرتی طور پر اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ امامت کے مفہوم کا روحانی اور معنوی پہلو بڑھ گیا۔ ''ولایت'' کے مفہوم میں رفتہ رفتہ تجرد کی نشوونما شاید تاریخ میں مفہوم امامت کے اسی غیر سیاسی ہونے کا نتیجہ ہو۔ ولایت دراصل ایک قسم کی سیاسی سرپرستی تھی (۲) جس کا تعین علم وعمل کی صفات میں برتری کی بنیاد پر ہوتا تھا' لیکن مرحلۂ عمل میں اسکے سیاسی ضعف کی وجہ سے' اس میں صوفیانہ رنگ بڑھتا چلا گیا اور اس اصطلاح کو سیاسی میدان کی بجائے ماورائے طبیعت معاملات میں استعمال کیا جانے لگا۔

۱۔ اندیشۂ سیاسی در اسلام معاصر' حمید عنایت۔ ترجمہ بہاء الدین خرمشاہی۔ طبع تہران۔ ص ۳۱۴

۲۔ اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ ۔ (سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۶)

صحیح معنی میں بھرپور سیاست میں حصہ نہ لینے کی وجہ سے شیعہ حدیث بھی ایک دوسری سمت مڑ گئی۔ امام کی خصوصیات کے بارے میں جو ابحاث کی گئیں' نیز امام کے دائرۂ اقتدار کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ماورائے سیاست پہلوؤں کی جانب توجہ سیاسی پہلو یعنی "احکام السلطانیہ" کی جانب توجہ سے کہیں زیادہ تھی۔ اس حوالے سے شاید اہم ترین دلیل یہ ہو کہ شیعوں میں امامت کی بحث علم کلام کے حوالے کر دی گئی' بالفاظ دیگر اصول عقائد کے ضمن میں آ گئی' جبکہ اگر اس میں عملی پہلو قوی ہوتے تو فقہ کے سپرد کی جاتی۔ ان حالات میں یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ کربلا جیسا واقعہ' جس میں واضح طور پر سیاسی اور عسکری رنگ پایا جاتا ہے' وہ کس طرح امامت کے بارے میں تصوف کی طرف مائل سوچ میں تحلیل (disolve) ہو کے رہ گیا۔

غالیوں کا اثر

امامت کے مفہوم نیز کربلا کے خونی واقعے کو غیر سیاسی کرنے میں غالیوں کا بھی حصہ ہے۔ انہوں نے ائمہؑ کے بارے میں خدائی تصور دے کر مفہوم امامت کو سیاست اور معروضی حقائق سے دور کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ غالیوں اور اُن کے بارے میں جو کچھ تحریر کیا گیا ہے اس پر نگاہ ڈالی جائے' تو مفہوم امامت کو غیر سیاسی کرنے کے سلسلے میں اُن کے اصرار اور شدومد کی نشاندہی ہوتی ہے۔

اعتدال پسند شیعوں اور غالی شیعوں کے درمیان تنازع اصولی طور پر ان کے امامت کے معاملے میں الوہیت کی طرف مائل ہونے کی بنیاد پر تھا۔ اس مثال کی جانب توجہ فرمایئے۔ وہ لوگ اس آیت قرآنی: وَ هُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ کی تشریح میں کہا کرتے تھے: قالوا هو الامام. (زمین پر اِلٰہ سے مراد امام ہے)۔ ان کی یہی بات تھی' جس کی بنا پر امام جعفر صادقؑ نے انہیں مجوس' یہود' نصاریٰ اور مشرکین سے بدتر کہا۔(۱)

اب سوال یہ ہے کہ کیا غلو کی بحث موضوع امامت کے صرف الوہیت کی جانب رجحان تک محدود ہے' یا امامت کے حوالے سے دوسرے رجحانات بھی اس میں شامل ہیں؟ یہ جو علم حدیث کے بعض بڑے علما اس بات پر زور دیتے ہیں کہ فلاں فلاں غالی راویوں کو موثق نہ سمجھا جائے' یا وہ بصائر جیسی کتابوں کو معتبر نہیں سمجھتے' یہ اس بات کی دلیل ہے کہ غلو کا معاملہ صرف الوہیت کی جانب رجحان تک محدود نہیں تھا۔ غالیوں کی نظر میں ایک امام' رسول اللہؐ سے کسی طرح بھی کم نہیں ہوتا۔ یاد رہے کہ کچھ غالی ایسے بھی تھے جن کا دعویٰ تھا کہ انتخاب رسولؐ میں جبرئیل سے (معاذ اللہ) خطا ہوئی ہے' اور اسے علی ابن ابیطالب کو منتخب کرنا چاہیے تھا۔ ائمہؑ کو نبوت' بلکہ اس سے بھی بالاتر خصوصیات عطا کر دینے کا مطلب یہ تھا کہ اگر امامؑ

۱۔ اختیار معرفۃ الرجال' ابو جعفر طوسی۔ تحقیق مصطفوی۔ طبع مشہد۔ ص ۳۰۰

اپنی امامت کی عملی سیاست میں زیادہ مشہود نہیں، تب بھی عالم بالا میں یہ امامت ہر چیز سے زیادہ مستحکم اور اس کا دامن بہت زیادہ وسیع ہوگا۔

ہماری گفتگو ان امور کی نفی یا ان کے اثبات کے بارے میں نہیں ہے، بلکہ اس مسئلے پر ہے کہ اصولی طور پر جو باتیں ''بصائر'' یا اسی جیسی دوسری کتابوں میں بیان ہوئی ہیں، وہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ سیاسی دائرے میں ولایت کی طرف توجہ سے کہیں زیادہ توجہ سیاست سے خالی ولایت کی جانب تھی۔

اب وہ مقام آ پہنچا ہے جہاں ہم دیکھیں گے کہ اصولی طور پر غالی حضرات امام حسین علیہ السلام کے بارے میں کیا تصور رکھتے تھے، اور اس تحریک کے سیاسی پہلو کا (جو بظاہر شکست نظر آتی ہے) کس طرح تجزیہ و تحلیل کیا کرتے تھے؟

ایک عجیب بات جو اس حوالے سے واقع ہوئی، البتہ وہ غالیوں کے تصور سے مکمل طور پر مطابقت رکھتی ہے، وہ یہ ہے کہ اس واقعے میں امام حسینؑ کو جناب عیسیٰ بن مریمؑ جیسی حیثیت حاصل ہوگئی۔ ان لوگوں کے ذہن میں یہ سوال ابھرا کہ ''ولیِ خدا'' کو ہونے والی اس شکست سے کیسے نکالا جائے؟ بہتر یہ ہے کہ اُن کی اس دن کی حالت کو حضرت عیسیٰؑ کی اس دن کی حالت کے مشابہ قرار دیا جائے جس دن انہیں صلیب پر لٹکایا گیا تھا۔ یعنی یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی بجائے کسی اور شخص کو صلیب پر لٹکا دیا تھا۔ اسی طرح کربلا میں بھی کوفیوں نے امام حسینؑ کی جگہ حنظلہ بن اسعد شامی کو قتل کر دیا تھا!

بہتر ہے کہ اس بارے میں موجود روایت کو پیش کر دیا جائے: علامہ مجلسی نے اس حدیث کا ترجمہ اس طرح سے لکھا ہے:

> ''ابن بابویہ نے معتبر سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ ابوصلت ہروی نے امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ کوفہ میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو دعویٰ کرتے ہیں کہ حسین ابن علیؑ قتل نہیں ہوئے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے حنظلہ بن اسعد شامی کو اُن کی شبیہ بنا دیا اور امامؑ کو آسمان پر اٹھا لیا، اسی طرح جیسے حضرت عیسیٰؑ کو آسمان پر اٹھا لیا تھا اور وہ اس آیت کو حجت قرار دیتے ہیں: وَ لَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا. (سورۂ نساء۴۔ آیت ۱۴۱)
>
> امامؑ نے فرمایا: وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اُن پر خدا کا غضب اور اُس کی لعنت ہو۔ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُس خبر کو جھٹلانے کی بنا پر کافر ہو گئے ہیں جس میں آپ نے خبر دی ہے کہ حسینؑ شہید ہوں گے۔ خدا کی قسم حسینؑ قتل ہو گئے اور جو حسینؑ سے بہتر تھے یعنی امیر المومنینؑ اور امام حسنؑ وہ بھی قتل ہوئے۔ اور ہم اہلِ بیتِ رسالتؐ میں سے ہر ایک قتل ہوگا، اور خود مجھے مکر و حیلے کے ساتھ زہر دے کر شہید کیا جائے گا۔ مجھ تک یہ خبر رسول اللہؐ سے پہنچی ہے، اور انہیں رب العالمین کی طرف سے جبرئیل نے یہ اطلاع دی ہے۔ اور اس آیت سے اللہ تعالیٰ کی مراد یہ ہے کہ کافر کو مومن پر کوئی حجت حاصل نہیں، آخر کس طرح اس

سے وہ معنی مراد لیے جاسکتے ہیں؟ حالانکہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یہ خبر دی ہے کہ کافروں نے ناحق متعدد انبیا کو قتل کیا ہے' لیکن ان کو قتل کرنے کے باوجود انبیا کی حجت اُن پر غالب تھی اور اُن کی حقانیت ظاہر تھی۔''(۱)

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ: صاحب الامرؑ کی تحریر میں ایک فرمان آیا کہ جن لوگوں کا دعویٰ ہے کہ امام حسینؑ قتل نہیں ہوئے' ان کا یہ قول کفر ہے اور رسولؐ و ائمہؑ کی تکذیب اور ضلالت و گمراہی ہے۔(۲)

ایک اور حدیث میں بھی امام حسینؑ کو حضرت عیسیٰ بن مریمؑ سے تشبیہ دینے کی بابت آیا ہے اور امام جعفر صادقؑ کے اس قول کا بھی اضافہ کیا گیا ہے کہ: خدا غالیوں پر لعنت کرے جو اہلِ بیتؑ کے بارے میں غلو کرتے ہیں اور حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔(۳)

غالی شیعوں کی کتابوں میں بھی امام حسینؑ کی شہادت کے بارے میں اس قسم کی توجیہات پائی جاتی ہیں۔ ''**الهفت الشريف في فضائل مولانا جعفر الصادق**'' نامی کتاب میں ایک بحث ''**في معرفة قتل الحسين على الباطن في زمن بني امية**'' کے عنوان سے کی گئی ہے جو اس بارے میں غالیوں کی بے سروپا باتوں پر مشتمل ہے۔(۴)

جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کرچکے ہیں کہ بنیادی طور پر ائمہؑ کے بارے میں غلو اس بات کا سبب بنا کہ شیعوں میں امامت کے مفہوم کا سیاسی پہلو کمزور ہوگیا۔ اس حوالے سے بالخصوص امام حسینؑ جن کا سیاسی اقدام واضح طور پر لوگوں کے سامنے تھا' ان کے بارے میں غالیوں کا مؤقف مفہومِ امامت کو لاہوتی فضا میں محدود کرنے کے سلسلے میں کافی مؤثر تھا۔ اگر ہم اس بات سے واقف ہوں کہ عیسائیوں میں حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر چڑھانے کا معاملہ سیاسی اعتبار سے نہیں بلکہ اپنے لاہوتی رُخ سے قابلِ توجہ تھا' تو ہم امام حسینؑ کے بارے میں اس تشبیہ کے اثرات کی اہمیت کو سمجھ سکتے ہیں۔ استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ نے حضرت عیسیٰؑ اور امام حسینؑ کے درمیان موازنے کی بحث کے ضمن میں اس نکتے کی جانب توجہ دلائی ہے کہ کچھ لوگوں نے غلط طور پر عیسائیوں کے حضرت عیسیٰؑ کے قربان ہوجانے کے اعتقاد کو امام حسینؑ کے بارے میں بھی پیش کیا ہے۔(۵) یعنی جس طرح حضرت عیسیٰؑ اپنے پیروکاروں کے گناہ بخشوانے کے لیے صلیب پر چڑھنے پر رضامند ہوگئے' اسی

۱۔ عیون اخبار الرضا۔ ج ۲۔ ص ۲۰۳' بحار الانوار۔ ج ۴۴۔ ص ۲۷۱۔ ح ۴

۲۔ بحار الانوار۔ ج ۴۴۔ ص ۲۷۱۔ ح ۳

۳۔ علل الشرائع۔ ص ۲۲۵۔ ۲۲۷' بحار الانوار۔ ج ۴۴۔ ص ۲۶۹۔ ۲۷۱

۴۔ الہفت الشریف (تحقیق مصطفیٰ غالب۔ طبع بیروت الاندلس) ص ۹۶

۵۔ حماسۂ حسینی مرتضیٰ مطہری۔ ج ۳۔ ص ۲۲۲' ۲۲۷' ۲۲۳' ۲۲۶

طرح امام حسینؑ نے بھی شہادت کو قبول کیا تھا۔

مقصدِ شہادت اور سیاست

اس بحث کا آغاز واقعۂ کربلا کے بارے میں ایک اہم سوال کا جواب دے کر کیا جاسکتا ہے' اور وہ سوال یہ ہے کہ امام حسینؑ کی شہادت کا مقصد اور فلسفہ کیا تھا؟ یہ ایک سیاسی شہادت تھی یا معنوی شہادت؟ بالفاظ دیگر کربلا ایک ظاہری شکست تھی' جس کا نتیجہ ایک خوں رنگ شہادت تھا۔ اگر اس واقعے میں سیاسی کامیابی حاصل ہوئی ہوتی' تو اس سوال کی گنجائش نہیں تھی' لیکن اب تو امام حسینؑ کا لشکر بنی امیہ کی فوج کے سامنے شکست کھا چکا ہے' اور آپ کے خاندان کی عورتیں اور بچے اسیر ہو چکے اور ایک شہر سے دوسرے شہر پھرائے جارہے ہیں' اس صورتحال کو دیکھا جائے تو اس اقدام کا کیا مقصد ہوسکتا ہے؟ دوسرے الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ولی کے لیے یہ واقعہ ظہور میں لاکر اس سے کیا مقصد اور کیا ہدف پیشِ نظر رکھا ہے؟

اس کا ایک جواب تو یہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امام حسینؑ اور اُن کے اصحاب کو ان مصیبتوں میں اس لیے مبتلا کیا تا کہ جنت میں اُن کو زیادہ بڑا مقام حاصل ہو۔ یہ جواب سیاسی میدان سے دور ہونے کا راستہ فراہم کرتا ہے' اگرچہ ذاتی طور پر ممکن ہے کہ کربلا کے نتائج کا جائزہ دو الگ الگ دائروں میں کیا جاسکے۔ اِنّ اللّٰہ شاء ان یراک قتیلاً کی عبارت ممکن ہے اس جانب کسی کی رہنمائی کرے کہ امام حسینؑ اور اُن کے ساتھی اپنے لیے شہید ہوئے ہیں۔ یعنی کیونکہ وہ عظیم لوگ تھے اور خدا انہیں پسند کرتا تھا' اس لیے اُس نے انہیں اپنی طرف بلا لیا۔

ھر کہ در این بزم مقرب تر است	جام بلا بیشترش می دھند
وآنکہ ز دلبر نظر خاص یافت	داغ عنابر جگرش می نھند

''یعنی اس بارگاہ میں جو بھی زیادہ مقرب ہے اس پر زیادہ بلائیں پڑیں گی۔ اور جسے دلبر کی زیادہ توجہ حاصل ہوئی اس کے جگر پر تکلیف کا داغ لگایا جائے گا۔''

ہم نے اشارہ کیا ہے کہ ممکن ہے یہ مسئلہ درحقیقت سیاسی مقاصد سے متصادم نہ ہو' لیکن بظاہر اسی نظریے کی ترویج کرتا ہے کہ کربلا سیاسی نہیں' بلکہ ایک معنوی اور شخصی واقعہ تھا۔ اس جواب سے ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے' اور وہ یہ کہ امام کی حیثیت سے حسین ابن علیؑ کے اس اقدام نے اپنے پیروکاروں کو کیا فائدہ پہنچایا؟ یہی وہ مقام ہے جہاں اس سوال کے جواب کے منطقی نتیجے کے طور پر نہیں' بلکہ اس سے پیدا ہونے والی فضا سے ممکن ہے یہ تصور وجود میں آئے کہ امام حسینؑ نے اس لیے جامِ شہادت نوش کیا تا کہ دوسرے لوگ آپ کی عزاداری منا کر آپ کے وجود سے اپنی آخرت کے لیے فائدہ

اٹھائیں۔ بارہا اس بات کی جانب اشارہ کیا جاچکا ہے کہ ان نتیجوں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مقدمات یا حتیٰ ان کے بعض نتائج (مثلاً حسین ابن علیؑ پر رونے کا ثواب) درست نہیں ہیں؛ بلکہ صرف اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان جوابات اور اس فضا کے بننے نے واقعۂ کربلا کے سیاسی نہیں بلکہ صوفیانہ نقطۂ نظر کے رواج کی راہ ہموار کی ہے۔ مرحوم علامہ مجلسیؒ نے کربلا کے واقعے سے کسی حد تک سیاسی نتیجہ اخذ کیا ہے، جس کی جانب ہم مناسب مقام پر اشارہ کریں گے؛ اسکے باوجود انہوں نے اس ذاتی اور شخصی نقطۂ نظر کے حوالے سے امام حسینؑ کے اپنے ماننے والوں کو فائدہ پہنچانے کی بابت یوں تحریر کیا ہے کہ:

''اور یہ بات جان لینی چاہیے کہ یہ دنیاوی ذلتیں اُن کے لیے مزید عزت کا باعث ہیں؛ اور خدا کا دوست ان باتوں سے ذلیل نہیں ہوا کرتا۔ جو لوگ انہیں ذلیل کرنا چاہتے تھے آج زمین پر اُن کا نام لعن ونفرین کے بغیر نہیں لیا جاتا؛ ان کی نسلیں تک ختم ہو چکی ہیں اور ان کی قبروں کے نشان تک مٹ چکے ہیں۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان بزرگ ہستیوں کے ناموں کو بلند کیا اور ان کے علوم اور کمالات کا دنیا بھر میں چرچا ہے اور دوست و دشمن، نماز میں اور نماز کے علاوہ بھی ان پر درود وسلام بھیجتے ہیں اور ان کے توسط سے درگاہ الٰہی میں اپنی حاجت طلب کرتے ہیں؛ منبروں اور میناروں اور درہم و دینار کو ان کے ناموں سے مزین کرتے ہیں؛ اور زمین کے بادشاہ اور سلاطینِ مملکت شوق ورغبت اور خلوص کے ساتھ ان کے دروازے کی چوکھٹ پر اپنی پیشانی رکھتے ہیں۔

جبکہ ان کی زیارت کی برکت سے ہر روز ہزارہا لوگ بخشے جاتے ہیں؛ ان کے دشمن پر لعنت کے طفیل ہزارہا لوگ بہشت کے مستحق ہو جاتے ہیں؛ ان پر گریہ وزاری اور ان کے مصائب پر آنسو بہا کر ہزارہا لوگ اپنے سیاہ نامۂ اعمال سے گناہوں کی غلاظت دھو ڈالتے ہیں؛ ہزارہا لوگ آپ کی احادیث اور تعلیمات کی نشر واشاعت کی برکت سے سعادتِ ابدی پر فائز ہوتے ہیں؛ ہزارہا لوگ آپ کی احادیث کی برکت سے معرفت ویقین کی منزل پر پہنچتے ہیں؛ ہزارہا لوگ آپ کی تعلیمات کی پیروی اور آپ کی سنت پر عمل کے ذریعے مکارمِ اخلاق اور محاسنِ آداب سے مزین ہوتے ہیں؛ ہزارہا ایسے لوگ جو ظاہری یا باطنی طور پر نابینا ہوتے ہیں آپ کے مقدس روضوں پر شفایاب ہوتے ہیں اور ہزاروں قسم کی روحانی اور جسمانی بلاؤں میں مبتلا لوگ آپ کے عظیم الشان دارالشفاء سے صحتیاب ہوتے ہیں۔ (۱)

۱۔ مجموعۂ رسائلِ اعتقادی علامہ محمد باقر مجلسیؒ بہ کوشش سید مہدی رجائی۔ طبع مشہد بنیاد پژوہشہای اسلامی ۱۳۶۸ھ ش۔ ص ۱۹۸۔۱۹۹

صوفیانہ نقطۂ نظر

جو کچھ صوفیہ نے ولایت کے مفہوم اور اس کے مصادیق کے بارے میں کہا ہے' اس پر نگاہ دوڑانے سے کام زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔ ہمیں اس بات سے غفلت نہیں کرنی چاہیے کہ باوجود یہ کہ بعض صوفی سیاسی رجحان رکھتے تھے اور رکھتے ہیں' پھر بھی صوفی فکر کی طبیعت' معنویت کی جانب مائل اور سیاست سے پرہیز کی طبیعت ہے۔ تصوف میں قیادت کا اظہار ''ولایت'' کی صورت میں ہوتا ہے اور ان کے یہاں ''اولیا'' کی اصطلاح صوفیانہ فکر کے تشخص کا حصہ ہے۔ اس ولایت کا زمین سے زیادہ آسمان سے رابطہ ہوتا ہے۔ اگر اس کا زمین پر رہنے والوں سے کوئی رابطہ ہے بھی' تو وہ انہیں زمین سے مکمل طور پر کاٹ کر آسمان سے ملانے کے لیے ہے۔ جب چھٹی صدی ہجری سے تصوف تشیع میں بھی داخل ہو گئی' تو ائمہ شیعہ بھی اولیا اور اقطاب میں شمار کیے جانے لگے۔ اس سے پہلے بعض اماموں کے حالات ابونعیم اصفہانی کی ''حلیۃ الاولیاء'' میں بیان ہوئے تھے' لیکن اس چیز نے باضابطہ حیثیت اس وقت اختیار کر لی' جب صوفیوں کی کتابوں میں بھی بارہ اماموں کے حالات زندگی درج ہونے لگے۔ اس مرحلے میں دوسرے صوفی اقطاب کے ساتھ ساتھ بارہ اماموں کی ولایت بھی قبول کی جاتی تھی۔ البتہ خاتم ولایت کی بحث باقی رہ گئی تھی کہ محی الدین عربی حضرت عیسیٰ بن مریم کو خاتم کے طور پر پیش کرتا ہے' ابن عربی کی اس بات پر شیعہ صوفی سید حیدر آملی (۱) سخت ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں' اور کہتے ہیں کہ خاتم اولیا وہ نہیں بلکہ علی ابن ابیطالبؑ ہیں۔

رفتہ رفتہ تصوف کا عالم اسلام' بالخصوص اس کے مشرقی حصے پر تسلط ہو گیا' یہاں تک کہ ان علاقوں کے سنی اور شیعہ دونوں ہی اس کے زیر اثر آ گئے۔ سنی صوفیہ ائمہؑ سے محبت کرنے لگے اور اپنی کتابوں میں ان کا ذکر امامؑ کے عنوان سے کرنے لگے۔ نقشبندیوں کے اہم رہنماؤں میں سے ایک' خواجہ محمد پارسا نے اپنی کتاب ''فصل الخطاب'' میں بارہ اماموں کے حالات زندگی لکھے۔ حافظ حسین کربلائی نے بھی ''روضات الجنان و جنات الجنان'' میں ایسا ہی کیا۔ فضل اللہ بن روزبہان خنجی صوفی نے بھی کتاب ''وسیلۃ الخادم الی المخدوم در شرح صلوات چہاردہ معصوم'' لکھی۔ موخر الذکر باضابطہ طور پر ائمہؑ کی ولایت کو تسلیم کرتا ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ یہ خلافت سے جدا ہو جائے۔ (۲) یہی وہ مقام ہے جب اس (صوفی) طرزِ تفکر میں ولایت رکھنے کے باوجود ائمہؑ غیر سیاسی شناخت کے حامل ہو جاتے ہیں۔ ایسے ماحول میں ملا حسین

۱۔ جامع الاسرار و منبع الانوار' سید حیدر آملی' تصحیح پروفیسر ہنری کربن' یحییٰ عثمان۔ طبع تہران' انتشارات علمی و فرہنگی ۱۳۶۸ھ ش۔ ص ۳۹۶ اور اس کے بعد

۲۔ دیکھئے: مقدمہ کتاب ''وسیلۃ الخادم الی المخدوم''' فضل اللہ بن روزبہان خنجی' بہ کوشش رسول جعفریان۔ طبع قم' کتابخانہ آیت اللہ مرعشی ۱۳۷۱ھ ش۔ ص ۳۹ اور اس کے بعد

کاشفی سبزواری جیسا مشہور صوفی "روضۃ الشہداء" لکھتا ہے۔ یہ کتاب صفویوں اور ان کے بعد کے ادوار میں مجالس عزاداری کی بنیاد بن جاتی ہے۔(۱)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ: کیا اس نے واقعۂ کربلا اور بنیادی طور پر امام حسینؑ کی شخصیت کی صوفیانہ تعبیر کی ترویج کے لیے اس کتاب میں اپنے صوفیانہ خیالات کا ذکر کیا ہے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب نفی میں نہیں دیا جاسکتا۔ کیا کوئی شخص اس قسم کی کتاب لکھتے ہوئے اپنے صوفیانہ رجحانات کو ایک طرف رکھ سکتا ہے؟ ہمیں یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ اس کے بعد سے ایک سنی صوفی کی کتاب واقعۂ کربلا کے تجزیے و تحلیل کی بنیاد بن جاتی ہے' اور یہ چیز واقعۂ کربلا کے ایک سیاسی سے غیر سیاسی اور صوفیانہ اثرات کے حامل معنوی اور جذباتی واقعے میں تبدیل ہونے میں بہت زیادہ موثر واقع ہوتی ہے۔ اس بات سے بھی غافل نہیں رہنا چاہیے کہ صفوی حکمران بھی تصوف ہی کی پیداوار تھے اور سالہا سال تک ان کی حکومت تصوف زدہ رہی تھی' معاشرے کا ماحول بھی ایسا ہی تھا۔ یہ ماحول فقہا کے علمی جہاد کے باوجود مدتوں برقرار رہا اور کبھی بھی مکمل طور پر ختم نہ ہوا۔

ہدف اور پہلے سے آگاہ ہونا

ایک اور مسئلہ جس کا خاص اثر عاشورا کی سیاسی یا صوفیانہ تعبیر پر ہونے والی بحث پر پڑتا ہے' اور ایک طرح سے امام حسینؑ کی شہادت کے مقصد سے بھی مربوط ہو جاتا ہے' وہ امام حسینؑ کا پہلے ہی سے واقعۂ کربلا سے آگاہ ہونا ہے۔ ایک ایسا شخص جسے ایسے کسی حادثے کے واقع ہونے کی پہلے سے خبر نہ ہو' قدرتی بات ہے کہ کم از کم ظاہری طور پر اور اپنے نقطۂ نگاہ سے وہ صرف دشمن پر غلبے کے لیے کوشاں ہوتا ہے۔ یہ غلبہ محض میدانِ جنگ میں کامیابی تک محدود نہیں رہتا' بلکہ آخرکار حکومت کی تشکیل تک پہنچتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر امام حسینؑ کو پہلے سے اس واقعے کا علم تھا' تو پھر سیاسی کامیابی' دشمن پر غلبے اور حکومت کی تشکیل کے معاملات پر اعتراض کیا جاسکتا ہے۔ بالفاظِ دیگر سوال یہ اٹھتا ہے کہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک انسان اپنی شہادت سے واقف ہو' اسکے باوجود ایک معین سیاسی ہدف حاصل کرنا چاہتا ہو؟

الف: ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ پہلے سے باخبر ہونے کا سرے سے انکار کر دیا جائے۔ اس صورت میں زیرِ بحث مسئلے کی تحلیل زیادہ دشوار نہیں رہے گی۔ مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ متکلمین کے درمیان اس عقیدے کے بہت زیادہ حمایتی نہیں پائے جاتے۔ اسکے برعکس ہماری کتب میں تاریخ اور حدیث کی بکثرت روایتیں اسکے برخلاف

۱۔ اس مجموعے میں روضۃ الشہداء نامی کتاب کی شرح میں الگ سے ایک مقالہ موجود ہے۔

موجود ہیں۔

ب: ایک اور امکانی جواب جو بعض لوگوں کی طرف سے دیا گیا ہے' وہ یہ ہے کہ امام حسینؑ اپنی شہادت سے پہلے سے آگاہ تو تھے' لیکن جب تک آپ کربلا کی سرزمین پر نہیں پہنچ گئے' اس وقت تک آپ یہ نہیں جانتے تھے کہ آپ کی شہادت اسی سفر میں واقع ہو گی۔ بالفاظ دیگر آپ کلی طور پر تو اپنی شہادت سے واقف تھے' لیکن آپ اس شہادت کی جزئیات' وقت اور مقام سے لاعلم تھے۔ اس مفروضے کے تحت یہ بات پیش نظر رکھی جا سکتی ہے کہ کربلا کی سرزمین پر پہنچنے تک امام کے سامنے ایک واضح سیاسی ہدف موجود تھا' اور وقوع پذیر ہوا چاہنے والے حادثے پر اُن کلی اخبار و روایات کو منطبق کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ ہدف حصولِ حکومت ہو سکتا ہے۔

ج: ایک اور جواب یہ ہے کہ امام کے ہدف کی ایسی تعریف بیان کی جائے' جو اس قسم کی قبل از وقت آگہی سے ہم آہنگ ہو۔ اگر ہدف حکومت پر تسلط ہو' تو کم از کم بظاہر یوں محسوس ہو گا کہ فیصلے میں ایک ٹکراؤ اور تضاد پایا جاتا ہے۔ لیکن اگر ہدف ایک انقلابی تحریک کی داغ بیل ڈالنے کے لیے قربانی پیش کرنا ہو' تو اس صورت میں شہادت خود ایک سیاسی ہدف بن جائے گی۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ امامؑ اپنی شہادت سے اچھی طرح باخبر تھے اور فقط دین کی نجات کے لیے آپ نے یہ قدم اٹھایا تھا۔ دنیا کے انقلابی افراد کے درمیان یہ طرزِ عمل رائج اور معمول ہے۔ لیکن یہاں جو مشکل پیش آتی ہے' وہ یہ ہے کہ اس سیاسی نقطۂ نظر کو کم از کم نقطۂ نظر سمجھنا چاہیے۔ بالفاظ دیگر' امام کا قیام صرف موجودہ حالات کے انکار کا پہلو رکھتا ہے' لیکن کیا اس سے کسی نئی صورتحال کو جنم میں لانا بھی ثابت ہوتا ہے؟ دوسرے الفاظ میں امامؑ کے ہدف کی اس تعریف سے یہ بات واضح نہیں ہوتی (بلکہ ثابت نہیں ہوتی) کہ امامؑ حکومت پر تسلط کے لیے کوشاں تھے' بلکہ صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ امامؑ نے معاشرے کے بحرانی حالات کی نشاندہی اور حکام کا فساد آشکارا کرنے کے لیے یہ شہادت طلبانہ قدم اٹھایا۔ اس کے باوجود اس ہدف کو ایک قسم کی خودکشی نہیں سمجھنا چاہیے' جیسا کہ بعض قدیم سنی متکلمین نے شیعوں پر اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے اور کچھ نئے لکھنے والوں نے بھی اس کا اظہار کیا ہے۔ جیسے کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں' خاص حالات میں اس قسم کے اقدام کی عقل اور عقلا تائید کرتے ہیں۔ اس نظریے کے بکثرت حامی پائے جاتے ہیں۔

د: یہ جواب کہ امام کا مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تھا' ہماری اس بات میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا جسے ہم نے مذکورہ بالا جواب میں کہا ہے۔ ماسوا یہ کہ اگر خودکشی کی مشکل کا جواب دینا چاہیں' تو ہمارے پاس اس کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا کہ جزئی صورت میں قبل از وقت آگہی کا انکار کیا جائے۔ اگر اس مشکل سے کوئی تعلق نہ رکھا جائے اور مقصد صرف امام حسینؑ کے لیے ایک معین سیاسی ہدف بیان کرنا ہو' تب بھی یہ ثابت کرنے کے لیے

کہ امام حسینؑ کا مقصد حصولِ حکومت تھا کوئی اور راستہ تلاش کرنا پڑے گا۔ ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کے ہدف میں حصولِ حکومت کو شامل کر لینے سے بھی زیرِ بحث سوالات سے چھٹکارا حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اس صورت میں بات وہی ہو جائے گی کہ امام حکومت کے حصول کے خواہشمند تھے' اور یہاں پھر وہی پہلا سوال بے جواب باقی رہ جائے گا کہ پھر کس طرح یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ آپ اپنی شہادت سے بھی باخبر ہوں اور حصولِ حکومت بھی آپ کے پیشِ نظر ہو؟

اب جبکہ کربلا کی سیاسی تعبیر کے بارے میں ہماری بحث امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اصول تک پہنچ گئی ہے' تو اس بات کی جانب اشارہ کر دینا مناسب نظر آتا ہے کہ امامؑ کے قیام کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ایک سیاسی ہدف کے طور پر قبول کر کے ہم نے (واقعۂ کربلا کی) سیاسی تعبیر کی جانب ایک بڑا قدم اٹھایا ہے۔ اس ہدف کو قبول کر لینا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہم واقعۂ کربلا کو صرف ایک ذاتی اور نجی معاملہ نہ سمجھیں۔ بالفاظِ دیگر اگر یہ قبول کر لیا جائے کہ پورا قصہ قبل از وقت آگہی اور شہادت کی طرف گامزن ہونے کے ایک خاص حکم کی حد تک محدود تھا' تو ممکن ہے بظاہر معنوی لحاظ سے امام کا مرتبہ بلند ہو جائے' لیکن اسی قدر اس معاملے کا سیاسی پہلو محدود ہو جائے گا۔ بہتر ہے یہاں ہم استاد مرتضیٰ مطہریؒ کے بیانات پیش کریں' جو خود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نظریے کے حامیوں میں سے ہیں۔ ہم دیکھیں گے کہ استاد مرتضیٰ مطہریؒ اس واقعے کی صوفیانہ اور انفرادی تعبیر کی جانب سے بہت زیادہ تشویش کا شکار ہیں:

''ایک امر جو واقعۂ کربلا کے اپنے اصل راستے سے ہٹ جانے' عام لوگوں کے استفادے کے دائرے سے نکل جانے اور آخرکار عزاداری سے جو کلی ہدف پیشِ نظر ہے اُس سے منحرف ہو جانے کا موجب بنتا ہے' وہ بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ سید الشہداء کی تحریک نجی معاملے کے انداز کے ایک خصوصی اور مخفیانہ حکم کا نتیجہ تھی' اور آپ کو خواب' یا حالتِ بیداری میں ایک خصوصی حکم دیا گیا تھا۔ کیونکہ اگر یہ مان لیا جائے کہ آپ نے ایک خصوصی حکم کے تحت اپنی تحریک شروع کی تھی' تو پھر دوسرے لوگ اس قسم کے عمل میں انہیں اپنا امام اور مقتدیٰ نہیں بنا سکتے (غور کیجیے کہ واقعۂ کربلا کی سیاسی تعبیر کے بارے میں حساسیت' اس کے پیروکاروں کے لیے ہے) اور وہ امام حسینؑ کے لیے ایک مکتب کے قائل نہیں ہو سکتے' اس کے برخلاف ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ امام حسینؑ کی تحریک اسلام کے کلی احکام سے ماخوذ تھی۔۔۔۔۔

عام طور پر مقررین اپنے خیال میں امام حسینؑ کا مقام بلند کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ امام حسینؑ کو یزید اور ابن زیاد سے مقابلے کے لیے ایک خصوصی حکم دیا گیا تھا' اور (یہ لوگ) اس بارے میں خواب وغیرہ کی ہزار ہا باتیں کیا کرتے ہیں۔۔۔۔ اس حوالے سے جس قدر خیال بافیوں میں اضافہ ہوتا ہے اتنا ہی جن و

ملک اور خصوصی احکام کے تذکروں کی بھرمار ہو جاتی ہے جو اس تحریک کو بے فائدہ تر بنا دیتی ہے۔۔۔۔
ہم اہلِ مشرق ایسے شخص کو بلند مقام پر سمجھتے ہیں جس کے بارے میں کہا جائے کہ وہ اہلِ مکاشفہ ہے' اہلِ کرامت و معجزہ ہے' جن اس کے قابو میں ہیں' فرشتوں سے اس کا رابطہ ہے۔ بے شک امام حسینؑ ملکوتی مقام کے مالک ہیں' بلکہ وہ ہمہ جہت مقام کے مالک ہیں' انسانِ کامل ہیں' انسان کا مقام فرشتے سے کہیں زیادہ بلند ہے۔۔۔" (۱)

"واقعۂ کربلا کی تفسیر اور توجیہ کے بارے میں سامنے آنے والی دوسری معنوی تحریف یہ ہے کہ کہتے ہیں: جانتے ہو کیوں امام حسینؑ نے قیام کیا اور مارے گئے؟ ہم پوچھتے ہیں کیوں؟ تو کہتے ہیں: ایک خاص حکم تھا' جو صرف اُن کے لیے تھا۔ ان سے کہا گیا کہ جاؤ اور اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دو۔ پس اس کا ہم سے اور تم سے کوئی تعلق نہیں۔ یعنی (امام حسینؑ کا یہ اقدام) پیروی کے قابل نہیں ہے! اسلامی احکامات' جو کلی اور عمومی احکام ہیں' اُن سے اس کا کوئی رابطہ نہیں ہے۔۔۔ کیا دنیا میں اس سے بڑھ کر بھی کوئی خیانت ہو سکتی ہے؟" (۲)

"یہ جو کہا جاتا ہے کہ عارفاً بحقہ امام کی معرفت ضروری ہے' یہ اس لیے ہے کہ امامت و پیشوائی اس لیے ہے کہ اسے نمونۂ عمل قرار دیا جائے۔ امام انسانِ مافوق ہے' نہ کہ مافوقِ انسان۔ اور اسی بنا پر وہ نمونۂ عمل بن سکتا ہے۔ اگر امام مافوقِ انسان ہوتے' تو کسی صورت نمونۂ عمل نہیں بن سکتے تھے۔ لہٰذا ہم جتنا بھی شخصیات' واقعات اور حادثات کو معجزانہ اور مافوقِ انسانی پہلو دیں گے' اتنا ہی انہیں ایک رہبر اور ایک مکتب بننے سے دور کر دیں گے۔" (۳)

ھ: ایک اور جواب یہ ہے کہ اصولاً انبیا اور ائمۂ معصومینؑ کے بارے میں ظاہر اور باطن کو ایک دوسرے سے جدا کر دینا چاہیے۔ ان حضرات کا فریضہ ظواہر کے مطابق ہوا کرتا تھا اور وہ اپنی اجتماعی ذمے داریوں کو اسی فریضے کے مطابق انجام دیتے تھے۔ البتہ یہ حضرات خدا کے دیے ہوئے اختیار کی بنا پر باطن میں بھی واقعات سے آگاہ ہوتے تھے۔

۱۔ حماسۂ حسینی۔ ج ۳۔ ص ۸۴۔ ۸۶۔ شہید مطہری نے اسی کتاب کے صفحہ ۳۸۸ پر بھی لکھا ہے کہ امام حسینؑ کا یہ اقدام کسی خاص حکم کی بنیاد پر نہیں تھا' بلکہ شہدا اور قربانی دینے والوں کی منطق کے مطابق تھا۔

۲۔ حماسۂ حسینی۔ ج ۱۔ ص ۹۶۔ ۹۷

۳۔ حماسۂ حسینی۔ ج ۳۔ ص ۲۹۲

اس جواب میں ہماری بحث سے متعلق چیز یہ ہے کہ حتیٰ اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ جو اقدامات امام حسینؑ نے انجام دیے ان کی بنیاد پر آپ کا مقصد اموی حکومت کو ڈھا کر اپنی قیادت میں ایک نئی حکومت کا قیام تھا' تو ظاہر کی بنیاد پر یہ معقول دکھائی دیتا ہے۔ بطورِ مثال اس بحث کو نبی اکرمؐ کے اونٹ کے گم ہونے سے تشبیہ دیتے ہیں' باوجود یہ کہ آپ جانتے تھے' پھر بھی اصحاب کو اسے ڈھونڈنے بھیج دیا اور جب تک ضرورت پیش نہیں آئی آپ نے اپنی اس آگہی کا اظہار نہ کیا۔ اگر کلامی اعتبار سے کوئی اس بحث میں شک وشبے کا اظہار نہ کرے' تو سیاسی نقطۂ نظر کے ساتھ چلا جا سکتا ہے۔ علامہ مجلسی اس تحلیل کے معتقد تھے اور انہوں نے اپنی حد تک کوشش کی ہے کہ سیاسی نقطۂ نظر کا (البتہ حصولِ حکومت کی حد تک نہیں) ساتھ دیں۔ درحقیقت وہ جس حد تک معنوی نقطۂ نظر رکھتے تھے' اسی حد تک سیاسی نقطۂ نظر کے بھی قائل تھے۔ ظاہر اور باطن میں جدائی کے بارے میں ان کی گفتگو کا ابتدائی حصہ نقل کرتے ہیں:

''اور ان (انبیا اور ائمہ) کا فریضہ علمِ حقیقی (کی بنیاد) پر معین نہیں ہونا چاہیے' انہیں دوسرے انسانوں کے ساتھ ظاہری فریضے میں شریک ہونا چاہیے۔ جیسے کہ ان حضرات پر اشیا کی طہارت ونجاست اور لوگوں کے ایمان وکفر کے بارے میں ظاہر کی بنیاد پر فریضہ عائد ہوتا تھا' اگر ان کا فریضہ علمِ واقعی کی بنیاد پر ہوتا' تو انہیں کسی کے بھی ساتھ معاشرت نہیں رکھنا چاہیے تھی' ہر چیز کو نجس سمجھنا چاہیے تھا اور دنیا کی اکثریت کے کافر ہونے کا فیصلہ دینا چاہیے تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو رسول اللہؐ حضرت عثمان کے ساتھ اپنی بیٹی کا رشتہ نہ کرتے اور حضرت عائشہ اور حفصہ کو اپنے عقد میں نہ لاتے۔ پس ظاہر کی بنیاد پر امام حسینؑ اس بات کے ذمے دار تھے کہ اپنے اعوان وانصار کے ساتھ منافقوں اور کافروں سے جہاد کریں اور اگر بیس ہزار سے زیادہ افراد کی بیعت اور بارہ ہزار سے زیادہ بے وفا کوفیوں کے خطوط ملنے کے باوجود امامؑ بیٹھے رہتے اور ان کا جواب نہ دیتے' تو ظاہری طور پر انہیں حضرت پر حجت حاصل ہوجاتی اور ان لوگوں پر خدا کی حجت تمام نہ ہوتی۔''(۱)

ظاہر وباطن کی تقسیم اور انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنا' وہ امر ہے جسے بہت سے شیعہ متکلمین قبول کرتے ہیں۔ استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ اس بات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہ تاریخی اطلاعات سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ یہ سفر ناقابلِ اطمینان تھا' لکھتے ہیں:

''اس کے باوجود یہ پہلو اس دوسرے پہلو سے متصادم نہیں کہ امامؑ ایک اور سطح سے جو معنویت اور امامت

۱۔ مجموعۂ رسائلِ اعتقادی علامہ مجلسی۔ ص ۲۰۰۔۲۰۱

کی سطح ہے' یہ جانتے تھے کہ آخر کار وہ کربلا میں اتریں گے اور وہیں شہید ہوں گے۔''(۱)

یہ وہ بات ہے جسے آقائے صالحی {نعمت اللہ صالحی نجف آبادی مراد ہیں} قبول نہیں کرتے۔ ان کے خیال میں اگر کوئی یہ کہے کہ: ''امام حسینؑ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ کوفہ پہنچنے سے پہلے کربلا میں شہید ہو جائیں گے اور اسی حال میں وہ کوفہ میں حکومت کی تشکیل کا ارادہ بھی رکھتے تھے۔'' تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ''کوفہ جانے اور کوفہ نہ جانے کا ارادہ بیک وقت امام کے دل میں موجود تھا اور یہ اجتماع نقیضین ہے جو کسی طور ممکن نہیں۔''

انہیں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے تھی کہ تناقض کی کم از کم آٹھ شرائط ہیں' جن میں سے ایک وحدتِ جہت بھی ہے۔ اگر امام یا خداوند عالم کے تمام انبیاؑ اپنے ہر فیصلے میں ظاہری اور باطنی فریضے کی بنیاد پر دو ہرے دار ہوں اور دو قسم کے فیصلے کریں' تو کس طرح تناقض وجود میں آئے گا' جبکہ ایک ظاہری پہلو ہے اور دوسرا باطنی پہلو۔ کیا باپ اپنے ننھے بچے کے ساتھ بالکل اسی طرح کا طرزِ عمل اختیار نہیں کرتا۔ وہ دل میں بہت سی باتوں سے واقف ہوتا ہے' لیکن عملاً دو سطحوں پر عمل کرتا ہے' ایک بچے کی خواہش اور اسکی تربیت کے پہلو سے اور دوسرے اپنی پہلے سے آگہی کی بنیاد پر۔

ہم دوبارہ علامہ مجلسی کے سیاسی تجزیے کی طرف آتے ہیں' جو ظاہر اور باطن میں جدائی کے قائل ہیں۔ وہ اپنے اس نقطۂ نظر میں اس بات کے قائل ہیں کہ واقعۂ کربلا کا مقصد ظلم کو طشت از بام کرنا اور احیائے دین تھا۔ ہم نے اشارہ کیا ہے کہ ظاہر اور باطن کی بنیاد پر فریضہ سیاسی نقطۂ نظر کے موافق ہو سکتا ہے۔ اگرچہ بعض دوسرے دلائل کی بنیاد پر صوفیانہ نقطۂ نظر کی طرف بھی جھکاؤ رکھتا ہے۔ علامہ مجلسی (ایک حد تک معتدل) اخباری عالم کی حیثیت سے معنوی اور مادّی دونوں رجحانات کو ملحوظ رکھتے ہیں' اگرچہ یہ ماننا پڑے گا کہ اس بحث سے متعلق متعدد روایات ایسی ہیں جو معنوی رجحان کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ ہم اس سے پہلے کربلا کے بارے میں ان کے معنوی نقطۂ نظر کا ذکر کر چکے ہیں' اور اب ان کے سیاسی نقطۂ نظر کا جائزہ لیتے ہیں:

> ''اور درحقیقت اگر آپ دیکھیں تو اس امامِ مظلومؑ نے اپنی جان اپنے نانا کے دین پر فدا کر دی۔ اگر وہ یزید کے ساتھ صلح کر لیتے اور اس کے افعالِ قبیحہ کی مذمت نہ کرتے' تو کچھ ہی مدت میں شرائعِ دین اور سید المرسلینؐ کے دین کے اصول و فروع فرسودہ اور بے نام و نشاں ہو جاتے۔ معاویہ نے رسولِ مقبولؐ کے آثار کو مٹانے کی اس شد و مد کے ساتھ کوشش کی کہ اُن میں سے بہت ہی کم باقی رہے تھے' اور وہ کم بھی کچھ ہی مدت میں ختم ہو جاتے اور لوگوں کی نظر میں ان ملاعین کے قبیح اور شنیع اعمال و افعال پسندیدہ ہو جاتے

۱۔ حماسۂ حسینی۔ ج ۳۔ ص ۱۸۹

اور پوری دنیا پر کفر کا غلبہ ہو جاتا۔ آنجنابؑ کی شہادت اس بات کا سبب بنی کہ لوگ کسی حد تک خواب غفلت سے بیدار ہوئے اور ان (حکمرانوں) کے عقائد اور اعمال کی خرابیوں کو سمجھ گئے اور مختار وغیرہ جیسے قیام کرنے والے پیدا ہوئے' جنھوں نے اموی حکومت کے ستون ہلا ڈالے اور یہی چیز ان کے خاتمے اور جڑ سے اکھڑنے کا باعث بنی۔"(۱)

سیاسی تعبیر کی جانب

کہنا چاہیے کہ تشیع صفوی (ایران کا ایک شاہی خاندان) دور کے بعد سے مزید اجتماعی ہوئی' اور اس کا سبب سیاست سے قریبی تعلق اور اس میں بھرپور حصہ لینا تھا۔ صفوی دور میں شیعوں نے سیاست میں فعال حصہ لیا' لیکن قاچاری دور میں حکومت انہیں شامل کرنے سے پرہیز کرتی تھی۔ مشروطہ کے دور (ایران میں آئینی نظام کے قیام کی تحریک کا زمانہ) میں جس وقت نظامِ سلطنت مشکلات کا شکار ہوا اور جانشینی کا مسئلہ سامنے آیا' تو ولایت کی طاقت کی بحث میں شدت آگئی' لیکن ایک جامع نظریے کی حد تک اس کی تشریح نہیں کی گئی۔ مشروطہ کے بعد سیاست میں علمائے دین کی شرکت کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اسکی ایک وجہ خود علما کی گوشہ نشینی تھی اور دوسری وجہ انہیں اس میدان سے نکالنے کے لیے حکمرانوں کا دباؤ تھا۔ اس کے باوجود کچھ حضرات نے علما کی سیاست میں شرکت کی شمع جلائے رکھی۔ ۲۰ شہریور کے بعد سے مذہبی جذبات عروج پر پہنچ گئے۔ اس کے بعد مغرب اور مشرق کے سیاسی اور اجتماعی افکار کے نفوذ نے شیعہ علما کو مقابلے کی دعوت دی۔ مشروطہ میں علما کی شرکت اور اسلام کے سیاسی پہلو کی وضاحت اور تشریح کے لیے اس زمانے میں لکھے جانے والے رسالوں کے بعد کچھ عرصے کے لیے جمود طاری ہوگیا۔ انیس سو ساٹھ عیسوی کے عشرے میں ایک مرتبہ پھر ہلچل پیدا ہونے کے نتیجے میں یہ جمود ٹوٹا اور ایک بار پھر اسلام کی قیادت کی خواہش میں اضافہ ہوا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگرچہ ان کتابوں میں قیادت کے بارے میں خصوصی طور پر بحثیں نہیں ہوتی تھیں' اور اگر ہوتی بھی تھیں تو کلی طور پر ہوا کرتی تھیں' لیکن یہ تحریریں اس خواہش سے بھری ہوتی تھیں کہ اسلام ہی کو قیادت کرنی چاہیے۔

ان فکری جہادوں کے سیاسی جہادوں کے ساتھ ملاپ نے قیامِ امام حسینؑ سے استفادے کا راستہ کھول دیا۔ چند پہلوؤں سے اس بحث کی ضرورت بالکل واضح تھی۔ ان تحریروں میں ایک ظالمانہ نظام کے بارے میں گفتگو ہوتی تھی جسے لازماً ختم ہونا چاہیے' شہادت کے بارے میں گفتگو ہوتی تھی جو ظالمانہ پہلوی شہنشاہیت میں ہونے والے قتلِ عام کی صورت میں عیاں تھیں' ان تحریروں میں اس بارے میں گفتگو ہوتی تھی کہ شیعہ معاشرے کو جمود سے نکالا جائے' یہ جمود کربلا

۱۔ مجموعۂ رسائل اعتقادی علامہ باقر مجلسی۔ ص ۲۰۱

کے بارے میں صوفیانہ تعبیر میں افراط سے پیدا ہوا تھا۔ جس زمانے میں امام خمینی علیہ الرحمہ نے کتاب ولایت فقیہ لکھی اور ایک جامع حکومتی نظریے کے طور پر نظریۂ ولایت فقیہ کی تشریح کی۔ اس زمانے میں ایران میں ''راہِ حسین''، ''الف بائے فکری قیامِ امام حسین''، ''شہید جاوید''، ''تحریفاتِ عاشورا'' اور ''شہادت'' جیسی کتابیں شائع کی جا رہی تھیں۔ یہ کتابیں مختلف نظریات کی بنیاد پر لکھی گئی تھیں' اور بسا اوقات ان کے لکھنے والوں کے درمیان اختلافِ رائے بھی پائے جاتے تھے' لیکن سب اس نتیجے پر پہنچے ہوئے تھے کہ قیامِ عاشورا کی سیاسی تعبیر پر زور دینا چاہیے۔ ان کتابوں میں سے ''شہید جاوید'' نامی کتاب پر سب سے زیادہ بحث پڑی۔ اس کتاب پر کلامی اعتبار سے ہونے والی بحثوں اور اس پہلو سے کیے جانے والے اعتراضات سے قطع نظر (بعض لوگوں نے کتاب کے صرف اسی حصے پر تنقید کی ہے) کتاب کا مقصد امام حسینؑ کے قیام کو حکومت پر قبضے کی حد تک سیاسی قرار دینا تھا۔ آقائے صالحی حتیٰ یہ بھی قبول کرنے کو تیار نہیں کہ امام حسینؑ کا مقصد ایک حد تک شہادت بھی ہو سکتا ہے' جو اپنی جگہ احیائے اسلام کے لیے ضروری بھی ہے۔ وہ اس سے کم کچھ سوچنے کے لیے تیار نہیں کہ امام حسینؑ نے حصولِ حکومت کے لیے قیام فرمایا تھا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آقائے صالحی اپنے مقصود تک پہنچنے اور اس قیام کو سیاسی قرار دینے میں ایک طرح کی شدت سے کام لیتے ہوئے بعض بدیہیات تک کی مخالفت پر مجبور ہو گئے۔ البتہ یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اس کتاب نے افراطی صوفیانہ نقطۂ نظر کے مقابلے میں ایک اہم محاذ کھول دیا۔

کتاب کے اس پہلو پر ڈاکٹر حمید عنایت کا تجزیہ قابلِ توجہ ہے' وہ لکھتے ہیں:

> ''جیسا کہ بآسانی دکھائی دے رہا ہے ''شہید جاوید'' کا اصل مقصد شیعہ امام شناسی کے ایک پہلو کو سیاسی کرنا ہے' جسے اب تک مکمل طور پر عارفانہ' شاعرانہ اور جذباتی انداز میں برتا گیا ہے۔ اس عمل کا نتیجہ شیعہ مجاہدین کے درمیان ایک محتاط لیکن بڑھتے ہوئے رجحان کی پیدائش تھا کہ وہ کربلا کے واقعے کو بنیادی طور پر ایک انسانی مسئلے کے طور پر دیکھیں' اور اس کے نتیجے میں امام کے اس عظیم انقلابی اقدام کو ایک ناقابلِ تقلید تاریخی اقدام نہ سمجھیں اور اسے انسانوں کی حد سے بالاتر قرار نہ دیں۔'' (۱)

شہادت' سیاسی ہدف

اس بات کی جانب توجہ ضروری ہے کہ مذکورہ بالا کتابوں میں اصولاً کربلا کی سیاسی تعبیر کو صرف اسی بات میں منحصر نہیں کیا گیا ہے کہ امام حسینؑ نے یہ قدم محض حصولِ حکومت کے لیے اٹھایا تھا۔ بلکہ انہی مصنفین میں سے بعض نے اس بات کا یکسر انکار کیا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علی شریعتی کا نام لیا جا سکتا ہے' جو اس واقعے کے بارے میں اپنی سیاسی تعبیر کو مفہوم

۱۔ اندیشۂ سیاسی در اسلام معاصر۔ ص ۳۳۰۔۳۳۱

شہادت سے حاصل کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ باقاعدہ طور پر اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ امام حسینؑ نے حصولِ حکومت کے لیے قیام فرمایا تھا۔

دراصل اس واقعے کی سیاسی تعبیر اس طرح کی جاسکتی ہے کہ امام حسینؑ نے اپنے جانبازانہ اقدام کے ذریعے لوگوں کو حکومت کے خلاف جدوجہد پر اُکسانے کی کوشش کی۔ اس اعتبار سے امام حسینؑ پر گریے اور آپ کی عزاداری سے بھی ایک صوفیانہ تعبیر کی بجائے ایک سیاسی اقدام کے طور پر استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

بعض ایسے افراد جنہوں نے واقعۂ کربلا کی سیاسی تعبیر کے بارے میں افراط کی راہ اختیار کی ہے، اُن کے لیے یہ بات ماننا بہت مشکل ہے کہ امام حسینؑ نے چاہا تھا کہ دنیا کے بہت سے دوسرے جانباز قائدین کی طرح شجرِ اسلام کو اپنے خون سے سیراب کردیں۔ یہ سوال کہ ''امام حسینؑ کا قتل ہوجانا کس طرح دین کی ترویج اور اسلام کی ترقی کا باعث بن سکتا ہے؟'' ایک ایسا سوال ہے جو آقائے صالحی کے لیے ایک معمہ بنا ہوا ہے اور خود اُن کے بقول ''اب تک یہ میرے لیے حل نہیں ہوا ہے۔''(۱)

امام حسین علیہ السلام کے قتل کے جو مختلف نتائج بیان کیے جاسکتے ہیں، جیسے بنی امیہ کی رسوائی وغیرہ، آقائے صالحی نے انہیں ناقابلِ قبول قرار دیا ہے، لیکن اس بات کی وضاحت نہیں کی ہے کہ کیا اصولی طور پر ممکن ہے کہ کوئی شخص اس قسم کے نتائج کے حصول کے لیے ایسی قربانی پیش کرے۔ اگر خود اس بات میں تردید نہ ہو (جیسے کہ نہیں ہے) تو کیا یہ قبول کیا جاسکتا ہے کہ جس نے ایسا کیا ہے، اُس نے کچھ نتائج کو پیشِ نظر رکھا ہوگا، اگرچہ ممکن ہے اُن کے خیال میں یہ نتائج حاصل نہ ہوئے ہوں۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ حالیہ عشروں میں جن انقلابی حضرات نے امام حسینؑ کے بارے میں کتابیں لکھی ہیں، اُنہوں نے اس بات کو بآسانی قبول کیا ہے کہ امام حسینؑ نے اپنا خون دے کر اسلام کو بچانا چاہا۔ ان حضرات میں شہید ہاشمی نژاد کا نام لیا جاسکتا ہے، جنہوں نے اپنی کتاب ''درسی کہ حسینؑ بہ انسانہا آموخت'' میں اس نقطۂ نگاہ کو تسلیم کیا ہے۔

آخری بات

ایک نکتے کی وضاحت باقی رہ جاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ رہبرِ کبیر حضرت آیت اللہ العظمیٰ امام خمینی علیہ الرحمہ کی مضبوط اور مستحکم قیادت میں اسلامی انقلاب کے دوران واقعۂ کربلا کی سیاسی تعبیر کو تقویت حاصل ہوئی اور امام خمینیؒ نے مختلف مواقع پر اس بارے میں گفتگو فرمائی۔ اس قسم کی گفتگوئیں ''قیامِ عاشورا در کلام و پیامِ امام خمینیؒ'' نامی ایک مجموعے میں

۱۔ شہید جاوید نعمت اللہ صالحی نجف آبادی۔ طبع تہران کانونِ انتشار۔ ص ۳۲۶ (بحث: کیا امامؑ کی شہادت اسلام کے مفاد میں تھی؟)

شائع کی گئی ہیں' خود ان گفتگوؤں کا جائزہ' جو کچھ ہم نے اب تک عرض کیا اس کے مطابق ایک اور تحریر کا تقاضا کرتا ہے۔ فی الحال اس مضمون کے حسنِ اختتام کے طور پر امام خمینیؒ کے دو جملے نقل کرتے ہیں۔ آپ نے ایک مقام پر فرمایا:

''جب حضرت سید الشہداؑ مکہ تشریف لائے' اور پھر مکہ سے اُس حال میں باہر نکلے' یہ ایک عظیم سیاسی قدم تھا۔ آپ کے تمام اقدامات سیاسی اقدامات تھے' اسلامی سیاسی' اور یہ اسلامی سیاسی اقدام ہی تھا جس نے بنی امیہ کا خاتمہ کیا اور اگر یہ عمل نہ ہوتا تو اسلام پامال ہو جاتا۔'' (۱)

ایک اور مقام پر آپ نے فرمایا ہے:

''سید الشہداؑ آئے تھے' حکومت بھی حاصل کرنا چاہتے تھے' بنیادی طور پر آپ اسی لیے آئے تھے اور یہ ایک افتخار ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت سید الشہداؑ حکومت کے لیے نہیں آئے تھے' تو نہیں ایسا نہیں تھا! آپ حکومت کے لیے آئے تھے' کیونکہ حکومت کو سید الشہداؑ جیسی شخصیت کے ہاتھ میں ہونی چاہیے' ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہونی چاہیے جو سید الشہداؑ کے شیعہ ہوں۔'' (۲)

☆☆☆

۱۔ صحیفۂ نور۔ ج ۱۸۔ ص ۱۴۰

۲۔ صحیفۂ نور۔ ج ۲۰۔ ص ۱۹۰

علیہ السلام

امام زین العابدین

شمس الدین ذہبی کہتے ہیں:

"کان لعلی بن الحسین جلالة عجیبة وحُقّ له واللّٰه ذلک، فقد کان اهلا للامامة العظمیٰ لشرفه وسُؤدده وعلمه وتألّهه وکمال عقله."

"علی ابن الحسین عجب جلالت کے مالک ہیں، اور بخدا وہ ایسی جلالت کے اہل بھی ہیں۔ آپ اسے شرف، بزرگواری، علم اور کمالِ عقل کی بنا پر امامتِ عظمیٰ کی لیاقت رکھتے ہیں۔"

(سیر اعلام النبلاء۔ ج ۴۔ ص ۳۹۸)

امام زین العابدینؑ

علی بن الحسین علیہما السلام جو زین العابدینؑ اور سجادؑ کے نام سے مشہور ہیں' شیعوں کے چوتھے امام ہیں۔ مشہور(۱) قول کے مطابق آپ کی ولادت ۳۸ ہجری میں ہوئی۔ بعض نقول میں ۳۵ اور ۳۶ ہجری کو بھی آپ کی ولادت کا سال قرار دیا گیا ہے۔(۲) احمد بن قاسم کوفی نے آپ کی ولادت کا سال ۳۰ ہجری ذکر کیا ہے۔(۳) آپ کی ولادت کی تاریخ مختلف کتابوں میں(۴) پندرہ جمادی الاوّل قرار دی گئی ہے۔ بعض نے ۹ شعبان (۵) اور بعض نے ۵ شعبان (۶) قرار دی ہے۔

اگر امام زین العابدین علیہ السلام کی ولادت ۳۸ ہجری میں ہوئی ہو تو واضح ہے کہ امامؑ نے حضرت علیؑ کی زندگی کا کچھ حصہ' نیز امام حسنؑ اور امام حسینؑ کا دور امامت پایا ہے' اور معاویہ کی جانب سے عراق اور دوسرے علاقوں کے شیعوں پر ظلم وستم کا مشاہدہ کیا ہے۔ لیکن بعض لکھنے والوں نے واقعۂ طف{کربلا} کے بارے میں نقل ہونے والی روایات کو سامنے

۱۔ تواریخ النبی والآل۔ ص ۲۹' از ارشاد۔ ص ۲۸۴' مسار الشیعہ۔ ص ۳۱' التہذیب۔ ج ۶۔ ص ۷۷' روضۃ الواعظین۔ ص ۲۳۲' کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۱۰۵' الفصول المہمہ۔ ص ۱۸۳' الدروس۔ ص ۱۵۳' المناقب ابن شہر آشوب۔ ج ۳۔ ص ۱۷۵' اعلام الوریٰ۔ ص ۲۵۶

۲۔ تواریخ النبی والآل۔ ص ۳۰' از الاقبال۔ ص ۶۲۱' مصباح المتہجد۔ ص ۳۳۷' بیہقی نے "لب الانساب" میں امام سجادؑ کی ولادت کے بارے میں تین قول ۳۳' ۳۶ اور ۳۸ ہجری نقل کیے ہیں۔

۳۔ الاستغاثہ۔ ص ۱۱۶۔ یہاں یہ مشکل درپیش ہے کہ اسی کوفی کی طرح کچھ لوگوں نے امام سجادؑ کو امام حسینؑ کا بڑا بیٹا قرار دینا چاہا ہے۔ کہتے ہیں کہ شیخ مفید' رجال میں شیخ طوسی' علی بن طاؤس اور احمد بن طاؤس اور خلاصۃ الرجال میں علامہ کا بھی یہی خیال ہے۔ جبکہ چوٹی کے مورخین اور محدثین نے امام سجادؑ کو عاشور کے دن شہید ہونے والے علی اکبرؑ سے چھوٹا قرار دیا ہے۔ اس بارے میں دیکھئے: تواریخ النبی والآل۔ ص ۳۱

۴۔ جن میں مسار الشیعہ صفحہ ۳۱' مصباح المتہجد صفحہ ۳۳۷ اور اعلام الوریٰ صفحہ ۲۵۶ بھی شامل ہیں۔

۵۔ روضۃ الواعظین۔ ص ۲۳۲

۶۔ کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۱۰۵

رکھتے ہوئے' امامؑ کی عمر کو اُن کی مشہور عمر سے کچھ کم لکھا ہے اور آپ کی ولادت کا سال سن ۴۸ ہجری قرار دیا ہے۔ یہ روایات بتاتی ہیں کہ امام حسینؑ اور اُن کے اصحاب کی شہادت کے بعد کچھ لوگ امام زین العابدینؑ کو شہید کرنا چاہتے تھے' لیکن بعض لوگوں نے آپ کے نابالغ ہونے کی بنا پر آپ کو قتل ہونے سے بچالیا۔ حمید بن مسلم' جو خود کربلا میں موجود تھا' کہتا ہے: شمر امام سجادؑ کو قتل کرنے کے لیے آیا' لیکن میں نے یہ کہہ کر کہ آپ کم سن ہیں' آپ کو قتل ہونے سے بچالیا۔(۱)

اسی طرح یہ بھی نقل ہوا ہے کہ جب عبید اللہ نے امام زین العابدینؑ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا' تو اُس نے کچھ لوگوں سے کہا کہ وہ آپ میں بلوغ کی علامتوں کا جائزہ لیں۔ جب ان لوگوں نے آپ کے بالغ ہونے کی شہادت دیدی' تو اس نے آپ کے قتل کا حکم صادر کردیا۔ لیکن امامؑ کے یہ کہنے نے کہ اگر تو خاندانِ پیغمبرؐ کے ساتھ ''قرابت'' کا دعویدار ہے (ابوسفیان کا پوتا ہونے کے اعتبار سے) تو تجھے ان عورتوں کو مدینہ پہنچانے کے لیے ان کے ساتھ کسی مرد کو بھیجنا ہوگا' ابن زیاد کے لیے ایسی صورتحال پیدا کردی کہ اُس نے آپ کے قتل کا ارادہ ترک کردیا۔(۲) ایک اور روایت یہ ہے کہ حضرت زینبؑ نے امام سجادؑ کو قتل ہونے سے بچایا' اور فرمایا: ''اگر تم انہیں قتل کرنا چاہتے ہو' تو پہلے مجھے قتل کرو۔''(۳) جاحظ نے بھی امویوں کے جرائم شمار کرتے ہوئے امام سجادؑ کی اس بے حرمتی کی طرف اشارہ کیا ہے جو ان لوگوں نے واقعۂ کربلا کے بعد آپ کی بلوغت کی علامتوں کو تلاش کرتے ہوئے کی تھی۔(۴) اگر یہ روایات درست ہوں (۵) تو امامؑ کی عمر آپ کی مشہور عمر سے کم ہونی چاہیے۔ کیونکہ بلوغت کی زیادہ سے زیادہ عمر پندرہ سال ہے' اور ان روایات کے مطابق جو صورتحال بنتی ہے اُس میں لامحالہ امامؑ کی تقریباً یہی عمر ہوگی۔

اگرچہ یہ روایات متعدد ماخذ (sources) میں نقل ہوئی ہیں' لیکن ایسے شواہد موجود ہیں جو ان روایات کو قبول کرنے میں مانع ہیں۔

اوّل یہ کہ مشہور مورخین اور سیرت نویسوں نے آپ کی ولادت سن ۳۸ ہجری میں لکھی ہے' جس کی بنیاد پر واقعۂ کربلا کے وقت آپ کی عمر ۲۳ سال قرار دی گئی ہے۔

دوّم یہ کہ جن روایات کا ہم نے ابھی تذکرہ کیا ہے' وہ بھی ان صاحب رائے مورخین کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں

۱۔ تاریخ طبری۔ ج ۵۔ ص ۴۲۹ (ناشر موسسہ عز الدین)

۲۔ ایضاً۔ ج ۵۔ ص ۴۳۱

۳۔ ایضاً۔ ج ۵۔ ص ۴۳۱

۴۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۱۵۔ ص ۲۳۶

۵۔ علی بن الحسینؑ سید جعفر شہیدی۔ ص ۳۲۔۳۳

تھیں اور انہی ابتدائی صدیوں سے ان کے نزدیک صحیح اُن مشہور روایات کے ساتھ ان روایات کا تضاد واضح تھا اور ان پر تنقید بھی کی گئی ہے۔

اہلِ سنت کی تاریخی روایات کے نمایاں ترین راویوں میں سے ایک محمد بن عمر واقدی امام جعفر صادق علیہ السلام کا وہ کلام نقل کرنے کے بعد جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ: ''علی بن الحسینؑ نے ۵۸ سال کی عمر میں وفات پائی۔'' لکھتا ہے کہ: یہ جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ امام سجادؑ ۲۳ یا ۲۴ سال کی عمر میں کربلا میں اپنے والد کے ساتھ موجود تھے۔ اس بنیاد پر ان لوگوں کا قول درست نہیں جنہوں نے آپ کو ''صغیر'' قرار دیا اور نابالغ متعارف کرایا۔ حضرت کربلا میں بیمار تھے اسی وجہ سے آپ نے جنگ میں شرکت نہیں فرمائی تھی لہٰذا یہ بات کیسے قبول کی جاسکتی ہے کہ آپ نابالغ تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ آپ کے فرزند ابوجعفر محمد بن علی باقر نے جابر بن عبداللہ انصاری سے ملاقات کی ہے اور ان سے حدیث بھی نقل کی ہے جبکہ جابر نے سن ۷۸ ہجری میں وفات پائی ہے۔(۱)

سوّم یہ کہ امام زین العابدین علیہ السلام نے عبیداللہ ابن زیاد اور یزید ابن ابی سفیان کا جس انداز سے سامنا کیا اُس سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی عمر اس سے زیادہ تھی جو پہلی رائے میں بیان کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ کربلا کے میدان میں آپ کی بلوغت اور عدم بلوغت کی بات ہوئی تھی۔ آپ کو منبر پر جانے کا جو موقع فراہم ہوا تھا وہ بھی آپ کے اُس سن وسال کا پتا دیتا ہے جو اُس صورتحال کا تقاضا تھا۔ ایک ایسا شخص جس کے بالغ ہونے میں ابھی شک وشبہ پایا جاتا ہو وہ یزید کی جانب سے ایسا موقع دیے جانے کو قبول نہیں کرسکتا۔

چہارم یہ کہ تاریخی ماخذ (sources) میں امام محمد باقر علیہ السلام کی ولادت کے بارے میں آنے والی متعدد روایات سے یہ ظاہر ہے کہ آپ چار سال کی عمر میں کربلا میں موجود تھے اور کسی نے ان روایات کے بارے میں شک وشبہ کا اظہار نہیں کیا ہے۔ ان روایات کو قبول کرنے کی صورت میں ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا کہ ہم اسی مشہور قول کو ایک یا دو سال کی کمی بیشی کے فرق کے ساتھ قبول کرلیں۔

آخری بات یہ کہ ''بیہقی'' جیسے شخص نے ''لباب الانساب'' میں امامؑ کی ولادت کے بارے میں تین قول (۳۳، ۳۶ اور ۳۸ ہجری) بیان کیے ہیں اور ان تینوں کے تینوں اقوال کا پہلے بیان کیے جانے والے قول سے کوئی ربط نہیں ہے۔

۱۔ طبقات الکبریٰ۔ ج ۵۔ ص ۲۲۲، مختصر تاریخ دمشق۔ ج ۱۷۔ ص ۲۵۶، کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۱۹۱۔ البتہ صرف جابر کی وفات کے سال سے استدلال کرتے ہوئے واقعۂ کربلا سے پہلے امام محمد باقرؑ کی ولادت کو ثابت نہیں کیا جاسکتا اگرچہ اس سے کربلا کے بعد آپ کی ولادت کا احتمال ضرور کم ہوجاتا ہے۔ واقدی کی سند امام محمد باقرؑ کی ولادت کی روایت ہے نہ کہ جابر کے ساتھ ان کی ملاقات۔

۳۳ ہجری کا تذکرہ ابن عساکر نے کیا ہے(۱) اور زہری نے بھی کہا ہے کہ علی بن الحسینؑ ۲۳ سال کی عمر میں کربلا میں اپنے والد کے ساتھ موجود تھے۔(۲)

امام زین العابدین علیہ السلام کی رحلت بعض کتابوں میں ۹۲ ہجری (۳)' بعض میں ۹۴ ہجری (۴) اور بعض میں ۹۵ ہجری (۵) بیان کی گئی ہے۔ آپ کی وفات ماہِ محرم میں مانی گئی ہے اور مختلف کتابوں میں ماہِ محرم کی ۲۵' ۲۲ اور ۱۸ تاریخ ذکر کی گئی ہے۔(۶)

''شبراوی'' نے لکھا ہے کہ آپ ۹۴ ہجری میں ولید بن عبدالملک کی طرف سے دیے جانے والے زہر کے اثر سے شہید ہوئے۔(۷)

اختلافی مسائل میں سے ایک اور مسئلہ جس کے بارے میں تحقیق بے فائدہ نہیں' امام سجادؑ کی والدہ کا صحیح نام اور اُن کا نسب معلوم کرنا ہے۔ اس موضوع پر بعض لکھنے والوں نے وسیع تحقیق کی ہے' لیکن اس کے باوجود افسوس یہ ہے کہ اب بھی اس بارے میں کوئی قطعی رائے نہیں دی جاسکتی۔ حالیہ دنوں میں ایک ساسانی شہزادی کے بطن سے امام سجادؑ کی ولادت کا انکار اکثر اس لیے کیا گیا ہے کہ کہیں دشمنانِ تشیع اس سے استدلال کرتے ہوئے یہ نہ کہیں کہ ایران میں شیعیت کا پھیلاؤ خاندانِ ائمہؑ کے یزدگرد سوم کی بیٹی (جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ امام سجادؑ کی والدہ تھیں) کے ذریعے ایران کے ساسانی شاہی گھرانے سے قائم ہونے والے تعلق کی بنا پر ہوا ہے۔ استاد شہید مطہری نے حماسۂ حسینی میں اس بارے میں موجود زیادہ تر روایات کو جمع کیا ہے اور ان پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ چند روایات ایسی بھی ہیں جو بتاتی ہیں کہ امام سجادؑ کی والدہ کنیز تھیں۔ ان روایات میں پائے جانے والے تمام تر اختلافات' یا ان میں سے بعض کے ''فتوحات'' وغیرہ میں درج روایات سے ہم آہنگ نہ ہونے کے باوجود' یہ بات یقینی ہے کہ اصل روایت غیر معمولی مشہور ہے اور وقعۃ صفین (۸) تاریخ

۱۔ مختصر تاریخ دمشق۔ ج ۱۷۔ ص ۲۳۰

۲۔ ایضاً۔ ۲۳۱

۳۔ کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۱۰۱

۴۔ مسار الشیعہ۔ ص ۲۶' مصباح المتہجد۔ ص ۲۹۷' فرق الشیعہ۔ ص ۶۶' تاریخ دمشق ترجمۃ الامام زین العابدینؑ۔ ص ۱۲۔ حدیث ۵

۵۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۴۶۸' اثبات الوصیہ۔ ص ۱۷۱' التہذیب۔ ج ۶۔ ص ۷۷' مروج الذہب۔ ج ۳۔ ص ۱۶۰

۶۔ بالترتیب ارشاد صفحہ ۲۸۵' مصباح کفعمی صفحہ ۵۰۹' کفایۃ الطالب صفحہ ۴۵۴

۷۔ الاتحاف بحب الاشراف۔ ص ۱۴۳

۸۔ وقعۃ صفین۔ ص ۱۲

یعقوبی (۱) 'بصائر الدرجات (۲) اور تاریخ قم (۳) جیسی قدیم شیعہ کتب میں موجود ہے' جو سب کی سب تیسری یا چوتھی صدی ہجری میں تالیف ہوئی ہیں۔ کافی میں بھی امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک روایت نقل ہوئی ہے۔ (۴) اسی طرح چوتھی صدی ہجری میں ''قاضی نعمان'' نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے (۵) اس حوالے سے امام زین العابدین علیہ السلام کو 'ابن الخیرتین' فخیرته من العرب القریش 'ومن العجم الفارس و کانت امه ابنة کسریٰ'' (۶) جیسے عناوین سے یاد کیا گیا ہے' اور ابوالاسود دئلی (م: ۶۹ ہجری) سے ایک شعر بھی منسوب ہے کہ اس نے امام سجادؑ کے بارے میں کہا:

و ان غلاما بین کسریٰ و هاشم

لأکرم من نیطت علیه التمائم (۷)

ہم اس معاملے کے تشیع کے پھیلاؤ کے ساتھ تعلق کے بارے میں ایک اور مقام پر تجزیہ کر چکے ہیں اور اس بات کو قبول کرتے ہوئے کہ اصل ماجرے میں شک وشبہ پایا جاتا ہے' ان کے درمیان رابطے کے بارے میں پائے جانے والے مغالطے کا مناسب تجزیہ وتحلیل کر چکے ہیں۔ (۸) ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صرف یہ بات قبول کی جا سکتی ہے کہ امام زین العابدینؑ کی مادر گرامی ایک اہم خاندان سے تعلق رکھتی تھیں' جو ساسانی شاہی خاندان بھی ہو سکتا ہے' جو اس وقت کے ایران کے تمام صوبوں میں برسر اقتدار تھا۔ لیکن یہ ثابت کرنا دشوار ہے کہ وہ خود ایرانی بادشاہ کسریٰ کی بیٹی تھیں۔

اُن نصوص کے مطابق' جو شیعہ محدثین نے روایات کی کتب میں نقل کی ہیں' امام سجادؑ اپنے والد حسین ابن علیؑ کے جانشین اور وصی ہیں۔ ان نصوص کو شیخ کلینی نے ''کافی'' میں' شیخ حر عاملی نے ''اثبات الهداة'' میں اور دوسروں نے نقل کیا ہے۔ وہ احادیث جو ائمہؑ کے اسمائے گرامی کے بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی گئی ہیں' وہ بھی

۱۔ تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۳۳۵

۲۔ بصائر الدرجات۔ ص ۹۶

۳۔ تاریخ قم۔ ص ۱۹۶

۴۔ کافی۔ ج ۲۔ ص ۳۶۹

۵۔ شرح الاخبار۔ ج ۳۔ ص ۲۶۶

۶۔ نثر الدر۔ ج ۱۔ ص ۳۳۹ ' زہر الفردوس۔ ج ۱۔ ص ۲۹۰

۷۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۳۶۶ ' بحار الانوار۔ ج ۴۶۔ ص ۴ ' از ربیع الابرار زمخشری

۸۔ دیکھئے: تاریخ تشیع در ایران۔ ج ۱۔ ص ۱۳۵۔ ۱۶۳

اس بات کی تائید کرتی ہیں۔ ان سے قطع نظر' تاریخ کے ہر دور میں شیعوں کے درمیان امام سجادؑ کی مقبولیت اور اُن کی امامت کو قبول کرنا بذاتِ خود آپ کے وصی ہونے کی سچی گواہی ہے۔ وہ واحد شبہ جو اس زمانے میں اہلِ بیتؑ کے کچھ طرفداروں میں پیدا ہوا تھا' وہ محمد بن حنفیہ کی امامت کا مسئلہ تھا' جس پر ہم اس کے بعد مختصر اروشنی ڈالیں گے۔ اسی طرح شیعہ نصوص کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلوار یا زرہ جیسی کچھ چیزوں کا ائمہؑ کے پاس ہونا ضروری ہے' جن کی امام سجادؑ کے پاس موجودگی کا صراحت کے ساتھ اہلِ سنت کی کتابوں میں بھی ذکر کیا گیا ہے۔(۱)

جس زمانے میں امام سجادؑ زندگی گزار رہے تھے' یہ وہ دور تھا جب امویوں کے ہاتھوں تمام دینی اقدار تحریف اور تغیر کا شکار تھیں اور اہم ترین مذہبی شہر (مدینہ) کے لوگوں کے لیے ضروری کیا گیا تھا کہ وہ یزید کے غلام کے طور پر اس کی بیعت کریں۔ اسلامی احکام ابن زیاد' حجاج بن یوسف اور عبدالملک بن مروان جیسے لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن چکے تھے۔ حجاج' عبدالملک بن مروان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے افضل اور برتر قرار دیتا تھا! دینی نصوص کے یکسر برخلاف مسلمانوں سے جزیہ وصول کیا کرتا تھا اور معمولی تہمت اور الزام پر لوگوں کو جلادوں کے سپرد کر دیتا تھا۔

ایسی حکومت کے ہوتے ہوئے لوگوں کی دینی تربیت کس حد تک تنزل کا شکار ہو جائے گی اور کس طرح زمانہ جاہلیت کی اقدار کا احیا ہوگا' بالکل واضح بات ہے۔ ان حالات میں امام سجادؑ نے ایک عبادت گزار انسان کی حیثیت سے زندگی بسر کی' آپ کا اہم ترین اجتماعی کردار دعا کے ذریعے لوگوں کا خدا سے تعلق پیدا کرنا تھا۔ آپ ایک ایسی شخصیت تھے کہ تمام لوگ آپ کے اخلاق سے متاثر اور آپ کی عادات اور کردار کے شیفتہ تھے۔ بہت سے طالبانِ علم آپ کی احادیث کے راوی تھے' اور آپ کے اُس چشمۂ پُرفیض سے سیراب ہوتے تھے' جس کا سرچشمہ علمِ نبیؐ اور علمِ علیؑ تھا۔ اہلِ سنت کے ایک عالم اور مورخ محمد بن سعد نے امامؑ کی توصیف کرتے ہوئے کہا ہے: "کان علی بن الحسین ثقة مامونا کثیر الحدیث عالیاًرفیعاًوَرِعاً." (۲)

"شافعی" نے جو رسالہ خبرِ واحد کی حجیت کے بارے میں تحریر کیا ہے' اس میں لکھا ہے کہ: وجدت علی بن الحسین. وهو افقه اهل المدینة. یعوّل علی خبر الواحد. (علی بن حسینؑ جو مدینہ والوں میں فقیہ ترین شخص ہیں' خبرِ واحد پر بھروسہ کرتے تھے)۔(۳)

"ابن شہاب زہری" باوجود یہ کہ امویوں سے وابستہ تھا' اور امویوں اور شیعوں کے درمیان موجود عداوت کے

۱۔ طبقات الکبریٰ۔ ج۱۔ ص ۲۸۶۔ ۲۸۸

۲۔ ایضاً۔ ج۵۔ ص ۲۲۲

۳۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۱۵۔ ص ۲۷۴

باوجود امام سجادؑ کے زمانے کے اُن علما میں سے ہے جو انتہائی اشتیاق اور ذوق وشوق کے ساتھ امامؑ سے استفادہ کرتا تھا اور اُس نے کثرت کے ساتھ امامؑ کی مدح سرائی کی ہے۔ امامؑ نے "زہری" کو ایک خط لکھ کر اسے نصیحت کی تھی کہ اس نے اپنے مقام اور مرتبے کو اموی حکام کے ہاتھوں میں ایک ہتھیار کے طور پر دے رکھا ہے' وہ اپنے اس طرز عمل پر نظر ثانی کرے۔(۱) ایک مرتبہ امام زین العابدینؑ نے حضرت علی ابن ابیطالبؑ کی اہانت کرنے پر اسے سرزنش بھی کی تھی۔(۲) اس کے باوجود وہ امام سجادؑ کے علوم کا راوی تھا' جیسا کہ مختلف کتابوں میں اس کی نقل کی ہوئی روایات کو درج کیا گیا ہے۔(۳) اس کے علاوہ وہ امام سجادؑ کی عبادت اور ان کے اخلاص کا بھی شیدائی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ: **كان الزهري اذا ذكر علي بن الحسين يبكي ويقول: زين العابدين.** (جب بھی زہری کے سامنے علی ابن الحسینؑ کا تذکرہ آتا تو وہ رونے لگتے اور کہتے کہ وہ عابدوں کی زینت ہیں)۔(۴) اسی طرح اُس سے نقل کیا گیا ہے کہ: **علي بن الحسين اعظم الناس منة علىّ.** (علی ابن الحسینؑ وہ ہستی ہیں جن کے مجھ پر سب سے زیادہ احسان ہیں)۔(۵) وہ یہ بھی کہتا تھا: **ما رايت احداً افقه من علي بن الحسين.** (میں نے کسی کو بھی علی ابن الحسینؑ سے بڑا فقیہ نہیں پایا)۔(۶) زہری امام سجادؑ کی اس قدر تعریف کیا کرتا تھا کہ بعض 'مروانی' اس سے کہا کرتے تھے کہ: **يا زهري! ما فعل نبيك' يعني علي بن الحسين.** (۷)

دوسرے محدثوں میں سے "ابوحازم" کہا کرتا تھا: **ما رايت هاشمياً افضل من علي بن الحسين ولا افقه منه.** (میں نے ہاشمیوں میں سے کسی کو علی ابن الحسینؑ سے افضل اور ان میں فقیہ تر نہیں پایا)۔(۸) "جاحظ" سے بھی منقول ہے کہ وہ کہا کرتا تھا: علی بن الحسینؑ کی شخصیت کے بارے میں شیعہ' معتزلی' خارجی' عام وخاص سب کا خیال یکساں ہے' اور کسی کو (دوسروں پر) اُن کی برتری اور تقدم کے بارے میں شک نہیں ہے۔(۹)

۱۔ تحف العقول۔ ص ۲۰۰

۲۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۴۔ ص ۱۰۲

۳۔ مثال کے طور پر: طبقات الکبریٰ۔ ج ۸۔ ص ۲۷۴' حلیۃ الاولیاء۔ ج ۳۔ ص ۱۸۶' کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۱۰۳

۴۔ حلیۃ الاولیاء۔ ج ۳۔ ص ۱۳۵

۵۔ طبقات الکبریٰ۔ ج ۵۔ ص ۲۱۴

۶۔ زین العابدینؑ سید الاہل۔ ص ۴۳

۷۔ شرح الاخبار۔ ج ۳۔ ص ۲۵۸

۸۔ تذکرۃ الخواص۔ ص ۱۸۶' کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۸۰

۹۔ عمدۃ الطالب۔ ص ۱۹۳

جیسا کہ ہم بعد میں اشارہ کریں گے' امام زین العابدین علیہ السلام کی شہرت اور لوگوں میں آپ کی مقبولیت کی ایک اہم وجہ دعا کے قالب میں آپ کے خوبصورت کلمات کا لوگوں کے درمیان پھیلنا تھا' جو سب کو اپنی جانب متوجہ کرتے تھے۔
ایک مشہور محدث' سعید بن مسیب' امام سجادؑ کے بارے میں کہتا تھا: ما رایت اورع من علی بن الحسین. (میں نے کسی کو علی ابن الحسینؑ سے زیادہ متقی نہیں دیکھا)۔(۱) امامؑ اپنے زمانے میں "علی الخیر' علی الاغر اور علیّ العابد" کے ناموں سے مشہور تھے۔(۲) مالک بن انس کی بھی یہی رائے تھی کہ (اس زمانے میں) اہلِ بیتِ رسول میں کوئی بھی امام سجادؑ کی مانند نہیں تھا۔(۳)

ان کے بارے میں ''ابن ابی الحدید'' کہتا ہے: کان علی بن الحسین غایة فی العبادة. (علی ابن الحسینؑ انتہائی عبادت گزار شخص تھے)۔(۴) آپ انتہائی کثرت سے سجدے کیا کرتے تھے' جن کا اثر آپ کی پیشانی پر ظاہر تھا' اسی لیے لوگ آپ کو "ذی الثفنات" (گٹوں والے) کہتے تھے۔(۵) ''ابن حبان'' امام سجادؑ کے بارے میں کہتا ہے: وکان من افاضل بنی هاشم من فقهاء المدینة و عبادهم ... یقال علی بن الحسین سیدالعابدین فی ذلک الزمان. (وہ مدینہ میں سکونت پذیر بنی ہاشم کے فقہا اور عبادت گزاروں میں سب سے افضل تھے۔۔۔۔ علی ابن الحسینؑ کو اس زمانے میں سید العابدین کہا جاتا تھا)۔(۶) ''ابو زہرہ'' نے بھی لکھا ہے: فعلیّ زین العابدین کان امام المدینة نُبلا و علماً. (اور علی ابن الحسینؑ شرافت و نجابت اور علم میں سب سے افضل ہیں)۔(۷)

کہتے ہیں کہ جب امام زین العابدین علیہ السلام وضو کیا کرتے تھے' تو آپ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔ جب آپ سے اس کی وجہ پوچھی جاتی' تو آپ فرماتے تھے کہ: ''اتدرون بین یدی من ارید ان اقوم.'' (کیا تم نہیں جانتے ہو' میں کس کے سامنے کھڑا ہونے جا رہا ہوں؟)۔(۸) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ نماز کے موقع پر امامؑ کا چہرہ فق

۱۔ حلیۃ الاولیاء۔ ج ۳۔ ص ۱۴۱' کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۸۰' مختصر تاریخ دمشق۔ ج ۱۷۔ ص ۲۳۶' تہذیب التہذیب۔ ج ۷۔ ص ۳۰۵' سیر اعلام النبلاء۔ ج ۴۔ ص ۳۹۱

۲۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۱۵۔ ص ۲۷۳

۳۔ تہذیب التہذیب۔ ج ۷۔ ص ۳۰۵

۴۔ ایضاً۔ ج ۱۔ ص ۲۷

۵۔ دیکھئے: معجم الادباء۔ ج ۱۱۔ ص ۱۰۳

۶۔ الثقات۔ ج ۵۔ ص ۱۶۰

۷۔ الامام الصادقؑ۔ ص ۲۲

۸۔ صفۃ الصفوۃ۔ ج ۲۔ ص ۵۵' نور الابصار۔ ص ۱۲۷' طبقات الکبریٰ۔ ج ۵۔ ص ۲۱۶' الاتحاف۔ ص ۱۳۶' الفصول المہمہ۔ ص ۲۰۱' العقد الفرید۔ ج ۳۔ ص ۱۱۴

اور آپ کے بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ جب اس کیفیت کا سبب پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: "انی ارید الوقوف بین یدی ملک عظیم." (میں ایک عظیم بادشاہ کی بارگاہ میں کھڑا ہوا تھا)۔(۱) دورانِ نماز آپ کسی چیز کی جانب توجہ نہ دیتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نماز پڑھ رہے تھے کہ اسی اثنا میں آپ کے ایک فرزند کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ وہ درد سے چیخ رہا تھا۔ ہڈی جوڑنے والے کو بلایا گیا' جس نے بچے کی ہڈی بٹھادی' اس وقت بھی بچہ درد سے چیخ پکار کر رہا تھا۔ نماز کے بعد جب امامؑ نے بچے کو اپنا ہاتھ گردن سے لٹکائے ہوئے دیکھا' تب آپ کو معلوم ہوا کہ اُس کا ہاتھ ٹوٹ گیا تھا۔(۲) زمخشری کہتا ہے: ایک مرتبہ علی ابن الحسینؑ نے وضو کی غرض سے پانی میں ہاتھ ڈالا' اور یکلخت سر اٹھا کر آسمان' چاند اور ستاروں کی طرف دیکھنے اور ان کی خلقت کے بارے میں سوچنے لگے' اس سوچ میں اس قدر غرق ہوئے کہ صبح ہوگئی۔ موذن صبح کی اذان دے رہا تھا اور آپ کا ہاتھ اسی طرح پانی میں تھا۔(۳) جب آپ کے ایک خادم سے آپ کے بارے میں پوچھا گیا' تو اُس نے کہا: "میں کبھی بھی دن میں اُن کے لیے کھانا لے کر نہیں گیا اور نہ میں نے رات میں اُن کے لیے بستر لگایا۔"(۴) کہا گیا ہے کہ ایک دن نماز کے موقع پر ایک سانپ آپ کی جانب بڑھا لیکن امامؑ نے اپنی جگہ سے حرکت نہ فرمائی۔ حتیٰ یہ سانپ آپ کے دونوں پیروں کے درمیان سے گزرا لیکن نہ آپ اپنی جگہ سے ہلے اور نہ آپ کا رنگ تبدیل ہوا۔(۵)

صدقہ دینے اور غریبوں کی مدد کرنے میں بھی آپ مشہور تھے۔ آپ کی شہادت کے بعد معلوم ہوا کہ سو خاندان آپ کی طرف سے دیے گئے خرچے اور صدقات پر زندگی گزار رہے تھے۔(۶) امام محمد باقر علیہ السلام کے بقول' امام سجادؑ رات کے وقت اندھیرے میں اپنی پشت پر روٹیاں اٹھا کر فقیروں کے لیے لے جاتے تھے۔ اور فرماتے تھے: رات کے اندھیرے میں صدقہ اللہ کی آتشِ غضب کو ٹھنڈا کرتا ہے۔(۷) لوگ بھی آپ سے انتہائی محبت کیا کرتے تھے' لہٰذا روایات میں آیا ہے کہ قاری حضرات اس وقت تک مکہ کی طرف حرکت نہیں کرتے تھے جب تک امام سجادؑ وہاں سے نہ گزر جائیں اور پھر ان کے پیچھے ایک ہزار سوار چلا کرتے تھے۔(۸) ایک مرتبہ امامؑ ایک خوب صورت لباس پہن کر گھر سے

۱۔ شرح الاخبار۔ ج ۳۔ ص ۲۵۸

۲۔ ایضاً۔ ج ۳۔ ص ۲۶۳

۳۔ ربیع الابرار۔ ج ۳۔ ص ۱۶۰' ۲۶۳

۴۔ المناقب ابن شہر آشوب۔ ج ۲۔ ص ۲۵۵

۵۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۱۰۔ ص ۱۵۹

۶۔ حلیۃ الاولیاء۔ ج ۳۔ ص ۱۳۶' کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۷۷۔ ۷۸ مختصر تاریخ دمشق۔ ج ۱۷۔ ص ۲۳۸

۷۔ مختصر تاریخ دمشق۔ ج ۱۷۔ ص ۲۳۸

۸۔ رجال الکشی۔ ص ۱۱۷

باہر تشریف لائے' لیکن فوراً گھر میں واپس لوٹ گئے اور پکار کر کہا: میرا وہی پہلا والا لباس لے آؤ۔ گویا میں علی ابن الحسینؑ نہیں ہوں۔(۱)

جب آپ سواری پر مدینہ کے گلی کوچوں سے گزرتے تھے تو لوگوں کو اپنی سواری کے آگے سے ہٹانے کے لیے کبھی بھی "راستہ دو' راستہ دو" کی صدائیں بلند نہیں کیا کرتے تھے۔ آپ کا کہنا تھا کہ راستہ سب کا مشترک ہے اور مجھے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ میں دوسروں کو ایک طرف ہٹا کر خود آگے بڑھ جاؤں۔(۲)

سفر کے دوران ہمراہیوں سے اپنا نسب پوشیدہ رکھتے تھے۔ جب آپ سے پوچھا گیا کہ سفر کے دوران آپ اپنے سفر کے ساتھیوں سے اپنا نسب کیوں چھپاتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام پر ایسی چیز لوں جیسی میں دوسروں کو دے نہیں سکتا۔(۳) "جویریہ بن اسماء" کا کہنا ہے: آپ نے رسول اللہؐ کے ساتھ اپنی نسبت کا ایک درہم بھی نہیں کھایا۔(۴) آپ کے فرزند امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ میرے والد نے دو مرتبہ اپنا مال خدا کی راہ میں تقسیم کیا۔(۵)

محمد بن اسامہ بن زید کی وفات کے موقع پر امام زین العابدین علیہ السلام اُن کے سرہانے پر موجود تھے۔ اس موقع پر محمد سخت گریہ کر رہے تھے۔ امام نے اُن سے رونے کا سبب دریافت کیا' تو محمد نے کہا: میں پندرہ ہزار درہم کا مقروض ہوں۔ امامؑ نے فرمایا: تم پریشان مت ہو' میں اس رقم کی ادائیگی کی ذمے داری لیتا ہوں۔(۶)

یہ امام زین العابدین علیہ السلام کے فضائل کا کچھ حصہ تھا۔

امام زین العابدینؑ اور شیعہ

جس وقت کربلا کا واقعہ رونما ہوا' شیعہ کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے بھی اور سیاسی اور اعتقادی صورتحال کے لحاظ

۱۔ مکارم الاخلاق۔ ص ۵۸' وسائل الشیعہ۔ ج ۲۔ ص ۳۶۴۔ البتہ یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ آپ بعض مواقع پر خوبصورت لباس بھی زیب تن کیا کرتے تھے' تا کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ آپ فرمانِ خدا: "قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِيْ أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ" (سورۂ اعراف ۷۔ آیت ۳۲) کے برخلاف عمل پیرا ہیں۔ دیکھئے: تفسیر العیاشی۔ ج ۲۔ ص ۱۵۔ حدیث ۳۲' مستدرک الوسائل۔ ج ۳۔ ص ۲۰۳ اور دیکھئے: مختصر تاریخ دمشق۔ ج ۱۷۔ ص ۲۳۶

۲۔ مختصر تاریخ دمشق۔ ج ۱۷۔ ص ۲۳۶

۳۔ نثر الدرر۔ ج ۱۔ ص ۳۴۱' ربیع الابرار۔ ج ۳۔ ص ۶۹

۴۔ سیر اعلام النبلاء۔ ج ۴۔ ص ۳۹۱

۵۔ ایضاً۔ ج ۱۷۔ ص ۲۳۸

۶۔ ایضاً۔ ج ۱۷۔ ص ۲۳۹' شرح الاخبار۔ ج ۳۔ ص ۲۶۱۔ ۲۶۲ (اس دوسری کتاب میں اس شخص کا نام زید بن اسامہ بن زید آیا ہے)

سے بھی بدترین حالات سے دوچار تھے۔ کوفہ جو شیعی رجحانات کا مرکز تھا' ایک ایسے مرکز میں تبدیل ہو چکا تھا جہاں شیعوں کی سرکوبی کی جا رہی تھی۔ امام حسینؑ کے حقیقی شیعہ' جو مدینہ یا مکہ میں تھے' یا جو کوفہ سے نکل کر امامؑ کے لشکر میں شامل ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے' کربلا میں شہید ہو چکے تھے۔ اگرچہ بہت سے اب بھی کوفہ میں تھے' لیکن کوفہ میں ابن زیاد نے جو سخت حالات پیدا کر دیے تھے' اُن کی وجہ سے اُنہیں اپنے وجود کے اظہار کی جرأت نہ تھی۔ نفسیاتی اعتبار سے واقعۂ کربلا شیعوں کے لیے ایک بہت بڑا دھچکا تھا اور بظاہر یوں پیش کیا جاتا تھا کہ اب شیعہ سر نہیں اٹھا سکیں گے۔ خاندانِ رسالت کے کچھ افراد اور اُن میں سرِ فہرست امام حسینؑ شہید ہو چکے تھے' اور نسلِ فاطمہؑ سے امام حسینؑ کا صرف ایک بیٹا زندہ بچا تھا' جو ان حالات میں زیادہ مشہور نہیں تھا' بالخصوص جبکہ امام حسینؑ کے بڑے بیٹے' یعنی حضرت علی اکبرؑ بھی شہید ہو چکے تھے۔ امام زین العابدینؑ کی مدینہ میں سکونت اور آپ کی عراق سے دوری نے آپ کو کوفہ میں موجود شیعہ تحریکوں کی رہنمائی سے محروم کر دیا تھا۔

ان حالات میں جبکہ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ شیعیت یکسر ختم ہو چکی ہے' امام زین العابدین علیہ السلام کے لیے ضروری تھا کہ آپ صفر (zero) سے اپنے کام کا آغاز کریں اور لوگوں کو اہلِ بیتؑ کی طرف راغب کریں۔ اس سلسلے میں امامؑ کو کافی کامیابی حاصل ہوئی۔(۱)

تاریخ' امام زین العابدین علیہ السلام کی اس کامیابی کی تائید کرتی ہے' کیونکہ آپ شیعوں کو نئی زندگی دینے اور مستقبل میں امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام کی سرگرمیوں کے لیے سازگار حالات فراہم کرنے میں کامیاب رہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام نے چونتیس برسوں پر محیط اپنی سرگرمیوں کے ذریعے شیعیت کو اُس کی زندگی کے ایک سخت ترین دور سے نکالا' وہ تاریک دور جس میں روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی اور بس زبیریوں اور امویوں کے ہاتھوں شیعوں کی سرکوبی ہی دکھائی دیتی ہے۔ عراق پر حجاج کی بیس سالہ حکومت اور پوری مملکتِ اسلامیہ پر عبدالملک بن مروان کے تسلط کے دوران ان کا صرف ایک ہی واضح ہدف تھا اور وہ شیعوں اور اور دوسرے علاقوں میں بنی امیہ کے دیگر مخالفین' خوارج یا عبدالرحمن بن محمد بن اشعث جیسے سرکش عناصر کی سرکوبی۔ حجاج وہ شخص تھا جس کی طبیعت پر لفظ شیعہ کا سننا لفظ کافر کے سننے سے زیادہ گراں گزرتا تھا۔(۲)

ان برسوں میں عراق میں دو شیعہ تحریکیں اٹھیں اور یہ دونوں ہی (ان میں سے ایک کی عارضی کامیابی کے باوجود)

۱۔ دراسات و بحوث فی التاریخ والاسلام۔ ج۱۔ ص۶۱ (طبع اول) مقالہ: الامام السجادؑ باعث الاسلام من جدید

۲۔ امام محمد باقرؑ کے کلمات دیکھیے شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۱ صفحہ ۴۴ اور الامام الصادقؑ ابوزہرہ صفحہ ۱۱۱' ۱۱۲ میں

شکست سے دوچار ہوئیں۔ اس کے بعد بھی شیعہ پوری شدت کے ساتھ امویوں کی جانب سے قتل، ایذا رسانی اور قید و بند کا شکار رہے۔ ان دو میں سے ایک تحریک 'توابین کی تحریک تھی' جس کی قیادت کوفہ کے چند معروف شیعہ سرداروں کے ہمراہ سلیمان بن صرد خزاعی کے ہاتھ میں تھی۔ ہم اس سے پہلے اس بارے میں گفتگو کر چکے ہیں۔ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ توابین نے علی بن الحسینؑ کی امامت کو قبول کیا تھا۔ (۱) ہمیں ابتدائی حوالہ جاتی کتابوں (primry sources) میں اس مدعا پر کوئی دلیل نہیں مل سکی۔ اہم بات یہ ہے کہ مجموعی طور پر توابین نے طے کر رکھا تھا کہ کامیابی کی صورت میں معاشرے کی امامت اہلِ بیتؑ کے سپرد کر دیں گے اور قدرتی طور پر نسلِ فاطمہؑ سے علی ابن الحسینؑ کے سوا کوئی اور اس کام لیے موجود نہ تھا۔ لیکن کیا ان کے ذہن میں ٹھیک یہی بات تھی یا نہیں؟ اس بارے میں تاریخ میں کچھ ذکر نہیں ملتا۔ دکھائی یوں دیتا ہے کہ توابین اور امام زین العابدینؑ کے درمیان کوئی خاص سیاسی رابطہ نہیں تھا اور جس چیز کی وجہ سے اس تحریک پر شیعہ رنگ غالب نظر آتا ہے، وہ اس میں کوفہ کے معروف شیعوں کی شرکت اور اس کی جذباتی اساس، یعنی حسین ابن علیؑ کی مدد نہ کرنے پر توبہ کرنا اور اس توبہ کی قبولیت کی واحد راہ اپنی شہادت پیش کرنا تھی۔ اس تحریک میں کہیں بھی محمد بن حنفیہ کا نام نظر نہیں آتا۔

توابین کی نمایاں ترین سیاسی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے حالات کا صحیح اندازہ نہیں لگایا، کوفہ سے باہر نکل آئے اور اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ مختار نے بھی اسی وجہ سے اس کا ساتھ نہیں دیا کہ اُن کے خیال میں اس تحریک کی قیادت سیاسی اور عسکری مسائل سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔ حتیٰ وہ شیعوں کی ایک بڑی تعداد کے توابین کی تحریک کا ساتھ دینے سے گریز کا موجب بھی بنے۔

اُس زمانے کی دوسری شیعہ تحریک، یعنی مختار کی تحریک سے امام زین العابدین علیہ السلام کے رابطے کے بارے میں بھی یہی ابہام پایا جاتا ہے۔ اس رابطے میں نہ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ اعتقادی لحاظ سے بھی کچھ مشکلات موجود ہیں۔ کہتے ہیں کہ مختار نے کوفہ میں شیعوں کو اپنی جانب مائل کرنے کے بعد امام زین العابدینؑ سے مدد طلب کی تھی، لیکن امامؑ نے اسے کوئی مثبت اشارہ نہیں دیا۔ (۲)

اگر ہم اُس سیاست کو پیشِ نظر رکھیں جس پر امامؑ آخر تک کاربند رہے، تو آپ کی جانب سے مختار کی تحریک کے بارے میں یہ موقف منطقی نظر آتا ہے۔ امامؑ نے واقعۂ کربلا کے بعد یہ بات جان لی تھی کہ اس مردہ معاشرے کی قیادت ہاتھ میں لے کر اسے زندہ نہیں کیا جا سکتا۔ مزید یہ کہ دوسرے طاقتور گروہوں کی موجودگی میں ایک اور سیاسی تحریک میں

۱۔ تشیع در مسیر تاریخ۔ ص ۲۸۶

۲۔ رجال الکشی۔ ص ۱۲۶

الجھنے کے نتیجے میں ایسے خطرات مضمر ہیں جنہیں مول لینا مناسب نہیں۔اسی وجہ سے اپنے دورِ امامت میں امام زین العابدینؑ کی تحریک کی ماہیت' بخوبی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ آپ کی تحریک صرف ایک سیاسی تحریک نہ تھی اور بہت سے مواقع پر معین معنی میں سیاسی سرگرمی سے واضح طور پر مختلف تھی۔

اس معاملے کا اعتقادی پہلو اس وقت شروع ہوا جب مختار نے محمد بن حنفیہ سے اپنی تائید اور حمایت کا مطالبہ کیا۔محمد بن حنفیہ نے مختار کی تائید کی' لیکن باضابطہ طور پر نہیں۔اس کے بعد یہ مشہور ہو گیا کہ عراقی شیعوں نے محمد بن حنفیہ کی امامت قبول کر لی ہے۔اگرچہ یہ مسئلہ اُبھر کر سامنے نہیں آیا لیکن بعد میں جب ''کیسانیہ'' کے نام سے ایک فرقہ مشہور ہوا' تو کہا گیا کہ اس کا آغاز مختار کے زمانے سے ہوا تھا۔

کوفہ کے کچھ شیعوں میں غالیوں کے بعض اصول عقائد رسوخ کر جانے پر بھی بعد میں مختار کو موردِ الزام ٹھہرایا گیا اور یہ مشہور ہو گیا کہ غالیوں کی پیدائش میں مختار کا بڑا ہاتھ ہے۔متعدد دلائل کی بنیاد پر' جنہیں اس مختصر تحریر میں بیان کرنے کی گنجائش نہیں اور ہم نے دوسرے مقامات پر ان کا ذکر کیا ہے' ان تمام مسائل میں اور حتیٰ اس بات میں بھی کہ کیسانیہ نامی فرقہ محمد بن حنفیہ کی امامت یا اُن کی مہدویت کا عقیدہ رکھتا تھا' شک وشبہ پایا جاتا ہے۔لیکن امام زین العابدینؑ کی جانب سے غالیوں کی مخالفت کے بارے میں شواہد موجود ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ عراقی شیعوں کے درمیان انحراف موجود تھا' جس کی وجہ سے امامؑ اس بات پر آمادہ ہوئے تھے کہ اُن کے ساتھ براہِ راست تعلق استوار کرنے اور ان کی مکمل حمایت سے اجتناب کریں۔

امام زین العابدین علیہ السلام نے عراقیوں کے ایک گروہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''**احبونا حبَّ الاسلام و لاترفعونا فوق حدِّنا**'' (ہم سے اسلام کی محبت میں محبت کرو اور ہمیں اپنی حد سے زیادہ نہ بڑھاؤ)۔(۱) ایک اور روایت میں ہے کہ امامؑ نے فرمایا: ''**احبونا حبَّ الاسلام و لاتحبّونا حبَّ الاصنام**'' (اسلام کی محبت میں ہم سے محبت کرو' ہم سے بتوں والی محبت نہ کرو)۔(۲) نیز ابو خالد کابلی کہتے ہیں: میں نے امام سجادؑ سے سنا' کہ آپ فرماتے تھے: یہود و نصاریٰ عزیر اور عیسیٰ سے اس قدر محبت کرتے تھے کہ اُن کے بارے میں ایسی باتیں کرتے تھے' جیسی کہ: ''**آن قوماً من شیعتنا سیُحبّونا حتی یقولوا فینا ما قالتِ الیهود فی عزیر و ما قالتِ النصاریٰ فی عیسیٰ بن مریم**'

۱۔دیکھئے: سیر اعلام النبلاء۔ج ۴۔ص ۳۸۹۔۳۹۰' طبقات الکبریٰ۔ج ۵۔ص ۲۱۴(وہاں متن اس طرح سے ہے کہ حضرت نے فرمایا: تم اپنے اس افراطی طرزِ عمل سے اس بات کا سبب بنے ہو کہ لوگ ہم سے نفرت اور دشمنی رکھیں) حلیۃ الاولیاء۔ج ۳۔ص ۱۳۶۔یعنی ہمارے بارے میں غلو نہ کرو۔

۲۔مختصر تاریخ دمشق۔ج ۱۷۔ص ۲۳۲

فلا هم منّا ولا نحن منهم. "(ہمارے بعض شیعہ ہماری محبت میں اس حد تک بڑھ جاتے ہیں کہ ہمارے بارے میں ویسی ہی باتیں کرنے لگتے ہیں جیسی باتیں یہود ونصاریٰ عزیرؑ اور عیسیٰ ابن مریمؑ کے بارے میں کیا کرتے ہیں ایسے لوگوں کا نہ ہم سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہمارا اُن سے کوئی تعلق)۔(۱)

شیعہ ماخذ (sources) کی رو سے محمد بن حنفیہ کوئی منحرف شخص نہ تھے اور انہوں نے امام زین العابدین علیہ السلام کی امامت کو قبول کیا ہوا تھا۔لہٰذا یہ بات ثابت کرنے میں کئی دشواریاں آڑے آتی ہیں کہ واقعاً محمد بن حنفیہ نے اپنے آپ کو کوفہ کے شیعوں کے لیے بطور امام پیش کیا تھا۔اس مسئلے کے حل کے لیے کئی راستے فرض کیے جاسکتے ہیں مثلاً یہ کہ محمد بن حنفیہ نے امام زین العابدینؑ کے اشارے پر اور امام کو ان مسائل سے علیحدہ رکھنے کے لیے یہ عمل انجام دیا ہو۔اگرچہ کسی خاص تاریخی حوالے سے اس بات کی تائید نہیں ہوتی۔

یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مختلف دلائل کی روشنی میں یہ بات قبول نہیں کی جاسکتی کہ امام زین العابدین علیہ السلام نے مختار کے بارے میں یہ فرمایا ہو کہ:"یکذب علی الله وعلی رسوله." (اُس نے اللہ اور اُس کے رسول پر جھوٹ باندھا ہے)۔(۲) خاص طور پر اس لیے کہ جب مختار نے عبیداللہ ابن زیاد کا سر امامؑ کی خدمت میں بھجوایا تو آپ نے فرمایا تھا کہ:"جزی الله المختار خیراً." (اللہ مختار کو جزائے خیر دے)۔(۳) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس زمانے میں:"لم یبق من بنی هاشم احد الا قام بخطبة فی الثناء علی المختار وجمیل القول فیه."(بنی ہاشم میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے مختار کی تعریف اور اُس کی ستائش میں گفتگو نہ کی ہو اور اُس کے بارے میں کلماتِ خیر ادا نہ کیے ہوں)۔(۴) امام محمد باقر علیہ السلام سے بھی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:"لاتسبّوا المختار فانه قتل قتلتنا وطلب ثارنا وزوج ارامنا وقسم فینا المال علی العسرة." (مختار کو گالی نہ دو،اُس نے ہمارے مقتولین کے قاتلوں کو قتل کیا،ہماری بیواؤں کے بیاہ کرائے اور ہماری تنگی کے ایام میں ہمارے درمیان مال ودولت تقسیم کیا)۔(۵) اور مختار کے بیٹے کے جواب میں مختار کے بارے میں مثبت مؤقف کا اظہار کیا۔(۶)

بہر طور جیسا کہ پہلے بھی وضاحت کی جاچکی ہے مختار کی تحریک بھی سیاسی صورت میں زیادہ عرصے تک نہ چل سکی اور

۱۔رجال الکشی۔ص ۱۰۲،اور دیکھیے:طبقات الکبریٰ۔ج ۵۔ص ۲۱۴،نسب قریش مصعب زبیری۔ص ۵۸

۲۔طبقات الکبریٰ۔ج ۵۔ص ۲۱۳

۳۔رجال الکشی۔ص ۱۲۷۔

۴۔طبقات الکبریٰ۔ج ۵۔ص ۲۸۵۔

۵۔رجال الکشی۔ص ۱۲۸۔

۶۔ایضاً۔ص ۱۲۶

سن ۶۷ ہجری میں زبیریوں کے ہاتھوں کچل دی گئی۔ اس کے باوجود اس تحریک نے اہلِ کوفہ میں ہلچل کے اعتبار سے شیعہ جذبات و احساسات کو زندہ رکھنے نیز سیاسی معاملات میں شرکت کے حوالے سے موالیوں میں محرک (motivetion) پیدا کرنے کے حوالے سے خاص اثرات مرتب کیے۔

وہ انحراف جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں اُس کی بنیاد پر حتیٰ یہ بھی فرض کیا جاسکتا ہے کہ محمد ابن حنفیہ کی خواہش کے برخلاف بعض لوگوں میں امامؑ کے انتخاب کے بارے میں شکوک و شبہات پائے جاتے تھے۔ کچھ لوگ امامؑ کے انتخاب کے بارے میں تردد کا شکار تھے۔ امام زین العابدین علیہ السلام کے ایک صحابی "قاسم بن عوف" خود یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ابتدا میں وہ علی ابن الحسینؑ اور محمد بن حنفیہ کے درمیان کشش و پیچ میں مبتلا تھے (۱) بعد میں وہ امام زین العابدینؑ سے ملحق ہوئے تھے۔ "کشی" کے مطابق ابوحمزہ ثمالی اور فرات بن احنف بھی اسی طرح کے اصحاب میں شامل ہیں۔ (۲) سعید بن مسیب کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض نے انہیں امام سجادؑ کے اصحاب میں شمار کیا ہے لیکن بظاہر وہ اہلِ سنت کے فتاویٰ کے مطابق فیصلے کیا کرتے تھے۔ رجال کشی میں سعید کے اس طرزِ عمل کی وجہ حجاج کے ظلم و ستم سے نجات حاصل کرنے کی کوشش قرار دیا گیا ہے۔ (۳) بہر صورت بے شک و شبہ وہ امامؑ کا احترام کیا کرتے تھے اور اُن کا امامؑ سے علمی اور اخلاقی استفادہ کرنا ظاہر تھا۔ لیکن اُنہوں نے امامؑ کے جنازے میں شرکت نہیں کی اور اس حوالے سے تنقید کا ہدف بھی بنے۔ (۴)

ان چند افراد کے علاوہ کچھ دوسرے ایسے لوگ بھی ہیں جو شیعہ کتابوں کے مطابق مضبوط ترین شیعوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ امامؑ کے ابتدائی دور میں آپ کے ساتھ صرف چند افراد تھے۔ سعید بن جبیر، سعید بن مسیب، محمد بن جبیر بن مطعم، یحییٰ بن ام الطویل اور ابو خالد کابلی۔ (۵) شیخ الطائفہ (شیخ طوسی) کے مطابق امام سجادؑ کے اصحاب کی تعداد ایک سو تہتر تھی۔ (۶)

۱۔ رجال الکشی۔ ص ۱۲۳

۲۔ ایضاً۔ ص ۱۲۲

۳۔ ایضاً۔ ص ۱۲۳

۴۔ ایضاً۔ ص ۱۱۶

۵۔ ایضاً۔ ص ۱۱۵۔ ایک روایت میں تین آدمیوں کا ذکر ہوا ہے اور لکھا ہے کہ: ارتد الناس بعد قتل الحسین الا ثلاثۃ: یحییٰ بن ام الطویل، ابو خالد الکابلی، جبیر بن مطعم. ثم ان الناس لحقوا و کثروا... (امام حسینؑ کے قتل کے بعد تین افراد کے سوا سب لوگ مرتد ہو گئے تھے: یحییٰ بن ام الطویل، ابو خالد کابلی اور جبیر بن مطعم۔ اس کے بعد لوگ ان سے مل گئے اور زیادہ ہو گئے) دیکھئے: اختیار معرفۃ الرجال۔ ص ۱۲۳

۶۔ رجال الطوسی۔ ص ۸۱۔۱۰۲

بہرصورت امام زین العابدین علیہ السلام تشیع کو باقی رکھنے بلکہ اُسے وسعت دینے میں کامیاب رہے۔ آپ کی فقہی روش یہ تھی کہ آپ احادیث نبوی کو حضرت علیؑ کے توسط سے نقل کرتے تھے اور شیعہ صرف انہی احادیث کو درست قرار دیتے تھے۔ اس طرح تشیع نے اس زمانے میں موجود انحرافات کی مخالفت کے لیے اوّلین فقہی اقدام اٹھائے۔ اگرچہ اس کا زیادہ تر کام بعد کے زمانے میں ہوا۔ امام سجادؑ اذان دیتے وقت اس میں "حی علیٰ خیر العمل" کہا کرتے تھے۔ جب آپ پر اعتراض کیا گیا، تو آپ نے فرمایا: "ھو الاذان الاوّل." (شروع میں اذان اسی طرح سے تھی)۔(۱) اس کے علاوہ عراق میں جو انحرافات پھوٹ پڑے تھے اُن سے امامؑ کی بیزاری کے نتیجے میں اصل شیعہ اعتقادی بنیادیں محفوظ رہیں۔ امامؑ کی کوششیں شیعیت کی بقا کا موجب بنیں، لیکن مدینہ، جس میں ابتدائے اسلام ہی سے کج رویاں گھر کر چکی تھیں اور جسے شیعوں کے خلاف بھڑکایا گیا تھا، شیعیت کی نشوونما کے لیے مناسب مقام نہ تھا۔ خود امام سجادؑ فرمایا کرتے تھے کہ مکہ اور مدینہ میں ان کے بیس سچے محب بھی نہیں ہیں۔(۲) جبکہ عراق میں آپ کے محبوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔

امویوں سے امامؑ کا سامنا

اموی حکمرانوں سے امامؑ کا پہلا سامنا واقعۂ کربلا کے بعد عبید اللہ ابن زیاد کے ساتھ ہوا۔ ابن زیاد نے آپ کا نام دریافت کیا۔ امامؑ نے اپنا نام علی بتایا۔ ابن زیاد نے کہا: کیا خدا نے علی ابن الحسینؑ کو قتل نہیں کیا؟ امامؑ نے جواب دیا: میرا ایک بھائی تھا، جسے لوگوں نے قتل کر دیا۔ ابن زیاد بولا: اُسے اللہ نے قتل کیا ہے۔ امام سجادؑ نے فرمایا: اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا. (اللہ ہی ہے جو روحوں کو موت کے وقت اپنی طرف بلا لیتا ہے۔ سورۂ زمر ۳۹۔ آیت ۴۲)۔ اس دلیل میں امامؑ نے اس جانب اشارہ کیا ہے کہ لوگوں نے اُن کے بھائی کو قتل کیا ہے اور خدا نے اُس کی روح قبض کی ہے۔ اس موقع پر ابن زیاد نے امامؑ کو قتل کرنا چاہا، لیکن حضرت زینب علیہا السلام کے شجاعانہ اقدام کی وجہ سے اُسے اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔(۳)

شام میں یزید نے بھی امامؑ سے گفتگو کی(۴) اور آپ کے لیے نامناسب الفاظ استعمال کیے۔ اس کے بعد امامؑ نے ایک عظیم الشان خطبہ دیا، جس میں شامیوں کے سامنے اپنا اور اپنے خاندان کا تعارف کرایا۔ مسجد میں موجود شامی، جو اموی پروپیگنڈے کی وجہ سے غفلت کا شکار تھے، اور خاندانِ رسولؐ سے ناآشنا تھے، انہیں امامؑ کے اس خطبے نے کسی حد تک

۱۔ المصنف ابن ابی شیبہ۔ ج۱۔ ص۲۱۵ (طبع ہندوستان)

۲۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج۴۔ ص۱۰۴ اور دیکھیے: بحار الانوار۔ ج۴۶۔ ص۱۴۳؛ الغارات۔ ص۵۷۳

۳۔ تاریخ طبری۔ ج۵۔ ص۴۳۱ (ناشر عز الدین)؛ نسب قریش مصعب زبیری۔ ص۵۸

۴۔ العقد الفرید۔ ج۵۔ ص۱۳۱

آگاہ کیا۔ یہی وجہ تھی کہ یزید نے خطبے کے دوران مداخلت کی اور اسے جاری نہ رہنے دیا' اس کے بعد لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے سارا گناہ ابن زیاد کے سر تھوپ دیا اور علی ابن الحسینؑ اور دوسرے اسیران کربلا کو عزت واحترام کے ساتھ مدینہ روانہ کردیا۔

اس خطبے کے اہم نکات میں سے ایک یہ تھا کہ امام زین العابدین علیہ السلام نے اپنے آپ کو' اپنے والدِ گرامی کو اور اپنے گھرانے کو اولادِ رسول کا نام دیا' جبکہ معاویہ اور امویوں کی کوشش تھی کہ انہیں حضرت علیؑ کی ذرّیت قرار دیا جائے اور انہیں خود کو ذرّیتِ رسول کہنے کی اجازت نہ دی جائے۔

واقعۂ کربلا کے کچھ عرصے بعد اہلِ مدینہ نے امویوں کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے' قیامِ حرہ کی بنیاد رکھ دی۔ اس شورش کی قیادت غسیلِ ملائکہ کے نام سے معروف صحابیٔ رسول حنظلہ کے فرزند عبداللہ کے ہاتھ میں تھی۔ یہ شورش بنی امیہ کے خلاف اور یزید کی خلاف اسلام اور لادین زندگی کی مخالفت میں برپا ہوئی تھی۔ امام زین العابدین علیہ السلام اور دوسرے بنی ہاشم کا مؤقف اس کے موافق نہ تھا' اسی لیے آپ اپنے خاندان کے کچھ افراد کے ساتھ شہر سے باہر نکل گئے تھے۔ امامؑ کی رائے میں نہ صرف یہ کہ اس تحریک کی ماہیت شیعی نہ تھی' بلکہ یہ ٹھیک زبیریوں کی لائن پر تھی اور وہ بھی عبداللہ ابن زبیر کی قیادت میں جو جنگِ جمل برپا کرنے والوں میں سے تھا۔ شیعوں کے امامؑ ہونے کے ناطے آپ کا معمولی سا اقدام بھی شیعوں کے لیے سنگین نتائج کا سبب بن سکتا تھا۔ اسی لیے امامؑ نے اس معاملے میں بالکل شرکت نہیں کی' جس کی نہ تو کوئی واضح اور درست لائن تھی اور نہ ارتباط۔

مزید یہ کہ جب ابتدا میں لوگوں نے امویوں کو شہر سے باہر نکال دیا' تو امامؑ نے غیرت اور مروت کی بنا پر مروان بن حکم کی درخواست پر اس کی بیوی کو پناہ دی۔ طبری نے کہا ہے کہ اس کی وجہ مروان اور امامؑ کے درمیان پائی جانے والی قدیمی دوستی تھی۔(۱) یہ ایک سفید جھوٹ ہے۔ اصولی طور پر امامؑ اپنی اس کم عمری میں اور وہ بھی ایسے حالات میں جبکہ اس خاندان کے ساتھ آپ کے والدِ گرامی اور آپ کے دادا جان کے سخت ترین تنازعات تھے' مروان کے ساتھ قریبی تعلق رکھ ہی نہیں سکتے تھے' وہ مروان جس کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ وہ بنی امیہ کا غلیظ ترین شخص تھا۔ مروان وہی شخص ہے جس نے مدینہ میں امام حسینؑ سے طلبِ بیعت کے آغاز ہی میں حاکمِ مدینہ سے کہا تھا کہ یا تو وہ امامؑ کو بیعت پر مجبور کرے یا انہیں قتل کر ڈالے۔ امام زین العابدینؑ کا یہ طرزِ عمل بنی امیہ کی رذالتوں کا ایک مؤدبانہ جواب تھا' تا کہ تاریخ ان دونوں کے کردار کا موازنہ کرے۔

۱۔ تاریخ طبری۔ ج ۵۔ ص ۴۸۵' الامامہ والسیاسہ۔ ج ۱۔ ص ۲۰۸

جس وقت مسلم بن عقبہ جو "مسرف" کے نام سے معروف ہوا اہل مدینہ کی شورش کو سرکوب کر چکا اور بنی امیہ کے دور کے ایک بدترین جرم کا مرتکب ہوا تو اُس نے علی ابن الحسینؑ کے ساتھ نرم رویہ اپنایا جس کی وجہ یہ تھی کہ امام نے اس شورش میں شرکت نہیں کی تھی۔ مسلم بن عقبہ نے لوگوں سے اس طرح بیعت لی کہ وہ خود کو یزید کا غلام سمجھیں لیکن علی بن الحسینؑ کے ساتھ عام طریقے سے بیعت لی گئی۔(۱) جب تک امام مسلم کے پاس نہیں آئے تھے وہ امام اور اُن کے اجداد کو دشنام دیا کرتا تھا۔ لیکن جب امام تشریف لائے تو اُس نے آپ کے ساتھ ملائمت آمیز برتاؤ کیا۔ جب امام واپس تشریف لے گئے تو لوگوں نے مسلم سے اُس کے اس طرزِ عمل کے بارے میں سوال کیا۔ اُس نے کہا: "ما كان ذلك لرأي منّي لقد مُلِئ قلبي منهُ رُعباً۔" (میں اُن کے ساتھ یہ طرزِ عمل اختیار نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن کیا کروں کہ میرا دل رعب اور ہیبت سے لبریز ہو گیا تھا)۔(۲)

اس سے قطع نظر کہ ہمیں ائمہ علیہم السلام کے اختیار کردہ موقف کا جائزہ لیتے ہوئے اُن ادوار کی سیاسی صورتحال، عسکری مخالفت، تنظیموں کی تشکیل اور اُن کے مبارزے کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے ہر امام سے اُس کا فریضہ اُس دور کی مخصوص شرائط و حالات (circumstances) (۳) میں ایک خاص طرزِ عمل کا تقاضا کرتا ہے اور ہر عقلمند سیاسی انسان اس بات کو جانتا ہے کہ مختلف معروضی حالات میں ایک ہی طرح کے طرزِ عمل سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، تاریخ گواہ ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام اپنے طرزِ عمل کے ذریعے شیعوں کے تحفظ اور بعد کی سرگرمیوں کے لیے اُن کی بقا اور تقویت کا موجب بنے۔

بہرصورت علویوں اور امویوں کے ماضی کے اختلافات کے پیشِ نظر اموی امام زین العابدین علیہ السلام کی طرف سے شدید بدگمان تھے۔ ان حالات میں امام کی طرف سے کوئی معمولی سی حرکت بھی خطرناک نتائج کی حامل ہو سکتی تھی اور ظاہر ہے امام کی نظر میں اس قسم کے اقدامات پر عمل کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اس زمانے میں امام اہم ترین دینی اور سیاسی اصول "تقیے" پر کاربند تھے۔ تقیہ وہ ڈھال ہے جس سے استفادہ تاریخ میں شیعوں کی بقا کا ضامن رہا اور شیعوں کے ائمہ نے بارہا انہیں اس سے استفادے کی تاکید کی۔ البتہ وہ لوگ جنہیں اپنی آزادی کی وجہ سے تقیے کی ضرورت نہیں تھی انہوں نے اس کے بارے میں قرآن کی صراحت کے باوجود شیعوں کو کمزور کرنے کی غرض سے اس کا انکار کیا۔ اہلِ سنت کو اقتدار

۱۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۳۔ ص ۲۵۹، اور دیکھیے: طبقات الکبریٰ۔ ج ۵۔ ص ۲۱۵، کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۱۰۷، تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۲۵

۲۔ مروج الذہب۔ ج ۳۔ ص ۷۰۔ ۷۱

۳۔ علم غیب بیان شدہ وظیفے پر منطبق ہوتا ہے، کوئی جداگانہ بات نہیں ہے۔

حاصل ہونے کی وجہ سے تقیے کی ضرورت نہ تھی' لہٰذا انہوں نے صرف شیعوں پر الزام تراشی کے لیے تقیے کو اسلام کے مسلّمہ فقہی احکام کے دائرے سے باہر نکال دیا۔

امام زین العابدین علیہ السلام نے ایک روایت میں فرمایا ہے: ''ایسا شخص جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک کر دے' وہ اس شخص کی مانند ہے جو کتاب خدا کو چھوڑ بیٹھا اور اس سے روگرداں ہو گیا ہے' ماسوا اس کے کہ وہ تقیے میں ہو۔ امامؑ سے پوچھا گیا: تقیہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: "یخاف جباراً عنیداً یخاف ان یفرُطَ علیه او ان یطغیٰ." (کسی سرکش جابر کی طرف سے زیادتی یا اس کی جانب سے ظلم کا خوف ہوتا)۔(۱)

تقیہ اگرچہ ایک قرآنی اصول ہے' لیکن فقہی لحاظ سے اس کی تاکید زیادہ تر اُن ائمہؑ کی طرف کی گئی ہے جنہوں نے خود اس پر عمل کیا تھا۔ امام زین العابدین علیہ السلام واقعاً بہت دشوار حالات میں زندگی گزار رہے تھے' اور آپ کے پاس تقیے کے سوا کوئی اور راستہ نہ تھا۔ بنیادی طور پر یہی تقیہ تھا جو ان حالات میں شیعوں کی حفاظت کا موجب بنا۔ یہ وہ چیز تھی جس سے ایک شدت پسند گروہ ہونے کی بنا پر خوارج بے بہرہ تھے اور اسی لیے انہوں نے بہت سی کاری ضربیں کھائیں۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ کوئی شخص امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے پوچھا: آپ کس طرح زندگی گزار رہے ہیں؟ امامؑ نے جواب میں فرمایا: ''اس طرح سے زندگی گزار رہے ہیں کہ اپنی ہی قوم میں آل فرعون کے درمیان بنی اسرائیل کی مانند ہیں۔ ہمارے بچوں کو قتل کرتے ہیں اور عورتوں کو کنیز بناتے ہیں۔ لوگ ہمارے بزرگ اور سردار کو دشنام دے کر ہمارے دشمنوں سے تقرب حاصل کرتے ہیں۔ اگر قریش حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبت کی وجہ سے تمام عربوں پر فخر کرتے ہیں اور اگر عرب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعلق کی وجہ سے عجم پر افتخار کرتے ہیں اور انہوں نے بھی عربوں اور قریش کے لیے یہ فضیلت قبول کر لی ہے' تو ہم اہل بیت کو قریش پر بھی برتری کا حامل اور فخر کرنا چاہیے' کیونکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم اہل بیت ہی میں سے ہیں۔ لیکن ان لوگوں نے ہمارا حق چھین لیا ہے اور ہمارے لیے کسی حق کے قائل نہیں۔ اگر تم نہیں جانتے کہ ہماری زندگی کیسے گزر رہی ہے' تو جان لو کہ ایسے گزر رہی ہے' جیسے کہ میں نے بیان کیا۔'' حدیث نقل کرنے والا کہتا ہے کہ: امامؑ اس انداز سے بول رہے تھے' جیسے چاہتے ہوں کہ جو لوگ نزدیک میں موجود ہیں وہ بھی سن لیں۔

مجموعی طور پر یہ کہنا چاہیے کہ امویوں کے ساتھ امامؑ کے طرزِ عمل کی نرمی اس بات کا سبب بنی کہ امامؑ مدینہ میں آزادی کے ساتھ زندگی گزاریں اور اپنی جانب مخالفین کی توجہ زیادہ مبذول نہ ہونے دیں۔ علاوہ ازیں دین کی

۱۔ طبقات الکبریٰ۔ ج ۵۔ ص ۲۱۴' حلیۃ الاولیاء۔ ج ۳۔ ص ۱۴۰

حفاظت کے سلسلے میں امام کا علمی پہلو زیادہ ابھر کر سامنے آئے۔ علمائے اہلِ سنت کی زبان سے امامؑ کی بکثرت تعریفیں اس حقیقت کی گواہ ہیں۔ اگر امام سیاست میں الجھ جاتے، تو وہ کسی صورت امام کے اس پہلو کی توصیف کے لیے تیار نہ ہوتے۔

امام زین العابدینؑ کا دعا سے استفادہ کرنا

جب معاشرہ انحراف کا شکار ہوا، تو اُس پر آسائش پسندی اور دنیا پرستی کا غلبہ ہوگیا اور اسے سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی فساد نے اپنے گھیرے میں لے لیا، سیاسی لحاظ سے بھی اس میں سانس لینے کا کوئی روزن نہ تھا۔ ایسے حالات میں امام زین العابدین علیہ السلام نے اپنی بعض تعلیمات کے اظہار کے لیے دعا سے استفادہ کیا اور معاشرے میں ایک مرتبہ پھر معرفت، عبادت اور خدا کی بندگی کی جانب توجہ کی ایک تحریک پیدا کی۔ اگرچہ بظاہر ان دعاؤں کا اصل مقصود معرفت اور عبادت ہی تھا لیکن اگر ان دعاؤں میں موجود عبارتوں پر غور کیا جائے، تو کہا جاسکتا ہے کہ ان عبارتوں کے ذریعے لوگ اُن سیاسی مفاہیم سے بھی آشنا ہو سکتے تھے جو امام زین العابدینؑ کے پیشِ نظر تھے۔

مشہور صحیفۂ سجادیہ جو پچاس سے کچھ زائد دعاؤں پر مشتمل ہے، امام زین العابدین علیہ السلام کی دعاؤں کے صرف کچھ ہی حصے کا مجموعہ ہے۔ دوسرے مجموعوں میں بھی آپ کی دعائیں جمع کی گئی ہیں۔ اس طرح معروف صحیفۂ سجادیہ سمیت ان مجموعوں کی کل تعداد چھ تک پہنچی ہے اور ان میں سے بعض میں ایک سو اسی سے زیادہ دعائیں ہیں۔ (۱) یہ دعائیں صرف شیعوں ہی میں نہیں بلکہ اہلِ سنت کے یہاں بھی موجود تھیں (۲) اور اس سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ امام زین العابدینؑ کی دعائیں اس زمانے کے معاشرے میں سرایت کر چکی تھیں۔ شیعہ اماموں کے درمیان، امام زین العابدینؑ اس قسم کی دعاؤں کے حوالے سے سب سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔

آپ کی دعاؤں میں ایک عبارت ایسی موجود ہے جسے کثرت کے ساتھ دہرایا گیا ہے اور شاید ہی کوئی دعا اس عبارت سے خالی ہوگی۔ یہ عبارت ''محمد و آلِ محمد پر صلوات'' ہے۔ اور بنیادی طور پر صحیح دعاؤں کی ایک علامت یہی ہے۔ جس زمانے میں بچوں کا نام تک علی رکھنا برا سمجھا جاتا تھا اور لوگوں کو صرف اسی وجہ سے خطرات کا سامنا کرنا پڑتا تھا، اور امویوں کا کوئی کام حضرت علی علیہ السلام کو برا بھلا کہے بغیر نہیں ہوتا تھا (۳) ایسے حالات میں اس عبارت کا استعمال بخوبی اپنی اہمیت کا عکاس ہے۔ آپ کی دعاؤں میں "محمد و آله الطیبین الطاهرین الاخیار الانجبین." (۴) جیسی

۱۔ الذریعہ۔ ج ۱۵۔ ص ۱۸۔۲۱

۲۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۱۱۔ ص ۱۹۲، ج ۶۔ ص ۱۸۶۔۱۸۷، ج ۵۔ ص ۱۱۳

۳۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۱۳۔ ص ۲۲۰، انساب الاشراف۔ ج ۱۔ ص ۱۸۳

۴۔ صحیفۂ سجادیہ۔ دعا نمبر ۶۔ جملہ نمبر ۲۳

عبارتیں بار بار دہرائی گئی ہیں۔

محمدؐ وآلِ محمد علیہم السلام کے ساتھ وابستگی پر اصرار وہ حقیقت ہے جس کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صلوات بھیجنے کے ضمن میں خود خدا نے دیا ہے اور شیعہ عقائد کے بیان کرنے میں اس کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ امام زین العابدین علیہ السلام کی بعض دعاؤں کے مضامین نقل کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ محمدؐ وآلِ محمد علیہم السلام کے ساتھ مضبوط وابستگی کے بارے میں امام سجادؑ کی ایک روایت بیان کر دی جائے۔ آپ فرماتے ہیں: "انّ اللّٰہ فرض علی العالم الصلاة علی رسول اللّٰہ وقرنّنا بہ فمن صلّی علی رسول اللّٰہ و لم یُصلّ علینا لقی اللّٰہ تعالیٰ وقد بتر الصّلاة علیہ وترک امرہ۔ " (اللہ تعالیٰ نے عالم پر اپنے پیغمبرؐ پر درود بھیجنے کو واجب کیا ہے اور ہمیں بھی ان کے ساتھ ملا دیا ہے۔ تو جو رسول اللہ پر صلوات بھیجے لیکن ہم پر درود نہ بھیجے اس نے رسول پر صلوات کو ادھورا چھوڑ دیا اور حکم خدا کو ترک کر دیا ہے)۔(۱) محمدؐ وآلِ محمدؑ کی ہمراہی خاندانِ رسالت کے بارے میں لوگوں کے موقف میں اہم اثر مرتب کر سکتی ہے۔

صحیفۂ کاملہ کے اہم ترین سیاسی و دینی مضامین میں سے ایک "امامت" ہے۔ امامت کا مفہوم ایک شیعی مفہوم کی صورت میں جو اہل بیت کے دوسروں سے زیادہ خلافت و رہبری کے حقدار ہونے کے پہلو کے علاوہ اعلیٰ ترین درجے پر ان کے الٰہی پہلوؤں عصمت اور انبیا بالخصوص پیغمبر اسلامؐ کے علوم سے بہرہ مند ہونے کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ یہاں ہم اس بارے میں چند نمونے پیش کرتے ہیں۔ ایک مقام پر امامؑ فرماتے ہیں:

"رَبِّ صَلِّ عَلٰی اَطَائِبِ اَهْلِ بَيْتِهِ الَّذِيْنَ اخْتَرْتَهُمْ لِاَمْرِکَ وَجَعَلْتَهُمْ خَزَنَةَ عِلْمِکَ وَحَفَظَةَ دِيْنِکَ وَخُلَفَآئَکَ فِيْ اَرْضِکَ وَحُجَجَکَ عَلٰی عِبَادِکَ وَطَهَّرْتَهُمْ مِنَ الرِّجْسِ وَالدَّنَسِ تَطْهِيْرًا بِاِرَادَتِکَ وَجَعَلْتَهُمُ الْوَسِيْلَةَ اِلَيْکَ وَالْمَسْلَکَ اِلٰی جَنَّتِکَ۔" (۲)

"پروردگارا! ان کے اہل بیتِ اطہار پر رحمت نازل فرما جنہیں تو نے حکومت کے لیے منتخب کیا اپنے علم کا خزینہ دار اور اپنے دین کا محافظ بنایا روئے زمین پر اپنا خلیفہ اور اپنے بندوں پر اپنی حجت قرار دیا اور جنہیں اپنے ارادے سے ہر قسم کی نجاست اور آلودگی سے پاک وصاف رکھا اور جنہیں اپنے تک پہنچنے کا وسیلہ اور جنت تک آنے کا راستہ قرار دیا۔"

۱۔ تاریخ جرجان۔ ص ۱۸۸

۲۔ صحیفہ سجادیہ۔ دعا نمبر ۴۷۔ جملہ نمبر ۵۶

ایک اور مقام پر فرمایا:

"اَللّٰھُمَّ اِنَّ ھٰذَا الْمَقَامَ لِخُلَفَآئِکَ وَاَصْفِیَآئِکَ وَمَوَاضِعَ اُمَنَائِکَ فِی الدَّرَجَۃِ الرَّفِیْعَۃِ الَّتِیْ اخْتَصَصْتَھُمْ بِھَا قَدِ ابْتَزُّوْھَا... حَتّٰی عَادَ صِفْوَتُکَ وَخُلَفَاءُکَ مَغْلُوْبِیْنَ مَقْھُوْرِیْنَ مُبْتَزِّیْنَ... اَللّٰھُمَّ الْعَنْ اَعْدَائَھُمْ مِنَ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ وَمَنْ رَضِیَ بِفِعَالِھِمْ وَاَشْیَاعَھُمْ وَاَتْبَاعَھُمْ." (۱)

"بارالہا! یہ مقام تیرے جانشینوں اور برگزیدہ بندوں کے لیے تھا اور تیرے امانتداروں کا محل تھا تو نے یہ ارفع و اعلیٰ منصب ان کے لیے مخصوص کیا تھا لیکن دوسروں نے اسے اُن سے چھین لیا۔۔۔ یہاں تک کہ تیرے برگزیدہ اور جانشین ظالموں کے مقابل مغلوب و مقہور ہو گئے اور اُن کا حق اُن کے ہاتھ سے جاتا رہا۔۔۔ بارالہا! تو ان برگزیدہ بندوں کے اگلے پچھلے دشمنوں پر اور اُن لوگوں پر جو اُن دشمنوں کے عمل اور کردار سے راضی و خوشنود ہوں اور اُن پر جو اُن کے تابع و پیروکار ہوں لعنت فرما۔"

ایک اور دعا میں فرمایا:

"وَصَلِّ عَلٰی خِیَرَتِکَ اللّٰھُمَّ مِنْ خَلْقِکَ مُحَمَّدٍ وَعِتْرَتِہِ الصَّفْوَۃِ مِنْ بَرِیَّتِکَ الطَّاھِرِیْنَ وَاجْعَلْنَا لَھُمْ سَامِعِیْنَ وَمُطِیْعِیْنَ کَمَا اَمَرْتَ." (۲)

"بارالہا! اپنی بہترین مخلوق محمد اور ان کی عترت پر جو کائنات میں تیری منتخب کردہ ہے رحمت نازل فرما اور ہمیں اپنے فرمان کے مطابق ان کا اطاعت گزار قرار دے۔"

"اَللّٰھُمَّ وَاجْعَلْنِیْ مِنْ اَھْلِ التَّوْحِیْدِ وَالْاِیْمَانِ بِکَ وَالتَّصْدِیْقِ بِرَسُوْلِکَ وَالْاَئِمَّۃِ الَّذِیْنَ حَتَمْتَ طَاعَتَھُمْ." (۳)

"بارالہا! مجھے توحید کا عقیدہ رکھنے والوں، تجھ پر ایمان لانے والوں اور تیرے رسول اور اُن ائمہ کی تصدیق کرنے والوں میں سے قرار دے جن کی اطاعت کو تو نے واجب کیا ہے۔"

ایک اور دعا میں فرمایا:

"اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ اَیَّدْتَ دِیْنَکَ فِیْ کُلِّ اَوَانٍ بِاِمَامٍ اَقَمْتَہٗ عَلَمًا لِعِبَادِکَ وَمَنَارًا فِیْ بِلَادِکَ

۱۔ صحیفہ سجادیہ۔ دعا نمبر ۴۸۔ جملہ نمبر ۹۔۱۰

۲۔ ایضاً۔ دعا نمبر ۳۴

۳۔ ایضاً۔ دعا نمبر ۴۸

بَعْدَ اَنْ وَصَلْتَ حَبْلَهُ بِحَبْلِكَ وَجَعَلْتَهُ الذَّرِيْعَةَ اِلٰى رِضْوَانِكَ وَافْتَرَضْتَ طَاعَتَهُ وَحَذَّرْتَ مَعْصِيَتَهُ وَاَمَرْتَ بِامْتِثَالِ اَوَامِرِهِ وَالْاِنْتِهَاءِ عِنْدَ نَهْيِهِ وَاَلَّا يَتَقَدَّمَهُ مُتَقَدِّمٌ وَلَا يَتَاَخَّرَ عَنْهُ مُتَاَخِّرٌ فَهُوَ عِصْمَةُ اللَّائِذِيْنَ وَكَهْفُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَعُرْوَةُ الْمُتَمَسِّكِيْنَ وَبَهَاءُ الْعٰلَمِيْنَ." (۱) ... وَاَقِمْ بِهِ كِتَابَكَ وَحُدُوْدَكَ وَشَرَائِعَكَ وَسُنَنَ رَسُوْلِكَ صَلَوٰتُكَ اَللّٰهُمَّ عَلَيْهِ وَاٰلِهِ وَاَحْيِ بِهِ مَا اَمَاتَهُ الظَّالِمُوْنَ مِنْ مَعَالِمِ دِيْنِكَ وَاجْلُ بِهِ صَدَاءَ الْجَوْرِ عَنْ طَرِيْقَتِكَ وَاَبِنْ بِهِ الضَّرَّاءَ مِنْ سَبِيْلِكَ وَاَزِلْ بِهِ النَّاكِبِيْنَ عَنْ صِرَاطِكَ وَامْحَقْ بِهِ بُغَاةَ قَصْدِكَ عِوَجًا.... وَاجْعَلْنَا لَهُ سَامِعِيْنَ مُطِيْعِيْنَ." (۲)

"بارالٰہا! تو نے ہر زمانے میں ایک ایسے امام کے ذریعے اپنے دین کی تائید فرمائی ہے جسے تو نے اپنے بندوں کے لیے نشانِ راہ اور اپنی زمین پر مشعلِ ہدایت بنایا ہے۔ جبکہ تو نے اسکے اور اپنے درمیان ایک براہِ راست رابطہ قرار دیا ہے اور اسے اپنی رضا وخوشنودی کا ذریعہ قرار دیا ہے' اور اس کی اطاعت فرض کی اور اس کی نافرمانی سے منع کیا ہے۔ اس کے احکام کی بجا آوری اور اس نے جس چیز سے منع کیا ہے اس سے باز رہنے کا حکم دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ کوئی اس سے آگے نہ بڑھے اور کوئی اس سے پیچھے نہ رہے۔ وہ پناہ طلب کرنے والوں کے لیے سرو سامانِ حفاظت' اہلِ ایمان کے لیے جائے پناہ اور تمام اہلِ جہاں کی رونق وزیبائش ہے۔ ۔۔۔۔ اور اس کے ذریعے اپنی کتاب اور حدود واحکام اور اپنے رسول (ان پر اے اللہ تیری طرف سے درود ورحمت ہو) کی سنتوں کو قائم کر اور ظالموں نے دین کے جن نشانات کو مٹا ڈالا ہے انہیں ان کے ذریعے از سرِ نو زندہ کردے اور ظلم وجور کے زنگ کو اپنی شریعت سے دور اور اپنی راہ کی دشواریوں کو برطرف کردے اور جو تیری راہِ راست سے روگردانی کرنے والے ہیں' انہیں ختم اور جو تیری راہِ راست میں کجی پیدا کرتے ہیں' انہیں نیست ونابود کردے۔ اور ہمیں اس (امام) کی بات پر کان دھرنے والا اور اس کی اطاعت کرنے والا اور اس کی خوشنودی کے لیے کوشاں رہنے والا بنا۔"

مندرجہ بالا جملوں سے بخوبی واضح ہے کہ امامؑ اہم ترین شیعی مفہوم کے عنوان سے بھرپور انداز سے امامت کے مفہوم کی ترویج کے لیے کوشاں تھے۔ اہلِ بیتؑ کے بارے میں ایسے ہی تعریفی اور تمجیدی کلمات کو ہم اس سے پہلے حضرت

۱۔ صحیفۂ سجادیہ۔ دعا نمبر ۴۷

۲۔ ایضاً۔ دعا نمبر ۴۷

علیؑ کی خلافت کے بارے میں بحث کی مناسبت سے نہج البلاغہ سے بھی نقل کر چکے ہیں۔

جیسا کہ اشارہ کیا گیا' دعاؤں کا دائرہ محض اسی حد تک نہیں رہتا' بلکہ عبادی' سیاسی' فکری اور دوسرے اہداف و مقاصد بھی پیش نظر رکھے گئے تھے۔ اس حوالے سے ایک فکری مورد کی جانب اشارہ مناسب رہے گا۔ "اربلی" کہتے ہیں کہ امام زین العابدین علیہ السلام مدینہ میں مسجد نبویؐ میں تشریف فرما تھے۔ اس موقع پر آپ نے دیکھا کہ ایک گروہ اعتقادی بحث و مباحثے کے دوران خدا کو اس کی مخلوق سے تشبیہ دے رہا ہے۔ امامؑ یہ گفتگو سن کر غیظ میں آ گئے اور وہاں سے اٹھ کر قبر رسولؐ کے پاس گئے اور ایک دعا پڑھنا شروع کر دی جس کا مضمون عقیدۂ تشبیہ کی نفی تھا۔ آپ نے ان الفاظ کے ساتھ بارگاہ الٰہی میں تضرع کیا:

"الٰهی بَدَت قُدرَتُکَ وَلَم تُبدُ هیئة فجهلوکَ وَقَدَّروکَ بالتَّقدیرِ علیٰ غیرِ ما انتَ بهِ شبَّهوکَ وانا بریء. یا الٰهی منَ الَّذین بالتَّشبیه طلبُوکَ..." (۱)

"خدایا تیری قدرت تو ظاہر ہوئی لیکن تیری ہیئت آشکار نہیں ہوئی۔ اس لیے لوگ تجھ سے جاہل ہیں اور تجھے ایسا سمجھتے ہیں جیسا تو نہیں ہے۔ تجھے تشبیہ دیتے ہیں۔ اے خدا! میں ان سے بری ہوں جو تشبیہ کے ذریعے تجھے طلب کرتے ہیں۔۔۔"

مختلف ادوار میں اہل بیتؑ کا ایک اقدام یہ بھی رہا ہے کہ لوگوں کو اس بات سے آگاہ کیا جائے کہ قرآن اور سنت میں جن اہل بیتؑ کے اس قدر حقوق اور فضائل بیان ہوئے ہیں' وہ کون لوگ ہیں۔ شام میں بنی امیہ اپنے آپ کو اہل بیت کے طور پر متعارف کراتے تھے۔ حجاز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعض ازواج اسی خیال میں تھیں۔ بتدریج ازواج رسول اس دنیا سے رخصت ہو گئیں اور چونکہ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے ان کے اہل بیت ہونے کا دعویٰ بھی خود بخود ختم ہو گیا۔ اب ان کے بعد اولاد فاطمہؑ کے سوا کوئی اہل بیتؑ باقی نہیں رہا تھا۔

اس بات سے لوگوں کو آگاہ کرنا انتہائی ضروری امر تھا' خصوصاً اس لیے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد پیش آنے والے حالات و واقعات سیاسی میدان میں خاندان رسالت کی گمنامی کا سبب بن گئے تھے۔ جب امام زین العابدینؑ کو شام لے جایا گیا' تو آپ نے وہاں اہل بیت کا تعارف کرایا۔ یہ بات امامؑ کے خطبے میں بھی نمایاں ہے اور بعض تاریخی روایات بھی اس کی تائید کرتی ہیں۔ آیئے اس بارے میں ایک روایت کا مطالعہ کرتے ہیں:

"رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ کے حرم کو "توما" نامی دروازے سے دمشق میں لایا گیا اور مسجد کے دروازے

۱۔ کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۸۹

کے نزدیک اس جگہ ٹھہرایا گیا جہاں اسیروں کو رکھا جاتا تھا' اس موقع پر ایک بوڑھا شخص ان کے پاس آیا اور بولا: خدا کا شکر جس نے تمہیں قتل اور ہلاک کیا اور لوگوں کو تمہاری سرکشی سے نجات دلائی اور امیر المومنین کو تم پر غلبہ دیا۔ علی ابن الحسینؑ (امام زین العابدینؑ) نے اس سے کہا: اے شیخ! کیا تم نے قرآن پڑھا ہے؟' کہا: ہاں۔ فرمایا: کیا تم نے یہ آیت پڑھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی زبان سے فرمایا: قُلْ لَّآ اَسْـئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى؟ کہا: ہاں۔ فرمایا: اے شیخ! ہم ہی قربیٰ ہیں۔ پھر فرمایا: کیا وَ اٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ والی آیت پڑھی ہے؟ کہا: ہاں۔ فرمایا: اے شیخ! ہم ہی ذوی القربیٰ ہیں۔ پھر فرمایا: کیا آیت وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ ..... وَلِذِي الْقُرْبٰى پڑھی ہے؟ اُس نے کہا: ہاں۔ فرمایا: اے شیخ! وہ ذوی القربیٰ ہم ہی ہیں۔ پھر پوچھا: کیا آیت تطہیر پڑھی ہے؟ وہ بولا: ہاں۔ فرمایا: اے شیخ! ہم ہی وہ اہل بیتؑ ہیں جن کے لیے خدا نے آیت تطہیر کو مختص کیا ہے۔ یہ سن کر شیخ خاموش اور خجل ہو گیا اور بولا: بارالٰہا! میں نے جو کچھ اُن سے کہا اور جو دشمنی میں اُن سے رکھتا تھا' اُس سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ بارالٰہا! میں دشمنِ محمد و آلِ محمد سے بیزار ہوں۔''(۱)

ان دعاؤں کے قالب میں امام زین العابدینؑ کا گریہ اور آپ کی مخلصانہ بندگی اور عبادت' اُس زمانے کے بگڑے ہوئے معاشرے کے لیے' جس میں بنی امیہ نے اسلام کو مذاق بنا رکھا تھا' ایک سبق آموز درس تھا'۔ امامؑ کی یہ اشک فشانیاں کربلا کے دردناک واقعے کے لیے بھی تھیں اور امامؑ فرمایا کرتے تھے کہ: یعقوبؑ کو حتمی طور پر یہ پتا نہیں تھا کہ یوسفؑ مر چکے ہیں' اس کے باوجود وہ اُن پر اتنا روئے کہ اُن کی آنکھیں سفید ہو گئیں۔ لیکن میں نے تو خود اپنی آنکھوں سے اہل بیتؑ کے سولہ افراد کو شہید ہوتے دیکھا ہے۔ میں کیسے اپنا گریہ روک سکتا ہوں؟''(۲)

اس طرح امامؑ کا گریہ خود بخود اس بات کا سبب بنا کہ بکثرت مواقع پر لوگ واقعۂ کربلا سے باخبر ہوئے۔ یہ اس کے علاوہ تھا کہ امامؑ خود مختلف موقعوں پر واقعات کربلا بیان کیا کرتے تھے۔ (۳)

امام زین العابدینؑ اور غلام

امام زین العابدین علیہ السلام کی کوششیں جو دینی پہلو کی حامل بھی تھیں اور سیاسی پہلو بھی رکھتی تھیں' اُن میں سے ایک کوشش اُس طبقے پر توجہ تھی جو خاص طور پر دوسرے خلیفہ کے دور سے اور بالخصوص بنی امیہ کے دور میں شدید ترین

۱۔ الفتوح۔ ج ۵۔ ص ۲۴۲۔ ۲۴۳

۲۔ مختصر تاریخ دمشق۔ ج ۱۷۔ ص ۲۳۹

۳۔ دیکھئے: تاریخ طبری۔ ج ۵۔ ص ۱۹۶۔ ۲۱۲ (ناشر: عزالدین)

معاشرتی دباؤ کا شکار تھا' اور ابتدائی زمانے کے اسلامی معاشرے کے محروم ترین طبقات میں شمار ہوتا تھا۔ غلام اور کنیزیں' ایرانی ہوں یا مصری' رومی ہوں یا سوڈانی' سب پر سخت ترین کام مسلط کیے جاتے تھے اور وہ اپنے مالکوں کی طرف سے شدید توہین کا نشانہ بنتے تھے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام' جنہوں نے اپنے اسلامی طرز عمل سے عراق کے موالیوں کے ایک حصے کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا' انہی کی طرح امام زین العابدین علیہ السلام نے بھی اس طبقے کی معاشرتی حیثیت بلند کرنے کی کوشش کی۔ ایک مرتبہ آپ نے اپنی ایک کنیز کو آزاد کیا اور پھر اس سے عقد کرلیا۔ عبدالملک بن مروان نے آپ کو بدنام کرنے اور آپ کا مذاق اڑانے کی غرض سے اس عقد پر آپ کی سرزنش کی' کہ آپ نے آخر ایسا کام کیوں کیا؟ امام سجادؑ نے اس کے جواب میں آیت لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ پڑھ کر حضرت صفیہ کے بارے میں رسول اللہ کی سیرت کی طرف اشارہ کیا' نیز یہ بھی یاد دلایا کہ آنحضرتؐ نے اپنی پھوپھی زاد بہن کا عقد زید بن حارثہ کے ساتھ کیا تھا۔ (۱) اس طرح آپ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ کا ایک مرتبہ پھر احیا کیا جو اس زمانے میں امویوں کے نزدیک ختم ہو چکی تھی۔

سید الاہل نے لکھا ہے: باوجود یہ کہ امام کو غلاموں کی ضرورت نہیں تھی' پھر بھی آپ انہیں خرید لیا کرتے تھے۔ یہ خریداری صرف انہیں آزاد کرنے کے لیے ہوا کرتی تھی۔ کہتے ہیں کہ امام نے تقریباً ایک لاکھ غلاموں کو آزاد کیا۔ وہ غلام جو امامؑ کے اس ارادے سے باخبر ہو جاتے' وہ اپنے آپ کو امام کی نگاہوں کے سامنے لاتے' تاکہ آپ انہیں خرید لیں۔ امام ہر مہینے' ہر روز اور ہر سال انہیں آزاد کرتے رہتے تھے۔ اور عالم یہ ہو گیا تھا کہ مدینہ میں بڑی تعداد میں آزاد شدہ موالی مردوں اور عورتوں کا ایک لشکر دکھائی دیتا تھا جو سب کے سب امامؑ کے موالی (آزاد کردہ) تھے۔ (۲)

علامہ امینی نے بھی لکھا ہے کہ: امام زین العابدین علیہ السلام ہر ماہ رمضان کے آخر میں اُن میں سے بیس افراد کو آزاد کیا کرتے تھے۔ اسی طرح انہوں نے تحریر کیا ہے کہ: آپ کسی غلام کو ایک سال سے زیادہ نہیں رکھتے تھے' حتیٰ آزاد کرنے کے بعد اُن کو کچھ مال بھی دیا کرتے تھے۔ (۳) اس عرصے میں وہ نزدیک سے امام سجادؑ کی عظیم علمی' اخلاقی اور پرہیزگار شخصیت سے واقف ہو جاتے تھے اور قدرتی بات ہے کہ اُن میں سے بہت سے لوگوں کے دلوں میں امام سجادؑ اور شیعیت سے رغبت پیدا ہو جاتی تھی۔

۱۔ طبقات الکبریٰ ج ۵۔ ص ۲۲۳' العقد الفرید۔ ج ۷۔ ص ۱۳۰

۲۔ زین العابدین سید الاہل۔ ص ۴۷

۳۔ اعیان الشیعہ۔ ج ۴۔ ص ۴۶۸ (طبع اول)

ایک مرتبہ ایک کنیز ہاتھ میں پانی کا برتن لیے امامؑ کے ہاتھ پر پانی ڈال رہی تھی' کہ اچانک برتن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر امامؑ کے رخِ انور پر لگا اور اُسے زخمی کر دیا۔ امامؑ نے اس کی طرف دیکھا' تو کنیز نے کہا: وَ الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ. امامؑ نے فرمایا: میں نے اپنا غصہ پی لیا۔ کنیز نے کہا: وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ. امامؑ نے فرمایا: میں نے تجھے معاف کیا۔ کنیز ایک بار پھر گویا ہوئی: وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (۱) امامؑ نے فرمایا: میں نے تجھے خدا کی راہ میں آزاد کیا۔ (۲)

ایک مرتبہ امام زین العابدین علیہ السلام مسجد سے نکل رہے تھے کہ ایک شخص نے آپ کو برا بھلا کہا۔ امامؑ کے ساتھیوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ لیکن امامؑ نے انہیں اس عمل سے باز رکھا اور فرمایا: ہمارے باطن کا جو کچھ اُس سے پوشیدہ رہا ہے' وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو وہ بول رہا ہے۔ اس طرح آپ نے اُس شخص کو شرمندہ کر دیا اور آخر کار اُس شخص کو امامؑ نے اپنے لطف سے نوازا۔ (۳)

اب جبکہ گفتگو کے آخر میں ایک بار پھر امام زین العابدین علیہ السلام کے عفو و درگزر کا ذکر آیا ہے' تو مناسب نظر آتا ہے کہ ایک اور پیاری سی روایت نقل کر دیں۔ عبداللہ بن محمد بن عمر کہتے ہیں: ہشام بن اسماعیل (مدینہ میں امویوں کا گورنر) ہمسائے کے حقوق بھلا کر ہمیں تکلیف دیا کرتا تھا' بالخصوص علی بن الحسینؑ نے اس کی طرف سے دی گئی بہت سی تکلیفیں برداشت کیں۔

جب وہ معزول ہوا' تو ولید نے حکم دیا کہ اسے لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا جائے' تاکہ جو چاہے اس سے اپنا بدلہ لے لے۔ ہشام کہتا ہے کہ مجھے علی ابن الحسینؑ سے زیادہ کسی سے خوف نہ تھا۔ ہشام' مروان کی دیوار کے ساتھ کھڑا ہوا تھا' اس حال میں امام سجادؑ اس کے قریب سے گزرے۔ آپ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ اس سے مزاحم نہ ہوں' حتیٰ اس سے ایک بھی سخت لفظ نہ بولیں۔ جب امامؑ گزر گئے' تو ہشام نے چلا کر کہا: "اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ" (۴) اللہ جانتا ہے کہ اپنی رسالت کہاں قرار دے۔

☆☆☆

۱۔ سورۂ آل عمران ۳۔ آیت ۱۳۴

۲۔ شرح الاخبار۔ ج ۳۔ ص ۲۶۰

۳۔ کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۱۰۱' الاتحاف۔ ص ۱۳۷۔ ۱۳۸' مختصر تاریخ دمشق۔ ج ۱۷۔ ص ۲۳۴

۴۔ تاریخ طبری۔ ج ۶۔ ص ۵۲۶' شرح الاخبار۔ ج ۳۔ ص ۲۶۰

علیہ السلام

امام محمد باقر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جابر سے فرمایا:

"اِنّک تبقیٰ حتیّ تری رجلاً من وُلدی اشبہ الناس بی، اسمہ اسمی، فاذا رأیتہ لم یَخل علیک فاقرئہُ مِنّی السلام. جاحظ: ھو سیّد فقہاء الحجاز."

"تم میرے بعد اتنے عرصے زندہ رہو گے کہ میری اولاد میں سے ایک شخص سے ملاقات کرو گے جو لوگوں میں سب سے زیادہ مجھ سے مشابہ ہوگا اور اس کا نام میرے نام پر ہوگا۔ جب تم اس سے ملو تو اسے میرا سلام پہنچانا اور میری اس وصیت پر ضرور عمل کرنا اس میں سستی نہ برتنا۔"

(شرح نہج البلاغہ۔ ج ۱۵۔ ص ۲۷۷)

امام محمد باقرؑ کی شخصیت

شیعوں کے پانچویں امام محمد بن علی ابن الحسین علیہم السلام ہیں جنہوں نے باقر کے نام سے شہرت پائی ہے۔ آپ کی مادر گرامی فاطمہ بنت امام حسن ابن علیؑ ہیں جن کا ذکر امام جعفر صادقؑ نے ان الفاظ میں فرمایا ہے کہ: "کانت صدیقة لم تدرک مثلها فی آل الحسن." (تمہیں آل حسنؑ میں ان جیسا سچا کوئی نہیں ملے گا)۔ (۱) اس طرح امام محمد باقرؑ وہ پہلے شخص ہیں جن کے والد امام حسینؑ کی نسل سے اور والدہ امام حسنؑ کی نسل سے ہیں۔ (۲)

آپ کی ولادت بعض کتب میں یکم رجب اور بعض میں تین صفر قرار دی گئی ہے۔ (۳) آپ کی ولادت کا سال متعدد کتابوں میں ۵۷ ہجری (۴) اور بعض میں ۵۶ یا ۵۸ ہجری قرار دیا گیا ہے۔ (۵) یعقوبی نے امامؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: "قتل جدّی الحسین ولی اربع سنین وانّی لأذکر مقتله وما نالنا فی ذلک الوقت." (اپنے دادا حسینؑ کی شہادت کے وقت میں چار سال کا تھا۔ مجھے ان کی شہادت کا واقعہ اور جو کچھ اس دن ہم پر گزرا وہ سب یاد ہے)۔ (۶)

شیخ صدوق سے نقل ہونے والی ایک روایت میں آیا ہے کہ "زرارہ" نے امام محمد باقرؑ کی خدمت میں عرض کیا کہ کیا آپ نے امام حسینؑ کو دیکھا ہے؟ تو امامؑ نے فرمایا: "اذکر وانا معه فی المسجد الحرام و قد دخل فیه.."

۱۔ دعوات راوندی۔ ص ۶۸۔ حدیث ۱۶۵؛ بحار الانوار۔ ج ۳۶۔ ص ۲۱۵

۲۔ عمدۃ الطالب۔ ص ۱۹۵۔ قابل ذکر بات ہے کہ حسن مثنیٰ کے فرزند جن کی والدہ فاطمہ بنت حسینؑ تھیں وہ بھی انہی خصوصیات کے مالک تھے۔

۳۔ پہلا قول مسار الشیعہ کے صفحہ ۳۳ پر اور دوسرا قول کشف الغمہ کی جلد ۲ صفحہ ۱۳۶ پر آیا ہے۔

۴۔ کلینی، شیخ مفید اور شیخ طوسی نے کافی کی جلد ۱ صفحہ ۴۶۹، مسار الشیعہ صفحہ ۳۳ پر اور التہذیب جلد ۶ صفحہ ۷۷ پر یہ سال ذکر کیا ہے۔

۵۔ اثبات الوصیہ۔ ص ۱۷۳

۶۔ تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۳۲۰

(مجھے یاد ہے میں ان کے ساتھ مسجد الحرام میں تھا اور وہ اس میں داخل ہو رہے تھے۔۔۔)۔(۱)

امام محمد باقر علیہ السلام کی وفات کا دن سات ذی الحجہ اور بعض نے ربیع الاول یا ربیع الثانی قرار دیا ہے۔(۲) یعقوبی نے وفات کا سال ۱۱۷ ہجری بیان کیا ہے اور اس وقت آپ کی عمر ۵۸ برس ذکر کی ہے۔(۳) جبکہ اکثر کتابوں میں ۱۱۴ ہجری بیان کیا گیا ہے۔(۴) بعض روایات میں ۱۱۵، ۱۱۶ اور ۱۱۸ ہجری بھی ذکر کیا گیا ہے۔(۵)

بہر حال آپ کی وفات ہشام کے دور خلافت میں واقع ہوئی ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ امام محمد باقر کو ابراہیم بن ولید بن عبدالملک کے زمانے میں زہر دیا گیا' آپ شہید ہوئے اور بقیع میں اپنے والد بزرگوار کے پہلو میں دفن ہوئے۔(۶) ابراہیم آخری اموی خلیفہ سے پہلے مختصر مدت کے لیے خلیفہ بنا تھا۔

آپ کی امامت کے دلائل تفصیل کے ساتھ شیعہ کتابوں میں ذکر کیے گئے ہیں۔(۷) آپ کی انگشتری کا نقش جو عام طور پر اپنے زمانے کی مشکلات کے حوالے سے ائمہ کا شعار ہوتا تھا' العِزَّۃُ لِلّٰہِ جمیعاً (تمام عزت خدا ہی کے لیے ہے) تھا۔(۸)

شیعوں کے پانچویں امام نے "شاکر" اور "ہادی" کا لقب پایا اور اسکے علاوہ "باقر" کے لقب سے زیادہ مشہور ہوئے۔ باقر کے معنی ہیں شگاف ڈالنے والا۔ اس کی وضاحت میں جابر بن یزید جعفی کہتے ہیں: لأنہ بقر العلم بقراً ای شقہ و أظھرہ اظھارا۔ (کیونکہ آپ نے علم کو شگافتہ کیا اور اس کے اسرار و رموز کو واضح کیا)۔(۹)

۱۔ من لا یحضرہ الفقیہ۔ ج ۲۔ ص ۲۳۳۔ حدیث ۲۳۰۸

۲۔ کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۱۳۶

۳۔ تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۳۲۰ "توفی ابو جعفر ... سنۃ ۱۱۷ و سنہ ثمان و خمسون سنۃ."

۴۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۴۶۹' فرق الشیعہ۔ ص ۵۷' ارشاد۔ ص ۲۹۳' التہذیب۔ ج ۶۔ ص ۷۷' المعرفۃ والتاریخ۔ ج ۳۔ ص ۳۳۶' تاریخ ابی زرعۃ الدمشقی۔ ج ۱۔ ص ۲۹۳۔ ۲۹۵

۵۔ تواریخ النبی والآل۔ ص ۶۷

۶۔ الفصول المہمہ۔ ص ۲۲۱

۷۔ اثبات الہداۃ۔ ج ۵۔ ص ۲۶۳' اثبات الوصیہ۔ ص ۱۳۲' بحار الانوار۔ ج ۳۶۔ ص ۲۲۹ اور اس کے بعد کافی۔ ج ۱۔ ص ۳۰۵' اعلام الوریٰ۔ ص ۲۶۰' البصائر۔ ج ۴۔ باب ۲۸' الامامۃ والتبصرۃ۔ ص ۶۲ اور ۶۳' نشر مؤسسۃ الامام المہدی

۸۔ کافی۔ ج ۲۔ ص ۴۷۳' حلیۃ الاولیاء۔ ج ۳۔ ص ۱۸۶' تاریخ جرجان۔ ص ۱۹ "القوۃ للّٰہ جمیعاً."

۹۔ علل الشرائع۔ ج ۱۔ ص ۲۳۳

یعقوبی لکھتا ہے: کان سُمِّیَ الباقر لانّہُ بَقَرَ العلم. (آپ کو اس وجہ سے باقر کا نام دیا گیا ہے کہ آپ نے علم کو شگافتہ کیا)۔(۱) راغب اصفہانی نے بھی اسی طرح کی بات کی ہے۔(۲)

ابن منظور نے لفظ باقر کے بارے میں یوں کہا ہے: التبقر التوسُّع فی العلم والمال و کان یقال محمد بن علی بن الحسین بن علی الباقر رضوان اللّٰہ علیھم لأنّہ بقر العلم و عرف اصلہ و استنبط فرعہ. (علم اور مال کے زیادہ مقدار میں ہونے کو "تبقر" کہتے ہیں' اور محمد بن علی بن حسین بن علی رضوان اللہ علیہم کو اس لیے باقر کہا جاتا تھا کہ آپ نے علم کو شگافتہ کیا' اس کے اصولوں کو معین کیا اور اس کے اصولوں سے اس کے فروعات کے استخراج کا طریقہ بیان فرمایا)۔(۳)

جابر بن عبداللہ انصاری نے امام محمد باقر علیہ السلام کی فضیلت میں ایک روایت نقل کی ہے' جسے ابن شہر آشوب کے مطابق عراق اور مدینہ کے تمام فقہا نے بیان کیا ہے۔(۴) اس روایت میں جابر کہتے ہیں: رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے مخاطب کیا اور فرمایا:

"انّک تبقی حتی تریٰ رجلا من وُلْدی أشبہ الناس بی اسمہ علی اسمی، اذا رأیتہ لم یَخْلُ علیک فاقْرَئْہُ منی السّلام."

"تم میرے بعد اتنے عرصے زندہ رہو گے کہ میری اولاد میں سے ایک شخص سے ملاقات کرو گے جو لوگوں میں سب سے زیادہ مجھ سے مشابہ ہوگا' اور اس کا نام میرے نام پر ہوگا۔ جب تم اس سے ملو تو اسے میرا سلام پہنچانا اور میری اس وصیت پر ضرور عمل کرنا' اس میں سستی نہ برتنا۔"

تاریخ یعقوبی میں اس حدیث کے بعد یہ بھی آیا ہے:

"فلما کبر سنّ جابر وخاف الموت جعل یقول: یاباقر یاباقر! این أنت؟ حتیٰ رآہ' فوقع علیہ یقبل یدیہ ورجلیہ و یقول: بابی واُمّی شبیہ ابیہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم انّ اباک یقرأک السّلام."

"جب جابر بوڑھے ہو گئے اور انہیں اپنا وقتِ وفات قریب ہوتا نظر آنے لگا' تو وہ مسلسل کہا کرتے تھے

۱۔ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۳۲۰

۲۔ المفردات۔ ص ۵۴

۳۔ لسان العرب۔ لفظ باقر کے ذیل میں۔

۴۔ دیکھئے: بحار الانوار۔ ج ۴۶۔ ص ۲۹۴

کہ: اے باقر! اے باقر! کہاں ہو؟ یہاں تک کہ ایک دن انہوں نے آپ کو دیکھ لیا، وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس حال میں کہ آپ کے ہاتھوں اور پیروں کو چومتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ: میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں! آپ اپنے جد رسول خداً کی شبیہ ہیں۔ رسول خداً نے آپ کو سلام کہا ہے۔"(۱)

یہ روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی نقل ہوئی ہے، اور آپ نے اس روایت میں لفظ "باقر" کو اپنے والد گرامی کے لیے ایک خاص فضیلت قرار دیا ہے۔(۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس روایت کے نقل ہونے کی وجہ سے آپ "باقر" کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ اس کے بعد جب آپ کی مجلس کثیر تعداد میں اہل سنت کے راویوں اور محدثین کے جمع ہونے اور ان کے استفادے کا مقام بن گئی، تو اس لقب نے اپنی عملی شکل بھی ظاہر کر دی۔

جب زید بن علیؑ ہشام کے پاس تھے، تو ہشام نے امام محمد باقرؑ کے لیے "بقرہ" کا لفظ استعمال کر کے امامؑ کی توہین کرنا چاہی، اس پر جناب زید نے اسے جواب دیا: "سماه رسول الله صلی الله علیه و آله باقر العلم، وانت تسمیه البقرة، لقد اختلفتما اذاً." (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں باقر العلم کا نام دیا ہے، اور تم انہیں بقرہ (گائے) کہہ رہے ہو، تمہارے اور رسول اللہ کے درمیان کتنا فرق ہے!)۔(۳)

یہ روایت مختلف کتابوں میں اتنی زیادہ نقل ہوئی ہے کہ اس کی صحت اور درستی کے بارے میں معمولی سا بھی شک نہیں۔

محمد بن کعب قرظی نے بھی امام کے بارے میں ایک شعر میں کہا ہے:

یا باقر العلم لاھل التقیٰ
وخیر من لبیّ علی الاجبل (۴)

امام محمد باقرؑ کا علمی مقام

یہ بات بلا شک و تردید کہی جا سکتی ہے کہ بہت سے علمائے اہل سنت کی رائے میں امام محمد باقر علیہ السلام کو اپنے

۱۔ تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۳۲۰؛ دیکھیے: المنتخب من ذیل المذیل۔ ص ۶۴۲؛ مختصر تاریخ دمشق۔ ج ۲۳۔ ص ۷۸

۲۔ الاختصاص۔ ص ۶۲

۳۔ عیون الاخبار۔ ج ۱۔ ص ۲۱۲

۴۔ مختصر تاریخ دمشق۔ ج ۲۳۔ ص ۷۸؛ سیر اعلام النبلاء۔ ج ۴۔ ص ۴۰۴

زمانۂ حیات میں بہت زیادہ شہرت حاصل تھی اور آپ کی بزم تمام اسلامی شہروں اور سرزمینوں سے تعلق رکھنے والے آپ کے محبوں سے بھری رہتی تھی۔ ایک عالم اور فقیہ کی حیثیت سے اور بالخصوص علوم اہل بیتؑ کے ایک نمائندے کی حیثیت سے آپ کا علمی مقام بہت سے لوگوں کو اس بات پر مجبور کرتا تھا کہ وہ آپ کی بزم سے استفادہ کریں اور اپنی علمی اور فقہی مشکلات کا حل آپ سے طلب کریں۔ ان میں سے اہل عراق جن میں شیعوں کی بڑی تعداد موجود تھی آپ کی شخصیت کے گرویدہ ہو گئے تھے۔(۱)

آپ کے پاس آنے والوں میں آپ کی علمی شخصیت کے سامنے اس قدر عاجزی اور انکساری کا اظہار نظر آتا تھا کہ عبداللہ بن عطا مکی کہتے ہیں: میں نے علما کو کسی کے سامنے اتنا منکسر نہیں دیکھا جتنا وہ ابوجعفر (امام محمد باقرؑ) کے حضور رہا کرتے تھے۔ حکم بن عیینہ لوگوں کے درمیان اپنی تمام تر علمی عظمت کے باوجود آپ کے سامنے استاد کے حضور زانوئے ادب تہہ کیے بیٹھے ایک بچے کی طرح نظر آتا تھا۔(۲)

آپ کی علمی شہرت کے بارے میں ابن عنبہ کے الفاظ ہیں کہ: کان واسع العلم و وافر الحلم. (آپ وسیع علم اور کثیر حلم کے مالک تھے)۔ لہٰذا اس حوالے سے آپ اتنے زیادہ مشہور ہیں کہ کسی کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔(۳) آپ کی شہرت کا ڈنکا خود آپ کے اپنے زمانے میں نہ صرف حجاز میں بجتا تھا کہ: کان سید فقهاء الحجاز. (آپ فقہائے حجاز کے سید و سردار تھے)۔(۴) بلکہ عراق اور خراسان میں بھی اسکی صدائیں گونجتی تھیں۔ جیسا کہ راوی کہتا ہے: میں نے دیکھا کہ خراسان کے لوگ آپ کے گرد حلقہ بنائے ہوئے آپ سے اپنی علمی مشکلات کے بارے میں سوالات کر رہے ہیں۔(۵)

''ذہبی'' امام محمد باقر علیہ السلام کے بارے میں لکھتے ہیں: آپ ان لوگوں میں سے ایک تھے جن میں علم و عمل، سیادت و شرافت اور وثاقت و متانت یکجا تھی اور آپ میں خلافت کی اہلیت پائی جاتی تھی۔(۶)

خاص و عام امام محمد باقر علیہ السلام کے علم و دانش سے فیضیاب ہونے کے لیے آپ کی بزم کا رُخ کرتے تھے اس

۱۔ ارشاد۔ ص ۲۸۲، بحار الانوار۔ ج ۴۶۔ ص ۳۳۲، کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۱۲۶، الفصول المہمہ۔ ص ۲۱۴

۲۔ مختصر تاریخ دمشق۔ ج ۲۳۔ ص ۷۹، ارشاد۔ ص ۲۸۰، حلیۃ الاولیاء۔ ج ۳۔ ص ۱۸۰، کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۱۱۷۔ ۱۱۸

۳۔ عمدۃ الطالب۔ ص ۱۹۵

۴۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۱۵۔ ص ۷۷

۵۔ کافی۔ ج ۶۔ ص ۲۶۶، بحار الانوار۔ ج ۴۶۔ ص ۳۵۷

۶۔ سیر اعلام النبلاء۔ ج ۴۔ ص ۴۰۲

بارے میں استاد ابو زہرہ لکھتے ہیں: امام محمد باقر علیہ السلام امامت اور لوگوں کی ہدایت کے سلسلے میں امام سجادؑ کے وارث تھے۔ اسی لیے تمام اسلامی شہروں کے علما ہر طرف سے آپ کی بزم میں آتے تھے۔ اور جو کوئی بھی مدینے کی زیارت کو آتا' آپ کی خدمت میں ضرور شرفیاب ہوتا اور آپ کے بے پایاں علوم سے بہرہ مند ہوتا۔

وہی لکھتے ہیں: فقہ و حدیث کے بہت سے بزرگ علما' آپ کے علم سے استفادے کی غرض سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔(۱)

عیون الاخبار سے منقول ہے کہ: فقہا آپ سے حلال و حرام (کے احکام) سیکھا کرتے تھے۔(۲)

آپ اپنے والد امام زین العابدینؑ کی طرح' جنہیں لوگوں کے درمیان عظیم علمی شہرت حاصل تھی' خاص و عام میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ محمد بن منکدر جو خود اہلِ سنت کے ایک مشہور محدث ہیں' امام محمد باقرؑ کی علمی عظمت کے بارے میں کہتے ہیں: میں نے علی ابن الحسینؑ کے فرزند محمد باقرؑ کی خدمت میں پہنچنے سے قبل تک اُن کے بچوں میں سے کسی کو (علم و فضیلت میں) ان کا جانشین نہیں پایا تھا۔(۳)

بہت سے علمائے اسلام نے امام محمد باقر علیہ السلام کے علمی اور فقہی مقام کے بارے میں انتہائی خوب صورت جملے کہے ہیں' جنہیں استاد اسد حیدر نے اپنی کتاب میں جمع کیا ہے۔(۴)

فقہ' عقائد اور دوسرے اسلامی علوم کے بارے میں امامؑ کی بیان کردہ روایات کی کثرت اور وسعت اس بات کا سبب بنی کہ اہلِ سنت محدثین نے بھی آپ سے احادیث کو نقل کیا ہے' ان میں سے ایک معروف ترین ''ابو حنیفہ'' ہیں۔ انہوں نے اہلِ سنت طریق سے آنے والی بہت سی روایات کو قبول نہ کرنے کے باوجود اہلِ بیتؑ کے طریق سے اور خصوصاً امام محمد باقرؑ کی روایات کو نقل کیا ہے۔(۵) ذہبی نے امامؑ سے روایت کرنے والوں میں عمرو بن دینار' اعمش' اوزاعی' ابن جریج اور قرۃ بن خالد کا ذکر کیا ہے۔(۶)

ابو اسحاق جب آپ کی خدمت میں پہنچے اور آپ کے عظیم اور تعجب انگیز علمی مقام کا مشاہدہ کیا' تو آپ کی تعریف

۱۔ الامام الصادقؑ۔ ص ۲۲۔ ناشر دار الفکر العربی بیروت

۲۔ حیاۃ الامام الباقرؑ۔ ج ۱۔ ص ۱۳۹

۳۔ الاتحاف۔ ص ۱۴۵

۴۔ الامام الصادقؑ والمذاہب الاربعہ۔ ج ۲۔ ص ۴۳۵۔ ۴۳۹

۵۔ تذکرۃ الحفاظ۔ ج ۱۔ ص ۱۲۷' دیکھیے: جامع مسانید الامام الاعظم ابو حنیفہ

۶۔ تذکرۃ الحفاظ۔ ج ۱۔ ص ۱۲۴

کرتے ہوئے کہا: میں نے ان جیسا کوئی نہیں دیکھا۔(۱)

ابوزرعہ دمشقی بھی آپ کے بارے میں کہتے ہیں: ابوجعفر کا شمار عظیم ترین علما میں ہوتا ہے۔(۲)

جرأت کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ شیعہ اماموں میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے بعد اکثر روایات کی سند امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ تک جاتی ہے' اور اس کی وجہ اس زمانے کے مخصوص سیاسی حالات تھے' جن کی بنا پر ان دو اماموں کو دوسرے اماموں سے زیادہ علوم آل محمدؐ کی نشر و اشاعت کا موقع ملا۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث کے شیعہ مجموعوں میں اہل بیتؑ کی روایات کا ایک بڑا حصہ انہی دو اماموں سے نقل ہوا ہے۔ اسی لیے امام محمد باقرؑ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ: **لم يظهر من وُلْدِ الحسن و الحسين من العلوم' ما ظهر منه فى التفسير و الكلام و الاحكام و الحلال و الحرام.** (تفسیر' کلام' احکام اور حلال وحرام کے بارے میں جو کچھ آپ سے صادر ہوا ہے' وہ حسنؑ اور حسینؑ کی اولادوں میں سے کسی اور سے صادر نہیں ہوا)۔(۳)

ان احادیث کی نشر و اشاعت کی وجہ سے اس زمانے میں آپ کو ایک عالم' امام' فقیہ اور محدث کی حیثیت سے عظیم علمی شہرت حاصل ہوئی۔ ابوزہرہ نے آپ کی خدمت میں شرفیاب ہونے والوں اور آپ سے علمی استفادہ کرنے والوں کے انبوہ کثیر میں سے سفیان ثوری' سفیان بن عیینہ (مکہ کے محدث) اور ابوحنیفہ کی جانب اشارہ کیا ہے۔(۴)

ابرش کلبی نے ہشام بن عبدالملک سے پوچھا: **من هذا الذى تداكّ عليه الناس.** (یہ کون ہے جس کے گرد لوگ ٹوٹے پڑ رہے ہیں؟ اور اس سے سوالات کر رہے ہیں؟ ہشام نے جواب دیا: یہ کوفیوں کے نبی ہیں' اپنے آپ کو رسول اللہ کا فرزند' علم کو شگافتہ کرنے والا اور مفسر قرآن سمجھتے ہیں۔(۵)

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ ہشام نے آپ کو "**المفتون به اهل العراق.**" (وہ شخص جس کے اہل عراق شیفتہ ہیں) کہا تھا۔(۶)

علما کی جانب سے آپ کی اس قدر تمجید و تعظیم کے بعد: **ليس يروى عن الباقر من يُحْتَجُّ به.** (امام محمد باقرؑ

۱۔ الامام الصادقؑ والمذاہب الاربعہ۔ ج ۲۔ ص ۴۳۵' اعیان الشیعہ۔ ج ۳۔ قسم ۲۔ ص ۲۰

۲۔ المناقب ابن شہر آشوب۔ ج ۳۔ ص ۲۷

۳۔ مناقب آل ابی طالب۔ ج ۳۔ ص ۳۲۷' بحار الانوار۔ ج ۴۶۔ ص ۲۹۴

۴۔ الامام الصادقؑ۔ ص ۲۲

۵۔ بحار الانوار۔ ج ۴۶۔ ص ۳۵۵ از مناقب' کافی۔ ج ۸۔ ص ۱۲۰

۶۔ نور الابصار۔ ص ۱۴۳' سیر اعلام النبلاء۔ ج ۴۔ ص ۴۰۵' مختصر تاریخ دمشق۔ ج ۲۳۔ ص ۷۹

سے روایت کرنے والے افراد قابلِ قبول نہیں)۔(۱) کہنے کی وجہ بے عقلی کی انتہا ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام کے بارے میں اس قسم کے ناروا اظہار رائے کی وجہ بہت سے غیر شیعہ محدثین کی تنگ نظری ہے۔ جب بھی وہ کسی کو اہلِ بیتؑ اور ان کے علوم کی طرف معمولی سی بھی توجہ دیتا ہوا دیکھتے ہیں' تو چاہے وہ شخص شیعہ ہو یا نہ ہو' اُن کی نظر میں حجیت اور علمی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے' یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ اہلِ سنت کے جو محدثین اپنی حدیث کی کتابوں میں امام محمد باقرؑ کی اس قدر احادیث نقل کرتے ہیں' وہ ابن سعد کی تعصب زدہ نظر میں کس طرح ان لوگوں میں شامل ہیں جن کو حجت نہیں سمجھا جا سکتا۔ جیسا کہ پہلے اشارہ ہو چکا ہے' سفیان ثوری' اوزاعی' ابو حنیفہ اور کچھ دوسرے افراد بھی جن کے نام تہذیب التہذیب میں ابن حجر نے بیان کیے ہیں' ان میں شامل ہیں۔

امام محمد باقرؑ اور اسلامی فرقوں کے درمیان فقہی اختلافات

سن ۹۴ ہجری سے لے کر ۱۱۴ ہجری تک کے درمیانی سال وہ زمانہ ہے جس میں مختلف فقہی مشرب پیدا ہوئے اور تفسیر کے بارے میں نقلِ حدیث اپنے عروج پر تھی۔ علمائے اہلِ سنت میں سے ابن شہاب زہری' مکحول' قتادہ' ہشام بن عروہ وغیرہ حدیث نقل کرنے اور فتویٰ دینے میں مشغول تھے۔ زہری' ابراہیم نخعی' ابو الزناد' رجاء بن حیاۃ جیسے علما' جو سب کے سب کوئی کم کوئی زیادہ اموی حکام سے وابستہ تھے' اُن کی اس وابستگی کی وجہ سے ایک اہم ضرورت اس بات کی تھی کہ پیغمبر اسلام کی اس حقیقی سنت کو زندہ کیا جائے جس میں خلفا اور ان سے وابستہ علما کی عمدی تحریف کا شائبہ تک نہ ہو' امام محمد باقرؑ نے سعد الخیر کے نام ایک خط میں علمائے سوء کی شکایت کرتے ہوئے فرمایا:

"فاعرِف اشباه الاحبار و الرّهبان الذين ساروا بكتمان الكتاب و تحريفه فما ربحت تجارتهم و ما كانوا مهتدين. ثم اعرف اشباههم من هذه الأُمّة الذين اقاموا حروف الكتاب و حرّفوا حدوده' فهم مع السادة و الكُبَرة' فاذا تفرقت قادة الاهواء كانوا مع اكثرهم دنيًا و ذلك مبلغهم من العلم."(۲)

"احبار و رُہبان جیسے ان لوگوں کو دیکھو' وہ احبار جنھوں نے کتاب خدا کو لوگوں سے چھپایا اور اس میں تحریف کی اور اس کے باوجود ان کی اس تجارت کا کوئی فائدہ نہ ہوا اور نہ وہ ہدایت پا سکے۔ اب انہی جیسے لوگ اس امت میں ہیں' جو قرآن کے الفاظ کی تو حفاظت کرتے ہیں' لیکن اس کے حدود میں تحریف کرتے

۱۔ طبقات الکبریٰ۔ ج ۵۔ ص ۳۲۲۔ اس کے راوی قابلِ قبول افراد نہیں ہیں۔

۲۔ روضۃ الکافی۔ ص ۷۷

ہیں۔ یہ لوگ سرداروں اور بڑے لوگوں کے ساتھ ہیں۔ جب خواہشات کے پجاری یہ رہبر متفرق ہوں گے تو یہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن کے پاس زیادہ دنیا ہوگی۔ ان کا علم بس اسی قدر ہے۔"

اس زمانے میں نقل ہونے والی بکثرت روایات اور اس دور کے محدثین کے درمیان علمِ فقہ کی شہرت کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اہلِ سنت میں اس کے بعد علمِ فقہ تدوین کے مرحلے میں داخل ہوا تھا۔ واقعۂ کربلا کے بعد سیاسی تناؤ کو ختم کرنے اور ابن زبیر کی شکست اور اس کے خاتمے اور مروانیوں کے مکمل اقتدار نے مجبوراً بہت سے علما کو سیاست سے دور کر کے درس و حدیث کے میدان میں داخل کر دیا اور انہیں اس بات پر ابھارا کہ وہ کسی نہ کسی صورت سے روایات کے اختلاف کو حل کریں اور لوگوں کے لیے فقہی فتاویٰ صادر کریں۔ پہلی بار سن ۱۰۰ ہجری میں عمر بن عبدالعزیز نے ابوبکر بن حزم کے نام احادیث کی تدوین کا فرمان جاری کیا۔(۱) یہ خود اس بات پر بہترین دلیل ہے کہ دوسری صدی کے آغاز میں امام محمد باقرؑ کے دور میں اہلِ سنت نے علمی کوششوں کا آغاز کیا۔ لہٰذا امامؑ نے اس بات کو محسوس کیا کہ مختلف وجوہات کی بنا پر اہلِ سنت کی احادیث میں جو انحرافات شامل ہو گئے ہیں ان کے مقابلے میں اہلِ بیتؑ کے فقہی نظریات کے اظہار اور نشر و اشاعت کے ذریعے اپنے مؤقف کا اظہار کیا جائے۔ اگرچہ اس دور تک شیعہ فقہ کا نقطۂ نظر محدود سطح پر اور اذان، تقیے، نمازِ میت وغیرہ کی حد تک واضح ہو چکا تھا، لیکن امام محمد باقرؑ کے ذریعے اس سلسلے میں اہم قدم اٹھایا گیا اور شیعوں کے درمیان ایک لائقِ تحسین علمی و فکری تحریک شروع ہو گئی۔ اسی زمانے میں شیعوں نے اپنے علوم (جو فقہ، تفسیر اور اخلاق پر مشتمل تھے) کی تدوین کا آغاز کیا۔

اس سے پہلے اسلامی معاشرے میں فقہ اور فقہی احادیث وسیع پیمانے پر اور مکمل طور پر بے اعتنائی کا شکار تھیں۔ سیاسی کشاکش اور شدید مادّی افکار جو دربار پر مسلط تھے، وہ لوگوں کے درمیان خود دین اور خصوصاً فقہ سے غفلت کا سبب بن گئے تھے۔ خلیفۂ اوّل اور دوم کے حکم سے حدیث کی تدوین پر پابندی، فقہ کی گوشہ نشینی کے اہم ترین اسباب میں سے تھی؛ وہ فقہ جس کا کم از کم اسّی فیصد حصہ پیغمبر اکرمؐ سے روایت شدہ احادیث پر مبنی تھا۔ ذہبی نے حضرت ابوبکر سے نقل کیا ہے:

"فلا تحدّثوا عن رسول اللّٰہ(ص) شیئاً فمن سالکم فقولوا: بیننا و بینکم کتاب اللّٰہ فاستحِلّوا حلالہ و حرّموا حرامہ." (۲)

"رسول اللہؐ سے کوئی چیز نقل نہ کرو اور جو کوئی تم سے کسی مسئلے کا حکم پوچھے اس سے کہہ دو کہ: ہمارے درمیان

۱۔ المصنف۔ ج ۹۔ ص ۳۳۷؛ سنن الدارمی۔ ج ۱۔ ص ۱۲۶؛ تقیید العلم۔ ص ۱۰۵ اور ۱۰۶

۲۔ تذکرۃ الحفاظ۔ ج ۱۔ ص ۲

کتابِ خدا (قرآن) موجود ہے اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام سمجھو۔"

اس بارے میں حضرت عمر سے بھی یہ نقل کیا گیا ہے:

"اقلّوا الرِّوایۃَ عن رسول اللہ و انا شریککم." (۱)

"رسولِ خداؐ سے کم حدیثیں نقل کرو اس عمل میں میں بھی تمہارے ساتھ شریک ہوں۔"

معاویہ سے نقل کیا جاتا ہے کہ انہوں نے کہا:

"علیکم من الحدیث بما کان فی عھد عمر فانّہ کان قد اخاف النّاسَ فی الحدیث عن رسول اللہ(ص)." (۲)

"رسولِ خداؐ سے جو روایات عمر کے دور میں روایت کی گئی ہیں انہی پر اکتفا کرو کیونکہ عمر لوگوں کو پیغمبر اکرمؐ کی احادیث نقل کرنے سے ڈراتے تھے۔"

لوگوں کی بے خبری اس وقت اپنی انتہا کو پہنچ گئی جب اسلامی فتوحات کا آغاز ہوا۔ حکمران طبقہ اور عوام الناس اس طرح کشور کشائی، جنگی امور اور مالی معاملات میں مشغول ہو گئے کہ کوئی بھی کسی بھی طرح کی علمی سرگرمیوں اور دینی تربیت سے دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ جب ابن عباس نے ماہِ رمضان کے آخر میں فتوحات کے مراکز میں سے ایک اہم مرکز بصرہ میں منبر پر جا کر کہا کہ: أخرجوا صدقۃَ صومِکم. (اپنے روزے کا صدقہ نکال دو) تو لوگوں نے ان کی بات نہیں سمجھی۔ لہٰذا ابن عباس نے کہا: مدینہ کے جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ کھڑے ہو جائیں اور دوسروں پر روزے کے صدقے کا مفہوم واضح کریں: فانھم لا یعلمون من زکاۃ الفطرۃ الواجبۃ شیئاً. (یہ لوگ زکاتِ فطرہ واجب کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے)۔ (۳)

بعد از آں بنی امیہ کے دورِ اقتدار میں دین سے اس ناواقفیت میں مزید شدت پیدا ہو گئی۔ جیسا کہ ڈاکٹر علی حسن لکھتے ہیں: بنی امیہ کا دور جس میں دینی امور پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی تھی اس دور میں لوگ فقہ اور دینی مسائل سے ناواقف تھے اس بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے اور صرف اہلِ مدینہ اس قسم کے مسائل سے واقفیت رکھتے تھے۔ (۴)

کچھ دوسرے منابع (sources) میں بھی لکھا ہے کہ پہلی صدی ہجری کے دوسرے نصف میں لوگ حتیٰ نماز

۱۔ تذکرۃ الحفاظ۔ ج ۱۔ ص ۷

۲۔ ایضاً

۳۔ الاحکام فی الاصول الاحکام۔ ج ۲۔ ص ۱۳۱

۴۔ نظرۃ عامۃ فی تاریخ الفقہ الاسلامی۔ ص ۱۱۰

پڑھنے اور حج کی ادائیگی کے طریقے سے بھی ناواقف تھے۔(۱)

انس بن مالک اپنے زمانے کے بارے میں کہا کرتے تھے: ما اعرف شیئاً ممّا كان على عهد رسول الله. قيل: الصلاة؟ قال: أليس صنعتم ما صنعتم فيها. (جو چیزیں رسول اللہؐ کے زمانے میں معمول تھیں، اُن میں سے مجھے کچھ بھی نظر نہیں آتیں۔ کہا گیا: نماز؟ بولے: تم نے کیا کیا تحریفیں اس نماز میں نہیں کی ہیں!)۔(۲)

یہ سب عامۃ المسلمین میں فقہ کو بھلا بیٹھنے کی دلیل ہے۔ اور یہی امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام کے فقہ کی جانب توجہ دینے، اسے لوگوں کے درمیان از سرِ نو زندہ کرنے اور فقہ کی تدوین اور اس کی دوبارہ نگارش میں داخل ہونے والی تحریف کی روک تھام کے لیے سرگرمِ عمل ہونے کا اہم ترین سبب ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام مکتبِ اہلِ بیتؑ کے نمائندے اور مکتبِ تشیع کے نقطۂ نظر سے تفسیر اور فقہ کے اوّلین بانیوں میں سے ہیں۔ اس مکتب کے مطابق حقیقی اسلامی علوم تک دسترس صرف اہلِ بیتؑ کے راستے ہی سے ممکن ہے جو علمِ رسول کا دروازہ ہیں، اور اسی لیے امام محمد باقر علیہ السلام کے کلمات میں ایسے بکثرت نمونے ملتے ہیں جن میں آپ لوگوں کو اہلِ بیتؑ کے علم سے استفادے کی دعوت دیتے ہیں اور درست حدیث کو صرف انہی کے پاس قرار دیتے ہیں۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ آپ سلمة بن كُهَيل اور حَكَم بن عُتَيبَہ سے فرماتے تھے:

"شرّقا أو غرّبا فلا تجدا علماً صحيحاً الّا شيئاً خرج من عندنا." (۳)

"مشرق اور مغرب میں جا کر کھنگال ڈالو، تمہیں ہمارے علم کے سوا صحیح علم کہیں نہیں ملے گا۔"

اسی طرح ایک اور کلام میں اس زمانے کے مشہور علما میں سے ایک حسن بصری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "فليذهب الحسن (يعني البصري) يميناً و شمالاً فو الله ما يوجد العلم الّا ههنا." (حسن بصری جہاں چاہے چلا جائے، خدا کی قسم ہمارے سوا اسے کہیں اور سے علم نہیں ملے گا)۔(۴)

ایک اور روایت میں آیا ہے:

"فليذهب الناس حيث شاؤوا فو الله ليس الأمر الّا من ههنا." (وأشار الى بيته)."

۱۔ کشف القناع فی حجیۃ الاجماع۔ ص ۵۶

۲۔ ضحی الاسلام۔ ج ۱۔ ص ۳۸۶۔ نقل از بخاری و ترمذی، دیکھئے: جامع البیان العلم۔ ج ۲۔ ص ۲۴۴، دراسات و بحوث فی التاریخ والاسلام۔ ج ۱۔ ص ۵۶۔ ۵۷

۳۔ اختیار معرفۃ الرجال۔ ص ۲۰۹۔ ۲۱۰، کافی۔ ج ۱۔ ص ۳۹۹، بصائر الدرجات۔ ص ۹

۴۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۵۱، وسائل الشیعہ۔ ج ۱۸۔ ص ۴۲

"لوگ جہاں چاہیں چلے جائیں خدا کی قسم یہ امر یہاں کے سوا کہیں اور نہیں ملے گا(۱)۔ اور اپنے گھر کی طرف اشارہ فرمایا۔"

آپ کے یہ کلمات کھلے لفظوں میں لوگوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ حقیقی دینی معارف کے حصول کے لیے عترت کو معیار قرار دیں۔ اس دعوت کو قبول کرنا تشیع کو قبول کرنے کے مترادف تھا۔ امام محمد باقر علیہ السلام کی ایک اور گفتگو میں ہے:"آل محمد ابواب الله والدعاة الی الجنة و القادة الیها." (آل محمد علوم الٰہی کے دروازے جنت کی طرف بلانے والے اور اس کی جانب لوگوں کو بڑھانے والے ہیں)۔(۲)

ان کلمات کو اتنی تفصیل کے ساتھ بیان کرنے سے ہمارا مقصد اس نکتے کی وضاحت ہے کہ ان جملوں نے تاریخی اعتبار سے تشیع کی تشکیل میں اپنا ایک خاص کردار ادا کیا ہے۔

جیسا کہ امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل ہونے والی ایک اور روایت میں آیا ہے:"ایها الناس این تذهبون و این یراد بکم؟بنا هدی الله أوّلکم و بنا ختم آخرکم." (اے لوگو! کہاں جارہے ہو اور کہاں لے جائے جارہے ہو؟ تمہیں ابتدا میں بھی اللہ نے ہمارے ذریعے سے ہدایت دی اور تمہارا اختتام بھی ہم ہی پر ہو گا)۔(۳)

جب ہشام مدینہ آیا تو امامؑ نے اپنی تقریر میں فرمایا:"الحمد لله الذی بعث محمد بالحق نبیًا و اکرمنا به نحن صفوة الله علی خلقه و خیرته علی عباده و خلفائه فالسعید من اتّبعنا و الشّقی من عادانا و خالفنا." (حمد اس خدا کے لیے جس نے محمد کو برحق نبی مبعوث کیا اور ہمیں ان کے ذریعے عزت و احترام دیا۔ پس ہم خدا کی مخلوق میں سے اس کے منتخب اور اس کی جانب سے منصوب خلفا ہیں۔ خوش بخت وہ ہے جو ہماری پیروی کرے اور بدبخت وہ ہے جو ہم سے دشمنی رکھے اور ہماری مخالفت کرے)۔(۴)

امام محمد باقر علیہ السلام مکتب اہل بیتؑ کے نمائندے کی حیثیت سے دوسروں کے ساتھ اپنے مناظروں میں اس بات کی کوشش کیا کرتے تھے کہ اہل بیتؑ کی فقہی آراء کی ترویج کریں اور ساتھ ہی ساتھ جہاں اہل سنت انحراف کا شکار ہوئے ہیں اسے واضح کر کے لوگوں کے لیے اس کی نشاندہی کریں۔ امامؑ اپنے زمانے کے چوٹی کے علما کی رائے کے مطابق صحیح اور غلط کی پہچان کا معیار تھے اور بکثرت مواقع پر ایسا ہوا ہے کہ وہ اپنے عقائد آپ کے سامنے پیش کرتے تھے،

۱۔ کافی۔ ج۱۔ ص۳۹۹ بصائر الدرجات۔ ص۱۲
۲۔ تفسیر العیاشی۔ ج۱۔ ص۸۶ وسائل الشیعہ۔ ج۱۸۔ ص۹
۳۔ کافی۔ ج۱۔ ص۴۷۸
۴۔ دلائل الامامہ۔ ص۱۰۴ بحار الانوار۔ ج۴۶۔ ص۳۰۶

تا کہ ان کی صحت اور سقم سے واقف ہوسکیں۔ امام کے ابوحنیفہ کے ساتھ ہونے والے ایک مناظرے کا احوال نقل کرنے کے بعد ابوزہرہ نے یوں لکھا ہے: "اس خبر سے امام محمد باقر علیہ السلام کی امامت علما کے لیے واضح ہوگئی۔ یہ لوگ آپ کی خدمت میں آیا کرتے اور آپ ان کے عقائد اور نظریات پر تنقید کرتے۔ گویا آپ ایک ایسے سربراہ تھے جو اپنے ماتحتوں پر حکمرانی کرتا ہو تا کہ انہیں راہ ہدایت پر چلائے۔ اور اس زمانے کے علما آپ کی سربراہی کے آگے سر تسلیم خم کیے ہوئے تھے اور آپ کی اطاعت کیا کرتے تھے۔"

ایک مرتبہ عبداللہ بن معمر (عمیر) لیثی امام محمد باقر علیہ السلام کے پاس آیا اور آپ سے پوچھا: یہ جو مشہور ہے کہ آپ نے متعہ کے حلال ہونے کا فتویٰ دیا ہے، کیا یہ درست ہے؟ امام نے فرمایا: "**احلّها اللّٰهُ فی کتابه و سنّها رسول الله و عملَ بها اصحابه.**" (خدا نے اسے اپنی کتاب میں حلال قرار دیا ہے، سنت پیامبر اُس پر برقرار رہی ہے اور آپ کے اصحاب نے اس پر عمل کیا ہے)۔(۱)

عبداللہ نے کہا: لیکن عمر نے اس سے منع کیا ہے۔ امام نے جواب دیا: "**فانتَ علی قول صاحبک و انا علی قول رسول الله (صلی الله علیه و آله وسلم).**" (تم اپنے دوست کے فتوے پر عمل کرو اور میں رسول اللہ کے حکم پر عمل کروں گا)۔(۲)

جیسا کہ ہم نے دیکھا، امام نے کتاب وسنت کی بنیاد پر استدلال کیا اور جو لوگ اس کے علاوہ دوسری چیزوں سے استدلال کرتے اور انہیں سند قرار دیتے، امام ان کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ درج ذیل روایت امام کی اسی روش کی نشاندہی کرتی ہے:

> "مکحول بن ابراہیم، قیس بن ربیع سے روایت کرتے ہیں: میں نے ابواسحاق سے جوتوں پر سے مسح کے بارے میں پوچھا۔ اُنہوں نے جواب دیا: میں لوگوں کو جوتوں پر سے مسح کرتے دیکھا کرتا تھا، یہاں تک کہ میری ملاقات بنی ہاشم کے ایک فرد سے ہوئی، جو محمد بن علی بن الحسینؑ (امام محمد باقرؑ) تھے، میں نے اُن سے جوتوں کے اوپر سے مسح کے بارے میں پوچھا، تو انہوں نے فرمایا: "**لم یکن امیر المؤمنین یمسح علیها (و کان یقول): سبق الکتاب المسح علی الخفین.**" (امیر المومنین علیؑ جوتوں پر سے مسح نہیں کیا کرتے تھے (اور آپ فرماتے تھے): کتاب خدا نے بھی اسے تجویز نہیں کیا ہے)۔(۳)

۱۔ الامام الصادق۔ ص ۲۴

۲۔ نثر الدر۔ ج ۱۔ ص ۳۴۴، کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۳۶۲، بحار الانوار۔ ج ۴۶۔ ص ۳۵۶، اور دیکھیے: المیزان۔ ج ۴۔ ص ۲۸۹

۳۔ الامام الصادق والمذاہب الاربعہ۔ ج ۲۔ ص ۴۵۲

اس کے بعد ابو اسحاق اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں: جب سے مجھے امامؑ نے منع کیا ہے، میں نے جوتوں پر سے مسح نہیں کیا۔ قیس بن ربیع کہتے ہیں: میں نے بھی جب سے ابو اسحاق سے یہ مسئلہ سنا ہے، جوتوں پر سے مسح نہیں کیا۔"

کتاب و سنت کی بنیاد پر امامؑ کے مضبوط استدلال نے نہ صرف ابو اسحاق بلکہ قیس بن ربیع کو بھی آپ کی بات قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔

ایک اور موقع پر جب نافع مولی عمر نے کسی حکم پر استدلال کی غرض سے ایک حدیث کو نقل کیا اور غلط صورت سے اس کی روایت کی تو امامؑ نے اس تحریف سے پردہ اٹھایا اور حدیث کو صحیح شکل میں روایت کیا۔(۱) امامؑ نے اس کا ایسی حالت میں انکار کیا جبکہ وہ لوگوں کے درمیان بیٹھا فتویٰ دے رہا تھا۔

امام محمد باقر علیہ السلام کے اصحاب بھی فقہی مسائل میں ابوحنیفہ کے کمزور دلائل کے مقابل اٹھ کھڑے ہوتے تھے، اور فقہی اعتبار سے ان کی مخالفت کیا کرتے تھے۔(۲)

امام محمد باقر علیہ السلام نے ان لوگوں کے دلائل کو سختی کے ساتھ مسترد کیا جو قیاس سے کام لیا کرتے تھے (۳) اور آپ کے بعد آپ کے فرزند امام جعفر صادق علیہ السلام نے بھی ان لوگوں کی مخالفت جاری رکھی۔ امام محمد باقر علیہ السلام نے تمام منحرف اسلامی فرقوں کے خلاف سخت رویہ اختیار کیا اور اپنے اس طرزِ عمل کے ذریعے مختلف میدانوں میں اہلِ بیتؑ کے صحیح اعتقادات کو دوسرے فرقوں کے مقابل واضح اور ممتاز کرنے کی کوشش کی۔

مرجئہ کے خلاف امامؑ کا موقف انتہائی دوٹوک اور حساس تھا۔ اس درست بات سے قطع نظر کہ زبانی ایمان ایک انسان کو اسلامی معاشرے میں مسلمانوں کے تمام حقوق سے بہرہ مند کر دیتا ہے، بعض مرجئہ حقیقی ایمان کو بھی ایک باطنی اعتقاد کے سوا کچھ اور نہیں سمجھتے تھے اور اس میں عملِ صالح کی کسی حیثیت کے قائل نہ تھے۔ علاوہ ازیں مرجئہ امیر المومنینؑ کے دشمنوں کے بارے میں شیعہ عقائد کے بھی مخالف تھے۔ ایک مقام پر امامؑ اس فرقے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں: "اَللّٰھم العن المرجئة فانّھم أعداء نا فی الدنیا و الآخرة." (بارالٰہا! مرجئہ کو اپنی رحمت سے دور رکھ کہ یہ لوگ دنیا اور آخرت میں ہمارے دشمن ہیں)۔(۴)

۱۔ دعائم الاسلام۔ ج ۲۔ ص ۲۶۰، مستدرک الوسائل۔ ج ۱۵۔ ص ۲۸۵، ۲۸۶، ۳۰۰

۲۔ دعائم الاسلام۔ ج ۱۔ ص ۹۵، مستدرک الوسائل۔ ج ۱۵۔ ص ۲۸۶۔ ۲۸۷

۳۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۱۸۔ ص ۳۹

۴۔ کافی۔ ج ۸۔ ص ۲۷۶، بحار الانوار۔ ج ۳۶۔ ص ۲۹۱

امامؑ نے خوارج کے خلاف بھی مؤقف اختیار کیا' جو اس زمانے میں ایک خاص کژ وفر کے مالک تھے۔ آپ کی رائے میں وہ لوگ جاہل عبادت گزار' بے عقل مقدسین اور سطحی دیندار تھے' جو اپنے عقائد میں انتہائی متعصب اور تنگ نظر تھے۔ آپ نے ان کے بارے میں فرمایا:

"انّ الخوارج ضیّقوا علی انفسهم بجهالتهم انّ الدین أوسع من ذلک."

"خوارج نے اپنی جہالت کی وجہ سے دین کو انتہائی محدود قرار دیا ہوا تھا' جبکہ دین میں ان کے تصور سے کہیں زیادہ وسعت پائی جاتی ہے۔"(۱)

یہودیوں اور اسرائیلیات سے مقابلہ

اس زمانے کے اسلامی معاشرے کی علمی فضا پر گہرے اثرات مرتب کرنے والے خطرناک گروہوں میں سے ایک یہودی بھی تھے۔ یہودیوں کے کچھ احبار (یہودی علما) جو بظاہر مسلمان ہو گئے تھے اور کچھ دوسرے لوگ جو ابھی تک اپنے دین پر باقی تھے' اسلامی معاشرے میں پھیل گئے تھے' اور انہوں نے سادہ لوح مسلمانوں کی علمی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ اسلامی علوم پر انہوں نے جو اثر ڈالا وہ اسرائیلیات کے نام سے جعلی احادیث کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ان احادیث کا زیادہ تر حصہ تفسیر اور انبیائے سلف کی زندگی اور ان کی سیرت کے بارے میں گھڑا گیا تھا۔ مسلمان علما میں سے جن لوگوں نے ان اسرائیلیات کو اپنی تالیفات میں جگہ دی' ان میں مشہور مفسر طبری بھی شامل ہے' جس نے تفسیر قرآن کے بارے میں اکثر روایات کو (بالواسطہ یا بلاواسطہ) یہودیوں کی کتب سے حاصل کیا ہے۔

یہودیوں کی ان علمی کاوشوں نے (اسلامی معاشرے کے اندر خاص طور پر مسلمانوں کی علمی محافل میں) فقہی اور اعتقادی مسائل پر بھی تشویش ناک اثر مرتب کیا۔ یہ بات تاریخ میں اس قدر واضح ہے کہ اس میں معمولی سے بھی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔(۲)

یہودیوں اور اسلامی تعلیمات میں ان کی طرف سے داخل کی گئی ناشائستہ باتوں کے خلاف مزاحمت ائمۂ طاہرینؑ کے لائحۂ عمل کا ایک اہم حصہ تھا۔ انبیائے الٰہی کے بارے میں یہودیوں کی گھڑی ہوئی جھوٹی احادیث اور ان آسمانی ہستیوں کے چہرے داغدار ہونے کا باعث بننے والی باتوں کی تکذیب' ائمۂ معصومینؑ کے لائحۂ عمل اور انداز کار میں بخوبی دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہاں ہم اس سلسلے کے دو نمونوں کی جانب اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ التہذیب۔ ج۱۔ ص۲۴۱' من لا یحضرہ الفقیہ۔ ج۱۔ ص۸۳

۲۔ بحوث مع اہل السنۃ والسلفیہ۔ ص۵۰۔۵۱

الف: دو افراد حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں ایک تنازع لے کر آئے اور آپ سے اسے حل کرنے کی درخواست کی۔ سورۂ "ص" کی تیئیسویں اور چوبیسویں آیات اسی واقعے کے بارے میں ہیں۔ جو تنازع پیش کیا گیا وہ یہ تھا کہ ان میں سے ایک شخص کے پاس ۹۹ بھیڑیں تھیں اور دوسرے کے پاس صرف ایک بھیڑ تھی۔ جس شخص کے پاس ایک بھیڑ تھی اس نے دوسرے کی شکایت کی کہ اس کا یہ بھائی جس کے پاس ۹۹ بھیڑیں ہیں وہ اس کی ایک بھیڑ پر بھی قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے دوسرے شخص کی کوئی بات سنے بغیر یہ فیصلہ کیا کہ: قَالَ لَقَدْ ظَلَمَکَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِکَ اِلٰی نِعَاجِه.... اس نے تیری بھیڑ کو اپنی بھیڑوں سے ملانے کا سوال کر کے تجھ پر ظلم کیا ہے....

اس بارے میں یہودیوں نے حدیثیں گھڑ کر مسلمانوں کے درمیان رائج کر دیں کہ اس واقعے میں "اوریا" کی بیوی کے ساتھ حضرت داؤد علیہ السلام کی شادی کا اشارہ ہے۔ ان جعلی احادیث کے مطابق' حضرت داؤدؑ ایک کبوتر کا تعاقب کرتے ہوئے چھت پر چلے گئے' وہاں سے آپ کی نگاہ "اوریا" کے گھر میں اس کی بیوی پر پڑ گئی' جسے دیکھ کر (نعوذ باللہ) آپ اس کے عشق میں مبتلا ہو گئے۔ پھر انہوں نے اپنا مقصود حاصل کرنے کے لیے "اوریا" کو محاذ جنگ کے اگلے مورچوں پر بھیج دیا' جہاں وہ مارا گیا اور حضرت داؤدؑ نے اس کی بیوی سے شادی رچالی' اور خداوند متعال نے ان آیات میں علامتی طور پر اس واقعے کا ذکر کیا ہے۔

واضح ہے کہ یہ جھوٹی روایات کس حد تک اور کن کن پہلوؤں سے حضرت داؤدؑ کی پیغمبرانہ شخصیت کو داغدار کر سکتی ہیں۔ یہ احادیث جو اسلام کے ابتدائی دور میں "کعب الاحبار" اور "عبداللہ بن سلام" جیسے لوگوں کے ذریعہ رائج ہوئی تھیں' ان پر علی بن ابیطالبؑ نے بھی تنقید کی ہے۔ آپ نے اس بارے میں فرمایا: "لااُوتی بو جل یزعم انّ داؤد تزوج امرئة اوریا الاّ جلَدْتُهُ حدّین حدّاً للنبوّة وحدّاً للاسلام." (جو شخص اس بات کا معتقد ہوگا کہ حضرت داؤدؑ نے اوریا کی بیوی سے شادی کی تھی' میں اس پر دو حدیں جاری کروں گا' ایک حد توہین نبوت کی اور دوسری حد اسلام کی وجہ سے)۔(۱)

امام علی رضا علیہ السلام بھی اسرائیلی احادیث کی مذمت کیا کرتے تھے۔(۲)

ب: وہ یہودی جو اسلامی معاشرے میں زندگی گزار رہے تھے (چاہے وہ گروہ جو بظاہر مسلمان ہو گیا تھا' یا وہ جو اپنے

۱۔ مجمع البیان۔ ج ۸۔ ص ۴۷۲

۲۔ تفسیر الصافی۔ ج ۴۔ ص ۲۹۵۔ ۲۹۶

دین پر باقی تھے) ان کی کوشش ہوتی تھی کہ مسلمانوں کو یہ باور کرادیں کہ کعبہ پر بیت المقدس (جو یہودیوں کا قبلہ تھا) کو برتری حاصل ہے۔ اس مقصد کی خاطر انہوں نے حدیثیں گھڑیں اور بڑے پیانے پر انہیں مسلمانوں کے درمیان رائج کردیا۔ زرارہ نقل کرتے ہیں: میں امام محمد باقرؑ کی خدمت میں حاضر تھا' امامؑ جو کعبہ کے سامنے تشریف فرما تھے' آپ نے فرمایا: بیت اللہ کی طرف دیکھنا بھی عبادت ہے۔ اسی وقت قبیلۂ بجیلہ کا ایک شخص جسے عاصم بن عمر کہتے تھے' امامؑ کے پاس آیا اور بولا: کعب الاحبار کہتا ہے کہ کعبہ ہر روز بیت المقدس کے سامنے سجدہ کرتا ہے۔ امامؑ نے فرمایا: کعب الاحبار کی اس بات کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ اس شخص نے کہا: کعب ٹھیک کہتا ہے۔ امامؑ نے فرمایا: "کَذَبْتَ وَ کَذَبَ کعب الأحبار معک." (تم بھی اور کعب الاحبار بھی دونوں کے دونوں جھوٹے ہو)۔ اس کے بعد شدید غیظ کے عالم میں فرمایا: "ماخلق اللّٰهُ عزوجل بُقعةً في الأرض أحبَّ إليه منها." (اللہ تعالیٰ نے روئے زمین پر کوئی ایسا مقام پیدا نہیں کیا جو اس کے نزدیک کعبہ سے زیادہ محبوب ہو)۔(۱)

بعد میں شیعوں کے دوسرے ائمہ بھی "لاتشبّهوا باليهود" یعنی یہودیوں کی شباہت اختیار نہ کرو(۲) جیسی عبارتوں کے ذریعے اس بات کی کوشش کیا کرتے تھے کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان پیدا ہونے والے اس ناپسندیدہ علمی رابطے کو توڑا جائے' جو رفتہ رفتہ اسلام کے حقیقی اور بھرپور علمی سرمائے کو انحراف کی طرف لے جارہا تھا۔ جبکہ دوسرے اسلامی فرقوں کے راویوں نے سادہ لوحی کے ساتھ ان احادیث کو قبول کیا' انہیں اپنی کتابوں کے مختلف ابواب میں نقل کیا اور اپنے علمی منابع کو ان سے آلودہ کرلیا۔ لیکن اہلِ بیتؑ کے پیروکاران کے فیضان سے ان انحرافی اور عوام پسند افکار کے مقابل ہوشیار رہے' اور ان کے نقصانات سے محفوظ رہے۔

اس روایت کی طرف بھی اشارہ مناسب ہے کہ اسرائیلی روایات کا ایک راوی محمد بن کعب قرظی اور امام محمد باقر علیہ السلام ایک جگہ ایک ساتھ تھے کہ وہاں ہشام بن عبدالملک کا ذکر چھڑ گیا۔ اس موقع پر قرظی نے امامؑ کو طعنہ دیتے ہوئے کہا: آپ کا گھرانہ تلوار کے ذریعے اپنا مقصد حاصل نہیں کرسکتا۔ اسکے بعد اس نے ایک اسرائیلی روایت نقل کرکے اپنی یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی۔(۳)

۱۔ کافی۔ ج ۴۔ ص ۲۳۹' بحار الانوار۔ ج ۴۶۔ ص ۳۵۴

۲۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۳۔ ص ۵۷۱

۳۔ ربیع الابرار۔ ج ۲۔ ص ۸۳۳۔۸۳۴

امام محمد باقرؑ کی علمی میراث

شیعوں کی فقہی اور تفسیری مسانید پر طائرانہ نگاہ ڈالنے ہی سے یہ بات بخوبی محسوس کی جا سکتی ہے کہ شیعوں کی فقہی، اخلاقی اور تفسیری روایات کا ایک بڑا حصہ امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے۔ وسائل الشیعہ اور تفسیری کتابیں جیسے بحرانی کی البرھان اور فیض کاشانی کی صافی میں بہت سی روایات فقہی مسائل کی تشریح، قرآنی آیات کی توضیح اور ان کی شانِ نزول کے بارے میں ہیں جو امام محمد باقرؑ سے روایت ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ امیر المومنینؑ اور جنگِ صفین کے بارے میں بہت سی تاریخی روایات بھی آپ ہی سے منقول ہیں۔(۱)

اسی طرح اخلاقیات کے موضوع پر بھی امام محمد باقر علیہ السلام کے گہربار اور پُرمغز کلمات نقل کیے گئے ہیں، یہ مختصر جملے انتہائی خوب صورت ہیں اور امامؑ کی روحِ عصمت اور آپ کے باطنی کمالات کا نتیجہ ہیں۔ اربلی نے لکھا ہے کہ انبیا کے بکثرت حالات امام محمد باقرؑ سے نقل ہوئے ہیں اور لوگوں نے آپ سے غزوات کی باتیں بھی نقل کی ہیں اور آپ نے احکام نیز مناسکِ حج کے بارے میں جو کچھ رسولِ مقبولؐ سے نقل کیا ہے اس سے استناد کیا ہے۔ اسی طرح انہوں نے تفسیرِ قرآن میں بھی آپ سے روایات کو تحریر کیا ہے اور شیعہ و سنی سب نے آپ سے حدیث کو نقل کیا ہے۔(۲)

اس بارے میں ابوزہرہ لکھتے ہیں: آپ مفسرِ قرآن اور شارحِ فقہ اسلامی تھے، آپ اوامر و نواہی کے فلسفے سے آشنا تھے اور ان کے انتہائی ہدف سے بھی پوری طرح باخبر تھے۔(۳)

ابوزہرہ امامؑ کے افکار اور اخلاق و اجتماعی افکار و کلمات کے بارے میں لکھتے ہیں: آپ کے کمالِ نفسانی، روشنی قلب اور قوتِ ادراک کی وجہ سے خداوندِ متعال نے آپ کی زبان پر حیرت انگیز حکمتیں جاری کر دیں اور انفرادی و اجتماعی اخلاق کے بارے میں آپ سے ایسی عبارتیں روایت ہوئی ہیں کہ اگر انہیں مرتب کیا جائے تو اخلاق کے میدانوں میں ان سے ایک اہم اور جامع روش وجود میں آ سکتی ہے۔(۴)

امامؑ کے عملی اخلاق سے جو درس حاصل ہوتے ہیں، ان میں سے ایک احمقانہ تقدس کی مخالفت ہے۔ آپ عملاً ان لوگوں کی مخالفت کیا کرتے تھے جن کا یہ گمان تھا کہ مکمل طور پر دنیاوی نعمتوں کو ترک کر دینا اسلامی تقویٰ اور زہد ہے۔ حکم

۱۔ دیکھیے: شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۲۔ ص ۲۱۲۔ ۲۱۳، ۲۲۹۔ ۲۳۳، ۲۸۹ اور ج ۳۔ ص ۳۲۳ اور ج ۳۔ ص ۱۰۶، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱ اور ج ۶۔ ص ۱۳ و دیکھیے: تاریخ طبری۔ ج ۳۔ ص ۲۷، ج ۵۔ ص ۱۷۶۔ ۱۹۷۔ تا شرز الدین

۲۔ کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۱۳۶

۳۔ الامام الصادقؑ۔ ص ۲۳

۴۔ ایضاً

بن عُیَینہ کہتا ہے:

"ایک دن میں ابوجعفر (امام محمد باقرؑ) کی خدمت میں شرفیاب ہوا' میں نے دیکھا کہ آپ ایک آراستہ اور سجے ہوئے کمرے میں تشریف فرما ہیں۔ آپ نے ایک نرم وملائم پیراہن زیب تن کیا ہوا تھا' اور اس کے اوپر ایک رنگین اونی شال ڈالی ہوئی تھی جس کے رنگ کا اثر آپ کے شانے پر بھی ظاہر تھا۔ میں کمرے اور اس کی اس تزئین وآرائش کو دیکھ رہا تھا کہ امامؑ نے مجھ سے فرمایا: تم کمرے کی اس حالت کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ میں نے عرض کیا: اب جبکہ آپ اس حال میں ہیں' تو میں کیا کہہ سکتا ہوں' لیکن ہمارے درمیان یہ کام نوجوان کیا کرتے ہیں۔ فرمایا: اے حَکَم! "جن زینتوں کی اللہ نے لوگوں کو اجازت دی ہے اور جس روزی کو اس نے حلال قرار دیا ہے' اسے کس نے حرام کیا ہے؟" یہ جو تم دیکھ رہے ہو' یہ اسی قسم سے ہے جسے خدا نے لوگوں کے لیے حلال قرار دیا ہے۔ البتہ یہ کمرہ جسے تم دیکھ رہے ہو' میری نئی زوجہ کا ہے' جس سے میں نے حال ہی میں شادی کی ہے۔ میرا کمرہ وہی ہے جو تم جانتے ہو۔" (۱)

کچھ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ تلاشِ معاش' جو بہتر زندگی کے لیے جدوجہد کی علامت ہے' اچھی بات نہیں۔ امام محمد باقر علیہ السلام کے زمانے کا ایک حافظِ قرآن محمد بن منکدر آپ کی توصیف کرتے ہوئے کہتا ہے: میں انہیں نصیحت کرنا چاہتا تھا لیکن انہوں نے مجھے نصیحت کردی۔ پوچھا گیا: کیسے؟ اس نے کہا: ایک دن میں مدینہ سے باہر نکلا' تو وہاں صحرا میں محمد بن علی بن حسینؑ کو دیکھا۔ وہ اپنے بھاری بدن کے ساتھ دو سیاہ فام غلاموں کے ہمراہ کام میں مشغول تھے۔ میں نے دل میں سوچا: سبحان اللہ! قریش کا ایک بزرگ شخص اس وقت اور اس حالت میں حصولِ دنیا کی کوشش میں مشغول ہے' مجھے اسے نصیحت کرنی چاہیے۔ میں ان کے پاس گیا اور کہا: خدا آپ کو سلامت رکھے' اگر آپ کو اس حال میں موت آجائے تو کیا کریں گے؟ فرمایا: اگر اس حال میں میری موت آپہنچے' تو میں اس دنیا سے اطاعتِ الٰہی کی حالت میں رخصت ہوں گا۔ میں کام کر کے اپنے اہل وعیال کو تیرا اور دوسرے لوگوں کا محتاج بننے سے محفوظ رکھتا ہوں۔ میں اس وقت موت آپہنچے سے ڈروں گا جب وہ مجھے خدا کی نافرمانی کی حالت میں آدبوچے۔ میں نے عرض کیا: اے فرزندِ رسولؐ! آپ نے درست فرمایا ہے' میں آپ کو نصیحت کرنا چاہتا تھا' لیکن اُلٹا آپ نے مجھے نصیحت کردی۔ (۲)

۱۔ کافی۔ ج ۶۔ ص ۴۴۶' بحار الانوار۔ ج ۴۶۔ ص ۲۹۲

۲۔ کافی۔ ج ۵۔ ص ۷۳ اور ج ۶۔ ص ۴۴۶' التہذیب۔ ج ۶۔ ص ۳۲۵' الفصول المہمہ۔ ص ۲۱۳' بحار الانوار۔ ج ۴۶۔ ص ۲۹۴ اور دیکھئے: تہذیب التہذیب۔ ج ۹۔ ص ۳۵۲

امام محمد باقر علیہ السلام خصوصاً تفسیر کے بارے میں بے انتہا مشہور ہیں' اسی لیے آپ کی علمی شخصیت کے بارے میں کہا گیا ہے: **لم یظھر عن احد من ولد الحسن و الحسین من العلوم ما ظھر منہ من التفسیر و الکلام و الفتیا و الاحکام و الحلال و الحرام.** (حسنؑ اور حسینؑ کی اولاد میں سے جو کچھ تفسیر' کلام' فتوئی اور حلال وحرام کے احکام کے بارے میں آپ سے صادر ہوا ہے' وہ کسی اور سے صادر نہیں ہوا)۔(۱)

مالک بن اعین جھنی ایک شعر میں امام محمد باقر علیہ السلام کی اس طرح توصیف کرتا ہے:

اذا طلب الناس علم القرآن — کانت قریش علیہ عیالاً

و ان فاہ فیہ ابن بنت النبی — تلقت یداہ فروعاً طوالاً (۲)

''یعنی اگر لوگ قرآن کا علم حاصل کرنا چاہیں' تو جان لیں کہ قریش اس کے اہل وعیال ہیں اور اگر دختر رسولؐ کے فرزند (امام محمد باقرؑ) اس بارے میں لب کھولیں تو اس کی بہت سی فروعات (شاخیں) پیش کردیں گے۔''

کلامی مسائل میں بھی امام محمد باقر علیہ السلام توحید اور صفات خدا (۳) پر مشتمل امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے کئی خطبوں کے راوی ہیں۔ اسی طرح آپ نے شیعوں اور اہل سنت کے درمیان کلامی مسائل میں موجود اختلاف کے بارے میں بہت سے اہم اور باریک نکات کی بھی وضاحت کی ہے۔ اصول کافی میں اس قسم کی متعدد روایات نظر آتی ہیں۔

ابن ندیم نے ''الفہرست'' میں تفسیر سے متعلق ایک کتاب کو امام محمد باقر علیہ السلام سے منسوب کیا ہے اور کہا ہے کہ اسے ابی الجارود زیاد بن منذر نے امامؑ سے نقل کیا ہے۔(۴) ان روایات کا بڑا حصہ تفسیر قمی اور مجمع البیان جیسی عظیم تفسیر میں آیا ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام اور اُن کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام کی انتھک کوششوں سے شیعہ فقہ' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث اور ائمہ علیہم السلام کے قلوب پر ہونے والے غیبی الہامات واشراقات پر تکیہ کرتے ہوئے' اہل

۱۔ المناقب ابن شہر آشوب۔ ج ۳۔ ص ۳۲۷' بحار الانوار۔ ج ۴۶۔ ص ۲۹۴

۲۔ الاتحاف بحب الاشراف۔ ص ۱۴۴' کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۱۲۳' عمدۃ الطالب۔ ص ۱۹۵' الفصول المہمہ۔ ص ۲۱۰۔ ۲۱۱' سیر اعلام النبلاء۔ ج ۴۔ ص ۴۰۴' نور الابصار۔ ص ۱۴۳

۳۔ دیکھیے: حیاۃ الامام الباقرؑ باقر شریف قرشی۔ ج ۱۔ ص ۱۹۰

۴۔ دیکھیے: تاسیس الشیعہ العلوم الاسلام۔ ص ۳۲۷' تفسیر ابی الجارود تفسیر قمی میں درج کی گئی ہے۔ البتہ تفسیر ابی الجارود کی سند کے طریقوں پر محققین نے اعتراض کیا ہے۔ دیکھیے: الذریعہ تفسیر ابی الجارود کی ذیل میں۔

سنت وغیرہ کی فقہ سے پہلے ہی تدوین کے مرحلے تک پہنچ گئی تھی۔ یہاں تک کہ مصطفیٰ عبدالرزاق لکھتے ہیں: ومن المعقول ان یکون الشروع الی تدوین الفقه کان اسرع الی الشیعة لأنّ اعتقادهم العصمة فی أئمّتهم أوما یشبه العصمة کان حریاً الی تدوین اقضیتهم و فتاویهم. (یہ معقول دکھائی دیتا ہے کہ دوسرے فرقوں کی نسبت شیعہ فقہ کی تدوین جلد شروع ہوئی۔ کیونکہ شیعوں کا اپنے ائمہ کی عصمت کا عقیدہ رکھنا یا انہیں معصوم جیسا سمجھنا اس بات کا تقاضا کرتا تھا کہ اُن کے پیروکار اُن کے فیصلوں اور اُن کے فتووں کو جمع کریں)۔(۱)

یہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فقہی میراث تھی' جو اہلِ بیتِ عصمتؑ کے راستے مستحکم طور پر ہم تک پہنچی ہے۔ اہلِ سنت جو احادیث امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں' ان کی سند وہ عام طور پر آپ کے آباؤ اجداد سے ملاتے ہوئے رسولِ اللہ تک پہنچاتے ہیں' لیکن شیعہ امام محمد باقرؑ اور دوسرے ائمہ کی امامت اور عصمت کا عقیدہ رکھنے کی وجہ سے سند کا ذکر ضروری نہیں سمجھتے۔ خود امام محمد باقرؑ سے جب ان احادیث کے بارے میں سوال کیا گیا جنہیں آپ بغیر سند کے رسول اللہؐ سے نقل فرماتے تھے' تو آپ نے فرمایا: "اذا حدّثتُ بالحدیث ولم اُسنده' فسندی فیه الی زین العابدین' عن ابیه الحسین الشهید عن ابیه علی بن ابیطالب عن رسول الله عن جبریل عن الله تعالیٰ." (جب میں کسی حدیث کی روایت کروں' لیکن اُس کی سند کا ذکر نہ کروں' تو ایسے موقع پر میری سند یہ ہوتی ہے کہ میرے والد زین العابدینؑ نے اپنے والد حسین شہیدؑ سے اور انہوں نے اپنے والد علی ابن ابی طالبؑ سے اور انہوں نے رسول اللہؐ سے اور انہوں نے جبرئیل سے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ سے روایت کی ہے)۔(۲)

دوسرے ائمہ کی طرح امام محمد باقر علیہ السلام نے بھی دینی اعتبار سے اہلِ بیتؑ کے مقام اور ان کی منزلت کی اہمیت واضح کرنے کے سلسلے میں بھرپور کوشش کی۔ اس بارے میں آپ سے نقل ہونے والی ایک روایت میں یوں آیا ہے: "آل محمد ابواب الله وسبیله و الدّعاة الی الجنّة و القادة الیها." (آلِ محمد علومِ الٰہی کے دروازے' رضائے الٰہی تک پہنچنے کا راستہ' جنت کی طرف بلانے والے اور لوگوں کو اس کی جانب بڑھانے والے ہیں)۔(۳)

نیز آپ سے روایت ہے: "کلُّ شیء لم یخرج من هذا البیت فهو وبالٌ." (جو چیز اس گھر سے نہیں نکلی وہ وبال سے خالی نہیں ہوگی)۔(۴)

۱۔ تمہید لتاریخ الفقہ الاسلامی۔ ص۲۰۳

۲۔ الامالی۔ ص۴۲' اعلام الوریٰ۔ ص۴۳۶

۳۔ تفسیر العیاشی۔ ج۱۔ ص۸۶' وسائل الشیعہ۔ ج۱۸۔ ص۹

۴۔ المیزان۔ ج۳۔ ص۶۷ از کافی

درحقیقت آپ علوم پیغمبر کو حضرت علیؑ کے توسط سے لوگوں کے لیے روایت کیا کرتے تھے اور یہ وہ زمانہ تھا جب مکحول (۱) جیسے لوگ امیر المومنین حضرت علیؑ سے کوئی حدیث نقل کرتے تھے تو خوف کی وجہ سے آپ کو ابوزینب کہا کرتے تھے۔ اسی بنیاد پر ہمیں احادیث رسول اللہؐ کے واحد وارث شیعہ ہی نظر آتے ہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اس میراث کی ایک ایک چیز کی سند قرآن مجید ہے۔ لہٰذا امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے: "اذا حدّثتکم بشیءٍ فسالونی عن کتاب اللّٰہ." (جب میں تمہارے لیے کوئی حدیث نقل کروں' تو اس کی کتاب خدا سے مطابقت کے بارے میں مجھ سے سوال کیا کرو)۔(۲)

یہ امام محمد باقر علیہ السلام کی میراث ہی ہے جو حدیث کی تحریفات سے شیعوں کے محفوظ رہنے کا سبب بنی۔ جبکہ حدیث کے نہ لکھنے اور دوسرے اسباب کی بنا پر ان تحریفات کے لیے زمین ہموار ہو چکی تھی۔ امام محمد باقرؑ نے متعدد طریق سے رسول اللہؐ سے نقل ہونے والی حدیث "علیٌّ اقضاکم." (علیؑ تم میں بہترین قضاوت کرنے والے ہیں) کی بنیاد پر اس بات کی کوشش کی کہ ایک سنی عالم کو امیر المومنینؑ کے احکامِ قضائی قبول کرنے پر مجبور کردیں اور اس عالم کے اس نظریے کو باطل ثابت کردیں کہ دوسروں کے احکام قضائی پر عمل کرنا جائز ہے۔(۳) اسی طرح آپ بعض اوقات ان علوم کو دو ٹوک انداز میں باطل قرار دیتے تھے جو بعض صحابہ سے نقل ہوئے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ احکام کو "اسلامی" اور "جاہلی" میں تقسیم کرنے کے بعد فرمایا: "اُشھِدُکم علی زید بن ثابت لقد حَکَمَ فی الفرائض باحکام الجاھلیة." (میں تمہیں زید بن ثابت پر گواہ ٹھہراتا ہوں کہ انہوں نے میراث کے مسئلے میں احکامِ جاہلیت کے مطابق حکم دیا ہے)۔(۴)

امام محمد باقرؑ کے نقطۂ نظر سے شیعوں کی صورتحال

امام محمد باقر علیہ السلام کا دورِ امامت وہی دور تھا جب بنی امیہ اور ان کے حکام کی جانب سے عراق کے شیعوں پر شدید دباؤ جاری تھا۔ عراق' شیعوں کا اصل مرکز تھا' اسی لیے امام محمد باقرؑ کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ: المَفتون به اهل العراق (وہ شخص جس کے اہل عراق شیفتہ ہیں)۔(۵)' امام اهل العراق (اہل عراق کے امام)۔(۶) یا "الذی قد

۱۔ ابن ابی الحدید نے کہا ہے کہ وہ امیر المومنینؑ سے بغض رکھتا تھا۔ دیکھئے: الاختصاص' ص ۱۲۸

۲۔ المیزان۔ ج ۳۔ ص ۷۶ بنقل از کافی

۳۔ التہذیب۔ ج ۶۔ ص ۲۲۰۔ ۲۲۱' کافی۔ ج ۷۔ ص ۴۰۸' وسائل الشیعہ۔ ج ۱۸۔ ص ۸۔ ۹

۴۔ کافی۔ ج ۷۔ ص ۴۰۷' التہذیب۔ ج ۶۔ ص ۲۱۷

۵۔ ارشاد۔ ص ۲۸۲

۶۔ اعیان الشیعہ۔ ج ۴۔ قسم ۲۔ ص ۴۳

تداکَ علیه الناس یسالونه. (جس کے گرد لوگ جوق در جوق جمع ہو کر سوال کرتے ہیں)۔(۱)

شیعہ ہر سال حج کے موقع پر امامؑ سے ملاقات کیا کرتے تھے۔ یہ ملاقاتیں عام طور پر مکہ میں یا حج سے واپسی پر حاجیوں کے مدینہ سے گزرتے ہوئے ہوا کرتی تھیں۔ اس بارے میں امام علی رضا علیہ السلام فرماتے ہیں: "مع ما فیه (الحج) من التفقُّه و نقل اخبار الائمة." (حج میں دین کی سمجھ بوجھ اور ائمہ کی روایات کے نقل جیسے فوائد موجود ہیں)۔(۲) البتہ بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عراقیوں کو مدینہ میں امام محمد باقرؑ کے پاس جانے سے روک دیا گیا تھا۔(۳)

اس زمانے میں امامؑ اور ان کے شیعوں کو غالیوں کا مسئلہ درپیش تھا، جن کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ لوگ امامؑ کی روایات سے سوءِ استفادہ کر کے اور آپ سے جعلی احادیث منسوب کر کے ائمہؑ اور شیعوں کے مقام سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے تھے اور سادہ لوح شیعوں کو اپنا پیروکار بنا کر اپنے مقاصد حاصل کرتے تھے۔ جس زمانے میں امامؑ مدینہ میں تھے اُن لوگوں کا یہ سوءِ استفادہ بہت شدت اختیار کر گیا تھا۔ جب امامؑ نے غالیوں کو اپنے سے دور کیا تو آپ کے اصحاب نے بھی انہیں اپنے اجتماع سے باہر نکال دیا۔ مغیرۃ بن سعید اور بیان بن سمعان جو دونوں کے دونوں غالیوں کی مشہور ترین شخصیات اور اُن کے قائدین میں سے تھے انہیں امام محمد باقرؑ کے اصحاب کی طرف سے کافر قرار دیا گیا۔ اس بارے میں ابو ہریرہ عجلی نے اپنے اشعار میں کہا ہے:

اباجعفر انت الامام نُحبُّه ۔۔۔ ونرضی الذی ترضی به ونتابع

اتتنا رجال یحملون علیکم ۔۔۔ احادیث قد ضاقت بهن الاضالع

احادیث افشاها المغیرة عنکم ۔۔۔ و شرُّ الاُمور المحدثات البدائع (۴)

"اے ابو جعفر! آپ وہ امام ہیں جن سے ہم محبت کرتے ہیں۔ اور جس پر آپ راضی ہیں اس پر ہم بھی راضی ہیں اور اس کی پیروی کرتے ہیں۔ کچھ لوگ ہمارے پاس آتے ہیں اور ایسی احادیث آپ سے منسوب کرتے ہیں جنہیں سن کر ہم دل گرفتہ ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ احادیث ہیں جو مغیرہ آپ سے روایت کرتا ہے اور بدترین چیز بدعتیں ہی تو ہیں۔"

۱۔ الکافی۔ ج ۸۔ ص ۱۲۰

۲۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۸۔ ص ۸

۳۔ مختصر تاریخ دمشق۔ ج ۲۳۔ ص ۸۳

۴۔ انساب الاشراف۔ ج ۲۔ ص ۷۷؛ عیون الاخبار۔ ج ۲۔ ص ۱۵۱؛ العیون والحدائق۔ ص ۲۳۰

یہ اشعار غالیوں کی سرگرمیوں اور ان کی طرف سے عراقی شیعوں کو اپنے گرد جمع کرنے کے لیے ائمہؑ سے منسوب کر کے جھوٹی احادیث پھیلانے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ لوگ اطاعتِ امامؑ کے بہانے اپنے آپ کو اسلامی فرائض کی ادائیگی سے آزاد قرار دیتے تھے اور رستگاری اور اعلیٰ اسلامی اہداف تک رسائی کے لیے صرف معرفتِ امامؑ کو کافی سمجھتے تھے۔

اس کے مقابل امام محمد باقر علیہ السلام مسلسل عملِ صالح کی ضرورت پر زور دیا کرتے تھے۔ امام محمد باقرؑ کی درج ذیل احادیث اور ان جیسے دوسرے کلمات غالیوں کے مؤقف اور ان کے فاسد افکار کے خلاف ایک اقدام تھا۔ اس قسم کی گفتگوؤں کا سبب کم از کم ایک زاویے (angle) سے شیعوں میں سے غالیوں کے افکار کے اثرات کو ختم کرنا بھی ہے۔

ایک موقع پر آپ نے فرمایا:

"انّ شیعتنا من أطاع اللّٰہ."(۱)

''ہمارے شیعہ اللہ کے اطاعت گزار ہیں۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

"شیعتنا اھل الورع والاجتھاد واھل الوفاء والامانۃ واھل الزھد والعبادۃ واصحاب احدی و خمسین رکعۃ فی الیوم و اللیلۃ القائمون باللیل والصائمون بالنھار یزکّون أموالھم و یحجّون البیت و یجتنبون کل محرّم."(۲)

''ہمارے شیعہ اہلِ تقویٰ اور جدوجہد کرنے والے ہیں۔ یہ اہلِ وفا، اہلِ امانت، زاہد و عابد اور دن رات میں اکیاون رکعت نماز پڑھنے والے، رات کے نمازی اور دن کے روزہ دار ہیں۔ یہ اپنے مال کی زکات دیتے ہیں، حج بجالاتے ہیں اور ہر حرام کام سے بچتے ہیں۔''

نیز فرمایا:

"لیس مِن أولیائنا مَنْ ھو فی قریۃ فیھا عشرۃ الاف رجل فیھم من خلق اللّٰہ اورع منہ."(۳)

''جو دس ہزار کی آبادی والے علاقے میں سب سے زیادہ باتقویٰ نہ ہو وہ ہمارے دوستوں میں سے نہیں ہے۔''

۱۔ الفصول المہمہ۔ ص ۲۱۳
۲۔ صفات الشیعہ۔ ص ۱۶۳
۳۔ بحار الانوار۔ ج ۷۰۔ ص ۳۰۳

اور فرمایا:

"انَّ شیعتنا من شیّعنا واتّبع آثار نا واقتدیٰ باعمالنا." (۱)

"ہمارے شیعہ وہ لوگ ہیں جو ہماری اور ہمارے آثار واعمال کی پیروی کریں۔"

عبداللہ بن یحییٰ بزار سے منقول ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام روزانہ پچاس رکعت نماز پڑھا کرتے تھے۔ (۲)

امام محمد باقر علیہ السلام کی طرف سے شیعوں کو عمل کی جانب ترغیب' بالواسطہ (indirect) طور پر ان تمام فرقوں کے مقابل آپ کے موقف کی عکاس ہے جن کی نظر میں عملِ صالح کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔

اس بارے میں ایک اور روایت بعض غالیوں کی سازش کی نشان دہی کرتی ہے جن کے ساتھ امامؑ سختی سے پیش آتے تھے۔ علی بن محمد نوفلی کہتے ہیں:

"مغیرۃ بن سعید امام محمد باقرؑ کے پاس آیا اور بولا: آپ لوگوں سے کہیے کہ میں علمِ غیب جانتا ہوں' میں بھی عراقیوں کو یہ بات ماننے پر تیار کروں گا۔ امامؑ نے سختی سے اسے اپنے یہاں سے چلتا کیا اور بعد میں یہ بات ابوہاشم بن محمد بن حنفیہ کو بتائی اور انہوں نے بھی مغیرۃ بن سعید کو سخت زدوکوب کیا' یہاں تک کہ قریب تھا کہ وہ مر جاتا۔" (۳)

اہلِ عراق کی ایک مشکل یہ تھی کہ امامؑ کو ان کے عقیدے اور ایمان کی پائیداری پر کوئی خاص بھروسہ نہ تھا۔ اگرچہ وہ لوگ شدت کے ساتھ محبت کا اظہار کیا کرتے تھے اور اہلِ بیتؑ کی احادیث کی نشر واشاعت کے لیے بھرپور کوششیں کرتے تھے' لیکن بعض وجوہات کی بنا پر (جن میں سے بعض کا تعلق کوفہ اور عراق کے لوگوں کی تاریخ سے تھا) وفاداری کے اس اظہار پر کامل یقین نہیں کیا جاسکتا تھا۔ برید عجلی سے نقل ہوا ہے کہ انہوں نے امام محمد باقرؑ سے کہا: کہتے ہیں کہ کوفہ میں ہمارے دوستوں کی ایسی کثیر جماعت موجود ہے کہ اگر آپ انہیں حکم دیں تو وہ آپ کی اطاعت اور آپ کے فرمان کی متابعت کریں گے۔ امامؑ نے فرمایا: کیا تم اپنے مومن بھائی کی جیب سے اپنی ضرورت کے مطابق کچھ نکال سکتے ہو؟ میں نے عرض کیا: نہیں۔ امامؑ نے جواب دیا: "بدمائهم أبخل." "یعنی وہ اپنے خون کے معاملے میں (اس سے) زیادہ بخیل ہیں۔ (۴)

۱۔ بحار الانوار۔ ج ۶۸۔ ص ۱۵۳

۲۔ مختصر تاریخ دمشق۔ ج ۲۳۔ ص ۷۹

۳۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۸۔ ص ۱۲۱

۴۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۳۔ ص ۳۲۵

دوسری طرف کیونکہ امام تقیے پر مجبور تھے اور عراقی شیعوں کی ایک بڑی تعداد شدید دباؤ اور گھٹن زدہ ماحول کی وجہ سے اس بات کی خواہشمند تھی کہ امام عراق تشریف لا کر مسلح جدوجہد کریں' لہٰذا قدرتی طور پر ان میں سے بعض لوگ آپ کی امامت کے بارے میں شک وشبہ کا شکار ہو گئے' اور اس بنا پر اور اس وجہ سے بھی کہ آپ کی امامت کے بارے میں مناسب معلومات ان تک نہیں پہنچ رہی تھیں' وہ آپ اور آپ کے بھائی زید بن علیؑ کے درمیان تردد میں پڑ گئے تھے۔ یہی تردد شیعوں میں گروہ بندیوں کا سبب بنا۔

اگرچہ جس وقت زید نے کوفہ میں قیام کیا' اس سے سات سال پہلے ہی امامؑ وفات فرما چکے تھے' لیکن اسی دور میں اور اس کے بعد بھی بہت سے شیعوں کے درمیان زید کی امامت کی جانب رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ ان تمام پیچیدگیوں کے باوجود' کیونکہ شیعہ اموی مفادات کے خلاف اقدامات میں مشغول رہا کرتے تھے' اس لیے انہیں اندرونی اختلافات سے زیادہ خطرہ نہیں تھا۔ لیکن اُن پر سیاسی دباؤ کم ہونے کے ساتھ ہی غالیوں کا مسئلہ بتدریج زور پکڑتا گیا' یہاں تک کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانے میں تو یہ شیعوں کا سرفہرست مسئلہ بن گیا تھا۔ بنی امیہ کی طرف سے جو سختیاں شیعوں پر کی جاتی تھیں' وہ عمر بن عبدالعزیز کے دو سالہ دورِ حکومت (۹۹ تا ۱۰۱ ہجری) کے سوا امویوں کے پورے دورِ اقتدار میں انتہائی شدت کے ساتھ جاری رہیں۔ اس قسم کے جملے کہ: "مَنْ بُلِيَ مِن شيعتنا بِبَلاءٍ فَصَبَرَ كتب الله له أجرَ الفِ شهيد۔" (ہمارے شیعوں میں سے جو شخص بلا اور مصیبت میں گرفتار ہو اور صبر سے کام لے' تو اللہ تعالیٰ اُسے ایک ہزار شہیدوں کا ثواب عطا فرمائے گا) اس دباؤ کی عکاسی کرتے ہیں جو شیعوں پر ڈالا جاتا تھا اور امامؑ کوشش کیا کرتے تھے کہ ان جملوں کے ذریعے شیعوں کو زیادہ سے زیادہ صبر و استقامت کی دعوت دیں۔

شیعوں کے سیاسی حالات اور ابتدا سے آپ کے زمانے تک خلفا کی طرف سے شیعوں پر ہونے والی سختیوں کے تجزیے اور تحلیل کے بارے میں امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک تفصیلی روایت نقل ہوئی ہے۔ اس بارے میں امامؑ کے نقطہ ہائے نظر کی وضاحت کے لیے ہم اس روایت کا ترجمہ نقل کرتے ہیں:

> "ہم اہلِ بیت نے قریش کے مظالم اور ہمارے خلاف اُن کی صف بندی کی وجہ سے کیا کچھ برداشت کیا ہے اور ہمارے شیعوں اور ہمارے دوستوں پر لوگوں نے کیا کیا ستم ڈھائے ہیں۔ اپنی رحلت سے قبل رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اعلان فرمایا تھا کہ ہم لوگوں پر خود ان سے زیادہ اولیٰ ہیں۔ لیکن قریش نے ایک دوسرے کے تعاون سے اس امر کو اس کے محور سے دور کر دیا۔ انہوں نے حکومت حاصل کرنے کے لیے حکومت پر ہمارے حق اور ہماری اولیت ہی سے استدلال کیا اور ہمارے حق پر قبضہ کر لیا۔ پھر حکومت قریش کے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں پھرتی رہی' یہاں تک کہ دوبارہ ہم اہلِ بیت کے پاس

لوٹ آئی۔ لیکن لوگوں نے ہماری بیعت کو توڑ ڈالا اور ہمارے خلاف جنگ بپا کر دی' یہاں تک کہ امیر المومنینؑ شہادت کے بلند درجے پر فائز ہونے تک بادِ حوادث کے تند جھونکوں کے نشیب و فراز کا شکار رہے۔ ان کے بعد آپ کے فرزند امام حسنؑ کی بیعت کی گئی اور ان کے ساتھ وفاداری کا وعدہ کیا گیا۔ لیکن ان سے بھی بے وفائی کی گئی۔ ان کے بعد ہم مسلسل تحقیر اور ظلم و ستم کا نشانہ بنے' اپنے شہر اور گھر سے نکالے گئے' اپنے حقوق سے محروم کیے گئے اور قتل اور دھمکیوں کا شکار رہے' حتیٰ ہم اور ہمارے پیروکاروں سے جانوں کی سلامتی مکمل طور پر چھین لی گئی۔

جھوٹ گھڑنے والوں اور حق کا انکار کرنے والوں نے اپنے جھوٹ اور انکار کے لیے میدان ہموار پایا' اور اپنے اس جھوٹ اور انکار کو پوری مملکت اسلامیہ میں ظالم حکمرانوں' قاضیوں اور ان کے اہل کاروں سے تقرب کا ذریعہ سمجھا' لہٰذا جھوٹی روایتیں گھڑنا اور انہیں پھیلانا شروع کر دیا۔ ان لوگوں نے ہماری طرف سے ایسی باتیں نقل کیں جو نہ ہماری زبان پر جاری ہوئی تھیں اور نہ ہم نے ان کے مضمون پر عمل کیا تھا۔ اس عمل کے ذریعے وہ لوگوں کو ہم سے متنفر اور ان کے دل میں ہمارے خلاف نفرت اور عداوت کا بیج بونا چاہتے تھے۔ یہ وہ سیاست تھی جس پر امام حسنؑ کی شہادت کے بعد معاویہ کے دور میں شدت کے ساتھ عمل ہو رہا تھا۔ اس زہریلے پروپیگنڈے کے بعد ہر جگہ شیعوں کا قتلِ عام کیا گیا اور معمولی سے شک پر بھی ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جاتے۔ جو لوگ ہماری دوستی اور پیروی میں مشہور تھے' انہیں قید کر دیا گیا' ان کا مال لوٹ لیا گیا اور ان کے گھروں کو مسمار کر دیا گیا۔ یہ طرزِ عمل "عبید اللہ ابن زیاد" کے دور تک روز بروز شدید تر ہوتا چلا گیا' یہاں تک کہ کوفہ کی باگ ڈور حجاج بن یوسف کے ہاتھوں میں آ گئی۔ اس نے طرح طرح کی اذیتیں دے کر شیعوں کو قتل کیا اور وہ معمولی سے سوءِ ظن اور کسی بھی الزام میں انہیں قید کر دیتا۔ ہمارے پیروکاروں پر عرصۂ حیات اس قدر تنگ ہو گیا تھا اور بات یہاں تک جا پہنچی تھی کہ اگر کسی کو "زندیق" یا "کافر" کہا جاتا' تو یہ اسکے لیے امیر المومنینؑ کا "شیعہ" کہلانے سے بہتر ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ جو لوگ نیکی اور بھلائی کی وجہ سے معروف ہوا کرتے تھے اور شاید در حقیقت بھی پرہیزگار اور راستگو لوگ تھے' انہوں نے بھی بعض سابقہ خلفا کی فضیلت میں ایسی حیرت انگیز حدیثوں کی روایت کی (۱) کہ نہ خدا نے ایسی کوئی چیز پیدا کی تھی اور نہ اُن سے کوئی ایسی بات وقوع پذیر ہوئی تھی۔ بعد میں آنے والے

۱۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۱۱۔ ص ۴۳' الامام الصادق ابو زہرہ۔ ص ۱۱۱۔۱۱۲

راوی ان باتوں کی صداقت پر یقین رکھتے تھے' کیونکہ اس قسم کی باتیں ایسے لوگوں سے منسوب کی جاتی تھیں جو جھوٹ اور تقویٰ کی کمی میں معروف نہ تھے۔"

یہ روایت اس دور کی صورتحال کے بارے میں امام محمد باقر علیہ السلام کے تجزیے کو بیان کرتی ہے' اور شیعوں پر' جو زیادہ تر عراق میں رہتے تھے' اموی حکمرانوں کی سختیوں کی تشریح پر مبنی ہے۔ البتہ مدینہ اور مکہ میں بھی شیعہ تھے' لیکن اُن کی تعداد عراقی شیعوں کے مقابلے میں بہت کم تھی' انہی میں سے ایک "ابن میمون" تھے۔ ایک دن امامؑ نے اس سے پوچھا: کم أنتم بمکة؟ (مکہ میں تم کتنے لوگ ہو؟) انہوں نے کہا: ہم چار افراد ہیں۔ آپ نے فرمایا: انکم نورٌ فی ظلمات الارض. (تم لوگ زمین کی تاریکیوں میں نور ہو)۔(۱) لازماً یہ تعداد خالص شیعوں کی ہوگی۔

امام محمد باقر علیہ السلام شیعہ شاعروں کا بہت زیادہ احترام کیا کرتے تھے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ لوگوں نے دیکھا کہ کُثَیِّر سوار ہے اور امام محمد باقر علیہ السلام اسکے ساتھ پیدل چل رہے ہیں۔ کُثَیِّر پر اعتراض کیا گیا' تو اس نے کہا: امامؑ نے مجھے یہ حکم دیا تھا۔ میرا اُن کی اطاعت کرتے ہوئے سواری پر ہونا' اُن کی نافرمانی کرتے ہوئے پیدل چلنے سے بہتر ہے۔(۲)

بہت سے شیعہ تشیع کے بلند درجات تک نہیں پہنچے تھے اور ان میں سے کچھ لوگ اہلِ سنت کی احادیث سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ علومِ اہلِ بیتؑ سے بہرہ مند ہونے کے بھی متمنی تھے۔ اسی لیے ایسے لوگوں کو علمِ رجال کی کتابوں میں اصحابِ امامؑ میں شمار کیا گیا ہے۔ شیخ طوسی کی کتاب رجال میں امام محمد باقرؑ کے جن ۴۶۷ اصحاب کے نام ذکر ہوئے ہیں' ان کا امامؑ کے ساتھ رابطہ دوسروں کی نسبت زیادہ قوی تھا' حالانکہ اہلِ سنت کی کتابوں میں ایسے کئی لوگ ملتے ہیں جنہوں نے امام محمد باقرؑ سے حدیث نقل کی ہے' لیکن وہ لوگ آپ کے اصحاب میں شمار نہیں ہوتے۔ عراق میں سیاسی شیعوں (یعنی وہ لوگ جو ائمہؑ کی امامت پر اعتقاد رکھنے کی وجہ سے نہیں بلکہ اہلِ بیتؑ کی انسانی اور سیاسی شخصیت کی برتری کی وجہ سے ان کی حاکمیت کے طرفدار تھے) کی تعداد بہت زیادہ تھی۔(۳) لیکن کوئی بھی ان کے بھروسے پر کامیابی کے کم ترین امکانات کے ساتھ ایک سیاسی تحریک کی داغ بیل ڈالنے پر تیار نہ تھا۔ امام محمد باقرؑ کے ساتھ برید عجلی کی گفتگو' جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں' اسی حقیقت کو نمایاں کرتی ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام کے اصحاب میں سے کچھ حضرات دوسروں سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں اور شیعہ حدیث کے

۱۔ رجال کشی۔ ص ۲۳۶

۲۔ ربیع الابرار۔ ج ۲۔ ص ۲۹۱

۳۔ "تاریخ تشیع در ایران" کی پہلی جلد میں تشیع کی مختلف اقسام کی بحث دیکھئے۔

مجموعوں میں امام محمد باقرؑ سے روایت ہونے والی نصف سے زیادہ احادیث انہی حضرات سے نقل ہوئی ہیں۔

زرارۃ بن اعین، معروف بن خربوذ، برید بن معاویہ عجلی، ابو بصیر اسدی، فضیل بن یسار اور محمد بن مسلم وہ حضرات ہیں جو امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ دونوں کی صحبت سے سرفراز ہوئے تھے اور شیعہ علما کی جانب سے ان کی مکمل توثیق اور تائید کی گئی ہے۔(۱)

امام جعفر صادق علیہ السلام نے زرارہ کے بارے میں فرمایا: "رحم اللہ زرارۃ بن اعین، لولا زرارۃ لاندرست آثار النبوۃ و احادیث ابی۔" (خدا زرارہ بن اعین کی مغفرت فرمائے۔ اگر وہ نہ ہوتے تو آثار نبوت اور میرے والد کی احادیث ناپید ہو جاتیں)۔(۲)

محمد بن مسلم جیسے حضرات نے امامؑ کی گہری معرفت حاصل کر لی تھی اور انہوں نے صرف امام محمد باقرؑ اور اُن کے بعد امام جعفر صادقؑ سے ہی علم حاصل کیا تھا۔ وہ خود اس بارے میں کہتے ہیں: میں جس چیز کے بارے میں شک وشبہ کا شکار ہوتا تھا اسے ابوجعفر (امام محمد باقرؑ) سے پوچھ لیتا تھا۔ میں نے آپ سے تیس ہزار اور ابوعبداللہ (امام جعفر صادقؑ) سے سولہ ہزار احادیث حاصل کیں۔(۳) بعض شیعہ محمد بن مسلم کو شیعوں میں فقیہ ترین شخص قرار دیتے ہیں۔(۴) جابر بن یزید جعفی ایک اور معروف شیعہ تھے، وہ جب بھی امام محمد باقرؑ سے حدیث نقل کرتے، تو کہتے: حدثنی وصیُّ الاوصیاء و وارث علم الانبیاء محمد بن علی بن الحسین. (وصی اوصیا اور وارث علم انبیا محمد بن علی بن الحسینؑ نے مجھ سے یوں فرمایا)۔(۵)

یہ وہی کلمات ہیں جو مالک اشتر نخعی نے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لوگوں کو مخاطب کر کے کہے تھے: "ایھا الناس! ھذا وصیُّ الاوصیاء و وارث علم الأنبیاء." (اے لوگو! یہ اوصیا کے وصی اور علم انبیا کے وارث ہیں)۔(۶) ابوحنیفہ، جابر کو ایک بے مثال انسان قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں: لیس عندی فی الکوفة فی بابه اکبر منه. (میری نظر میں کوفہ میں اس باب میں اُن سے بڑھ کر کوئی شخصیت نہیں پائی جاتی)۔(۷)

۱۔ رجال کشی۔ ص۲۳۸

۲۔ رجال الکشی۔ ص۹۰، الاختصاص۔ ص۶۶

۳۔ الاختصاص۔ ص۲۰۱، رجال الکشی۔ ص۱۰۹

۴۔ الاختصاص۔ ص۲۰۴

۵۔ ارشاد۔ ص۲۸، حلیۃ الاولیاء۔ ج۳۔ ص۱۸۳

۶۔ تاریخ یعقوبی۔ ج۲۔ ص۱۷۹

۷۔ المناقب للمکی۔ ج۲۔ ص۱۸، نقل از الامام ابوحنیفہ ابوزہرہ۔ ص۷

حمران بن اعین اور عبداللہ بن شریک جیسی کم نظیر شخصیات بھی امامؑ کے اصحاب میں شامل تھیں۔(۱)

امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے والد کے اُن اصحاب کے بارے میں' جو آپ کی احادیث کے راوی تھے' فرمایا کرتے تھے:"ما أجد احداً احیا ذکرنا واحادیث ابی (علیه السلام) الاّ زرارة وابو بصیر المرادی ومحمدبن مسلم وبرید بن معاویة 'ولولا هؤلاء ما کان احد یستنبط هدی'هؤلاء حفّاظ الدین واُمناء ابی (علیه السلام) علی حلاله وحرامه وهم السابقون الینا فی الدنیا والآخرة." (میرے والد کی احادیث کو زرارہ' ابوبصیر مرادی' محمد بن مسلم اور برید بن معاویہ کے سوا کسی اور نے محو اور ناپید ہو جانے کے خطرے سے محفوظ نہیں رکھا۔ اگر یہ لوگ نہ ہوتے' تو کسی کو ہدایت نہ ملتی۔ یہ دین کے محافظ اور حلال و حرامِ الٰہی کے بارے میں میرے والد کے قابلِ اعتماد افراد ہیں۔ ان لوگوں نے دنیا اور آخرت میں ہماری جانب سبقت اختیار کی ہے)۔(۲)

امام محمد باقرؑ اور سیاسی مسائل

زیدی شیعوں نے امام کے شمشیر بدست قیام کو مسئلۂ امامت میں اپنے مذہب کی ایک بنیاد قرار دیا ہے۔ زیدیہ کی نظر میں ایک علوی فرد کو اسی وقت امام کی حیثیت سے قبول کیا جاسکتا ہے جب وہ مسلح قیام کرے۔ بصورتِ دیگر وہ اسے امام نہیں مانتے۔ اگر زیدیہ کے اس عقیدے کے نتیجے پر نظر ڈالیں' تو اس کا حاصل وسیع و عریض اسلامی مملکت کے گوشہ و کنار میں نفسِ زکیہ' ان کے بھائی ابراہیم' حسین ابن علی المعروف شہیدِ فخ اور بعض دوسرے افراد کے ہاتھوں اٹھنے والی چند پراگندہ اور ناکام تحریکوں کے علاوہ کچھ اور نظر نہیں آتا۔ طبرستان کی مسلح تحریک جس کے قائدین کے بارے میں شک و شبہ کا اظہار کیا جاتا ہے کہ وہ زیدیہ تھے یا امامیہ (اگرچہ یقین کے قریب احتمال یہی ہے کہ زیدیہ تھے) کے علاوہ کسی تحریک نے کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں کی' جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ:

الف: وہ لوگ خدا کے برگزیدہ بندوں' یعنی ائمہ طاہرینؑ کی بجائے تلوار اٹھا لینے والے ہر علوی کے پیچھے چل پڑے۔

ب: علمی اعتبار سے تفسیر' فقہ اور کلام میں امامیہ شیعوں کی نسبت وہ کسی منظم اور مربوط علم کے مالک نہ ہو سکے۔ یہ لوگ فقہ میں تقریباً ابوحنیفہ کی فقہ کے اور کلام میں پورے طور پر معتزلہ کے پیروکار تھے۔ اس کے بالمقابل شیعہ اماموں بالخصوص امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے علمی اقدامات کے نتیجے میں اپنی نوعیت کا ایک ایسا خاص بھرپور علمی

۱۔ بحار الانوار۔ ج ۴۶۔ ص ۳۴۳۔۳۴۴

۲۔ الاختصاص۔ ص ۶۶

مکتب وجود میں آیا جس نے بعد میں مکتب جعفری کے نام سے شہرت پائی۔ اس کا مکتب باقری کے نام سے مشہور ہونا بھی بے جواز نہ تھا۔ یہ فکری مکتب جو تمام میدانوں میں علوم اہل بیتؑ کو منظم طور پر پیش کرتا ہے' ان دو اماموں کی نصف صدی (۹۴ ہجری سے ۱۴۸ ہجری تک) پر پھیلی ہوئی انتھک محنتوں کا نتیجہ ہے۔

اس زمانے کے سیاسی حالات میں' جبکہ بنی امیہ اور اُن کے بعد بنی عباس اپنی حکومت کی بقا کے لیے اپنے ہر مخالف اور ہر مخالفت کو کچل دیا کرتے تھے' یہ راستہ (علمی اور فکری جدوجہد) منتخب کرنے کے بعد قدرتی طور پر ممکن نہ تھا کہ اس کے ساتھ ساتھ اہم سیاسی اقدامات میں بھی شرکت کی جاسکے۔ اور ہمیشہ اور ہر جگہ واحد قابلِ قدر بات یہی نہیں ہوتی کہ ہر صورت اور ہر قیمت پر سیاسی عمل میں شرکت کی جائے' چاہے اس کے لیے معارف حق کے بیان سے چشم پوشی کرنی پڑے' اور ایک قوم پر ہمیشہ کے لیے راستہ بند کردیا جائے۔ ائمۂ اہلِ بیتؑ نے اس دور میں اپنا بنیادی پروگرام یہی قرار دیا تھا کہ اسلام کے حقیقی دینی معارف کو بیان کیا جائے اور آپ حضرات نے اپنا بنیادی کام مذہبی فکر کی تدوین ہی قرار دیا تھا' جس کا نتیجہ آج ہم بخوبی دیکھ رہے ہیں۔

اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ائمہؑ نے جابر حکمرانوں کے خلاف کبھی کوئی مؤقف اختیار نہیں کیا۔ تقریباً تمام ہی شیعہ اور حتیٰ بنی امیہ بھی بخوبی جانتے تھے کہ ائمۂ اہلِ بیتؑ خلافت کے دعویدار ہیں' اور جیسا کہ امام محمد باقر علیہ السلام کا کلام نقل کیا گیا' ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ خلافت پر ان کا اور ان کے آبا کا حق تھا اور قریش نے انہیں اس سے زبردستی محروم کیا ہے۔ اسی لیے وہ اپنے شیعوں کو صرف استثنائی اور خاص وجوہات کی بنا پر تجویز کیے جانے والے مواقع کے سوا حکمرانوں کے ساتھ تعاون سے منع کیا کرتے تھے۔ لیکن یہ عدم تعاون ایک باقاعدہ' مسلسل اور مسلحانہ جنگ اور انقلابی قیاموں کی صورت میں سامنے نہیں آیا۔ لہٰذا حکام کی مخالفت' ان کے ساتھ عدم تعاون کی دعوت اور ان کے بائیکاٹ کی صورت میں ان کے خلاف جدوجہد امامؑ کا واضح مؤقف تھا۔

شیعوں میں سے ایک شخص "عقبہ بن بشیر اسدی" امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا' اور اپنے قبیلے میں اپنے بلند مقام و مرتبے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا: ہمارے قبیلے میں ایک شخص نقیب تھا جس کا انتقال ہوگیا' اب قبیلے کے لوگ مجھے اس کی جگہ نقیب (۱) بنانا چاہتے ہیں۔ اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ امامؑ نے فرمایا:

"تمنُّ علینا بِحَسَبِک انَّ اللّٰہ تعالی رفع بالایمان من کان الناس سمُّوہ وضیعاً اذا کان مُؤْمِناً ووضع بالکفر من کان یسمُّونہ شریفاً اذا کان کافراً فلیس لِاحدٍ فضلٌ الا"

۱۔ رجال الکشی۔ ص ۲۰۳۔۲۰۴

بتقوی اللّٰہ . امّا قولک ان قومک کان لھم عریف فھلک فأرادوا ان یعرفونی علیھم فان کنت تکرہ الجنّۃ و تبغضھا فتعرّف علی قومک یأخذ السلطان بامرء مسلم یسفک دمہ فتشرکھم فی دمہ وعسی ان لا تنال من دنیاھم شیء."

"کیا تم اپنے حسب اور نسب کے ذریعے ہم پر احسان جتاتے ہو؟ اللہ تعالیٰ مومن کو اُس کے ایمان کی وجہ سے بلند مقام عطا فرماتا ہے' حالانکہ لوگ اسے معمولی سمجھتے ہیں' اور کافر کو ذلیل کرتا ہے' جبکہ لوگ اُسے بڑا سمجھتے ہیں۔ اور یہ جو تم کہہ رہے ہو کہ تمہارے قبیلے میں ایک نقیب تھا جس کا انتقال ہو گیا ہے اور اب قبیلے والے تمہیں اس کی جگہ متعارف کرانا چاہتے ہیں' تو اگر تمہیں جنت بُری لگتی ہے' اور تمہیں وہ ناپسند ہے' تو اپنے قبیلے کا نقیب بننا قبول کرلو' کہ اگر حاکم کسی مسلمان کا خون بہائے گا' تو تم اس کے خون میں شریک قرار پاؤ گے اور شاید تمہیں اُن کی دنیا سے بھی کچھ نہ مل سکے۔"(۱)

یہ روایت بتاتی ہے کہ امامؑ کس طرح اپنے شیعوں کو حکومت میں کوئی بھی عہدہ حاصل کرنے' حتیٰ اُس میں نقیب تک بننے سے روکتے تھے' جس کی کوئی خاص ذمے داری بھی نہیں ہوتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ آپ کی نظر میں لوگوں پر حکمرانوں کے ظلم وستم اور اُن کے گناہوں میں شریک ہونا تھا۔

امام محمد باقر علیہ السلام لوگوں کو مختلف طریقوں سے حکمرانوں پر اعتراض اور انہیں نصیحت کرنے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ آپ کی ایک روایت میں آیا ہے:

"من مشیٰ الیٰ سلطانٍ جائرٍ فامرہ بتقوی اللّٰہ ووعظہ وخوّفہ کان لہ مثل اجر الثقلین من الجنّ والانس ومثل اجورھم."

"جو شخص ظالم حاکم کے پاس جا کر اسے تقوائے الٰہی اختیار کرنے کی تاکید کرے' اُسے نصیحت کرے اور اسے قیامت کا خوف دلائے' اس کے لیے جن وانس کا سا اجر ہوگا۔"(۲)

تقیہ وہ بنیادی ترین ڈھال ہے جس کی پناہ میں شیعوں نے اپنے آپ کو بنی امیہ اور بنی عباس کے تاریک استبدادی ادوارِ حکومت میں محفوظ رکھا۔ جیسا کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے اپنے والدِ گرامی سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: "انّ التقیۃ من دینی ودین آبائی ولا دین لمن لاتقیۃ لہ." (بے شک تقیہ میرا اور میرے اجداد کا دین ہے' اور جس کے

۱۔ ابن اثیر کہتا ہے: عرفاء جمع عریف ہے۔ وہ کسی قبیلے یا گروہ کے کاموں کا ذمے دار ہوتا ہے' ان کے امور انجام دیتا ہے اور امیر اسی کے ذریعے سے قبیلے والوں سے آگاہ رہتا ہے۔ (لسان العرب)

۲۔ الاختصاص۔ ص ۲۶۱

پاس تقیہ نہیں اُس کے پاس دین نہیں)۔(۱)

خاندانِ رسالت کی جانب سے اپنی امامت کے دعوے کے بارے میں بکثرت تاریخی دلائل اور شواہد موجود ہیں' اور یہ بات اکثر لوگوں کے لیے اظہر من الشمس تھی اور سب جانتے تھے کہ ائمہٴ اہلِ بیتؑ امامت کو صرف اپنا حق سمجھتے ہیں۔ امام محمد باقرؑ اور دوسرے تمام ائمہؑ بھرپور انداز میں حکمرانوں کے کاموں کو باطل اوران کی حکمرانی کو شرعاً ناجائز قرار دیتے تھے اور لوگوں کے سامنے اسلامی معاشرے میں سچی امامت کے قیام کی ضرورت کو بیان کرتے رہتے تھے:

"وکذلک یامحمد(بن مسلم!)من اصبح من ھذہ الامّة لاامام له من اللّٰہ عزّوجلّ ظاھرعادل اصبح ضالاً تائھاً و ان مات علی ھذہ الحالة مات میتة کفرونفاق و اعلَم یا محمدا!انّ ائمّة الجور و اتّباعھم لمعزولون عن دین اللّٰہ'قد ضلّوا واضلّوا فاعمالھم التی یعملونھا کرماد اشتدّت به الریح فی یوم عاصف لا یقدرون ممّا کسبوا علی شی ء ذلک ھوالضّلال البعید."

"اسی طرح اے محمد (بن مسلم!) اس امت کا جو شخص بھی ظاہر وعادل اور خدا کی طرف سے منصوب امام کے بغیر زندگی گزارے' وہ گمراہی میں پڑ گیا اور حیرانی وسرگردانی میں مبتلا ہوا' اور اگر وہ اسی حال میں مرجائے' تو کفر ونفاق کی حالت میں مرے گا۔ اے محمد! ظالم حکمراں اوران کے پیروکار خدا کے دین سے منحرف ہوگئے ہیں' وہ خود بھی گمراہی میں پڑے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہی کی طرف کھینچ رہے ہیں۔ جو عمل وہ انجام دیتے ہیں وہ اُس راکھ کی مانند ہے' جس پر طوفانی دن میں تیز ہوا چلی ہو' اُنہوں نے جو کچھ انجام دیا ہے اس میں سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آئے گا اور یہ حق سے دور کرنے والی گمراہی کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔"(۲)

اس قسم کے کلمات کا قدرتی نتیجہ لوگوں کی اہلِ بیتؑ کی جانب رہنمائی کرتا اور اُنہیں حاکموں اور گورنروں کے ظلم وستم سے آگاہ کرتا تھا۔ امامؑ کا بار بار اس بات پر زور دینا کہ ولایت نماز' روزہ' حج اور زکات کے پہلو بہ پہلو اسلام کے پانچ بنیادی احکام میں سے ایک ہے' اسی بنیاد پر تھا۔ جیسا کہ آپ نے حدیث کے اگلے حصے میں ولایت پر تاکید کی خاطر فرمایا:"ولم ینادبشیء کمانودی بالولایة'فاخذالناس باربع وترکوا الولایة."(خدانے لوگوں کو ولایت سے بڑھ کر کسی اور چیز کی طرف دعوت نہیں دی ہے' اسکے باوجود لوگوں نے چار چیزوں کو تو لیا' لیکن ولایت کو چھوڑ دیا)۔(۳)

۱۔ دعائم الاسلام۔ج ۱۔ص ۹۵

۲-۳۔ کافی۔ج ۱۔ص ۱۸۳۔۱۸۴

روایت کی گئی ہے کہ ایک دن امام محمد باقر علیہ السلام ہشام بن عبد الملک کے یہاں گئے لیکن اُسے خلیفہ اور امیر المومنین کی حیثیت سے سلام نہیں کیا۔ ہشام کو یہ بات ناگوار گزری اور اس نے اپنے اردگرد موجود افراد کو حکم دیا کہ وہ امامؑ کی سرزنش کریں۔ اس کے بعد ہشام نے امامؑ سے کہا: "لایزال الرجل منکم شق عصا المسلمین ودعا الی نفسه." یعنی ہر زمانے میں آپ کے یہاں سے کسی نہ کسی نے مسلمانوں کے درمیان اختلاف ڈالا ہے اور لوگوں کو اپنی طرف دعوت دی ہے۔ اسکے بعد اس نے امامؑ کو بُرا بھلا کہنا شروع کیا اور دوسروں کو بھی حکم دیا کہ امامؑ کی سرزنش کریں۔

اس موقع پر امامؑ نے لوگوں کی طرف رُخ کیا اور فرمایا:

"ایها الناس! این تذهبون واین یراد بکم؟ بنا هدی الله اوّلکم وبنا ختم آخرکم، فان یکن لکم ملک معجل، فانّ لنا ملک مؤجلاً، ولیس بعد ملکنا ملک، لأ نّا اهل بیت العاقبة، یقول الله: والعاقبة للمتقین."

"اے لوگو! کہاں جا رہے ہو اور کہاں دھکیلے جا رہے ہو؟ ابتدا میں بھی اللہ نے تمہیں ہمارے ذریعے ہدایت دی اور تمہارا اختتام بھی ہم پر ہی ہوگا۔ اگر تم نے جھپٹ کر زمامِ حکومت کو ہاتھ میں لے لیا ہے تو آخرکار امتِ مسلمہ کے امور ہمارے ہی ہاتھ میں آئیں گے۔ کیونکہ ہم وہ گھرانہ ہیں جس کے ساتھ عاقبت ہے۔ خدا کا فرمان ہے: انجامِ کار متقین کے لیے ہے۔"

ہشام کے حکم سے امامؑ کو قید کر لیا گیا۔ جو لوگ قید خانے میں امامؑ کے ساتھ تھے وہ آپ سے متاثر ہوئے اور آپ سے محبت کرنے لگے۔ جب اس بات کی اطلاع ہشام کو ملی تو اس نے کہا کہ آپ کو مدینہ واپس بھجوا دیا جائے۔(۱)

امام محمد باقر علیہ السلام کے زمانے میں اموی حکام اہلِ بیتؑ کے ساتھ سخت گیری سے کام لیتے تھے اور اس سخت گیری کی وجہ اہلِ بیتؑ کی جانب سے اپنی امامت اور دینی وسیاسی قیادت کا دعویٰ تھی، جس کے تحت وہ بنی امیہ کو غاصب سمجھتے تھے۔ تاریخ (جس کی صحت یا سقم کے بارے میں بھی ٹھیک ٹھیک اور واضح طور پر معلوم نہیں) بتاتی ہے کہ اموی خلفا میں سے صرف عمر ابن عبد العزیز تھا جس نے اہلِ بیتؑ کے ساتھ نسبتاً نرم رویہ اپنایا۔ اسی وجہ سے اہلِ سنت نے اُس کے بارے میں امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: "عمر بن عبد العزیز نجیب بنی امیه." (عمر بن عبد العزیز بنی امیہ کا نیک آدمی ہے)۔(۲)

۱۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۴۷۱، ۲۔ المناقب۔ ج ۴۔ ص ۱۸۹

۲۔ تذکرۃ الحفاظ۔ ج ۱۔ ص ۱۱۹

اسی طرح شیعہ کتابوں میں آیا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز بیت المال سے اہلِ بیتؑ کا حصہ ادا کیا کرتا تھا (۱) اور اس نے بنی ہاشم کو فدک بھی واپس کر دیا تھا۔ (۲) ایک روایت میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ امام محمد باقرؑ عمر بن عبدالعزیز کے یہاں گئے تو اس نے آپ سے کہا کہ اسے کچھ نصیحت فرمائیں۔ آپ نے فرمایا: میری نصیحت یہ ہے کہ چھوٹی عمر کے مسلمانوں کو اپنے بچوں کی طرح سمجھو، متوسط عمر والوں کو اپنے بھائیوں کی طرح اور عمر رسیدہ لوگوں کو اپنے باپ کی طرح۔ اپنے بچوں پر رحم کرو، اپنے بھائیوں کی مدد کرو اور اپنے باپ سے نیکی کرو۔ (۳)

بنی امیہ کے دور میں اہلِ بیتؑ پر سب سے زیادہ سختیاں ہشام بن عبدالملک کی طرف سے ہوئیں، اسی کے سخت اور توہین آمیز کلمات تھے جنہوں نے کوفہ میں (سال ۱۲۲ ہجری میں) زید بن علیؑ کو قیام پر مجبور کیا۔ زید اور ہشام کے درمیان جو ملاقات ہوئی، اُس میں ہشام نے حتیٰ ابوجعفر محمد بن علی (امام محمد باقرؑ) کی بھی توہین کی اور امویوں کے مخصوص انداز تمسخر اور طریقہ اذیت کے مطابق امامؑ کو جن کا لقب باقر تھا (نعوذ باللہ) "بقرہ" (گائے) کہا۔ زید جو اس کی اس جسارت پر انتہائی غضبناک ہو گئے تھے، انہوں نے فرمایا: "سماهٔ رسول الله (صلى الله عليه و آله وسلم) الباقر وانت تسميه البقرة لشدّ ما اختلفتما ولتخالفنّه في الآخرة كما خالفته في الدنيا فيرد الجنّة وترد النار." (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں باقر نام دیا ہے اور تو انہیں بقرہ کہہ رہا ہے۔ تیرے اور رسول اللہؐ کے درمیان کس قدر اختلاف ہے! تو آخرت میں بھی ان کی اسی طرح مخالفت کرے گا جس طرح دنیا میں اُن کا مخالف ہے۔ اس وقت وہ جنت میں داخل ہوں گے اور تو جہنم میں)۔ (۴)

ہشام کی موجودگی میں ایک عیسائی شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین کی، لیکن اُس نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ بعد میں زید نے اس مسئلے پر بہت سخت ردِعمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ جیسا کہ کہا گیا ہے، یہ طرزِ عمل اموی حکومت کے خلاف زید کے قیام کے بنیادی اور اہم محرک تھے۔ اور یہ سچ ہے کہ وسیع وعریض اسلامی مملکت، خاص طور پر مملکتِ اسلامیہ کے مشرقی حصے اور ایران میں اموی حکومت کے خلاف مسلسل چلنے والی تحریکوں کا آغاز اسی قیام سے ہوا تھا۔

جیسا کہ شیعہ منابع (sources) میں آیا ہے، امام محمد باقر علیہ السلام کو ان کے فرزند امام جعفر صادق علیہ السلام

۱۔ قرب الاسناد۔ ص ۱۷۲

۲۔ الخصال۔ ج ۱۔ ص ۱۵۱، اور دیکھئے: امالی طوسی۔ ص ۸۰، تاریخ الخلفاء۔ ص ۲۳۲

۳۔ بہجۃ المجالس۔ ج ۳۔ ص ۲۵۰، مختصر تاریخ دمشق۔ ج ۲۳۔ ص ۷۷

۴۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۷۔ ص ۱۳۲، عمدۃ الطالب۔ ص ۱۹۳

کے ساتھ شام بلایا گیا تھا' تاکہ وہاں ان کی توہین کی جائے اور اس طرح حکومت کے حصول اور موجودہ حکومت کی مخالفت کا خیال ان کے ذہن سے نکالا جائے۔ امام جعفر صادقؑ نے ایک طویل روایت میں اس واقعے کو بیان کیا ہے۔ ہم ذیل میں اس روایت کا کچھ حصہ اس کے راوی کی زبانی نقل کرتے ہیں:

ایک سال ہشام مناسک حج کی ادائیگی کے لیے مکہ آیا ہوا تھا۔ امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ بھی اس سال حج کے لیے وہاں تشریف لائے ہوئے تھے۔ امام جعفر صادقؑ نے چند جملوں میں (جو بنی امیہ پر بنی ہاشم کی برتری کے عکاس تھے) فرمایا:

"الحمدللّٰہ الذی بعث محمّدا بالحق نبیًا و اکرمنا بہ' فنحن صفوۃ اللّٰہ علی خلقہ و خیرتہ علی عبادہ و خلفاءہ' فالسّعیدمن اتّبعنا و الشّقیُّ من عادانا و خالفنا."

"حمد اس خدا کے لیے جس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبی مبعوث کیا اور اُن کے ذریعے ہمیں عزت و احترام بخشا۔ پس ہم اس کی مخلوق میں برگزیدہ اور اس کی جانب سے منصوب خلیفہ ہیں۔ وہ شخص خوشبخت ہے جس نے ہماری پیروی کی اور وہ شخص بدبخت ہے جس نے ہم سے دشمنی رکھی اور ہماری مخالفت کی۔"

یہ خبر ہشام تک پہنچی' تو وہ دمشق پہنچنے تک خاموش رہا اور اس بارے میں کوئی بات زبان پر نہ لایا۔ دمشق پہنچنے کے بعد اُس نے مدینہ کے گورنر کے پاس ایک قاصد بھیجا اور اس سے کہا کہ وہ امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کو شام بھیج دے۔ یہ دونوں امامؑ شام پہنچے۔ ہشام نے ان کی توہین کرنے کے لیے تین دن تک ان سے ملاقات نہ کی اور چوتھے دن اپنے دربار میں داخلے کی اجازت دی۔ اس وقت دربار میں بہت سے بڑے لوگ اور قریش کی بڑی بڑی شخصیات موجود تھیں۔ اس نے امام محمد باقرؑ سے (جو سن رسیدہ تھے) درخواست کی کہ وہ تیر اندازی کے مقابلے میں شرکت کریں۔ ابتدا میں امامؑ نے ضعیفی کا بہانہ کر کے اسے ٹالنا چاہا' لیکن ہشام نے اصرار کیا۔ مجبوراً امامؑ نے کمان ہاتھ میں لی اور پہلا تیر نشانے پر بٹھایا اور اسکے بعد یکے بعد دیگرے نو تیر ایک کے اوپر ایک بٹھا دیے۔

ہشام جو شدید حیرت کا شکار ہو گیا تھا' یوں گویا ہوا: ما ظننت انّ فی الأرض احدا یرمی مثل ھذا الرّامی. یعنی' میں نہیں سمجھتا کہ زمین پر کوئی ان جیسا تیر انداز ہوگا۔ اس کے بعد اس نے بنی امیہ اور بنی ہاشم کی قرابت داری کا ذکر کر کے کوشش کی کہ ان دونوں گھرانوں کو مساوی قرار دے۔ امام محمد باقرؑ نے تاکید کی کہ دوسرے گھرانے اہلِ بیتؑ میں موجود فضائل اور معنوی کمالات سے محروم ہیں۔

ہشام نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں شیعوں کے اعتقاد کا مذاق اڑایا اور بولا: علیؑ علمِ غیب کا دعویٰ کیا کرتے تھے' حالانکہ خدا نے کسی کو بھی اس سے آگاہ نہیں کیا ہے۔ جواب میں امامؑ

نے امیر المومنینؑ کے توسط سے معارف قرآن اور علوم پیغمبر کی نشر و اشاعت کی جانب اشارہ کیا۔

آخر کار ہشام نے انہیں آزاد کر کے مدینہ روانہ کرنے کا حکم صادر کر دیا۔

اسی دوران شام میں رہنے والے عیسائی راہبوں اور پادریوں اور امام محمد باقرؑ کے درمیان ایک مذاکرہ ہوا' جسے حدیث کی کتابوں میں تفصیل سے درج کیا گیا ہے۔ اسی کے بعد ہشام نے حکم دیا تھا کہ امامؑ جلد از جلد دمشق کو چھوڑ دیں' تاکہ کہیں شام کے رہنے والے آپ کے علم و دانش سے متاثر نہ ہو جائیں۔ اس نے بلا تاخیر مدینہ کے گورنر کے نام ایک خط ارسال کیا' جس میں اُس نے امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے بارے میں یہ لکھا: "ابوتراب کے یہ دو بیٹے جو شام سے مدینہ کے لیے روانہ ہوئے ہیں' جادوگر ہیں اور اسلام کا جھوٹا اظہار کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ (نعوذ باللہ) عیسائی راہبوں سے متاثر ہو گئے ہیں اور نصاریٰ کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ میں نے اُن سے اپنی قرابت داری کی وجہ سے انہیں تکلیف پہنچانے سے گریز کیا ہے۔ جب وہ مدینہ پہنچیں تو لوگوں سے کہنا کہ: جو ان سے کوئی معاملہ کرے گا' یا مصافحہ یا سلام کرے گا میں اس سے بری الذمہ ہوں۔ کیونکہ یہ (نعوذ باللہ) اسلام سے منحرف ہو گئے ہیں۔" لوگوں نے اس فرمان سے متاثر ہو کر آپ کی توہین کی' لیکن امامؑ نے ان کو نصیحت کی اور انہیں عذاب الٰہی سے ڈرایا' یہاں تک کہ وہ آپ کی اہانت سے دستبردار ہو گئے۔ (۱)

درج بالا روایت اہل بیتؑ کا چہرہ داغدار کرنے کے لیے ہشام کی مکاریوں کی نشاندہی کرتی ہے' نیز یہ بھی بتاتی ہے کہ ائمہ طاہرینؑ دوسروں کے سامنے اہل بیتؑ کی شان اور عظمت بیان کرنے پر کس قدر اصرار کیا کرتے تھے۔

☆☆☆

۱۔ دلائل الامامہ۔ ص ۱۰۴' امان الاخطار۔ ص ۵۲' بحار الانوار۔ ج ۴۶۔ ص ۳۰۶' دیکھیے تفسیر علی بن ابراہیم قمی۔ ص ۸۸' مناقب آل ابی طالب۔ ج ۳۔ ص ۳۳۳ اور ۳۲۸

امام جعفر صادق علیہ السلام

جاحظ کہتے ہیں:

"جعفربن محمدالذی ملأ الدنیا علمه و فقهه."

"جعفر بن محمد وہ ہستی ہیں جنہوں نے دنیا کو اپنے علم اور فقہ سے معمور کر دیا۔"

(شرح نہج البلاغہ۔ ج ۱۵۔ ص ۲۷۳)

65 سوال

امام جعفر صادقؑ کی شخصیت

شیعوں کے چھٹے امام، جعفر بن محمد صادق علیہ السلام ہیں، جن کی ولادت تاریخی منابع (sources) کے مطابق سن ۸۰ ہجری (۱) میں اور بعض دوسرے منابع کے مطابق سن ۸۳ ہجری میں ہوئی۔ (۲) آپ کی والدہ "فروہ بنت قاسم ابن محمد ابن ابی بکر" ہیں۔ مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ امامؑ کی وفات سن ۱۴۸ ہجری کے ماہ شوال میں، منصور عباسی کے دور خلافت میں ہوئی (۳) اور بعض کتابوں میں کہا گیا ہے کہ اس دن ۲۵ شوال تھی۔ (۴)

امام جعفر صادق علیہ السلام فکری اور عقیدتی اعتبار سے شیعوں کے اصل پشتیبان تھے۔ احادیث اور علوم اہل بیتؑ کے ایک بڑے حصے کی نشر واشاعت آپ ہی کے توسط سے ہوئی۔ شیعوں کے درمیان پیدا ہونے والے مختلف فرقوں میں امام جعفر صادقؑ حد فاصل کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ نے شیعوں کو انحرافات سے محفوظ رکھنے کی اہم ذمے داری کو اپنے پروگرام میں سر فہرست رکھا تھا، آپ نے انہیں اس زمانے میں موجود ایسے انحرافات سے متاثر ہونے سے بچایا جو اُن کی خالص فکر اور عقیدے اور ان کے مکتب کے استقلال کے لیے مسلسل خطرہ بنے ہوئے تھے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کی امامت کے بارے میں جو روایات نقل ہوئی ہیں، وہ روایات کے متعدد مجموعوں اور شیعہ تاریخ کی کتابوں، جیسے کافی (کتاب الحجہ)، کشف الغمۃ فی معرفۃ الائمہ (۵)، اثبات الوصیہ، ارشاد مفید اور اثبات الہداۃ میں موجود ہیں۔

۱۔ کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۱۶۱، اثبات الوصیہ۔ ص ۱۷۸

۲۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۴۷۲، ارشاد۔ ص ۳۰۴، فرق الشیعہ۔ ص ۷۸

۳۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۴۷۲، ارشاد۔ ص ۳۰۴، فرق الشیعہ۔ ص ۷۸

۴۔ تواریخ النبی والآل۔ ص ۶۸

۵۔ کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۱۶۷۔ ۱۷۳

امام محمد باقر علیہ السلام مدینہ میں رہتے تھے' لیکن امام جعفر صادقؑ (اس وجہ سے کہ آپ کے اکثر شیعہ عراق میں تھے یا کچھ اور دوسری وجوہات کی بنا پر) ایک مدت تک عراق میں رہے۔ (۱)

امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانے میں بنی امیہ کو زوال آیا اور حکومت بنی عباس کے ہاتھ میں آ گئی۔ آپ نے (دوسرے ائمہؑ کی نسبت) سب سے زیادہ عرصے لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کی اور سن ۱۴۸ ہجری میں اس دنیا سے رحلت فرمائی اور شیعوں کو اپنی جدائی کے سخت اور دائمی غم میں مبتلا کر گئے۔ امام جعفر صادقؑ کی شہادت کے بارے میں ایک روایت اہلِ سنت کے منابع (sources) سے نقل کی گئی ہے (۲) لیکن ابوزہرہ اسے درست نہیں سمجھتے اور اپنی رائے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے انہوں نے منصور کی زبانی امام جعفر صادقؑ کی تعریف اور آپ کی رحلت پر اسکے اظہارِ تاسف (جسے یعقوبی نے نقل کیا ہے) کو دلیل بنایا ہے۔ (۳) اسی طرح انہوں نے منصور کی طرف سے اس اقدام کو اُس کی اُس روش کے بھی خلاف قرار دیا ہے جو اُس نے اپنی حکومت کی بنیادیں مستحکم کرنے کے لیے اختیار کی ہوئی تھی۔ (۴)

لیکن یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی بات امامؑ کے شہید نہ ہونے پر تاریخی نص اور دلیل نہیں ہے' کیونکہ منصور کا ایک خلیفہ کے طور پر اظہارِ افسوس کرنا (جو بظاہر یہ قبول نہیں کرنا چاہتا کہ امام جعفر صادقؑ کو اس کے حکم پر شہید کیا گیا ہے) ایک مکمل طور پر قدرتی بات ہے۔ ایسی ہی ایک اور مثال امام علی رضاؑ کے حوالے سے مامون کی بھی موجود ہے۔ بنیادی طور پر یہ حکمرانوں کا اور اُن کے حکم پر کیے جانے والے سیاسی قتل کے مواقع پر ایک عمومی رویہ ہے۔ اسی طرح منصور کا کردار' اسکے ہاتھوں بکثرت علویوں کا قتل اور اُن کے ساتھ اس کی کھلی دشمنی جو بغیر کسی وقفے کے جاری رہی تھی' وہ منصور کے طرزِ عمل کے بارے میں ابوزہرہ کے اظہار کردہ موقف کی نفی کرتے ہیں۔

اسکے برعکس' منصور کے حکم پر امام جعفر صادق علیہ السلام کے قتل کا احتمال' اسکے اندازِ حکومت کے عین مطابق ہے' اُس کا اپنے دشمنوں کے ساتھ معمول کا رویہ یہی تھا۔ اگرچہ اسکے اس قسم کے اقدامات مکمل طور پر خفیہ طریقے سے انجام دیے جاتے تھے تاکہ وہ اسکے ردِعمل سے محفوظ رہ سکے۔ لہٰذا اگر منصور کے حکم پر امام جعفر صادقؑ کو زہر دینے کی کوئی تاریخی اطلاع موجود ہو تو منصور کے اظہارِ افسوس کو بنیاد بنا کر اسکی نفی کرنے کے مقابل اسے قبول کرنے کے بہت سے حوالے موجود ہیں۔

۱۔ الملل والنحل۔ ج۱۔ ص ۱۴۷

۲۔ الاتحاف بحب الاشراف۔ ص ۱۴۷

۳۔ تاریخ یعقوبی۔ ج ۳۔ ص ۱۱۷/ الامام الصادقؑ ابوزہرہ۔ ص ۶۷

۴۔ الامام الصادقؑ۔ ص ۶۳

امام جعفر صادقؑ کی اخلاقی اور فقہی شخصیت

امام جعفر صادق علیہ السلام کی علمی شخصیت کے بارے میں بکثرت شواہد موجود ہیں۔ شیعہ نقطۂ نظر سے آپ کو مقامِ امامت خداوندِ عالم کی جانب سے عطا کیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ میں اس منصب کے لیے ضروری شرطیں پائی جاتی تھیں۔ آپ کو حدیث کی روایت، فقاہت اور افتا کے اعتبار سے اہلِ سنت کے درمیان بلند مقام حاصل ہے، یہاں تک کہ وہ آپ کو ابوحنیفہ، مالک بن انس اور اپنے دور کے دوسرے بکثرت چوٹی کے محدثین کے مُسَلَّم اساتذہ میں شمار کرتے ہیں۔ مالک بن انس ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے کچھ عرصے امام جعفر صادقؑ کی شاگردی اختیار کی ہے، وہ آپ کی شخصیت کے بارے میں کہتے ہیں:

"ولقد کنت آتی جعفر بن محمد و کان کثیرُ المزاح و التبسم، فاذا ذُکِر عنده النبی (صلی الله علیه و آله وسلم) اخضرّ واصفرّ، ولقد اختلفْتُ الیه زماناً وما کنت اراه الاّ علیٰ ثلاث خصال: امّا مصلّیا و اما صائماً و اما یقرأ القرآن وما رأیته قطّ یحدّث عن رسول الله (صلی الله علیه و آله وسلم) الاّ علی الطّهارة ولا یتکلم فی ما لا یعنیه و کان من العلماء الزهاد الذین یخشون الله وما رأیته قط الا یخرج الوسادة من تحته و یجعلها تحتی." (۱)

"میں کچھ عرصے تک جعفر بن محمد کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ آپ اہلِ مزاح تھے اور ہر وقت آپ کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہوا کرتی تھی۔ جب اُن کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر ہوتا تھا تو آپ کا رنگ متغیر اور پھر زردی مائل ہو جاتا تھا۔ جس زمانے میں، میری آپ کے یہاں آمد و رفت تھی، میں نے کبھی آپ کو ان تین حالتوں کے سوا نہیں دیکھا: یا تو آپ نماز کی حالت میں ہوتے تھے، یا روزے کے عالم میں، یا تلاوتِ قرآن میں مشغول۔ آپ کبھی بھی بغیر وضو کے رسول اللہؐ سے حدیث روایت نہیں کیا کرتے تھے۔ کوئی فضول بات نہیں کرتے تھے۔ آپ اُن زاہد علما میں سے تھے جن کے پورے وجود پر خوفِ خدا چھایا ہوا ہو۔ میں جب کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا، آپ اپنی نشست نکال کر میرے نیچے رکھ دیا کرتے۔"

۱۔ المناقب۔ ص ۲۴۸ نقل از ابوزہرہ، الامام مالک۔ ص ۹۴۔۹۵، اور دیکھیے: الامام الصادقؑ والمذاہب الاربعہ۔ ج ۲۔ ص ۵۳، التوسل والوسیلہ ابن تیمیہ۔ ص ۵۲

عمر بن المقدام سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا:

"كُنتُ اذا نظرت الى جعفر بن محمد علمت انه من سلالة النبيين."(۱)

"میں جب بھی جعفر بن محمد کو دیکھتا تو جان لیتا کہ آپ نسلِ انبیا سے ہیں۔"

تیسری صدی ہجری کے مشہور عالم جاحظ امام کے بارے میں یوں کہتے ہیں:

"جعفر بن محمد الذی ملاء الدنیا علمه و فقهه و یقال ان اباحنیفة من تلامذته وكذلك سفيان الثوري وحسبک بهما فی هذا الباب."(۲)

"جعفر بن محمد وہ ہستی ہیں جنہوں نے دنیا کو اپنے علم اور فقہ سے معمور کردیا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ اور سفیان ثوری آپ کے شاگردوں میں سے تھے' اور ان دو کا آپ کی شاگردی اختیار کرنا آپ کی علمی اور فقہی عظمت (کی نشاندہی) کے لیے کافی ہے۔"

ابن حجر ہیثمی بھی آپ کی علمی شخصیت کی تعریف و تمجید کرتے ہوئے' اس نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ یحییٰ بن سعید' ابن جریج' مالک' سفیان ثوری' ابوحنیفہ' شعبہ اور ایوب فقیہ جیسے لوگوں نے آپ سے روایت نقل کی ہے۔(۳) امام جعفر صادقؑ سے ابوحنیفہ نے جو کسبِ علم کیا' اس کا ایک نمونہ "وزیر آبی" نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے ابوحنیفہ کے اس سوال کے جواب میں کہ: یا اباعبداللہ ما اصبرک علی الصلاۃ. (اے اباعبداللہ آپ کو نماز پر اتنا صابر کس نے بنایا ہے؟) ایک مفصل گفتگو فرمائی۔(۴)

امام جعفر صادق علیہ السلام کی شخصیت کے بارے میں علما اور دانشوروں سے متعدد باتیں نقل ہوئی ہیں' جن کا ایک بڑا حصہ استاد اسد حیدر نے اپنی گرانقدر کتاب "الامام الصادق والمذاہب الاربعۃ" میں جمع کردیا ہے(۵) اور قدرتی بات ہے کہ ان باتوں کو یہاں دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کی محفلِ درس میں کسبِ علم کے لیے آنے والوں' یا آپ سے حدیث نقل کرنے والوں کی کثرت' آپ کی علمی عظمت کی نشاندہی کرتی ہے۔

۱۔ تہذیب التہذیب۔ ج ۲۔ ص ۱۰۴' کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۱۸' الکامل فی الضعفاء الرجال۔ ج ۲۔ ص ۵۵۶' سیر اعلام النبلاء۔ ج ۶۔ ص ۲۵۷

۲۔ رسائل الجاحظ۔ ص ۱۰۶

۳۔ الصواعق المحرقۃ۔ ص ۱۲۰

۴۔ نثر الدرر۔ ج ۱۔ ص ۳۵۶

۵۔ الامام الصادق والمذاہب الاربعہ۔ ج ۱۔ ص ۵۱۔ ۴۲

حسن بن علی الوشاء کہتے ہیں: میں نے مسجدِ کوفہ میں ایسے نو سو افراد کو دیکھا ہے جو حدثنی جعفر بن محمد (ہم سے جعفر بن محمد {امام جعفر صادق} نے حدیث بیان کی) (۱) کہتے تھے۔ بعض منابع (sources) میں آپ کے شاگردوں اور آپ سے حدیث سننے والوں کی تعداد تقریباً چار ہزار بیان کی گئی ہے۔ (۲)

سفیان ثوری (اہلِ سنت کی کتب میں جن کے علم اور زہد کا شہرہ ہے) نے نصیر بن کثیر کے ساتھ امامؑ کے حضور زانوئے تلمذ تہہ کیے اور آپ سے علمی اور اخلاقی استفادہ کیا۔ (۳) نصیر بن کثیر، سفیان ثوری کے ہمراہ زمانۂ حج میں امامؑ کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا: میں حج کرنے جا رہا ہوں، مجھے کوئی ایسی چیز تعلیم فرمایئے، جس کے ذریعے میں نجات حاصل کر سکوں۔ امامؑ نے انہیں ایک دعا تعلیم فرمائی۔ (۴) اور دوسرے مواقع پر بھی وہ عاجزانہ طور پر امامؑ سے درخواست کرتے تھے کہ آپ اُن کے لیے کوئی حدیث بیان فرمائیں۔

ان ہی لوگوں کے درمیان کچھ افراد ایسے بھی تھے جو امام جعفر صادق علیہ السلام سے جھوٹی حدیثیں منسوب کر کے آپ کی حیثیت کو کم کرنا چاہتے تھے۔ اس بارے میں "شریک" کہتے ہیں: جعفر بن محمد ایک صالح اور متقی انسان ہیں لیکن آپ کے پاس کچھ جاہل افراد کی آمد و رفت رہتی ہے، جو باہر نکل کر آپ کی طرف سے جعلی حدیثیں نقل کرتے ہیں۔ یہ لوگ عوام سے مال بٹورنے کے لیے آپ سے ہر برائی کو نسبت دیتے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک مشہور غالی "بیان بن سمعان" ہے، جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ امام کی معرفت نماز، روزے اور تمام شرعی واجبات و فرائض کے مقابلے میں کافی ہے۔ شریک اپنی گفتگو کے آخر میں کہتے ہیں: امام جعفر صادق کی شخصیت ان تمام جھوٹی باتوں سے پاک اور مبرا ہے، لیکن جب لوگ ان باتوں کو سنتے ہیں، تو اُن کی نظر میں امامؑ کا مقام کم ہو جاتا ہے۔ (۵)

ان باتوں سے قطع نظر، امامؑ اپنے زمانے میں، خاص کر علما اور دانشوروں کی نظر میں، انتہائی عظمت کے مالک تھے۔ اس بارے میں ابو زہرہ لکھتے ہیں:

"ما اجمع علماء الاسلام علی اختلاف طوائفهم فی امر کما اجمعوا علی فضل الامام

۱۔ الامام الصادق۔ ص ۱۲۹، اور دیکھیے: الامام الصادق والمذاہب الاربعہ۔ ج ۱۔ ص ۶۷

۲۔ کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۱۶۶

۳۔ العقد الفرید۔ ج ۳۔ ص ۱۷۵، تذکرۃ الحفاظ۔ ج ۱۔ ص ۱۶۷، الاتحاف بحب الاشراف۔ ص ۱۴۷، کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۱۵۷

۴۔ السہمی تاریخ جرجان۔ ص ۵۵۴، المزی تہذیب الکمال۔ ج ۵۔ ص ۹۲، ابن عساکر نقل از طبری۔ ج ۱۵ طبع لیدن۔ ص Lxxxiv

۵۔ رجال کشی۔ ص ۳۲۴۔۳۲۵

الصادق وعلمه."(۱)

''اپنے تمام تر گروہی اختلافات کے باوجود علمائے اسلام کے درمیان امام صادقؑ کے علم وفضل کے بارے میں اتفاق پایا جاتا ہے۔''

''ملل ونحل'' جیسی مشہور کتاب کے مصنف شہرستانی امامؑ کی علمی اوراخلاقی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"و هو ذو علم غزير في الدين و ادب كامل في الحكمة و زهد بالغ في الدنيا وورع تامّ عن الشهوات."(۲)

''آپ دینی مسائل ومعاملات میں بے پایاں علم ودانش، حکمت میں ادب کامل، دنیاوی معاملات اور اُس کے زرق وبرق کے بارے میں انتہائی زہد کے مالک اور نفسانی شہوتوں سے مکمل طور پر دور رہنے والے تھے۔''

ابوحنیفہ نے امام محمد باقر علیہ السلام سے استفادہ کرنے کے علاوہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی احادیث نقل کی ہیں،(۳) لہٰذا امام جعفر صادقؑ سے اُن کی روایات اُن کی کتاب ''الآثار'' میں کثرت کے ساتھ دیکھی جاسکتی ہیں۔(۴) وہ خود امام جعفر صادق علیہ السلام کے بارے میں کہا کرتے تھے:

"ما رأيت افقه من جعفر بن محمد، وانه اعلم الأمّة."(۵)

''میں نے کسی کو بھی جعفر بن محمد سے زیادہ فقیہ نہیں پایا، وہ امت اسلامی کے عالم ترین انسان ہیں۔''

مشہور مورخ ابن خلکان آپ کے بارے میں کہتا ہے:

"احد الائمة الاثنى عشر على مذهب الامامية و كان من سادات اهل البيت و لقب بالصادق لصدق مقاله، وفضله اشهر من أن يذكر."(۶)

''آپ مذہب امامیہ کے بارہ میں سے ایک امامؑ اور اہل بیت رسولؐ کے ایک بزرگ تھے۔ آپ اپنی

۱۔ الامام الصادق۔ ص ۲۶

۲۔ الملل والنحل۔ ج ۱۔ ص ۱۴۷، الامام الصادقؑ۔ ص ۳۹

۳۔ جامع المسانید۔ ج ۲۔ ص ۳۳۹

۴۔ الامام الصادقؑ۔ ص ۳۸

۵۔ جامع المسانید۔ ج ۱۔ ص ۲۲۲، الامام الصادقؑ۔ ص ۲۲۳ اور الامام ابوحنیفہ۔ ص ۷۰

۶۔ وفیات الاعیان۔ ج ۸۔ ص ۱۰۵

صداقتِ سخن کی وجہ سے صادق کے لقب سے مشہور ہوئے۔ آپ کا علم و فضل اتنا مشہور ہے کہ محتاجِ بیان نہیں۔"

شیخ مفید آپ کے بارے میں فرماتے ہیں:

"و لم ینقل العلماء عن احد من اھل بیته ما نقل عنه."(۱)

"علمائے اسلام نے اہلِ بیت میں سے کسی سے بھی آپ کے برابر حدیثیں نقل نہیں کی ہیں۔"

منصور عباسی جو مسلسل علویوں سے برسرِ پیکار رہا کرتا تھا، وہ مالک بن انس جیسے بعض اہلِ سنت فقیہوں کو سامنے لا کر امام جعفر صادق علیہ السلام کی فقہی شخصیت کو کم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ مالک سے کہتا تھا: خدا کی قسم تو عقلمند ترین انسان ہے۔۔۔۔ اگر میں زندہ رہا، تو تیرے فتاویٰ اور اقوال کو قرآن کی طرح لکھ کر پوری دنیا میں پھیلاؤں گا اور لوگوں کو انہیں ماننے پر مجبور کروں گا۔(۲)

منصور کا یہ اقدام مالک سے محبت کی وجہ سے نہیں تھا، بلکہ اس لیے تھا کہ مالک کو نمایاں کر کے، امام جعفر صادقؑ اور اپنے مخالف دوسرے علما کے لیے اپنے دل میں بھڑکنے والی کینے اور حسد کی آگ کو ٹھنڈا کرے۔

منصور، امام جعفر صادق علیہ السلام کی علمی اور فقہی شخصیت کو نقصان پہنچانے کے لیے، ہر حربہ اختیار کرتا تھا۔ لہٰذا اُس نے ابوحنیفہ کو آمادہ کیا کہ وہ امامؑ کے سامنے جا کر آپ سے بحث و مباحثہ کریں، تاکہ ابوحنیفہ کی کامیابی کی صورت میں، اسلامی علم و دانش کے میدان میں امامؑ کی تحقیر کرے۔ ابوحنیفہ نے خود یہ واقعہ اس طرح نقل کیا ہے:

"منصور نے مجھ سے کہا: لوگ جعفر بن محمد کی طرف حیرت انگیز حد تک متوجہ ہیں اور لوگوں کا سیلاب اُن کی طرف بہا چلا جا رہا ہے۔ تم چند مشکل مسئلے تیار کر کے ان کے حل جعفر بن محمد سے دریافت کرو۔ جب وہ تمہارے پیش کیے ہوئے مسائل کے جواب نہیں دے سکیں گے، تو لوگوں کی نظروں سے گر جائیں گے۔

لہٰذا میں نے چالیس بہت پیچیدہ اور مشکل مسئلے تیار کیے۔

اس کے بعد حیرہ میں امام جعفر صادقؑ اور ابوحنیفہ کی منصور کی موجودگی میں ملاقات ہوئی۔

منصور کے دربار میں اپنے داخلے کے بارے میں خود ابوحنیفہ یہ کہتے ہیں:

"جب میں دربار میں داخل ہوا، تو میں نے جعفر بن محمد کو دیکھا جن کی شخصیت کی ہیبت و عظمت حتیٰ

۱۔ کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۱۶۶

۲۔ تذکرۃ الحفاظ۔ ج ۱۔ ص ۲۰۹

خود منصور پر بھی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے سلام کیا اور اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد منصور نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: اپنے سوالات ابو عبداللہ کے سامنے پیش کرو۔ میں جو مسائل اپنے ساتھ لایا تھا یکے بعد دیگرے انہیں آپ سے پوچھنے لگا۔ آپ اُن کے جواب میں فرماتے تھے: اس مسئلے کے بارے میں تمہارا عقیدہ یہ ہے اور اہلِ مدینہ اس کے بارے میں یہ کہتے ہیں اور ہماری رائے یہ ہے۔ آپ کی رائے بعض مسائل میں ہمارے نقطۂ نظر سے، بعض میں اہلِ مدینہ کے عقیدے سے اور بعض میں ہم دونوں سے مختلف ہوا کرتی تھی۔ اس طرح میں نے آپ کی خدمت میں چالیس مسئلے پیش کیے اور ان کا جواب لیا۔

مناظرے کے اختتام کے بعد بے اختیار ابو حنیفہ نے امام جعفر صادقؑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے آخری کلمات یوں ادا کیے: انّ اعلم الناس 'اعلمھم باختلاف الناس. (عالم ترین انسان وہ ہے جو مسائل کے بارے میں لوگوں کے اختلافِ رائے سے بھی واقف ہو)۔"(۱)

امام جعفر صادق علیہ السلام بھی اپنے جد امیر المومنین کی طرح فرماتے تھے:

"سلونی قبل ان تفقدُونی 'فانّه لایحدثکم احدبعدی بمثل حدیثی."(۲)

''قبل اسکے کہ مجھے نہ پاسکو مجھ سے پوچھ لو' کیونکہ میرے بعد کوئی ایسا نہیں ہے جو تمہیں میری طرح حدیث سنا سکے۔''

امام جعفر صادق علیہ السلام سے نہ صرف فقہی مسائل کے بارے میں' بلکہ تفسیر' علم کلام اور اخلاقیات کے بارے میں بھی گرانقدر احادیث ہم تک پہنچی ہیں۔ کتاب ''کافی'' کے اصول کے حصے کے مطالعے کے ذریعے اسلام کے عقلی مسائل کے بارے میں امام کی علمی گہرائی اور وسعتِ نظر کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ ''البرهان'' اور ''صافی'' جیسی شیعہ روائی تفسیریں اس بارے میں امام کی بیان کردہ بکثرت احادیث پر مشتمل ہیں۔

اس بارے میں اہلِ سنت عالمِ دین' ابوزہرہ لکھتے ہیں:

"و لم یکن علمه مقصوراً علی الحدیث وفقه الاسلام' بل کان یدرس علم الکلام."(۳)

''آپ کا علم صرف حدیث اور فقہ اسلامی تک منحصر نہ تھا' بلکہ آپ علمِ کلام کی بھی تدریس فرماتے تھے۔''

۱۔ تہذیب الکمال۔ ج ۵۔ ص ۷۹۔ ۸۰' الکامل فی ضعفاء الرجال۔ ج ۲۔ ص ۵۵۶' الامام الصادقؑ۔ ص ۲۷۔ ۲۸' الامام ابوحنیفہ۔ ص ۷۰۔ ۷۱

۲۔ تہذیب الکمال۔ ج ۵۔ ص ۷۹' سیر اعلام النبلاء۔ ج ۶۔ ص ۲۵۷' الکامل فی ضعفاء الرجال۔ ج ۲۔ ص ۵۵۹

۳۔ الامام الصادقؑ۔ ص ۶۶

یہاں امام جعفر صادق علیہ السلام کے کلامی نظریات کو تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا جاسکتا' لیکن جبر وتفویض کے مسائل کے بارے میں امام کا فرمایا ہوا معروف جملہ: لاجبرٌ ولا تفویض بل امر بین الامرین. " (نہ جبر ہے اور نہ تفویض' بلکہ معاملہ ان دونوں کے درمیان ہے) اس مسئلہ کے بارے میں بیان ہونے والی خوبصورت ترین' جامع ترین اور دقیق ترین تعبیر ہے۔

ابوزہرہ' اپنی کتاب کے ایک اور مقام پر امام جعفر صادق علیہ السلام کے بارے میں کہتے ہیں:

"و فوق هذه العلوم' قد كان الامام الصادق على علم بالاخلاق ومايؤدى الى فسادها."(۱)

"ان سب علوم سے بڑھ کر' امام صادق اخلاق اور اس کے بگاڑ کے اسباب ومحرکات کے بارے میں انتہائی قیمتی معلومات رکھتے تھے۔"

جن راویوں نے امامؑ سے حدیث نقل کی ہے اُن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان کے نام "مزی" کی "تہذیب الکمال" (۲) اور رجال کی دوسری کتابوں جیسے "تہذیب التہذیب" وغیرہ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان میں اہلِ سنت کی بہت سی اہم شخصیات بھی شامل ہیں۔ ذہبی نے "سیر اعلام النبلاء" میں امام جعفر صادقؑ سے حدیث نقل کرنے والے راویوں کے نام درج کیے ہیں۔ (۳)

یہ ان حالات میں ہے' جبکہ بہت سے محدث بنی امیہ کے عہد میں امامؑ سے حدیث نقل کرنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ مالک بن انس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ: لم یرو عن جعفر بن محمد حتى ظهر امر بنى العباس. (انہوں نے بنی عباس کے حکومت سنبھالنے تک جعفر بن محمد (امام صادقؑ) سے حدیث نقل نہیں کی)۔ (۴)

امام جعفر صادقؑ کے شیعہ

امام جعفر صادق علیہ السلام کے اصحاب کی تعداد میں اضافہ اور شیعیت کا پھیلاؤ قدرتی طور پر مختلف اختلافات اور گوناگوں ناپسندیدہ امور کے ساتھ ساتھ تھا۔ اس زمانے میں آپ کے تمام شاگرد اور شیعہ اپنی فکر اور اپنے نظریے کو ایک صحیح

۱۔ الامام الصادق۔ ص ۶۷

۲۔ تہذیب الکمال۔ ج ۵۔ ص ۷۵۔ ۷۶

۳۔ سیر اعلام النبلاء۔ ج ۶۔ ص ۲۵۶

۴۔ الکامل فی ضعفاء الرجال۔ ج ۲۔ ص ۵۵۵' سیر اعلام النبلاء۔ ج ۶۔ ص ۲۵۶

زاویے میں نہیں رکھ سکے تھے اور اپنے تمام دینی معارف کو محمد بن مسلم اور زرارہ کی طرح اس کے اصیل سرچشمے یعنی خاندانِ رسالت سے نہیں لے پائے تھے۔

ان میں سے بہت سے افراد اہلِ سنت محدثین کے حلقۂ درس میں بھی جایا کرتے تھے جو اپنی جگہ ان کے طرزِ فکر اور سمجھ بوجھ پر اثر انداز ہوتا تھا۔ دوسری طرف آپ کے ماننے والوں کی کثرت اس دائرے کی وسعت اور ان لوگوں کے دور اور نزدیک کے علاقوں میں پھیلے ہونے نے ان سب کے لیے امامؑ سے ذاتی طور پر رجوع کرنا ناممکن بنادیا تھا۔ لہٰذا یہ لوگ اپنے فقہی عقیدتی اور دوسرے مسائل میں مشہور و معروف شیعوں سے رجوع کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے ان حضرات کا اختلافِ رائے قدرتی طور پر دوسرے شیعوں کے درمیان بھی پھیلنے لگتا تھا۔ اس کے علاوہ سیاسی کشمکش کے دوران بعض شیعوں کا عباسیوں کی نئی حکومت کی طرف جھکاؤ بھی محسوس کیا جارہا تھا کیونکہ اس سے پہلے یہ لوگ شیعہ اجتماعات میں بھرپور شرکت کیا کرتے تھے اور یہ جھکاؤ خود شیعوں کے درمیان اختلافات کے اسباب میں ایک اور سبب کا اضافہ کررہا تھا۔

ان سب کے علاوہ زیدیہ گروہ بھی اس تفرقے کا ایک عامل ہوگیا تھا۔ ان کے انقلابی اقدامات کی وجہ سے بہت سے سیاسی اور تندرو شیعہ ان کی طرف مائل ہوکر ان کے گرد جمع ہوگئے تھے۔ اس قسم کی باتوں نے شیعوں پر کم وبیش ناپسندیدہ اور نسبتاً گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔

اس کے باوجود امام جعفر صادق علیہ السلام کے اصحاب اور پیروکاروں میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جو آپ کے حقیقی شیعہ شمار کیے جاتے تھے اور جنہوں نے حضرت کے علمی اور روائی آثار کی حفاظت کے لیے پیہم اور انتھک جدوجہد کا مظاہرہ کیا تھا۔

خود امام جعفر صادق علیہ السلام اس بارے میں فرماتے ہیں:

"ما احدٌ احییٰ ذکرنا و احادیث ابی الاّ زرارة و ابوبصیر لیث المرادی و محمد بن مسلم وبُرید بن معاویة العجلی ولو لا هؤلاء ما کان احد یستنبط هذا هؤلاء حفّاظ الدین وامناء ابی (علیه السلام) علی حلال اللّٰه و حرامه وهم السابقون الینا فی الدنیا والسابقون الینا فی الآخرة."(۱)

"زرارہ ابوبصیر لیث مرادی محمد بن مسلم اور برید بن معاویہ عجلی کے علاوہ کسی نے ہمارے ذکر اور میرے

۱۔ سیر اعلام النبلاء۔ ص ۱۳۷ اور دیکھیے: وسائل الشیعہ۔ ج ۱۸۔ ص ۱۰۳۔ ۱۰۴

والد کی احادیث کو زندہ نہیں رکھا۔ اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو کوئی بھی ہمارے اور ہماری احادیث کے متعلق نہ جانتا۔ یہ حافظانِ دین اور خدا کے حلال اور حرام کیے ہوئے پر میرے والد کے قابلِ اعتماد افراد ہیں۔ جس طرح انہوں نے دنیا میں ہماری طرف سبقت اختیار کی ہے اسی طرح آخرت میں بھی ہماری طرف سبقت لیں گے۔"

نیز آپ ہی کا ارشاد ہے:

"رحم اللّٰه زرارة بن اعین لولا زرارة و نظراته لاندرست احادیث ابی." (۱)

"خدا زرارہ بن اعین پر رحمت نازل فرمائے اگر زرارہ اور اس جیسے افراد نہ ہوتے تو میرے والد کی احادیث کا خاتمہ ہو جاتا۔"

انہی افراد کے درمیان کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کا امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے شیعوں کے لیے مرجع کی حیثیت سے تعارف کرایا تھا۔ لہٰذا اپنے ایک شیعہ کے جواب میں جس نے آپ سے پوچھا تھا کہ: جب بھی ہمارے لیے کوئی مسئلہ پیش آئے تو ہم کس کی طرف رجوع کریں؟ آپ نے فرمایا: "علیک بالاسدی یعنی ابابصیر." (تمہیں اسدی یعنی ابوبصیر کی طرف رجوع کرنا چاہیے)۔ (۲)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

"ما یمنعک من محمد بن مسلم الثقفی فانّه سمع من ابی و کان عنده وجیهاً."

"محمد بن مسلم ثقفی سے کیوں رجوع نہیں کرتے انہوں نے میرے والد سے حدیث سنی ہے اور وہ ان کے نزدیک محترم تھے۔" (۳)

اس کے برعکس کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو مذہب جعفری اور زیدیہ کے درمیان تذبذب کا شکار تھے۔ ایک مرتبہ جب امام جعفر صادق علیہ السلام نے عبدالملک بن عرم سے اس کے جنگ میں شریک نہ ہونے کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیتے ہوئے کہا:

"فان الزیدیة یقولون لیس بیننا و بین جعفر خلاف الا انّه لا یری الجهاد."

۱۔ وسائل الشیعہ۔ ص ۱۳۶

۲۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۸۔ ص ۱۰۳

۳۔ ایضاً۔ ج ۸۔ ص ۱۰۵

"زیدیہ کہتے ہیں کہ ہمارے اور جعفر صادقؑ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہ جہاد پر اعتقاد نہیں رکھتے۔"

امامؑ نے اس الزام کا جواب دینے کے بعد فرمایا:

"بلى والله انى لاراه و لكنى اكره ان ادع علمى الى جهلهم." (۱)

"خدا کی قسم! میں خدا کی راہ میں جہاد پر اعتقاد رکھتا ہوں لیکن مجھے اپنے علم کو ان کے جہل کے ساتھ رکھنا پسند نہیں ہے۔"

ایک مشہور شیعہ شاعر "سید حمیری" ایک اور قسم کے انحراف کا شکار ہو گئے جسے عباسیوں نے ایجاد کیا اور پروان چڑھایا تھا۔ وہ کیسانی مذہب کی طرف مائل ہو گئے تھے جو بعض محققین کے خیال میں عباسیوں کا بنایا ہوا تھا۔ لیکن بعد میں وہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے پاس آئے اور اپنا عقیدہ بدل کر آپ کے مخلص شیعوں میں شامل ہو گئے۔ (۲)

وہ خود اپنے ایک شعر میں جو ان کے واپس پلٹنے اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے ساتھ ملحق ہو جانے کو بیان کرتا ہے کہتے ہیں:

تجعفرت باسم الله والله اكبر

وايقنت ان الله يعفو ويغفر

"خدا کے نام سے جو بزرگ و برتر ہے میں جعفر بن محمد کی طرف پلٹ آیا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ خدا میرے گناہوں سے درگذر فرمائے گا اور انہیں بخش دے گا۔"

بعد میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے بھی اس پر رحمت کی دعا کی اور اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہ وہ گناہوں کا مرتکب ہوا ہے فرمایا:

"وما خطر ذنب عندالله ان يغفره لمُحبّ علىّ." (۳)

"علیؑ کے محبوں کے گناہوں سے درگذر کرنا خدا کے لیے کوئی بڑی بات نہیں ہے۔"

۱۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۱۱۔ ص ۳۲

۲۔ رجال کشی۔ ص ۲۴۸، الاغانی۔ ج ۷۔ ص ۲۳۳۔ ابو الفرج نے اس کے پلٹ جانے کو نقل کرنے کے بعد ابن سامر سے ایک روایت نقل کی ہے کہ اس نے کہا: وہ اپنے اعتقاد سے نہیں پلٹا تھا۔ خود ابو الفرج بھی اس کے پلٹ جانے کو قبول نہیں کرتا لیکن شیعہ کتابوں میں اس کے اپنے عقیدے سے پلٹ جانے کی بار بار تائید کی گئی ہے۔ دیکھئے: الاغانی۔ ج ۷۔ ص ۲۳۵

۳۔ الاغانی۔ ج ۷۔ ص ۲۳۲، ۲۷۷

شیعوں میں افتراق وانتشار یا دوسرے الفاظ میں ان کے درمیان تفرقے کی پیدائش کے حوالے سے ایک توجہ طلب نکتہ پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ درباری علما کا ایک گروہ جو مہدی عباسی کی خدمت میں رہا کرتا تھا' وہ ان اختلافات کو ہوا دینے اور انہیں بڑا کر کے پیش کرنے کے سلسلے میں شدت کے ساتھ کوشاں رہتا تھا۔ اس بارے میں ''کشی'' نے ''ابن مفضل'' نامی ایک شخص کا ذکر کیا ہے' جس نے فرقوں کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے ہر صحابی کا ذکر ایک شیعہ فرقے کے سربراہ کی حیثیت سے کیا ہے۔

گفتگو کے اس حصے میں اس بات کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے' کہ امامؑ کے اکثر شیعہ عراق میں اور وہ بھی کوفہ میں رہتے تھے۔ دوسرے مراکز میں یا تو شیعہ تھے ہی نہیں یا بہت کم تعداد میں تھے' البتہ کبھی کبھی خراسان سے بھی کچھ لوگ امامؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ سے فقہی احکام کے بارے میں سوال کیا کرتے تھے۔(۱)

حفص بن غیاث حدیث بیان کرنے کی غرض سے بصرہ گیا۔ اس سے کہا گیا کہ وہ کچھ لوگوں کی حدیث روایت نہ کرے' ان میں جعفر بن محمد بھی شامل تھے۔ اس کی وجہ اہلِ بصرہ میں پایا جانے والا عثمانی مزاج تھا' جو جنگِ جمل کے وقت سے یہاں رائج تھا۔ حفص نے ان سے کہا: اگر تم یہ بات کوفہ میں کہو' تو: لاخذتکم النعال المطرقة. (لوگ تمہیں جوتوں سے ماریں گے)۔(۲)

امام جعفر صادقؑ اور غلو

امام جعفر صادق علیہ السلام نے بھی اپنے والد گرامی کی طرح غلو کا شدید مقابلہ کیا۔ یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ حضرت علی علیہ السلام سے لے کر امام محمد باقر علیہ السلام کے عہد تک' برسہا برس کی محنتوں کے نتیجے میں مسلمان معاشرے میں اہلِ بیتؑ کے لیے محبت کے جذبات پیدا ہو گئے تھے' اور عراق اور بعض دوسرے علاقوں میں شیعیت کافی رسوخ کر گئی تھی۔ اب غالیوں کی یہ کوشش تھی کہ شیعوں کے اندر رخنہ پیدا کر کے انہیں اندرونی طور پر کمزور کر دیں اور ان کا چہرہ داغدار بنا ڈالیں۔

غلو کی یہ تحریک کئی پہلوؤں سے شیعیت کے لیے خطرناک تھی' کیونکہ یہ نہ صرف اندرونی طور پر شیعوں کے عقائد میں انتشار کا سبب تھی' اور انہیں اسلامی معاشرے سے کاٹ رہی تھی' بلکہ شیعوں کو دوسروں کی نظر میں فروعِ دین پر عمل کے حوالے سے غیر سنجیدہ اور بے عمل لوگ ظاہر کر رہی تھی اور دوسرے تمام لوگوں میں شیعوں سے بدگمانی پیدا

۱۔ تاریخ یحییٰ بن معین۔ ج ۳۔ ص ۳۷۲

۲۔ الکامل فی ضعفاء الرجال۔ ج ۲۔ ص ۵۵۵' تہذیب الکمال۔ ج ۵۔ ص ۸۲' سیر اعلام النبلاء۔ ج ۱۔ ص ۲۵۷

کر رہی تھی۔(۱)

آج فرقوں پر لکھی گئی کتابوں کے ایک سرسری مطالعے کے ذریعے ہی یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ اگرچہ فرقوں کی تقسیم بندی کے وقت شیعہ غالیوں کا ذکر علیحدہ سے کیا جاتا ہے' لیکن نہ صرف اکثر اربابانِ فرق و مذاہب نے' بلکہ اہلِ سنت کی عام شخصیات نے بھی شیعہ گروہوں کے درمیان کوئی خاص فرق ملحوظ نہیں رکھا اور لوگوں کو ان کی احادیث قبول کرنے سے پرہیز کی تلقین کی ہے۔ اس بدگمانی کی کم از کم ایک وجہ شیعوں میں غالیوں کے افکار کا رسوخ کر جانا ہے' جس کے آثار شیعہ ائمہ اور اُن کے بعد اصولی شیعہ علما کی بھرپور کوششوں کے باوجود کم و بیش باقی ہیں۔ ان کی مثال حدیث سے متعلق بعض شیعہ کتابوں میں تحریفِ قرآن کے بارے میں روایات کی موجودگی ہے' جبکہ ان روایتوں کا سرچشمہ غالی ہیں۔(۲)

بہر صورت' شیعیت کی تصحیح' غلو کی نفی اور شیعوں کو غالی تحریک سے دور رکھنے کے سلسلے میں امامؑ کا علمی قیام' اسلام کی حقیقی تعلیمات (جس کے مبلغ ائمہؑ تھے) کو محفوظ رکھنے کے لیے امام جعفر صادق علیہ السلام کے اہم ترین اقدامات میں سے ہے۔ یہاں ہم ایک نظر اُن اقدامات پر ڈالیں گے' جو امامؑ نے غالیوں کی نفی' ان کے نظریات کو مسترد کرنے اور اس گروہ کی تکفیر کے لیے اٹھائے تھے۔

امامؑ کے اقدامات میں سے ایک قدم حقیقی شیعوں کو منحرف غالیوں سے دور کرنا تھا۔ واضح ہے کہ شیعوں اور غالیوں کے درمیان ربط و ضبط' شیعوں کے درمیان غالیوں کے لیے محسوس کی جانے والی ممکنہ کشش کی وجہ سے بعض شیعوں کو غلو کی طرف کھینچ سکتا ہے۔ بالخصوص جبکہ غالی غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو ائمہؑ سے مربوط ظاہر کرتے تھے' اور ائمہؑ کی جانب سے کی جانے والی اپنی تکذیب کے متعلق کہتے تھے کہ ائمہ صرف تقیے کی وجہ سے ان کی تکذیب کرتے ہیں۔ سادہ لوح شیعوں کو دھوکا دینے کے لیے یہ بات بہت موثر تھی۔

ایک روایت جس کی سند موجود ہے' اس میں امام جعفر صادق علیہ السلام کا یہ قول بیان ہوا ہے کہ آپ نے ابو الخطاب کے ساتھیوں اور دوسرے غالیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ''مفضل'' سے فرمایا:

"یا مفضّل! لاتقاعدوهم و لاتؤاكلوهم و لاتشاربوهم و لاتصافحوهم."(۳)

۱۔ یہاں تک کہ ایک خارجی نے ایک شیعہ پر الزام لگایا تھا کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اہلِ بیتؑ سے محبت کی وجہ سے ان کے لیے اعمالِ صالح کی انجام دہی ضروری نہیں اور اپنے اعمالِ بد کی وجہ سے ان پر عذاب بھی نہیں ہوگا۔ دیکھیے: الاغانی۔ ج ۲۰۔ ص ۱۰۷ نقل از العقیدہ والشریعۃ فی الاسلام۔ ص ۲۰۳

۲۔ دیکھیے: اکذوبہ تحریف القرآن بین الشیعہ والسنہ۔ ص ۲۶

۳۔ رجال کشی۔ حدیث ۵۲۵' مستدرک الوسائل۔ ج ۱۲۔ ص ۳۱۵

''اے مفضل! ان (غالیوں) کے ساتھ نشست و برخاست نہ رکھو' نہ ان کے ساتھ کچھ کھاؤ پیو اور نہ ان کے ساتھ مصافحہ کرو۔''

ایک اور روایت میں امامؑ نے ایک مرتبہ پھر اسی بات کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا:

"واما ابو الخطاب محمد ابی زینب الاجدع' ملعون واصحابہ ملعونون' فلاتجالس اهل مقالتهم. فانی منهم بری و آبائی منهم براء." (۱)

''ابوالخطاب اور اس کے اصحاب ملعون ہیں۔ اس کی باتوں پر اعتقاد رکھنے والوں کے ساتھ میل ملاپ نہ رکھو' کہ میں اور میرے آباء ان سے بیزار ہیں۔''

امامؑ خاص طور پر شیعہ نوجوانوں کے بارے میں زیادہ حساس تھے اور فرماتے تھے:

"احذروا علی شبابکم الغلاة لا یفسدوهم. الغلاة شر خلق الله. یُصَغِّرون عظمة الله و یدعون الربوبیّة لعباد الله." (۲)

''اپنے جوانوں کے بارے میں غالیوں سے ہوشیار رہو' کہ کہیں وہ انہیں خراب نہ کر دیں۔ غالی خدا کی بدترین مخلوق ہیں' یہ خدا کی عظمت کو کم کرتے ہیں اور بندگانِ خدا کی ربوبیت کا دعویٰ کرتے ہیں۔''

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے شیعوں کو صرف غالیوں ہی کی ہم نشینی سے نہیں روکا' بلکہ آپ انہیں ہر بدعت گزار کے ساتھ نشست و برخاست سے روکا کرتے تھے:

"واحذر مجالسة اهل البدع. فانها تنبت فی القلب کفراً وضلالاً مبیناً." (۳)

''اہلِ بدعت کے ساتھ ہم نشینی سے پرہیز کرو' کیونکہ یہ دل میں کفر کی نشوونما اور کھلی گمراہی کا سبب بنتی ہے۔''

امامؑ نے شیعہ معاشرے سے غالیوں کو دور کرنے کی غرض سے اُن کے عقائد کو مسترد کیا اور اپنی طرف منسوب احادیث وروایات کو پرکھنے کے لیے ''کتاب اللہ'' کو میزان اور پیمانہ قرار دے کر شیعوں سے چاہا ہے کہ وہ غالیوں کے جھوٹے دعووں کو قبول نہ کریں۔

شہرستانی کے بقول' سدیر صیرفی امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: میری جان آپ پر فدا ہو! آپ کے

۱۔ الغیبہ۔ ص ۱۷۷' مستدرک الوسائل۔ ج ۱۲۔ ص ۳۱۵

۲۔ الامالی شیخ طوسی۔ ج ۲۔ ص ۲۶۴

۳۔ مستدرک الوسائل۔ ج ۱۲۔ ص ۳۱۵' از مصباح الشریعہ۔ ص ۳۸۹

شیعوں میں آپ کے بارے میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ کے کان میں بات کہی جاتی ہے' بعض کہتے ہیں آپ پر وحی ہوتی ہے' کچھ کا کہنا ہے کہ آپ کے دل پر الہام ہوتا ہے' کچھ کہتے ہیں کہ آپ کو خواب میں ہدایات دی جاتی ہیں' بعض کہتے ہیں کہ آپ اپنے آباؤ اجداد کی کتابوں سے فتویٰ دیتے ہیں۔ ان میں سے کونسی بات کو قبول کیا جائے؟

امامؑ نے فرمایا:

"لاتـأخذ بشيء مما يقولون. نحن حجة الله و أمناء ه على خلقه' حلالنا من كتاب الله و حرامنا منه."(۱)

"جو باتیں یہ لوگ کہتے ہیں' اُن سب کو چھوڑ دو۔ ہم اللہ کی حجت اور اس کی مخلوق پر اس کے امین ہیں۔ ہمارا حلال وحرام کتاب خدا سے ہے۔"

یہ روایت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ غالیوں کی طرف سے ائمہؑ کی جانب جھوٹی باتیں منسوب کرنے کی وجہ سے بعض لوگوں کے ذہن میں یہ تصورات پیدا ہونے لگے تھے کہ کیا سچ مچ ائمہؑ کوئی نیا دین لے کر آئے ہیں؟ اور کیا اُن پر کوئی نئی وحی ہوتی ہے؟ یا معاملہ کچھ اور ہے؟ امامؑ نے اس بات کی تاکید کر کے کہ ان کے پاس جو کچھ ہے وہ کتاب اللہ ہی کی تعلیمات ہیں' اپنے شیعوں سے چاہا کہ وہ ان غلط عقائد کو ماننے اور ان کی پیروی کرنے سے پرہیز کریں۔

ایک اور روایت' جسے شہرستانی نے تحریر کیا ہے' اُس میں ہے کہ فیض بن مختار امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا: میں آپ پر فدا ہو جاؤں! آپ کے شیعوں میں یہ کیسا اختلاف پیدا ہو گیا ہے؟ میں کبھی کبھی کوفہ میں اُن کے پاس جاتا ہوں' تو شک وشبہ کا شکار ہونے لگتا ہوں۔ پھر میں مفضل سے ملتا ہوں اور وہاں وہ کچھ حاصل کرتا ہوں جو میرے اطمینان کا باعث بنتا ہے۔ امامؑ نے فرمایا:

"اجل! ان الناس اغرّوا بالكذب علينا حتى كان الله فرضه عليهم لايريد منهم غيره، و انى لاحدث احدهم الحديث، فلايخرج منى حتى يتاوله على غير تأويله."(۲)

"دیکھو لوگ ہم پر جھوٹ باندھنے کی گمراہی میں مبتلا ہو گئے ہیں' گویا خدا نے ان پر یہ فرض کر دیا ہے اور وہ اس کے علاوہ اُن سے کچھ اور نہیں چاہتا۔ میں ان میں سے کسی کے لیے کوئی حدیث بیان کرتا ہوں' لیکن وہ میرے پاس سے اٹھ کر اس کی ایسی تاویل کرتا ہے جو اصل معنی کے برخلاف ہوتی ہے۔"

۱۔ دیکھئے: مجلہ "تراثنا" شمارہ ۱۲۔ ص ۱۷۔۱۸ مقالہ "اهل البيت فى راى صاحب الملل و النحل"

۲۔ مفاتیح الاسرار۔ برگ ۳۶۔ نقل از مجلہ "تراثنا" شمارہ ۱۲۔ ص ۱۸

ایک اور روایت جسے "سہمی" نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے' اس میں ہے کہ عیسیٰ الجرانی نے کہا: میں جعفر بن محمد الصادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے پوچھا: جو کچھ میں نے ان لوگوں سے سنا ہے' کیا وہ آپ کو بتاؤں؟ فرمایا: بولو۔ میں نے کہا: "فانّ طائفة منهم عبدوک و اتّخذوک الهاً من دون الله و طائفة أخری و الوا لک النبوة و .... "(ان کا ایک گروہ آپ کی عبادت کرتا ہے اور خدا کی بجائے آپ کو معبود مانتا ہے' اور ایک اور گروہ آپ کو نبوت تک لے جاتا ہے اور ۔۔) یہ سن کر امام نے اس قدر گریہ فرمایا کہ آپ کی ریش مبارک تر ہوگئی۔ اس کے بعد فرمایا:

"ان امکننی الله من هؤلاء فلم اسفک دمائهم سفک الله دم ولدی علی یدی."(۱)

"اگر خدا مجھے ان پر غلبہ عطا فرمائے اور میں ان کا خون نہ بہاؤں' تو خدا میرے ہاتھوں میرے بیٹے کا خون بہائے۔"

اس بات کا امکان ہے کہ اس قسم کی خبروں کے راوی' بالخصوص وہ لوگ جو اہلِ سنت کا مزاج رکھتے تھے' انہوں نے ان میں اپنی طرف سے کچھ باتوں کا اضافہ کردیا ہو' لیکن بہرصورت ان سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ غالیوں کی وجہ سے اسلامی معاشرے میں ائمہ کی شخصیت پر انگلیاں اٹھائی جارہی تھیں اور بہت سے لوگوں کے اذہان میں اس قسم کے سوالات جنم لے رہے تھے۔

بعض غالی حضرات امام محمد باقر علیہ السلام کے مہدی ہونے کا عقیدہ بھی رکھتے تھے' جس کی امام جعفر صادق علیہ السلام نے تردید کی۔(۲) غالی بعض ائمہ کی نبوت کا عقیدہ بھی رکھتے تھے۔ اس بارے میں امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

"مَنْ قال: انّا انبیاء' فعلیه لعنة الله و من شک فی ذلک فعلیه لعنة الله."(۳)

"جو یہ کہے کہ ہم نبی ہیں' اُس پر اللہ کی لعنت ہو اور جو ہماری اس بات میں شک کرے' اس پر بھی اللہ کی لعنت ہو۔"

بعض غالیوں نے لفظ "الہٰ" اور لفظ "امام" کو ایک ہی قرار دیا' اور آیت: وَ هُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ (سورۂ زخرف ۴۳۔ آیت ۸۴) کی تاویل کرتے ہوئے کہا کہ زمین کے "اِلٰہ" سے مراد امام ہیں۔ ایسی ہی باتیں تھیں جو اس بات کا سبب بنیں کہ امام جعفر صادق علیہ السّلام نے غالیوں کو مجوس' یہود' نصاریٰ اور مشرکین سے

۱۔ تاریخ جرجان۔ ص ۳۲۲۔۳۲۳

۲۔ رجال کشی۔ ص ۳۰۰

۳۔ ایضاً۔ ص ۳۰۱

بدتر قرار دیا۔(۱)

امامؑ نے غالیوں کے اُن عقائد کے خلاف انتہائی سخت رویہ اختیار کیا جن میں وہ ائمہؑ سے "الوہیت" کے کسی پہلو کو نسبت دینے کی کوشش کرتے تھے۔ آپ فرماتے تھے:

"لعن اللّٰہ من قال فینامالانقوله فی انفسنا ولعن اللّٰه من ازالنا عن العبودیة للّٰه، الذی خلقنا والیه مآبنا ومعادنا وبیده نواصینا." (۲)

"اُس شخص پر خدا کی لعنت ہو جو ہمارے بارے میں ایسی بات کہے جو ہم خود اپنے بارے میں نہیں کہتے۔ خدا کی لعنت ہو اس پر جو ہمیں اس خدا کی عبودیت سے جدا کردے جس نے ہمیں خلق کیا ہے اور جس کی طرف ہمیں لوٹنا ہے اور اسی کے ہاتھ میں ہماری تقدیر ہے۔"

ایک اور روایت میں آپ نے فرمایا ہے:

"لعن اللّٰه المفوّضة" (۳) فانهم صغروا عصیان اللّٰه و کفروا به اشرکوا وضلوا واضلوا فراراً من اقامة الفرائض واداء الحقوق." (۴)

"خدا مفوضہ پر لعنت کرے۔ انہوں نے خدا کی نافرمانی کو معمولی کر دیا ہے' خدا کا انکار کیا ہے' شرک کیا ہے' گمراہ ہوئے اور گمراہ کیا ہے' تاکہ فرائض کی انجام دہی اور حقوق کی ادائیگی سے راہِ فرار اختیار کریں۔"

اسلام کے بدیہی اور ضروری امور کا انکار کرنے والے افراد کو کافر قرار دینا' فقہائے اسلام کے نزدیک قابلِ قبول امر ہے۔ اس امر کو اگر اس کے فطری طریقے سے استعمال کیا جائے' تو اس کے ذریعے بعض انحرافات کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ امامؑ نے غالیوں کی تکفیر کے ذریعے اس بات کی کوشش کی کہ انہیں مسلمان معاشرے سے دور رکھا جائے اور شیعی فکر کو ان کی خباثتوں سے مکمل طور پر نجات دلائی جائے۔

غالیوں کے وہ اقدامات جو تاویل کی جانب مائل ہوا کرتے تھے' اُن میں سے ایک اقدام یہ تھا کہ انہوں نے دینی مفاہیم کو علامتی (symbolic) بنادیا تھا۔ اس طرح یہ مفاہیم اپنے اصل معنی سے جدا ہو کر کسی اور معنی سے نزدیک

۱۔ رجال کشی۔ ص ۳۰۰

۲۔ ایضاً۔ ص ۳۰۲

۳۔ وہ لوگ جو غالیوں سے ایک درجہ نیچے ہیں۔

۴۔ علل الشرائع۔ ج ۱۔ ص ۱۲۷' بحار الانوار۔ ج ۲۳۔ ص ۲۷۰

ہو جاتے اور اپنی حقیقت کھو بیٹھتے تھے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے غالیوں کے ایک سرغنہ ابوالخطاب کو ایک خط میں تحریر فرمایا:

"بلغنی انک تزعم انّ الزنا رجل' وانّ الخمر رجل' وانّ الصلاة رجل' وانّ الصیام رجل' وانّ الفواحش رجل' ولیس ھو کما تقول' انا اصل الحق' وفروع الحقّ طاعة اللّٰہ' وعدوّنا اصل الشرّ وفروعھم الفواحش."(۱)

"میں نے سنا ہے کہ تم نے کہا ہے کہ زنا' شراب' نماز' روزہ اور فواحش کچھ لوگوں کے نام ہیں۔ تم جیسے کہہ رہے ہو ایسا نہیں ہے۔ ہم حق کی اصل ہیں اور حق کی فروع خدا کی اطاعت ہے۔ ہمارے دشمن شر کی اصل ہیں اور اس کی فروع فواحش اور برائیاں ہیں۔"

ایک اور روایت میں امام نے فرمایا:

"..... علی ابی الخطاب لعنة اللّٰہ والملائکة والناس اجمعین فاشھد انّہ کافر فاسق مشرک."(۲)

"ابوالخطاب پر خدا' فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہو۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ وہ کافر' فاسق اور مشرک ہے۔"

ایک اور مقام پر امامؑ نے غالیوں سے فرمایا:

"توبوا الی اللّٰہ فانکم فسّاق کفار مشرکون."(۳)

"خدا کی بارگاہ میں توبہ کرو' کہ تم لوگ کافر' فاسق اور مشرک ہو۔"

امامؑ کی جانب سے خوارج (غالیوں) کی کھلے لفظوں میں تکفیر نے غالیوں کے اُن ہر قسم کے جھوٹے دعووں کا راستہ بند ہو گیا جن کے تحت وہ یہ ظاہر کیا کرتے تھے کہ امام جعفر صادقؑ نے صرف تقیے کی وجہ سے اُن کے ساتھ یہ طرزِ عمل اختیار کیا ہوا ہے۔ یہ رویہ اور وہ بھی اس صریح انداز میں' غالیوں کے ساتھ شیعوں کے میل جول کے مکمل طور پر خاتمے کا سبب بنتا تھا۔

وہ چیزیں جو غالیوں کے نظریات پھیلنے کا سبب تھیں' اُن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ اپنے پیروکاروں کو' فقہی

۱۔ بحار الانوار۔ ج ۴۷۔ ص ۲۱۹
۲۔ ایضاً۔ ص ۲۹۷
۳۔ ایضاً۔ ص ۲۹۷

فروعات پر عمل'' کی پابندی سے چھٹکارے اور بسا اوقات ''شرعی محرمات'' پر عمل کی دعوت دیتے تھے۔ وہ امام جعفر صادق کا ایک قول بیان کیا کرتے تھے کہ: ''جو کوئی امام کی معرفت حاصل کر لے وہ جو عمل چاہے انجام دے سکتا ہے۔'' امام نے اس شبہ کے جواب میں فرمایا:

''انما قلتُ: اذا عرفتَ فاعمل ما شئت من قليل الخير و كثيره فانه يقبل منك.''

''میں نے کہا ہے: جب تم نے (امام کی) معرفت حاصل کر لی تو کم عمل خیر انجام دو یا زیادہ (اس معرفت کی وجہ سے) تمہارے اعمال قبول ہوں گے۔''(۱)

امام کا مقصد اس اہم اصول کو بیان کرنا تھا جس پر شیعہ عقیدہ رکھتے تھے اور وہ یہ کہ احکام امر ولایت کے تابع ہوتے ہیں اور اگر ولایت نہ ہو تو بغیر ولایت رکھے ان اعمال کی انجام دہی سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ غالیوں نے اس عقیدے کی اس کے حقیقی معنی سے ہٹ کر تاویل کی تھی۔

غالیوں کی بے عملی اس بات کا سبب بنی کہ شیعوں نے انہیں پہچاننے کے لیے احکام فقہی کا لحاظ رکھنے کو معیار قرار دے دیا اور وہ اسی طریقے سے غالی اور غیر غالی شخص میں تمیز کرتے تھے۔(۲) روایات میں احکام شرعی پر عمل کرنے کے بارے ائمہ کی تاکید ایک اعتبار سے غالیوں کی تکذیب ہے۔ ''انما شيعتنا من اطاع الله.'' (یقیناً ہمارے شیعہ خدا کی اطاعت کرنے والے لوگ ہیں) اور ''لاتنال ولايتنا الا بالورع.'' (ہماری محبت تقویٰ کے بغیر حاصل نہیں ہوتی)(۳) جیسی عبارتیں اسی قسم کی روایات سے تعلق رکھتی ہیں۔

غالیوں کی پیدائش میں حماقت کے اثرات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔(۴) علاوہ ازیں وہ غالی جو ائمہ کی نیابت کا دعویٰ کرتے تھے اور انہیں مقام الوہیت تک پہنچاتے تھے تاکہ خود کو ان کا نبی ظاہر کریں ایسے غالیوں کی دنیا طلبی اور اپنے گرد مریدوں کا مجمع لگانے کی خواہش بھی غالیوں کی پیدائش میں اہم ترین اثر رکھتی ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرمایا کرتے تھے:

''انّ الناس اولعوا الكذب علينا.... وانّي اُحدّث احدهم بحديث فلا يخرج من عندي حتى يتأوّله على غير تاويله و ذلك انّهم لايطلبون بحديثنا وبحبنا ماعند الله و انما

۱۔ کافی۔ ج ۲۔ ص ۴۶۴

۲۔ رجال کشی۔ ص ۵۳۰

۳۔ مناقب الامام امیر المومنین (محمد بن سلیمان کوفی)۔ ج ۲۔ ص ۲۸۶

۴۔ ایضاً۔ ص ۲۹۵

یطلبون الدنیا۔"(۱)

"لوگوں کو ہم پر جھوٹ باندھنے کی حرص ہے۔۔۔۔ میں ان میں سے کسی کے سامنے کوئی حدیث بیان کرتا ہوں اور وہ میرے پاس سے اٹھنے سے پہلے ہی اس کی اس کے اصل معنی کی بجائے دوسرے معنی میں تاویل کر دیتا ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ یہ لوگ ہماری حدیثوں اور ہماری محبت سے اس چیز کے طلبگار نہیں جو خدا کے پاس ہے {یعنی ثواب} بلکہ وہ صرف دنیا کے طالب ہیں۔"

امامؑ نے اس مقصد کے لیے کہ شیعہ ایسی متضاد حدیثوں کا کھرا اور کھوٹا پن جانچ سکیں (جن میں سے بہت سی غالیوں کی گھڑی ہوئی تھیں) قرآنِ مجید کو کسوٹی قرار دیا۔ اس سلسلے میں آپ نے ایک مقام پر فرمایا:

"لا تقبلوا علینا حدیثاً الا ما وافق القرآن والسنّة او تجدون معه شاهداً من احادیثنا المتقدمة فان المغیرة بن سعید لعنهُ اللّٰه دسّ فی کتب ابی احادیث لم یحدّث بها ابی فاتقوا اللّٰه ولا تقبلوا علینا ما خالف قول ربّنا تعالی وسنّة نبینا فانا اذا حدثنا قلنا: قال اللّٰه عزّوجلّ وقال رسول اللّٰه۔"(۲)

"ہم سے روایت کی جانے والی صرف ان حدیثوں کو قبول کرو جو قرآن وسنت کے موافق ہوں یا ہماری پچھلی حدیثوں میں تمہارے پاس اُن کا کوئی شاہد موجود ہو۔ مغیرہ بن سعید (اُس پر خدا کی لعنت ہو) نے میرے والد کی کتابوں میں ایسی احادیث شامل کر دی ہیں جو ہرگز میرے والد نے بیان نہیں کی ہیں۔ اللہ کا خوف کرو اور ہم سے نقل ہونے والی ان باتوں کو قبول نہ کرو جو ہمارے پروردگار اور ہمارے نبیؐ کی سنت کے مخالف ہوں۔ کیونکہ ہم جب حدیث بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں: خدا اور اُس کے رسولؐ نے فرمایا ہے۔"

دوسرے مواقع پر بھی مذکورہ بالا روایت میں بیان ہونے والی غالیوں کی اس خبیث حرکت کا ذکر ہوا ہے اور اس روایت میں جن کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اُن کا مقصد بھی واضح کیا گیا ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مغیرہ امام محمد باقر علیہ السلام کے اصحاب کی لکھی ہوئی کتابوں کو مطالعے کے بہانے اپنے گھر لے جاتا اور "و یدسُّ فیها الکفر والزندقة و یسندها الی ابی ثم یدفعها الی اصحابه۔" (ان میں کفر اور

۱۔ مناقب الامام امیر المومنین (محمد بن سلیمان کوفی)۔ ص ۱۳۶

۲۔ ایضاً۔ ص ۲۲۴

زندقہ کی باتیں شامل کر کے انہیں میرے والد سے منسوب کر دیتا اور پھر وہ کتابیں اصحاب کو واپس کر دیتا)۔"

امام فرمایا کرتے تھے:

"فکلما کان فی کتب اصحاب ابی من الغلو فذاک مادسّه مغیرة بن سعید فی کتبهم."(۱)

"میرے والد کے اصحاب کی کتابوں میں جو کچھ غلو ہے وہ ان کتابوں میں مغیرہ کی شامل کی ہوئی باتیں ہیں۔"

امام جعفر صادق علیہ السلام کے اس راست اقدام کے نتیجے میں سچے شیعہ غلو سے محفوظ رہے۔ لیکن افسوس کہ اس کے ناپسندیدہ اثرات نے شیعیت کی بھرپور پیشرفت میں رکاوٹ کھڑی رکھی۔ ابوحنیفہ نے غلو ہی کی وجہ سے اپنے اصحاب سے کہا تھا کہ وہ حدیث غدیر کو نقل نہ کریں۔ (۲) اگرچہ یہ کام نقل حدیث کی دنیا میں بہت برا سمجھا جاتا ہے لیکن اس سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ غلو کی تحریک نے امیر المومنین کے فضائل کے بارے میں صحیح ترین حدیثوں کی روایت کو بھی کس قدر نقصان پہنچایا ہے۔

اہل بیتؑ کی روایات پر مبنی شیعہ فقہ

امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام کا دور مختلف میدانوں میں علوم اہل بیتؑ کی نشر و اشاعت کا دور تھا۔ یہ بات امام جعفر صادق کے بارے میں زیادہ صادق آتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کے دور امامت کے کچھ حصے میں آزاد سیاسی فضا میسر تھی جو ایک طرف بنی امیہ کی طاقتور حکومت کے زوال اور دوسری طرف بنی عباس کے اقتدار میں آنے کی وجہ سے پیدا ہونے والے سیاسی خلا کا نتیجہ تھی۔ امام نے شیعوں کی مکمل توجہ اہل بیتؑ کی جانب مبذول کروائی اور انہیں دوسروں کی احادیث کے ساتھ وابستگی سے منع کیا۔ یہ امر شیعہ فقہ کی مستقل اور خالص صورت میں تشکیل کا اہم ترین سبب تھا اور اس کی اہمیت پہلے ہی سے تقریباً امام محمد باقر علیہ السلام کے دور میں واضح ہوگئی تھی۔ اس کے باوجود ہم یہاں اس بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی تاکیدوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ آپ نے ایک روایت میں فرمایا:

"ایتها العصابة! علیکم بآثار رسول الله و سنته و آثار الائمة الهداة من اهل بيت رسول

۱۔ مناقب الامام امیر المومنین (محمد بن سلیمان کوفی)۔ ص ۴۲۵

۲۔ امالی شیخ مفید۔ ص ۲۷

اللہ."(۱)

"اے شیعو! رسول خداؐ کے آثار اور ان کی سنت اور رسول اللہؐ کے اہل بیتؑ میں سے ائمۂ ہدیٰ کے آثار پر توجہ دو۔"

اسی طرح آپ نے یونس بن ضبیان سے فرمایا:

"یایونس! ان اردت العلم الصحیح فعندنااھل البیت فانّاورثناواوتینا شرع الحکمۃ وفصل الخطاب."(۲)

"اے یونس! اگر تم صحیح علم حاصل کرنا چاہتے ہو تو وہ ہم اہلِ بیت ہی کے پاس ہے کیونکہ حکمت کے راستے اور حق اور باطل کی پہچان کی میزان ہمیں وراثت میں ملی ہے۔"

شیخ حرعاملی نے "وسائل الشیعہ" میں "باب وجوب الرجوع فی جمیع الاحکام الی المعصومینؑ" (تمام احکام میں معصومینؑ کی طرف رجوع کرنا واجب ہے) کے عنوان سے ایک باب قائم کیا ہے جو اسی حوالے سے اہلِ بیتِ عصمت وطہارت کی احادیث پر مبنی ہے۔(۳)

ابان بن تغلب امام جعفر صادق علیہ السلام کے ایک سچے اور آگاہ شیعہ کی حیثیت سے شیعہ مذہب کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"الشیعۃ الذین اذااختلف الناس عن رسول اللہ(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)اخذوا بقول علیؑ واذااختلف الناس عن علیؑ اخذوابقول جعفر بن محمد."(۴)

"شیعہ وہ ہیں کہ جب کبھی بھی لوگوں کے درمیان قولِ رسولؐ میں اختلاف پیدا ہوتا ہے تو وہ حضرت علیؑ کا قول قبول کرتے ہیں اور جب لوگوں میں حضرت علیؑ کے قول میں اختلاف پیدا ہوتا ہے تو وہ جعفر بن محمد (امام جعفر صادقؑ) کا قول قبول کرتے ہیں۔"

یونس بن یعقوب نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے عرض کیا: میں نے خود آپ سے سنا ہے کہ آپ نے علمِ کلام سے منع فرمایا ہے۔ امامؑ نے اُن کے جواب میں فرمایا: "انما قلت: ویل لھم ان ترکوا مااقول وذھبواالی ما

۱۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۱۸۔ ص ۲۳ اور ۶۱

۲۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۱۸۔ ص ۴۷

۳۔ ایضاً۔ ص ۴۱

۴۔ رجال النجاشی۔ ص ۱۲

یریدون. " (میں نے کہا تھا: وائے ہو ان پر اگر وہ اس چیز کو چھوڑ دیں جو میں کہتا ہوں اور اس طرف چلے جائیں جسے وہ خود چاہتے ہیں)۔(۱)

اسی لیے امام اپنے شیعوں کو ایک دوسرے کی مدد کی تاکید کیا کرتے تھے اور فرماتے تھے: "رحم اللّٰہ من احییٰ امرنا." یعنی خدا اس شخص پر رحمت نازل کرے جو ہمارے امر کو زندہ کرتا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام اپنی روایات اپنے شاگردوں کے سامنے بیان کرتے تھے اور آپ کے شاگرد چاہے وہ شیعہ ہوں یا سنی آپ کی روایات کو لکھ لیا کرتے تھے۔ فرق یہ تھا کہ اہل سنت ان احادیث کو اس انداز سے بیان کرتے تھے کہ جعفر بن محمد سے اور انہوں نے اپنے پدر گرامی سے اور انہوں نے اپنے اجداد سے اور انہوں نے رسول اللہؐ سے نقل کیا ہے۔(۲) بالفاظ دیگر اہل سنت سند کا ذکر کیا کرتے تھے جبکہ آپ کے شیعہ شاگرد سند کے بغیر صرف "عن ابی عبد اللّٰہ" لکھ کر نقل کرتے تھے۔ کیونکہ شیعوں کا ائمہ کی عصمت، اُن کی امامت اور قول امام کی حجیت پر اعتقاد انہیں سند کا ذکر کرنے سے بے نیاز کر دیتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ خود امام یہ تاکید فرماتے تھے کہ ان کی احادیث، احادیث رسولؐ ہی ہیں:

"حدیثی حدیث ابی و حدیث ابی حدیث جدّی و حدیث جدّی حدیث علی بن ابی طالب و حدیث علیّ حدیث رسول اللّٰہ و حدیث رسول اللّٰہ قول اللّٰہ." (میری حدیث میرے پدر گرامی کی حدیث ہے، میرے پدر گرامی کی حدیث میرے دادا کی حدیث ہے، میرے دادا کی حدیث علی ابن ابی طالبؑ کی حدیث ہے، علیؑ کی حدیث رسول اللہ کی حدیث ہے اور رسول اللہ کی حدیث اللہ کا قول ہے)۔(۳)

ائمہ علیہم السلام کی تقریباً تمام ہی احادیث اسی انداز سے نقل ہوئی ہیں، ماسوا یہ کہ کبھی حسب ضرورت کسی اور سے نقل کیا کرتے تھے۔ ابوبکر بن عیاش سے کہا گیا: جعفر بن محمد تک رسائی کے باوجود تم نے اُن سے حدیث کیوں نہیں سنی؟ اُس نے کہا: میں نے جعفر بن محمد سے اُن کی بیان کی ہوئی احادیث کے بارے میں پوچھا: کیا آپ نے ان میں سے کوئی چیز خود سنی ہے؟ (یعنی کیا حدیث میں آپ کا کوئی استاد ہے؟) تو انہوں نے کہا: نہیں "لکنّھا روایۃ رویناھا عن آبائنا." (یہ وہ روایتیں ہیں، جنہیں ہم اپنے آبا سے نقل کرتے ہیں)۔(۴)

یہ روایت بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے اور درحقیقت شیعہ عقائد کی ماہیت کو بنیادی اعتبار سے واضح کرتی ہے۔

۱۔ کافی۔ ج۱۔ ص ۱۷، وسائل الشیعہ۔ ج ۱۸۔ ص ۴۵

۲۔ مثال کے طور پر دیکھئے: تاریخ جرجان۔ ص ۱۷۰، ۲۶۴، ۲۶۵، ۳۰۵، ۵۷۰

۳۔ کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۱۷۰، کافی۔ ج۱۔ ص ۵

۴۔ تہذیب الکمال۔ ج ۵۔ ص ۷۷، الکامل فی ضعفاء الرجال۔ ج ۲۔ ص ۵۵۵

ابن عدیؒ کہتے ہیں: "ولجعفر بن محمد حدیث کبیر عن ابیہ عن جابر و عن ابیہ عن آبائہ و نسخا لاھل البیت یرویہ جعفر بن محمد." (جعفر بن محمد کی متعدد احادیث اپنے والد کے توسط سے جابر سے ہیں' نیز ان کے والد کے توسط سے ان کے اجداد سے ہیں' نیز اہل بیتؑ کے پاس ایک نسخہ بھی ہے جس سے جعفر بن محمد روایت کیا کرتے ہیں)۔(۱) وہ مزید کہتے ہیں کہ: ابن جریج' شعبہ بن حجاج اور دوسرے افراد آپ سے روایت کرتے ہیں۔

ابوزہرہ نے امام جعفر صادقؑ کے اساتذۂ حدیث کے بارے میں ہیر پھیر کی بھر پور کوشش کی ہے' تاکہ آپ کے اجداد طاہرینؑ کے علاوہ کسی اور واسطے سے آپ کا رسول اللہؐ سے اتصال ظاہر کرے۔ اس حوالے سے وہ صرف قاسم بن محمد بن ابی بکر کا نام ذکر کرسکا ہے۔(۲)

اگر امام جعفر صادق علیہ السلام بھی اُس زمانے کے معروف محدثین کی طرح (جیسا کہ ہم "تذکرۃ الحفاظ" میں دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اساتذۂ حدیث کے طور پر کم از کم دس افراد کا تذکرہ کیا ہے) اپنے اجداد طاہرینؑ کے علاوہ حدیث کے اساتذہ میں سے کسی سے رسول اللہ کی حدیث نقل کرتے' تو آپ بھی اپنے اساتذۂ حدیث کا تعارف کراتے۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ صرف اپنے اجداد کے طریق سے حدیث نقل کرتے ہیں جنہیں شیخ اور استادِ حدیث شمار نہیں کیا جاسکتا۔

ائمۂ اہل بیتؑ ابتدا ہی سے اس نکتے پر زور دیا کرتے تھے کہ حدیث میں اُن کا کوئی شیخ (استاد) نہیں ہے اور اُن کے علم کا سرچشمہ حدیث کے عام مشائخ (اساتذہ) کی بجائے کسی اور طریق سے ہے۔ امیر المومنینؑ یہی نکتہ بیان کرنے کے لیے فرماتے ہیں:

"الا انّ ابرار عترتی و طائب اُرومتی احلم الناس صغاراً و اعلمھم کباراً. الا و انّا اھل البیت من علم اللہ علمنا و بحکم اللہ حکمنا و من قولٍ صادقٍ سمعنا' فان تتبعوا آثارنا تھتدوا ببصائرنا' معنا رایۃ الحق من یتبعھا لَحِق و من تأخر عنھا غرق." (۳)

"میری عترت کے نیک اور میرے گھرانے کے پاک لوگ بچپن میں بردبار ترین اور بزرگی میں عالم ترین انسان ہوتے ہیں۔ ہم اہل بیت نے علم خدا سے علم حاصل کیا ہے اور حکم خدا سے حکم کرتے ہیں اور ہم نے سچے نبی کی باتیں سنی ہیں۔ اگر تم ہماری اور ہمارے آثار کی پیروی کرو گے' تو ہماری رہنمائی سے ہدایت

۱۔ الکامل فی ضعفاء الرجال۔ ج ۲۔ ص ۵۵۸

۲۔ الامام الصادق۔ ص ۸۸۔ ۹۰

۳۔ العقد الفرید۔ ج ۳۔ ص ۶۷ بنقل از الامام الصادق۔ ص ۹۰

پاؤ گے۔ پرچم حق ہمارے ساتھ ہے کہ جو بھی اس کی پیروی کرے گا وہ حق تک پہنچ جائے گا اور جو اس سے منھ موڑے گا وہ گمراہی میں غرق ہو جائے گا۔"

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

"انّ عندنا مالانحتاج معه الی الناس وان الناس لیحتاجون الینا وان عندنا کتابٌ املاء رسول الله وخط علیّ صحیفة فیها کلّ حلال وحرام."(۱)

"ہم اہل بیت کے پاس ایسی چیز ہے، جس کے ہوتے ہوئے ہمیں لوگوں کی ضرورت نہیں ہے، تاہم لوگوں کو ہماری ضرورت ہے۔ ہمارے پاس ایسی کتاب ہے جسے رسول اللہؐ نے املا فرمایا اور امیر المومنین نے اُسے لکھا ہے۔ ایسی کتاب جس میں ہر حلال اور حرام کا ذکر موجود ہے۔"

جو ہم آہنگی روایات کی شیعہ کتابوں میں پائی جاتی ہے وہ کسی صورت اہل سنت کی روایات کی کتابوں میں موجود نہیں۔ کیونکہ ان کی کتابیں اختلاف رائے سے پر اور ایسی احادیث سے لبریز ہیں جن کا مضمون آپس میں ہم آہنگ نہیں ہے اور اس کی جڑ صحابہ کے عقائد و نظریات سے جا کر ملتی ہے۔ اس صورت میں یہ نہایت بے انصافی ہے کہ کوئی شیعیت کا تعارف کراتے ہوئے اسے ایک ایسا فرقہ قرار دے جو ایسے افکار اور نظریات کا مرکب ہو جس میں بہت سے اوہام شامل ہو گئے ہیں۔(۲)

اسی لیے امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے زمانے کے اہل سنت محدثین کے علوم کی قدر پیمائی (evaluation) کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ان الناس بعدنبیّ الله رکب به سنّة من کان قبلکم فغیّروا وبدّلوا وحرّفوا وزادوا فی دین الله ونقصوا منه فما من شیء علیه الناس الیوم الاّ وهومتحرّف عمّانزّل به الوحی من عندالله."(۳)

"لوگوں نے رسول اللہؐ کے بعد گزشتہ امتوں کی سی راہ اختیار کر لی۔ پس دین خدا میں تبدیلیاں کیں، اس میں تحریف کی، اس میں اضافہ کیا اور اس میں سے کچھ کم بھی کیا۔ لہٰذا جو کچھ اس وقت ان کے پاس ہے وہ خدا کی طرف سے نازل کردہ دین کی تحریف شدہ شکل ہے۔"

۱۔ کافی۔ ج ۱، ص ۲۴۱

۲۔ الامام ابوحنیفہ۔ ص ۱۱۱

۳۔ ایضاً۔ ص ۱۴۰

ائمہ علیہم السلام کی روایات نے اہلِ سنت کی فقہ میں بھی سرایت کی اور ان کے بہت سے محدثین نے امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے روایات نقل کیں، جن میں سے کچھ ان کی احادیث کے مجموعوں میں موجود ہیں۔ حتیٰ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ کتبِ اہلِ سنت میں ایسی بکثرت روایات مل سکتی ہیں جو کبھی لفظی اعتبار سے اور کبھی مضمون کے اعتبار سے اہلِ بیتؑ کی روایات سے مشابہ ہیں۔

اہلِ سنت فقہا کے درمیان شدید اختلاف کی وجہ یہ تھی کہ انہیں بہت جلد اجتہاد کی ضرورت پیش آ گئی تھی اور انہوں نے نئے احکام حاصل کرنے کے لیے روایات سے استنباط کا کام شروع کر دیا تھا، جبکہ شیعہ مدتوں تک ائمہؑ کی روایات کی نصوص پر عمل کرتے رہے۔

اہلِ سنت کے کام کی اہم ترین خامی یہ تھی کہ اُن کے پاس کافی مقدار میں احادیث کا ذخیرہ موجود نہیں تھا (۱) اور جو مقدار موجود تھی، وہ بھی چند لوگوں کے حافظے میں محفوظ تھی جو مختلف دور دراز شہروں میں بکھرے ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں مضمون کے اعتبار سے بھی ان کے درمیان بہت سا اختلاف پایا جاتا تھا۔ لہٰذا ان روایات نے ان کے کام کی مشکل کو کئی گنا بڑھا دیا تھا۔ علمائے اہلِ سنت نے اس بڑی ناقابلِ حل مشکل کو خلفا، صحابہ اور تابعین کے افعال کو شرعی قرار دے کر ایک حد تک حل کیا۔ البتہ اس طرح کا عمل کس حد تک دینی اور عقلی اصولوں سے سازگار ہے، یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔

غیر شیعوں کی روایات کے ضعف کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام کے طریق سے ایک دلچسپ روایت نقل ہوئی ہے:

"یظن هٰؤلاء الذین یدعون انّهم فقهاء علماء انّهم قد اثبتوا جمیع الفقه والدین ممّا یحتاج الیه الامّة ولیس کل علم رسول اللّٰه علموه ولاصار الیهم من رسول اللّٰه ولاعرفوه وذلک انّ الشیء من الحلال والحرام والاحکام یرد علیهم فیسألون عنه ولا یکون عندهم فیه اثرعن رسول اللّٰه." (۲)

"فقاہت اور علمیت کا دعویٰ کرنے والے یہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ وہ سارا کا سارا فقہ اور دین جس کی لوگوں کو ضرورت ہے، ان کے پاس موجود ہے، حالانکہ یہ لوگ رسول اللہؐ کے علم میں سے کچھ بھی نہیں جانتے اور ان کے پاس رسول اللہؐ سے کچھ بھی نہیں پہنچا ہے۔ کیونکہ جب ان سے حلال و حرام کے احکام کے

۱۔ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ رسولِ خداؐ کے بعد لوگوں کو حدیث لکھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

۲۔ تفسیر العیاشی۔ ج ۲۔ ص ۳۳۱، وسائل الشیعہ۔ ج ۱۸۔ ص ۴۰

بارے میں پوچھا جاتا ہے' تو اس مسئلے کے بارے میں ان کے پاس رسول اللہ کی کوئی حدیث موجود نہیں ہوتی۔"

اہلِ سنت میں روایات کا یہ ضعف اور صحابہ اور تابعین کے عمل پر ان کا تکیہ کرنا' قدرتی طور پر ان کے فقہی ڈھانچے کی کمزوری کا باعث بنا۔ کیونکہ صحابہ اور تابعین کے درمیان نقطۂ نظر اور مزاج کا اس قدر زیادہ اختلاف تھا' کہ اُس نے ان کی آراء اور فتاویٰ کو جمع کرنا بہت مشکل بنا دیا تھا۔ ابوزہرہ' اُس زمانے کے بارے میں' جس میں ابوحنیفہ اور امام جعفر صادق نے زندگی بسر کی تھی' لکھتے ہیں:

"ولقد كثر المأثور من فتاوى الصحابة في ذلك العصر كثرة عظيمة شغلت عقول الفقهاء واتخذوا نبراساً في اجتهادهم فتأثروا بها في اجتهادهم."(۱)

"اُس زمانے میں صحابہ کے فتاویٰ پر مشتمل روایات اس قدر کثیر مقدار میں ملتی تھیں' کہ فقہا کے اذہان ان میں مشغول ہو گئے تھے اور ان لوگوں نے اپنے اجتہاد کے لیے ان روایات کو چراغ راہ بنا لیا تھا اور شدت کے ساتھ ان کے زیرِ اثر آ گئے تھے۔"

فقہائے اہلِ سنت نے علم اور فتوے کے ماخذ کے طور پر صحابہ اور تابعین کی سیرت پر تو تکیہ کیا ہی' لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ اور چیزیں سامنے لائے' جن میں سے اہم ترین قیاس ہے۔ ایک اہلِ سنت عالم نے قیاس کا سہارا لینے کی توجیہ کرتے ہوئے نصوص کی کمی کا مسئلہ اٹھایا ہے۔(۲) بالکل اسی رائے کا اظہار اُسی زمانے میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے کیا تھا۔ آپ نے مذکورہ بالا حدیث میں آگے چل کر روایات کے سلسلے میں اہلِ سنت کی تہی دستی کے بارے میں فرمایا ہے:

"ويستحيون ان ينسبهم الناس الى الجهل ويكرهون ان يسألوا فلايجيبون فيطلب الناس العلم من معدنه فلذلك استعملوا الرأي والقياس في دين الله وتركوا الآثار ودانوا بالبدع."(۳)

"انہیں اس بات سے شرم محسوس ہوتی ہے کہ لوگ انہیں جاہل اور نادان کہیں اور انہیں لوگوں کے سوالات کے جواب نہ دینا بھی پسند نہیں' (کیونکہ اس کے) نتیجے میں لوگ علم کو اس کے معدن (اہلِ بیتؑ) سے

۱۔ الامام ابوحنیفہ۔ ص ۱۰۵

۲۔ المدخل الفقہی العام۔ ج ۱۔ ص ۷۴۔ نقل از مجلّہ "نورِ علم" شمارہ ۱۰۔ ص ۵۵

۳۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۱۸۔ ص ۳۹

حاصل کریں گے۔ اسی لیے انہوں نے دین خدا میں رائے اور قیاس کو داخل کر دیا اور رسول اللہؐ کے آثار کو ایک طرف ڈال کر بدعت اختیار کرلی۔"

درج بالا روایت میں امامؑ نے رائے اور قیاس کی طرف فقہائے اہل سنت کے رجحان کی وجہ ان کے یہاں روایات کی کمی کو قرار دیا ہے اور خود اس رجحان کو روایات سے ان کی روگردانی کا سبب بتایا ہے۔

دراصل ان کا حدیث کی کمی پوری کرنے کے لیے رائے اور قیاس کا سہارا لینا' خود اس بات کا سبب بنا کہ وہ نصوص کے سامنے تعبد کی بجائے رائے اور قیاس کو حکم و فتوے کے (قریب قریب) ماخذ کا مقام دے دیں۔ ایسی فقہ' ایسے ماخذ کے ساتھ ایک درست اور روایات و احادیث کے مطابق فقہ نہیں ہو سکتی۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس قسم کے فقہی مکتب کے مخالف مؤقف اختیار کیا اور اپنی علمی سرگرمیوں کا بیشتر حصہ رائے اور قیاس کی مخالفت کے لیے مختص کر دیا۔ لہٰذا آپ سے اس بارے میں متعدد روایات نقل کی گئی ہیں۔ ہم نمونے کے طور پر ان میں سے چند روایات پیش کرتے ہیں۔

ابو حنیفہ ان لوگوں میں سے تھے' جنہوں نے رائے اور قیاس پر عمل میں گویا دوسروں پر سبقت لی ہوئی تھی' اور اُن کا فقہی مکتب' عراق میں مکتب رائے کے طور پر مشہور تھا۔ اس کی وجہ بھی یہ تھی کہ وہ ان روایات کو صحیح نہیں سمجھتے تھے جو اہل سنت کے طریق سے روایت ہوئی ہیں۔ اس بارے میں ابن خلدون لکھتا ہے: "ابو حنیفہ کے نزدیک قابل قبول روایات کی کل تعداد صرف سترہ یا اس کے قریب قریب تھی' اسی طرح مالک تین سو حدیثوں کو صحیح سمجھتے اور قبول کرتے تھے۔"(۱) ابو بکر بن داؤد کہتا ہے: "جو روایات ابو حنیفہ نے نقل کی ہیں ان کی تعداد ایک سو پچاس سے زیادہ نہیں ہے۔"(۲)

ابو حنیفہ کے رائے اور قیاس کی جانب رجحان اور نصوص پر عمل کو چھوڑنے کی دو وجوہات تھیں:

۱۔ موجودہ روایات کو تسلیم نہ کرنے کی وجہ سے وہ ان کو نقل کرنے اور ان پر عمل کرنے پر تیار نہیں تھے۔

۲۔ جب سے انہوں نے رائے اور قیاس پر عمل شروع کیا تھا' اس وقت سے اُن کی نظر میں ایسے ماخذ انہیں نصوص سے بھی بے نیاز کر دیتے تھے' یہاں تک کہ انہوں نے ان روایات سے بھی ہاتھ اٹھا لیا تھا جنہیں وہ صحیح اور قابل استناد سمجھتے تھے اور پورے طور پر رائے اور قیاس کے ہو کر رہ گئے تھے۔ البتہ محمد بن حسن شیبانی اور ابو حنیفہ کے دوسرے پیروکار اسے ایک الزام قرار دیتے ہیں۔

۱۔ مقدمۂ ابن خلدون۔ ص ۴۴۴

۲۔ تاریخ بغداد۔ ج ۱۳۔ ص ۴۱۶

بہر کیف عراق جو مکتب رائے کے پھیلاؤ کا مرکز شمار کیا جاتا تھا' وہی خطہ تھا جہاں شیعہ بھی بڑی تعداد میں بستے تھے۔ لہٰذا شیعوں اور اصحاب رائے کا آمنا سامنا ہونا ناقابلِ اجتناب نظر آتا ہے۔ اسی لیے امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنی پوری قوت رائے' قیاس اور استحسان جیسے ماخذ کو مسترد کرنے کے لیے صرف کی۔

امام جعفر صادق علیہ السلام اور ابوحنیفہ کے درمیان مناظرے کے بارے میں نقل ہونے والی ایک مشہور روایت کے مطابق امام نے انہیں دین میں قیاس کرنے سے منع فرمایا اور چند معاملات میں انہیں متوجہ کیا کہ ان میں قیاس کسی صورت مسئلے کا حل نہیں ہے۔ امام نے ان سے پوچھا: زنا زیادہ اہم ہے یا کسی کو قتل کرنا؟ ابوحنیفہ نے کہا: قتل۔ امامؑ نے فرمایا: خدا نے زنا کے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے چار گواہوں کا اور قتل کے دعوے کے اثبات کے لیے دو گواہوں کا تقاضا کیا ہے اور یہ مقتضائے قیاس کے خلاف ہے۔ اس کے بعد آپ نے پوچھا: نماز اہم ہے یا روزہ؟ انہوں نے کہا: نماز۔ امامؑ نے فرمایا: عورت پر ایامِ حیض میں چھوٹ جانے والی نمازوں کی قضا واجب نہیں' لیکن اس حالت میں چھوٹ جانے والے روزوں کی قضا اسے ادا کرنا چاہیے۔ یہ بھی قیاس کے ذریعے قابلِ توجیہ نہیں ہے۔(۱)

اسی طرح کی اور مثالیں دوسری روایات میں ذکر ہوئی ہیں۔(۲) یوں امامؑ نے اس بات کی نشاندہی کی کہ قیاس پر عمل فقیہ کو کس طرح اسلام کے ثابت اور مسلّمہ احکام کے خلاف فتویٰ دینے پر آمادہ کرتا ہے۔ اس روایت کو "موفق مکی" نے ابوحنیفہ کے مناقب میں اس انداز سے نقل کیا ہے کہ گویا یہ مناظرہ ابوحنیفہ اور امام محمد باقر علیہ السلام کے درمیان ہوا تھا' نہ کہ امام جعفر صادق علیہ السلام اور ابوحنیفہ کے درمیان۔ ساتھ ہی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابوحنیفہ نے یہ مثالیں امام محمد باقرؑ کے سامنے پیش کی ہیں اور امام کے اعتراض کے جواب میں وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ وہ قیاس کو قبول نہیں کرتا۔(۳)

امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے اصحاب کو اس صورت میں اہلِ رائے کے ساتھ میل جول سے روکتے تھے' جب ان کے ان سے متاثر ہونے کا امکان ہو۔(۴) اسی طرح قیاس پر عمل کی مذمت میں امامؑ سے بکثرت روایات نقل کی گئی ہیں(۵) اور آپ ان لوگوں کے حوالے سے اپنی شدید پریشانی کے اظہار میں دریغ نہیں فرماتے تھے' جو آپ سے حدیث بھی نقل کرتے تھے اور قیاس پر بھی عمل کرتے تھے۔

۱۔ دیکھئے: الموفقیات۔ ص ۷۶۔۷۷' شرح الاخبار۔ ج ۳

۲۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۱۸۔ ص ۳۰' الاحتجاج۔ ص ۱۹۶' وفیات الاعیان۔ ج ۱۔ ص ۴۷۱

۳۔ دیکھئے: الامام ابوحنیفہ۔ ص ۶۹

۴۔ المحاسن۔ ص ۲۰۵۔ حدیث ۳۵۶' وسائل الشیعہ۔ ج ۱۸۔ ص ۱۶

۵۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۱۸۔ ص ۲۳۔۲۹' کافی۔ ج ۱۔ ص ۵۸' علل الشرائع۔ ج ۱۔ ص ۸۱۔۸۳' رجال کشی۔ ص ۱۸۹' اور ۱۹۳۔۱۹۴

داؤد بن سرحان کہتے ہیں: میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے سنا کہ آپ نے فرمایا:

"انی لأحدث الرجل بالحديث وانهاه عن الجدال والمراء في دين الله وانهاه عن القياس فيخرج من عندي فيتأوّل حديثي على غير تاويله." (۱)

"کبھی میں کسی شخص کے لیے حدیث بیان کرتا ہوں اور اسے دین خدا میں جدال اور مراء سے منع کرتا ہوں اور قیاس سے روکتا ہوں' لیکن جوں ہی وہ میرے پاس سے نکلتا ہے' میری حدیث کی میری مراد کے برخلاف کسی اور طرح تاویل کر دیتا ہے۔"

یقیناً اگر امام جعفر صادق علیہ السلام قیاس' اس کے حامیوں اور اس کو ایجاد کرنے والوں کے مقابل اس دوٹوک انداز سے کھڑے نہ ہوتے' تو عراق میں شیعہ فقہ' جو اصحاب رائے سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہ تھی' اس سے متاثر ہو کر اپنی اصالت سے محروم ہو جاتی۔ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ شیعہ فقہا کس طرح وسیع حد میں نصوص کے تابع تھے' اور انہوں نے احکام کے استنباط کے دوران اسی کو اپنی مستقل روش بنایا ہوا تھا۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے انہی نصوص کی بنیاد پر فروعی احکام بیان کیے اور مستحکم اصول وقواعد کا حامل ایک ثروتمند اور بھرپور فقہی مکتب پیش کیا۔ یہ وہ کام ہے جس کی صورت گری میں شیخ طوسی نے "مبسوط" کے ذریعے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

سند کے مسئلے میں اہل سنت کے سامنے کئی دشواریاں حائل تھیں۔ اسی لیے ابوحنیفہ ان احادیث پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ احادیث کے بیشتر طریق اطمینان بخش نہیں تھے' اور ایک جملہ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ غیر شیعہ فقہ کا تکیہ احادیث کے ایسے ناقص مجموعوں پر تھا جن پر اعتماد کرنا مشکل تھا۔ اس کے مقابلے میں شیعہ عصمت ائمہؑ اور اہل بیتؑ کے پُرفیض سرچشمے سے وابستہ تھے' جس میں سرفہرست امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام تھے۔ اس لیے اس حوالے سے انہیں کوئی مشکل درپیش نہ تھی۔ حتیٰ بہت سے اہل سنت علما کو بھی اس حقیقت میں کوئی شک نہ تھا۔ خود ابوحنیفہ نے بھی قابل لحاظ تعداد میں اہل بیتؑ کے طریق سے آنے والی احادیث کو قبول کیا ہے۔ (۲) اہل بیتؑ کی روایات پر ابوحنیفہ کا اعتماد درج ذیل نقل سے معلوم ہوتا ہے:

"ایک دن ابوحنیفہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث سن کر آپ کی مجلس سے باہر آئے۔ اُن

۱۔ رجال کشی ص ۱۷۰۔۱۳۸ ۱۳۹

۲۔ دیکھئے: الآثار۔ جب احمد بن حنبل سے اس سند کے بارے میں پوچھا گیا: "عن موسى بن جعفر عن جعفر بن محمد عن محمد بن علي عن علي بن الحسين عن حسين بن علي عن علي بن ابيطالب عن النبي" تو انہوں نے کہا: یہ ایسی سند ہے جسے اگر کسی دیوانے پر پڑھا جائے تو وہ عاقل ہو جائے۔ دیکھئے: المناقب ابن شہر آشوب۔ ج ۲۔ ص ۳۷۸

سے کہا گیا: آپ نے جعفر بن محمد سے اُن کے اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان موجود واسطے کے بارے میں کیوں نہیں پوچھا؟ ابوحنیفہ نے جواب دیا: مجھے یہ حدیث اسی طرح قبول ہے۔''(۱)

جس سرچشمے پر شیعوں کا تکیہ تھا اہلِ سنت کے لیے بھی وہ قابلِ قبول تھا' کیونکہ امام جعفر صادق علیہ السلام احادیث کو اپنے آبا کے واسطے سے روایت کرتے تھے' جس کی بنیاد امیر المومنینؑ اور پھر رسولِ خدا تک پہنچتی تھی۔ امیر المومنینؑ مسلسل سالہاسال رسولِ گرامی کی خدمت میں رہے تھے' اور آپ تمام فقہا اور محدثین کے لیے ایک قابلِ اعتماد محدث تھے۔

اموی دور میں شیعہ طریق کے سوا دوسروں کے باقی ماندہ آثار طاقِ نسیاں کی زینت بن گئے اور صرف اہلِ بیتؑ نے آنحضرتؐ کے آثار کی حفاظت کی اور انہیں دست بہ دست اپنی اولادوں اور اُن کے ذریعے سے اپنے شیعوں تک پہنچایا۔

ابوزہرہ' بنی امیہ کے دورِ حکومت میں امیر المومنین علیہ السلام کے بہت سے کلام کے برباد ہو جانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے: یہ بات غیر معقول نظر آتی ہے کہ وہ منبروں پر تو علیؑ پر سب وشتم کریں اور اس بات کی اجازت دیں کہ لوگوں کے درمیان ان کی احادیث علومِ اسلامی کے چھلکتے ہوئے سرچشمے کے طور پر عام رہیں۔۔۔ لہٰذا اُن کے علوم صرف اُن کے اہلِ بیتؑ کے پاس باقی رہ گئے۔ اسی لیے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ امیر المومنینؑ سے روایت کا علم اپنی مکمل صورت میں آپ کے خاندان کے پاس محفوظ تھا۔ آپ کی اولاد نے اُن احادیث کو جو آپ نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ سے روایت کی تھیں' نیز آپ کے فتاویٰ اور فقہ کو مکمل یا قریب قریب مکمل طور پر نقل کیا ہے۔(۲)

جس روایت کا سلسلۂ سند امام جعفر صادق علیہ السلام سے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک مکمل ہو' اُس کی سند کسی اور سند کے ساتھ قابلِ موازنہ ہے ہی نہیں۔ ائمہ علیہم السلام کی شخصیت اخلاقی اعتبار سے بھی اور علمی اعتبار سے بھی' حتیٰ اہلِ سنت کی نظر میں جو سادہ ترین معیار پایا جاتا ہے' اُس کے مطابق بھی ہر شخص سے بالاتر ہیں۔ لہٰذا علمِ رجال میں اہلِ سنت کے قدیم ترین ماہر ''عجلی'' امام جعفر صادقؑ کے نام کے ذیل میں لکھتے ہیں: **جعفر بن محمد بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم اجمعین' ولهم شیء لیس لغیرهم' خمسة ائمة.** (ان کو ایسا امتیاز حاصل ہے جو کسی اور کو حاصل نہیں' اور وہ یہ کہ یہ پانچوں امام ہیں)۔(۳)

۱۔ امالی شیخ مفید۔ ص ۲۱۔۲۲

۲۔ الامام الصادق۔ ص ۱۹۵

۳۔ تاریخ الثقات۔ ص ۹۸

قرآن حدیث پر حاکم ہے

امام جعفر صادق علیہ السلام نے قرآن کو اصل اور حدیث کو فرع کے طور پر پیش کیا اور حدیث کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار اس کی قرآن کے ساتھ مطابقت کو قرار دیا۔ یہ وہ اصول ہے جس کی ترویج تمام ائمۂ اہل بیت کیا کرتے تھے۔(۱) امام جعفر صادق نے اپنے شیعوں کو حکم دیا کہ وہ صرف اُس حدیث کو صحیح سمجھیں جو قرآن کے مطابق ہو۔ امام جعفر صادق سے متعدد بار یہ روایت نقل ہوئی ہے کہ:

"اذا ورد علیکم حدیث فوجدتموه له شاهداً من کتاب الله او من قول رسول الله والا فالذی جاء کم به اولی به."(۲)

"جب تمہیں کوئی حدیث ملے، تو اگر اس پر قرآن یا حدیثِ رسولؐ سے کوئی شہادت دستیاب ہو، تو اسے قبول کر لو۔ بصورتِ دیگر یہ حدیث اسی کے لیے بہتر ہے جس نے اسے تمہارے لیے نقل کیا ہے۔"

نیز فرمایا:

"ما اتاکم عنا من حدیث لایصدّقه کتاب الله فهو باطل."(۳)

"جس حدیث کی تائید کتاب اللہ سے نہ ہو، وہ باطل ہے۔"

اور فرمایا:

"ما لم یوافق من الحدیث القرآنَ فهو زخرف."(۴)

"جس حدیث کی موافقت قرآن نہ کرے، وہ درست نہیں ہے۔"

یہ نظریہ کہ قرآن حدیث پر حاکم ہے، ایسے بہت سے فکری انحرافات سے روکتا تھا جو "السنة قاضیة علی الکتاب" (یعنی سنت کتاب پر حاکم ہے) کے نظریے سے پیدا ہوتے تھے۔ اسی طرح یہ نظریہ غالیوں کے افکار و نظریات کی راہ میں بھی رکاوٹ تھا، جو تحریفِ قرآن کا احتمال دے کر اپنی تمام غلط باتوں کو ائمہؑ کے نام سے اور حدیث کے طور پر

۱۔ اس بارے میں ائمہؑ کی احادیث "جامع الاخبار" اور "الآثار عن النبیؐ والائمہؑ" (ناشر موسسۃ الامام المہدیؑ) جلد ا صفحہ ۳۹۵۔۴۰۶ میں آئی ہیں۔

۲۔ کافی۔ ج ا۔ ص ۶۹، المحاسن۔ ج ا۔ ص ۲۲۵، بحار الانوار۔ ج ۲۔ ص ۲۴۳

۳۔ المحاسن۔ ج ا۔ ص ۲۲۱، تفسیر العیاشی۔ ج ا۔ ص ۹

۴۔ کافی۔ ج ا۔ ص ۶۹

پھیلانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام خود نامور مفسرِ قرآن تھے' جن کی تفسیری روایات' مجمع البیان اور اس سے پہلے تفسیر قمی اور تفسیر عیاشی میں درج ہوئی ہیں۔ آپ قرآن کے بارے میں فرماتے تھے: "ان القرآن حیّ لم یمت وانه یجری کما یجری اللیل و النهار و کما یجری الشمس والقمر." (قرآن زندہ ہے' کبھی نہیں مرے گا' اور یہ دن رات اور چاند سورج کی طرح جاری رہے گا)۔(۱) اسی طرح آپ نے فرمایا: "ان القرآن فی کل زمان جدید." (قرآن ہر زمانے میں جدید ہے)۔(۲)

اس کے علاوہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے قرآنی سورتوں کی تلاوت کے فضائل کے بارے میں روایات بیان کر کے مسلمانوں کے درمیان قرآن کو زندہ کرنے کی کوشش کی۔ ایک روایت میں آپ سے نقل کیا گیا ہے کہ روز قیامت بارگاہِ خدا میں تین چیزیں شکایت کریں گی ۔۔۔ اور تیسری چیز: "مصحف معلق قد وقع علیه الغبار لا یقرء فیه." (وہ قرآن ہے جس پر غبار جم جائے اور اسے پڑھا نہ گیا ہو)۔(۳)

حضرت تاکید فرماتے تھے کہ: وہ تاجر جو رات گئے بازار سے گھر پلٹتا ہے' اسے بھی قرآن کا ایک سورہ پڑھنا چاہیے۔(۴) نیز آپ اس بات پر بھی زور دیتے تھے کہ: قرآن کو حزن کے ساتھ پڑھا جائے۔(۵)

امام جعفر صادقؑ کے دور میں حدیث کی کتابت

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد حدیث لکھنے پر پابندی لگادی گئی تھی' یہاں تک کہ مدتوں لوگ اسے لکھنا ناپسند کرتے تھے' حتیٰ بعض اہل سنت محدثین تیسری صدی ہجری میں بھی حدیث لکھنے سے گریز کیا کرتے تھے۔(۶) اس کے مقابل اہل بیت عصمت ابتدا ہی سے اپنے اصحاب کو حدیث لکھنے اور اسے فراموشی سے بچانے کی ترغیب دیتے تھے۔(۷) امام جعفر صادقؑ بھی اپنے آباؤ اجداد کی روش کی پیروی کرتے ہوئے اس امر کی تاکید کیا کرتے

۱۔ تفسیر العیاشی۔ ج ۲۔ ص ۲۰۳

۲۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۲۔ ص ۸۷' بحار الانوار۔ ج ۲۔ ص ۲۸۰

۳۔ کافی۔ ج ۲۔ ص ۶۱۳' الخصال۔ ص ۱۳۲

۴۔ کافی۔ ج ۲۔ ص ۴۹۹

۵۔ کافی۔ ج ۲۔ ص ۶۱۴

۶۔ تذکرۃ الحفاظ۔ ج ۱۔ ص ۶۱' ۳' اور ۳۸۲۔ ۳۳۱' جامع بیان العلم۔ ج ۱۔ ص ۸۷۔ ۹۷' سنن الدارمی۔ ج ۱۔ ص ۱۱۹۔ ۱۲۰

۷۔ طبقات الکبریٰ۔ ج ۶۔ ص ۱۶۸' تقیید العلم۔ ص ۸۹۔ ۹۰' ربیع الابرار۔ ج ۳۔ ص ۲۹۳' التراتیب الاداریہ۔ ج ۲۔ ص ۲۳۶ وغیرہ اور دیکھئے مقالہ: تاریخ تدوین حدیث۔ مجلہ "نور علم" دورہ دوم۔ ص ۱۹' ۲۱' ۲۲

تھے۔ اگر چہ آپ کے زمانے میں بعض افراد نے حدیث جمع کرنے اور اسے لکھنے کا کام شروع کر دیا تھا' لیکن اس معاملے میں اب بھی بہت سے لوگ شک وشبہ کا شکار تھے۔ ابوزہرہ نے یہ نقل کرتے ہوئے کہ امام جعفر صادقؑ حدیث کی کتابت کے طرفدار تھے' اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ حدیث کی کتابت اس زمانے میں عام ہو چکی تھی' جیسے کہ مالک بن انس نے اپنا مجموعۂ حدیث "الموطأ" اسی دور میں تالیف کیا۔ (۱) یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر چہ حدیث کی کتابت کا کام دوسری صدی کی ابتدا میں شروع ہو چکا تھا' اور اس کے بعض مجموعے تالیف ہو چکے تھے' لیکن جیسا کہ تاریخ گواہی دیتی ہے' الموطأ جیسے کام بہت کم ہیں اور حدیث کی زیادہ تر کتابیں دوسری صدی کے اواخر اور نمایاں طور پر تیسری صدی میں تالیف ہوئی ہیں۔ بطور مثال ابو حنیفہ نے اس حوالے سے کوئی مجموعہ تیار نہیں کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ ابو حنیفہ کہا کرتے تھے: میں حدیث کے استادوں سے ملا ہوں اور ان سے حدیث سنی ہے' لیکن جعفر بن محمد صحفی ہیں۔ جب یہ بات امام جعفر صادقؑ کے کانوں تک پہنچی' تو آپ مسکرائے اور فرمایا: وہ سچ کہتا ہے' میں صحفی ہوں' میں نے اپنے اجداد کے صحیفوں اور ابراہیم و موسیٰ کے صحیفوں کو پڑھا ہے۔ (۲) اپنے اجداد کے صحیفوں سے وابستگی' اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ امام کو اپنے اجداد سے صحفی وراثت میں ملی تھی' اور یہ خود اس حقیقت کی واضح تائید ہے کہ شیعہ فقہ کو رسول خداؐ کے زمانے ہی سے حدیث کے ایک تدوین شدہ مجموعے کی پشت پناہی حاصل رہی ہے۔ اس بارے میں شیعہ کتب احادیث میں موجود دسیوں روایات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ ائمہ علیہم السلام لوگوں کے لیے حدیث کے ان صحیفوں سے حدیثیں روایت کیا کرتے تھے اور بعض اوقات اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ آپ کے اصحاب ان صحیفوں کا مطالعہ کریں۔ (۳) جبکہ دوسرے حدیثوں کو صرف حفظ کرتے تھے اور صحیفوں پر اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔ لہٰذا سعید بن عبدالعزیز سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا: لا یؤخذ العلم من صحفیٍ. (کسی صحفی سے علم حدیث نہیں سیکھا جا سکتا)۔ (۴)

امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایسی متعدد روایات نقل ہوئی ہیں جن میں آپ نے اپنے اصحاب کو حدیث لکھنے کی ترغیب دی ہے' یہ روایات اس بات کی علامت ہیں کہ آپ کے دور میں تدوین حدیث کی جانب بہت کم رجحان پایا جاتا تھا۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: "اکتب و بث علمک فی اخوانک. فان مت فورث کتبک بنیک." (لکھو اور اپنا علم اپنے بھائیوں میں پھیلاؤ' اور جب مرنے لگو تو اپنی کتابیں اپنے بچوں کے

۱۔ الامام الصادقؑ۔ ص ۹۵

۲۔ روضات الجنات۔ ج ۸۔ ص ۱۶۹

۳۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۹۵۔ ۹۸' اور ۷۷ مکاتیب الرسولؐ۔ ص ۷۳۔ ۷۶

۴۔ تذکرۃ الحفاظ۔ ج ۱۔ ص ۳۱۹

لیے وراثت میں چھوڑ جاؤ)۔(۱)

امام جعفر صادقؑ اور اہلِ سنت کی فقہی بنیادیں

تشیع کا فقہی مکتب' بعض پہلوؤں سے اہلِ سنت کے فقہی نظریے سے مختلف ہے۔ امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے دور میں علم فقہ وسعت اختیار کر رہا تھا' اور جدید مسائل پر کلی احکام کی تطبیق کے بارے میں مختلف دلیلیں اور حجتیں وضع کی جارہی تھیں۔ امام جعفر صادقؑ کی رائے بھی یہی تھی کہ رسولِ خداؐ کے مکمل آثار صرف اہلِ بیت رسالتؑ کے پاس ہیں۔ کیونکہ جب دوسرے انہیں ضائع کر رہے تھے' تو انہوں نے ان آثار کو ہر قسم کی دست بُرد سے بچا کر مکمل طور پر اپنے پاس محفوظ رکھا۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے امام سے عرض کیا:

"اصلحک اللّٰہ' اتیٰ رسول اللّٰہ(ص) الناس بما یکفون فی عهده؟ قال: نعم و ما یحتاجون الیہ الی یوم القیامة. فقلت: فضاع من ذلک شیء؟ فقال: لا هو عند اهله."(۲)

"اے فرزندِ رسول! کیا رسولِ خداؐ نے اپنے زمانے میں وہ سب کچھ لوگوں تک پہنچا دیا تھا جن کی ان کو ضرورت تھی؟ آپ نے فرمایا: ہاں انہیں روزِ قیامت تک جس چیز کی بھی ضرورت تھی وہ سب آپ نے ان تک پہنچا دیا تھا۔ میں نے عرض کیا: کیا اس میں سے کوئی چیز ضائع ہوئی ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں' آنحضرتؐ کے اہلِ بیت کے پاس موجود ہے۔"

شیعوں پر سیاسی دباؤ

امام جعفر صادق علیہ السلام کے دورِ امامت میں صرف دوسری صدی ہجری کے تیسرے عشرے میں نسبتاً آزاد فضا میسر تھی۔ البتہ اس عشرے میں بھی آپ کی اور آپ کے شیعوں کی سرگرمیوں کی نگرانی کی جاتی تھی۔ لیکن اس سے پہلے بنی امیہ (جن کی حکومت کا خاتمہ سن ۱۳۲ ہجری میں ہوا) کے دور میں اور اس کے بعد منصور عباسی کی طرف سے شیعوں پر بہت زیادہ سختیاں روا رکھی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ ان سے اپنے وجود کے اظہار کا ہر قسم کا امکان سلب کر لیا گیا تھا۔ ایک روایت میں آیا ہے: "ابو جعفر ثانی (امام محمد تقی علیہ السلام) کے ایک صحابی نے آپ سے پوچھا: ہمارے مشائخ نے اپنے زمانے کی سخت پابندیوں کی وجہ سے حدیث نقل کرنے سے گریز کیا اور صرف حدیث لکھنے پر اکتفا کیا۔ اب وہ کتابیں

۱۔ کشف المحجہ' ابن طاؤس نقل از بحار الانوار۔ ج ۳۔ ص ۱۵۰

۲۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۱۸۔ ص ۲۳

ہمارے پاس موجود ہیں' کیا ہم ان کتابوں سے حدیث نقل کر سکتے ہیں؟ امامؑ نے فرمایا: ان کتابوں میں موجود روایات سچی ہیں۔ تم ان سے حدیث نقل کر سکتے ہو۔'' (۱)

درج بالا روایت اس حقیقت کی ترجمان ہے کہ اُس زمانے میں اہلِ بیتؑ اور اُن کے شیعوں پر سیاسی پابندیاں اس حد پر پہنچی ہوئی تھیں کہ شیعہ مشائخ ائمہؑ کی احادیث بھی نقل نہیں کر پاتے تھے۔ اصحابِ امام اپنے آپ کو منصور کی گزند سے محفوظ رکھنے کے لیے مکمل طور پر تقیہ کرنے اور اس بات کا خیال رکھنے پر مجبور تھے کہ ان سے معمولی سی بھی بے احتیاطی نہ ہو جائے۔

یہ پابندیاں قدرتی طور پر اس بات کا سبب بنیں کہ اہلِ بیتؑ کے علوم اور اُن کے فقہی فتاویٰ ایک حد تک متروک ہو گئے۔

ابان بن تغلب نے امامؑ سے عرض کیا: میں مسجد میں بیٹھتا ہوں اور لوگ مجھ سے فقہی مسائل کے بارے میں سوالات کرتے ہیں' اور جب تک جواب نہ دوں میری جان نہیں چھوڑتے۔ اگر میں آپ کی رائے بیان کروں تو اشکالات پیش آئیں گے۔ میں کیا کروں؟ امامؑ نے فرمایا: اُن کی جس رائے کو تم جانتے ہو وہ انہیں بتا دو۔ (۲)

امام جعفر صادق علیہ السلام کا بار بار تقیے کی تاکید کرنا' خود اس سیاسی دباؤ کی موجودگی کی واضح دلیل ہے۔ شیعوں پر یلغار کا خطرہ اتنا نزدیک تھا کہ امامؑ نے ان کی حفاظت کے لیے تقیہ ترک کرنے کو نماز ترک کرنے کے مترادف قرار دیا۔ (۳) اسی سلسلے میں امامؑ نے معلّی بن خنیس (جو اپنے زمانے کے حکام کے ہاتھوں مارے گئے) سے فرمایا: ''یا معلّی! اکتم امرنا و لاتذعہ' فانّ من کتم امرنا و لایذیعہ اعزّہ اللّٰہ فی الدنیا۔'' (اے معلّی! ہمارے امر کو پوشیدہ رکھو اور اسے ہر کسی کے سامنے بیان نہ کرو۔ جو کوئی ہمارے امر کو پوشیدہ رکھے گا اور اسے برملا نہیں کرے گا' اللہ تعالیٰ اسے دنیا میں عزت دے گا)۔ (۴)

بہر کیف ایسی روایات موجود ہیں جو بتاتی ہیں کہ یہ سختیاں اس قدر زیادہ تھیں کہ شیعہ ایک دوسرے کی جانب دیکھے بغیر ایک دوسرے کے قریب سے گزر جاتے تھے۔ (۵)

ایک اور روایت میں ابو جعفر منصور کے جاسوسوں کے بارے میں آیا ہے: کان لہ بالمدینۃ جواسیس

۱۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۵۳' وسائل الشیعہ۔ ج ۱۸۔ ص ۵۸

۲۔ ایضاً۔ ص ۳۳۹

۳۔ مستدرک الوسائل۔ ج ۱۲۔ ص ۲۵۴۔ ۲۵۵' وسائل الشیعہ۔ ج ۹۔ ص ۴۵۹

۴۔ مختصر بصائر الدرجات۔ ص ۱۰۱' وسائل الشیعہ۔ ج ۹۔ ص ۴۶۵

۵۔ ایضاً۔ ص ۲۷۸' مستدرک الوسائل۔ ج ۱۲۔ ص ۲۹۷۔ ۳۰۰' وسائل الشیعہ۔ ج ۱۹۔ ص ۳۲

ینظرون علی من اتّفق شیعة جعفر فیَضربون عنقهٗ. (مدینہ میں منصور کے ایسے جاسوس تھے جو جعفر کے شیعوں کے یہاں رفت وآمد رکھنے والوں کی نگرانی کرتے' اور ان کی گردن جدا کر دیتے تھے)۔(۱)

واقدی کی نقل کے مطابق' امام جعفر صادق علیہ السلام کے غلاموں میں سے ایک غلام معتب کو منصور نے گرفتار کرلیا اور اسے ایک ہزار کوڑے مارے یہاں تک کہ اس کی موت واقع ہوگئی۔(۲)

اس زمانے میں کسی پر بھی رافضی کا الزام لگا دینا اس کی جان و مال کو خطرے میں ڈالنے اور اس پر تشدد کا دروازہ کھولنے کے لیے کافی تھا۔(۳)

امام جعفر صادقؑ اور اہم سیاسی واقعات

الف: زید بن علی کا قیام

امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانے میں اہم سیاسی واقعات رونما ہوئے' ان میں علویوں کے قیام (۱۲۲ ہجری میں زید بن علیؑ کا قیام' ۱۴۵ اور ۱۴۶ ہجری میں محمد بن عبداللہ بن حسن اور اُن کے بھائی ابراہیم کا قیام) اور عباسیوں کی تحریک شامل ہیں جن کے نتیجے میں بنی امیہ کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور اقتدار کی باگ ڈور بنی عباس کے ہاتھ میں آئی۔ عباسیوں اور علویوں کی جدائی بھی (جس کے لیے عباسیوں کے اقتدار میں آنے سے پہلے ہی راہ ہموار ہو چکی تھی) امام جعفر صادقؑ کے دور میں پیش آنے والے اہم واقعات میں شامل ہے۔

یہاں ہم پہلی صدی ہجری کی ابتدا سے علویوں اور عباسیوں (مجموعی طور پر بنی ہاشم) کے ہاتھوں وجود میں آنے والے تمام اہم سیاسی اور دینی مسائل کو پوری تفصیل کے ساتھ اور مکمل طور پر بیان نہیں کر سکتے' لیکن مذکورہ مسائل میں سے ایسے مسائل کی وضاحت کی کوشش کریں گے جو کسی بھی طرح امام جعفر صادقؑ کے ساتھ مربوط ہیں۔

محبانِ اہلِ بیتؑ کے دلوں میں جو محبت علویوں (خصوصاً فاطمیوں) کے لیے تھی' بنی عباس اس سے محروم تھے۔ اس صورتحال کی متعدد وجوہات تھیں' جن میں سے اہم ترین ان کے ساتھ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا برتاؤ تھا۔ علاوہ ازایں امیر المومنینؑ اور اُن کے فرزندوں کی امامت کا مسئلہ' جو کم از کم شیعوں کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل تھا' اس نے ان کی محبوبیت کو اور بڑھا دیا تھا۔ نسلِ رسولؐ میں صرف فاطمی ہی تھے اور یہ بات بھی انہیں ایک خاص اہمیت اور مقام دے سکتی تھی۔

۱۔ وسائل الشیعہ۔ ص ۳۸۲۔۳۸۳

۲۔ المنتخب من ذیل المذیل۔ ص ۶۵۴

۳۔ المحاسن۔ ص ۱۱۹' حیاۃ الامام الباقرؑ۔ ج ۱۔ ص ۴۵۶

امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد کچھ عرصے کے لیے محمد بن حنفیہ ایک قابلِ توجہ اجتماعی اور سیاسی مقام کے حامل رہے' لیکن رفتہ رفتہ امام زین العابدین علیہ السلام کی علمی اور اخلاقی شخصیت نے معاشرے میں اپنی جگہ پیدا کی اور آپ اہلِ بیتِ رسولؐ کی واحد مرکزِ نگاہ شخصیت بن گئے۔ آپ کربلا کے ہولناک حادثے میں زندہ بچ جانے والے امام حسینؑ کے واحد فرزند تھے' اور آپ کی بقا سے امام حسینؑ کی اولاد سے دخترِ رسول حضرت فاطمہؑ کی نسل مٹ جانے سے بچ گئی۔

عبداللہ بن عباس صدرِ اسلام کی ایک معروف علمی شخصیت تھے' جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مصاحبت بھی حاصل رہی تھی اور جو اپنے زمانے کے ایک بڑے اور قابلِ اعتماد ترین محدث شمار ہوتے تھے۔ جب تک وہ زندہ تھے (سن ۶۸ ہجری) علویوں اور بنی عباس کے درمیان کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا تھا' لیکن اُن کے بعد بتدریج اختلافات کا آغاز ہوگیا۔ اگرچہ کربلا میں نہ صرف وہ' بلکہ عباسیوں میں سے کوئی ایک فرد بھی موجود نہ تھا۔ دوسری صدی ہجری کی ابتدا میں عباسیوں میں علویوں سے علیحدہ خود مختار ہونے کی سوچ پیدا ہوئی' اور وہ خفیہ طور پر لوگوں کو اپنی طرف دعوت دینے لگے' لیکن انہیں اپنی کامیابی کی کوئی خاص امید نہ تھی۔ اس کی وجہ بھی یہ تھی کہ لوگ صرف آلِ علیؑ کو باقی بچ جانے والی نسلِ پیغمبرؐ سمجھتے تھے۔ خصوصاً کربلا کے دردناک واقعے کے بعد اس گھرانے کی مظلومیت نے لوگوں کے درمیان ان کی سماجی حیثیت کو حیرت انگیز طور پر بلند کردیا تھا۔

زید بن علی بن الحسینؑ نے جس تحریک کا آغاز کیا تھا اُس کے ذریعے عراقیوں کے درمیان علویوں کی اہمیت کی تاکید ہوتی تھی۔ زید بن علیؑ امام محمد باقرؑ کے بھائی تھے' لیکن امام محمد باقرؑ کو علمی اعتبار سے معاشرے میں جو اہمیت حاصل تھی' اس کی وجہ سے زید اور اُن کی انقلابی تحریک کو غیر معمولی مقام حاصل نہ ہوسکا۔ اگرچہ ان کا شمار محدثین میں بھی ہوتا تھا اور علوی ہونے کی وجہ سے اہلِ عراق کی ایک کثیر تعداد کی توجہ بھی انہیں حاصل تھی۔

امام محمد باقر علیہ السلام نے ۱۱۴ یا ۱۱۷ ہجری میں رحلت فرمائی اور ان کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام نے شیعوں کے چھٹے امام کے طور پر نگاہوں کو اپنی جانب مبذول کرایا۔ دوسری صدی ہجری کے دوسرے عشرے کے اواخر میں "زید" نے ہشام بن عبدالملک کے ساتھ پے در پے اختلافات اور لفظی جنگوں کے بعد حکومت کے خلاف اقدام کا فیصلہ کیا' اور ماہِ صفر ۱۲۲ ہجری میں کوفہ میں ایک انقلابی تحریک شروع کی اور دو دن تک جاری رہنے والے مسلح تصادم کے بعد جامِ شہادت نوش کیا۔ یہاں جو چیز ہمارے لیے اہمیت کی حامل ہے' وہ حضرت زید بن علیؑ کے انقلابی اقدام اور زیدیہ نامی فرقے کے بارے میں (جس نے حضرت زید کی شہادت کے بعد عراق میں اپنی موجودیت کے اظہار کا آغاز کیا تھا) امام جعفر صادقؑ کا طرزِ عمل تھا۔

بعض شیعہ روایتوں میں آیا ہے کہ زید شیعہ ائمہؑ جن میں امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ بھی شامل ہیں' کی امامت

کے قائل تھے۔ جیسا کہ اُن سے نقل ہوا ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے: **جعفر امامُنافی الحلال و الحرام.** (جعفر حلال و حرام میں ہمارے امام ہیں)۔(۱)

اور زید بن علی کے بارے میں امام جعفر صادقؑ کی ایک روایت میں آیا ہے:

"رحمہ اللّٰہ اما انہ کان مؤمناً و کان عالما و کان صدوقاً اما انہ لو ظفر لوفی اما انہ لو ملک یعرف کیف یضعُھا."(۲)

"خدا اُن پر رحمت فرمائے! وہ مومن، عالم اور راست گو انسان تھے۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتے، تو وفا کرتے۔ اور اگر وہ حاکم ہو جاتے، تو جانتے تھے کہ حکومت کس کے سپرد کرنی ہے۔"

اس بارے میں متعدد روایات نقل ہوئی ہیں۔ اسی طرح کچھ اور روایات بھی نقل ہوئی ہیں، جن کا مضمون ان روایات کے برخلاف ہے۔ ممکن ہے زید امام جعفر صادق علیہ السلام کی علمی امامت کو قبول کرتے ہوں، لیکن آپ کی سیاسی امامت کے قائل نہ ہوں، اور انہوں نے امامؑ کی صریح اجازت کے بغیر اپنی تحریک کا آغاز کیا ہو۔ بہر طور زید نے امویوں کے خلاف (جو ان کی نگاہ میں جاہلیت کی علامت تھے) اس شورش کی قیادت کی، اور اُن کے اور زید کے خاندان کے درمیان تقریباً اسی سال سے اسلامی خلافت کے لیے جنگ و جدال جاری تھی۔ امام جعفر صادقؑ کی چند روایات میں کوفہ کے محلّے "کناسہ" میں زید کی شہادت کی خبر دی جا چکی تھی۔(۳)

ایک اور روایت کے مطابق امام جعفر صادق علیہ السلام نے زید سے برائت کا اظہار کرنے والے شیعوں کے سامنے زید کی تائید کی ہے۔(۴) یہ دونوں قسم کی روایات اہلِ سنت کے منابع (sources) میں نقل ہوئی ہیں، لیکن مجموعاً ان سے اس قیام سے آپ کی رضامندی کی نشاندہی نہیں ہوتی۔ خصوصاً جبکہ "کافی" اور حدیث کے بعض دوسرے شیعہ مجموعوں میں زید کی تحریک کے خلاف تنقیدیں بھی کی گئی ہیں۔ اس سب کے باوجود یہ یقینی ہے کہ امامؑ زید کے قیام کو "ایک ظالم کے خلاف قیام" کی نظر سے دیکھتے تھے، اسی طرح آپ زید کی اخلاقی شخصیت کی بھی تائید فرماتے تھے اور کسی کو ان کی توہین کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ حکیم بن عیاش کلبی جو عثمانی مذہب تھا، اُس نے

۱۔ حیاۃ الامام الباقر۔ ص ۳۵۶۔۳۶۱، رجال النجاشی۔ ص ۱۳۰، کفایۃ الاثر۔ ص ۳۲۷، اور دیکھئے: سیرہ و قیامِ زید بن علی از حسین کریمان۔ ص ۳۹ اور اس کے بعد۔

۲۔ ایضاً۔ ص ۳۸۵

۳۔ عیون اخبار الرضا۔ ج ۱۔ باب ۲۵، امالی صدوق۔ مجلس ۱۰۔ ص ۴۰، تنقیح المقال۔ ج ۱۔ ص ۴۶۸، سیرہ و قیامِ زید بن علی۔ ص ۱۶۸

۴۔ خطط مقریزی۔ ج ۳۔ ص ۳۰۷، نامۂ دانشوران۔ ج ۵۔ ص ۹۲، فوات الوفیات۔ ج ۱۔ ص ۲۱۰

اپنے اشعار میں کہا:

صلبنا لکم زیدا علی جذع نخلۃ ولم أر مھدیًا علی الجذع یصلب

وقستم بعثمان علیًا سفاھۃ وعثمان خیر من علیّ واطیب

''ہم نے زید کو درخت کے تنے پر پھانسی دے دی اور کوئی مہدی ایسا نہیں دیکھا گیا جسے یوں پھانسی دی گئی ہو۔ تم لوگوں کی بے وقوفی ہے جو علی کا موازنہ عثمان کے ساتھ کرتے ہو حالانکہ عثمان علی سے بہتر اور زیادہ پاکیزہ ہیں۔''

جب یہ اشعار امام جعفر صادق علیہ السلام تک پہنچے تو آپ نے اس حال میں اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیے کہ وہ لرز رہے تھے اور فرمایا:

''اللھم ان کان عندک کاذبًا فسلّط علیہ کلبک.''

''بارالہا! اگر وہ تیرے نزدیک جھوٹا ہے تو اس پر اپنا کتا مسلط فرمادے۔''

کہا جاتا ہے کہ بنی امیہ نے اسے کسی کام سے کوفہ بھیجا تھا کہ راستے میں ایک شیر نے اسے مار ڈالا۔ جب یہ خبر امام جعفر صادق کو ملی تو آپ سجدے میں گر گئے اور فرمایا: ''الحمدللّٰہ الذی أنجزنا ماوعدنا.'' (تمام تعریفیں اس خدا کے لیے ہیں جس نے ہم سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا)۔(۱)

ایک اور روایت میں ہے کہ امامؑ نے ''ابو ولاد کاہلی'' سے زید کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا: میں نے انہیں پھانسی پر لٹکے ہوئے دیکھا ہے۔ کچھ لوگ انہیں برا بھلا کہہ رہے تھے اور کچھ لوگ ان کی تعریف کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: ''اُن کی تعریف کرنے والے اُن کے ساتھ جنت میں ہوں گے اور انہیں برا بھلا کہنے والے اُن کے خون میں شریک ہیں۔''(۲)

زید کے قیام اور خصوصاً بنی عباس کے اقتدار میں آ جانے کے بعد بنی حسن بنی حسینؑ سے جدا ہو گئے اور زید اور اُن کے بیٹے یحییٰ کا نام لے کر محمد بن عبداللہ بن حسن بن حسن بن علیؑ نامی بنی حسن کے ایک فرد کو حکمران بنانے کے لیے کمربستہ ہو کر میدان میں اتر گئے۔ ان لوگوں نے رفتہ رفتہ شیعوں کے ایک گروہ کو بھی اپنے گرد جمع کر لیا، جن کو زیدیہ کہا جانے لگا۔ جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے، جعفریوں اور زیدیوں کے درمیان شدید اختلافات اور زبردست جنگ وجدال کا آغاز ہوا،

۱۔ نثر الدرر، ج۱، ص۳۵۲۔۳۵۳

۲۔ ایضاً، ج۱، ص۳۵۳

جس کے دوران زیدیوں نے امام جعفر صادقؑ کو اپنے الزامات کا نشانہ بنایا۔

ایک حدیث میں آیا ہے: زیدیہ امام جعفر صادق علیہ السلام پر الزام لگایا کرتے تھے کہ آپ راہِ خدا میں جہاد پر اعتقاد نہیں رکھتے۔ امام نے اس الزام کی تردید کرتے ہوئے فرمایا: "ولکنی اکرہ ان ادع علمی الی جھلھم." (لیکن میں اپنے علم کو ان کے جہل کے ساتھ رکھنا پسند نہیں کرتا)۔(۱)

ب: امام جعفر صادقؑ اور ابوسلمہ کی دعوت

امام جعفر صادق علیہ السلام کی پالیسی میں اولین مقام علمی کاموں اور ایسے اصحاب کی تربیت کو حاصل تھا جو فقہ اور حدیث کے اعتبار سے جعفری تشیع کے مؤسس شمار ہوئے۔ ان حالات میں حکومتِ وقت کے خلاف آپ کی سیاسی جدوجہد اُس وقت کی حکومت سے آپ کی ناخوشی' اُسے غیر قانونی قرار دینا اور اسلام و مسلمین کے لیے خاندانِ رسالت کی امامت اور قیادت کے دعوے کی حد تک محدود تھی۔ امام جعفر صادقؑ کے خیال میں ضروری مقدمات فراہم کیے بغیر (جن میں اہم ترین علمی اور فکری کام تھا) حکمرانوں کے خلاف مسلح تحریک چلانے سے ناکامی کے سوا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔ اس مقصد کے لیے امامت پر عقیدہ رکھنے والی ایک وسیع شیعہ تحریک کی ضرورت تھی' تاکہ اس کی بنیاد پر حکمرانوں کے خلاف تحریک کا آغاز کیا جائے' اور اس تحریک کے لیے کامیابی کا حصول ممکن ہو۔ وگرنہ ایک خام اور جلد بازی پر مبنی اقدام نہ صرف دوام پذیر نہیں ہوتا' بلکہ موقع پرست عناصر اس سے سوءِ استفادہ کرتے ہیں۔

جیسے کہ زید بن علیؑ اور اُن کے بعد خراسان میں یحییٰ بن زید کی تحریک سے سب سے زیادہ فائدہ بنی عباس نے اٹھایا اور اپنے آپ کو "الرضا من آل محمدؐ" کے نعرے کا مصداق قرار دینے کے لیے زبردست پروپیگنڈا کیا۔ ان کوششوں کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے طالبیوں کے اس گروہ کو بھی قتل کر دیا جو بعض لوگوں کے بقول "ابوہاشم بن محمد بن حنفیہ" کی جانشینی کی حمایت میں سرگرم تھے۔

اس عمل کے نتائج بعد میں سامنے آئے' کیونکہ فقہ جعفری ایک مضبوط تشیع کی بانی بنی جس نے روز بروز ترقی کی منزلیں طے کیں۔ جبکہ زیدیہ اور خوارج' جو صرف سیاسی میدان میں سرگرمِ عمل تھے' بہت جلد علمی اور فکری محدودیت کا شکار ہوئے اور رفتہ رفتہ اپنی نسبتاً مضبوط پوزیشن سے محروم ہو کر زوال کا شکار ہو گئے۔ اس کے نتیجے میں بنی عباس کو سیاسی اور عسکری کامیابی حاصل ہوئی اور انہوں نے وسیع و عریض اسلامی سلطنت کی باگ ڈور سنبھال لی۔ یہ اس حال میں ہوا تھا کہ حکمرانی کے لیے بنی ہاشم کا امیدوار امام حسنؑ کی نسل سے تعلق رکھنے والا "محمد بن عبداللہ" نامی ایک فرد تھا' جس کے بارے

۱۔ تہذیب التہذیب ۔ ج ۲۔ ص ۴۳' وسائل الشیعہ ج ۲۔ ص ۳۲

میں ہم اس کے بعد گفتگو کریں گے۔ یہاں ہم بنی عباس کے قیام کے ساتھ امام جعفر صادقؑ کے رابطے کا ذکر کر رہے ہیں:

بنی عباس کی دعوت کا اصل کام دو افراد (وزیر آل محمد کے نام سے مشہور ابو سلمہ خلال (۱) اور ابو مسلم خراسانی) کے ذریعے انجام پایا۔ جیسا کہ اپنے مقام پر یہ بات ثابت ہوئی کہ ان کی تحریک کا اصل نعرہ ''الرضا من آل محمد'' تھا۔ عوام الناس کو اس نعرے سے یہی سمجھ آتا تھا کہ یہ بات طے ہے کہ خاندانِ رسول کا کوئی شخص خلیفہ بنے گا جو قدرتی طور پر علویوں میں سے کسی فرد کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ لیکن علویوں کی سیاسی کمزوری اور بنی عباس کی مسلسل کوششوں نے پس پردہ معاملات کو بنی عباس کے حق میں تبدیل کر دیا۔ اس حال میں تحریک کے آخری ایام تک عراق کے سارے معاملات کی کنجی ابو سلمہ خلال کے ہاتھ میں تھی جس نے کوفہ میں سفاح اور منصور کو اپنے کنٹرول میں رکھا ہوا تھا یہاں تک کہ جوں ہی امویوں کا تختہ الٹا اس نے لوگوں سے سفاح کے لیے بیعت لے لی۔ لیکن کچھ ہی عرصے بعد لوگوں کو علویوں کی طرف دعوت دینے اور علویوں کو عباسیوں کی جگہ بٹھانے کے الزام میں اسے قتل کر دیا گیا۔ یہ ماجرا کچھ یوں تھا کہ ابو سلمہ نے امام جعفر صادقؑ اور دوسرے دو علویوں کو ایک خط لکھا اور اس رجحان کا اظہار کیا کہ اگر وہ قبول فرمائیں تو وہ ان کے لیے لوگوں سے بیعت لے لے۔ امام جعفر صادقؑ جانتے تھے کہ اس دعوت کی کوئی بنیاد نہیں ہے اور اگر بنیاد ہوتی تب بھی آپ اس وقت ایک شیعہ امام کی حکومت کے قیام کے لیے حالات ساز گار نہیں سمجھتے تھے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کی نظر میں ابو سلمہ کی دعوت حقیقت پر مبنی نہ تھی اسی لیے آپ نے اس کے خط کے جواب میں اس کے قاصد سے فرمایا: ''ابو سلمہ کسی اور کا شیعہ ہے۔'' (۲) بعض دوسری جگہوں پر تحریر ہے کہ ابو مسلم نے بھی اس بارے میں ایک خط امام جعفر صادقؑ کو لکھا تھا جس کے جواب میں امامؑ نے تحریر فرمایا: ''**ما انت من رجالی ولا الزمان زمانی.**'' (نہ تم میرے آدمی ہو اور نہ زمانہ میرا زمانہ ہے)۔ (۳)

بہر صورت اس اقدام کے مقابل امامؑ نے احتیاط اور دعوت کے مقاصد سے عدم موافقت کا طرز عمل اختیار کیا۔ اسی طرح آپ نے عبداللہ بن حسن کو ان کے فرزند محمد (نفس زکیہ) کے بارے میں بھی یہی مؤقف اختیار کرنے کی تاکید کی تھی۔ بنی عباس کے ساتھ ابو سلمہ کی وفاداری اور ان کے خاندان میں امامت کو قرار دینا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ اپنی دعوت میں مخلص نہیں تھا۔

۱۔ الوزراء والکتاب۔ ص ۸۴ وہ اور ابو مسلم دونوں موالی شمار ہوتے تھے۔

۲۔ مروج الذہب۔ ج ۳۔ ص ۲۶۹، الوزراء والکتاب۔ ص ۸۶

۳۔ دیکھئے: حیاۃ الامام الرضاؑ۔ ص ۴۹

حتی اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ وہ اپنی دعوت میں مصمم اور پر عزم تھا' تب بھی ابو مسلم جیسے اشخاص اور عباسیوں کی موجودگی میں اس کام کا ہونا ممکن نہ تھا اور اس کی دعوت قبول کرلینا' نابودی کے گڑھے میں گرنے کے مترادف تھا۔ شاید عباسیوں کے ہاتھوں ابو سلمہ خلال اور ابو مسلم خراسانی کے قتل کو اس امر کا بہترین گواہ قرار دیا جاسکے۔

ج: منصور کے ساتھ طرزِ عمل

امام جعفر صادق علیہ السلام کی زندگی کا آخری حصہ منصور کے دورِ حکومت میں بسر ہوا۔ امام جعفر صادقؑ بنی ہاشم کے درمیان ایک منفرد روحانی شخصیت کے مالک سمجھے جاتے تھے۔(۱) آپ کو منصور کے زمانے میں علمی شہرت حاصل تھی' اور آپ اہلِ سنت کے بہت سے فقہا اور محدثین کی توجہ کا مرکز تھے۔ قدرتی بات ہے کہ منصور کو علویوں سے جو شدید عداوت تھی' اس کے پیشِ نظر اُس نے امامؑ کو سخت نگرانی میں رکھا ہوا تھا اور وہ آپ کو ایک آزادانہ زندگی بسر کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے بھی اپنے اجداد کی طرح اپنے اس عقیدے کو پوشیدہ نہیں رکھا تھا کہ خلافت صرف آپ ہی کا حق ہے اور دوسروں نے اسے غصب کیا ہے۔ آپ کے واجب الاطاعت ہونے کے حوالے سے' آپ کے بعض اصحاب کا طرزِ عمل اس امر پر شیعوں کے راسخ اعتقاد کی نشاندہی کرتا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایک حدیث میں فرمایا ہے:

"بُنی الاسلام علی الخمس: علی الصلاۃ و الزکاۃ و الحج و الصوم و الولایۃ. قال زرارۃ: فقلت: ای شیء من ذلک افضل؟ فقال: الولایۃ افضل لانھا مفتاحُھُنّ و الوالی ھو الدلیل علیھنّ."(۲)

"اسلام پانچ ستونوں پر استوار ہے: نماز' زکات' حج' روزہ اور ولایت۔ زرارہ کہتے ہیں: میں نے پوچھا: ان میں سب سے زیادہ اہمیت کسے حاصل ہے؟ امامؑ نے فرمایا: ولایت کو۔ کیونکہ یہ دوسرے اصولوں کی کلید ہے اور والی ہی ہوتا ہے جو ان (دوسرے اصولوں) کی جانب لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے۔"

اس روایت میں ولایت کو ایک ایسا اصول قرار دیا گیا ہے' جس پر دوسرے اصولوں کا اجرا منحصر ہے۔ امامؑ کی یہ روش منصور کے لیے انتہائی خطرناک تھی' اسی لیے وہ کسی ایسے موقع کی تاک میں تھا جس سے فائدہ اٹھا کر امامؑ کو شہید کردے۔ ابن عنبہ لکھتا ہے: منصور نے کئی بار امامؑ کے قتل کا ارادہ کیا لیکن خدا نے اُن کی حفاظت فرمائی۔(۳)

۱۔ شذرات الذہب۔ ج۱۔ ص۲۲۰' جہاد الشیعہ۔ ص۱۰۳

۲۔ وسائل الشیعہ۔ ج۱۔ ص۷۔ ۸

۳۔ عمدۃ الطالب فی انساب آل ابی طالب۔ ص۱۹۵

امام جعفر صادق علیہ السلام کی اکثر سرگرمیاں پوشیدہ طور پر انجام پاتی تھیں اور آپ اپنے اصحاب کو مسلسل رازداری برتنے اور اہل بیتؑ کے اسرار پوشیدہ رکھنے کی تاکید کیا کرتے تھے۔ لہٰذا اس بارے میں آپ سے متعدد روایتیں نقل ہوئی ہیں۔ (۱) اسی بنا پر یہ بات تاریخ میں اپنی مکمل جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ درج نہیں ہوسکی ہے کہ امامؑ نے کس طرح اپنے امور انجام دیے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے عرض کیا یقینی طور پر شیعہ قیادت کے پاس ایسا پوشیدہ لائحۂ عمل تھا اور وہ ایسی خفیہ سرگرمیوں میں مصروف تھی جن کا مقصد شیعوں کو منظم اور مربوط کرنا تھا اور یہ وہ چیز ہے جس کے آثار بعد کے ادوار میں ظاہر ہوئے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام عام طور پر ضروری مواقع کے سوا منصور کے دربار میں آمد و رفت سے گریز کیا کرتے تھے، اور اسی لیے منصور بھی آپ پر اعتراض کیا کرتا تھا۔ (۲) جیسا کہ اس نے ایک دن آپ سے کہا: آپ دوسروں کی طرح ہم سے ملاقات کے لیے کیوں نہیں آتے۔ آپ نے جواب میں فرمایا:

"لیس لنا ما نخافک من اجله ولا عندک من امر الآخرة ما نرجوک له ولا انت فی نعمة فنهنیک ولا تراها نقمة فنعزیک بها فما نصنع عندک؟" (۳)

''ہم نے کوئی ایسا کام نہیں کیا، جس کی وجہ سے تجھ سے خوف کھائیں، اور امرِ آخرت کے حوالے سے تیرے پاس کوئی چیز ہے نہیں کہ جس کی ہمیں امید ہو۔ نہ تیرا یہ مقام تیرے لیے نعمت ہے، جس کی ہم تجھے مبارکباد دیں اور نہ تو اسے اپنے لیے مصیبت سمجھتا ہے، جس کی تجھے تسلی دیں۔ پس تیرے پاس ہمارا کیا کام؟''

اس طرح امامؑ اُس کی حکومت سے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا کرتے تھے، جیسے کہ آپ اپنی سیاسی نصیحتوں مثلاً "ایاک والمجالسة الملوک." (۴) یعنی بادشاہوں کی ہم نشینی سے پرہیز کرو، کے ذریعے اپنے اصحاب کو سلاطین کے ساتھ ہم نشینی سے پرہیز کی تلقین کرتے تھے۔ نیز فرمایا کرتے تھے: "کفارة عمل السلطان الاحسانُ الی الاخوان." (حکمراں کا کام کرنے کا کفارہ بھائیوں کے ساتھ نیکی کرنا ہے)۔ (۵)

۱۔ مستدرک الوسائل۔ ج ۱۲۔ ص ۲۰۳۔ ۲۹۱

۲۔ ایضاً۔ ص ۳۰۷

۳۔ کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۲۰۸۔ ۲۰۹، الامام الصادق۔ ص ۱۴۱

۴۔ مستدرک الوسائل۔ ج ۱۲۔ ص ۳۱۰

۵۔ نثر الدرر۔ ج ۱۔ ص ۳۵۴

maablib.org

آپ بادشاہوں کے دربار میں آمد و رفت رکھنے والے علما کو اس عمل سے بچنے کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے تھے:

"الفقهاء أُمناء الرُّسل فاذا رأيتم الفقهاء قد ركبوا الى سلاطين فاتهموهم." (۱)

"فقہا' انبیا کے امانتدار ہیں۔ پس اگر تم کسی فقیہ کو بادشاہوں کے پاس آتے جاتے دیکھو تو اُس کو الزام دو۔"

ایک دن منصور نے آپ سے پوچھا:

"یا اباعبداللّٰہ! لِمَ خَلَقَ اللّٰه تعالیٰ الذُّباب؟

"اے اباعبداللہ! خدا نے مچھر کو کیوں پیدا کیا ہے؟"

فقال: لِيذلَّ به الجبابرة." (۲)

"فرمایا: جابروں کو ذلیل کرنے کے لیے۔"

ایک اور روایت میں ہے کہ منصور نے امام سے کہا: نحن وانتم فی رسول اللّٰه سواء. (رسول اللہؐ سے ہمارا اور آپ کا رشتہ یکساں ہے)۔ فقال: "لو خطب اليكم رسول اللّٰه(ص) قد تزوّج منكم لجازله ولايجوزان يتزوّج منّا فهذا دليل على انّامنه و هومنّا." (آپ نے فرمایا: اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہاری بیٹیوں کے لیے رشتہ بھیجیں تو جائز ہوگا' لیکن وہ ہماری بیٹیوں سے شادی نہیں کر سکتے۔ اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہم اُن سے ہیں اور وہ ہم سے ہیں)۔ (۳)

امام جعفر صادق علیہ السلام سے "لاتحاكموا الى الطاغوت." (طاغوتوں سے فیصلے نہ کراؤ) کے عنوان کے تحت بعض روایات نقل ہوئی ہیں' جو حکمرانوں کے ساتھ آپ کے برتاؤ کی نشاندہی کرتی ہیں۔ آپ نے اس بارے میں ایک سوال کے جواب میں فرمایا: "... من تحاكم اليهم (السُّلطان و القضاة) فى حق اوباطل 'فانّما تحاكم الى الطاغوت..." (جس کسی نے' چاہے وہ حق پر ہو یا باطل پر' اپنے معاملات کا فیصلہ ان (حاکم یا اُس کے مقرر کردہ قاضی) کے سپرد کیا' اُس نے طاغوت کی عدالت کو قبول کیا)۔ (۴)

۱۔ کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۱۸۳' تہذیب الکمال۔ ج ۵۔ ص ۸۸' سیر اعلام النبلاء۔ ج ۶۔ ص ۲۶۲

۲۔ ایضاً۔ ج ۲۔ ص ۱۵۸' تہذیب الکمال۔ ج ۵۔ ص ۹۲۔ ۹۳

۳۔ محاضرات الادباء۔ ج ۱۔ ص ۳۳۳

۴۔ کافی۔ ج ۷۔ ص ۴۱' تہذیب۔ ج ۶۔ ص ۲۱۸' وسائل الشیعہ۔ ج ۱۸۔ ص ۳۵۳

کچھ لوگوں نے یہ تصور کیا ہے کہ امام کے لیے لازم ہے کہ وہ لوگوں کو حکومت کے خلاف تحریک چلانے پر اُکسائے۔ دراصل یہ زیدیہ کا عقیدہ تھا' جو عباسی حکومت کے خلاف سخت جدوجہد کے باوجود ایک مضبوط اور گہری فقہی اور فکری بنیاد کے حامل نہ تھے۔ جبکہ شیعوں کی تاریخ میں یہ بات نظر آتی ہے کہ مذہب امامیہ کی زیادہ تر کوشش یہ تھی کہ اپنی فکری بنیادوں کو مضبوط کیا جائے' اور شاید اسی وجہ سے امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانے ہی سے شیعہ مذہب 'مذہب جعفری' کے نام سے پہچانا جانے لگا تھا' کیونکہ اس اعتبار سے آپ دوسرے تمام ائمہ سے ممتاز تھے۔ (۱)

درحقیقت آپ کی امامت پر اس زاویے سے بحث ہونی چاہیے' ایک ایسی امامت کے طور پر گفتگو ہونی چاہیے جو علمی اور فکری سیاست سے آخر کار سیاست کے اصطلاحی معنی تک جا پہنچتی ہے۔ یہیں سے اس کھلی غلطی کا پتا لگایا جاسکتا ہے جو شہرستانی سے سرزد ہوئی ہے۔ اُنہوں نے امامؑ کے اجتماعی طرزِ عمل کی توصیف کرتے ہوئے لکھا ہے: **ماتعرّض للامامة قطُّ ولانازع احداً فی الخلافة قطُّ** (آپ ہرگز قیادت کی فکر میں نہیں پڑے' اور کسی سے خلافت پر بھی جھگڑا نہ کیا)۔ (۲)

دراصل امامؑ نے شیعہ معاشرے کے تشخص کی حفاظت کی' اور حاکمیت کے مقابل' اس معاشرے پر اپنی امامت کو قائم کیا اور یہ خود عین سیاست اور حکومت کے خلاف ایک جنگ ہے۔ اس مقام پر ہم گواہ کے طور پر ایک روایت پیش کرتے ہیں:

''حسن بن صالح بن حی اور اس کے ساتھی امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حسن نے آپ کو مخاطب کرکے کہا: **یابن رسول اللّٰہ! ماتقول فی قول اللّٰہ تعالیٰ: " اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ "؟ قال: العلماء. فسألوہ عن العلماء. فقال: الائمّة منّا اھل البیت.** "(اے فرزندِ رسولؐ! اللہ تعالیٰ کے اس قول کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے کہ: ''اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اور اولی الامر کی''؟ آپ نے فرمایا: اس سے مراد علما ہیں۔ انہوں نے پوچھا علما سے کیا مراد ہے' تو فرمایا: اس سے مقصود ہم اہلِ بیت کے ائمہ ہیں)۔ (۳)

د: نفس زکیہ کے ساتھ امامؑ کا رویہ

امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کی اولادوں کے درمیان اختلاف اس وقت رونما ہوا جب عبداللہ بن حسن بن حسن

۱۔ رجال کشی۔ ص ۲۵۵

۲۔ الملل والنحل۔ ج ۱۔ ص ۱۴۷

۳۔ شرح الاخبار۔ ج ۳۔ ص ۲۹۹۔ ۳۰۰

نے اپنے بیٹے محمد کو قائمِ آلِ محمد (۱) قرار دیا۔ اس کے بعد یہ اختلاف شدت اختیار کر گیا۔ البتہ کافی عرصے تک بنی عباس بھی اس اختلاف کو بڑھانے کے لیے سرگرم رہے تھے۔ زید کے قیام اور اُن کی شہادت کے بعد (امام جعفر صادقؑ اور چند دوسرے افراد کے سوا) علوی اور عباسی' تمام بنی ہاشم نے محمد بن عبداللہ کی بیعت قبول کر لی۔ عباسیوں کی پس پردہ سرگرمیوں کے بارے میں ہم جو کچھ جانتے ہیں' اُس کی بنیاد پر ہم سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اس وقتی تحریک سے استفادے کے لیے اس میں شمولیت اختیار کی تھی۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس زمانے میں ابھی انہیں اپنے ایک مستقل طاقت بننے کی امید نہ تھی' اور وہ محض اسی پر خوش تھے کہ نفسِ زکیہ کی تحریک کے ذریعے اُن کے حالات کچھ بہتر ہو جائیں گے۔ نفسِ زکیہ کے ہاتھ پر علویوں اور عباسیوں کی بیعت کا قصہ ابوالفرج اصفہانی نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اُن کے بیان کے مطابق' عباسیوں میں سے داؤد بن علی' ابراہیم امام' صالح بن علی' منصور اور سفاح اس بیعت کے موقع پر موجود تھے۔ جب اس محفل میں امام جعفر صادقؑ کا ذکر آیا تو نفسِ زکیہ کے والد عبداللہ بن حسن نے کہا: لا نرید جعفراً لئلاّ یفسد علیکم امرکم. (یہاں جعفر کی موجودگی ضروری نہیں ہے' کیونکہ وہ تمہارے کام کو خراب کر دیں گے)

جب امامؑ نے اُن کی تحریک کی مخالفت کا اعلان کیا' تو عبداللہ بن حسن نے اسے حسد کا شاخسانہ قرار دیا۔ (۲) مذکورہ بالا بیعت کا کوئی فائدہ نہ ہوا' اور حکومت پر عباسی قابض ہو گئے۔ بعد میں نفس زکیہ نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا اور سن ۱۴۵ ہجری میں مدینہ میں حکومت کے خلاف شورش کی' لیکن کچھ ہی عرصے بعد منصور کی فوج کے ہاتھوں مارے گئے۔ اُن کے بھائی ابراہیم نے بھی سن ۱۴۶ ہجری میں بصرہ میں حکومت کے خلاف قیام کیا اور انہیں بھی قتل کر دیا گیا۔ مدینہ میں نفس زکیہ کی شورش کے موقع پر امام جعفر صادقؑ مدینہ سے باہر نکل گئے' اور مدینہ اور مکہ کے درمیان ''فُرع'' نامی علاقے میں چلے گئے اور شورش ختم ہو جانے پر واپس مدینہ تشریف لے آئے۔ (۳) اس سے پہلے بھی منصور نے امام جعفر صادقؑ سے عبداللہ بن حسن اور اُن کی اولاد کی فتنہ انگیزیوں کا گلہ کیا تھا۔ امامؑ نے اُس سے اپنے اور اُن کے درمیان اختلاف کا ذکر کیا اور سورۂ حشر کی آیت ۱۲ (لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا یَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ... یعنی اگر وہ نکلے تو دوسرے ان کے ساتھ نہیں نکلیں

۱۔ مقاتل الطالبیین۔ ص ۱۴۱

۲۔ مقاتل الطالبیین۔ ص ۴۰۔ ۱۴۱' سیرہ و قیامِ زید بن علی۔ ص ۵۷ نقل از ارشاد۔ ص ۲۷۶۔ ۲۷۷' اعلام الوریٰ (فارسی ترجمہ) ص ۳۸۳۔ ۳۸۴' الامام الصادقؑ۔ ص ۵۶ نقل از الاحتجاج' کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۱۷۲۔ ۱۷۳ اور دیکھئے: تاریخ طبری۔ ج ۷۔ ص ۳۰۲ تا شرح عز الدین

۳۔ کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۱۶۲

گے۔۔) کی جانب اشارہ کیا کہ اس تحریک کو عام لوگوں کی حمایت حاصل نہیں ہے۔(۱)

بنی الحسن سے وابستہ بہت سے لوگوں نے منصور کے قید خانوں میں وفات پائی، جن کے ناموں کی فہرست ابوالفرج نے درج کی ہے۔ یہ تحریکیں اور شکستیں آئندہ اٹھنے والی تحریکوں کا نقطۂ آغاز تھیں جو عام طور پر شکست سے دوچار ہوئیں۔ اسلامی سلطنت کے مشرقی علاقے میں پہلی کامیاب تحریک "طبرستان" میں چلائی گئی، جس کا نتیجہ اس علاقے میں زیدیہ حکومت کی تاسیس کی صورت میں برآمد ہوا۔ اس بارے میں ہم نے "تاریخ تشیع در ایران" {نامی کتاب میں} تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

یہ مسئلہ گزر گیا اور کچھ ہی عرصے بعد دونوں بھائیوں نے (محمد بن عبداللہ بن حسن نے مدینہ میں اور ابراہیم بن عبداللہ بن حسن نے بصرہ میں) قیام کیا اور عباسی افواج کے ساتھ ایک مختصر جنگ کے بعد مارے گئے۔ یہ شکست زیدیہ کے لیے اگلی شکستوں کا نقطۂ آغاز بن گئی، جنہوں نے عراق اور ایران میں مسلح بغاوت کی تھی۔ اگرچہ ان میں سے ایک قیام طبرستان میں (حسن بن زید کا قیام) کسی حد تک کامیاب رہا اور ایک مدت تک (تقریباً آدھی صدی، تیسری صدی کا دوسرا نصف) جاری رہا۔

☆☆☆

۱۔ نثر الدر۔ ج ۱۔ ص ۳۵۵

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام

قال الطبرسی: کان الناس بالمدینة یسمونہ زین المجتھدین.

طبری کہتے ہیں: مدینہ کے لوگ آپ کو عبادت الٰہی کے سلسلے میں کوشاں لوگوں کی زینت کہا کرتے تھے۔

(اعلام الوریٰ۔ ص ۲۹۸)

امام موسیٰ کاظمؑ کی شخصیت

55 سال عمر

شیعوں کے ساتویں امام، موسیٰ ابن جعفر علیہ السلام ہیں، جنھیں اپنے معاندین ومخالفین کے سامنے تحمل و بردباری کا مظاہرہ کرنے اور دشمنوں کے مقابل غیظ وغضب پی جانے کی بنا پر مسلمانوں اور خاص طور پر شیعوں نے کاظم کا لقب دیا ہے۔(۱)

آپ کی ولادت سن ۱۲۸ ہجری (اور کچھ منابع میں ۱۲۹ ہجری) میں مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع "ابواء" کے مقام پر بیان کی گئی ہے۔ آپ کی والدہ کا نام "حمیدہ بربریہ" (۲) تھا۔ آپ کی ولادت کا مہینہ کسی ماخذ (source) میں بیان نہیں ہوا ہے، اور صرف سال کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے۔ (۳) آپ نے ۲۵ رجب (۴) سن ۱۸۳ ہجری کو بغداد میں ظالم حکمراں ہارون الرشید عباسی کے قید خانے میں شہادت پائی۔ بعض نے آپ کی تاریخ شہادت ۵ رجب اور بعض نے ۶ رجب بھی بیان کی ہے۔ (۵)

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے سن ۱۴۸ ہجری میں اپنے والد گرامی کی شہادت کے بعد شیعوں کی قیادت کی ذمے داری سنبھالی اور اپنی زندگی مدینہ اور بغداد میں بسر کی۔ آپ کے زمانے کی کسی علوی شخصیت میں آپ کی برابری کی جرأت نہ تھی۔ علم، تقویٰ، زہد و عبادت میں آپ اپنے دور کی سب سے بڑی شخصیت سمجھے جاتے تھے۔

شیخ مفید آپ کے بارے میں فرماتے ہیں: ابوالحسن موسیٰ (کاظم) علیہ السلام اپنے زمانے کے عابد ترین، فقیہ ترین،

۱۔ المناقب ابن شہر آشوب۔ ج ۲۔ ص ۳۸۲، ارشاد۔ ص ۲۷۹، عمدۃ الطالب۔ ص ۱۹۶، الصواعق المحرقۃ۔ ص ۲۰۳

۲۔ امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: "حمیدة فی الدنیا محمودة فی الآخرة۔" کافی۔ ج ۱۔ ص ۴۷۷۔ حدیث ۱

۳۔ تواریخ النبی والآل۔ ص ۳۵

۴۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۱۔ ص ۱۰۴، مصباح المتہجد۔ ص ۵۲۶

۵۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۴۷۶، عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۱۔ ص ۹۹

سخی ترین اور معزز ترین انسان تھے۔(۱)

شیخ طبرسی لکھتے ہیں: آپ کتابِ خدا کے حافظ ترین انسان تھے۔۔۔ اور اہلِ مدینہ آپ کو عبادتِ الٰہی کے سلسلے میں کوشاں لوگوں کی زینت کہا کرتے تھے۔(۲)

ابن ابی الحدید آپ کے بارے میں لکھتے ہیں: آپ فقاہت' دیانت' عبادت اور حلم و صبر کا مجموعہ تھے۔(۳)

مشہور مورخ' یعقوبی آپ کے بارے میں لکھتے ہیں: موسیٰ بن جعفر اپنے زمانے کے عابد ترین انسان تھے۔(۴)

شذرات الذہب میں ہے کہ: آپ صالح' عابد' سخی' حلیم اور عظیم الشان شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے ابوحاتم کا یہ قول بھی نقل کیا ہے' جس میں اُنہوں نے کہا ہے کہ: آپ ثقہ اور مسلمانوں کے اماموں میں سے ایک امام ہیں۔(۵)

یافعی کہتا ہے: آپ صالح' عابد' سخی اور حلیم تھے۔(۶)

علم الانساب کے مشہور ماہر یحییٰ بن حسن بن جعفر نے آپ کے بارے میں لکھا ہے کہ: موسیٰ بن جعفر اپنی عبادت اور سخت کوشی کی وجہ سے عبدِ صالح کہلاتے تھے۔(۷)

مذکورہ جملے' شیعہ اور سنی مورخین اور محدثین کے اُن جملوں کا ایک نمونہ ہیں' جن کے ذریعے اُن لوگوں نے امام کے اوصاف بیان کیے ہیں۔ ''استاد عطاردی'' نے اس قسم کے بہت سے جملے اپنی قابلِ قدر کتاب ''مسند الامام الکاظمؑ'' میں جمع کیے ہیں۔

آپ کی خوبیوں میں سے جو چیز سب سے زیادہ قابلِ توجہ تھی' وہ آپ کی سخاوت اور فیاضی تھی' جو ضرب المثل بن گئی تھی۔ اس بارے میں ابن عنبہ لکھتے ہیں: آپ کے پاس ہمیشہ پیسوں سے بھری تھیلیاں رہا کرتی تھیں۔ آپ جس کسی سے ملتے یا جو بھی آپ کے کرم کا منتظر ہوتا' اُسے آپ اُن میں سے عطا فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کی یہ تھیلیاں ضرب المثل بن گئی تھیں۔(۸)

۱۔ ارشاد۔ ص ۲۷۷

۲۔ اعلام الوریٰ۔ ص ۲۹۸

۳۔ شرح نہج البلاغہ۔ ج ۱۵۔ ص ۲۷۳

۴۔ تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۴۱۴

۵۔ شذرات الذہب۔ ج ۱۔ ص ۳۰۴

۶۔ مرآت الجنان۔ ج ۱۰۔ ص ۳۹۴

۷۔ تہذیب التہذیب۔ ج ۱۔ ص ۳۹۹

۸۔ عمدۃ الطالب۔ ص ۱۹۶

آپ کو اذیت و آزار پہنچانے والے لوگ بھی آپ کی سخاوت سے فیض پاتے تھے۔ اس بارے میں ابن خلکان نے خطیب کا یہ قول نقل کیا ہے: وہ اس قدر سخی اور کریم تھے کہ جب آپ کو بتایا جاتا کہ فلاں شخص آپ کو تکلیف پہنچانا چاہتا ہے تو آپ اس کے پاس ایک ہزار دینار کی تھیلی بھجوا دیتے۔ آپ تھیلیوں میں تین سو، چار سو یا دو سو دینار رکھ کر اہلِ مدینہ میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ (۱) پیسوں سے بھری آپ کی تھیلیاں مشہور تھیں۔ (۲)

ابو الفرج اصفہانی نے آپ کی طرف سے اُن لوگوں کو کی جانے والی بخششوں کے بارے میں ایک تفصیلی روایت نقل کی ہے، جو آپ کو اذیتیں پہنچاتے تھے۔ یہ روایت انسان کو حیرت زدہ کر دیتی ہے۔ (۳)

علمِ رجال کے مشہور ماہر ذہبی امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے بارے میں لکھتے ہیں: موسیٰ بن جعفر حکما میں سخی ترین اور خدا کے پرہیزگار بندوں میں سے تھے۔ (۴)

آپ میں پائی جانے والی دوسری خصوصیات میں زہد اور عبادت بھی شامل ہیں۔ آپ نے مسلسل کئی برس قید خانے میں بسر کیے، اور اس پوری مدت کے دوران عبادتِ الٰہی میں مشغول رہے۔ یہاں تک کہ آپ کے قید خانوں کے کئی نگراں بھی آپ سے متاثر ہو جاتے تھے اور امامؑ کو شدید سختیوں کے ساتھ قید رکھنے سے گریز کرتے تھے۔ (۵)

ہارون الرشید نے ربیع سے آپ کے بارے میں کہا: یہ شخص بنی ہاشم کے راہبوں میں سے ہے۔ ربیع کہتا ہے: میں نے ہارون سے کہا: پھر اس کو قید کیوں کیا ہوا ہے؟ ہارون نے جواب دیا: افسوس کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ (۶)

ساتویں صدی کے ایک مورخ ابن وردی نے آپ کی کثرتِ عبادت کے بارے میں ایک مستند روایت نقل کی ہے۔ (۷)

اس روایت کا ذکر بھی مناسب نظر آتا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے بیٹے موسیٰ سے انتہائی محبت کیا کرتے تھے۔ لہٰذا آپ سے پوچھا گیا: آپ کو موسیٰ سے کتنی محبت ہے؟ آپ نے جواب دیا: ”میں چاہتا ہوں کہ موسیٰ کے سوا میرا

۱۔ تاریخ بغداد۔ ج ۱۳۔ ص ۲۷، وفیات الاعیان۔ ج ۵۔ ص ۳۰۸

۲۔ ایضاً

۳۔ مقاتل الطالبیین۔ ص ۳۳۲

۴۔ میزان الاعتدال۔ ج ۴۔ ص ۲۰۲

۵۔ مقاتل الطالبیین۔ ص ۳۳۲

۶۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۱۔ ص ۳۱

۷۔ تتمۃ المختصر۔ ج ۱۔ ص ۲۱۰، مسند الامام الکاظم۔ ج ۲۔ ص ۳۴۲، زہر الآداب۔ ج ۱۔ ص ۱۳۳، ارشاد۔ ص ۲۸۱

کوئی اور بیٹا نہ ہوتا' تاکہ کوئی اس سے میری محبت میں شریک نہ ہوتا۔"(۱)

انہی پاکیزہ اخلاق وعادات کی بنا پر آپ کو لوگوں میں بے انتہا محبوبیت حاصل تھی اور وہ آپ کے بارے میں بہت سی کرامات کے قائل تھے۔ ابن الجوزی نے اس بارے میں ایک روایت نقل کی ہے' جسے ابن حجر ہیثمی نے بھی نقل کیا ہے۔ روایت کا مضمون یہ ہے کہ سن ۱۴۹ ہجری میں حج کے سفر کے دوران شقیق بلخی کی امامؑ سے ملاقات ہوئی۔ اس نے کئی بار امامؑ سے ایک بات پوچھنے کی کوشش کی' اور امامؑ نے ہر مرتبہ ایک آیت کی تلاوت فرما کے اس کے دل میں چھپی بات کو آشکارا کردیا۔(۲)

امام جعفر صادقؑ کے بعد امامت

عام طور پر شیعوں کے درمیان پیدا ہونے والے اختلاف کی وجہ اگلے امامؑ کا تعین ہوتی تھی۔ کبھی سیاسی وجوہات کی بنا پر' جس میں عباسی حکومت سے لاحق خطرہ بھی شامل ہے' امامؑ خود بہت سے شیعوں کے لیے بھی انجان رہتے تھے۔ کیونکہ اس بات کا امکان تھا کہ اگر علیٰ الاعلان کسی امامؑ کی امامت کا تعین ہوجائے' تو اسے خلفا کی جانب سے دباؤ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ علویوں اور خاص طور پر امام جعفر صادقؑ (جنہوں نے اُس سوسائٹی میں بڑی اہمیت حاصل کر لی تھی) کے لیے منصور کا قائم کردہ شدید گھٹن آلود ماحول' اس بات کا سبب بنا کہ بعض شیعوں میں اپنے آئندہ امام کے بارے میں ایک خاص قسم کی پریشانی اور تشویش پیدا ہوگئی۔ امام جعفر صادقؑ کے بعض فرزندوں کی جانب سے (جو ناحق امامت کا دعویٰ کررہے تھے) آپ کے شیعوں کو اپنی امامت کی دعوت دیئے' انہیں اپنی جانب جذب کرنے اور اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نے بھی سونے پہ سہاگے کا کام کیا۔ شیعوں کا متفرق اور بکھرا ہوا ہونا بھی ایک مشکل تھی' کیونکہ وہ لوگ مختلف شہروں میں رہتے تھے اور حقیقی امامؑ کے بارے میں اطمینان کا حصول ان کے لیے ایک دشوار کام تھا۔ امام جعفر صادقؑ نے اپنا جانشین پوشیدہ رکھنے کی خاطر' اپنے دو فرزندوں امام موسیٰ کاظمؑ اور عبداللہ کے علاوہ' منصور عباسی کو بھی اپنا وصی قرار دیا تھا۔(۳)

ان سب عوامل نے باہم مل کر ہر امامؑ کے بعد شیعوں کے درمیان گروہ بندیاں پیدا کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ اور امام جعفر صادق علیہ السلام کی رحلت کے بعد بھی یہ گروہ بندیاں اسی طرح رونما ہوئیں۔ یہاں تک کہ امام موسیٰ کاظمؑ کے

۱۔ نثر الدر۔ ج۱۔ ص۳۵۶

۲۔ صفوۃ الصفوۃ۔ ج۲۔ ص۱۰۳' الصواعق المحرقہ۔ ص۲۰۳

۳۔ الخرائج۔ ص۲۹۲' مسند الامام الکاظمؑ۔ ج۱۔ ص۳۹۰

ایک صحابی نے یہ دیکھتے ہوئے کہ: ذَهَبَ النَّاسُ بَعْدَ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰهِ یَمِیْناً وَ شِمَالاً. (امام جعفر صادقؑ کے بعد لوگ دائیں اور بائیں چلے گئے)(۱)" آپ سے آپ کے جانشین کے بارے میں سوال کیا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانے میں ایک اور مسئلہ بھی تھا' جس سے بعض لوگوں نے فائدہ اٹھایا' اور وہ اسماعیل بن جعفر بن محمد کا مسئلہ تھا۔ کیونکہ وہ امام جعفر صادقؑ کے بڑے بیٹے تھے' اس لیے بہت سے شیعہ یہ سمجھ رہے تھے کہ شیعوں کی آئندہ قیادت اُن کے ذمے ہوگی۔ اسماعیل اپنے والد کی زندگی ہی میں وفات پا چکے تھے اور جیسا کہ روایت میں آیا ہے' امام جعفر صادقؑ اس بات پر اصرار کر رہے تھے کہ شیعہ اُن کی میت دیکھ کر اُن کی موت کا یقین کر لیں۔ اسکے باوجود کچھ لوگوں نے امام جعفر صادقؑ کے بعد اسماعیل کی مہدویت کا دعویٰ کر کے یا دوسرے بہانوں سے شیعوں میں خطابیہ' باطنیہ یا اسماعیلیہ کے نام سے ایک فرقہ پیدا کر دیا۔ اسماعیل کے بارے میں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اُن کے والد کے بعد اُن کا شیعوں کے قائد یا امام کے طور پر پیش کیا جانا (ممکنہ طور پر) سیاسی پہلو کا حامل تھا' اور اُن کا امام جعفر صادقؑ کا بڑا بیٹا ہونا بھی قدرتی طور پر اس بارے میں موثر ثابت ہوا تھا' بالخصوص جبکہ امام جعفر صادقؑ نے اپنی زندگی کے آخری ایام تک وضاحت کے ساتھ اپنے جانشین کے تعین سے گریز کیا تھا۔ یاد رہے کہ یہ بات ان روایات سے متصادم نہیں ہے' جن کے مطابق امام جعفر صادقؑ نے ابتدا ہی سے امام موسیٰ کاظمؑ کو اپنے بعض خاص اصحاب کے سامنے اپنا جانشین متعارف کرا دیا تھا۔(۲)

یہ روایات مختلف طریق سے نقل ہوئی ہیں۔ اسکے باوجود ہم نے جن دلائل کا ذکر کیا اُن کی بنیاد پر اسماعیل اپنے والد کے زمانے میں اس طرح پیش کیے جاتے تھے' جس سے بعض شیعوں میں اُن کی جانشینی اور امامت کا شبہ پیدا ہو گیا تھا۔

مثال کے طور پر فیض بن مختار سے نقل ہونے والی ایک روایت میں آیا ہے کہ ایک دن وہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں موجود تھے اور ایک معاملے کے ضمن میں آپ نے کھلے لفظوں میں فرمایا کہ اسماعیل اُن کے جانشین نہیں ہیں۔ فیض کہتے ہیں کہ: میں نے عرض کیا: ہمیں کوئی شک نہیں تھا کہ لوگ (شیعہ) آپ کے بعد ان ہی کے پیچھے چلیں گے۔ اس کے بعد آگے چل کر روایت میں آیا ہے کہ امامؑ نے اپنے بیٹے موسیٰ کو اپنے جانشین کے عنوان سے متعارف کرایا۔(۳)

اسحاق بن عمار صیرفی بھی کہتے ہیں: میں نے امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں اُن کے بعد اسماعیل کی امامت کی

۱۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۱۔ ص ۳۱

۲۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۳۰۷۔ ۳۰۹

۳۔ رجال کشی۔ ص ۳۵۵۔ ش ۶۶۳' دیکھئے: الغیبۃ نعمانی۔ ص ۳۲۴

طرف اشارہ کیا لیکن امامؑ نے انکار کیا۔(۱)

ایک اور روایت میں آیا ہے: ولید بن صبیح نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا: عبدالجلیل نے مجھ سے کہا ہے کہ آپ نے اسماعیل کو اپنا وصی قرار دیا ہے۔ امامؑ نے اس بات کا انکار کیا اور انہیں امام موسیٰ کاظمؑ سے متعارف کرایا۔(۲)

اسی وجہ سے جب اسماعیل کا انتقال ہو گیا' تو امام جعفر صادق علیہ السلام نے تاکید فرمائی کہ شیعہ اُن کی موت کو پورے اطمینان کے ساتھ قبول کرلیں۔ کیونکہ اُن کے زندہ ہونے کے تصور (اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ بعض شیعہ غالیوں میں مہدویت کا تصور پایا جاتا تھا) کے نتیجے میں شیعوں کے درمیان ایک نئے فرقے کی پیدائش کا خطرہ موجود تھا اور اسماعیل کی موت پر امام جعفر صادقؑ کا اصرار اسی انحراف کا راستہ روکنے کے لیے تھا۔

ایک اور روایت "زرارہ" سے نقل ہوئی ہے کہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کے گھر میں تھا کہ امامؑ نے مجھے حکم دیا کہ داؤد بن کثیر رقی' حمران' ابوبصیر اور مفضل بن عمر کو اُن کی خدمت میں حاضر کروں۔ جب مذکورہ لوگ آگئے' تو رفتہ رفتہ ان کے پیچھے پیچھے کچھ اور لوگ بھی اندر چلے آئے۔ جب وہاں موجود لوگوں کی تعداد تیس ہوگئی' تو امامؑ نے فرمایا: "یَــا دَوُد اکْشِفْ عَنْ وَجْہِ اِسْمَاعِیلَ." (اے داؤد! اسماعیل کے چہرے سے کپڑا ہٹادو) انہوں نے اسماعیل کے چہرے سے کپڑا ہٹادیا۔ امامؑ نے پوچھا: "یَا دَوُد اَحَیٌّ ھُوَ اَوْمَیِّتٌ." (اے داؤد یہ زندہ ہے یا مردہ؟) داؤد نے کہا: وہ مرچکا ہے۔ اس کے بعد امامؑ کے حکم سے تمام حاضرین نے یکے بعد دیگرے اسماعیل کے جسدِ خاکی کو دیکھا اور اُن کی موت کا اعتراف کیا۔ امامؑ نے ایک مرتبہ پھر یہ عمل دُہرایا' یہاں تک کہ اُنہیں قبرستان لے جایا گیا اور جب اُنہیں قبر میں اتارا جارہا تھا' تو امامؑ نے لوگوں کو مائل کیا کہ وہ اسماعیل کی موت کی گواہی دیں۔ اس موقع پر امامؑ نے اپنے بعد موسیٰ کاظمؑ کی امامت کی تاکید فرمائی۔(۳)

شیخ مفید لکھتے ہیں:

> "روایت ہوئی ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے اسماعیل کی موت پر بہت گریہ کیا اور شدید غم واندوہ آپ پر طاری ہوا اور آپ بغیر جوتوں اور بغیر ردا کے اُن کے تابوت کے آگے آگے چلتے رہے اور کئی مرتبہ تابوت کو زمین پر رکھنے کا حکم دیا۔ ہر مرتبہ آپ اُن کے چہرے کو کھولتے اور اسے دیکھتے۔ اس عمل سے آپ کا مقصد ان لوگوں پر اسماعیل کی موت کی قطعیت ثابت کرنا تھا جو انہیں اپنے والد کا جانشین سمجھتے

۱۔ الغیبۃ۔ ص ۳۲۶

۲۔ بحار الانوار۔ ج ۴۸۔ ص ۲۲

۳۔ الغیبۃ نعمانی۔ ص ۳۲۸

تھے۔ اسکے ساتھ ساتھ آپ اپنی زندگی ہی میں اس شبہ کو دور کرنا چاہتے تھے۔" (۱)

وہ روایات جو اس مسئلے پر بعض شیعوں کی پریشانی کی نشاندہی کرتی ہیں، اُن میں سے ایک ہشام بن سالم کی روایت ہے، وہ کہتے ہیں: میں مومن طاق کے ہمراہ مدینہ میں تھا۔ ہم نے دیکھا کہ کچھ لوگ عبداللہ بن جعفر بن محمد کے گھر میں جمع ہوئے ہیں۔ ہم نے عبداللہ سے زکات کے بارے میں کچھ مسائل دریافت کیے، لیکن اُس نے ہمیں درست جوابات نہیں دیے۔ ہم وہاں سے باہر نکل آئے لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہم مرجئہ، قدریہ، زیدیہ، معتزلہ یا خوارج میں سے کس فرقے کو قبول کریں۔ اس موقع پر ہم نے ایک بوڑھے کو دیکھا جسے ہم نہیں پہچانتے تھے۔ ہم سمجھے کہ وہ منصور کے جاسوسوں میں سے کوئی جاسوس ہے (جو مدینہ میں جعفر بن محمدؑ کے شیعوں سے واقفیت کے لیے اُن کی صفوں میں گھس گئے تھے) لیکن اسکے برخلاف وہ بوڑھا شخص ہمیں ابوالحسن موسیٰ بن جعفرؑ کے گھر لے گیا۔ ابھی ہم وہیں تھے کہ فضیل اور ابوبصیر بھی وہاں پہنچ گئے، اُن سے سوالات کیے اور اُن کی امامت کا یقین حاصل کیا۔ پھر ہر طرف سے گروہ در گروہ لوگ آنے لگے، سوائے عمار ساباطی کے گروہ کے اور کچھ اور بہت تھوڑے لوگوں کے جو عبداللہ بن جعفر کو (امام) مانتے تھے۔ (۲)

درج بالا روایت میں جو چیز اپنی جانب توجہ مبذول کراتی ہے، وہ یہ ہے کہ شیعہ ایسے لوگ نہیں تھے جو بغیر تحقیق کیے امامت اور وصایت کا دعویٰ کرنے والے ہر شخص کے دعوے کو قبول کر لیں۔ بلکہ وہ خاص قسم کے سوالات کر کے اُس کے علم و دانش کو پرکھتے تھے، اور جب علمی اعتبار سے اُس کی امامت کا یقین حاصل کر لیتے تھے تب اسکی وصایت کو قبول کرتے تھے۔ درج بالا روایت اس اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ہشام، فضیل اور ابوبصیر جیسے افراد بھی احتیاط اور تحقیق سے کام لیتے تھے۔ اسی طرح ان خطرات کی جانب بھی اشارہ کرتی ہے جو امام جعفر صادقؑ کے شیعوں کو منصور عباسی کی طرف سے لاحق تھے۔

یہ بات کہ شیعوں نے عبداللہ بن جعفر کو (جو عبداللہ افطح کے نام سے مشہور تھا اور اسی لیے اس کے ماننے والوں کو فطحیہ کہا گیا ہے) (۳) حلال و حرام اور نماز و زکات وغیرہ کے بارے میں سوالات کر کے آزمایا اور انہیں اس کے پاس کوئی علم نظر نہیں آیا لہٰذا اس سے منہ موڑ لیا۔ نوبختی نے بھی "فِرَق الشیعہ" (۴) میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اس بیان اور دوسری روایات میں اس جانب اشارہ موجود ہے کہ عقیدے کے اعتبار سے عبداللہ مرجئہ کی جانب مائل تھا۔ (۵)

۱۔ ارشاد۔ ص ۲۶۷

۲۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۳۵۱۔ ۳۵۲، الخرائج والجرائح۔ ص ۲۹۷

۳۔ اس نام کے بارے میں دیکھیے: فرق الشیعہ۔ ص ۷۷

۴۔ فرق الشیعہ۔ ص ۷۷۔ ۷۸

۵۔ الفصول المختار۔ ص ۲۵۳

نوبختی نے امام جعفر صادق علیہ السلام کی رحلت کے بعد شیعوں کی چھ فرقوں میں تقسیم کو اس ترتیب سے بیان کیا ہے:

۱۔ وہ لوگ جو خود امام جعفر صادق علیہ السلام کی مہدویت کے معتقد تھے۔

۲۔ اسماعیلیۂ خالصہ جو اسماعیل کے زندہ ہونے پر مُصر تھے۔

۳۔ وہ لوگ جو اسماعیل کے فرزند محمد کی امامت پر اعتقاد رکھتے تھے۔ (۱)

۴۔ ایک گروہ جو محمد بن جعفر المعروف دیباج کی امامت کا معتقد تھا۔

۵۔ وہ گروہ جو عبداللہ فطح (جس کا ذکر ابھی گزرا ہے) کی امامت کو قبول کرتا تھا۔

نوبختی اس اختلاف کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: شیعوں نے اس حدیث کی بنیاد پر کہ: اَلْاِمَامَۃُ فِی الْاَکْبَرِ مِنْ وُلْدِ الْاِمَامِ. (امامت گزشتہ امام کے بڑے بیٹے کو ملتی ہے) اُس {عبداللہ} کی طرف گئے' لیکن جب وہ ان کے سوالات کے جواب نہ دے سکا' تو اُنہوں نے اُسے چھوڑ دیا۔ وہ لکھتے ہیں: ابتدا میں بہت سے شیعہ بزرگ اُس کی طرف گئے۔ عبداللہ نے امام جعفر صادق علیہ السلام کی وفات کے تقریباً ۷۰ دن بعد دنیا سے کوچ کیا۔ اس کا کوئی بیٹا نہیں تھا' اس لیے مجبوراً اُس کے تمام پیروکار اُس کی امامت کے عقیدے سے پلٹ کر امام موسیٰ ابن جعفر علیہ السلام کی امامت کے قائل ہو گئے۔ اگرچہ ان میں سے کچھ لوگ عبداللہ کی زندگی ہی میں امام موسیٰ کاظم کی طرف لوٹ آئے تھے۔

۶۔ وہ لوگ جو موسیٰ بن جعفرؑ کی امامت کے معتقد تھے۔

شیعوں میں ہشام بن سالم' عبداللہ بن ابی یعفور (۲)' عمر بن یزید بیاع السابری' محمد بن نعمان' مومن طاق' عبید بن زرارہ' جمیل بن درّاج' ابان بن تغلب (۳) اور ہشام بن حَکَم جیسے افراد' جو اُن کے بزرگ' اہلِ علم' صاحب رائے اور شیعوں کے فقہا شمار کیے جاتے تھے' انہوں نے موسیٰ ابن جعفر علیہ السلام کی امامت کو قبول کر لیا تھا۔ صرف عبداللہ بن بکیر بن اعین اور عمار بن موسیٰ ساباطی تھے' جنہوں نے آپ کی امامت کو قبول نہیں کیا تھا۔ (۴)

مرحوم طبرسی نے اعلام الوریٰ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کے شیعوں میں آپ کے بعد بننے والے گروہوں کا

۱۔ شیخ مفید نے اس کی امامت کے قائل افراد کی تعداد بہت کم قرار دی ہے' دیکھیے: الفصول المختار۔ ص ۲۵۲۔ اس کے باوجود بعد میں یہی گروہ اسماعیلیہ کے نام سے مشہور ہوا۔

۲۔ بعض کتابوں میں ان واقعات سے پہلے ہی ان کی وفات کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

۳۔ ایضاً

۴۔ فرق الشیعہ۔ ص ۷۹

ذکر کیا ہے اور ان کے رجحان کی وجوہات بھی بیان کی ہیں۔(۱)

امام موسیٰ کاظمؑ کا سیاسی طرزِ عمل

وہ دور جس میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام زندگی بسر کر رہے تھے وہ عباسی حکمرانوں کے ظلم واستبداد کا پہلا مرحلہ تھا۔ انہوں نے علویوں کے نام پر زمامِ حکومت پر قبضہ کرنے کے کچھ عرصے بعد تک لوگوں اور خصوصاً علویوں کے ساتھ نسبتاً نرم رویہ اختیار کیا۔ لیکن جوں ہی انہیں حکومت پر کنٹرول حاصل ہوا اور انہوں نے اپنے اقتدار کی بنیادیں مضبوط کر لیں' اور دوسری طرف علویوں کی حمایت میں مختلف تحریکیں اٹھنے لگیں' جن کی وجہ سے ان پر سخت خوف وہراس طاری ہوگیا' تو انہوں نے ظلم وستم کو اپنی سیاست کی بنیاد بنالیا اور اپنے مخالفین پر شدید دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ انہوں نے عبداللہ بن علی جیسے اپنے نزدیک ترین دوست کو بھی سفاح کی جانشینی کے لیے اس کی خفیہ کوششوں کی پاداش میں قتل کر دیا۔ اسی طرح انہوں نے ابوسلمہ اور ابومسلم خراسانی کو بھی راستے سے ہٹا دیا۔

منصور نے بڑی تعداد میں علویوں کو شہید کیا اور اُن کی ایک کثیر تعداد اس کے قید خانوں میں موت سے ہم آغوش ہوئی۔(۲)

دباؤ ڈالنے کی یہ پالیسی امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانے سے شروع ہوئی اور امام علی رضا علیہ السلام کے زمانے تک' جو مامون کی خلافت کا زمانہ تھا' اپنی تمام تر شدت کے ساتھ جاری رہی۔ مامون کے زمانے میں لوگوں نے کچھ سیاسی امن وسکون محسوس کیا' لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ دربارِ خلافت نے دوبارہ لوگوں پر دباؤ کی پالیسی کا آغاز کر دیا۔

عباسیوں کا سیاسی دباؤ اُس زمانے میں شروع ہوا جس سے پہلے امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام اپنے بہت سے شاگردوں کی تربیت کر کے شیعوں کی علمی اور حدیثی بنیادوں کو مستحکم کر چکے تھے' اور شیعوں کے درمیان ایک عظیم تحریک کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ امام موسیٰ کاظمؑ اس دور کے بعد دباؤ کا مرکز بنے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کی ذمے داری یہ تھی کہ اس علمی تحریک میں شیعوں کے درمیان فکری توازن برقرار رکریں۔ قدرتی بات ہے کہ عباسی حکمران امامؑ کی قیادت میں شیعہ نامی کسی گروہ کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ یہ وہ اہم ترین عامل تھا جو انہیں مجبور کرتا تھا کہ وہ امامؑ کو دباؤ میں رکھیں۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے اپنے والد کی شہادت کے بعد سن ۱۴۸ ہجری میں امامت کی ذمے داری سنبھالی۔

۱۔ اعلام الوریٰ۔ ص ۲۸۸

۲۔ تاریخ فخری۔ ص ۲۲۱۔۲۲۲

منصور عباسی کی موت مکہ میں سن ۱۵۸ ہجری میں واقع ہوئی۔ سن ۱۶۹ ہجری تک اس کا بیٹا مہدی عباسی اس کا جانشین رہا۔ اس کے بعد ایک سال تک ہادی عباسی نے خلافت سنبھالی اور پھر ہارون رشید خلیفہ بنا۔ امامؑ نے ۱۸۳ ہجری میں شہادت پائی اور اس پورے عرصے میں آپ نے شیعوں کی قیادت کی۔

جیسا کہ ہم نے کہا' امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا دور شیعوں کے لیے انتہائی دشوار دور تھا اور اس دور میں شیعوں اور علویوں کی جانب سے عباسی خلفا کے خلاف متعدد تحریکیں اُٹھیں۔ ان میں سے اہم ترین (ہادی عباسی کے دورِ حکومت میں) حسین بن علی (شہید فخ) کی تحریک' نیز ہارون کے دور میں عبداللہ کے بیٹوں یحییٰ اور ادریس کی تحریک تھی۔ درحقیقت عباسیوں کے اہم ترین رقیب علوی ہی تھے اور قدرتی بات تھی کہ حکومت ان پر سختی سے نظر رکھتی تھی۔

تاریخ اور حدیث کی کتابوں نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے ساتھ عباسی خلفا کی متعدد جھڑپوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر ہارون الرشید کے ساتھ ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ تمام شیعہ ائمہ تقیہ پر عمل کی تاکید کیا کرتے تھے' اور ان کی کوشش رہتی تھی کہ شیعوں کی تنظیم اور ان کی قیادت کا عمل خفیہ طور پر انجام دیں۔ قدرتی بات ہے کہ یہ صورتحال اس بات کا سبب بنتی تھی کہ تاریخ ان کے سیاسی اقدامات کا زیادہ گہرائی سے جائزہ نہ لے سکے۔ اس کے باوجود' شیعوں کا استحکام' جو اس قسم کی جدوجہد کے بغیر ناممکن تھا' ان مسلسل کوششوں کا گواہ ہے۔ اس تحریک کی قیادت اور اس کی رہنمائی میں جس باریکی سے کام لیا گیا' وہ تاریخ میں شیعوں کے استحکام کا اہم عامل رہا ہے۔

اب ہم عباسی خلفا' خاص کر ہارون الرشید کی امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے ساتھ ہونے والی جھڑپوں پر ایک نظر ڈالیں گے۔ ان جھڑپوں سے امامؑ کی پوزیشن نیز آپ کی سیاسی روش کا علم ہوتا ہے۔

ابن شہر آشوب نے منصور عباسی کے امام موسیٰ کاظمؑ کے ساتھ ایک جھڑپ کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''منصور نے امامؑ سے درخواست کی کہ وہ عید نوروز کے دن اس کی جگہ مجلس میں تشریف رکھیں اور جو تحائف لائے جائیں' انہیں اُس کی طرف سے قبول کریں۔ امامؑ نے اسے جواب دیا:

''اِنِّی قَدْ فَتَّشْتُ الْاَخْبَارَ عَنْ جَدِّی رَسُوْلِ اللّٰہِ (صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم) فَلَمْ اَجِدْ لِهٰذَا الْعِيدِ خَبَرًا' اِنَّهُ سُنَّةٌ لِلْفُرْسِ مَحَاهَا الْاِسْلَامُ وَمَعَاذَ اللّٰہِ اَنْ نُحْيِيَ مَا مَحَاهُ الْاِسْلَامُ.''(۱)

''میں نے اپنے جد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روایات کا جائزہ لیا ہے' مجھے اس عید کے بارے میں

۱۔ مناقب ابن شہر آشوب۔ ج ۴۔ ص ۳۱۹' مسند الامام الکاظمؑ۔ ج ۱۔ ص ۵۱۔ ۵۲

کوئی روایت نہیں ملی۔ یہ عید ایرانیوں کی سنت ہے، جس پر اسلام نے خط بطلان کھینچا ہے۔ میں اس بات سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ جس چیز کو اسلام نے ختم کیا ہے میں اُسے زندہ کروں۔"

منصور نے جواب میں کہا کہ وہ اس کام کو لشکر کی خاطر (سیاسۃ للجند) انجام دیتا ہے، کیونکہ منصور کے بہت سے فوجی، حتیٰ اس علاقے کے مشہور زمیندار بھی ایرانی تھے اور قدرتی بات ہے کہ اس عید کی مناسبت سے وہ منصور کو بہت سے تحفے دیا کرتے تھے۔ اس طرح اس (منصور کنجوسی میں بھی مشہور تھا) کے خزانے میں بڑی مقدار میں مال و دولت کا اضافہ ہوتا تھا۔ اس نے امامؑ کو مجبور کیا کہ وہ اُس دن منصور کی طرف سے مجلس میں تشریف فرما ہوں اور افواج کے تحائف قبول فرمائیں۔ اس صورتحال میں اس حرکت پر منصور کے ساتھ امامؑ کا برتاؤ قابلِ توجہ ہے۔

اس کے بعد، مہدی عباسی کے دس سالہ دورِ حکومت میں، جبکہ امامؑ تدریس، نقلِ حدیث، شاگردوں کی تربیت اور مختلف علاقوں کے شیعہ رہنماؤں کے ساتھ روابط پیدا کرنے میں مشغول تھے، تاریخ نے امامؑ کے حوالے سے اُس کے قابلِ توجہ اقدامات کو اپنے صفحات میں درج کیا ہے۔ ان میں سے اہم ترین امامؑ کو بغداد میں حراست میں لینا، قید کرنا اور آخرکار آزاد کرنا ہے، جسے ابن اثیر، خطیب بغدادی اور ابن خلکان جیسے مورخین نیز شیعہ راویوں نے بھی نقل کیا ہے۔ مہدی عباسی، جسے شاید امامؑ کی بخششوں نے وحشت زدہ کر دیا تھا اور وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ آپ نے رقوم جمع کی ہوئی ہیں جنہیں آپ شیعوں کو منظم اور مضبوط کرنے کے لیے خرچ کر رہے ہیں۔ لہٰذا اُس نے مدینہ میں اپنے گورنر کو امامؑ کی گرفتاری کا حکم دیا۔ اس نے امامؑ کو گرفتار کر کے بغداد روانہ کر دیا۔ مہدی عباسی نے آپ کو قید خانے میں ڈال دیا۔ رات کو اُس نے حضرت علی ابن ابیطالبؑ کو خواب میں دیکھا، کہ آپ فرما رہے تھے: فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ؟ (اگر تمہیں حکومت مل جائے، تو کیا تم سے کچھ بعید ہے کہ تم زمین میں فساد برپا کرو گے اور قرابتداروں سے قطع تعلق کرلو گے؟)۔(۱)

اسی وقت مہدی نیند سے اٹھ بیٹھا، اپنے حاجب کو، جس کا نام ربیع تھا آواز دی، اور اُسے حکم دیا کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو اُس کے سامنے حاضر کیا جائے۔ جب امامؑ تشریف لائے، تو اُس نے آپ کو اپنے پہلو میں بٹھایا اور کہا: میں نے امیر المومنینؑ کو خواب میں دیکھا ہے، وہ اس آیت کی تلاوت فرما رہے تھے۔ پھر اُس نے امامؑ سے پوچھا: کیا آپ مجھے یہ اطمینان دلائیں گے کہ آپ میرے خلاف یا میری کسی اولاد کے خلاف قیام نہیں کریں گے؟ امامؑ نے فرمایا: "وَاللّٰهِ مَا فَعَلْتُ ذٰلِكَ وَلَا هُوَ مِنْ شَأْنِي۔" (خدا کی قسم میں نے ایسا کام نہیں کیا ہے، اور نہ ہی یہ کام میری شان کے مطابق ہے)

۱۔ سورۂ محمدؐ ۴۷۔ آیت ۲۲

خلیفہ نے امامؑ کو تین ہزار درہم دیئے' آپ کی باتوں کی تصدیق کی اور اپنے اس طرزِ عمل سے اس بات کی کوشش کی کہ امامؑ اُس سے راضی ہو کر مدینہ واپس پلٹیں۔ اس نے فوری طور پر امامؑ کو مدینہ واپس بھجوادیا۔ (۱)

دوسری مرتبہ آپ کے ساتھ ایسا ہی واقعہ ہارون کے دور میں پیش آیا' جسے ہم بعد میں نقل کریں گے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کو چھوڑ کر دوسرے تمام ائمہؑ کی نسبت امام موسیٰ کاظمؑ کے بارے میں زیادہ غیر معمولی واقعات نقل ہوئے ہیں' یہاں تک کہ غیر شیعہ کتابوں میں بھی اس قسم کے واقعات کے بہت سے شواہد دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس کا ایک نمونہ ''دینوری'' کی وہ روایت ہے جو اس نے ''اخبار الطوال'' میں نقل کی ہے' اور یہ وہ پیش گوئی ہے جو امام موسیٰ کاظمؑ نے ہارون الرشید کو اُس کے بیٹوں کے درمیان پیدا ہونے والے اختلاف کے بارے میں کی تھی۔

ایک مرتبہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام مہدی عباسی کے پاس آئے' آپ نے دیکھا کہ وہ ردِ مظالم کر رہا ہے۔ امامؑ نے اسے اس حال میں دیکھا' تو اُس سے پوچھا: جو کچھ تم نے ظلم و ستم کر کے ہم سے چھینا ہے' اُسے کیوں ہمیں واپس نہیں کر دیتے؟ مہدی نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ امامؑ نے اس کے سامنے فدک کے قصے کی اس طرح وضاحت فرمائی: فدک کیونکہ: ''مَا لَمْ يُوجِفْ عَلَيْهِ خَيْلٌ وَلَا رِكَابٌ'' (وہ جس کے لیے جنگ نہ کی گئی ہو) کے زمرے میں آتا تھا' اس لیے وہ خالصتاً رسول اللہ کی ملکیت تھا' جسے آپ نے اپنی بیٹی فاطمہؑ کو عطا کر دیا تھا' اور آپ کی رحلت کے بعد علیؑ' حسنؑ' حسینؑ اور امِ ایمن کی گواہی کی بنیاد پر ابوبکر فدک' حضرت فاطمہؑ کو واپس لوٹانے پر تیار ہو گئے تھے' لیکن عمر اُن کے آڑے آگئے۔ مہدی نے کہا: اس کی حدود واضح کر دیجیے' تاکہ میں اسے آپ کو لوٹا دوں۔ امامؑ نے فدک کی حدود بیان فرمائیں' تو خلیفہ بولا: یہ تو بہت زیادہ ہے' میں اس بارے میں سوچوں گا۔ (۲)

ظاہر ہے کہ مہدی یہ کام نہیں کر سکتا تھا' کیونکہ اس طرح وہ نہ صرف اُن لوگوں کی شکست قبول کرتا جو فدک واپس اہلِ بیتؑ کو لوٹانے میں رکاوٹ بنے تھے (اور ان لوگوں میں خود اس کے اجداد بھی شامل تھے) بلکہ فدک کی واگزاری کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر مالی وسائل بھی امامؑ کو میسّر آسکتے تھے اور یہ حکومت کی مصلحت میں نہ ہوتا۔

سن ۱۶۹ ہجری میں مہدی کی موت کے بعد اُس کا بیٹا موسیٰ الہادی تخت نشین ہوا۔ وہ ایک سال سے زیادہ زندہ نہ

۱۔ حیاۃ الامام موسیٰ بن جعفرؑ۔ ج ۱۔ ص ۴۵۴ (از نور الابصار۔ ص ۱۳۶)' تاریخ بغداد۔ ج ۱۳۔ ص ۳۰' وفیات الاعیان۔ ج ۵۔ ص ۳۰۸' المناقب۔ ج ۲۔ ص ۳۶۳' جہاد الشیعہ۔ ص ۲۵۱ (از مقاتل الطالبیین۔ ص ۵۰۰)' مسند الامام الکاظمؑ۔ ج ۱۔ ص ۵۷ (از کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۲۱۳' الکامل فی التاریخ۔ ج ۶۔ ص ۸۵' مرآۃ الجنان۔ ج ۱۔ ص ۳۹۴' تتمۃ المختصر۔ ج ۱۔ ص ۲۱۰' شذرات الذہب۔ ج ۱۔ ص ۳۰۴)

۲۔ التہذیب۔ ج ۴۔ ص ۳۰۴

رہا۔ اسی کے زمانے میں حسین بن علی شہید فخ نے قیام کیا اور شہید ہوئے۔ جب اُن کا سر ہادی کے پاس لایا گیا' تو اُس نے چند اشعار پڑھے' جس میں اس نے طالبیوں پر قطع رحم کا الزام لگایا۔ اس کے بعد اُس نے موسیٰ ابن جعفرؑ کے بارے میں اپنی شدید تشویش کا اظہار کیا اور قسم کھائی کہ وہ انہیں قتل کر دے گا۔ وَاللّٰهِ مَاخَرَجَ حُسَيْنُ اِلَّا عَنْ اَمْرِهِ وَلَا تَبِعَ اِلَّا مَحَبَّةَ لِاَنَّهُ صَاحِبُ الْوَصِيَّةِ فِي هٰذَا الْبَيْتِ قَتَلَنِي اللّٰهُ اِنْ اَبْقَيْتُ عَلَيْهِ. (خدا کی قسم حسین (شہید فخ) نے ان (امام موسیٰ کاظمؑ) کے حکم سے قیام کیا ہے اور وہ انہی کے زیر اثر تھا۔ کیونکہ اس خاندان میں صاحب وصیت (بااثر) یہی ہیں۔ اگر میں انہیں زندہ چھوڑوں تو خدا مجھے قتل کر دے)

قاضی ابو یوسف' جو اُس وقت وہاں موجود تھا' اُس نے اسے ٹھنڈا کیا اور بولا: موسیٰ ابن جعفرؑ اور اُن کے خاندان کا کوئی فرد خلفا کے خلاف خروج کا عقیدہ نہیں رکھتا۔ (۱) آگے لکھا ہے کہ: جب امامؑ کو ہادی کے ہاتھوں اپنی گرفتاری اور قتل کیے جانے کے خطرے کا علم ہوا' اور آپ نے اُس کی دھمکیاں سنیں' تو آپ نے اس کے حق میں نفرین فرمائی اور کچھ ہی دنوں بعد اُس کی موت کی خبر مدینہ پہنچ گئی۔ (۲)

درحقیقت ہمیں بھی اس بات کا یقین نہیں ہے کہ شہید فخ نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے حکم سے قیام کیا ہوگا۔ اگرچہ اس بات کو قبول کیا جا سکتا ہے کہ قیامِ فخ عباسیوں کے خلاف اٹھنے والی علوی تحریکوں میں سے سالم ترین تحریکوں کی فہرست میں شامل ہے۔ قابلِ ذکر ہے کہ زیدی شیعہ' جو شیعوں میں انتہا پسند گروہ شمار ہوتے تھے' وہ یہ ظاہر کرتے تھے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام جہاد کے معتقد نہیں ہیں۔ اُن کے جواب میں امامؑ فرمایا کرتے تھے: وَلٰكِنْ لَااَدَعُ عِلْمِي اِلٰى جَهْلِهِمْ. (میں اپنے علم کو اُن کے جہل کے سپرد نہیں کر سکتا)

البتہ زیدیوں کی برپا کردہ تحریکوں کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ اگرچہ یہ تحریکیں سچائی اور خلوصِ نیت پر مبنی ہوتی تھیں' اور کبھی کبھی ان کے رہنما عالم فاضل اور فداکار افراد ہوا کرتے تھے' لیکن مختلف سیاسی وجوہات کی بنا پر' ان کی کثرت اور وسعت کے باوجود ان کا کام بے نتیجہ رہ جاتا تھا۔ کم از کم عراق میں انہیں معمولی سی بھی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ امامی شیعہ جو ان تحریکوں سے کسی طرح متفق نہیں تھے' اس مسئلے میں اُن سے الجھ پڑے اور ان کے درمیان اختلاف پیدا ہوگیا۔ بالخصوص اگر اُن گہرے اختلافات کو مدِ نظر رکھا جائے جو بتدریج زیدیہ اور شیعوں کے درمیان پیدا ہو رہے تھے' تو ان تحریکوں میں امامیوں کی شرکت' درست معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ زیدیوں کی قیادت شیعہ ائمہؑ کی بجائے دوسرے لوگوں کے

۱۔ حیاۃ الامام موسیٰ بن جعفرؑ۔ ج۱۔ ص ۴۷۲

۲۔ دیکھئے: مناقب ابن شہر آشوب۔ ج۲۔ ص ۳۷۶' عیون اخبار الرضاؑ۔ ج۱۔ ص ۹۷۔ خلیفہ کی جانب سے دھمکی ملنے کے بعد جو ایک مفصل دعا امامؑ نے پڑھی' وہ جوشن صغیر کے نام سے مشہور ہے' جو دعا کی کتابوں میں موجود ہے۔

ہاتھوں میں تھی۔ زیدیہ اور شیعوں کے درمیان اختلافات ممکنہ طور پر خود زید ہی کے زمانے سے شروع ہو گئے تھے اور نفس زکیہ کے معاملے میں اپنے عروج پر پہنچ چکے تھے۔ یہاں تک کہ ان اختلافات نے زیدیوں اور شیعوں کا باہمی تعاون بہت مشکل بنا دیا تھا۔ جب شہید فخ نے قیام کیا' تو مدینہ کے اکثر علویوں نے اس قیام میں شرکت کی' لیکن امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے نہ صرف اس میں شرکت نہیں کی' بلکہ ان کی یقینی شکست اور شہادت کے بارے میں بھی انہیں بتا دیا تھا۔(۱)

شہید فخ مدتوں سے قیام کی فکر میں تھے۔ لیکن ہادی عباسی کی جانب سے علویوں پر شدید دباؤ اس قیام میں عجلت کا باعث بنا۔ حاکم مدینہ' جس کا تعلق حضرت عمر کے خاندان سے تھا' اس نے علویوں پر بہت زیادہ سختیاں کیں۔ اس کا یہ طرز عمل اس بات کا سبب بنا کہ قیام جلد شروع ہو گیا' اور ایام حج میں جبکہ خلیفہ کی جانب سے بھی بڑی تعداد میں افراد مکہ بھیجے گئے تھے' قیام کا آغاز ہو گیا۔ لیکن نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ خلیفہ کے لشکر نے قیام کو سختی کے ساتھ دبا دیا۔ ان کے درمیان ہونے والی جنگ' خود حسین ابن علی اور ان کے اکثر ساتھیوں کی شہادت اور شکست کے ساتھ ختم ہوئی اور جب ان کے سر موسیٰ بن عیسیٰ کے سامنے پیش کیے گئے' تو اس موقع پر وہاں امام موسیٰ کاظمؑ سمیت' علی بن ابیطالبؑ کے کچھ اور فرزند بھی موجود تھے۔ موسیٰ بن عیسیٰ نے حسین ابن علی کے سر کی طرف اشارہ کر کے امامؑ سے پوچھا: کیا یہ حسین ابن علی کا سر ہے؟ امامؑ نے فرمایا:

"نعم انا لله و انا اليه راجعون. مضى و الله مسلما صالحا قواما آمرا بالمعروف و ناهيا عن المنكر و ما كان في اهل بيته مثله."(۲)

"ہاں' انا للہ وانا الیہ راجعون' خدا کی قسم وہ اس حال میں اس دنیا سے رخصت ہوئے ہیں کہ نیک مسلمان تھے' عبادت الٰہی کے لیے قیام کرتے تھے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے خاندان میں بے مثال تھے۔"

امام کا یہ جواب سن کر موسیٰ بن عیسیٰ خاموش رہا اور کچھ نہیں بولا۔

امام موسیٰ کاظمؑ اور ہارون الرشید

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی زندگی کے بارے میں نقل کی جانے والی روایات کا ایک اہم حصہ آپ پر ہارون الرشید کی سختیوں سے متعلق ہے۔ ان روایات کو ہم تین حصوں میں بیان کریں گے:

۱۔ وہ روایات جو امامؑ اور ہارون کے درمیان ہونے والی جھڑپوں کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔

۱۔ مقاتل الطالبین۔ ص ۲۹۷۔ ۲۹۸

۲۔ ایضاً۔ ص ۳۰۲

۲۔وہ روایات جو آپ کی گرفتاری اور اسیری سے متعلق واقعات بیان کرتی ہیں۔

۳۔وہ روایات جو آپ کی شہادت کے بارے میں ہیں۔

اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ ہارون الرشید سن ۱۷۰ ہجری میں خلیفہ بنا اور سن ۱۹۳ ہجری تک زمامِ اقتدار اُس کے ہاتھ میں رہی۔اس دوران علویوں کے ساتھ اُس کی مختلف لڑائیاں ہوئیں اور متعدد مواقع پر اُس نے انہیں اذیتیں پہنچائیں اور اُن کا قتلِ عام کیا۔اس مختصر کتاب میں اس کے تفصیلی بیان کی گنجائش نہیں ہے۔اس قتل وغارتگری کی روایات کو ابوالفرج اصفہانی نے ''مقاتل الطالبیین'' میں اور اُن میں سے بعض کو ''طبری'' نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔کلی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہارون الرشید کے دور میں اُس کی طرف سے شیعوں پر ہونے والے ظلم وستم کا موازنہ اسکے پہلے کے کسی اور دور میں شیعوں پر ہونے والے مظالم کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا' ہاں اس کی وسعت اور شدت کے لحاظ سے اس کا موازنہ متوکل جیسے دور کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔البتہ بعید نہیں ہے کہ بعض مواقع پر ہارون نے اپنے مخالفوں اور خاص طور پر علویوں کے ساتھ کچھ نرمی کا مظاہرہ بھی کیا ہو' لیکن بدقسمتی سے کیونکہ ہارون الرشید اور امام موسیٰ کاظمؑ کے درمیان ہونے والی جھڑپوں کی ٹھیک ٹھیک تاریخ واضح نہیں ہے' اس لیے انہیں ایک منظم تاریخی تسلسل کے ساتھ بیان نہیں کیا جاسکتا۔

ان جھڑپوں سے متعلق روایات کو ہم تین حصوں میں بیان کرتے ہیں:

پہلا حصہ

ان میں سے بعض روایات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ ابتدا میں ہارون نے امامؑ کے حوالے سے زیادہ سخت گیری کا مظاہرہ نہیں کیا تھا' لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور مختلف وجوہات کی بنا پر وہ بتدریج آپ پر سختیاں بڑھاتا چلا گیا۔ایک روایت' جسے عیاشی اور شیخ مفید نے نقل کیا ہے' اُس میں ہے کہ:

''جب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو ہارون کے سامنے پیش کیا گیا' تو جو باتیں اُس نے آپ سے کہیں اُن میں سے بعض یہ ہیں:

یہ دنیا کیا ہے؟ اور کن لوگوں کے لیے ہے؟

فرمایا: یہ ہمارے شیعوں کے لیے سکونِ قلبی کا باعث اور دوسروں کے لیے سبب امتحان ہے۔

ہارون نے کہا: تو کیوں اس کا مالک اسے اپنے اختیار میں نہیں لے لیتا؟

آپ نے جواب دیا: جب یہ آباد تھی' تو اس سے چھین لی گئی' اب جب یہ آباد ہو جائے گی' تو اس کا مالک اسے اپنے اختیار میں لے لے گا۔

اُس نے کہا: آپ کے شیعہ کہاں ہیں؟

امامؑ نے جواب میں اس آیت کی تلاوت فرمائی: لَمْ یَكُنِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ الْمُشْرِكِیْنَ مُنْفَكِّیْنَ حَتّٰی تَاْتِیَهُمُ الْبَیِّنَةُ. (کافروں میں سے اہلِ کتاب اور مشرک (اپنے کفر سے) دستبردار ہونے والے نہ تھے یہاں تک کہ ان کے پاس خدا کے پاس سے ایک روشن دلیل آ گئی)۔(۱)

ہارون نے کہا: اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کافر ہیں؟

فرمایا: نہیں، لیکن ایسے ہی ہو جیسے خدا نے فرمایا ہے کہ: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ. (کیا آپ ان کو نہیں دیکھتے جنہوں نے خدا کی نعمت کو کفر سے بدل دیا اور اپنی قوم کو ہلاکت میں ڈال دیا)۔(۲)

اس موقع پر ہارون طیش میں آ گیا اور آپ کے ساتھ سختی سے پیش آیا۔"(۳)

ایک اور روایت جسے شیخ صدوق نے نقل کیا ہے وہ یہ بتاتی ہے کہ ایک مرتبہ ہارون نے کسی کو امام موسیٰ کاظمؑ کے پاس بھیجا اور اسے حکم دیا کہ جتنا جلد ممکن ہو حضرت کو حاضر کیا جائے۔ جب خلیفہ کا بھیجا ہوا شخص مدینہ میں آپ کے حضور پہنچا اور اُس نے آپ سے کہا کہ آپ خلیفہ کی خدمت میں چلیں تو آپ نے فرمایا: "لَوْلَا اَنِّیْ سَمِعْتُ فِیْ خَبَرٍ عَنْ جَدِّیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اَنَّ طَاعَةَ السُّلْطَانِ لِلتَّقِیَّةِ وَاجِبَةٌ اِذًا مَاجِئْتُ." (اگر میں نے اپنے نانا رسول اللہ کی یہ حدیث نہ سنی ہوتی کہ تقیے کی بنا پر سلطان کی اطاعت واجب ہے تو میں ہرگز نہ جاتا)۔ جب آپ ہارون الرشید کے پاس پہنچے تو اُس نے اپنا غصہ چھپالیا اور آپ کے ساتھ مہربانی سے پیش آیا اور پوچھا: آپ ہم سے ملاقات کے لیے کیوں نہیں آتے؟ امامؑ نے فرمایا: "سَعَةُ مَمْلَكَتِكَ وَحُبُّكَ لِلدُّنْیَا." (تیری حکومت کی وسعت اور تیرے حبِ دنیا میں گرفتار ہونے کی وجہ سے)

اس کے بعد ہارون الرشید نے آپ کو کچھ تحائف دیئے جن کے بارے میں آپ نے فرمایا: "وَاللّٰهِ لَوْلَا اَنِّیْ اَرٰی اَنْ اُزَوِّجَ بِهَا مِنْ عُزَّابِ بَنِیْ طَالِبٍ لِئَلَّا یَنْقَطِعَ نَسْلُهُ اَبَدًا مَاقَبِلْتُهَا." (خدا کی قسم! اگر میں آلِ ابوطالب کے غیر شادی شدہ افراد کی فکر میں نہ ہوتا کہ کہیں اُن کی نسل منقطع نہ ہو جائے تو کسی صورت یہ تحفے قبول نہ کرتا)۔(۴)

۱۔ سورۂ بینہ ۹۸۔ آیت ۱

۲۔ سورۂ ابراہیم ۱۴۔ آیت ۲۸

۳۔ دیکھئے: الاختصاص۔ ص ۲۶۲، تفسیر عیاشی۔ ج ۲۔ ص ۲۳۰، بحار الانوار۔ ج ۴۸۔ ص ۱۳۸

۴۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۱۔ ص ۷۶

دوسرا حصہ

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی اسیری کے بارے میں متعدد اور مختلف روایات نقل ہوئی ہیں۔ مجموعی طور پر ان روایات سے جو چیز سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ امام موسیٰ کاظمؑ دو مرتبہ ہارون الرشید کے ہاتھوں قیدی بنے، جن میں سے دوسری مرتبہ کی آپ کی اسیری سن ۱۷۹ سے سن ۱۸۳ ہجری تک یعنی چار سال کے عرصے تک جاری رہی اور اس کا خاتمہ آپ کی شہادت پر ہوا۔ پہلی مرتبہ اسیری کی مدت تاریخ میں درج نہیں ہوئی ہے۔ ہارون ہی کے ہاتھوں دو مرتبہ امامؑ کی اسیری کی دلیل مورخین کے اشاروں کے علاوہ (۱) کچھ اور روایات بھی ہیں جو امامؑ کی زندانِ ہارون سے پہلی مرتبہ رہائی کی خبر دیتی ہیں اور انہیں کئی راویوں نے نقل کیا ہے۔

مسعودی لکھتا ہے: ہارون الرشید کے محل کا نگراں اور پولیس کا سربراہ عبداللہ بن مالک خزاعی کہتا ہے: ہارون کا بھیجا ہوا آدمی ایک ایسے وقت میں میرے پاس آیا کہ کبھی اور وہ اس وقت میرے پاس نہیں آیا تھا، اُس نے مجھے کپڑے بدلنے کی مہلت بھی نہ دی اور اسی حال میں مجھے ہارون کے پاس لے گیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے سلام کیا اور بیٹھ گیا۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے بہت تعجب ہو رہا تھا اور ہر لحظہ میری پریشانی بڑھ رہی تھی۔ اس موقع پر ہارون نے مجھ سے پوچھا: عبداللہ! تم جانتے ہو میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟ میں نے کہا: واللہ میں نہیں جانتا۔ کہنے لگا: میں نے ایک حبشی کو خواب میں دیکھا، اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار تھا اور وہ مجھ سے کہہ رہا تھا: اگر تم نے ابھی اور اسی وقت موسیٰ ابن جعفرؑ کو آزاد نہ کیا، تو میں اس ہتھیار سے تمہارا سر تن سے جدا کردوں گا۔ تم فوراً جاؤ اور انہیں آزاد کردو اور انہیں تیس ہزار درہم بھی دو، اور اُن سے کہو کہ اگر وہ چاہیں تو یہیں رہیں، ہم ان کی تمام ضروریات پوری کریں گے۔ اور اگر وہ مدینہ جانا چاہیں، تو ان کے سفر کا انتظام کردو۔ میں نے غیر یقینی کے ساتھ تین مرتبہ اس سے پوچھا: کیا آپ کا یہی حکم ہے کہ میں موسیٰ ابن جعفرؑ کو رہا کردوں؟ اُس نے ہر مرتبہ اپنی بات کو دُہرایا اور اس بات پر زور دیا۔ میں وہاں سے نکل کر قید خانے پہنچا۔ موسیٰ ابن جعفرؑ مجھے دیکھ کر اضطراب کے عالم میں کھڑے ہو گئے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ میں ان پر تشدد کے لیے آیا ہوں۔ میں نے کہا: آپ اطمینان رکھیے۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں آپ کو اسی وقت رہا کردوں اور تیس ہزار درہم آپ کے حوالے کروں۔ میری بات سن کر موسیٰ ابن جعفرؑ نے فرمایا: ابھی میں نے اپنے جد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا تھا، آپ فرما رہے تھے: یَا مُوسیٰ حُبِسْتَ مَظْلُوماً. (تمہیں مظلوم قید کیا گیا ہے) یہ دعا پڑھو، آج ہی کی رات قید سے آزاد ہو جاؤ گے۔ اس کے بعد امامؑ نے وہ دعا پڑھی۔ (۲)

۱۔ دیکھئے: عیون اخبار الرضا۔ ج ۱۔ ص ۹۳

۲۔ مروج الذہب۔ ج ۳۔ ص ۳۵۶، شذرات الذہب۔ ج ۱۔ ص ۳۰۴، وفیات الاعیان۔ ج ۵۔ ص ۳۰۱۔ ۳۰۹

دوسری تاریخی کتابوں میں بھی اس روایت کا ذکر مورخین کے درمیان اس کی شہرت کی نشاندہی کرتا ہے' اگرچہ ان نقول میں لوگوں کے نام اور بعض دوسرے مسائل مختلف نقل کیے گئے ہیں۔

مرحوم شیخ صدوق نے اس روایت کو زیادہ تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔(۱) پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے کہ اس سے ملتا جلتا ایک واقعہ مہدی عباسی کے زمانے میں بھی پیش آیا تھا۔

بہر حال اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہارون الرشید علویوں کے بارے میں بہت زیادہ حساس تھا اور امام موسیٰ کاظمؑ پر بھی سخت نظر رکھتا تھا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ شیعہ اماموں کا طرزِ عمل جس کے تحت وہ علمی اور فکری انداز کار اختیار کرتے تھے' اس بات کا سبب تھا کہ عباسی ان کے ساتھ کم شدت سے پیش آتے تھے۔ شیعہ ائمہؑ انہی مقاصد کی خاطر تقیے سے کام لیتے تھے' اور ہر قسم کے داخلی تشکل (set-up) کو تقیے کے پردے میں چھپا لیتے تھے۔ یہ تشکل (set-up) بھی ایک قسم کا علمی اور قیادتی رابطہ تھا' اور اس میں کوئی سیاسی منصوبہ یا سازش کار فرما نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ حکام کو اتنا بھی قبول نہ تھا' کیونکہ وہ اس قسم کے مسائل کو مستقبل میں وسیع سیاسی اقدامات کی تمہید سمجھتے تھے۔ درحقیقت امامؑ اور شیعوں کا باہمی رابطہ' نیز وکلا کا تعین' حکومت کا تختہ الٹنے اور اس کی جگہ نئی حکومت کی تشکیل کے لیے سیاسی اہداف کے حصول کا ایک ذریعہ ہوسکتا تھا۔ یہ وہی کام تھا جو خود عباسی کر چکے تھے۔ مختصر یہ کہ ہارون نے اپنی حکومت کے لیے امامؑ سے جو خطرہ محسوس کیا' وہ اس بات کا سبب بنا کہ وہ امامؑ پر کڑی نظر رکھے۔ امام کی پوزیشن کی وجہ سے بعض علویوں کا آپ سے حسد کرنا اور اُن کی طرف سے آپ کی چغلیاں کھانے کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ یہ لوگ حکومت کو جھوٹی رپورٹیں دیا کرتے تھے' جو امامؑ کے خلاف حکومت کو مشتعل کرنے کا سبب بنتی تھیں۔

امامؑ کی اسیری کا سبب بننے والے واقعات کا ایک نمونہ:

اس سے پہلے کہ امامؑ کی قید کا سبب بننے والے واقعات بیان کیے جائیں' اس نکتے کو جان لینا ضروری ہے کہ علویوں کے اثر و نفوذ کی ایک وجہ یہ تھی کہ لوگ انہیں اولادِ رسول کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔ یہ وہ بات ہے جسے خود امامؑ نے بھی بارہا بیان کیا ہے۔ اس کے مقابلے میں اموی اور عباسی اس نظریے کی سختی کے ساتھ مخالفت کیا کرتے تھے' تاکہ اس طرح علویوں کے احترام کو کم کرسکیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اس بات کو خاص اہمیت دیا کرتے تھے۔

بہر صورت امام حسنؑ اور امام حسینؑ کا رسولِ خداؐ کے فرزندوں کی حیثیت سے پہچانا جانا' اُن کی طرف مسلمانوں کی توجہات مبذول ہونے کا سبب بن سکتا تھا۔ اسی وجہ سے اہلِ بیتؑ کے دشمن اور مخالفین اس اصول کا انکار کرنے کی کوشش

۱۔ عیون اخبار الرضا۔ ج ۱۔ ص ۲۷۳' امالی صدوق۔ ص ۲۲۶' مسند الامام الکاظم۔ ج ۱۔ ص ۹۲

کرتے رہے اور پوری تاریخ میں (باوجود یہ کہ سنی اور شیعہ مسلمانوں کی اکثریت انہیں فرزندِ رسولؐ کے طور پر قبول کرتی تھی) حکمرانوں کی کوشش رہی کہ اس کے برخلاف مؤقف اختیار کریں۔

حسنین علیہما السلام کو فرزندِ رسولؐ کے طور پر پہچانے جانے کی وجہ سے معاویہ سخت غضبناک رہا کرتے تھے۔ اُن کا اصرار تھا کہ لوگ انہیں فرزندِ علیؑ کے طور پر پہچانیں۔(۱) عمرو بن عاص بھی اس بات کو سخت ناپسند کرتا تھا۔(۲) حجاج بن یوسف بھی اس بارے میں سخت مؤقف کا مالک تھا۔ یہاں تک کہ جب اسے اطلاع دی گئی کہ یحییٰ بن یعمر حسنؑ اور حسینؑ کو فرزندِ رسول سمجھتا ہے، تو اس نے یحییٰ کو خراسان سے بلوایا اور انہیں مجبور کیا کہ وہ اپنے دعوے پر قرآنِ مجید سے کوئی دلیل پیش کریں۔ انہوں نے سورۂ انعام کی آیت ۸۵ کی تلاوت کی جو صراحت کے ساتھ حضرت عیسیٰؑ کو فرزندِ ابراہیمؑ قرار دیتی ہے اور اس طرح یہ استدلال کیا کہ: "جب قرآن حضرت عیسیٰؑ کو حضرت ابراہیمؑ کا فرزند قرار دیتا ہے، جبکہ اُن کا اپنی ماں کے سوا حضرت ابراہیمؑ سے کوئی رشتہ نہ تھا، تو پھر حسنینؑ فرزندِ رسول کیوں نہیں ہو سکتے۔"(۳) استاد جعفر مرتضیٰ نے اس بات کے لیے مزید شواہد بیان کیے ہیں۔(۴)

یہ مسئلہ ہارون رشید کے زمانے میں، اور اس کی اہلِ بیتِ رسولؐ خاص طور پر امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے ساتھ گفتگوؤں میں پیش آیا کرتا تھا، اور کم از کم ایک بار امامؑ کا اس بات پر اصرار آپ کی اسیری کا سبب قرار دیا جا سکتا ہے۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ: ہارون الرشید نے امام موسیٰ کاظمؑ سے سوال کیا: آپ کس طرح کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ کی ذرّیت میں سے ہیں، حالانکہ نبی کی کوئی اولادِ نرینہ نہیں تھی اور آپ لوگ اُن کی بیٹی کی اولاد ہیں؟ امامؑ نے اس کے سامنے دو دلیلیں پیش کیں: پہلی سورۂ انعام کی آیت ۸۵، جو حضرت عیسیٰؑ کو حضرت ابراہیمؑ کا بیٹا قرار دیتی ہے اور دوسری آیۂ مباہلہ کہ جس میں حسنینؑ کو "اَبْنَآءَ نَا" کا مصداق قرار دیا گیا ہے۔(۵)

یہ بات عباسیوں پر انتہائی گراں گزرتی تھی، جو خود رسول اللہؐ کے چچا کی اولاد تھے۔ یہ لوگ اس رشتے کو اپنی خلافت کے اثبات کے لیے استعمال کرتے تھے۔ مروان بن ابی حفصہ نے اسی استدلال کی بنیاد پر یہ شعر کہا ہے:

۱۔ کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۱۷٦

۲۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۲۰۔ ص ۳۳۴

۳۔ وفیات الاعیان۔ ج ٦۔ ص ۱۷۴، تفسیر ابن کثیر۔ ج ۲۔ ص ۱۵۵، الدر المنثور۔ ج ۳۔ ص ۲۸، نور الابصار۔ ص ۲۱۔۲۲

۴۔ الحیاۃ السیاسیہ للامام الحسنؑ۔ ص ۳۴۔۳۵

۵۔ نور الابصار۔ ص ۱۴۸۔۱۴۹، عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۱۔ ص ۸۴۔۸۵، صواعق محرقہ۔ ص ۲۰۳، ینابیع المودہ۔ ص ۳۳۵، مسند الامام الکاظمؑ۔ ج ۱۔ ص ۵۰

أنـّیٰ یـکـونُ وَلا یـکـونُ ولـم یـکـن
لِبَـنـی الْـبَـنـاتِ وراثۃُ الاَعْـمـامِ

''یہ کیسے ممکن ہے' نہ ایسا ہوا ہے اور نہ ہوگا کہ چچا کا حق بیٹیوں کی اولاد کو ورثے میں ملے۔''

اس شعر کی رد میں متعدد اشعار بیان کیے گئے ہیں۔(۱)

عباسیوں کی طرف سے پھیلائے گئے اس نظریے کو پیش نظر رکھتے ہوئے' یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ شیعوں نے کبھی امامت کے اثبات کے لیے وراثت کی جانب توجہ نہیں دی ہے اور اس بارے میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی واضح احادیث (نصوص) اور آئندہ امام کے تعین کے بارے میں گزشتہ امام کی نصوص کو سند قرار دیا ہے۔ اس کے مقابلے میں عباسی' وراثت پر زور دیتے تھے اور ان کی کوشش ہوتی تھی کہ حسنینؑ اور ان کی اولاد کو اولادِ رسولؐ ہونے کے ناطے سے نہیں بلکہ اولادِ علیؑ ہونے کی حیثیت سے پیش کریں' تاکہ اس طرح وہ غیر معمولی اہمیت اور احترام جو انہیں فرزندِ رسولؐ ہونے کے ناطے سماج میں حاصل تھا' اسے شکوک وشبہات کا شکار کردیں۔ ہمیں یہ بات قبول کرنا پڑے گی کہ اس زمانے کے ایران' یمن' عراق اور دوسرے علاقوں کے رہنے والے اہلِ سنت علاقوں میں علویوں کو حاصل روحانی اثر ورسوخ' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپنے اہلِ بیتؑ کی عظمت کے بارے میں واضح احادیث اور حسنینؑ کو "اَبْنَآءَ نَا" کے طور پر پیش کرنے کی وجہ سے تھا۔

ابن اثیر کی روایت کے مطابق' ہارون الرشید جو ماہِ رمضان سن ۱۷۹ ہجری میں عمرے کی غرض سے مکہ جارہا تھا' دورانِ سفر مدینہ پہنچا اور روضۂ رسول کی زیارت کو آیا۔ اس نے لوگوں کی توجہ حاصل کرنے اور لوگوں کو رسولِ خداؐ کے ساتھ اپنے خونی رشتے کا احساس دلانے کے لیے روضۂ رسول کی زیارت کے بعد نبی اکرم کو اس طرح سلام عرض کیا: اَلسَّلامُ عَلَیْکَ یارَسُولَ اللّٰہِ یَابْنَ عَمِّ. (سلام ہو آپ پر اے رسولِ خداؐ اے چچا کے بیٹے!) اس موقع پر امام موسیٰ کاظمؑ جو وہاں موجود تھے' آگے بڑھے اور رسول اللہ کو مخاطب کرکے فرمایا: "اَلسَّلامُ عَلَیْکَ یااَبَۃِ." (سلام ہو آپ پر' اے بابا!) یہ سُن کر ہارون کا چہرہ فق ہوگیا اور اُس نے امامؑ سے مخاطب ہوکر کہا: ھٰذَا الْفَخْرُ یااَبَاالْحَسَنِ جِدًّا. (اے ابوالحسن یہ واقعاً باعثِ افتخار ہے) اس کے بعد ہی اُس نے آپ کی حراست کا حکم دیا تھا۔(۲) پھر ہارون نے یحییٰ ابن جعفر کی طرف رُخ کرکے کہا: اَشْھَدُ اَنَّہٗ اَبُوْہُ حَقًّا. (میں مانتا ہوں کہ رسولِ خداؐ واقعاً ان کے پدر ہیں)۔(۳)

۱۔ الاحتجاج۔ ج ۲۔ ص ۱۶۷

۲۔ الکامل۔ ج ۶۔ ص ۱۶۴ اور دیکھئے: الاحتجاج۔ ج ۲۔ ص ۱۶۵' روضۃ الواعظین۔ ص ۱۸۳' صواعق محرقہ۔ ص ۲۰۴' مرآۃ الجنان۔ ج ۱۔ ص ۳۹۵

۳۔ کامل الزیارات۔ ص ۱۸' کافی۔ ج ۴۔ ص ۵۵۳

اس واقعے کے بعد امامؑ کی گرفتاری سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ امام کا یہ عمل ہارون الرشید کے خلاف ایک سیاسی اقدام شمار کیا گیا تھا۔ امام موسیٰ کاظمؑ کا اس قسم کا طرزِ عمل ہارون کے لیے باعث خطر تھا۔

تیسرا حصہ

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی حراست اور اسیری کی کچھ اور وجوہات بھی رہی ہیں' ان میں سے ایک وجہ یہ تھی کہ شیعہ اس بات کے پابند تھے کہ امامت اور رہبری کے تعلق سے جو باتیں اُن سے کہی جاتی ہیں' وہ انہیں خفیہ رکھیں اور رہبری سے متعلق رازوں کو فاش نہ کریں۔ قدرتی بات ہے کہ جب امام موسیٰ کاظمؑ کی امامت اور ان کے واجب الاطاعت ہونے کے بارے میں کچھ باتیں کسی جگہ سامنے آتی تھیں' تو اس سے امامؑ کے لیے بھی اور یہ باتیں بیان کرنے والے کے لیے بھی مشکلات جنم لیتی تھیں۔ یہ مسئلہ امام جعفر صادقؑ کے زمانے میں بھی درپیش تھا' کیونکہ اس حوالے سے منصور عباسی اپنی خاص حساسیت کا مظاہرہ کرتا تھا۔

ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ شیعہ کیونکہ تقیے کے اصول کا خیال رکھتے تھے' اس لیے دشمن یہ تصور کرتا تھا کہ شیعہ ان کے خلاف کوئی معمولی سا سیاسی قدم بھی نہیں اٹھائیں گے' اور وہ اپنے اماموں کو زیادہ سے زیادہ فکری اور روحانی قائدین کے طور پر مانتے ہیں۔ اسی لیے وہ ہمیشہ سیاسی بغاوتوں کے لیے مشغول زیدی مذہب رکھنے والے علویوں کو تلقین کیا کرتے تھے کہ وہ بھی اپنے چچازاد بھائیوں (یعنی امام موسیٰ کاظمؑ) کی طرح رہیں' تاکہ محفوظ رہ سکیں۔ (۱)

درحقیقت شیعہ ائمہ صرف اپنی امامت و رہبری کے قائل ہونے اور حاکم نظام کو باطل قرار دینے کے باوجود' ان حالات میں اس نظام کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ کیونکہ انہیں اس میں کامیابی کے امکانات نظر نہیں آتے تھے۔ یہ امامی شیعوں کے درمیان قبول شدہ روش تھی۔ اس کے باوجود امام موسیٰ کاظمؑ کے بارے میں یہ اعتقاد رکھنے کی وجہ سے کہ آپ واجب الاطاعت امام ہیں' شیعوں کے لیے مشکلات کھڑی ہو جاتی تھیں۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی اسیری کی وجوہات میں سے ایک وجہ اسی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ شیعہ کتب احادیث میں ایک باب "باب تحریم اذاعۃ الحق مع الخوف بہ" (خوف کی صورت میں اظہارِ حق کا حرام ہونا) کے عنوان سے پایا جاتا ہے' جو اس بارے میں متعدد احادیث پر مشتمل ہے۔ (۲) یہ روایات مختلف ائمہ' بالخصوص امام جعفر صادقؑ کی ہیں۔

۱۔ مقاتل الطالبیین۔ ص ۳۰۲

۲۔ مستدرک الوسائل۔ ج ۱۲۔ ص ۲۸۹

رجال کشی میں یونس بن عبدالرحمن سے ایک نسبتاً طویل روایت نقل کی گئی ہے' جو ہمارے موضوع کے حوالے سے ایک دلچسپ نمونہ ہوسکتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ابتدا میں یحییٰ بن خالد برمکی' ہشام بن حکم کے بارے میں اچھی رائے رکھتا تھا۔ لیکن جب ہارون الرشید ہشام بن حکم کی کچھ باتیں سن کر اُن کا گرویدہ ہوگیا' تو یحییٰ' ہارون کو اُن کے خلاف ورغلانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی سلسلے میں ایک دن اُس نے ہارون سے کہا: اُس (ہشام بن حکم) کا خیال ہے کہ آپ کے علاوہ بھی اللہ کا کوئی امام زمین پر موجود ہے' جس کی اطاعت واجب ہے۔۔۔ اور اگر وہ امام اسے قیام کا حکم دے' تو وہ اُس کی اطاعت کرے گا۔ اُس نے مزید کہا: البتہ ہم اسے ان لوگوں میں سے سمجھتے تھے جو خروج کے قائل نہیں ہیں اور اپنی جگہ بیٹھے رہیں گے۔

یہ سن کر ہارون نے یحییٰ سے کہا کہ وہ متکلمین کی ایک محفل کا انعقاد کرے' اور ہارون پس پردہ بیٹھ کر انہیں سنے گا' تاکہ وہ آزادی سے بحث مباحثہ کرسکیں۔ محفل منعقد ہوئی اور بحث کا آغاز ہوا۔ لیکن جلد ہی تعطل (deadlock) کا شکار ہوگئی۔ یحییٰ نے پوچھا: کیا تم لوگ ہشام بن حکم کو بطور حَکَم قبول کرتے ہو؟ اُنہوں نے کہا: وہ بیمار ہیں' ورنہ ہم اُنہیں قبول کرلیتے۔ یحییٰ نے ہشام کو بلوایا۔ ہشام پہلے تو یحییٰ سے گریز کرنے کی وجہ سے اُس محفل میں آنا نہیں چاہتے تھے۔ اسی لیے کہا: میں نے خدا سے عہد کیا ہے کہ تندرستی کے بعد کوفہ چلا جاؤں گا اور بحث مباحثے سے کلی طور پر دور ہو کر عبادتِ الٰہی میں مشغول ہوجاؤں گا۔ لیکن یحییٰ کے اصرار کے بعد وہ محفل میں حاضر ہوئے اور اختلافی مسئلہ معلوم کرنے کے بعد بعض کی تائید کی اور بعض دوسروں کی بات کو مسترد کیا۔

بحث کے اختتام پر یحییٰ نے ہشام سے کہا کہ وہ اس نظریے کے بگاڑ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرے کہ "امام کا انتخاب لوگوں کا حق ہے"۔ ہشام نے مجبوراً اس بارے میں گفتگو کی۔ یحییٰ نے سلمان بن جریر سے' جس کے قول کو کچھ دیر قبل ہشام نے مسترد کیا تھا' کہا کہ وہ اس بارے میں ہشام سے اس کی رائے دریافت کرے۔ اس نے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں سوال سے آغاز کیا اور بولا: کیا تم انہیں واجب الاطاعت مانتے ہو؟ ہشام نے کہا: ہاں۔ اس نے پوچھا: اگر ان کے بعد والا امام تمہیں قیام کا حکم دے' تو کیا تم قیام کرو گے؟ ہشام نے کہا: وہ مجھے ایسا حکم نہیں دیں گے۔۔۔۔ جب گفتگو یہاں تک پہنچی' تو ہشام نے کہا: اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں یہ کہوں کہ اگر اس نے قیام کا حکم دیا تو میں قیام کروں گا' تو ہاں ایسا ہی ہے۔ ہارون جو پردے کے پیچھے موجود تھا' یہ بات سن کر بھڑک اٹھا۔۔۔ اس کے بعد ہی اس نے امام موسیٰ کاظم کو گرفتار کر کے انہیں زندان میں قید کردیا۔

یونس بن عبدالرحمن اس روایت کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ: یہ اور اس کے علاوہ کچھ اور وجوہات امام کی اسیری کا سبب تھیں۔

اس کے بعد ہشام کوفہ چلے گئے اور ابن اشرف کے گھر پر اس دار فانی سے کوچ کیا۔(۱)

ایک اور روایت میں آیا ہے: ہشام کو امامؑ نے خاموش رہنے کا حکم دیا تھا' لیکن کچھ مدت بعد انہوں نے اس خاموشی کو توڑ دیا اور امامؑ کے ایک صحابی عبد الرحمن بن حجاج نے اس سلسلے میں انہیں سرزنش کی اور کہا: ''تم نے کیوں اپنی خاموشی کو توڑا۔۔۔؟'' اس کے بعد امامؑ کے قول کے حوالے سے اُن سے کہا: کیا کسی مسلمان کا خون بہانے میں شریک ہونا تمہیں خوش کرتا ہے؟ ہشام نے کہا: نہیں۔ عبد الرحمن نے کہا: پھر تم کیوں شریک ہوتے ہو؟ اگر تم خاموشی اختیار کرو تو ٹھیک ہے' ورنہ تم امامؑ کا سر جلاد کے سپرد کر دو گے۔

روایت کے آخر میں آیا ہے: ہشام نے خاموشی اختیار نہیں کی۔ یہاں تک کہ جو نہیں ہونا چاہیے تھا' وہ واقع ہو گیا۔(۲)

ممکن ہے کہ شیعوں میں سے ہشام کے مخالفین نے اس بارے میں مبالغہ آرائی کی ہو۔

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ ہارون پردے کے پیچھے سے بحث پر نظر رکھے ہوئے تھا' اور وہاں موجود لوگوں نے یہ فیصلہ کیا ہوا تھا کہ ہشام کے ساتھ امامت کے علاوہ کسی اور موضوع پر بات نہیں کریں گے۔ اس کے بعد ہارون' جو پردے کے پیچھے سے ہشام کی گفتگو سن رہا تھا' مشتعل ہو کر بولا: ایسے شخص کے ہوتے ہوئے میری حکومت لمحے بھر بھی باقی نہیں رہ سکتی۔ اس شخص کی زبان ایک لاکھ تلواروں سے بھی زیادہ مؤثر ہے۔

ہشام نے خطرہ بھانپ کر روپوشی اختیار کر لی' جب وہ ہارون کے ہاتھ نہ لگے' تو اُس نے اُن کے بھائیوں اور ساتھیوں کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا' لیکن کچھ ہی مدت بعد جب اُسے ہشام کی موت کی اطلاع ملی' تو اُس نے انہیں رہا کر دیا۔(۳)

مرحوم شیخ صدوق ایک اور مقام پر امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی شہادت کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی قرار دیتے ہیں کہ ہارون کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ شیعہ آپ کی امامت پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ ہارون جان گیا تھا کہ شیعہ دن رات آپ کی خدمت میں پہنچتے ہیں۔ لہٰذا اُس نے اپنی جان جانے اور اپنی سلطنت چھن جانے کے خوف سے امامؑ کو شہید کر دیا۔(۴)

۱۔ رجال کشی۔ ص ۲۵۶' ۲۶۲

۲۔ ایضاً۔ ص ۲۷۱

۳۔ کمال الدین۔ ص ۳۶۲' ۳۶۳' بحار الانوار۔ ج ۴۸۔ ص ۱۹۷۔ ۲۰۳' مسند الامام الکاظم۔ ج ۱۔ ص ۳۹۹

۴۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ص ۱۰۰

امامؑ کے کچھ اقربا کی چغلیوں نے بھی آپ کے خلاف یحییٰ بن خالد برمکی کے ذاتی بغض میں اضافہ کیا۔ شیخ مفید اور ابوالفرج اصفہانی نے اس بارے میں ایک مستند روایت نقل کی ہے' جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: ہارون الرشید نے اپنے بیٹے کو تربیت کی غرض سے جعفر بن محمد بن اشعث کے سپرد کیا تھا' جو امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی امامت کا قائل تھا' اس چیز نے یحییٰ بن خالد برمکی کو پریشان کردیا تھا۔ اس بنا پر وہ ہارون کے سامنے اس کی برائیاں کیا کرتا تھا۔ گویا اس سے انتقام لینے کے لیے اس نے امام موسیٰ کاظمؑ کے خلاف سازش تیار کی۔ لہٰذا اُس نے علویوں میں سے کسی ایسے مناسب شخص کی تلاش شروع کر دی' جو اس کی سازشوں میں اس کا ایک مناسب آلۂ کار بن سکے۔ تلاشِ بسیار کے بعد اسے علی بن اسماعیل بن جعفر صادق (امام جعفر صادق علیہ السلام کا پوتا) مل گیا' جو ایک غریب آدمی تھا۔ یحییٰ نے اسے مالی مدد فراہم کی اور ہارون کے دربار میں حاضر ہونے کی ترغیب دی' تاکہ اس کے ذریعے سے امام موسیٰ کاظمؑ کے خلاف اپنے منصوبے کو جامۂ عمل پہنائے۔ جب علی بن اسماعیل' ہارون کے دربار میں جانے پر راضی ہوگیا' تو امام موسیٰ کاظمؑ نے اس کی مالی مدد کرکے اور اس کے قرضے ادا کرکے' اسے اس کام سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ ہارون کے دربار میں گیا اور اُس کے سامنے امامؑ کے خلاف گفتگو کی۔ (۱)

اس چغل خوری کو بھی امامؑ کو قید کرنے کی ایک وجہ قرار دیا گیا ہے۔

شیخ صدوق نے اس روایت کو زیادہ احتیاط کے ساتھ اور مکمل طور پر نقل کیا ہے' اور جعفر بن اشعث کے امام موسیٰ کاظمؑ کے ساتھ خفیہ رابطے کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: جب یحییٰ بن خالد برمکی نے جعفر بن محمد بن اشعث کے بارے میں بہتان تراشی کی' تو ہارون الرشید نے اُنہیں بلایا اور کہا: میں نے سنا ہے کہ تم نے اپنے مال کا خمس اور وہ پیسہ جو میں نے تمہیں دیا ہے' موسیٰ ابن جعفرؑ کو بھیج دیا ہے۔ جعفر نے وہ رقم ہارون کے سامنے پیش کرکے چغل خوروں کے اس منصوبے کو ناکام بنا دیا اور ہارون کو اپنی طرف سے مطمئن کردیا۔ اسی کے بعد یحییٰ بن خالد برمکی کے ذہن میں علی بن اسماعیل کا خیال آیا تھا۔ آخری مرتبہ جب امامؑ اسیر ہوئے' تو اُس کی یہی وجہ تھی۔

شیخ مفید مذکورہ بالا روایت نقل کرنے کے بعد اضافہ فرماتے ہیں کہ: اسی سال (سن ۱۷۹ ہجری میں) ہارون الرشید حج کے لیے گیا اور اُس نے مدینہ میں امامؑ کی گرفتاری کا حکم صادر کیا۔

ہم امامؑ کی گرفتاری کی جانب اشارہ کرنے سے پہلے' اس بات کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں کہ بعض منابع (sources) میں علی بن اسماعیل بن جعفر صادق کی بجائے محمد بن اسماعیل کا ذکر ہوا ہے۔

۱۔ ارشاد۔ ص ۲۹۷' مسند الامام الکاظمؑ۔ ج ۱۔ ص ۱۱۵' مناقب ابن شہر آشوب۔ ج ۳۔ ص ۴۷۱

ایک اور ماخذ میں آیا ہے کہ: محمد بن اسماعیل اپنے چچا موسیٰ کاظم علیہ السلام کے ساتھ تھا۔ اس نے ہارون کو خط میں لکھا: مجھے نہیں معلوم تھا کہ روئے زمین پر (ایک ہی وقت میں) دو ایسے خلیفہ ہوں گے جن کے پاس خراج لے جایا جاتا ہو۔

اس بات کا مقصد امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے خلاف ہارون کے کان بھرنا تھا' اور اس کے فوراً بعد امامؑ کو گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا گیا اور یہی اسیری آپ کی شہادت تک جاری رہی۔ (۱)

اس روایت کو ابن شہر آشوب نے بھی لکھا ہے۔ (۲)

یہ دو روایات جن میں سے ایک علی بن اسماعیل کے بارے میں ہے اور دوسری محمد بن اسماعیل کے بارے میں' ان میں مختلف پہلوؤں سے مشابہت پائی جاتی ہے' قدرتی طور پر ان میں سے کوئی ایک درست ہوگی۔

مشہور ہے کہ ہارون ایک سال حج کیا کرتا' اور دوسرے سال جنگ کے لیے جایا کرتا تھا۔ سن ۱۷۹ ہجری جو حج پر جانے کا سال تھا' وہ مدینہ آیا اور اپنے استقبال کے لیے آنے والے مدینہ کے عمائدین کے ہمراہ' جن میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام بھی شامل تھے' روضۂ رسولؐ پر حاضر ہوا۔ ہارون جو امامؑ کی خفیہ سرگرمیوں سے واقف تھا' جب وہ ضریح رسولؐ کے نزدیک آیا' تو قبر رسولؐ سے مخاطب ہو کر بولا: یا رسول اللہؐ! اب جو کام میں کرنا چاہتا ہوں' اس کے لیے آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ میں موسیٰ ابن جعفر کو گرفتار کرنا چاہتا ہوں' کیونکہ وہ آپ کی امت میں اختلاف ڈالنا اور اُن کا خون بہانا چاہتے ہیں۔ (۳)

ہارون یہ دکھاوا اس لیے کر رہا تھا کہ لوگ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو فرزند رسول کی حیثیت دیتے تھے اور اُس کی رسول خداؐ سے معذرت خواہی کا مقصد اپنے اس اقدام کی توجیہ کرنا تھا۔ عوام الناس جو ہارون کے اس اقدام کا محرک جاننا چاہتے تھے' اور یہ مسلسل ایک سوال کی صورت ان کے اذہان میں کھٹک رہا تھا' اُن کے سامنے اپنے اس اقدام کی توجیہ کے لیے امامؑ پر امت کے درمیان تفرقہ ڈالنے کی تہمت' انہیں مطمئن کرنے والی ایک دلیل محسوس ہوتی ہے۔

درج بالا روایت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ مدینۂ منورہ میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام لوگوں کی توجہ کا مرکز تھے' اور اسی لیے ہارون الرشید اپنی تمام تر طاقت اور اقتدار کے باوجود اس قسم کی توجیہات کرنے پر مجبور تھا' تاکہ لوگ اس کے اس اقدام سے نفرت کا اظہار نہ کریں اور اسے مسترد نہ کردیں۔ ہارون نے اسی مسجد میں امامؑ کو حراست (۴) میں لینے کا

۱۔ سر السلسلۃ العلویہ۔ ص ۳۵' مسند الامام الکاظمؑ۔ ج ۱۔ ص ۱۲۷۔ نقل از بخاری

۲۔ مناقب ابن شہر آشوب۔ ج ۲۔ ص ۳۸۵

۳۔ ارشاد۔ ص ۲۸۰

۴۔ ارشاد اور دیکھیے: روضۃ الواعظین۔ ص ۱۸۷

حکم جاری کیا۔ اس نے حکم دیا کہ دو قافلے تیار کیے جائیں' ایک کو کوفہ کی طرف اور دوسرے کو بصرہ کی سمت روانہ کیا جائے۔ اس نے امامؑ کو ان میں سے ایک قافلے کے ساتھ روانہ کردیا۔ اس نے ایسا اس لیے کیا تھا تاکہ لوگوں کو پتا نہ چل سکے کہ امامؑ کو قید کرکے کہاں رکھا جارہا ہے۔(۱)

ابوالفرج اصفہانی اس کے بعد لکھتے ہیں: ہارون الرشید نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو بصرہ کے حاکم عیسیٰ بن جعفر بن منصور کے پاس بھیج دیا۔ امامؑ کچھ عرصہ اس کے قید خانے میں رہے' لیکن آخرکار عیسیٰ اپنی اس ڈیوٹی سے عاجز آگیا اور اس نے ہارون کو لکھا کہ امامؑ کو کسی اور کے سپرد کیا جائے' بصورتِ دیگر وہ انہیں آزاد کردے گا۔ کیونکہ اس دوران اس نے امامؑ کے خلاف شواہد جمع کرنے کی اپنی سی پوری کوشش کردیکھی تھی' لیکن اس کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا تھا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ عیسیٰ اپنے خط میں آگے چل کر لکھتا ہے: یہاں تک کہ جب وہ دعا میں مشغول ہوتے ہیں' تو میں کان لگا کے سنتا ہوں کہ دیکھوں کیا وہ میرے یا تیرے لیے بددعا تو نہیں کرتے؟ لیکن میں نے اُن سے خود اپنے لیے دعا مانگنے کے سوا کچھ اور نہیں سُنا۔ وہ خدا سے اپنے لیے رحمت اور مغفرت کی دعا کیا کرتے ہیں۔(۲)

اس سے امامؑ کے انتہائی زہد و تقویٰ اور آپ کے تقیے اور کاموں کو پوشیدہ طریقے سے کرنے کی نشاندہی ہوتی ہے۔

اس کے بعد امامؑ کو فضل بن ربیع کے حوالے کردیا گیا۔ امامؑ طویل عرصے تک اس کے پاس قید رہے۔ کہتے ہیں کہ اس سے کہا گیا تھا کہ وہ امامؑ کو قتل کردے' لیکن اس نے یہ کام کرنے سے انکار کردیا۔ اس کے بعد امامؑ کو فضل بن یحییٰ کے سپرد کردیا گیا اور ایک مدت آپ اس کی قید میں رہے۔ مورخین کے بقول وہ امامؑ کا احترام کیا کرتا تھا۔ یہ خبر ہارون تک پہنچی کہ امامؑ وہاں مکمل آرام اور سکون سے ہیں اور انہیں وہاں کافی آزادیاں حاصل ہیں۔ اس وقت ہارون الرشید رقّہ (۳) نامی شہر میں تھا۔ یہ اطلاع ملتے ہی وہ فضل سے اتنا ناراض ہوا کہ اسی مجلس میں اُس نے خلیفہ کی نافرمانی کرنے پر علی الاعلان فضل پر لعنت ملامت کا حکم دیا' نیز اسی وجہ سے اس کو سو کوڑے بھی مارے گئے۔ اس کے بعد امامؑ کو سندی بن شاہک نامی داروغۂ زندان (jailer) کے سپرد کیا گیا۔(۴)

۱۔ مرحوم شیخ صدوق لکھتے ہیں: اس سے اگلے دن جبکہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام مقامِ رسولِ خداؐ پر حالتِ نماز میں تھے' آپ کو گرفتار کرلیا گیا۔
عیون اخبار الرضا۔ ج۱۔ ص۷۳

۲۔ مقاتل الطالبیین۔ ص۳۳۵' الائمۃ الاثنی عشر' ابن طولون۔ ص۹۱' جہاد الشیعہ۔ ص۳۰۲

۳۔ رقّہ' فرات کے مشرقی کنارے پر واقع ایک شہر کا نام ہے۔

۴۔ مقاتل الطالبیین۔ ص۳۳۶

امام موسیٰ کاظمؑ کی شہادت

یحییٰ بن خالد جوان حالات سے کافی پریشان تھا' ہارون الرشید کے پاس گیا اور فضل کے عمل پر معذرت طلب کرنے کے ساتھ ساتھ امامؑ کو شہید کرنے کے بارے میں ہارون کی خواہش کو سندی بن شاہک کے ذریعے سے پورا کیا۔(۱) اس بارے میں متعدد روایات موجود ہیں کہ امامؑ کی شہادت کا عامل یحییٰ بن خالد تھا۔ ابوالفرج اور دوسروں کے بقول وہ بظاہر کسی اور کام کے لیے' لیکن درحقیقت امامؑ کو شہید کرنے کے لیے بغداد گیا تھا۔ اس کا اپنے اس عمل کو خفیہ رکھنا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ اس اقدام کی ذمے داری اپنے سر لینے کو تیار نہ تھا۔ اس سے پہلے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے ساتھ اس کی دشمنی کو ہم ہشام بن حکم کے معاملے میں دیکھ چکے ہیں۔ اس صورت میں یہ بات درست نہیں ہوسکتی کہ وہ اندرونی طور پر امامؑ کا معتقد تھا۔

امام رضا علیہ السلام کی ایک روایت میں آیا ہے کہ کسی نے آپ سے پوچھا: کیا آپ کے والد کو یحییٰ بن خالد نے زہر دیا تھا؟ امامؑ نے اس بات کی تائید کی۔(۲) یہ بات دوسری روایات میں بھی آئی ہے۔(۳)

اکثر مورخین کی گواہی کے مطابق امامؑ کے شہید کیے جانے کے بارے میں تو کوئی شک نہیں پایا جاتا' لیکن کیونکہ امامؑ کو خفیہ طور پر شہید کیا گیا تھا اور عباسی حکمرانوں نے دھوکا دہی کرتے ہوئے یہ اعلان کیا تھا کہ امامؑ اپنی طبیعی موت دنیا سے رخصت ہوئے ہیں' لہٰذا بعض مورخین نے ان کی باتوں میں آکر اپنی کتابوں میں آپ کی موت کو طبیعی تحریر کردیا۔ ان میں سے بعض نے آپ کی شہادت کی خبر کو "کہا گیا ہے" کی عبارت کے ساتھ نقل کیا ہے۔(۴)

امامؑ کی شہادت کی کیفیت کے بارے میں تین مختلف روایتیں نقل ہوئی ہیں:

۱۔ امامؑ کی شہادت زہر دیے جانے سے واقع ہوئی ہے۔ یہ بات امام رضا علیہ السلام سے منقول روایت میں آئی ہے۔ اسی طرح وہ روایات جن میں امامؑ کے قتل کا الزام یحییٰ بن خالد پر لگایا گیا ہے' اُن میں بھی یہ نکتہ مذکور ہے۔

۲۔ ایک روایت میں ہے کہ امامؑ کو ایک قالین میں لپیٹ کر آپ کو اس قدر دبایا گیا کہ آپ شہید ہوگئے۔(۵)

۱۔ مقاتل الطالبین۔ ص۳۳۵

۲۔ رجال کشی۔ ص۵۰۲

۳۔ دلائل الامامہ۔ ص۱۴۷

۴۔ دیکھیے: وفیات الاعیان۔ ج۵۔ ص۳۱۰' عمدة الطالب۔ ص۱۹۶

۵۔ مقاتل الطالبین۔ ص۳۳۶

۳۔ایک اور روایت ہے جسے مستوفی نے نقل کیا ہے: شیعہ کہتے ہیں کہ ہارون الرشید کے حکم پر پگھلا ہوا سیسہ آپ کے حلق میں ڈالا گیا۔(۱)

ان میں سے سب سے زیادہ مشہور روایت زہر دیے جانے والی روایت ہے۔ امامؑ کی شہادت کے بعد آپ کے جسدِ مبارک کو دو وجوہات کی بنا پر بغداد کے عوام اور خواص کی زیارت کے لیے رکھا گیا تھا:

الف: اربلی کے بقول سندی بن شاہک بغداد کے فقہا اور اہم افراد کو جن میں ہیثم بن عدی بھی نظر آ رہا تھا' امامؑ کے جسدِ مبارک کے نزدیک لایا' تا کہ وہ دیکھ لیں کہ امامؑ کے بدن پر کسی زخم یا دم گھٹنے کے آثار نہیں ہیں اور آپ نے اپنی طبیعی موت کے ذریعے انتقال فرمایا ہے۔

ب: کیونکہ بعض شیعہ آپ کی مہدویت کے قائل تھے' یا اس بات کا امکان تھا کہ وہ آپ کی مہدویت کے قائل ہو جائیں گے' اس لیے امامؑ کے جسدِ اطہر کو بغداد کے پل پر رکھ دیا گیا اور یحییٰ بن خالد نے حکم دیا کہ منادی کر دی جائے کہ یہ موسیٰ ابن جعفرؑ ہیں' جن کے بارے میں رافضیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ مرے نہیں ہیں۔ اس کے بعد لوگ آئے اور آپ کو اس حال میں دیکھا کہ آپ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ اس کے بعد جنازے کو "باب التبن" میں قریشیوں کے مقبرے میں دفن کر دیا گیا۔(۲)

شیخ صدوق کے مطابق امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی تاریخِ شہادت ۲۵ رجب سن ۱۸۳ ہجری ہے' شیخ مفید کے بقول ۲۴ رجب اور مستوفی کی روایت کے مطابق ۱۴ صفر بروز جمعہ ہے۔

خلیفہ کے ساتھ امامؑ کی محاذ آرائی کے مزید نمونے

جو کچھ بیان کیا جا چکا ہے اُس کے علاوہ بھی عباسی حکومت کے ساتھ امامؑ کی محاذ آرائی اور ٹکراؤ کی مزید مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں۔ ان میں ایک قسم کی سلبی محاذ آرائی بھی شامل ہے۔ یعنی ایک ایسی محاذ آرائی جو اس انداز کی نہیں ہے جس کے ذریعے اُن کا تختہ الٹ دیا جائے' بلکہ جس میں اُن کی حکومت کے ناجائز ہونے پر زور دیا گیا ہے' اور اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ لوگوں کو ان پر اعتماد نہ رہے۔ سلبی محاذ آرائی میں اہم نکتہ عدمِ تعاون ہے' جو از خود حکومت کے ناجائز ہونے کی نشاندہی کرتا ہے۔ کسی حکومت کے بارے میں عوام الناس کے درمیان اس نظریے کا رائج ہو جانا' اس حکومت کے لیے انتہائی بڑا خطرہ شمار کیا جاتا ہے۔ کیونکہ جب عوام الناس کسی حکومت کے ناجائز ہونے کا عقیدہ رکھتے ہوں' تو کسی بھی وقت

۱۔ تاریخ گزیدہ۔ ص ۲۰۳

۲۔ کشف الغمہ۔ ج ۳۔ ص ۲۳۴

اس حکومت کے خاتمے کے لیے تحریک اٹھ سکتی ہے اور لوگ اس تحریک میں شامل ہو سکتے ہیں۔

صفوان بن مہران جمال کے ساتھ امام کی ملاقات کے بارے میں نقل ہوا ہے کہ: جب وہ ایک شیعہ کی حیثیت سے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی خدمت میں شرفیاب ہوا تو امام نے اس سے فرمایا:

"یاصَفْوانُ کُلُّ شَیءٍ مِنْکَ حَسَنٌ جَمیلٌ ماخَلا شیئاً واحداً."

"اے صفوان! تمہارے سارے کام اچھے ہیں سوائے ایک کام کے۔"

صفوان نے پوچھا: فرزند رسول! وہ کونسا کام ہے؟

امامؑ نے فرمایا:

"اِکْراءُکَ جِمالَکَ مِنْ هٰذَا الرَّجُلِ. یَعْنی هارُونَ."

"یہی کہ تم اپنے اونٹ اس شخص (یعنی ہارون) کو کرائے پر دیتے ہو۔"

صفوان نے کہا: میں اسے اپنے اونٹ تفریح یا شکار وغیرہ کے لیے کرائے پر نہیں دیتا' بلکہ اسے صرف حج کے سفر کے لیے دیتا ہوں۔ اس کام میں بھی وہ خود براہ راست سامنے نہیں آتا' بلکہ اس مقصد کے لیے دوسروں کو اپنا اجیر بناتا ہے۔

امامؑ نے فرمایا:

"یاصَفْوانُ اَیَقَعُ کِراءُکَ عَلَیْهِمْ؟"

"کیا تمہارے خیال میں اسے اپنے اونٹ کرائے پر دینا درست ہے؟"

صفوان نے کہا: ہاں۔

امامؑ نے فرمایا:

"اَتُحِبُّ بَقائَهُمْ حَتّیٰ یَخْرُجَ کِراءُکَ؟"

"کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ وہ تمہارا کرایہ ادا کرنے تک زندہ رہے؟"

صفوان نے کہا: ہاں۔

امامؑ نے فرمایا:

"فَمَنْ اَحَبَّ بَقائَهُمْ فَهُوَ مِنْهُمْ وَمَنْ کانَ مِنْهُمْ کانَ وَرَدَ النّارَ."

"جو کوئی ان کے زندہ رہنے کو پسند کرے وہ انہی میں شمار ہوگا اور جو ان میں شمار ہوگا' وہ جہنم میں جائے گا۔"

اس کے بعد صفوان نے اپنے تمام اونٹ فروخت کر دیے اور جب ہارون نے اس کا سبب دریافت کیا'

تو اسے جواب دیا کہ: اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور میرے غلام خاطر خواہ طور پر یہ کام نہیں کر پاتے ہیں۔ ہارون نے کہا: میں جانتا ہوں کہ تم نے کس کے اشارے پر اپنے اونٹ فروخت کیے ہیں۔ موسیٰ ابن جعفرؑ نے تمہیں ایسا کرنے کو کہا ہے۔ صفوان نے کہا: مجھے موسیٰ ابن جعفرؑ سے کیا واسطہ! ہارون بولا: یہ باتیں چھوڑو! خدا کی قسم اگر تمہارا حسنِ مصاحبت میرے پیشِ نظر نہ ہوتا' تو میں تمہیں قتل کر دیتا۔(۱)

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے عباسی خلافت کا سامنا کرتے ہوئے ایک اور طرزِ عمل اختیار کیا' اور وہ علی ابن یقطین سے آپ کا تعلق تھا۔ آپ نے اُن سے کہا کہ وہ عباسی دربار میں رہیں اور شیعوں کو پریشانیوں سے نجات دلانے کی کوشش کریں۔ علی ابن یقطین کا شمار امام موسیٰ کاظمؑ کے خاص اصحاب میں ہوتا تھا' جنہیں عباسی حکومت میں بھی اثر و رسوخ حاصل تھا۔ مہدی عباسی اور ہارون الرشید کے دور میں وہ کافی اثر و رسوخ کے مالک تھے اور وہ اس اثر و رسوخ کو شیعوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے امامؑ سے درخواست کی کہ وہ انہیں دربارِ خلافت کی خدمت چھوڑنے کی اجازت دیں۔ امامؑ نے یہ اجازت دینے سے گریز کیا اور فرمایا: "لَا تَفْعَلْ فَإِنَّ لَنَا أُنْساً وَلِاخْوانِکَ بِکَ عِزّاً وَعَسیٰ اَنْ یَجْبُرَ اللّٰهُ بِکَ کَسْراً وَیَکْسِرَ بِکَ نَائِرَةَ الْمُخَالِفِینَ عن اوْلِیاءِ ہٖ' یَا عَلِیُّ کَفَّارَةُ اَعْمَالِکُمُ الاِحْسَانُ اِلیٰ اِخْوَانِکُمْ." (یہ نہ کرنا' کیونکہ ہم تمہارے (وہاں ہونے) سے مطمئن ہیں اور تم اپنے بھائیوں (شیعوں) کے لیے باعثِ عزت ہو اور شاید خدا تمہارے وسیلے سے اپنے دوستوں کی کسی شکست کی تلافی کرے' اور ان کے خلاف مخالفین کی سازشوں کو نقش بر آب کر دے۔ اے علی! اپنے بھائیوں کے ساتھ نیکی کرنا تمہارے گناہوں کا کفارہ ہے)۔(۲)

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ امامؑ نے اُن کے جواب میں فرمایا: "لَا لَکَ الْمَخْرَجُ مِنْ عَمَلِهِمْ وَاتَّقِ اللّٰهَ." (تمہارے پاس اس کام کو جاری رکھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے' تقوائے الٰہی اختیار کرو)۔(۳)

ایک اور مقام پر نقل ہوا ہے کہ جب امامؑ عراق تشریف لائے' تو علی ابن یقطین امامؑ کو اس حال میں دیکھ کر اظہار افسوس کرنے لگے۔ امامؑ نے اُن سے فرمایا: "یَا عَلِیُّ اِنَّ لِلّٰهِ تَعَالیٰ اَوْلِیَاءَ مع اَوْلِیَاءِ الظَّلَمَةِ یَدْفَعُ بِهِمْ عَنْ اَوْلِیَاءِ ہٖ وَاَنْتَ مِنْهُمْ یَا عَلِی." (اے علی! ظالموں کے دوستوں کی صفوں میں اللہ کے بھی ایسے دوست ہیں جن کے

۱۔ رجال کشی۔ ص ۴۴۱

۲۔ بحار الانوار۔ ج ۴۸۔ ص ۱۳۶

۳۔ قرب الاسناد۔ ص ۱۲۶

ذریعے سے وہ اپنے دوستوں کو شر سے محفوظ رکھتا ہے اور اے علی! تم اُن میں سے ہو)۔(۱)

ایک اور روایت میں آیا ہے: "اِنَّ لِلّٰہِ مَعَ کُلِّ طَاغِیَۃٍ وَزِیراً مِنْ اَوْلِیاءِ یَدْفَعُ بِہٖ عَنْھُمْ." (ہر طاغوت کے ساتھ اللہ کے دوستوں میں سے ایک وزیر ہوتا ہے جس کے ذریعے سے خدا اپنے دوستوں سے بلاؤں کو دور کرتا ہے)۔(۲)

علی ابن یقطین کے عمل کی درستی' بلکہ اُن کے لیے اس عمل کے لازم ہونے پر امامؑ کی تاکید سے معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ اُن سے شیعوں کے حقوق کے تحفظ کے سلسلے میں کام لیتے تھے۔ علی ابن یقطین کے خلاف خلیفہ کے بہت کان بھرے گئے' لیکن تقیے سے کام لینے اور امام موسیٰ کاظمؑ کی ہدایات کی پیروی کی وجہ سے وہ مشکل میں پڑنے سے محفوظ رہے۔(۳) بعض مذہبی مسائل میں جب حکومت مشکل میں پھنستی تھی' تو علی ابن یقطین ان مسائل کے حل کے لیے امامؑ کی رائے سے استفادہ کرتے تھے۔(۴)

بگڑے ہوئے اور بکاؤ مال علما' جنہوں نے اپنے آپ کو عباسی حکومت کا خدمت گار بنایا ہوا تھا' اُن سے مقابلہ بھی امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے مبارزات میں شامل تھا' جسے آپ کے کلمات میں دیکھا جا سکتا ہے۔ دربارِ خلافت میں ایسے افراد کی موجودگی' عوام کے نزدیک حکومت کے جواز کی ضمانت ہوتی تھی اور ظاہر ہے یہ حکومت کی مقبولیت کا ایک عامل بھی بنتی تھی۔ اسی وجہ سے اس قسم کے افراد کو حکومت انتہائی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔

امامؑ سے منقول ایک روایت میں ہے' کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اَلْفُقَھَاءُ اُمَنَاءُ الرُّسُلِ مَالَمْ یَدْخُلُوا فِی الدُّنْیَا."

"فقہا انبیا کے امین ہیں' جب تک وہ دنیا میں داخل نہ ہو جائیں۔"(۵)

سوال کیا گیا: وہ کیسے دنیا میں داخل ہوں گے؟

حضرت نے فرمایا:

"اِتِّبَاعُ السُّلْطَانِ فَاِذَا فَعَلُوا ذٰلِکَ فَاحْذَرُوھُمْ عَلٰی اَدْیَانِکُمْ."

۱۔ رجال کشی۔ ص ۴۳۳

۲۔ رجال کشی۔ ص ۴۳۵

۳۔ ارشاد۔ ص ۲۷۴۔۲۷۵' الخرائج والجرائح۔ ص ۲۹۷

۴۔ تفسیر عیاشی۔ ج ۱۔ ص ۱۸۵

۵۔ بحار الانوار۔ ج ۲۔ ص ۳۶

''حکمرانوں کی پیروی کے ذریعے۔ جب ایسا ہو تو اپنے دین کے معاملے میں اُن سے ڈرو۔''

وہ علما اسی قسم کے تھے جنہیں ہارون الرشید نے امامؑ کی شہادت کے موقع پر بلایا' اوران سے کہا کہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ امامؑ کی موت طبیعی طور پر واقع ہوئی ہے۔ اس طرح اُس نے لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے ان کی ساکھ سے فائدہ اٹھایا۔

اس موضوع پر گفتگو کے اختتام پر یہ روایت پیش کرنا غیر مناسب نہیں ہوگا کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے اپنے شیعوں کو نصیحت کی تھی کہ وہ اپنا ظاہر سجا سنوار کر رکھا کریں اور اپنی سماجی حیثیت کی حفاظت کیا کریں۔ ایک دن آپ نے اپنے ایک شیعہ کو دیکھا کہ وہ ایک مچھلی ہاتھ میں لیے چلا جارہا ہے۔ امامؑ نے اسے مخاطب کر کے فرمایا: تم ایک ایسا گروہ ہو جس کے بے تحاشا دشمن ہیں' لہٰذا جتنا ممکن ہو اپنا ظاہر آراستہ رکھو۔(۱)

امام موسیٰ کاظمؑ اور فکری وکلامی مباحث

اسلامی مذاہب میں سے ایک مذہب' جو پہلی صدی ہجری کے اواخر میں پیدا ہوا اور اپنی پیدائش کے بعد اسلامی معاشرے میں رونما ہونے والے فکری تنازعات میں اس کا ایک بڑا حصہ رہا' وہ ''مذہب اعتزال'' ہے۔ اس مذہب کا بنیادی اصول دینی مسائل کی عقل کی روشنی میں توجیہ ہے۔ ''واصل بن عطاء'' اور ''عمرو بن عبید'' کا شمار اس مذہب کے اہم ترین پیشواؤں میں ہوتا ہے۔ عقل کی روشنی میں یہ دینی مسائل کی توجیہ کرنا' کوئی ایسی چیز نہیں جو شیعوں کے لیے ناقابلِ قبول ہو' لیکن اہم نکتہ یہ تھا کہ دینی مسائل کو اس طرح عقل کے سپرد کردینا کہ ان مسائل کی عقلی تحلیل وتوجیہ کے دوران افراط سے کام لیا جائے' مطلوبہ نتائج کے حصول کا ذریعہ نہیں ہوسکتا۔ اس کی مثالوں میں انواع واقسام کے وہ عقائد شامل ہیں جو عقلی رجحان رکھنے والے اس گروہ کی طرف سے توحید کے بارے میں پیش کیے جاتے تھے۔ یہ لوگ کبھی خدا سے متضاد صفات منسوب کردیتے' تو کبھی ایسی صفات کی نفی کرتے جو قرآن کی تصریح کے مطابق اللہ تعالیٰ کی صفات میں شامل ہیں۔ ان کی یہ حرکت شیعوں کے لیے' جن کے پاس ایک امام معصوم موجود تھا' قابلِ قبول نہ تھی۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ شیعہ فکر میں اصول پرستی' یعنی احادیث رسولؐ پر توجہ' بنیادی ترین اصول شمار ہوتا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ خود ائمہ علیہم السلام اسلام کی حقانیت کے دفاع کے دوران عقلی توجیہات بھی پیش کیا کرتے تھے۔ اسی حوالے سے ائمہؑ کی طرف سے ایسے شاگردوں کی تربیت بھی کی گئی جن کی ذمے داری تھی کہ وہ دین اور شیعہ عقائد کا عقلانی دفاع کریں۔

''معتزلہ'' کے مقابلے میں ''اہلِ حدیث'' کے ایسے گروہ تھے جو بکثرت جعلی احادیث میں گرفتار تھے اور توحید کے

۱۔ کافی۔ ج ۶۔ ص ۴۸۰: "یَامَعْشَرَ الشِّیعَةِ اِنَّکُمْ قَدْ عَادَاکُمُ الْخَلْقُ فَتَزَیَّنُوا لَهُمْ بِمَا قَدَرْتُمْ عَلَیْهِ..."

مسئلے میں بہت سی مشکلات اور شبہات کا شکار تھے۔

بہرصورت اُس دور کے سماج میں توحید اور صفاتِ خدا کی مباحث کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ ظاہر ہے کہ امام موسیٰ کاظمؑ کی رہنمائیاں شیعوں کو اس زمانے میں رائج توجیہات اور تاویلات سے نجات دلاسکتی تھیں۔

ایک روایت میں ہے کہ امامؑ سے خدا کی صفات کے بارے میں سوال کیا گیا' تو آپ نے جواب دیا: "لَاتَتَجاوَزُوا عَمّافِي الْقُرْآنِ." (جو کچھ قرآن میں ہے' اُس سے آگے نہ بڑھو)۔(۱)

ایک اور تعبیر میں فرمایا: "لَا تَتَجاوَزْفِي التَّوْحيدِماذَكَرَهُ اللّٰه تَعالىٰ في كِتابِهِ فَتَهْلِك." (توحید کے مسئلے میں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے' اُس سے آگے نہ بڑھو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے)۔(۲)

ایک اور روایت میں آیا ہے: "اِنَّ اللّٰهَ اَعْلىٰ وَاَجَلُّ مِنْ اَنْ يَبْلُغَ كُنْهَ صِفَتِهِ' فَصِفُوهُ بِماوَصَفَ بِهِ نَفْسَهُ وَكُفُّوا عَمّا سِوىٰ ذٰلِكَ." (اللہ اس سے بالاتر اور بلندتر ہے کہ کوئی اس کی صفات کی حقیقت تک پہنچ سکے' پس اس کو اسی طرح پہچانو جس طرح خود اُس نے اپنی توصیف کی ہے' اور اس کے علاوہ باتوں سے دستبردار ہو جاؤ)۔(۳)

اور جب آپ خود صفاتِ خدا بیان کرنا چاہتے' تو صرف مضامینِ قرآن سے استفادہ کرتے تھے۔(۴) آپ نے اہلِ حدیث کی مخالفت کی' جو تشبیہ کے قائل تھے اور آیات و روایات کے ظاہر کو پکڑ کر خدا کے لیے انسانی اور مادّی صفات تراشنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ ان کے مقابل آپ خدا کو ہر قسم کی تشبیہ اور مادّی صفت سے منزّہ قرار دیتے تھے۔(۵)

جب آپ سے کہا گیا کہ بعض لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا "سماء الدنیا" (دنیا کے آسمان) پر اتر کر آتا ہے' تو آپ نے فرمایا: "اِنَّ اللّٰهَ لَايَنْزِلُ وَلَايَحْتاجُ اِلىٰ اَنْ يَنْزِلَ اِنَّمامَنْظَرُهُ فِي الْقُرْبِ وَالْبُعْدِ سَواءٌ." (خدا نہیں اترتا اور نہ اسے اس کی ضرورت ہے' کیونکہ دور اور نزدیک دونوں اُس کی نگاہوں کے سامنے برابر ہیں)۔(۶)

صفاتِ خدا کے بارے میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے جو انتہائی گہرے اور قیمتی کلمات ہم تک پہنچے ہیں (۷)

۱۔ المحاسن۔ ص ۲۳۹' کافی۔ ج ۱۔ ص ۱۰۲

۲۔ التوحید۔ ص ۷۶

۳۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۱۰۵

۴۔ التوحید۔ ص ۷۶

۵۔ التوحید۔ ص ۷۵' ۹۷' ۹۹

۶۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۱۲۵' الاحتجاج۔ ص ۱۵۶

۷۔ التوحید۔ ص ۱۳۱' ۱۴۷' ۱۷۵' ۱۷۸' ۱۸۳

اُن کا علیحدہ سے جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔

اہلِ حدیث کے مقابل امامؑ کے کلامی مؤقف

علی ابن ابیطالب علیہ السلام کی امامت کے بارے میں نصِ الٰہی کو ترک کرنا' اُن اختلافات کا نقطۂ آغاز تھا جو بعد میں امتِ اسلامیہ کے درمیان وجود میں آئے۔ قیادت کے منصب پر نامناسب افراد کے بیٹھ جانے کے بعد' یہ لوگ نہ صرف سیاسی اقتدار کے مالک ہو گئے' بلکہ انہوں نے دین کی تفسیر اور احکام کے بیان کا کام بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کیونکہ یہ لوگ علمی لحاظ سے اس کام کی اہلیت نہیں رکھتے تھے' اس لیے انہوں نے ایسے نظریات پیش کیے جن سے قدرتی طور پر مشکلات نے جنم لیا۔ اس حوالے سے بظاہر پہلا علمی تنازع نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی میراث اور زکات کی ادائیگی کے مخالفین سے جنگ کے بارے میں پیش آیا۔ (۱) اس کے بعد خلفا کی خلافت کے دوران اس قسم کے متعدد اختلافات سامنے آتے رہے۔ اسی زمانے میں کبھی کبھار کلامی (اعتقادی) مسائل بھی پیش آئے' اور خلفا کی طرف سے ان کے جوابات دیے گئے۔ (۲)

جن لوگوں کے لیے کسی بھی وجہ سے یہ جوابات ناقابلِ قبول ہوتے تھے' وہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کر لیتے تھے اور جاہل لوگ حیران و پریشان رہ جایا کرتے تھے۔ اس صورتحال کی وجہ سے' اس بارے میں اسلامی معاشرے میں بتدریج اختلافات جنم لے رہے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث جمع کرنے اور انہیں بیان کرنے پر پابندی' مسلمانوں کے درمیان یہودی افکار کے سرایت کر جانے' دنیا طلبی کے عام ہو جانے' فاسد اموی حکومت کی بنیادیں مضبوط کرنے کے لیے دین کی انحرافی تفسیر' اور سب سے بڑھ کر علمی' دینی اور سیاسی میدان سے "اہلِ ذکر" کو خارج کر دینے نے اختلافات کا دامن وسیع سے وسیع تر کر دیا' اور جلد ہی ہر گروہ عقائد کے لحاظ سے دوسرے گروہ سے بنیادی سے اختلاف رکھنے لگا۔ شیعہ ائمہؑ نے بھی اسی ابتدائی زمانے سے' اپنا نقطۂ نظر حتیٰ الامکان عامۃ المسلمین اور اپنے شیعوں کے لیے بیان کیا' اور اپنے شیعوں کو خود فروش

۱۔ الملل والنحل۔ ج ۱۔ ص ۳۱

۲۔ اس بارے میں ایک دلچسپ روایت پر توجہ کریں: اخرج اللالکائی فی السنة عن عبد اللہ بن عمر' قال: جاء رجل الی ابی بکر' فقال: ارأیت الزنا بقدر؟ قال: نعم. قال: فان اللہ قدرہ علیّ ثم یعذبنی؟ قال: نعم یابن اللخناء' اما و اللہ لو کان عندی انسان امرت ان یلجاء انفک. (ایک شخص حضرت ابوبکر کے پاس آیا اور اُن سے پوچھا: کیا زنا تقدیرِ الٰہی ہے؟ حضرت ابوبکر نے کہا: ہاں۔ اس شخص نے کہا: کیا خدا خود مقدر میں لکھ کر مجھے عذاب دے گا؟ کہا: ہاں اے بدبودار چیز کے بیٹے' خدا کی قسم اگر کوئی ادھر ہوتا تو میں اسے حکم دیتا کہ تیری ناک توڑ دے۔ الغدیر۔ ج ۷۔ ص ۱۵۳' از تاریخ الخلفاء۔ ص ۶۵)

علما اور محدثین کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی پانچ سالہ حکومت کے دوران عراق میں اہل بیتؑ کی فکر کی عام نشر و اشاعت کے لیے حالات سازگار ہوئے' لیکن اس عہد کے خاتمے کے ساتھ ہی ایک بار پھر امویوں سے وابستہ فقہا اور محدثین نے سر ابھارا اور لوگوں کو حکومت کا حمایتی بنانے کی کوشش شروع کر دی۔

پہلی صدی ہجری کے اختتام اور دوسری صدی ہجری کے آغاز میں' شیعوں کے علاوہ چند دوسرے فرقے بھی سرگرم تھے۔ ان میں زیادہ اہم خوارج' مرجۂ جہمیہ اور معتزلہ تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے خاص موضوع پر مخصوص عقائد تھے اور وہ اُن کی ترویج میں مشغول رہتے تھے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اموی حکومت ان میں سے کسی گروہ کے ساتھ بھی موافق نہیں تھی اور خراسان میں عملاً جہمیہ اور مرجۂ سے برسرِ پیکار تھی' اسی طرح جیسے جنوبی ایران کے دور دراز علاقوں میں خوارج کے ساتھ شدت سے نبرد آزما تھی۔ معتزلہ کو بھی بعض محدود مواقع کے سوا کبھی کوئی خاص طاقت حاصل نہیں ہوئی۔ ادھر امویوں اور ان کے بنائے ہوئے عثمانی مذہب کے مقابلے میں شیعوں کے حالات بھی اظہر من الشمس تھے۔

عوام الناس اپنے حکمرانوں کی پیروی میں' ایک ایسے مذہب کے پابند تھے' جس کی ترویج ابن شہاب زہری اور اس سے پہلے عروۃ بن زبیر اور اس سے بھی پہلے ابو ہریرہ اور سمرہ بن جندب جیسے لوگ کرتے رہے تھے۔ اُنہوں نے سمجھ رکھا تھا کہ لوگوں کو "حدیث" کے ذریعے دھوکا دینا چاہیے' حدیث' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کلام ہے' اور صحابہ کی پہلی نسل میں اس سے بے توجہی اور اسے لکھنے کی ممانعت کی وجہ سے اسے آسانی کے ساتھ گھڑا جا سکتا تھا۔ لہٰذا بہت جلد احادیث نقل کرنے کا رواج عام ہو گیا اور بعض اہل سنت ائمہ کی اس تصریح کے باوجود کہ احادیثِ رسول کی کل تعداد چند سو سے زیادہ نہیں (۱) دوسری صدی ہجری کے نصف کے بعد احادیث کی تعداد کئی ہزار اور پھر کچھ ہی مدت بعد کئی لاکھ تک جا پہنچی۔ حدیث سازی کا یہ سلسلہ عقائد اور احکام دونوں ہی میدانوں میں جاری تھا۔ حدیث سازی کے علاوہ' دین میں تحریف کا ایک اور ذریعہ احادیث میں تحریف کرنا تھا۔

بعض روایات سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں تشبیہ کے بارے میں صرف اتنی جعلی احادیث تھیں جنہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا تھا۔ لیکن کچھ ہی عرصے بعد "ابن خزیمہ" نے کتاب التوحید میں کئی ہزار حدیثیں جمع کر ڈالیں۔ معاشرے کا عام دینی چلن انہی جعلی احادیث کی بنیاد پر تشکیل پایا اور اس کے پیروکاروں کو "سنی" کہا گیا اور اس کے مخالفین پر "اہلِ بدعت" کا ٹھپا لگا کر انہیں اس دائرے سے باہر کر دیا گیا۔ اس طرح "اہلِ حدیث" کی تشکیل ہوئی۔ ابتدا میں جو لوگ ان احادیث سے تمسک کرتے تھے اور دوسروں کو دین و مذہب سے خارج سمجھتے تھے' انہیں عثمانی مذہب کا پیروکار کہا جاتا تھا' وہی مذہب

۱۔ مقدمۂ ابن خلدون۔ ص ۴۴۴ اور دیکھیے: تاریخ بغداد۔ ج ۱۳۔ ص ۴۱۶

جس کی تائید وحمایت میں "جاحظ" نے "العثمانیہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔

شیعہ ائمہؑ نے ایک کوشش یہ کی کہ ان احادیث' بالفاظِ دیگر "اہلِ حدیث" کا مقابلہ کریں۔ لہٰذا ائمہؑ نے ضروری مواقع پر ان تحریفات اور جعل سازیوں کا جواب دیا اور اسی طرح بعض متشابہ آیات اور احادیث کی تفسیر میں اُن کے اخذ کردہ ظاہری اور عامیانہ مفہوم کے غلط ہونے کی نشاندہی فرمائی۔

یہ اقدام تمام ائمہؑ کی فکری زندگی میں اور اُن میں سے بعض کی زندگی میں تو بہت زیادہ دیکھا جاسکتا ہے' اور اس کا جائزہ لے کر ان حضرات کے کلامی اور فقہی مؤقف کے حوالے سے اچھے نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

یہاں ہم اس حوالے سے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی فکری زندگی سے چند مثالیں پیش کرتے ہیں:

الف: ایک روایت' جس کا اہلِ حدیث بہت زیادہ سہارا لیتے تھے اور اسے بہت زیادہ بیان کرتے تھے' وہ "آسمانِ دنیا پر خدا کے نزول" کی حدیث تھی۔ وہ روایت یہ تھی:

"عن ابی هریرة' انّ رسول اللّٰه(صلی اللّٰه علیه و آله وسلم) قال: یتنزّل ربّنا تبارک و تعالیٰ کلّ لیلة الی السماء الدّنیا حین یبقیٰ ثُلُث اللّیل الآخر یقول: مَنْ یدعونی فاستجیب له' من یسالنی فأُعطیه و من یستغفرنی فاغفرله." (۱)

"ابو ہریرہ سے روایت ہے: رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ہر رات کی آخری تہائی میں آسمانِ دنیا پر اترتا ہے اور پکارتا ہے: کون ہے جو مجھ سے دعا کرے' تاکہ میں اس کی دعا قبول کروں؟ کون ہے جو مجھ سے کچھ مانگے' تاکہ میں اسے عطا کروں؟ کون ہے جو مجھ سے استغفار کرے' تاکہ میں اس کی مغفرت کروں؟!"

اس روایت کے ظاہر کو اسی صورت میں مان لینے کا لازمی نتیجہ تشبیہ کا قائل ہونا' نیز اللہ تعالیٰ کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کو قبول کرلینا ہے۔ اہلِ حدیث علی الاعلان اس اعتقاد کا اظہار کرتے اور اس عقیدے کے لیے دوسری احادیث کو بھی سند قرار دیتے تھے۔ احمد ابن حنبل جو خود اہلِ حدیث کی اس فکری تحریک کا ثمر تھے اور انہوں نے کسی حد تک اسے معتدل کیا تھا' اُن کا عقیدہ تھا کہ:

"لِلّٰه عزّوجلّ عرشٌ وللعرش حملةٌ یحملونه واللّٰه عزّوجلّ علی عرشه لیس له حدٌّ واللّٰه اعلم بحدّه... یتحرّک' یتکلّم' ینظر' یبصر' یضحک... و ینزل کلّ لیلة الی

۱۔ بخاری۔ ج ۳۔ ص ۱۰۱ (شائع کردہ دار المعرفہ)' سنن الدارمی۔ کتاب الصلاۃ۔ باب ۱۶۸' الموطاء۔ کتاب القرآن۔ ش ۳۰

سماء الدنیا وقلوب العباد بین اصبعَین من اصابع الرّحمٰن... وخلق آدم بیده علی صورته."(۱)

"خدا کا ایک عرش ہے اور کچھ اس کے اٹھانے والے ہیں جنہوں نے اسے اٹھا رکھا ہے۔ خدا اپنے عرش پر ہے جس (کے وسیع وعریض ہونے) کی کوئی حد نہیں ہے اور اللہ ہی اس کی حد کو بہتر جانتا ہے۔۔۔۔ خدا حرکت کرتا ہے بولتا ہے نظر ڈالتا ہے دیکھتا ہے ہنستا ہے۔۔۔ بندوں کے دل خدا کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں۔۔۔ اور اللہ نے آدم کو اپنے ہاتھ سے اپنی شکل کے مطابق خلق کیا ہے۔"

خدا کی بیٹھک کے بارے میں اُن کا اعتقاد تھا کہ چار انگلیوں کے برابر جگہ خالی ہے جو اُس کے پہلو میں رسول اللہؐ کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔(۲) یہ عقائد اُن تحریف شدہ یا جعلی روایات کی بنیاد پر تھے جو احمد ابن حنبل تک پہنچی تھیں۔

جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہوا یہ لوگ "حدیث" سے تمسک کرتے تھے۔ لہٰذا جب ایک مرتبہ کسی شخص نے احمد ابن حنبل سے کہا کہ حدیث "رایتُ ربّی عزّوجلّ شابٌّ امرد جعد قطط علیه حلة حمراء." کو گویا صرف ایک شخص نے روایت کیا ہے تو وہ طیش میں آگئے اور اس حدیث کے متعدد طریق بیان کر دیے۔(۳)

یہ روایتیں احمد ابن حنبل کے زمانے میں نہیں گھڑی گئی تھیں بلکہ اِن میں سے بہت سی اس سے پہلے ہی لوگوں کے درمیان پھیلی ہوئی تھیں۔ اسی وجہ سے شیعہ بار بار ائمہؑ سے ان احادیث کے بارے میں سوال کرتے تھے۔ اسی حدیث نزولِ خدا کے بارے میں امام موسیٰ کاظمؑ اور امام علی رضاؑ سے سوال ہوئے ہیں:

یعقوب بن جعفر جعفری کہتے ہیں: امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی خدمت میں ایسے لوگوں کا تذکرہ ہوا جو یہ گمان کرتے تھے کہ خداوند عالم دنیا کے آسمان تک نیچے اترتا ہے۔ اس پر امامؑ نے فرمایا:

"ان اللّٰه لا ینزل ولا یحتاج الی ان ینزل انما منظره فی القرب والبعد سواءٌ لم یبعد منه قریب ولم یقرب منه بعید ولم یحتج الی شیءٍ بل یحتاج الیه وهو ذو الطول لا اله الّا هو العزیز الحکیم اما قول الواصفین: انه ینزل تبارک وتعالی فانما یقول ذلک من ینسبه الی نقص اوزیادة وکل متحرک محتاج الی من یحرّکه او یتحرک به فمن ظنّ باللّٰه الظنون هلک فاحذروا فی صفاته من ان تقفوا له علی حد تحدّونه بنقص

۱۔ طبقات الحنابلہ۔ ج ۱۔ ص ۲۹

۲۔ ایضاً۔ ج ۲۔ ص ۶۷

۳۔ ایضاً۔ ج ۲۔ ص ۳۶

او زیادة او تحریک او تحرّک او زوال او استنزال او نهوض او قعود فان الله جلّ وعزّ عن صفة الواصفین ونعت الناعتین وتوهّم المتوهّمین وتوکّل علی العزیز الرحیم الذی یراک حین تقوم و تقلبک فی الساجدین."

"خدا نیچے نہیں اترتا۔ اسے ضرورت ہی نہیں کہ نیچے اترے۔ اس کی نظر میں دوری اور نزدیکی برابر ہے، نہ نزدیکی اس کی نظر میں دور ہے اور نہ دوری اس کی نظر میں نزدیک۔ اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں، بلکہ ہر شئے اس کی محتاج ہے۔ وہ صاحبِ فضل وانعام ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی قادر اور حکیم ہے۔ وہ لوگ جو اس طرح خدا کی توصیف کرتے ہیں کہ "اللہ نیچے اترتا ہے" یہ بات وہ لوگ کہتے ہیں جنہوں نے خدا کو کمی اور زیادتی سے متصف کیا ہے۔ ہر متحرک، محرک (حرکت دینے والے) کا محتاج ہوتا ہے، تاکہ وہ اسے حرکت میں لائے، یا اس کی مدد سے وہ حرکت میں آئے۔ پس جو خدا کے بارے میں (ایسا) گمان رکھے، وہ ہلاک ہو جائے گا۔ خدا کی توصیف میں ایسی صفات سے پرہیز کرو جو خدا کو کمی و زیادتی، تحریک و تحرک، منتقل ہونے اور نیچے آنے یا اٹھنے اور بیٹھنے میں محدود کردے۔ اللہ تعالیٰ اس قسم کے وصف بیان کرنے والوں کے وصف اور اس قسم کا گمان رکھنے والوں کے گمان سے بالاتر ہے۔ اس خدائے غالب اور رحیم پر توکل کرو جو تمہیں کھڑے ہونے اور سجدہ کرنے والوں کے درمیان دیکھتا ہے۔"(۱)

اس روایت میں "آسمانِ دنیا پر خدا کے نزول" کی نفی کی گئی ہے، اور انتہائی باریک تعبیروں کے ذریعے تشبیہ کے انکار کے بارے میں مکتبِ اہلِ بیتؑ کا نقطۂ نظر بیان کیا گیا ہے۔ اہلِ بیتؑ سے ایسی بہت سی تعبیریں نقل ہوئی ہیں اور ان کی بنیاد امیر المومنین حضرت علیؑ کے ان خطبوں سے ماخوذ ہے جنہیں نہج البلاغہ میں نقل کیا گیا ہے۔ مذہبِ اہلِ بیتؑ میں نہ نفی ہے اور نہ تشبیہ، بلکہ تشبیہ کے بغیر اثبات کی تائید کی گئی ہے، اور یہ وہی تعبیر ہے جسے صراحت کے ساتھ امام رضاؑ نے بیان کیا ہے۔(۲)

حدیث "آسمانِ دنیا پر خدا کا نزول" کے بارے میں قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ امام علی رضا علیہ السلام نے اس اصل حدیث کا انکار نہیں کیا ہے، بلکہ اس میں ہونے والی تحریف کو بیان کیا ہے۔ یہ ایک اہم نکتہ ہے جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ احادیث گھڑنے والوں اور انہیں جھوٹا منسوب کرنے والوں کی طرف سے جانتے بوجھتے احادیث میں تحریف کی کوشش کی جاتی تھی۔

۱۔ کافی۔ ج۱۔ ص۱۲۵، التوحید۔ ص۱۸۳

۲۔ التوحید۔ ص۱۰۲

ابراہیم بن محمود کہتے ہیں: میں نے امام رضاؑ سے عرض کیا: اے فرزندِ رسولؐ! اس حدیث کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں جسے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ہر شب جمعہ آسمانِ دنیا پر اترتا ہے۔ امامؑ نے فرمایا:

"لعن اللہ المحرّفین الکلم عن مواضعہ. واللہ ما قال رسول اللہ کذلک 'انّما قال: انّ اللہ تعالی ینزّل ملکاً الی السّماء الدّنیا کلّ لیلۃ فی الثّلث الاخیر ولیلۃ الجمعۃ فی اوّل اللّیل فیامرہ فینادی ھل من سائل فاعطیہ سؤالہ؟ھل من تائب فاتوب علیہ من مستغفر فاغفر لہ؟..... حدّثنی بذلک ابی عن جدّی عن آبائہ عن رسول اللہ(ص). "

"خدا لعنت کرے اُن لوگوں پر جو بات کو اس کے اصل معنی سے منحرف کر کے اُس میں تحریف کے مرتکب ہوتے ہیں۔ خدا کی قسم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ نہیں فرمایا ہے بلکہ فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ ہر رات کی آخری تہائی میں اور شبِ جمعہ کے ابتدائی حصے میں ایک فرشتے کو آسمانِ دنیا پر اتارتا ہے اور اسے حکم دیتا ہے کہ وہ منادی کرے کہ کیا کوئی سائل ہے جس کی ضرورت کو میں پورا کروں؟ کیا کوئی توبہ کرنے والا ہے جس کی توبہ کو میں قبول کروں؟ کیا کوئی استغفار کرنے والا ہے جس کے گناہوں کو میں بخش دوں؟ ----- یہ حدیث میرے بابا نے میرے دادا سے اور انہوں نے اپنے اجداد کے ذریعے سے رسول اللہؐ سے نقل کی ہے۔"(۱)

حدیث کا آخری حصہ اس حقیقت کا ترجمان ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث نقل کرنے کے سلسلے میں اہلِ بیت علیہم السلام کا طریق سب سے زیادہ محفوظ ترین طریق ہے اور شیعہ اسی وجہ سے اس طریق (ذریعے) سے وابستہ رہے ہیں اور انہیں یہ حق حاصل ہے کہ وہ دوسرے کسی اور طریق پر اعتماد نہ کریں مگر یہ کہ اس کی تائید اس طریق سے ہوئی ہو۔

ب: ایک اور مثال جس کے ظاہر سے اہلِ حدیث متمسک تھے وہ آیتِ قرآن: اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ہے۔(۲) یہ لوگ دوسری آیاتِ قرآنی سے بے توجہی برتتے نیز استدلال اور تعقل کو کام میں نہ لانے کی وجہ سے (جو برسہا برس سے معتزلہ کے ساتھ جاری ان کی محاذ آرائی کا نتیجہ تھا) ایک قسم کے شدید سطحی اندازِ فکر میں مبتلا ہو گئے تھے اور کیونکہ تشبیہ کے باب میں ان کے پاس کچھ حدیثیں بھی موجود تھیں اس لیے قدرتی بات ہے کہ وہ اس قسم کی آیات کو ان احادیث ہی کی روشنی میں تفسیر کریں۔ اگر ہم مذکورہ آیت کی ذیل میں تفسیر برہان کو دیکھیں تو ہمیں اس آیت کی تفسیر میں

۱۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۱۔ ص ۱۰۲

۲۔ سورۂ طٰہٰ ۲۰۔ آیت ۵

متعدد روایات نظر آتی ہیں' جن میں سے اکثر اصحاب یا مناظرہ کرنے والوں کے جواب میں ہیں۔(۱) ان روایات میں "اثبات بلاتشبیہ" کی جانب رہنمائی کی گئی ہے اور آیت میں موجود مفاہیم کو علم اور قدرت کا کنایہ قرار دیا گیا ہے۔

اس آیت کے بارے میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے بھی سوال کیا گیا تھا' اور آپ نے بھی اس کا جواب دیا تھا:

"عن الحسن بن راشد قال: سُئِل ابو الحسن موسیٰ عن معنی قولِ الله تعالیٰ: اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى. فقال: استولیٰ علی ما دق و جلّ."(۲)

"حسن بن راشد کہتے ہیں: ابوالحسن موسیٰ (کاظم علیہ السلام) سے اللہ تعالیٰ کے قول: اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى کے بارے میں سوال کیا گیا' تو آپ نے فرمایا: یہ آیت تمام چھوٹے بڑے امور پر اللہ تعالیٰ کی گرفت کا کنایہ ہے۔"

واضح ہے کہ یہ تعبیر آیات محکمات میں آئی ہے' جس سے خدا کی محدودیت کی نفی ہوتی ہے' اور اگر آیت کے ظاہر سے تمسک کیا جائے' تو خدا کی محدودیت کو قبول کرنا پڑے گا۔

ج: اہلِ حدیث مسئلۂ جبر و اختیار میں' جبر کے قائل ہیں اور اُن کا یہ افراطی نظریہ معتزلہ کے تفریطی نظریے کے مقابلے میں تھا۔ عقیدۂ جبر کی جڑیں دور جاہلیت میں پائی جاتی ہیں' جیسا کہ بعض آیات قرآن میں اس بارے میں مشرکین کا قول نقل کر کے اشارہ کیا گیا ہے۔(۳)

معتزلہ کے خیال میں' ظہور اسلام کے بعد معاویہ نے عقیدۂ جبر کو رواج دیا۔(۴) لیکن متعدد قرائن اور شواہد کی بنیاد پر جاہلی افکار' نیز یہودیوں کی بعض آراء اسلام کے ابتدائی دور ہی میں بعض مسلمانوں کو عقیدۂ جبر کا معتقد بنانے میں مؤثر رہی تھیں۔

واضح ہے کہ عقیدۂ جبر خلفا کے اقتدار کی بنیادوں کو مضبوط اور ان کی غلطیوں کی توجیہ کر سکتا تھا۔ اسی طرح لوگوں کو ان پر اعتراض اور تنقید کرنے سے بھی باز رکھ سکتا تھا۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ حسن بصری کو دھمکی دی گئی تھی کہ اگر وہ "اختیار" کے عقیدے سے دستبردار نہ ہوئے' تو حکومت کو اس کی اطلاع دے دی جائے گی۔(۵)

۱۔ تفسیر البرہان۔ ج ۳۔ ص ۴۳۔ ۴۴

۲۔ الاحتجاج۔ ج ۲۔ ص ۱۵۷' مسند الامام الکاظم۔ ج ۱۔ ص ۲۶۲

۳۔ سورۂ نحل ۱۶۔ آیت ۳۵

۴۔ فضل الاعتزال۔ ص ۱۴۳' دیکھیے: بحوث مع اہل السنۃ والسلفیۃ۔ ص ۵۳

۵۔ طبقات الکبریٰ۔ ج ۷۔ ص ۱۲۲' اور دیکھیے: بحوث مع اہل السنۃ والسلفیۃ۔ ص ۵۳

اہل حدیث اپنے اس عقیدے کو ثابت کرنے کے لیے بعض آیات وروایات کا سہارا لیتے تھے۔ ان کے مقابلے میں "اہل عدل" بھی بعض دوسری آیات وروایات کا سہارا لیتے تھے۔ اس مقام پر بھی آیات کو درست طور پر سمجھنا اور متشابہات کو محکمات کی طرف پلٹانا ضروری تھا۔

اس باب کی روایات میں سے ایک روایت: "الشّقیّ من شقی فی بطن اُمّه والسّعیدمن سَعِد فی بطن اُمّه" تھی۔(۱)

اس حدیث کے ایسے معنی بھی کیے جاسکتے ہیں جو مکمل طور پر مذہب جبر کی تائید کرتے ہوں۔ اسی لیے اس کی وجہ سے اصحاب ائمہؑ کے ذہنوں میں بھی سوالات پیدا ہوئے تھے اور وہ اس حدیث کے درست معنی جاننے کے لیے سوال کیا کرتے تھے۔ اس بارے میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے سوال ہوا تھا' جس کی روایت ہم یہاں درج کررہے ہیں:

محمد بن ابی عمیر کہتے ہیں:

میں نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس قول: الشقی من شقی فی بطن امه والسّعید من سعد فی بطن امه. (شقی ماں کے پیٹ ہی سے شقی پیدا ہوتا ہے اور سعید ماں کے پیٹ ہی سے سعید پیدا ہوتا ہے) کے بارے میں پوچھا۔

حضرت نے اس حدیث کے معنی بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"الشّقی من علم اللّٰه وهوفی بطن امه انه سیعمل اعمال الاشقیاء والسّعیدمن علم اللّٰه وهوفی بطن امه انه سیعمل اعمال السّعداء."(۲)

"شقی انسان وہ ہوتا ہے کہ جب وہ شکمِ مادر میں تھا' اسی وقت سے خدا جانتا تھا کہ وہ اشقیا کے اعمال انجام دے گا اور سعادت مند انسان وہ ہے کہ جب وہ رحمِ مادر میں تھا' اسی وقت سے خدا جانتا تھا کہ وہ باسعادت لوگوں کا کردار اپنائے گا۔"

اسی روایت میں آگے چل کر ایک اور حدیث کے بارے میں سوال کیا گیا ہے جس سے جبر کا مفہوم سمجھا جاسکتا ہے۔ امامؑ نے اس کا بھی ایک خوب صورت جواب دیتے ہوئے فرمایا:

"قلت له: فمامعنی قوله: اعملوا فکلّ میسّرٌ لماخُلِق له. فقال: انّ اللّٰه عزّوجلّ خلق الجنّ

۱۔ دیکھیے: سنن ابن ماجہ۔ مقدمہ نمبر ۷ سنن الدارمی۔ مقدمہ نمبر ۲۳' مسند احمد۔ ج ۲۔ ص ۱۷۶

۲۔ التوحید۔ ص ۳۵۶' مسند الامام الکاظم۔ ج ۱۔ ص ۲۷۳

والانس لیعبدوہ ولم یخلقھم لیعصوہ' وذلک قولہ عزّوجلّ: و ما خلقت الجن و الانس اِلا لیعبدوہ (۱) فیسّر کلاً لما خُلِق لہ' فَالْوَیْلُ لِمِنِ استحبَ العمیٰ علی الھدیٰ. "(۲)

"میں نے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث کے معنی کیا ہیں جس میں آپ نے فرمایا ہے: "ہر چیز کو اسی راہ پر لے جایا جائے گا جس کے لیے اُسے خلق کیا گیا ہے۔" حضرت نے فرمایا: خدا نے جن وانس کو خلق کیا ہے' تاکہ وہ اُس کی عبادت کریں' اس لیے خلق نہیں کیا ہے کہ وہ اس کی نافرمانی کریں۔ لہٰذا ہر ایک کے لیے اس راستے پر چلنے کا امکان فراہم کر دیا ہے جس کے لیے اُسے خلق کیا گیا ہے۔ وائے ہو اس پر جو گمراہی کو ہدایت پر ترجیح دے۔"

امامؑ سے "نافرمانی کے عامل" کے بارے میں سوال ہوا' تو آپ نے ایک واضح جواب دیتے ہوئے فرمایا:

"لاتخلومن ثلاث: امّا ان تکون من اللّٰہ عزّوجلّ' ولیست منہ' فلا ینبغی للکریم ان یعذّب عبدہ بمالایکتسبہ. و امّاان تکون من اللّٰہ عزّوجلّ ومن العبدولیس کذلک' فلا ینبغی للشّریک ان یظلم الشّریک الضّعیف' و امّا ان تکون من العبدوھی منہ' فان عاقبہ اللّٰہ فبذنبہ وان عفاعنہ فبکرمہ وجودہ. "(۳)

"انسان جو عمل انجام دیتا ہے' اُس کی صرف تین صورتیں ہو سکتی ہیں: پہلی صورت یہ ہے کہ یا وہ کام خدا نے کیا ہو اور اس کا انسان سے کوئی تعلق نہ ہو' (اس صورت میں) مناسب نہیں ہے کہ خداوندِ کریم اپنے بندے کو ایسے عمل پر عذاب دے جو اس نے انجام ہی نہیں دیا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ عمل خدا اور بندے نے مشترکہ طور پر انجام دیا ہو' اس صورت میں بھی مناسب نہیں کہ مضبوط شریک (خدا) کمزور شریک (انسان) پر ظلم کرے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ وہ عمل خود بندے نے کیا ہو اور یہ خود اُس کا انجام دیا ہوا عمل ہو' اس صورت میں اگر خدا اسے عذاب دے' تو یہ اس کے انجام دیے ہوئے گناہ کی وجہ سے ہے اور اگر خدا اس کے گناہ سے چشم پوشی کرے' تو اس کی وجہ خدا کا جود و کرم ہے۔"

د: جنگِ جمل اور جنگِ صفین کے بعد سے "ایمان" کی تعریف کے بارے میں ایک مشکل نے جنم لیا تھا' اور وہ یہ کہ: مومن

۱۔ آیت کے متن میں لیعبدون ہے۔

۲۔ ایضاً

۳۔ التوحید' ص ۹۶' مسند الامام الکاظم' ج ۱' ص ۲۷۳

کون ہے؟ کیا وہ شخص جو صرف زبان سے شہادتین کہہ دے یا وہ جو احکام پر بھی عمل پیرا ہو یا مومن کی کوئی اور تعریف ہے؟

اس بارے میں مسلمان تین گروہوں میں بٹ گئے تھے: ایک گروہ کا کہنا تھا: جو کوئی گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو وہ دین سے خارج ہو جاتا ہے اور کافر ہے۔ یہ کہنے والے لوگ "خوارج" تھے۔ دوسرے گروہ کا کہنا تھا: گناہ کبیرہ کا مرتکب فاسق، غیر مومن اور غیر مسلم ہے۔ یہ کہنے والے "معتزلہ" تھے۔ تیسرے گروہ کا کہنا تھا: زبان سے شہادتین کہنا کافی ہے اور جو کوئی یہ کہہ دے وہ حتیٰ اگر گناہانِ کبیرہ کا مرتکب بھی ہو جائے، تب بھی مسلمان ہے، یہ کہنے والے "مرجئہ" تھے۔ یہ نظریہ درست ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی افراطی شکل میں اس انتہا پر پہنچا کہ عمل کا ایمان کے معاملے میں کوئی بنیادی کردار ہی نہیں رہا۔ اس کی اس شکل نے رفتہ رفتہ مخالفین کے ہاتھ میں ایک بہانہ دے دیا، جس کی بنیاد پر وہ اس عقیدے کو یکسر غلط سمجھنے لگے۔ درحقیقت جو انسان شہادتین کہہ دے وہ مسلمان ہے، لیکن مومن وہ ہے جو احکامِ شریعت پر بھی عمل کرتا ہو اور اس کا دل ایمان پر بھی مطمئن ہو۔

عمل کو غیر اہم قرار دینے والے مرجئہ کے افراطی نظریے کو رواج پاتے دیکھ کر ائمہ علیہم السلام نے ایمان کے گرانقدر مفہوم پر زور دیا۔ اس مفہوم کے تین اجزا تھے: ایمان معرفتِ قلبی، اقرارِ زبانی اور خارج میں عمل کا نام ہے۔ دراصل یہ وہ حدیث ہے، جو امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی تھی: "الایمان معرفةٌ بالقلب و اقرارٌ باللّسان و عملٌ بالارکان." (ایمان دل سے معرفت، زبان سے اقرار اور اعضا سے عمل کا نام ہے)۔(۱)

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے بھی دوسرے ائمہؑ کی طرح اس غلط عقیدے کا مقابلہ کیا، اور اسے باطل قرار دیا۔ جب آپ سے اس بارے میں سوال کیا گیا، تو آپ نے فرمایا:

"انّ للایمان حالاتٌ و درجاتٌ و طبقاتٌ و منازل، فمنه التّام المنتهیٰ تمامه و منه الناقص المنتهیٰ نقصه و منه الزّائد الرّاجح زیادته."(۲)

"ایمان کے درجات اور مراتب ہیں: ایک مرتبہ مکمل کمال کا مرتبہ ہے۔ ایک مرتبہ مکمل طور پر ناقص مرتبہ ہے اور ایک درمیانی مرتبہ ہے، جس میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔"

اصحاب کی جانب سے کیے جانے والے یہ سوالات، اس بات کی بھی دلیل ہیں کہ وہ معاشرے میں ان مشکلات کا

۱۔ نہج البلاغہ۔ کلمات قصار ۲۲۷

۲۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۳۹، اس فرقے کے بارے میں دیکھیے: مرجئہ تاریخ و اندیشہ از مولف۔ ناشر نشر خرم قم

سامنا کیا کرتے تھے اور اپنے ذہن مطمئن کرنے کے لیے انھیں مناسب جواب کی ضرورت ہوتی تھی (۱) اور یہ سوال اس لیے بھی کیے جاتے تھے تاکہ وہ ان فرقوں کے ساتھ کلامی بحث ومباحثے کے دوران اہلِ بیتؑ کے صحیح عقیدے سے لیس ہوں۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اس بارے میں بحث کرنے والوں سے ذاتی طور پر گفتگو کیا کرتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ اصحاب کو بھی مضبوط کیا کرتے تھے تاکہ وہ لوگوں کے درمیان اہلِ بیتؑ کے نقطۂ نظر کی نشرواشاعت کریں۔ ہشام بن حکم اہلِ بیتؑ کے نظریات دوسروں تک پہنچانے میں امام جعفر صادق اور امام موسیٰ کاظم علیہما السلام کے مضبوط ترین شاگرد تھے۔

مزید یہ کہ ایسے اصحاب جو بحث اور مناظرے کے میدان میں مضبوط تھے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اُنھیں مخالفین کے ساتھ بحث اور مناظرے اور شیعوں کے کلامی عقائد بیان کرنے کی ترغیب دیتے تھے جو کبھی کبھی لوگوں کے پاس تحریف شدہ صورت میں موجود ہوتے تھے۔ ابوالحسین خیاط معتزلی کی کتاب "انتصار" بتاتی ہے کہ شیعوں کے خلاف کس قدر تحریف ہوئی ہے اور توحید کے باب میں اُن کے عقائد کو تشبیہ کی صورت میں منعکس کیا گیا ہے۔ حالانکہ ائمہؑ کی کلامی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبِ شیعہ میں نظریۂ تنزیہ (یعنی خدا کے جسم اور شکل رکھنے سے منزہ ہونا) پر کس قدر اصرار کیا گیا ہے۔

جن اصحاب کو امام موسیٰ کاظم علیہ السلام مخالفین کے ساتھ بحث ومباحثے کا حکم دیا کرتے تھے اُن میں سے ایک محمد بن حکیم بھی تھے جن کے بارے میں نقل ہوا ہے کہ: "**کان ابو الحسن (علیه السلام) یامر محمّدبن حکیم ان یجالس اهل المدینة فی مسجد رسول الله و ان یُکلّمهم و یُخاصِمهم.**" (امام موسیٰ کاظم علیہ السلام محمد بن حکیم کو حکم دیا کرتے تھے کہ وہ مسجدِ نبوی میں بیٹھیں اور اُن لوگوں کے ساتھ بحث ومباحثہ کریں)۔ (۲)

تمام تر پابندیوں کے باوجود ائمہ علیہم السلام اور اُن کے اصحاب کی جانب سے یہ کوششیں اس بات کا سبب بنیں کہ اہلِ بیتؑ کے عقائد نے شیعوں کی فکری بنیادوں کو تشکیل دیا اور ٹھیک ٹھیک اور تحریف سے محفوظ اسلام اہلِ بیتؑ کے ذریعہ سے باقی رہا۔

☆☆☆

۱۔ شاید اسی وجہ سے امامؑ اپنے اصحاب کو تشبیہ کے بارے میں غلط عقائد رکھنے والے لوگوں کے ساتھ میل جول سے منع فرماتے تھے۔ دیکھیے: مسند الامام الکاظم۔ ج ۱۔ ص ۲۶۱

۲۔ رجال کشی۔ ص ۳۸۰

علیہ السلام

امام علی رضا

روی الرضا علیہ السلام عن آبائہ عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم عن اللّٰہ تعالی:

”کلمة لاالہ الااللّٰہ حصنی فمن دخل حصنی امن من عذابی.

ثم قال الرضاعلیہ السلام: بشروطھا وانامن شروطھا.“

امام رضاعلیہ السلام اپنے آبااوروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اوروہ اللہ تعالی سے روایت کرتے ہیں:

”کلمہ لاالہ الااللہ میراقلعہ ہے تو جو میرے قلعے میں داخل ہوگیا وہ میرے عذاب سے محفوظ ہوگیا۔

پھر امام نے فرمایا: اس کی کچھ شرائط ہیں اور میں ان شرائط میں شامل ہوں۔“

امام رضاؑ کی شخصیت

بہت سے مورخین کے بقول امام علی رضا علیہ السلام کی ولادت سن ۱۴۸ ہجری (۱) اور ان میں سے کچھ کے مطابق جن میں شیخ صدوق (۲) بھی شامل ہیں، سن ۱۵۳ ہجری کے ۱۱ ذیقعدہ (یا ذی الحجہ یا ربیع الاوّل) کے دن واقع ہوئی۔ آپ کی تاریخ وفات کے بارے میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض نے سن ۲۰۲ ہجری اور بعض نے سن ۲۰۳ ہجری (۳) کو آپ کی رحلت کا سال قرار دیا ہے۔ آپ نے کون سے مہینے میں وفات پائی؟ اس سلسلے میں کلینی (۴) اور شیخ مفید (۵) نے بغیر کسی تاریخ کا تعین کیے اسے ماہ صفر بیان کیا ہے۔ نوبختی نے ماہ صفر کے آخری دن کو آپ کا روز وفات قرار دیا ہے (۶) اور کچھ علما صفر کی ۱۷ یا ۲۳ یا ذی الحجہ کی آخری تاریخ کو آپ کا روز وفات سمجھتے ہیں۔ (۷) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ عام طور پر نوبختی کی بات کے قائل ہیں۔

آپ کی والدہ کا نام "خیزران" تھا۔ بعض نے کہا ہے آپ ام ولد (کنیز) اور نوبہ کی رہنے والی تھیں، اور آپ کا نام "اروی" اور لقب "شقراء" تھا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ان کا نام نجمہ اور کنیت ام البنین تھی، جبکہ چند ایک لوگوں نے ان کا نام "تکتم" بتایا ہے۔ (۸) امامؑ کی انگوٹھی پر مَاشَاءَ اللّٰهُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ منقوش تھا۔ (۹)

۱۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۴۸۶، ارشاد۔ ص ۳۳۱، التہذیب۔ ج ۶۔ ص ۸۳
۲۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۱۔ ص ۱۸، نوبختی نے سن ۱۵۱ نقل کیا ہے، دیکھیے: فرق الشیعہ۔ ص ۹۶
۳۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۴۸۶، ارشاد۔ ص ۳۳۱، فرق الشیعہ۔ ص ۹۶
۴۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۴۸۶
۵۔ ارشاد۔ ص ۳۳۱
۶۔ فرق الشیعہ۔ ص ۹۶
۷۔ تواریخ النبی والآل۔ ص ۷۹
۸۔ دراصل ان خاتون کے کئی نام ذکر کیے گئے ہیں، جن میں نجمہ، اروی، سکینہ، سمانہ اور تکتم بھی شامل ہیں۔ دیکھیے: تواریخ النبی والآل۔ ص ۹۱۔ مشہور ہے کہ آپ کی والدۂ گرامی کا مقبرہ مدینہ منورہ میں شربام ابراہیم میں واقع ہے۔
۹۔ بحار الانوار۔ ج ۴۹۔ ص ۲، از کافی

امام علی رضا علیہ السلام سن ۲۰۱ ہجری تک مدینہ میں تھے۔ اسی سال ماہ رمضان میں آپ "مرو" پہنچے اور جیسا کہ بتایا گیا ہے آپ نے ماہ صفر سن ۲۰۳ ہجری میں شہادت پائی۔

امام علی رضا علیہ السلام سے متعلق سیاسی واقعات کا تعلق زیادہ تر آپ کی ولی عہدی کے زمانے سے ہے۔ اس سے پہلے آپ کے سیاسی طرز عمل کے بارے میں بہت ہی کم ملتا ہے' جس کی ایک مثال کا تعلق ہارون الرشید کے ایک سردار "جلودی" کے محمد بن جعفر کے قیام کو کچلنے کے لیے مدینہ پر حملے سے ہے۔ (۱)

ابوالفرج نے نوفلی سے محمد بن جعفر کی تحریک کے سلسلے میں امام رضاؑ کی وساطت کے حوالے سے ایک روایت نقل کی ہے' جس کی صحت مشکوک ہے۔ (۲)

رافعی لکھتا ہے: مشہور ہے کہ علی بن موسیٰ الرضاؑ ایک سفر کے دوران قزوین تشریف لائے' اور داؤد بن سلیمان غازی کے گھر میں روپوش ہو گئے۔ جیسا کہ اسحاق بن محمد اور علی بن مہرویہ نے ایک تحریر میں اسی داؤد کے توسط سے امامؑ سے نقل کیا ہے کہ آپ کا ایک بچہ' جس کی عمر دو سال یا اس سے بھی کم تھی' قزوین میں دفن ہے۔ (۳) یہ وہی امام زادہ حسین ہیں جن کا مزار اس وقت قزوین میں موجود ہے۔ امکان ہے کہ یہ سفر سن ۱۹۳ ہجری میں ہارون رشید کی موت کے قریب پیش آیا ہو۔ (۴)

اصفہانی نے لکھا ہے کہ "جلودی" کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ آلِ ابی طالب کو مدینہ سے خراسان لے کر آئے اور امام علی رضاؑ بھی علویوں کے ساتھ خراسان آئے اور خراسان میں آپ کی موجودگی کے موقع پر ولی عہدی کی بیعت لی گئی۔ (۵) یہ روایت دوسری روایات کے ساتھ خلط ملط ہو گئی ہے' کیونکہ اگرچہ جلودی مدینہ آیا تھا' لیکن اُس نے امامؑ کے "مرو" کے سفر سے پہلے کسی زمانے میں مدینہ پر حملہ کیا تھا۔

یہاں ہم گفتگو کے آغاز میں وہ اختلاف بیان کریں گے جو امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی رحلت کے بعد پیش آیا تھا اور اس کے بعد امام علی رضا علیہ السلام کی زندگی میں پیش آنے والے دوسرے اہم واقعات کا ذکر کریں گے:

وہ چیزیں جو بہت اچھی طرح امام علی رضا علیہ السلام کی امامت کو ثابت کرتی ہیں' اُن میں روایات پر مبنی بہت سے دلائل' اُس دور کے شیعوں کے درمیان آپ کی مقبولیت نیز آپ کی علمی اور اخلاقی برتری شامل ہے۔ اگرچہ امام موسیٰ کاظم

۱۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۲۔ ص ۱۵۹

۲۔ مقاتل الطالبین۔ ص ۳۶۰

۳۔ التدوین فی اخبار قزوین۔ ج ۳۔ ص ۴۲۸' ضیافۃ الاخوان۔ ص ۲۷۲

۴۔ حیاۃ الامام الرضاؑ۔ ص ۲۲۵

۵۔ مقاتل الطالبین۔ ص ۳۷۵

کی زندگی کے آخری ایام میں امامت کا مسئلہ بہت پیچیدہ اور دشوار ہو چکا تھا' لیکن امام موسیٰ کاظمؑ کے اکثر اصحاب نے آپ کی طرف سے امام رضاؑ کی جانشینی کو قبول کر لیا تھا۔

شیخ مفید نے ان اصحاب میں سے بارہ کے نام ذکر کیے ہیں جنہوں نے امام موسیٰ کاظمؑ کے جانشین کے طور پر امام علی رضاؑ کے تعین کے بارے میں روایات نقل کی ہیں۔ ان میں سے اہم ترین داؤد بن کثیر الرّقی' محمد بن اسحاق بن عمار' علی بن یقطین اور محمد بن سنان ہیں۔(۱) اس کے بعد شیخ نے ان مذکورہ روایات کو تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس بارے میں جو کچھ جمع ہوا ہے' وہ شیخ صدوق اور بعض متاخرین کے ذریعے سے ہوا ہے۔(۲)

امام جعفر صادق علیہ السلام کی شہادت کے بعد آپ کی جانشینی کے مسئلے پر جو اختلاف پیش آیا تھا' وہ اس بات کا سبب بنا کہ اس مرتبہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی جانشینی کے بارے میں اصحاب نے زیادہ احتیاط سے کام لیا اور آپ کی شہادت سے پہلے ہی آپ سے اپنے جانشین کی شناخت کرا دینے پر اصرار کیا۔

نصر بن قابوس کہتے ہیں: میں نے ابو ابراہیم (امام موسیٰ کاظمؑ) کی خدمت میں عرض کیا: میں نے آپ کے والد سے اُن کے جانشین کے بارے میں پوچھا تھا' تو انہوں نے آپ کا تعارف کرایا تھا (فَاَخبَرَنی اِنَّکَ اَنتَ هُو)۔ پھر میں نے آنجناب کی خدمت میں عرض کیا کہ جب امام جعفر صادقؑ کی شہادت واقع ہوئی' تو لوگوں کے درمیان اختلاف پیدا ہوا (ذَهَبَ النَّاسُ یَمیناً وَ شِمالاً)۔ میں نے اور میرے دوستوں نے آپ کا انتخاب کیا۔ اب آپ ہمیں مطلع فرمایئے کہ آپ کا جانشین کون ہوگا؟ امامؑ نے اپنے فرزند علی رضاؑ کا تعارف کرایا۔(۳)

اس کے باوجود تقیے کی وجہ سے' نیز ان افراد کی موقع پرستی کی وجہ سے جن کے پاس امام موسیٰ کاظمؑ کے لیے شیعوں کی طرف سے لیا ہوا مال رکھا تھا' اسی طرح اُن بعض غلط روایات کی موجودگی کی وجہ سے' جن میں ایسی علامتیں بیان کی گئی تھیں جو ذہنوں کو امام علی رضاؑ کی طرف سے ہٹا دیں' کچھ مشکلات پیش آئیں۔ یہ اس کے باوجود تھا کہ امام موسیٰ کاظمؑ نے مدینہ میں شیعوں اور علویوں کے درمیان (جن میں سے متعدد اس واقعے کے شاہد و ناظر تھے) امام رضاؑ کو اپنا جانشین مقرر فرمایا تھا۔(۴)

جیسا کہ مرحوم طبرسی نے روایت کیا ہے: اصل اعتراض ان لوگوں کی جانب سے تھا جن کے پاس امام موسیٰ کاظمؑ

۱۔ ارشاد۔ ص ۳۰۴

۲۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۱۔ ص ۱۷۔ ۲۷' مسند الامام الرضاؑ۔ ج ۱۔ ص ۱۸۔ ۲۷' دیکھئے: روضۃ الواعظین۔ ج ۱۔ ص ۲۲۲

۳۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۳۱۲' رجال کشی۔ ص ۴۵۱

۴۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۱۔ ص ۲۸

کی آخری قید کے دوران کافی مال جمع ہو گیا تھا۔ اس بارے میں طبرسی کی عبارت کچھ یوں ہے: بظاہر اس اعتراض کا سبب ان اموال اور امانتوں کا لالچ تھا جو امامؑ کی اسیری کے زمانے میں آپ کے بعض اصحاب کے پاس اکٹھے ہو گئے تھے۔ اس بات نے انہیں امامؑ کی وفات کو جھٹلانے' آپ کے زندہ ہونے کا دعویٰ کرنے اور آپ کے جانشین اور آپ کے بعد امام کے بارے میں نص کا انکار کرنے پر مجبور کیا۔(۱)

طبرسی کی اس بات کی گواہی اس روایت سے ملتی ہے جسے ''کشی'' نے نقل کیا ہے' جس میں آیا ہے کہ امام موسیٰ کاظمؑ کے دو وکیلوں ''حیان سراج'' اور ایک اور شخص کے پاس تیس ہزار دینار تھے۔ امامؑ کی اسیری کے زمانے میں ان لوگوں نے اس رقم سے گھر اور غلہ خرید لیا' اور جب انہیں امامؑ کی وفات کی خبر ملی' تو انہوں نے امامؑ کی وفات کا انکار کیا اور شیعوں کے درمیان افواہ پھیلادی کہ امام موسیٰ کاظمؑ کا انتقال نہیں ہوا ہے' کیونکہ وہ قائم آل محمدؑ ہیں (اذاعافی الشیعة انه لایموت لانه هو القائم)۔ روایت کے آخر میں تصریح کی گئی ہے کہ شیعوں پر یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ ان دونوں نے اپنے پاس موجود مال ہڑپ کرنے کے لیے یہ افواہ پھیلائی ہے۔(۲)

یہ انحراف پیدا ہونے کا ایک اور سبب' جیسا کہ اس سے پہلے بھی بعض ائمہؑ کے معاملے میں پیش آچکا تھا' وہ ''قائم'' اور ''مہدی'' کا مفہوم تھا' جسے شیعوں کے درمیان بہت قوت حاصل تھی' اگرچہ اہلِ سنت کے منابع (sources) میں بھی یہ بکثرت موجود ہے۔ بعض مواقع پر اس انحراف کی وجہ لوگوں کی مفاد پرستی نہ تھی' بلکہ بعض لوگ مہدیٔ آلِ محمدؑ پر اعتقاد رکھتے لیکن اس کے درست مصداق کو نہ جاننے کی وجہ سے اس انحراف کا شکار ہو گئے تھے۔ واضح رہے کہ اس انحراف میں غلو کا بھی کچھ اثر ضرور تھا۔ بہرحال امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی شہادت کے بعد ایک گروہ کی طرف سے آپ کی مہدویت کے مسئلے (یعنی آپ کے ہنوز زندہ ہونے اور آپ کے غیبت اختیار کرنے) کی ترویج کی گئی۔

شیخ مفید نے کتاب ''الفصول المختارۃ'' میں ان گروہ بندیوں کی وضاحت کی ہے جو امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی شہادت کے بعد شیعوں کے درمیان پیدا ہو گئی تھیں۔ ان سے پہلے سعد بن عبداللہ اشعری نے بھی ''المقالات والفرق'' میں اس سے ملتی جلتی باتیں لکھی تھیں۔ ان تمام باتوں کو اس مختصر کتاب میں درج کرنا ممکن نہیں' لیکن ان کی جانب مختصر اشارہ فائدے سے خالی نہیں ہے۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی شہادت کے بعد ''قطعیہ'' اور ''واقفیہ'' کے نام سے دو رجحانات کے حامل گروہ سامنے

۱۔ اعلام الوریٰ۔ ص ۳۰۳

۲۔ رجال کشی۔ ص ۴۶۰

آئے۔ قطعیہ نے امام موسیٰ کاظمؑ کی وفات کی تائید کی اور امام علی رضاؑ کی امامت کو قبول کیا۔(۱) لیکن واقفیہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی وفات کا یقین نہ ہونے کا بہانہ بنا کر انہی کی امامت پر باقی رہے یا اُن کی مہدویت کا عقیدہ اپنا لیا۔ شہرستانی نے قطعیہ اور اثناعشریہ کو ایک ہی قرار دیا ہے جو امام رضاؑ کے بعد بارہویں امام تک اعتقاد رکھتے ہیں۔

بہرصورت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی مہدویت یا قائمیت کا عقیدہ شیعوں کے درمیان انحراف کی پیدائش کا سبب بنا اور کچھ لوگ امام کے بغیر اور درحقیقت سرگرداں و پریشاں ہو کر رہ گئے۔(۲) اس انحراف کا نتیجہ یہ نکلا کہ محمد بن بشیر نامی ایک غالی نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور ''ممطورہ'' نامی ایک فرقہ بنا ڈالا جو حلول اور تناسخ کا قائل تھا اور محرمات کو مباح سمجھتا تھا۔ یہ نام جو ''کلاب ممطورہ'' سے اخذ کیا گیا ہے(۳) انہیں ایک شیعہ متکلم علی بن اسماعیل نے دیا تھا اور بعد میں وہ اسی نام سے مشہور ہوئے۔(۴) اشعری نے ان کے بعض عقائد کی جزئیات کا ذکر کیا ہے اور پھر اضافہ کرتا ہے کہ: مَذَاهِبُهُم فِي التَّفْوِيضِ مَذَاهِبُ الغُلَاةِ المُفْرِطَة. (تفویض (خدا کے اختیارات ائمہ کو سونپ دینے) کے بارے میں ان کا عقیدہ وہی غالیوں والا عقیدہ ہے)۔ اشعری کی کتاب کی تالیف کے زمانے تک یہ فرقہ باقی تھا۔(۵)

اشعری اور شیخ مفید دونوں نے ایک اور عقیدے کی پیدائش کی جانب اشارہ کیا ہے جو یہ ہے کہ: ''بعد میں آنے والے تمام ائمہ صرف امام موسیٰ کاظمؑ کے امیر ہیں کیونکہ آپ ہنوز زندہ اور غائب ہیں۔'' اس عقیدے کی بنیاد بھی مہدویت پر ہے۔(۶)

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب شیعہ فکر اور علوم و معارف اپنی کامل شکل اور وسیع سطح پر شیعوں کے درمیان واضح طور پر موجود تھے۔ اسی لیے ان جزی انحرافات نے اصلِ تشیع پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ امام محمد باقر علیہ السلام کے دور کے بعد سے نیز امام جعفر صادق اور امام موسیٰ کاظم علیہما السلام کے توسط سے شیعوں کی ایک کثیر تعداد اس طرح تربیت

۱۔ دیکھئے: الفرق بین الفرق بغدادی۔ تحقیق: محمد زاہد الکوثری۔ ص ۴۰، الملل والنحل شہرستانی۔ ج ۱۔ ص ۱۵۰۔ قطعیہ کی اصطلاح کا اطلاق بعد میں امامِ زمانہؑ کے دور تک شیعہ اثناعشری پر ہوتا تھا۔

۲۔ امام رضاؑ نے ایک روایت میں ان کا انجام اس طرح بیان فرمایا ہے: ''يَعِيشُونَ حَيَارىٰ وَيَمُوتُونَ زَنَادِقَة.'' (حیرانی و سرگردانی کے عالم میں زندگی گزاری اور کفر کی حالت میں مر گئے)

۳۔ وہ کتے جو بارش کے پانی کی وجہ سے بھیگ گئے ہوں۔ لِأَنَّ الْكِلَابَ إِذَا أَصَابَهَا الْمَطَرُ فَهِيَ أَنْتَنُ مِنَ الْجِيَفِ.

۴۔ دیکھئے: الملل والنحل۔ ج ۱۔ ص ۱۵۰، تعلیقات مقالات والفرق از مشکور۔ ص ۲۳۹

۵۔ المقالات والفرق۔ ص ۹۳ اور کشی کی روایت کے مطابق (ص ۴۶۰) امام حسن عسکریؑ کے زمانے تک تھے۔

۶۔ الفصول المختار۔ ص ۲۵۴، المقالات والفرق۔ ص ۹۰

پا چکی تھی کہ ان میں سے ہر ایک اپنے مقام پر شیعہ فقہ اور کلام میں ایک ستون کی حیثیت رکھتا تھا۔ دوسری طرف اکثر منحرفین ایسے ضعیف النفس لوگ تھے جن کے لیے مخصوص حالات کے سوا پھلنا پھولنا ممکن نہ تھا۔ ہشام بن حکم، ہشام بن سالم، یونس بن عبدالرحمن اور علی بن اسماعیل اُن بزرگوں میں سے تھے جو شیعہ مذہب میں انحرافات کے رسوخ کی راہ میں حائل رہے، اور اس کے بعد سے شیعہ احادیث کو تالیف شدہ اصولوں کی مدد سے محفوظ رکھا گیا۔ یہ حالت کلینی اور صدوق کے زمانے تک جاری رہی، جنہوں نے ان اصولوں کو منظم طور پر جمع کیا۔

ولی عہدی کا مسئلہ

امام علی رضا علیہ السلام کی زندگی کا اہم ترین باب آپ کی ولی عہدی کا مسئلہ ہے۔ اس مختصر گفتگو میں ہم اس مسئلے کے بعض گوشے واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔ امام رضاؑ کی ولی عہدی سے تعلق رکھنے والے اہم ترین نکات یہ ہیں:

۱۔ اس کے ذریعے مامون کیا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔

۲۔ مامون کا مقصد ناکام بنانے کے لیے امام رضاؑ کا مؤقف۔

اس مسئلے پر ہمارے معزز اور گرامی قدر استاد علامہ سید جعفر مرتضٰی نے اپنی گرانقدر کتاب ''الحیاۃ السیاسیہ للامام الرضاؑ'' میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ہم اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس مسئلے کے بنیادی ترین نکات بیان کرتے ہیں۔

استاد نے اپنی کتاب میں مامون الرشید کے اس اقدام کے محرک کے طور پر گیارہ نکات بیان کیے ہیں، اور ہر نکتے کے لیے قرائن اور شواہد بھی پیش کیے ہیں۔(۱) جو کچھ ہم یہاں پیش کریں گے، یہ وہ باتیں ہوں گی جو خود مامون یا امامؑ کے کلمات سے اخذ کی جاسکتی ہیں۔ تفصیلات جاننے کے لیے ہم قارئین کو اس کتاب کے مطالعے کی دعوت دیں گے۔

ولی عہدی کا مسئلہ اٹھانے سے مامون کا مقصد

بظاہر مامون کے طرزِ عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص ظرافت کے ذریعے یہ بات ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اُس کا یہ اقدام خلوصِ نیت پر مبنی ہے اور علویوں کو حقدار تسلیم کرتے ہوئے، نیز امام رضا علیہ السلام سے انتہائی محبت کی وجہ سے وہ یہ قدم اٹھا رہا ہے۔ مامون نے یہ ریاکاری اتنی مہارت سے انجام دی تھی کہ بعد میں (جیسا کہ اربلی نے سید بن طاؤس کے بارے میں کہا ہے، اور خود اربلی کے بھی اسی جانب واضح رجحان کی نشاندہی ہوتی ہے) امام رضاؑ کی شہادت کے مسئلے میں مامون کو بے قصور سمجھا جاتا تھا اور اسے ایک شیعہ، یا امامؑ کی جانب مائل شخص قرار دیا جاتا تھا۔(۲) واضح سی

۱۔ حیاۃ السیاسیہ للامام الرضاؑ (طبع بیروت) ص ۲۱۲۔۲۳۲

۲۔ کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۲۸۲۔۲۸۳

بات ہے کہ ایک علوی کو خلافت سونپنا' وہ بھی ایسے حالات میں جبکہ عباسی حکمران شدت کے ساتھ علویوں کی سرکوبی کیا کرتے تھے' ہر انسان کو مامون کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا کر سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا دو بزرگ بھی اسی غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔ (۱)

مامون کی باتوں نیز خود امام حقؑ' آپ کے بعض اصحاب اور شیعوں کے کلمات کے مطالعے سے اس ماجرے کی حقیقت معلوم ہو سکتی ہے۔ جس چیز کو پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہے' وہ یہ ہے کہ مامون غیر معمولی سیاسی ذہانت کا مالک تھا' اور اس نے اپنی خلافت کے آغاز ہی سے اپنی راہ میں پیش آنے والی تمام مشکلات کو یکے بعد دیگرے حل کیا تھا اور اپنی بنیادوں کو مضبوط اور اپنی حاکمیت کو مستحکم کیا تھا۔

مامون کی ریاکاری اور اُس کے مذہبی رجحان سے قطعِ نظر ایک اور قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ مامون کے دور میں موجود اہم مذہبی رجحانات میں امامی شیعوں اور زیدیوں کے علاوہ اہلِ حدیث اور معتزلہ کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ اہلِ حدیث ایک عثمانی فرقہ ہونے کے ناطے امیر المومنینؑ کے خلاف مؤقف رکھتے تھے' لیکن معتزلہ کے درمیان (بصرہ میں اُن کے قدما کے برخلاف جو عثمانی مذہب تھے) بغداد میں امیر المومنینؑ کے بارے میں مثبت رجحان پیدا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے حضرت علیؑ کے بارے میں مثبت رائے رکھنے والوں پر اہلِ حدیث کی جانب سے تشیع کا الزام لگایا جانے لگا۔ اسی بنا پر معتزلیوں پر بھی شیعیت کا الزام لگایا گیا۔ کیونکہ اہلِ حدیث کی نظر میں حضرت علیؑ کے بارے میں مثبت رائے رکھنا' حتیٰ اُن کو چوتھا خلیفہ ماننا بھی شیعہ ہونے کے لیے کافی تھا۔ اگرچہ بعد میں علمائے رجال کے یہاں اس مفہوم میں تبدیلیاں پیدا ہوئیں' جن پر گفتگو کا یہاں موقع نہیں ہے۔ (۲)

اس زمانے میں اہلِ سنت کے یہاں تشیع کا الزام لگانے کا ایسا بازار گرم تھا کہ انہوں نے خود مامون کو بھی شیعہ قرار دیا اور اہلِ سنت کی بنیادی کتب میں اس کا یہی مذہب بیان کیا گیا ہے۔

کہا گیا کہ مامون علی علیہ السلام کو تمام خلفا پر مقدم سمجھتا تھا۔ اسی بنا پر مامون کو تاریخ میں ہر پیمانے سے ایک مکمل شیعہ فرد قرار دیا گیا۔ (۳) اس بات کی جانب اشارہ لازم ہے کہ مامون کو ایک معتزلی اور امیر المومنینؑ کے بارے میں اس

۱۔ حال ہی میں جناب حسن امین نے بھی ایک مقالے میں تاریخی اعتبار سے اس پر گفتگو کرتے ہوئے اس کی تائید کی ہے۔

۲۔ تاریخ تشیع در ایران تا قرن دہم ہجری میں ایک فصل کو ہم نے تشیع کی مختلف اقسام سے مخصوص کیا ہے اور اس بارے میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

۳۔ مروج الذہب۔ ج ۳۔ ص ۴۱۷۔ ۴۵۴' کامل ابن اثیر۔ ج ۶۔ ص ۴۰۸۔ ہم نے تاریخ تشیع در ایران تا قرن دہم ہجری کی جلد ۲ صفحہ ۲۷۹۔ ۲۸۰ پر مامون کے تشیع کی جانب رجحان کے عنوان کے تحت علیحدہ سے گفتگو کی ہے۔

قسم کا عقیدہ رکھنے والے فرد کے طور پر قبول کر لینے سے امام رضا کے حوالے سے اُس کی سیاسی پالیسی اور اُس کی طرف سے آپ کو اپنی سیاست کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی کسی طرح نفی نہیں ہوتی۔ اگرچہ یہ احتمال دیا جاسکتا ہے کہ اُس کے وہ عقائد بھی ایک سیاسی نمائش کے علاوہ کچھ اور نہ تھے۔ بہر صورت اس بارے میں زیادہ گفتگو لوگوں کی باطنی نیت کی جانب پلٹتی ہے اور ایک مؤرخ اسے نہیں جان سکتا۔

بہر صورت اس اقدام سے مامون کا مقصد کیا تھا؟

جب مامون کو عباسی حکومت کے بہی خواہوں کی جانب سے امام رضا علیہ السلام کی ولی عہدی پر اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا تو ان کے جواب میں اُس نے کچھ باتیں کہیں جن سے اس بارے میں اُس کی سیاست کے اصل خطوط واضح ہو جاتے ہیں:

"مامون نے کہا: یہ شخص اپنے کاموں کو ہم سے پوشیدہ رکھتا تھا اور لوگوں کو اپنی امامت کی دعوت دیتا تھا۔ ہم نے اسے اس لیے اپنا ولی عہد بنایا ہے کہ وہ لوگوں کو ہماری طرف دعوت دے اور ہماری سلطنت اور خلافت کا اعتراف کرے اور اس کے ساتھ ساتھ اس پر فریفتہ ہونے والے لوگ بھی یہ جان لیں کہ وہ ایسا نہیں ہے جیسا کہ وہ دعویٰ کرتا ہے اور یہ امر (خلافت) ہمارا حق ہے اس کا نہیں۔ ہمیں یہ بھی خوف تھا کہ اگر ہم نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تو کہیں وہ ہمارے معاملات میں ایسا رخنہ نہ ڈال دے جسے ہم پُر نہ کرسکیں اور ہمارے خلاف کوئی ایسا قدم نہ اٹھالے جس کا ہم مقابلہ نہ کرسکیں۔ اب جبکہ ہم نے اس کے ساتھ یہ رویہ اختیار کرلیا ہے اور اس کے معاملے میں غلطی کے مرتکب ہو چکے ہیں اور اُس کو بڑا بنا کر اپنے آپ کو ہلاکت کے گڑھے کے کنارے پر لے آئے ہیں تو ہمیں اب اس کے بارے میں سستی نہیں کرنی چاہیے۔ اس لیے اب ہمیں آہستہ آہستہ اُس کی شخصیت اور عظمت کو کم کرنا چاہیے تا کہ لوگوں کے سامنے اس کو ایسی صورت میں پیش کریں کہ ان کی نظر میں وہ لائقِ خلافت نہ رہے اس کے بعد ہم اس کے بارے میں ایسی تدبیر کریں گے جو اس کی طرف سے ہمیں لاحق خطرات کی روک تھام کرسکے۔"(۱)

مامون نے اپنی گفتگو کی ابتدا ہی میں اپنے اس اقدام کا مقصد بیان کر دیا ہے۔ یعنی اگر امام رضا اس کی ولی عہدی کو قبول کرلیں تو اس کا لازمہ یہ ہے کہ انھوں نے بنی عباس کی خلافت کو جائز مان لیا ہے۔ خود یہ بات کہ علویوں کی جانب سے عباسیوں کی خلافت کو قبول کرلیا گیا ہے عباسیوں کے لیے ایک بڑی کامیابی تھی۔ اس طرح ان دو خاندانوں کے درمیان

۱۔ عیون اخبار الرضا۔ ج ۲۔ ص ۱۶۷۔ ۱۶۸

جو اختلاف اور دیرینہ دشمنی موجود تھی وہ خود بخود عباسیوں کے مفاد میں ختم ہو جاتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ امام رضا علیہ السلام کے دربار خلافت میں شامل ہو جانے کی وجہ سے ان کی سرگرمیاں کنٹرول اور محدود ہو جاتیں اور پھر وہ اپنے آپ کو امام قرار نہیں دے سکتے تھے۔ کیونکہ اس صورت میں وہ لوگوں کو نہ صرف اپنی ولی عہدی قبول کرنے کی دعوت دیتے بلکہ اس خلیفہ کے لیے بھی دعوت دیتے جس کی جانشینی آپ نے قبول کی تھی۔ اس طرح سے اس پہلو کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جاتا کہ امامت اولادِ علیؑ کا مستقل حق ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ مامون کی ولی عہدی قبول کرنے سے امام علی رضا علیہ السلام کے مقام و مرتبے میں کمی واقع ہو جاتی اور آپ اپنے حامیوں کی نظروں سے گر جاتے اور پھر کوئی بھی آپ کو ایک مقدس اور نیک شخص کے طور پر قبول نہ کرتا اور معلوم ہو جاتا کہ جس چیز کا وہ دعویٰ کرتے ہیں وہ کسی مقدار میں بھی اُن کے پاس نہیں ہے۔

ابوصلت ہروی نے بھی امام رضا علیہ السلام کو ولی عہد بنانے کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے: جَعَلَ لَهُ وِلَايَةَ الْعَهْدِ لِيُرِيَ النَّاسَ اَنَّهُ رَاغِبٌ فِي الدُّنْيَا فَيَسْقُطَ مَحَلُّهُ مِنْ نُفُوسِهِمْ. (اس نے امامؑ کو ولی عہد بنایا تاکہ لوگوں کو دکھائے کہ وہ دنیا پرست ہیں اور اس طرح لوگوں کی نظروں میں ان کا مقام گر جائے)۔(۱)

حقیقت یہ ہے کہ لوگ ہمیشہ علویوں اور خاص طور پر ائمہ اہل بیتؑ کے لیے ایک خاص احترام کے قائل تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ اُن پر غیر معمولی اعتقاد اور اعتماد کیا کرتے تھے۔ تقدس کا جو ہالہ ائمہؑ کے گرد پایا جاتا تھا اُس کی باعث تمام لوگوں کے سر ان کے آگے جھک جاتے تھے اور لوگوں میں اُن کے سامنے تسلیم کے جذبات پیدا ہو جاتے تھے۔ مامون کی کوشش تھی کہ ائمہؑ کے اس تقدس کو ختم کردے اور کم از کم انہیں ان عام انسانوں کی طرح پیش کرے جو اقتدار پر فائز ہو کر ظلم وستم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس مسئلے کی قفطی نے اپنی کتاب میں واضح طور پر نشاندہی کی ہے۔(۲) اور کیونکہ خود خلافت اور سیاست لوگوں کی نگاہ میں ایک قسم کی برائی سمجھی جاتی تھی اس لیے ایک مہذب شخص کو اس میں ڈالنے سے خود بخود اس کا اثر ورسوخ کم ہو سکتا تھا۔ یہ سوچ کہ زہد اور خلافت ایک ساتھ نہیں چل سکتے اور وہ بھی ایسی خلافت جس کے بانی عباسی تھے امامؑ کے مقام و مرتبے کو کم کرتی تھی۔ اسی وجہ سے جب امامؑ پر اعتراض کرتے ہوئے کہا جاتا تھا: آپ نے دنیا سے اس قدر پرہیز کا اظہار کرنے کے باوجود مامون کی ولی عہدی کو کیوں قبول کر لیا؟ تو امامؑ جواب دیا کرتے تھے: "قَدْ عَلِمَ اللّٰهُ كَرَاهَتِي." (خدا جانتا ہے کہ میں اسے کتنا ناپسند کرتا ہوں)۔(۳)

۱۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۲۔ ص ۲۴۱

۲۔ تاریخ الحکماء۔ ص ۲۲۱۔ ۲۲۲ نقل از حیاۃ الامام الرضاؑ۔ ص ۲۲۴

۳۔ بحار الانوار۔ ج ۴۹۔ ص ۱۳۰ علل الشرائع۔ ص ۲۳۸ حیاۃ الامام الرضاؑ۔ ص ۲۳۲

یہ مقاصد جنہیں ہم نے بیان کیا' ان کے علاوہ مزید نکات کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ اس طرح سے مامون امامؑ کو زیادہ بہتر طور پر کنٹرول کر سکتا تھا۔ اسی لیے اس نے امامؑ (جو اس کے چنگل میں تھے) پر متعدد جاسوس اور محافظ متعین کیے ہوئے تھے' تاکہ وہ امامؑ کی خبریں اس تک پہنچائیں۔(۱) یہی سبب تھا کہ امامؑ اپنے سچے شیعوں سے بھی دور ہو گئے تھے۔ مامون کے اپنے بھائی امین کے خلاف جنگ کرنے کی وجہ سے بنی عباس مامون سے دور ہو گئے تھے' یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امام رضاؑ کو دربار خلافت میں لا کر اور یہ ظاہر کر کے کہ اُسے علویوں کی حمایت حاصل ہو گئی ہے وہ عباسیوں کو خوفزدہ کر کے انہیں دوبارہ اپنے قریب لانا چاہتا ہو۔(۲)

علویوں کی شورشوں نے مامون کو انتہائی پریشان کر رکھا تھا' یہ اُن مسائل میں سے تھیں جنہیں وہ کسی نہ کسی صورت حل کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا جب بعد میں اُس نے عبداللہ بن موسیٰ کو اُن کے بھائی کی جگہ ولی عہد بنانے کے لیے خط لکھا' تو اس میں تحریر تھا کہ: مَاظَنَنْتُ اَنَّ اَحَداً مِنْ آلِ اَبِی طَالِبٍ یَخَافُنِی بَعْدَمَا عَمِلْتُہُ بِالرِّضَا. (میں نہیں سمجھتا کہ رضا کو ولی عہدی حوالے کرنے کے بعد آلِ ابوطالب میں سے کوئی شخص مجھ سے خوفزدہ ہوگا)۔(۳)

لیکن عبداللہ مامون کے دھوکے میں نہیں آئے اور اس پر اپنے بھائی امام رضاؑ کے قتل کا الزام لگایا۔ امام رضاؑ کو ولی عہد بنانا' اسے عوام الناس کی نظروں میں امامؑ کے قتل سے مکمل طور پر بری الذمہ کر سکتا تھا۔ لہٰذا اُس نے امام رضاؑ سے اپنی محبت و عقیدت کا ناٹک رچا کر (جسے بعض لوگ حقیقت پر مبنی سمجھتے تھے) انہیں شہید کر دیا' اور کوئی بظاہر اس کی اس خیانت کی جانب متوجہ بھی نہ ہوا۔(۴)

امامؑ کا ردِ عمل

اس معاملے کا ایک فریق مامون تھا' جس کے امام علی رضا علیہ السلام کو خراسان لانے اور آپ کو ولی عہدی سپرد کرنے کے مقاصد ہم نے بیان کیے۔ اب اس بارے میں امامؑ کے رَدِعمل کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

الف: اس بارے میں امامؑ کی طرف سے سب سے پہلا ردِ عمل یہ ظاہر ہوا کہ آپ نے ابتدا میں خراسان آنے سے انکار

۱۔ عیون اخبار الرضا۔ ج ۲۔ ص ۱۵۱۔۱۵۲' حیاۃ الامام الرضا۔ ص ۲۱۳۔۲۱۴

۲۔ الصلۃ بین التشیع والتصوف۔ ص ۲۲۳۔۲۲۴

۳۔ مقاتل الطالبیین۔ ص ۶۲۸۔ علویوں کے وہ افراد جنہوں نے دوسری صدی ہجری کے اواخر میں بغاوتوں کے علم بلند کیے' وہ یہ ہیں: محمد بن ابراہیم بن اسماعیل' جن کے لشکر کا سپہ سالار ابوالسرایا تھا۔ یمن میں ابراہیم بن موسیٰ بن جعفر۔ بصرہ میں زید بن موسیٰ بن جعفر۔ دیکھیے: مسند الامام الرضا۔ ج ۱۔ ص ۵۰۔۵۱

۴۔ دیکھیے: حیاۃ الامام الرضا۔ ص ۲۳۱ اور اس کے بعد

کیا۔ ظاہر ہے کہ خود یہ انکار مامون کے لیے ایک کامیابی شمار ہو سکتی تھی۔ امامؑ نے اس حد تک مخالفت کی کہ ''رجاء بن ابی ضحاک'' جو مامون کی طرف سے آیا تھا' امامؑ کو زبردستی ''مرو'' لے جانے پر مجبور ہو گیا۔ کلینی نے یاسر خادم اور ریان بن صلت سے نقل کیا ہے کہ: جب امین کا قصہ تمام ہوا اور مامون کی حکومت مستحکم ہو گئی تو اس نے امامؑ کو ایک خط لکھا اور اُن سے خراسان آنے کی درخواست کی۔ امامؑ نے اس کی درخواست کا مثبت جواب نہیں دیا: فَلَمْ يَزَلِ الْمَامُونُ يُكَاتِبُهُ فِي ذٰلِكَ حَتّٰى عَلِمَ اَنْ لَا مَحِيصَ لَه وَلَا يَكُفُّ عَنْهُ. (۱) مامون مسلسل اس بارے میں خطوط لکھتا رہا' یہاں تک کہ امامؑ کے پاس گریز کا کوئی راستہ نہ رہا' کیونکہ مامون اس درخواست سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھا۔

صدوق نے معول بجستانی سے نقل کیا ہے: جب خراسان سے ایک نمائندہ امامؑ کو لینے کے لیے مدینہ آیا' تو میں اس وقت وہیں موجود تھا۔ امامؑ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وداع ہونے کی غرض سے حرم رسولؐ میں تشریف لائے۔ میں نے انہیں دیکھا کہ وہ بار بار حرم سے باہر تشریف لاتے اور پھر قبر رسول کی طرف لوٹ جاتے اور بلند آواز سے گریہ فرماتے تھے۔ میں امامؑ کے قریب گیا اور سلام عرض کر کے آپ سے اس کیفیت کا سبب دریافت کیا۔ امامؑ نے جواب دیا: میں اپنے جد کے جوار سے جدا ہو کر عالمِ غربت میں اس دنیا سے رخصت ہوں گا۔ (۲)

مزید برآں' جب امامؑ خراسان جا رہے تھے' تو آپ نے اپنے افرادِ خانہ میں سے کسی کو اپنے ساتھ نہ لیا۔ یہ خود اس بات کی ایک واضح دلیل ہے کہ امامؑ کی نظر میں اس سفر کا کوئی روشن مستقبل نہیں تھا اور اس سفر سے انہیں کوئی امید نہیں تھی۔

حسن بن علی وشاء سے منقول ہے کہ امامؑ نے مجھ سے فرمایا:

''اِنِّي حَيْثُ اَرَادُوا الْخُرُوجَ بِي مِنَ الْمَدِيْنَةِ جَمَعْتُ عِيَالِي فَاَمَرْتُهُم اَنْ يَبْكُوا عَلَيَّ حَتّٰى اَسْمَعَ ثُمَّ فَرَّقْتُ فِيهِم اثْنَي عَشَرَ اَلْفَ دِيْنَارٍ قُلْتُ: اَمَا اِنِّي لَا اَرْجِعُ اِلٰى عِيَالِي اَبَداً.'' (۳)

''جب انہوں نے مجھے مدینہ سے لے جانے کا قصد کیا' تو میں نے اپنے اہل وعیال کو جمع کیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ میرے لیے گریہ کریں' تا کہ میں اُن کے گریے کو سن لوں۔ پھر میں نے ان کے درمیان بارہ ہزار دینار تقسیم کیے اور کہا کہ اب میں تمہارے پاس دوبارہ پلٹ کر نہیں آؤں گا۔''

بے شک امامؑ کے یہ اقدامات سمجھدار لوگوں کو خصوصاً شیعوں کو جو براہِ راست آپ سے رابطے میں تھے' اس جانب متوجہ کر سکتے تھے کہ امامؑ نے اس سفر کو مجبوراً قبول کیا ہے۔ جیسا کہ بعد میں آپ نے یہ بات اپنے نزدیکی اصحاب کو بتائی بھی

۱۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۴۸۸' مسند الامام الرضا۔ ج ۱۔ ص ۶۳

۲۔ عیون اخبار الرضا۔ ج ۲۔ ص ۲۱۸

۳۔ عیون اخبار الرضا۔ ج ۲۔ ص ۲۱۹' اثبات الوصیہ۔ ص ۲۰۳' مسند الامام الرضا۔ ج ۱۔ ج ۲۔ ص ۱۶۹

ہے۔ انہی اصحاب میں سے عبدالسلام ہروی سے منقول ہے: وَاللّٰہِ مَا دَخَلَ الرِّضَا علیہ السلام فی ھٰذَا الْأَمْرِ طَائِعاً. (خدا کی قسم امام رضا علیہ السلام نے اپنی مرضی سے یہ کام انجام نہیں دیا ہے)۔(۱)

بہر صورت امامؑ کو مدینہ سے نکال کر بصرہ کے راستے فارس اور وہاں سے خراسان لایا گیا۔(۲)

یہیں پر مامون نے امام رضاؑ سے درخواست کی کہ وہ خلافت قبول فرمائیں۔ مامون کے شدید اصرار اور امامؑ کے مسلسل انکار کے بعد آخر کار ولی عہدی آپ پر مسلط کر دی گئی۔ جیسا کہ استاد جعفر مرتضی عاملی نے تفصیل سے گفتگو کی ہے کہ امامؑ کو خلافت کی پیشکش سنجیدگی پر مبنی نہیں تھی، بالکل اسی طرح ولی عہدی قبول نہ کرنے کی صورت میں مامون کی جانب سے امامؑ کو قتل کی دھمکی اس دعوے کی قابلِ اطمینان دلیل ہو سکتی ہے۔(۳) کیونکہ مامون اعتقادی لحاظ سے امامؑ سے جس عقیدت اور محبت کا اظہار کیا کرتا تھا قتل کی دھمکی اُس سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اگر وہ واقعاً امامؑ کا معتقد تھا، تو اُس کی جانب سے امامؑ کو نمازِ عید پڑھانے سے روکنا درست نہیں تھا۔

بہر کیف مامون کی جانب سے ولی عہدی قبول کرنے پر اصرار اور ساتھ ہی اسے قبول نہ کرنے کی صورت میں امامؑ کو قتل کی دھمکی نے آپ کے لیے ایسی صورتحال پیدا کر دی تھی کہ آپ ولی عہدی قبول کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔(۴) اس کے باوجود امامؑ نے پوری کوشش کی کہ مامون اپنی اس سیاست سے اپنے مطلوبہ مقاصد حاصل نہ کر سکے۔ یہ سلسلہ امامؑ اور مامون کے درمیان دو ماہ کی بحث و تکرار کے بعد اپنے انجام کو پہنچا۔(۵) یہ سب اس حال میں ہوا کہ امامؑ "بَاکٍ حَزِین" (غمگین اور گریہ کناں تھے)۔(۶)

جب خراسان نہ آنے اور ولی عہدی قبول نہ کرنے کے سلسلے میں امامؑ کی کوششیں بارآور ثابت نہ ہوئیں، تو آپ نے اس معاملے کو اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس بارے میں اہم نکتہ یہ ہے کہ امامؑ نے

۱۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۲۔ ص ۱۴۰

۲۔ امام رضاؑ کے خراسان کے سفر کے راستے کے تاریخی جغرافیہ کے بارے میں ایک علیحدہ کتاب تالیف ہوئی ہے۔ اس بارے میں مزید معلومات کے خواہشمند شائقین اس کتاب کا مطالعہ کریں۔

۳۔ حیاۃ الامام الرضاؑ۔ ص ۲۸۵۔ ۲۹۸۔ ولی عہدی قبول کرنے کے لیے امامؑ کو مجبور کرنے کے بارے میں دیکھیے: علل الشرائع۔ ج ۱۔ ص ۲۲۶۔ ۲۳۸، عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۲۔ ص ۱۳۹، امالی صدوق۔ ص ۴۳، بحار الانوار۔ ج ۴۹۔ ص ۲۹، مجموعہ آثار۔ ص ۲۱۶

۴۔ دیکھیے: مقاتل الطالبیین۔ ص ۳۷۵

۵۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۲۔ ص ۱۴۸

۶۔ ینابیع المودۃ۔ ص ۳۸۴

مامون کے اس اقدام کو اُس کی طرف سے خلافت کے لیے علویوں کا حق قبول کر لینے کے طور پر پیش کیا۔ ہم جانتے ہیں کہ اُس وقت تک عباسی خلفا علویوں کے لیے ایسے کسی حق کے قائل نہ تھے۔ یہ اقدام بخوبی گزشتہ خلفا (خواہ وہ اموی ہوں خواہ عباسی) کے اُن اقدامات کو باطل قرار دیتا تھا جو اس کے برخلاف اٹھائے گئے تھے۔ لہٰذا امامؑ نے فرمایا:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی حَفِظَ مِنَّا مَا ضَیَّعَ النَّاسُ وَرَفَعَ مِنَّا مَا وَضَعُوهُ حَتّٰی لَقَدْ لُعِنَّا عَلٰی مَنَابِرِ الْکُفْرِ ثَمَانِینَ عَاماً وَ کُتِمَتْ فَضَائِلُنَا وَبُذِلَتِ الْأَمْوَالُ فِی الْکِذْبِ عَلَیْنَا وَ اللّٰهُ یَأْبٰی لَنَا إِلَّا أَنْ یُعْلِیَ ذِکْرَنَا وَیُبَیِّنَ فَضْلَنَا." (۱)

"حمد وثنا اس خدا کے لیے ہے جس نے ہماری اس چیز کی حفاظت کی جسے لوگوں نے ضائع کر دیا تھا' اور ہماری قدر ومنزلت کو بلند کیا جسے لوگوں نے پست کر دیا تھا۔ اسّی برس تک کفر کے منبروں سے ہم پر لعن کی گئی' ہمارے فضائل کو چھپایا گیا اور ہم پر جھوٹ باندھنے کے لیے اموال خرچ کیے گئے۔ لیکن خدا نے ہمارے ذکر کی بلندی اور ہمارے فضائل کے اظہار کے علاوہ کچھ اور نہ چاہا۔"

وہ پہلا اجلاس جو ولی عہد کے طور پر امامؑ کا تعارف کرانے کے لیے منعقد ہوا' اُس میں آپ نے اسی تعبیر کو مختصر شکل میں بیان کیا:

"إِنَّ عَلَیْکُمْ حَقّاً بِرَسُولِ اللّٰهِ صلی اللّٰه علیه و آله وسلم وَ لَکُمْ عَلَیْنَا حَقٌّ بِهِ فَإِذَا أَدَّیْتُمْ إِلَیْنَا ذٰلِکَ وَجَبَ عَلَیْنَا الْحَقُّ لَکُم." (۲)

"ہم رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نسبت سے تم پر حق رکھتے ہیں اور تم ہم پر حق رکھتے ہو۔ پس اگر تم ہمارا حق ادا کرو گے' تو ہم بھی تمہارا حق ادا کریں گے۔"

ان میں سب سے زیادہ توجہ طلب نظر آنے والی بات وہ استدلال ہے جسے امامؑ نے ولی عہدی کی تجویز قبول کرنے سے پہلے مامون کے سامنے پیش کیا تھا' اور اُسے ایک خاص انداز سے اس بُری صورتحال میں پھنسا دیا تھا کہ یا تو وہ اپنے اور اپنے آباؤ اجداد کے لیے خلافت کے حق کا انکار کرے' یا پھر امامؑ کا پیچھا چھوڑ دے۔ امامؑ نے اس سے فرمایا:

"إِنْ کَانَتْ هٰذِهِ الْخِلَافَةُ لَکَ وَ اللّٰهُ جَعَلَهَا لَکَ فَلَا یَجُوزُ أَنْ تَخْلَعَ لِبَاساً أَلْبَسَکَ اللّٰهُ وَتَجْعَلَهُ لِغَیْرِکَ وَإِنْ کَانَتِ الْخِلَافَةُ لَیْسَتْ لَکَ فَلَا یَجُوزُ لَکَ أَنْ تَجْعَلَ لِی مَا لَیْسَ

۱۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۲۔ ص ۱۶۴

۲۔ مقاتل الطالبیین۔ ص ۳۷۵

لَکَ."(۱)

"اگر یہ خلافت تمہاری ہے اور خدا نے اسے تمہارے لیے قرار دیا ہے' تو اس صورت میں تمہارے لیے جائز نہیں ہے کہ تم اس لباس کو جسے تمہیں اللہ نے پہنایا ہے اُتار کر دوسرے کے حوالے کردو۔ اور اگر خلافت تمہاری نہیں ہے' تو اس صورت میں تمہارے لیے جائز نہیں ہے کہ جو چیز تمہاری ہے ہی نہیں اسے تم دوسروں کے حوالے کردو۔"

اسی طرح امامؑ نے اپنی ولی عہدی سے سوءِ استفادہ کرنے کے سلسلے میں مامون کی سیاست ناکام بنانے کی غرض سے' ایک سوال کے جواب میں' جس میں آپ سے پوچھا گیا تھا کہ آپ نے ولی عہدی کیوں قبول فرمائی ؟ فرمایا: (میرے ولی عہدی قبول کرنے کی) وہی وجہ تھی جو میرے جد (علی ابن ابی طالبؑ) کے شوریٰ میں شمولیت قبول کرنے کی وجہ تھی۔ (۲)

نیز فرمایا:

"قَدْ عَلِمَ اللّٰہُ کَراھَتِی لِذٰلِکَ فَلَمّا خُیِّرْتُ بَیْنَ قُبُولِ ذٰلِکَ وَبَیْنَ الْقَتْلِ اخْتَرْتُ الْقُبُولَ عَلَی الْقَتْلِ."(۳)

"خدا جانتا ہے کہ مجھے اس (ولی عہدی کو قبول کرنے) سے کتنی کراہت ہے؟ لیکن جب مجھے اس صورتحال کا سامنا کرنا پڑا کہ ولی عہدی قبول کرنے یا قتل ہو جانے میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کروں' تو میں نے مجبوراً ولی عہدی قبول کرنے کو قتل ہو جانے پر ترجیح دی۔"

بہر حال امامؑ کو ولی عہدی قبول کرنے پر مجبور کر دیا گیا' اور اس کے مقابلے میں امامؑ نے بھی بھرپور کوشش کی کہ مامون اپنے مقاصد حاصل نہ کر سکے۔ جو خطبہ امامؑ نے ولی عہد بننے کے بعد دیا تھا' اس میں چند اہم نکات کی جانب اشارہ کیا گیا ہے' اس میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ:

"انَّ اَمیرَ الْمُؤْمِنینَ عَضَّدَهُ اللّٰہُ بِالسَّدادِ وَوَفَّقَهُ لِلرَّشادِ عَرَفَ مِنْ حَقِّنا ما جَهِلَهُ غَیْرُهُ... وَ اِنَّهُ جَعَلَ اِلَیَّ عَهْدَهُ وَ الاِمْرَةَ الْکُبْرىٰ اِنْ بَقیتُ بَعْدَهُ."(۴)

۱۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۲۔ ص ۱۳۸۔ ۱۳۹' روضۃ الواعظین۔ ص ۲۲۳

۲۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۲۔ ص ۱۴۰

۳۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۲۔ ص ۱۳۹

۴۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۲۔ ص ۱۴۶

''امیر المومنین (یعنی مامون) کہ خدا راہِ راست پر چلنے میں اُس کی مدد فرمائے اور اسے راہ ورشد کی توفیق عطا فرمائے' اُس نے ہمارے اُس حق کو قبول کر لیا ہے جس کا دوسروں نے انکار کر دیا تھا۔۔۔اور مجھے عہدہ دیا ہے اور اگر میں اس کے بعد زندہ رہوں' تو مجھے اپنا جانشین بنایا ہے۔''

مامون سے یہ اعتراف لینا کہ ''خلافت اہلِ بیتؑ کا حق ہے'' اس مسئلے کے بنیادی نکات میں سے تھا جس کے لیے امامؑ کوشاں تھے۔ کیونکہ مامون امامؑ کو اپنی خلافت کی تائید پر آمادہ کرنے کی خواہش کے برخلاف' خود اہلِ بیتؑ کی امامت کی تائید کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ یہ الفاظ بھی کہ ''اگر میں اس کے بعد زندہ رہوں'' اس بات کے پیشِ نظر کہ امامؑ کی عمر مامون سے تقریباً بیس برس زیادہ تھی' اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ امامؑ مامون کی بدنیتی کا پول کھولنا چاہتے تھے۔

علاوہ ازیں امامؑ نے یہ شرط بھی رکھی کہ ولی عہدی قبول کرنے کی صورت میں اُن کا سیاسی اور مملکتی امور میں کوئی دخل نہیں ہوگا:

''وَ اَنَا اَقْبَلُ ذٰلِکَ عَلٰی اَنّی لا اُوَلّی اَحداً وَ لا اُعْزِلَ اَحداً وَ لا اُنْقِضَ رَسْماً وَ لا سُنّۃً وَ اَکُونَ فِی الْاَمْرِ مِنْ بَعِیدٍ مُشیراً.''(۱)

''میں اسے اس شرط پر قبول کرتا ہوں کہ نہ کسی کو تعینات کروں گا اور نہ کسی کو معزول کروں گا اور نہ کسی رسم اور روش کو توڑوں گا۔ صرف دور سے ایک مشیر (کی حیثیت سے) رہوں گا۔''

یہ شرط اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ امامؑ نہیں چاہتے تھے کہ موجودہ حالات نیز حکومت کی طرف سے کیے جانے والے کاموں کی ذمے داری اپنے کاندھوں پر لیں اور لوگ یہ گمان کریں کہ حکومتی معاملات امامؑ کی نگرانی میں چلائے جاتے ہیں یا آپ کا اُن میں کوئی عمل دخل ہوتا ہے۔ قدرتی بات ہے کہ ایسی صورت میں کوئی آپ کو موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتا تھا۔ کیونکہ جو مسائل مملکت میں پیش آ رہے تھے اور جن احکامات پر عمل ہو رہا تھا' ان سب کا ذمے دار مامون کو سمجھا جاتا۔ امامؑ نے مامون سے یہ بات منوا کر بہت بڑی کامیابی حاصل کی تھی۔ اس طرح حکومت میں موجودگی کے باوجود آپ نے اپنے آپ کو بدنامی سے بچائے رکھا۔ اسی بنا پر آپ خود فرمایا کرتے تھے:

''اِنّی مَادَخَلْتُ فِی ھٰذَا الْاَمْرِ اِلَّا دُخُولَ الْخارِجِ مِنْہُ.''(۲)

''میں اس حکومت میں داخل ہوا' لیکن اس طرح جیسے اس سے خارج ہوں۔''

۱۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج۲۔ ص ۱۳۸' اور دیکھئے: نور الابصار۔ ص ۱۴۳' ارشاد۔ ص ۳۱۰' کافی۔ ج۱۔ ص ۴۸۷' روضۃ الواعظین۔ ص ۲۲۴۔۲۲۵' اعلام الوریٰ۔ ص ۳۲۰' بحار الانوار۔ ج ۴۹۔ ص ۳۴۔۳۵' حیاۃ الامام الرضاؑ۔ ص ۳۴۷

۲۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج۲۔ ص ۱۳۸

حقیقت یہ تھی کہ امامؑ تقریباً دو سو سال کے انحراف کے نتیجے میں رونما ہونے والی خرابیوں کو قبول نہیں کرسکتے تھے۔
جب محمد بن ابی عباد نے اعتراض آمیز لہجے میں آپ سے کہا کہ: آپ ولی عہدی کی ذمے داری قبول کر کے اس منصب سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے؟ (تاکہ ہمیں بھی کوئی فائدہ حاصل ہو)۔ تو امامؑ نے فرمایا: اگر یہ کام میرے ہاتھ میں ہوتا اور تمہارا مقام بھی میرے نزدیک یہی ہوتا تو (ما کانَتْ نَفَقَتُکَ اِلّا فی کُمِّکَ وَ کُنْتُ کَواحِدٍ مِنَ النّاسِ) بیت المال سے تمہارے حقوق بھی عام لوگوں کے برابر ہوجاتے۔ (۱)

دراصل ایک ایسا معاشرہ جو شیعہ مذہب سے تعلق رکھنے والے ایک امامؑ کی قیادت قبول کرنے پر نہ قادر ہو اور نہ اس کا اہل، اُس میں ولی عہدی کی ذمے داری قبول کرنا ایک بے سود اور عبث کام تھا اور یہ اقدام شیعہ ائمہؑ کی اختیار کردہ زیادہ اصولی پالیسی کی راہ میں رکاوٹ کے سوا کچھ اور ثابت نہیں ہوسکتا تھا۔

امام علی رضاؑ اور مامون

امام علی رضا علیہ السلام کے ولی عہدی قبول کرنے اور آپ کی شہادت کے درمیانی عرصے میں آپ کے اور مامون کے تعلقات کے حوالے سے درج ذیل چند مسائل لائقِ توجہ ہیں:

الف: امام علی رضا علیہ السلام کو "مرو" لانے کے بعد مامون نے متعدد علمی محافل منعقد کروائیں، جن میں مختلف علما شرکت کیا کرتے تھے۔ ان محفلوں میں امامؑ اور دوسروں کے درمیان کافی گفتگوئیں ہوئیں، جن کا موضوع زیادہ تر اعتقادی اور فقہی مسائل ہوا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض گفتگوؤں کا ذکر طبرسی نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ (۲)

ان علمی محفلوں کے انعقاد سے مامون اپنی علم دوستی کی نشاندہی یا اس کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا۔ درحقیقت اسے اس اعتبار سے دوسرے عباسی خلفا سے مختلف سمجھنا چاہیے، خاص طور پر اس کے ذہنی رجحان اور معتزلہ کے ساتھ اس کی ہمراہی نے اسے آمادہ کیا تھا کہ وہ اہلِ حدیث (۳) کے خلاف کھڑا ہو کر ان کا قلع قمع کرے۔ اس کے باوجود یہ مسئلہ یہیں پر ختم نہیں ہوا۔ ان محفلوں کے انعقاد سے مامون کا ایک اور مقصد بھی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ امامؑ کو بحث و مباحثے کے میدان میں کھینچ کر عام لوگوں کے ذہن میں پائے جانے والے ائمہؑ کے ایک خاص علم مثلاً ایک قسم کے علمِ لدنی کے مالک ہونے کے تصور کو ختم کردے۔

۱۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۲۔ ص ۹۰

۲۔ الاحتجاج۔ ج ۲۔ ص ۱۷۱، ۲۳۷ اور دیکھیے: عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۱۔ ص ۱۳۶، ۱۶۷، بحار الانوار۔ ج ۴۹۔ ص ۱۸۹، ۲۱۲

۳۔ اہلِ حدیث کی مجالس میں بھی شرکت کرتے تھے۔ دیکھیے: بحار الانوار جلد ۴۹ صفحہ ۱۸۹

اس بارے میں شیخ صدوق کہتے ہیں: مامون ہر فرقے کے چوٹی کے علما کو امامؑ کے مقابل لے کر آتا تھا' تا کہ ان کے ذریعے سے امامؑ کے حجت ہونے کو غیر معتبر کر دے۔ اس کی وجہ اُس کی امامؑ اور اُن کے علمی اور سماجی مقام سے حسد تھی۔ لیکن آپ کے مقابلے میں آنے والا ہر فرد آپ کے علم و فضل کا اقرار کرتا اور امامؑ اُس کے خلاف جو دلیل پیش کرتے اس کے آگے سر جھکا دیتا۔(۱)

ایک روایت میں آیا ہے کہ ان کاموں سے مامون کا مقصد امامؑ کی حمایت حاصل کرنا تھا' لیکن آپ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: اس کی ظاہرداری کے فریب میں نہ آنا' میں مامون کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کروں گا۔(۲)

یہ محفلیں جو ابتدا میں انہی مقاصد کے لیے منعقد ہوتی تھیں' بتدریج مامون کے لیے مشکلات کھڑی کرنے لگیں۔ جب مامون کو محسوس ہوا کہ اس قسم کی محفلوں کا انعقاد اس کے لیے خطرناک ہے' تو اس نے امامؑ کو محدود کرنے کا قدم اٹھایا۔ عبدالسلام ہروی سے منقول ہے کہ مامون کو اطلاع دی گئی کہ امام رضاؑ نے علمِ کلام کی محفلوں کا انعقاد کیا ہے' جن کی وجہ سے لوگ ان کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ مامون نے محمد بن عمرو طوسی کو مامور کیا کہ وہ لوگوں کو امامؑ کی بزم سے دور کرے۔ اس کے بعد امامؑ نے مامون پر نفرین کی اور اس ضمن میں یہ بھی فرمایا:

"یَابَدِیعُ یا قَوِیُّ یامَنِیعُ یاعَلِیُّ یارَفِیعُ! صَلِّ عَلیٰ مَنْ شَرَّفْتَ الصَّلٰوۃَ بِالصَّلٰوۃِ عَلَیْہِ وَانْتَقِمْ لِی مِمَّنْ ظَلَمَنِی وَ اسْتَخَفَّ بِی وَطَرَدَ الشِّیعَۃَ عَنْ بَابِی۔"(۳)

"اے زمین و آسمان کے خالق' اے بے پایاں قدرت کے مالک' اے وہ پروردگار جس میں کوئی تغیر و تبدل واقع نہیں ہوتا' اے بلند مرتبہ رب! درود بھیج اس پر جس پر درود کے ذریعے تو نے نماز کو شرف عطا کیا اور اس سے میرا انتقام لے جس نے مجھ پر ظلم کیا اور میری بے احترامی کی اور میرے شیعوں کو میرے دَر سے دور کیا۔"

یہ مسئلہ امامؑ کو شہید کرنے کی ایک اہم وجہ بنا۔ احمد بن علی انصاری کہتے ہیں: میں نے ابوصلت سے پوچھا: مامون امام رضاؑ کو قتل کرنے پر کیوں آمادہ ہوا؟ ابوصلت نے کہا: ۔۔۔ مامون نے اس لیے امام رضاؑ کو ولی عہدی دی تھی' کہ لوگوں کو دکھائے کہ امامؑ کو دنیا سے رغبت ہے' اور یوں وہ لوگوں کی نظروں سے گر جائیں۔ لیکن جب لوگوں نے مامون پر امامؑ کی برتری کے سوا کسی اور چیز کا مشاہدہ نہ کیا' تو اس نے تمام اسلامی سرزمینوں کے متکلمین کو مدعو کیا' تا کہ اس طرح امامؑ کو علمی

۱۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج۱۔ ص۱۵۲

۲۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج۲۔ ص۱۸۳؛ بحار الانوار۔ ج۴۹۔ ص۱۸۹

۳۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج۲۔ ص۱۷۱

اعتبار سے شکست دے سکے اور اس طریقے سے عوام الناس کے سامنے امامؑ کے نقائص ثابت ہو جائیں۔ لیکن امامؑ جب بھی کسی یہودی' نصرانی یا کسی دوسرے عالم سے روبرو ہوتے' تو ہمیشہ اس پر برتری حاصل کرتے اور لوگ کہتے کہ: آپ مقامِ خلافت کے لیے مامون سے زیادہ لائق ہیں۔ اس کے جاسوس اسے اس صورتحال سے آگاہ کرتے رہتے' اور یوں مامون امامؑ کو زہر دینے کا مرتکب ہوا۔(۱)

ب: وہ باتیں جن کی وجہ سے امام رضا علیہ السلام اور مامون کے تعلقات خراب ہوئے' ان میں سے ایک امامؑ کا نمازِ عید کے لیے جانا بھی ہے۔ مامون نے امامؑ سے درخواست کی کہ آپ نمازِ عید پڑھائیں' لیکن امامؑ نے ان شرائط کی بنیاد پر جو آپ نے ولی عہدی قبول کرنے سے پہلے رکھی تھیں' نمازِ عید پڑھانے سے معذرت چاہی۔ مامون نے اصرار کیا تو امامؑ نے مجبوراً حامی بھر لی اور فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح نماز ادا کرنے جاؤں گا۔ مامون نے یہ بات قبول کر لی۔ لوگوں کو توقع تھی کہ امامؑ خلفا کی مانند خاص آداب و رسوم کے ساتھ گھر سے نکلیں گے' لیکن انہوں نے حیرت زدہ ہو کر دیکھا کہ امامؑ ننگے پاؤں تکبیر کہتے ہوئے روانہ ہوئے۔ درباری امرا جو اس قسم کے پروگراموں کے لیے مخصوص لباسوں میں تیار ہو کر آئے تھے' یہ دیکھ کر یکبارگی گھوڑوں سے نیچے اتر پڑے اور جوتے اتار کر گریہ کرتے اور تکبیر کہتے ہوئے امامؑ کے پیچھے چل پڑے۔ امامؑ ہر قدم پر تین مرتبہ تکبیر کہتے تھے۔

کہتے ہیں کہ یہ دیکھ کر فضل نے مامون سے کہا: اگر رضا اسی انداز سے مقامِ نماز تک پہنچ گئے' تو لوگ ان کے فریفتہ ہو جائیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ ان سے کہیں کہ وہ واپس لوٹ جائیں۔ لہٰذا مامون نے کسی کو بھیجا اور امامؑ سے درخواست کی کہ وہ واپس لوٹ جائیں۔ امامؑ نے اپنے جوتے طلب کیے' انہیں پہنا' گھوڑے پر سوار ہوئے اور واپس لوٹ گئے۔(۲)

اس واقعے سے مامون نے جو خطرہ محسوس کیا' اُس نے اُسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ امامؑ کو بلانے سے نہ صرف اسے کوئی فائدہ نہیں ہوا' بلکہ ان کی یہاں موجودگی حالات کو مزید اس کے خلاف کر دے گی۔ لہٰذا اُس نے آپ پر جاسوسوں کو مامور کر دیا' تاکہ وہ آپ پر سخت نگرانی رکھیں اور مامون کو پل پل کی اطلاع پہنچائیں' کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مامون کے خلاف کوئی اقدام کر ڈالیں۔ امامؑ کے بارے میں مامون کو اس قسم کی اطلاعات دیے جانے کے کچھ واقعات موجود ہیں۔(۳)

ابوصلت کہتے ہیں: امام رضاؑ جن باتوں کو حق سمجھتے تھے' انہیں بیان کرنے میں مامون سے کسی قسم کا خوف نہیں کھاتے

۱۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۲۔ ص ۲۳۱

۲۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۴۹۰' عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۲۔ ص ۱۴۹' روضۃ الواعظین۔ ص ۲۲۷۔ ۲۲۸

۳۔ دیکھیے: بحار الانوار۔ ج ۴۹۔ ص ۱۳۹' مسند الامام الرضاؑ۔ ج ۱۔ ص ۷۷۔ ۷۸' عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۲۔ ص ۱۵۳ نقل از حیاۃ الامام الرضاؑ۔ ص ۲۱۴

تھے اور اکثر اوقات اسے اس طرح جواب دیتے تھے کہ وہ ناراض ہو جاتا تھا۔ یہ صورتحال مامون کے غضب اور امام رضاؑ سے اس کی دشمنی میں اضافے کا سبب بنی تھی۔ لیکن وہ امامؑ پر اپنے غیظ وغضب اور عداوت کو ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔(۱)

شیخ مفید نے نقل کیا ہے کہ امامؑ مامون کے ساتھ اپنی خصوصی نشستوں میں اُسے نصیحت فرمایا کرتے تھے اور اسے عذاب الٰہی سے ڈراتے تھے اور جن غلط کاموں کا وہ ارتکاب کیا کرتا تھا اُن پر اسے سرزنش کیا کرتے تھے۔ مامون بظاہر امامؑ کی نصیحتوں کو قبول کیا کرتا تھا' لیکن درحقیقت امامؑ کا یہ رَدیہ اُسے بہت ناگوار گزرتا تھا۔ شیخ نے بطور مثال ایسے بعض واقعات کا ذکر بھی کیا ہے۔(۲)

بعض دوسرے مواقع پر امامؑ مامون کے اعمال پر کھلی تنقید بھی کیا کرتے تھے۔ مثلاً جب وہ غیر مسلم ممالک پر فوجی یلغار میں مشغول تھا' اس وقت آپ نے مامون کو خطاب کرکے فرمایا: امت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فکر کیوں نہیں کرتے اور ان کی اصلاح کیوں نہیں کرتے۔(۳)

امامؑ کی شہادت

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ کو "مرو" لاکر مامون جو نتائج حاصل کرنا چاہتا تھا وہ حاصل نہیں کرسکا۔ اگر یہی صورتحال جاری رہتی' تو اُسے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچنے کا امکان تھا۔ مامون' جس نے خلافت کے حصول کے لیے اپنے بھائی تک کو قتل کرنے سے گریز نہیں کیا تھا' اور بعد میں اپنے اُس وزیر کو قتل کرکے بھی اسے ذرہ بھر پشیمانی نہیں ہوئی تھی جس نے اسے خلافت تک پہنچانے کے لیے سخت محنت کی تھی۔ اب ایک بار پھر اُس نے اپنے ظالم اجداد کی طرح' اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے ایک اور شیعہ امامؑ کو قتل کرنے کی سازشیں تیار کیں' اور اپنے خاص سیاسی ہتھکنڈوں سے امام رضاؑ کو شہید کردیا۔(۴) ساتھ ہی اُس نے لوگوں پر یہ ظاہر کیا کہ امامؑ کی وفات نے اسے بہت غمناک اور افسردہ کردیا ہے۔ چنانچہ وہ تین روز تک امامؑ کی قبر سے دور ہونے پر تیار نہ ہوا۔ اس کی فریب کاری اس قدر مؤثر اور آنکھوں میں دھول جھونکنے والی تھی کہ علمائے شیعہ کی ایک قلیل تعداد بھی مامون کے ہاتھوں امامؑ کی شہادت قبول کرنے پر تیار نہیں ہوئی۔ ان علما میں اربلی بھی شامل ہیں۔(۵) حالانکہ شیعہ علما کی اکثریت' اور اُن میں سرفہرست شیخ صدوق' جنہوں نے امام رضاؑ اور

۱۔ عیون اخبار الرضا۔ ج ۲۔ ص ۲۴۱

۲۔ ارشاد (طبع بیروت)۔ ص ۳۱۵

۳۔ دیکھئے: مسند الامام الرضا۔ ج ۱۔ ص ۴۷

۴۔ مقاتل الطالبیین۔ ص ۳۳۷' ارشاد۔ ص ۳۱۶

۵۔ کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۲۸۲۔۲۸۳۔ اس مسئلے کو سید بن طاؤس سے بھی نسبت دی گئی ہے۔

ان سے متعلق روایات کے بارے میں ایک مفصل ترین کتاب تحریر کی ہے' وہ صراحت کے ساتھ اور متعدد روایات کو سند قرار دیتے ہوئے امامؑ کی شہادت مامون کے ہاتھوں قرار دیتے ہیں۔(۱)

امام رضاؑ اور علویوں کے خلاف پروپیگنڈا

پورے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ عباسیوں کی خلافت کے دور میں' اُن کے لیے اہم ترین مشکلات وہ شورشیں تھیں جو علویوں کی جانب سے ان کے خلاف برپا ہوتی تھیں۔ ان شورشوں کی قیادت ابتدا میں زیدیوں کے ہاتھ میں تھی' کچھ عرصے بعد اسماعیلی بھی ان کے ساتھ شامل ہوگئے تھے۔

سفاح کا دور گزرنے کے بعد بھی' جبکہ اسکے دور میں بھی خراسان میں علویوں کے نام سے ایک شیعی قیام (قیامِ شریک بن شیخ المہری) ہوا تھا' منصور' مہدی' ہادی' ہارون وغیرہ کے ادوار میں بھی مسلسل اور ہر کچھ دنوں بعد عباسیوں کی خلافت کے خلاف شورشیں برپا ہوا کرتی تھیں۔ اسی لیے اکثر عباسی خلفا علویوں کو کچلنے کے لیے بے رحمانہ ترین طریقے اختیار کرتے تھے۔ ان شورشوں کے شعلے مسلسل کئی صدیوں تک ہر کچھ مدت بعد وسیع اسلامی مملکت کے کسی نہ کسی گوشے میں آسمان کو چھونے لگتے تھے۔ چنانچہ تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں یہ مسئلہ ایک اہم مشکل کے طور پر درپیش تھا۔ یہاں تک کہ عباسی حکومت کے آخری ایام میں بھی محمد خوارزم شاہ جیسے بعض حکمراں یہ بہانہ کر کے کہ اسلامی خلافت علویوں کا حق ہے' عباسی خلافت کی اطاعت سے سرتابی کی کوشش کیا کرتے تھے۔

ان سرکوبیوں سے ہٹ کر جن کی تفصیل تاریخی کتب' خاص کر اہم کتاب ''مقاتل الطالبیین'' میں مل سکتی ہے' عباسیوں نے معاشرے میں علویوں کو تنہا کرنے کے لیے دوسرے ہتھکنڈے بھی اختیار کیے۔ ان میں سے اہم ترین ہتھکنڈا مختلف صورتوں سے اُن کا وہ زہریلا پروپیگنڈا تھا جس کا مقصد عام لوگوں کی نظر میں علویوں کی علمی شخصیات کو بے اعتبار کرنا تھا۔ خاندانِ رسالت کی عظمت کے بارے میں لوگوں کے اذہان میں شک وشبہ پیدا کرنا' وہ واحد اہم مقصد تھا جس کے حصول کے لیے عباسی مختلف طریقوں سے کوششیں کیا کرتے تھے' اور ہر زمانے میں' اُس زمانے کے حالات وظروف (circumstances) کے مطابق اپنے پروپیگنڈے کو ترتیب دیتے تھے۔

علویوں کے خلاف عباسیوں کے پروپیگنڈے کا ایک طریقہ (جس کا اصل مروج احتمال ہے کہ ہارون الرشید تھا' یا یہ اُس کے زمانے میں پھیلایا گیا تھا) یہ تھا کہ وہ کہتے تھے کہ: علوی اپنے لیے اس حد تک حق کے قائل ہیں کہ تمام دوسرے لوگوں کو اپنا ''عبید'' اور غلام سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں نے یہ مفہوم اُن روایات سے اخذ کیا تھا' جو اہلِ بیتؑ کی برتری یا مفہومِ

۱۔ دیکھئے: مسند الامام الرضاؑ۔ ج ۱۔ ص ۱۲۳۔ ۱۳۹

امامت اور برتری وانتخاب (اصطفاء) کے بارے میں خود نبی اکرمؐ اور ائمۂ اہل بیتؑ سے منقول تھیں۔ وہ اپنے پروپیگنڈے میں ان روایات سے سوءِ استفادہ کیا کرتے تھے۔ حالانکہ ان روایات میں صرف لوگوں کی امامؑ کے سامنے بے چون وچرا اطاعت کا تذکرہ ہے اور یہ مفہوم اس سے بالکل مختلف ہے جسے بنی عباس اس بارے میں اچھالا کرتے تھے۔ کیونکہ بنی عباس اپنے پروپیگنڈے میں لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ علوی تمہیں اپنا غلام سمجھتے ہیں اور اس طرح تمہیں ذلیل وحقیر شمار کرتے ہیں! ظاہر ہے کہ اس قسم کی بے بنیاد افواہیں بعض سادہ لوح عوام کو علویوں سے دوری اختیار کرنے پر آمادہ کرتی تھیں۔

اس بات کے لیے دو تاریخی ثبوت لائے جاسکتے ہیں:

۱۔ وہ واقعہ جو محمد بن ادریس شافعی اور ہارون الرشید کے درمیان پیش آیا۔ شافعی کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو اہلِ بیتؑ سے محبت کا اظہار کیا کرتے تھے' اُن سے عقیدت کا مظاہرہ کرتے تھے اور اس بارے میں انہوں نے کچھ اشعار بھی کہے تھے۔ (۱)

جب شافعی یمن گئے' تو وہاں ایک سال مقیم رہے' اس زمانے میں ہارون کو اطلاع دی گئی کہ شافعی' ایک علوی کے ساتھ مل کر تیرے خلاف قیام کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ خبر سُن کر ہارون غضبناک ہوا اور اُس نے شافعی کو گرفتار کرکے' انہیں دارالخلافہ بھیجنے کا حکم صادر کردیا۔ چنانچہ اُنہیں اُن کے چند ساتھیوں کے ساتھ دارالخلافہ بھیج دیا گیا۔ یہ خبر حنفی فقیہ محمد بن حسن شیبانی تک پہنچی' جو ہارون کے درباری تھے۔ انہوں نے اس خیال سے کہ کہیں اس اقدام کو شافعی کے خلاف اُن کی سازش کا شاخسانہ قرار نہ دیا جائے' ہارون سے درخواست کی کہ وہ شافعی کو معاف کردے۔ لیکن ہارون نے اس درخواست کو مسترد کردیا۔ جب شافعی کو ہارون کے سامنے لایا گیا' تو اُنہوں نے قیام کی اطلاع کو غلط قرار دیا اور کہا: کیا ایسا نہیں ہے کہ علوی دوسرے لوگوں کو اپنا غلام سمجھتے ہیں؟ اس صورت میں' میں کس طرح ایسے کسی شخص کو تیرے خلاف جنگ کے لیے آگے لاسکتا ہوں جو کامیابی کی صورت میں مجھے اپنا غلام بنالے گا؟ ہارون یہ سن کر بہت خوش ہوا اور انہیں علما کی خلعت عطا کی۔ (۲)

ممکن ہے شافعی نے یہ باتیں تقیہ کرتے ہوئے کہی ہوں' لیکن بہرصورت یہ بات سامنے آتی ہے کہ کسی زمانے میں لوگوں کے درمیان یہ افواہ موجود رہی ہے' اور عباسیوں کے سوا کوئی اور اس افواہ کو تیار اور پھیلا نہیں سکتا۔

دوسری تاریخی شہادت وہ روایت ہے جسے بہت سی کتابوں میں نقل کیا گیا ہے۔ مرحوم کلینی نے نقل کیا ہے کہ محمد بن زید طبری نے کہا: میں امام رضاؑ کے سرہانے کھڑا تھا جبکہ بنی ہاشم کے کچھ اور لوگ بھی آپ کے ہمراہ وہاں موجود تھے' انہی

۱۔ دیکھئے: دیوان الامام الشافعی۔ ص ۳۸' ۵۷' ۷۲۔ تاریخ تشیع در ایران۔ ج ۱۔ ص ۴۸

۲۔ الفتوح۔ ج ۸۔ ص ۲۳۸۔ ۲۳۹

میں سے ایک اسحاق بن حسین عباسی بھی تھا۔ امام نے اُس کی طرف رُخ کر کے فرمایا:

"یٰا اِسْحَاقُ اَبَلَغَنِی اَنَّ النَّاسَ یَقُولُونَ اِنَّا نَزْعَمُ اَنَّ النَّاسَ عَبِیدٌ لَنَا. لَا وَقَرَابَتِی مِنْ رَسُولِ اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم مَا قُلْتُهُ وَلَا سَمِعْتُهُ مِنْ آبَائِی قَالَهُ وَلَا بَلَغَنِی عَنْ اَحَدٍ مِنْ آبَائِی قَالَهُ وَلٰکِنِّی اَقُولُ: النَّاسُ عَبِیدٌ لَنَا فِی الطَّاعَةِ مَوَالٍ لَنَا فِی الدِّینِ فَلْیُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ." (۱)

"اے اسحاق! میں نے سنا ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم انہیں اپنا غلام سمجھتے ہیں۔ نہیں، اُس قرابت کی قسم جو میں اللہ کے رسولؐ کے ساتھ رکھتا ہوں، نہ میں نے ایسی کوئی بات کہی ہے اور نہ ہی میں نے اپنے آبا میں سے کسی سے ایسی بات سنی ہے اور نہ ہی میرے اجداد میں سے کسی سے کوئی ایسی روایت مجھ تک پہنچی ہے۔ بلکہ میں کہتا ہوں: لوگ اس بارے میں ہمارے فرمانبردار ہیں کہ ہماری اطاعت اُن پر واجب ہے، اور دینی اعتبار سے وہ ہمارے موالی اور دوست ہیں۔ اس بات کو یہاں حاضر لوگ یہاں غیر موجود لوگوں تک پہنچادیں۔"

ایک اور روایت میں ابوصلت سے منقول ہے کہ میں نے امامؑ سے عرض کیا: لوگ آپ سے کچھ باتیں نقل کرتے ہیں۔ امامؑ نے فرمایا: کیسی باتیں؟ عرض کیا: کہتے ہیں: آپ کا دعویٰ ہے کہ عوام آپ کے غلام ہیں۔ امامؑ نے فرمایا:

"اے خدا! جس نے آسمانوں اور زمین کو پھیلایا ہے، اور جو ظاہر و باطن کو جاننے والا ہے، تو گواہ ہے کہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی، اپنے آبا سے بھی نہیں سنا کہ انہوں نے ایسی بات کہی ہو۔ تو ان مظالم کو جانتا ہے جو ان لوگوں کی جانب سے ہم پر روا رکھے گئے، اور یہ بھی ان میں سے ایک ہے۔

اس کے بعد امامؑ نے میری جانب رُخ کیا اور فرمایا: جیسا کہ ہم سے منسوب کرتے ہیں کہ ہم تمام لوگوں کو اپنا غلام سمجھتے ہیں، تو ہم انہیں کس کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں؟ عرض کیا: آپ نے درست فرمایا اے فرزندِ رسول! اس کے بعد امامؑ نے ولایت اور لوگوں کو غلام سمجھنے کے درمیان فرق بتایا اور فرمایا: اے عبد السلام! کیا تم اس ولایت کے منکر ہو جو خدا نے ہمیں عطا کی ہے؟ میں نے عرض کیا: نہیں۔ میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ میں آپ کی ولایت کو قبول کرتا ہوں۔" (۲)

۱۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۱۸۷، امالی طوسی۔ ج ۱۔ ص ۲۱، امالی مفید۔ ص ۱۵۶، مسند الامام الرضا۔ ج ۱۔ ص ۹۶

۲۔ عیون اخبار الرضا۔ ج ۲۔ ص ۱۸۳، امالی مفید (طبع نجف) ص ۱۴۸، امالی طوسی۔ ج ۱۔ ص ۲۱، مسند الامام الرضا۔ ج ۱۔ ص ۹۶

یہ دوروایتیں بخوبی اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ بنی عباس نے کس طرح ایک برحق مسئلے (ولایت) کو ایک منفی رنگ میں پیش کر کے لوگوں کو ائمہؑ سے دور کرنے کی کوشش کی۔

۲۔ لوگوں میں ائمۂ اہلِ بیتؑ کا چہرہ داغدار کرنے کے لیے جھوٹی حدیثیں گھڑ کر اُن سے منسوب کرنا بھی پروپیگنڈے کی ایک صورت تھی جس میں عباسیوں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی سرگرمِ عمل تھے۔ امام رضا علیہ السلام نے اس خطرناک سیاست کا پردہ بھی چاک کیا۔ آپ سے نقل ہونے والی ایک روایت میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"ہمارے مخالفین ہماری فضیلت میں اپنی طرف سے حدیثیں گھڑ کر انہیں ہم سے منسوب کرتے ہیں۔ اس عمل کے ذریعے وہ کچھ خاص مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

یہ حدیثیں تین قسموں کی ہیں:

الف: غلوآمیز روایات جو ہمیں ہماری حیثیت سے بالاتر ظاہر کرتی ہیں۔

ب: تقصیری روایات جو ہمیں ہماری حیثیت سے کمتر ظاہر کرتی ہیں۔

ج: ایسی روایات جن میں ہمارے دشمنوں کے عیوب بیان کیے گئے ہیں۔

لوگ جب غلوآمیز روایات کو دیکھتے ہیں تو ہمارے شیعوں کی تکفیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ ہماری ربوبیت کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ اور جب دوسری قسم کی روایات کو دیکھتے ہیں تو ہماری اُسی حد کے قائل ہوجاتے ہیں اور جب (ہماری طرف منسوب کی جانے والی روایات میں) ہمارے دشمنوں کے عیوب دیکھتے ہیں تو ہماری طرف بھی وہی نسبتیں دیتے ہیں۔" (۱)

مندرجہ بالا روایت نشاندہی کرتی ہے کہ علویوں سے محبت کرنے والے لوگوں میں اُن کی پوزیشن خراب کرنے کی کس قدر کوشش کی جاتی تھی۔

امام علی رضاؑ اور کلامی مسائل

امام علی رضا علیہ السلام کا دور اُن ادوار میں سے ہے جن میں مختلف مکاتبِ فکر کی طرف سے کلامی بحثیں تیزی سے پھیل رہی تھیں اور ہر موضوع پر اختلافِ رائے پھوٹ پڑا تھا۔ دوگروہ جنہیں ہم "معتزلہ" اور "اہلِ حدیث" کے نام سے پہچانتے ہیں وہ ان بحثوں اور اس فکری کشمکش میں سب سے بڑے حصہ دار تھے۔ عباسی خلفا میں سے بھی ہر ایک ان مسائل میں کسی نہ کسی طرح شریک رہتا تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کا مامون کے ساتھ موازنہ کیا جاسکے۔ مامون

۱۔ بحارالانوار۔ ج ۲۶۔ ص ۲۳۹ از عیون اخبار الرضا۔ ص ۱۶۷۔ ۱۶۸

کے بعد بھی خلفا بھرپور انداز سے فکری اور کلامی مسائل میں الجھے رہے۔

یہ دو گروہ، جن میں سے ایک عقل کو نقل (حدیث) پر ترجیح دیتا تھا اور دوسرا اس کے برعکس (اہلِ حدیث) تھا، ان کے مقابل امام رضاؑ اپنا موقف بیان کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ سے نقل ہونے والی روایات کا ایک بڑا حصہ کلامی موضوعات پر مشتمل ہے اور وہ بھی سوال و جواب یا پھر مناظرے کی صورت میں۔ ایک مدت تک ولی عہدی کے منصب پر ہونے کی وجہ سے اس حوالے سے امام رضاؑ کو نسبتاً کھلی گفتگوؤں کا موقع ملتا تھا، اس لیے اکثر ایسے مناظرے ہوا کرتے تھے۔ خاص طور پر اس لیے کہ مامون بھی ابتدا میں متعدد وجوہات کی بنا پر اس قسم کی محفلوں کے انعقاد کی زیادہ کوششیں کیا کرتا تھا۔

ان مباحث میں سب سے زیادہ امامت کے موضوع پر گفتگو ہوتی تھی، جس کا ایک ستون عقل پر اور دوسرا ستون نقل پر استوار ہے۔ البتہ توحید سے متعلق مختلف مباحث (خصوصاً صفاتِ خدا کا موضوع، جس میں سے صفتِ عدل جو جبر و اختیار سے براہِ راست تعلق رکھتی تھی) کئی صدیوں تک مسلمانوں کے درمیان کلامی مباحثوں کا گرم ترین موضوع رہے۔ ان ابحاث کا آغاز پہلی صدی ہجری کے اواخر میں ہوا اور ان میں وسعت دوسری صدی ہجری کے دوسرے نصف میں پیدا ہوئی۔ ہم نے اس سے پہلے ائمہؑ کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے مختلف مقامات پر کلامی مسائل کا ذکر کیا ہے۔ یہاں ہم کوشش کریں گے کہ کسی طور اس زمانے میں جاری مسائل کا ذکر کریں، جو گزشتہ زمانوں کی نسبت کافی وسیع بھی تھے اور جن کی سطح بھی بلند تھی، اور اس بارے میں امام رضاؑ کا موقف بھی پیش کریں۔ جس نے ان مسائل کے عروج کے دور میں مذہبِ امامیہ کا موقف بیان کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

عباسیوں نے علویوں اور شیعوں پر جو پابندیاں عائد کی ہوئی تھیں، وہ شیعوں کی اکثر اپنے ائمہؑ سے دوری کا سبب بنتی تھیں اور اُن سے اعتقادات کی تعلیم حاصل کرنے میں ان کے لیے مشکلات پیدا کرتی تھیں۔ لہٰذا ''ابی نصر بزنطی'' سے منقول ہے کہ میں نے امامؑ سے عرض کیا: آپ کے شیعوں کا ایک گروہ جبر کا قائل ہو گیا ہے اور ایک گروہ اختیار کا قائل ہے۔ (۱)

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک شیعہ نے امامؑ سے عرض کیا: ''اے فرزندِ رسول! ہمیں اپنے پروردگار کی صفات سے آگاہ فرمائیں، کیونکہ ہمارے اصحاب (شیعوں) کے درمیان اس بارے میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ (۲)

۱۔ التوحید۔ ص ۳۳۸

۲۔ التوحید۔ ص ۴۷

زیادہ اہم مشکل اہلِ حدیث کی جانب سے درپیش تھی' جو اپنے آپ کو آیات وروایات کے صرف ظاہر کو قبول کرنے کا پابند سمجھتے تھے اور مفاد پرستی کی بنیاد پر کی جانے والی ایسی غلط تفاسیر سے متاثر تھے جن کا سرچشمہ اموی یا یہودی تھے اور وہی اس کی ترویج کرتے تھے' چنانچہ اہلِ حدیث بعض آیات وروایات کے ظاہر کو قبول کرتے تھے جو تشبیہ پر دلالت کرتی تھیں۔ یہ لوگ آیات کی مجموعی تفسیر اور محکمات کو بنیاد بنانے پر ہرگز تیار نہ تھے جن کے ذریعے متشابہات کی تفسیر کرتے ہوئے تشبیہ کی مشکل کو حل کیا جاسکتا ہے۔ یہ حضرات ایسی روایات نقل کرتے تھے اور ان کی بنیاد پر خدا اور اس کی صفات کی اس طرح تفسیر کرتے تھے کہ خدا کو ایک انسان کی شکل دیتے اور اس کے لیے آنکھ' ہاتھ' پیر وغیرہ ثابت کرتے تھے۔

شیعہ جو اپنے آپ کو روایات کا پابند سمجھتے تھے' قدرتی طور پر وہ اس صورتحال پر تشویش میں مبتلا ہو کر اس بارے میں امامؑ سے سوالات کرتے تھے۔ ہروی کہتے ہیں: میں نے اس روایت "اِنَّ الْمُؤْمِنِیْنَ یَزُوْرُوْنَ رَبَّهُمْ مِنْ مَنَازِلِهِمْ فِی الْجَنَّةِ." (بے شک مومنین جنت میں اپنے گھروں سے اپنے پروردگار کی زیارت کریں گے) کے متعلق اور اسی قسم کی دوسری روایات کے بارے میں جنہیں اہلِ حدیث قیامت کے دن خدا کو آنکھوں سے دیکھے جانے پر دلیل قرار دیتے ہیں' امامؑ سے سوال کیا۔ امامؑ نے تفصیل کے ساتھ ان روایات کا تجزیہ کیا اور ان میں سے بعض کو سرے سے غلط قرار دیا اور چند ایک کی آیات اور دوسری روایات نیز عقلی مقدمات کی مدد سے توجیہ فرمائی۔(۱)

ایک اور روایت میں اس بارے میں صراحت کے ساتھ فرمایا:

"مَاشَهِدَ بِهِ الْكِتَابُ وَالسُّنَّةُ فَنَحْنُ الْقَائِلُوْنَ بِهِ."(۲)

"جس چیز کی صحت کی تائید کتاب وسنت کرتی ہے' ہم اسی کے قائل ہیں۔"

شیعہ جن کا مؤقف ابتدا ہی سے تشبیہ اور جبر کے خلاف تھا' انہوں نے ان دو مسائل (تشبیہ اور جبر) کا مقابلہ کیا' جن کو یہودی' اُن سے متاثر افراد اور اموی حکمران رواج دے رہے تھے۔ لیکن بعض وجوہات (جن میں شیعوں کے درمیان غالیوں کا پایا جانا' شیعہ عقائد کے بارے میں غلط اور گمراہ کن پروپیگنڈا اور ان کے نقطۂ نظر کو درست طور پر نہ سمجھنا بھی شامل ہیں) اس بات کا باعث بنیں کہ کچھ لوگ شیعوں پر تشبیہ کا عقیدہ رکھنے کا الزام لگانے لگے۔ یہ الزام چوتھی صدی ہجری تک موجود تھا' جب مرحوم شیخ صدوق نے اپنی کتاب "توحید" مخالفین کے انہی جھوٹے الزامات کا جواب دینے کے لیے تالیف کی۔ شیخ صدوق کی جانب سے اس کتاب کی تالیف کا مقصد اس الزام کی نفی کرنا تھا۔ یہ مشکل امام رضاؑ کے دور میں بھی موجود تھی۔ اس کا سبب بھی تشبیہ کے بارے میں وہ چند روایات تھیں جنہیں غالیوں نے زیادہ تر اپنے عقائد جیسے خدا کی

۱۔ التوحید۔ ص ۱۱۷' عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۱۔ ص ۱۱۵

۲۔ التوحید۔ ص ۱۱۳' کافی۔ ج ۱۔ ص ۱۰۰

روح کا امامؑ میں حلول کر جانا وغیرہ کی توجیہ کے لیے گھڑا تھا۔

''حسین بن خالد کہتے ہیں: میں نے امامؑ سے عرض کیا: عامہ (اہلِ سنت) ہمیں تشبیہ اور جبر کا معتقد سمجھتے ہیں اور یہ آپ کے اجداد سے نقل ہونے والی روایات کی بنا پر ہے۔ امامؑ نے انہیں بہت دلچسپ جواب دیا، فرمایا: اے فرزندِ خالد! تمہارے بقول جو روایتیں میرے آبا سے تشبیہ اور جبر کے بارے میں نقل ہوئی ہیں، وہ زیادہ ہیں یا وہ جو اس بارے میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہوا ہے؟ میں نے عرض کیا: جو کچھ رسول اللہؐ سے منقول ہے، وہ زیادہ ہے۔ امامؑ نے فرمایا: پس پھر تو تمہیں یہ کہنا چاہیے کہ رسول اللہؐ جبر اور تشبیہ کے قائل تھے۔ میں نے کہا: وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے یہ باتیں نہیں کہی ہیں، بلکہ انہیں ان کی جانب جھوٹی نسبت دی گئی ہے۔ امامؑ نے فرمایا: لوگوں سے کہو کہ ہمارے اجداد نے بھی ایسی کوئی بات نہیں کہی ہے، بلکہ ان روایات کو ان کے نام سے گھڑا گیا ہے۔ پھر امامؑ نے فرمایا: جو شخص تشبیہ اور جبر کا قائل ہو، وہ کافر اور مشرک ہو جاتا ہے، اور ہم دنیا اور آخرت میں اس سے بیزار ہیں۔ امامؑ نے یہ باتیں بیان کرنے کے بعد ان روایات کو غالیوں کی گھڑنت قرار دیا اور شیعوں سے مطالبہ کیا کہ انہیں خود سے دور کر دیں۔''(۱)

یہی شبہات اس بات کا سبب بنے کہ امام علی رضا علیہ السلام نے اہلِ حدیث کے ساتھ شیعہ مؤقف کی مخالفت کو علانیہ بیان کیا اور مختلف تعبیرات میں امیر المومنینؑ (۲) کے کلمات سے استفادہ کرتے ہوئے یا خود اپنے طور پر تنزیہ کے عقیدے کی تشریح فرمائی۔ ہم یہاں ان میں سے بعض مثالیں پیش کرتے ہیں:

امامؑ نے اپنے آبا سے نقل کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت فرمائی کہ:

"مَاعَرَفَ اللّٰهَ مَنْ شَبَّهَهُ بِخَلْقِهِ، وَلاَ وَصَفَهُ بِالْعَدْلِ مَنْ نَسَبَ اِلَيْهِ ذُنُوبَ عِبَادِهِ." (۳)

''جس شخص نے خدا کو اُس کی مخلوق سے تشبیہ دی، اُس نے خدا کو نہیں پہچانا، اور جس شخص نے اُس کے بندوں کے گناہوں کی نسبت اُس کی طرف دی، اُس نے اُسے عادل نہیں سمجھا۔''

یہ روایت دونوں عقیدوں (تشبیہ اور جبر) کی وضاحت کے ساتھ کھلے لفظوں میں نفی کر رہی ہے۔

ایک اور روایت میں امامؑ نے تشبیہ کے اعتقاد کو جو اہلِ حدیث کے درمیان بدترین صورت میں رائج تھا، کفر آمیز

۱۔ التوحید۔ ص ۳۶۳، ۳۶۴۔ عیون اخبار الرضا۔ ج ۱۔ ص ۱۴۲

۲۔ امام رضاؑ کبھی کبھی امیر المومنین حضرت علیؑ کے خطبے ہو بہو نقل کیا کرتے تھے۔ دیکھیے: التوحید۔ ص ۶۹، عیون اخبار الرضا۔ ج ۱۔ ص ۱۲۱

۳۔ التوحید۔ ص ۴۷

عقیدہ قرار دیا ہے۔ داؤد بن قاسم کہتے ہیں کہ میں نے علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام سے سنا کہ آپ فرما رہے تھے:

"مَنْ شَبَّہَ اللّٰہُ بِخَلْقِہٖ فَھُوَ مُشْرِکٌ وَمَنْ وَصَفَہٗ بِالْمَکَانِ فَھُوَ کَافِرٌ." (۱)

"جو شخص خدا کو اس کی مخلوق سے تشبیہ دے وہ مشرک ہے اور جو کوئی خدا کے لیے مکان (جگہ) کا قائل ہو وہ کافر ہے۔"

یہاں اس بات کی وضاحت کے لیے کہ اہلِ حدیث نے تشبیہ کے مسئلے میں معاملہ کس درجہ گھٹیا مقام پر لا پہنچایا تھا بہتر ہے کہ اس مسئلے کے بارے میں اُن کی کچھ روایات پیش کریں:

الف: بندگانِ خدا کے دل اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں۔

ب: خدا عرفے کے دن آسمانِ دنیا پر اتر آتا ہے۔

ج: روزِ قیامت آتشِ جہنم بھڑکتی رہے گی تاوقتیکہ خدا اپنا پیر اس میں ڈال دے۔

د: انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف جھوٹی نسبت دی ہے کہ آپ نے فرمایا: "میں نے اپنے پروردگار کو اس کی بہترین شکل میں دیکھا ہے"۔ انہوں نے اس روایت کو اپنے اسی کفر آمیز ظاہر کے ساتھ قبول کیا ہوا ہے۔ (۲)

ایک اور روایت میں وہ کہتے ہیں: وہ کرسی جس پر خدا بیٹھا ہے اس پر صرف چار انگلیوں کے برابر جگہ بچی ہے۔"

اور پھر ابو بکر بن ابی مسلم اضافہ کرتا ہے:

"کرسی کا جو حصہ خالی بچ گیا ہے وہ محمدؐ کے لیے ہے تاکہ خدا انہیں اپنے ساتھ بٹھائے۔" (۳)

یہ اُن غلط عقائد کی ایک مثال تھی جن پر اہلِ حدیث سختی کے ساتھ عقیدہ رکھتے تھے۔

وہ مسائل جو بہت زیادہ کلامی اہمیت کے حامل ہیں اُن میں سے ایک رویتِ خدا (خدا کو دیکھے جانے) کا مسئلہ تھا۔ یہ وہ مسئلہ تھا جس سے اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود اشاعرہ بھی چھٹکارا نہ پاسکے اور آخرکار اہلِ حدیث کی طرح قیامت کے دن خدا کی رویت کے قائل ہوگئے۔ یہ عقیدہ ثابت کرنے کے لیے انہوں نے قرآن کی بعض متشابہ آیات مثلاً وَلَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَۃً اُخْرٰی (اور اس نے تو اُسے ایک بار اور بھی دیکھا ہے۔ سورۂ نجم ۵۳۔ آیت ۱۳) جن میں پیغمبر کے خدا کو دیکھنے کا ذکر آیا ہے نیز ان آیات کے بارے میں نقل ہونے والی احادیث کو سند قرار دیا ہے۔

۱۔ التوحید۔ ص ۶۹

۲۔ دیکھئے: طبقات الحنابلہ جلد ۲ صفحہ ۴۴

۳۔ طبقات الحنابلہ۔ ج ۲۔ ص ۶۷

امام رضا علیہ السلام نے اس نظریے اور اس پر کیے جانے والے استدلال کی تردید اور بطور کلی خدا کی رؤیت کا انکار کرنے کے لیے فرمایا: اس آیت کے بعد ایک اور آیت نازل ہوئی ہے' جو اس چیز کی وضاحت کرتی ہے جسے رسول اللہؐ نے دیکھا ہے: مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى. (جو کچھ نبی اپنے دل سے (نہ کہ اپنی آنکھوں سے) دیکھتا ہے' اس کی تکذیب نہیں کرتا) اور اس کے بعد اس آیت میں فرماتا ہے: لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى. (نبی نے خدا کی بعض بڑی نشانیاں دیکھیں) اور واضح ہے کہ آیاتِ خدا (خدا کی نشانیاں) خود خدا سے ہٹ کر اور چیزیں ہیں۔ اسی طرح ایک دوسرے مقام پر فرماتا ہے: لَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا. (کوئی بھی خدا کو اپنے علم کے احاطے میں نہیں لا سکتا) اگر کوئی اسے اپنی آنکھ سے دیکھ سکتا ہے' تو وہ اُسے اپنے علم کے دائرے میں لے آیا ہے' اور اُس نے خدا کا معائنہ کر لیا ہے۔

ابو قُرّہ کہتے ہیں: کیا آپ روایات کی تکذیب کرتے ہیں؟

امامؑ نے فرمایا:

"اِذَا كَانَتِ الرِّوَايَاتُ مُخَالِفَةً لِلْقُرْآنِ كَذَّبْتُهَا." (۱)

"جب روایات قرآن کی مخالف ہوتی ہیں' تو میں اُن کی تکذیب کرتا ہوں۔"

امامؑ نے ایک اور آیت: اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ. (مومنین اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے) جس سے اہلِ حدیث استدلال کرتے تھے' کی تفسیر میں فرمایا: يَعْنِي مُشْرِقَةً تَنْتَظِرُ ثَوَابَ رَبِّهَا. (۲) یعنی قیامت کے دن مومنین کے چہرے چمکتے ہوں گے اور وہ اپنے پروردگار کے ثواب کے منتظر ہوں گے۔

اور آیت: وَ جَآءَ رَبُّكَ وَ الْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا. کی تفسیر میں فرمایا: وَ جَآءَ [اَمْرُ] رَبُّكَ وَ الْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا (اور تمہارے پروردگار کا حکم پہنچ گیا' جبکہ فرشتے اپنے اپنے مقام پر صف بستہ کھڑے ہیں)۔ (۳)

ابراہیم بن عباس نے امامؑ کے بارے میں بہت خوبصورت جملہ کہا ہے' وہ کہتے ہیں: كَانَ كَلَامُهُ كُلُّهُ وَجَوَابُهُ وَتَمَثُّلُهُ اِنْتِزَاعَاتٌ مِنَ الْقُرْآنِ. (آپ کا تمام کلام' آپ کے جوابات اور آپ کی پیش کردہ مثالیں قرآن سے اخذ کردہ تھیں)۔ (۴)

دوسروں کے نظریات کا مقابلہ کرتے ہوئے امامؑ کا قرآنِ کریم سے سہارا لینا بھی قابلِ توجہ بات ہے۔ جب ایک

۱۔ التوحید۔ ص ۱۱۰' کافی۔ ج ۱۔ ص ۹۵

۲۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۱۔ ص ۱۱۴' امالی صدوق۔ ص ۳۳۶' مسند الامام الرضاؑ۔ ج ۱۔ ص ۳۷۹

۳۔ التوحید۔ ص ۱۶۲

۴۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۲۔ ص ۱۸۰

موقع پر امامؑ کے سامنے معتزلہ کا یہ نظریہ زیر بحث آیا کہ گناہانِ کبیرہ کی بخشش نہیں ہوگی تو آپ نے فرمایا:

"قَدْ نَزَلَ الْقُرْاٰنُ بِخِلَافِ قَوْلِ الْمُعْتَزِلَةِ: وَ اِنَّ رَبَّکَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰی ظُلْمِهِمْ. (۱)

"قرآن میں معتزلہ کے قول کے برخلاف نازل ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: (اور آپ کا پروردگار لوگوں کے ظلم بخشنے والا ہے)۔"

ایسی دوسری روایات جن سے اہلِ حدیث نے خدا کی خاص قسم کی توصیف کے لیے استفادہ کیا ہے اور جو ان کے تشبیہ کا قائل ہونے کی دلیل بھی ہیں' انہی میں سے ایک روایت یہ ہے: فَاِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ. احمد بن حنبل کا کہنا ہے کہ: اس روایت سے مراد یہ ہے کہ خدا نے آدم کو اپنی شبیہ خلق کیا ہے۔ وہ اپنے اس اعتقاد پر مزید زور دیتے ہوئے یہ بھی کہتے تھے کہ: اگر "صورتہ" کی ضمیر خود آدم کی طرف پلٹائی جائے تو اس صورت میں یہ کلامِ خدا بے معنی اور لغو ہو جائے گا' کیونکہ آدم سے پہلے کوئی اور آدم نہیں تھا کہ اس آدم کو اس کی شبیہ خلق کیا جاتا۔ (۲)

امام رضا علیہ السلام نے اس استدلال کے مقابلے میں' رسولِ خداؐ کے اس کلام کی شانِ صدور (ارشاد فرمائے جانے کا موقع) بیان کرتے ہوئے فرمایا: خدا انہیں غارت کرے' انہوں نے روایت کے ابتدائی حصے کو حذف کر دیا ہے: (پوری روایت یہ ہے کہ)

"اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) مَرَّ بِرَجُلَیْنِ یَتَسَابَّانِ' فَسَمِعَ اَحَدَهُمَا یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ: قَبَّحَ اللّٰهُ وَجْهَکَ وَ وَجْهَ مَنْ یُّشْبِهُکَ' فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ: یَا عَبْدَ اللّٰهِ! لَا تَقُلْ هٰذَا لِاَخِیْکَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ." (۳)

"رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو افراد کو دیکھا جو ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے۔ آپ نے سنا کہ اُن میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا ہے: خدا تیری صورت بگاڑے اور جو تیری شبیہ ہو اس کی بھی۔ رسولِ خداؐ نے فرمایا: اے بندۂ خدا! اپنے بھائی کے لیے ایسا نہ کہو کہ خدا نے آدم کو اس کی شبیہ خلق کیا ہے۔"

یہ روایت بتاتی ہے کہ خاندانِ نبوت میں احادیث کس طرح صحیح وسالم اور محفوظ رہی تھیں اور دوسروں کے پاس ان میں سے کچھ حصے کے حذف یا اس میں تبدیلی کی وجہ سے تحریف ہوئی۔

۱۔ سورۂ رعد ۱۳۔ آیت ۶

۲۔ طبقات الحنابلہ۔ ج ۲۔ ص ۱۳۱

۳۔ عیون اخبار الرضا۔ ج ۱۔ ص ۱۱۹

ایک روایت میں امامؑ نے صفات الٰہی پر اعتقاد کے اعتبار سے لوگوں کو تین گروہوں میں تقسیم کرتے ہوئے فرمایا: ایک گروہ تشبیہ کا قائل ہے اور دوسرا گروہ تعطیل کا۔ اور یہ دونوں عقیدے باطل ہیں۔ اور تیسرا راستہ یہ ہے کہ خدا کو کسی چیز سے تشبیہ دیے بغیر اُس کی صفات کا اثبات کیا جائے۔(۱)

اہلِ حدیث نے اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں کو ثابت کرنے کے لیے آیت: بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ. (۲) (بلکہ اس کے ہاتھ کھلے ہوئے ہیں) سے استدلال کیا ہے۔ جب امامؑ سے مشبہہ نے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں آپ کی رائے دریافت کی' تو آپ نے فرمایا: اگر دو ہاتھوں سے مراد انسان کے ہاتھ جیسے ہاتھ ہوں' تو اس صورت میں خدا کو مخلوق ہونا چاہیے۔(۳)

قضاوقدر اور جبر واختیار کے مسئلے میں بھی امام رضا علیہ السلام کی متعدد روایات نقل کی گئی ہیں' جن کے اصول ومبانی کی وضاحت کے لیے مفصل گفتگو کی ضرورت ہے' جس کی اس مختصر کتاب میں گنجائش نہیں' لیکن ہم اشارے کے طور پر یہ ضرور کہیں گے کہ امامؑ نے اس مسئلے میں بھی معتزلہ (جو تفویض کے قائل تھے) اور اہلِ حدیث (جو جبر کے قائل تھے) کی حدِ فاصل اختیار کی اور اپنے جد امام جعفر صادق علیہ السلام کے اسی نظریے: "اَلْاَمْرُ بَيْنَ الْاَمْرَيْنِ." کی وضاحت کی۔(۴)

حسنِ اختتام کے طور پر اس موضوع پر نقل ہونے والی ایک روایت بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

"حسن بن علی الوشاء کہتے ہیں: میں نے ابوالحسن (امام علی رضاؑ) سے پوچھا: کیا خدا نے بندوں کے کاموں کی انجام دہی کو خود ان کے سپرد کردیا ہے؟ (یعنی تفویض)۔ فرمایا: خدا اس سے بزرگ وبرتر ہے کہ ایسا کرے۔ میں نے عرض کیا: تو خدا ان کو گناہوں کے ارتکاب پر مجبور کرتا ہے (یعنی جبر)۔ امامؑ نے فرمایا: خدا اس سے بڑھ کر عادل اور حکیم ہے کہ ایسا کرے۔ پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

"يَابْنَ آدَمَ! اَنَا اَوْلٰى بِحَسَنَاتِكَ مِنْكَ وَاَنْتَ اَوْلٰى بِسَيِّئَاتِكَ مِنِّيْ. عَمِلْتَ الْمَعَاصِيَ بِقُوَّتِيَ الَّتِيْ جَعَلْتُهَا فِيْكَ."(۵)

"اے فرزندِ آدم! میں تیرے اچھے کاموں کا خود تجھ سے زیادہ سزاوار ہوں' اور تو اپنے برے کاموں کا مجھ

۱۔ التوحید۔ ص۱۰۰

۲۔ سورۂ مائدہ۵۔ آیت ۶۴

۳۔ التوحید۔ ص۱۶۸

۴۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج۱۔ ص۱۴۴

۵۔ التوحید۔ ص۳۶۲' ۳۶۲ کافی۔ ج۱۔ ص۱۵۷' اور دیکھئے: مجموعۂ آثار۔ ص۱۴۴

سے زیادہ سزاوار ہے (کیونکہ) جو قوت میں نے تجھے دی ہے تو نے اسی سے میری نافرمانی کی ہے۔"

امامت کے موضوع پر ائمۂ ہدیٰ علیہم السلام کے بیان کردہ اہم نکات ہمارے پاس موجود ہیں۔ واضح ہے کہ ابتدا میں امامت کے موضوع کا دارومدار احادیث و روایات پر تھا' کیونکہ تاریخی اعتبار سے اس بحث کی بنیاد یہ ہے کہ کیا رسولِ کریمؐ نے اپنے بعد کسی کو اپنا جانشین مقرر کیا ہے یا نہیں؟ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ' اس مسئلے کی عقلی وضاحت کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اِن سوالات کے جواب میں عقلی اصول پیش کیے جانے لگے کہ رسول اللہؐ کے بعد کسے حکومت کرنی چاہیے؟ اور اُس شخص کو خدا کی طرف سے منصوب ہونا چاہیے یا لوگوں کی طرف سے؟ بعد ازآں امامت سے متعلق دوسرے موضوعات سامنے آنے لگے' مثلاً یہ کہ کیا دو امام ایک ہی زمانے میں مقامِ امامت کے حامل ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ اور اس حوالے سے بکثرت عقلی بحثیں ہونے لگیں۔

اسی وجہ سے ہمیں امام علی رضا علیہ السلام کے زمانے تک اس موضوع میں زیادہ تر نقلِ روایات اور کبھی کبھار عقلی روش کا استعمال نظر آتا ہے۔ آپ کے زمانے میں یہ بحثیں زیادہ تفصیل کے ساتھ عقلی صورت میں ہونے لگیں اور امام رضاؑ نے اس بارے میں بکثرت معارف پیش کیے۔ البتہ ان بحثوں کی ایک اور وجہ بھی تھی اور وہ یہ کہ اُس دور میں خلافت کے لیے اہلِ بیتؑ کے حقدار ہونے کا مسئلہ سامنے آچکا تھا' جسے مامون نے قبول کر لیا تھا۔ "مسند الامام الرضاؑ" میں فصلِ "الامامۃ" میں ۴۹۰ سے زیادہ روایات درج کی گئی ہیں' جن میں سے بعض امام رضاؑ کے واقعات سے متعلق تاریخی مباحث سے متعلق ہیں۔ اس فصل کی روایات میں کثرت کے ساتھ عقلی بحثیں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ واضح ہے کہ امامت سے متعلق اس قدر زیادہ معارف اس سے پہلے موجود نہیں تھے۔ اس بارے میں مرحوم کلینی نے ایک تفصیلی روایت نقل کی ہے' جس میں امامت کے بارے میں امام رضاؑ کی ایک طویل قرآنی اور عقلی گفتگو پیش کی گئی ہے۔ اس روایت میں جامع طور پر امامت کے مختلف پہلوؤں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اس روایت کو اس موضوع پر ایک جامع مضمون قرار دیا جا سکتا ہے۔(۱)

ایک اور اہم روایت فضل بن شاذان سے نقل کی گئی ہے' جس کا ایک حصہ امامت سے متعلق عقلی مباحث پر مشتمل ہے۔ اسی میں امامؑ کی جانب سے اس سوال کا جواب بھی ہے کہ: فَلِمَ جَعَلَ اُولِی الْاَمْرِ وَ اَمَرَ بِطَاعَتِهِمْ؟ (پھر خدا نے اولوالامر کیوں بنائے اور اُن کی اطاعت کا حکم کیوں دیا؟) امامؑ نے خدا کی طرف سے امام کے تعین کے ضروری ہونے کے مختلف اسباب بیان کیے۔ اس گفتگو کا ایک اور حصہ اس سوال کے جواب پر مشتمل ہے کہ: فَلِمَ لَا یَجُوزُ اَنْ یَکُونَ فِی الْاَرْضِ اِمَامَانِ فِی وَقْتٍ وَاحِدٍ؟ (پھر زمین پر ایک ہی وقت میں دو اماموں کا ہونا جائز کیوں نہیں ہے؟) اس سوال

۱۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۱۹۸' کمال الدین۔ ص ۶۷۵

کے کئی دلچسپ جوابات دیے گئے ہیں۔ ایک اور سوال یہ تھا کہ امام خاندانِ رسولؐ ہی سے کیوں ہونا چاہیے؟ (۱)

شاید ولایت اور توحید کے باہمی تعلق کو بیان کرنے والی ایک اہم ترین دلیل' وہ حدیث ہے جو امامؑ نے خراسان جاتے ہوئے راستے میں نیشاپور کے مقام پر ارشاد فرمائی۔ یہ حدیث جسے امامؑ نے لوگوں کے شدید اظہارِ محبت کے دوران ارشاد فرمایا' اس سے اس کے تاریخی کردار کا بخوبی احساس کیا جا سکتا ہے۔ یہ روایت جیسا کہ مشہور ہے' اس طرح سے ہے:

"امامؑ نے اپنے آباؤ اجداد کے طریق سے (جیسا کہ ائمہؑ کی تمام احادیث اسی طرح سے ہوتی ہیں) رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه حِصْنِی فَمَنْ دَخَلَ حِصْنِی اَمِنَ مِنْ عَذَابِی."

"لا الہ الا اللہ میرا قلعہ ہے' جو کوئی اس قلعے میں داخل ہو گیا' وہ میرے عذاب سے محفوظ ہو گیا۔"

"فَلَمَّا مَرَّتِ الرَّاحِلَة نَادَانَا: بِشُرُوطِهَا وَاَنَا مِنْ شُرُوطِهَا." (۲)

"جب امامؑ کی سواری آگے بڑھ گئی' تو آپ نے ہم سے فرمایا: البتہ کچھ شرائط کے ساتھ' اور ان شرائط میں سے ایک میں ہوں۔"

امامت کے بارے میں امامؑ کے علانیہ اقدامات میں سے ایک' آپ کا وہ خوب صورت جملہ ہے جو آپ نے مامون کی موجودگی میں (اُس زمانے میں جبکہ ولی عہدی کا مسئلہ درپیش تھا) فرمایا: مامون نے ہمیں وہ حق دیا ہے جسے دوسروں نے قبول نہیں کیا تھا۔ (۳)

بہرصورت' امام علی رضا علیہ السلام نے مامون اور امین کے درمیان جاری تصادم کے دوران نیز ۲۰۰ ہجری سے ۲۰۳ ہجری تک اپنی ولی عہدی کے زمانے میں میسر نسبتاً آزادی کے دور میں مسئلۂ امامت کے بارے میں قابلِ توجہ معارف پیش کیے۔ اسی ضمن میں آپ نے اس بات کو بھی واضح کر دیا کہ آپ امرِ امامت کے اظہار میں کسی تقیے سے کام نہیں لیں گے۔ (۴)

امام علی رضا علیہ السلام کی ولی عہدی' امامت کے معنی کی وضاحت کے سلسلے میں آپ کے تبلیغی اقدامات اور آپ

۱۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۲۔ ص ۹۹

۲۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۲۔ ص ۱۳۴' التوحید۔ ص ۲۵۔ ۲۶' معانی الاخبار۔ ص ۱۷۱' امالی صدوق۔ ص ۱۴۲' حلیۃ الاولیاء۔ ج ۳۔ ص ۱۹۲' نقل از مسند الامام الرضاؑ۔ ج ۱۔ ص ۴۵۔ ۴۶

۳۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۲۔ ص ۱۳۵

۴۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۲۔ ص ۲۱۳

کے مناظرات وہ نکات ہیں جن کے ذریعے امامت کے علویوں کا حق ہونے کا مسئلہ اس نمایاں انداز سے اجاگر ہوا جس کی نظیر نہیں ملتی۔

امام علی رضاؑ اور ایران

وہ واحد شیعہ امام جن کا مدفن اسلامی مملکت ایران میں ہے' امام علی رضا علیہ السلام ہیں۔ یہ وہ امامؑ ہیں جن کا وجود اس سرزمین کے لیے ابتدا ہی سے باعثِ خیر و برکت رہا۔ آج ہر ایرانی شیعہ مسلمان کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ سال میں کم از کم ایک مرتبہ یا حتیٰ اس سے بھی زیادہ آپ کے روضۂ اطہر کی زیارت سے مشرف ہو۔

اس مقام پر حسنِ اختتام کے طور پر ہمیں ابن حبان کی ایک روایت نقل کرنا مناسب نظر آتا ہے' جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ نہ صرف شیعہ' بلکہ اہلِ سنت کے عوام اور محدثین بھی ایک زمانے میں اس امامِ بزرگوار کے روضۂ مبارک کا انتہائی احترام کیا کرتے تھے اور آپ کی قبرِ مطہر کی زیارت کرتے اور اس سے فیض حاصل کرتے تھے۔

ابن حجر کے بقول' ابو بکر بن خزیمہ اور ابو علی ثقفی جیسے افراد اور بعض دوسرے بزرگ محدثین' امام رضاؑ کی مرقد شریف کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے۔(۱)

چوتھی صدی ہجری کا ایک محدث اور علمِ رجال کا ماہر ابن حبان' امام علی ابن موسیٰ الرضاؑ کے نام کے ذیل میں لکھتا ہے: علی ابن موسیٰ الرضاؑ اس زہر کی وجہ سے فوت ہوئے جو انہیں مامون نے دیا تھا۔ یہ واقعہ بروز شنبہ (ہفتہ) ماہِ صفر کی آخری تاریخ کو سن ۲۰۳ میں پیش آیا۔ مشہور ہے کہ ان کی قبر "نوقان" سے باہر "سناباذ" میں ہارون کی قبر کے نزدیک واقع ہے۔ میں نے بارہا اس کی زیارت کی ہے۔ جب میں طوس میں تھا' تو جب بھی مجھ پر کوئی مشکل پڑتی تھی' میں علی ابن موسیٰ الرضا (صلوات اللہ علی جدہ و علیہ) کی قبر کی زیارت کے لیے جاتا اور خدا سے اس مشکل سے نجات کی دعا کرتا جو پوری ہو جاتی اور میری پریشانی دور ہو جاتی۔ پھر اس کے بعد وہ لکھتا ہے:

> "وَهٰذَا شَيْءٌ قَدْ جَرَّبْتُهُ مِرَاراً فَوَجَدْتُهُ كَذٰلِكَ اَمَاتَنَا اللّٰهُ عَلٰى مَحَبَّةِ الْمُصْطَفٰى وَاَهْلِ بَيْتِهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ عَلَيْهِمْ اَجْمَعِيْن." (۲)

> "یہ وہ چیز ہے جس کا میں نے بارہا تجربہ کیا اور دیکھا کہ وہی نتیجہ برآمد ہوا۔ خدا ہمیں محمد مصطفیٰؐ اور اُن کے اہلِ بیتؑ کی محبت پر موت دے۔"

۱۔ تہذیب التہذیب۔ ج ۷۔ ص ۳۸۷

۲۔ ۱۰۶۔ الثقات۔ ج ۸۔ ص ۴۵۶۔ ۴۵۷ (طبع ہند)

تاریخی اعتبار سے اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں پایا جاتا کہ اس خطے میں امامؑ کی قبر کی موجودگی تشیع کے فروغ کا سبب رہی ہے۔ اس علاقے کے شیعوں کا امامؑ سے رابطہ اور آپ کی خدمت میں خطوط تحریر کرنا اور آپ سے سوال کرنا اور اُن کے جواب پانا' اس بات کے ثبوتوں میں سے ایک ثبوت ہے۔ مختلف افراد کے نام شیعہ اصولوں کی وضاحت میں لکھے گئے امامؑ کے خطوط کا مجموعہ بہ آسانی اس کی وسعت کی نشاندہی کرتا ہے۔ ان خطوط کے موضوعات کتاب وسنت میں اہلِ بیتؑ کا مقام (۱)' بعض کلامی مسائل (۲) نیز شیعوں اور سنیوں کے درمیان پائے جانے والے اختلافی مسائل جیسے ایمانِ ابوطالب (۳)' مصداقِ شیعہ کی توضیح (۴)' مصداقِ صحابی کی وضاحت (۵)' اولوالامر کے معنی (۶) وغیرہ تھے۔ یہ جوابات وہ تعلیمات تھیں جو شیعوں میں ایک قطعی رائے کے طور پر مانی جاتی تھیں۔ ایک روایت یہ بھی بتاتی ہے کہ ایک مرتبہ عرفے کے دن امامؑ نے اپنا مال لوگوں میں تقسیم کردیا' اس پر فضل بن سہل نے آپ پر اعتراض کیا اور اسے ''زیاں'' کہا' اُن کے جواب میں امامؑ نے اسے ''غنیمت'' قرار دیا۔ (۷)

امامؑ کے ایک سچے شیعہ' جو ''مرو'' میں امامؑ کے قیام کے دوران' آپ کی خدمت میں پہنچے' دعبل خزاعی تھے۔ یہ بات سب کے علم میں ہے کہ خزاعیوں کا شمار شیعہ عرب قبائل میں ہوتا تھا' اور دعبل اس زمانے میں معروف عرب شاعر' خزاعی اور شیعہ کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ جب دعبل خراسان آئے' تو انہوں نے قصیدۂ ''تائیہ'' کہا۔ انہوں نے کہہ رکھا تھا کہ امام رضاؑ سے پہلے کوئی اور اسے نہ سنے۔ (۸) یہ قصیدہ اس دور کی شیعہ تاریخ کا عکاس ہے' ایسی تاریخ جو درد والم اور قتل وایذا پر مشتمل ہے۔

مدارس آیات خلت من تلاوة و منزل وحی مقفر العرصات
لآل رسول اللّٰہ بالخیف من منی و بالرکن و التعریف و الجمرات

۱۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۲۲۳' بصائر الدرجات۔ ص ۱۱۸' بحار الانوار۔ ج ۲۳۔ ص ۳۳۶

۲۔ دیکھئے: عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۱۔ ص ۱۶

۳۔ معادن الحکمہ۔ ج ۲۔ ص ۱۷۶

۴۔ قرب الاسناد۔ ص ۲۰۳۔ ۲۰۶

۵۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۲۔ ص ۸۷

۶۔ تفسیر العیاشی۔ ج ۱۔ ص ۳۶۰' بحار الانوار۔ ج ۲۳۔ ص ۲۹۶

۷۔ محاضرات الادباء۔ ج ۱۔ ص ۵۸۹

۸۔ دعبل بن علی الخزاعی شاعر اہلِ بیتؑ۔ ص ۸۳ نقل از الغدیر۔ ج ۲۔ ص ۳۵۹' الاتحاف۔ ص ۱۶۱

دیار علی و الحسین و جعفر — و حمزة و السجاد ذی الثفنات

دیارٌ عفاها جور کلِّ منابذ — و لم تعف بالایّام و السنوات

...هم اهل میراث النبی اذا انتموا — و هم خیر سادات و خیر حماة

تخیرتهم رشدا لامری فانهم — علی کلِّ حال خیرة الخیرات

نبذت الیهم بالمودة جاهدا (۱) — و زِدْ حبّهم یا ربّ فی حسناتی

... الم تر انّی مذ ثلاثین حجة — اروح و اغدو دائم الحسرات

اریٰ فیئهم فی غیرهم متقسّما — و ایدیهم من فیئهم صفرات

دعبل کو امید ہے کہ اُمت کی قیادت اہل بیتؑ کے ہاتھوں میں آ جائے گی:

خروج امام لامحالة خارجٌ — یقوم علی اسم اللّٰہ و البرکات

یمیّز فینا کلَّ حقٍ و باطل — و یجزی علی النعماء و النقمات

امامؑ یہ اشعار سن کر بہت متاثر ہوئے اور اپنے نام کے ڈھلے سو دینار اور اپنا جبہ دعبل کو دیا۔(۲) عجیب بات یہ ہے کہ راستے میں ڈاکوؤں نے اس قافلے پر حملہ کر دیا جس کے ساتھ دعبل سفر کر رہے تھے۔ ڈاکوؤں نے دعبل کو پہچان لیا اور اُن سے اُن کا قصیدہ سنا اور قصیدہ سننے کے بعد انہوں نے قافلے والوں کو اُن کا سامان واپس کر دیا۔ اہلیانِ قم نے دعبل سے درخواست کی کہ وہ امامؑ کا دیا ہوا جبہ ایک ہزار دینار میں ان کے ہاتھ بیچ دیں، لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ قم سے نکلنے کے بعد عرب نوجوانوں نے اُن سے وہ جبہ چھین لیا۔ وہ شہر میں واپس لوٹ آئے اور اس پر تیار ہو گئے کہ جبہ کا کچھ حصہ اور ایک ہزار دینار انہیں دیے جائیں۔(۳) جناب "اشتر" کے خیال میں احتمالاً وہ امامؑ کی شہادت کی خبر پانے تک قم میں مقیم رہے تھے۔ مامون نے اپنی خباثت کی بنا پر امامؑ کو اپنے باپ ہارون الرشید کی قبر کے نزدیک طوس میں دفن کیا۔ اس بات نے دعبل اور شیعوں کے دلوں کو تڑپا دیا۔ بعد میں دعبل کے کہے ہوئے شعروں میں عباسیوں کے خلاف صریح الفاظ موجود ہیں۔ اس نے خصوصاً اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے:

اریٰ اُمیّة معذورین ان قتلوا — و لا اریٰ لبنی العباس من عذر

۱۔ فیا رب زد قلبی هدیً و بصیرةً

۲۔ دعبل بن علی الخزاعی۔ ص ۸۹ نقل از عیون اخبار الرضاؑ۔ ص ۳۶۸ الفصول المہمہ۔ ص ۲۳۱

۳۔ دعبل بن علی الخزاعی۔ ص ۹۱

...قبران فی طوس: خیر الخلق کلهم و قبر شرّهم هذا من العبر (۱)

جب سن ۲۱۰ ہجری میں مامون نے فدک طالبیوں کو واپس لوٹایا' تو دعبل نے ایک شعر میں کہا:

اصبح وجه الزمان قد ضحکا برد مأمون هاشم فدکا (۲)

دعبل مامون اور معتصم کے دور کے درباریوں اور امرا کے ساتھ اپنے تمام تر تعلقات کے باوجود' کبھی تشیع سے دستبردار نہیں ہوئے۔ وہ خود کہتے تھے کہ میں پچاس سال سے اپنی سولی اپنے کاندھوں پر لیے پھر رہا ہوں' لیکن کسی نے مجھے پھانسی پر نہیں لٹکایا ہے۔ انہوں نے اہلِ بیتؑ کی مدح میں بکثرت اشعار کہے ہیں:

بابی و امی خمسة أحبهم لله' لا لعطیة أعطاها

بابی النبی محمدٌ و وصیه الطیّبان و بنته و ابناها (۳)

انہوں نے اپنی موت سے پہلے اپنے آخری شعر میں کہا تھا:

أعد لله یوم یلقاه دعبلٌ: ان لا اله الا الله

...الله مولاه و النبیُّ' و من بعدهما فالوصیُّ مولاه (۴)

بہرکیف اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایران میں تشیع کے فروغ کا ایک اہم عامل' وہاں امام رضا علیہ السلام کی تشریف آوری ہے۔ امامؑ کے راستے میں آنے والے شہروں اور دوسرے علاقوں میں (جو کسی نہ کسی طور پر امامؑ کی اقامت گاہ رہے ہیں) امامؑ کے آثار کی حفاظت سے' وہاں کے لوگوں میں خاص شیعی محبت کی نشان دہی ہوتی ہے۔ اگرچہ ممکن ہے ان میں سے بعض مقامات کے بارے میں اور ان کے امامؑ سے تعلق کے حوالے سے ہمارے پاس کوئی صحیح خبر موجود نہ ہو۔

مثال کے طور پر اہواز میں واقع ''مسجد امام رضاؑ'' (۵) ایران میں امام رضاؑ کے نام سے موجود قدیم ترین مقامات میں سے ایک مقام ہے۔ ''ابودلف'' کے علاوہ' یاقوت نے بھی اہواز میں واقع پل شوشتر اور اس کے بالمقابل واقع امام رضاؑ کے نام سے ایک مسجد کا ذکر کیا ہے۔ (۶) شوشتر شہر میں دو مقامات امام رضاؑ سے منسوب ہیں' ان میں سے

۱۔ دعبل بن علی الخزاعی۔ ص ۹۵۔۹۸

۲۔ فتوح البلدان۔ ص ۳۷ بنقل از دعبل بن علی الخزاعی۔ ص ۱۰۷

۳۔ دعبل بن علی الخزاعی۔ ص ۲۱۲' دیوان دعبل الخزاعی۔ ص ۲۴۷

۴۔ دیوان دعبل الخزاعی۔ ص ۱۴۰

۵۔ ابودلف (سفرنامہ۔ ص ۸۹) نے چوتھی صدی میں اس کی اطلاع دی ہے۔

۶۔ معجم البلدان۔ ج ۱۔ ص ۲۸۵' مرات البلدان۔ ج ۱۔ ص ۱۳۲

ایک پل شاہ علی ولشکر (۱) سے کچھ دور اور دوسرا شوشتر کے مشرقی حصے میں شطیط نامی نہر کے نزدیک واقع ہے۔ (۲) اس دوسری عمارت پر سن ۱۰۹۴ کی تاریخ دیکھی جا سکتی ہے۔

ایک اور قدم گاہ دزفول شہر کے مشرق میں موجود ہے۔ (۳) ان سب کا نام امام رضاؑ دیمی ہے اور یہ دیمی اس خطے سے لیا گیا ایک نام ہے۔ (۴) دو مزید گنبد ایک دزفول میں اور دوسرا شوشتر میں شاخراسون کے نام سے موجود ہیں۔ شوشتر میں دو اور گنبد "امام ضامن" کے نام سے کنارستان کے نواح میں اور "بقعہ امام رضاؑ" کے نام سے بلاک عقیلی کے نواح میں ہیں۔ (۵) "قدم گاہ امام رضاؑ" کے نام سے ایک مقام شوشتر کے نواح میں کہنک (۶) کی آبادی کے جنوب میں موجود ہے۔

ارجان نامی شہر میں جو قدیم زمانے میں ایک آباد شہر تھا اور آج اس سے ایک فرسخ کے فاصلے پر اپنی تین سوسالہ قدیم تاریخ کے ساتھ بہبہان نامی شہر موجود ہے قدم گاہ یا مسجد امام رضاؑ کے نام سے ایک مقام ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ امام نے خراسان جاتے ہوئے اس مقام پر نماز پڑھی تھی۔ (۷)

"ابرقو" میں مسجد قدم گاہ امام رضاؑ جو مسجد بیرون کے نام سے مشہور ہے ایک مشہور ومعروف جگہ ہے اور اس کے آثار آج تک موجود ہیں۔ (۸)

"یزد" شہر میں بھی کئی قدم گاہیں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک قدم گاہ خرانق (مشہدک) ہے۔ خرانق یزد شہر سے ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس قدم گاہ کی تاریخ وہاں موجود کتبے کی بنیاد پر چھٹی صدی ہجری تک پہنچتی ہے۔ اس کتبے پر کندہ ہے:

۱۔ اس بارے میں دیکھئے: جغرافیائے تاریخی ہجرت امام رضاؑ۔ ص ۵۸۔ ۵۹

۲۔ اس بارے میں دیکھئے: جغرافیائے تاریخی ہجرت امام رضاؑ۔ ص ۵۹۔ ۶۰

۳۔ اس بارے میں دیکھئے: جغرافیائے تاریخی ہجرت امام رضاؑ۔ ص ۶۱

۴۔ دیکھئے: دیار شہریاران بخش اول ۱/ ۵۵۴، ۳۶۸ جغرافیائے تاریخی ہجرت امام رضاؑ۔ ص ۵۷

۵۔ دیار شہریاران بخش اول ۱/ ۳۲۰، ۸۶۹، ۷۷۵، ۷۷

۶۔ جغرافیائے تاریخی ہجرت امام رضاؑ۔ ص ۶۳

۷۔ مرات البلدان۔ ج ۱۔ ص ۳۶۸، زندگانی امام رضاؑ سحاب۔ ص ۲۳۲، جغرافیائے تاریخی ہجرت امام رضاؑ۔ ص ۷۸۔ ۷۹

۸۔ یادگارہائی یزد۔ ج ۱۔ ص ۳۵۷۔ ۳۵۸۔ کاشی کاری کا وہ حصہ جس میں امام رضاؑ کے ورود کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ زیادہ تر ضائع ہو چکا ہے۔

"لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ امیر المؤمنین به تاریخ ست و تسعین مائة علی بن موسیٰ الرضا اینجا رسیده است و در این مشهد فرود آمذ و مقام کرد و به تاریخ سنۂ اثنی وتسعین وخمسمائه خراب بوذ واز جهد بوبکربن علی ابی نصر فرموذند وبه دست ضعیف پر گناه یوسف بن علی بن محمد بناوا کرده شذ خذایابر آن کس رحمت کن کی یک بار قل هو الله به اخلاص در کار آنک فرموذ و آنک کرد وآنک خواند کنذ کتبه یوسف بن علی بن محمد فی شهر ربیع الاوّل سنة خمس وتسعین وخمسمائة."

"لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ امیر المومنین بتاریخ ایک سو چھیانوے ہجری میں علی بن موسیٰ الرضا یہاں تشریف لائے اور اس مقام پر نزولِ اجلال اور قیام فرمایا۔ سن ۵۹۲ ہجری میں یہ ویران تھا اور ابوبکر بن علی ابی نصر کے حکم پر ضعیف و گناہ گار یوسف بن علی بن محمد نے اسے تعمیر کیا۔ خدا اس پر رحمت کر جو ایک مرتبہ خلوص کے ساتھ قل ھو اللہ پڑھے اس کے لیے کہ جس نے فرمایا اور اس کے لیے جس نے اسے تعمیر کیا اور جس نے پڑھی۔ اسے یوسف بن علی بن محمد نے ربیع الاوّل سن ۵۹۵ ہجری میں لکھا۔"(۱)

یقیناً اس کے گرد و نواح میں کچھ شیعہ مقیم ہوں گے جنھوں نے اس گنبد کی حفاظت کی ہے۔ امام رضاؑ کے سفر کے آثار میں سے ایک اور تاریخی اثر فراشاہ میں قدم گاہ دہ شیر ہے۔ یہ قدم گاہ تفت سے دہ شیر جانے والی سڑک کے کنارے فراشاہ کے مرکز میں واقع ہے۔ اس کی محراب میں جو عبارت کندہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "کاکویہ دیلمی" کے امرا میں سے ایک "گرشاسب بن علی" نے سن ۵۱۲ ہجری میں اس عمارت کی تعمیر کروائی ہے۔ یہ عمارت اسی زمانے میں مسجد مشہد علی بن موسیٰ الرضا کے نام سے مشہور ہو چکی تھی۔

اس پر اس وقت کندہ عبارت کچھ اس طرح سے ہے:

پہلا حاشیہ: بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ذٰلِکَ الَّذِیۡ یُبَشِّرُ اللّٰہُ عِبَادَہٗ ... (شوریٰ۔۲۳)

دوسرا حاشیہ: بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ اور بارہ اماموں کے اسمائے گرامی۔

متن: آیۂ تطہیر (اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡهِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَهۡلَ الۡبَیۡتِ وَ یُطَهِّرَکُمۡ تَطۡهِیۡرًا۔)

دوسری سطر: لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ. (اس کے نیچے جدید تر خط میں علی ولی اللہ کا اضافہ کیا گیا ہے)

۱۔ یادگارہائی یزد، ج ۱، ص ۱۷۳۔۱۷۷

تیسری سطر: بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ...

چوتھی سطر: بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قُلْ ھُوَ اللہُ اَحَد...

امر بعمارۃ ھذا المسجد المعروف بمشھد علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام العبد المذنب الفقیر الی رحمۃ اللّٰہ تعالیٰ کرشاسب بن علی بن فرامز ابن علاء الدولہ تقبل اللّٰہ منہ فی شھور سنۃ اثنی عشرۃ و خمس مائۃ۔"(۱)

یزد کے "دار الشفاء" نامی محلے میں ایک انتہائی قدیم اور پرانی مسجد، مسجد فرط یا پتک کے نام سے موجود ہے۔ اس مسجد کی تعمیر کی داستان ابو مسلم خراسانی کے خروج کے دور تک پہنچتی ہے۔ کہا گیا ہے کہ جب امام رضاؑ خراسان کے سفر کے دوران یزد پہنچے تو اسی مسجد میں نماز ادا کی۔ آج بھی مسجد کا ایک حجرہ "صومعہ امام رضاؑ" کے نام سے مشہور ہے۔ سن ۱۰۸۷ میں اس مسجد کی تعمیر نو ہوئی۔ صومعہ میں ایک پتھر موجود ہے جس پر یہ عبارت تحریر ہے: وقف کرد بر صومعۂ متبرکۂ امام علی موسیٰ الرضا میرک شربت دار فی تاریخ سنۃ ۹۳۷۔(۲)

مسجد مشہد امام رضاؑ سے متعلق دو پتھر جن میں سے ایک ۵۱۶ میں لکھا گیا اور مشہد میں حرم امام رضاؑ کے میوزیم میں اور دوسرا ۵۴۷ میں لکھا گیا اور واشنگٹن کے فریر گیلری کے میوزیم میں موجود ہیں۔ یہ دونوں یزد کی قدم گاہوں اور اس خطے میں تشیع کے وجود کی علامت ہیں۔ ان دونوں پتھروں کی عبارت کو جناب افشار نے شائع کیا ہے۔

۵۱۶ میں لکھے گئے پتھر کی عبارت اس طرح سے ہے:

پہلا حاشیہ: بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اور بارہ اماموں کے نام۔

دوسرا حاشیہ: بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اور آیت انما ولیکم اللّٰہ۔

تیسرا حاشیہ: امر بعمارۃ المشھد الرضوی علی بن موسیٰ الرضاؑ المذنب الفقیر الی رحمۃ اللّٰہ ابو القاسم احمد بن علی بن احمد العلوی الحسینی تقبل اللّٰہ منہ۔

پیشانی پر: اللّٰہ اکبر

متن: ھذا مقام الرضا علیہ السلام اقبل علی صلوتک و لاتکن من الغافلین شعبان سنۃ ستۃ عشر و خمس۔

۱۔ یادگارہائی یزد۔ ج ۱۔ ص ۳۸۳۔ ۳۸۴

۲۔ ایضاً۔ ج ۲۔ ص ۲۱۱۔ ۲۱۷

نیچے: مائة. عمل عبد الله بن احمد مره. (۱)

دوسرا پتھر:

پہلا حاشیہ: سورۂ آل عمران کی آیت ۱۷ اور ۱۸۔

دوسرا اور تیسرا حاشیہ: بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. اور چہاردہ معصومینؑ کے نام۔

پیشانی پر: آیۂ تطہیر (اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا)

متن: سورۂ اخلاص اور یہ جملہ: امر بعمارة هذا المسجد المعروف بمشهد علی بن موسیٰ الرضا علیه السلام العبد المذنب الی رحمة الله تعالی جنید بن عمار بر الفاد. (ف کا نقطہ واضح نہیں ہے)

پتھر کے نچلی جانب: فی سنة سبع و اربعین و خمس مائة. عمل احمد بن محمد بن احمد اسک. (۲)

''مسجد قدم گاہ'' کے نام سے ایک اور مسجد شہر یزد کے محلہ مالمیر میں خارج حصار موجود ہے۔(۳)

''نائین'' سے پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ''بافران'' نامی دیہات میں ایک درخت ہے جسے لوگ ''موم رضاؑ'' کہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ امام رضاؑ نے اس درخت کے نیچے غذا تناول فرمائی تھی۔ لوگ روز عاشورا اور اکیس رمضان المبارک کے دن یہاں جمع ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ عباس نے بھی وہاں پر ایک عمارت تعمیر کروائی تھی۔(۴) خود ''نائین'' میں بھی قدم گاہ و مسجد قدیمان موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امامؑ نے اس مسجد میں نماز ادا کی تھی۔ اسی ''نائین'' میں ایک حمام اور مسجد امام رضاؑ بھی ہے' جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ امامؑ نے اس حمام میں غسل فرمایا اور اس مسجد میں نماز ادا کی تھی۔ یہ دونوں ''نائین'' کے محلے ''گودالو'' میں واقع ہیں۔ ''مسجد کلوان'' کے پیچھے بھی ایک قدم گاہ موجود ہے' جو امام رضاؑ سے منسوب ہے۔(۵)

رافعی نے لکھا ہے کہ: قد اشتهر اجتياز علی بن موسیٰ الرضا بقزوین و یقال انه کان مستخفیا فی

۱۔ یادگارہائی یزد۔ ج ۲۔ ص ۹۱۷

۲۔ یادگارہائی یزد۔ ج ۲۔ ص ۹۱۸۔ گویا کتاب جغرافیائے تاریخی ہجرت امام رضاؑ کے فاضل مصنف نے ان موارد اور ان کے بعد آنے والے موارد سے غفلت برتی ہے۔

۳۔ یادگارہائی یزد۔ ج ۲۔ ص ۲۷۴

۴۔ تاریخ نائین۔ ج ۲۔ ص ۲۳۶۔ ۲۳۷' جغرافیائے تاریخی ہجرت امام رضاؑ۔ ص ۱۰۹

۵۔ تاریخ نائین۔ ج ۲۔ ص ۲۳۰۔ ۲۳۷' جغرافیائے تاریخی ہجرت امام رضاؑ۔ ص ۱۱۳۔ ۱۱۵

دار داود بن سلیمان غازی. (۱) مشہور ہے کہ علی ابن موسیٰ الرضاؑ قزوین سے گزرے ہیں اور کہا گیا ہے کہ آپ داؤد بن سلیمان غازی کے گھر میں روپوش تھے۔ گویا کسی کو اس بات میں شک نہیں ہے کہ خراسان کے سفر میں امامؑ قزوین سے نہیں گزرے ہیں۔ نیز یہ بھی کہا گیا ہے کہ امام رضاؑ "نطنز" سے گزرے ہیں اور جو مقام آج قدم گاہ علیؑ کے نام سے مشہور ہے وہ اس شہر میں امام رضا کے قیام سے تعلق رکھتا ہے۔ (۲)

یہ روایت بھی ہے کہ امام رضاؑ "دامغان" سے گزرے ہیں اور "آہوان" نامی مقام پر چند آہو (ہرن) آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ (۳)

امام علی رضا علیہ السلام کی نیشاپور میں تشریف آوری متعدد کتابوں میں مذکور ہے۔ شیخ صدوق نے نیشاپور کے محلّے "فرز" میں آپ کے تشریف لانے کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ اب تک (چوتھی صدی کا دوسرا نصف) وہاں پر ایک حمام موجود ہے جو حمامِ رضا کے نام سے مشہور ہے۔ (۴) اسی طرح نیشاپور سے بیس کلومیٹر کے فاصلے پر امام رضاؑ سے منسوب ایک مشہور قدم گاہ موجود ہے جو اسی نام سے شہرت رکھتی ہے۔ حمراء (۵) نامی محلے میں بھی ایک مقام عین الرضا کے نام سے مشہور رہا ہے۔ "پسندہ" کے نام سے ایک اور مقام کا ذکر بھی موجود ہے جو امامؑ کی اقامت گاہ تھی اور یہ جگہ امامؑ کو پسند تھی اسی وجہ سے اسے پسندہ کا نام دیا گیا ہے۔ (۶)

امام علی رضا علیہ السلام کے اصحاب میں ایسے افراد بھی ہیں جو حتیٰ اگر عرب تھے بھی تو انہوں نے ایرانی شہروں میں اقامت اختیار کی اور ایرانی نام پائے۔ چند افراد جو ہمدانی کے نام سے مشہور ہیں ہم نہیں جان سکے کہ وہ ھَمْدانی ہیں یا ھَمَدانی۔ اسی لیے ہم نے اُن کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ہم نے رازیوں قمیوں اور ایران کے علاوہ دوسرے شہروں کا ذکر بھی نہیں کیا ہے۔ جن افراد کے لقب ایرانی شہروں سے منسوب ہیں وہ یہ ہیں: ابراہیم بن ابی محمد خراسانی (مسند الرضاؑ۔ ج ۲۔

۱۔ التدوین فی اخبار قزوین۔ ج ۳۔ ص ۴۲۸

۲۔ دیکھئے: میراث فرہنگی نطنز۔ ص ۱۵۸۔ ۱۶۱

۳۔ بحر الانساب۔ ص ۱۰۱۔ ۱۰۳۔ اس میں شہر دامغان کی بجائے خراسان صوبے کا ذکر ہے۔ دیکھئے: جغرافیائے تاریخی ہجرت امام رضاؑ۔ ص ۱۱۶۔ ۱۱۷

۴۔ جغرافیائے تاریخی امام رضاؑ۔ ص ۱۳۲۔ ۱۳۳

۵۔ الثاقب فی المناقب۔ ص ۱۳۶۔ کہا گیا ہے کہ اس زمانے کا "حمراء" آج کا "دہ سرخ" ہو۔ دیکھئے: جغرافیائے تاریخی ہجرت امام رضاؑ۔ ص ۱۳۶

۶۔ الثاقب فی المناقب۔ ص ۱۳۶

ص ۵۱۱)' ابو سعید الخراسانی (مسند۔ ج ۲۔ ص ۵۱۴)' محمد بن عبداللہ الخراسانی (مسند۔ ج ۲۔ ص ۵۴۸)' سلیمان بن حفص مروزی (مسند۔ ج ۲۔ ص ۵۳۳)' سلیمان بن صالح مروزی (مسند۔ ج ۲۔ ص ۵۳۴)' سہل بن قاسم نوشجانی (مسند ج ۲۔ ص ۵۳۴)' ابو القاسم الفارسی (مسند۔ ج ۲۔ ص ۵۱۵)' فتح بن یزید الجرجانی (مسند۔ ج ۲۔ ص ۵۴۲)' فضالۃ بن ایوب ازدی سکن اہواز (مسند۔ ج ۲۔ ص ۵۴۳)' محمد بن اسحاق طالقانی (مسند۔ ج ۲۔ ص ۵۴۵) محمد بن ابی یعقوب بلخی (مسند۔ ج ۲۔ ص ۵۴۵)' محمد بن زید طبری (اصل کوفی) (مسند۔ ج ۲۔ ص ۵۴۷)' نعیم بن صالح طبری (مسند۔ ج ۲۔ ص ۵۵۳)' ابو سعید النیسابوری (مسند۔ ج ۲۔ ص ۵۱۵)' حمزۃ بن جعفر الارجانی (مسند۔ ج ۲۔ ص ۵۱۵) اور ابو حیون مولی الرضا (مسند۔ ج ۲۔ ص ۵۱۴)

☆☆☆

علیہ السّلام

امام محمد تقی

"قال المامون: انه لأفقه منكم وأعلم بالله ورسوله وسنته وأحكامه وأقرأ لكتاب الله منكم وأعلم بمحكمه ومتشابهه وناسخه ومنسوخه وظاهره وباطنه وخاصه وعامه وتنزيله وتأويله منكم."

"مامون نے کہا: وہ تم سے زیادہ فقیہ ہیں، اور تم سے زیادہ اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کی سنت اور احکام کے بارے میں جانتے ہیں۔ وہ تم سے زیادہ کتاب خدا کے پڑھنے والے ہیں اور تم سے زیادہ اس کے محکم، متشابہ، ناسخ، منسوخ، ظاہر، باطن، خاص، عام، تنزیل اور تاویل کے جاننے والے ہیں۔"

(تحف العقول۔ ص ۴۵۱)

امامت ۱۷ سال

امام محمد تقی کی شخصیت

محمد بن علی بن موسیٰ الرضا علیہما السلام شیعہ امامیہ کے نویں پیشوا اور اپنے نانا کی امت کی ہدایت کے لیے خدا کے منتخب بندوں میں سے ہیں۔ کلینی، شیخ مفید اور شیخ طوسی نے آپ کی ولادت کا مہینہ ماہِ رمضان قرار دیا ہے۔(۱) شیخ مفید نے ماہِ رمضان کی پندرہ تاریخ (۲) اور چند دوسرے مورخین (۳) نے اسی مہینے کی انیس تاریخ قرار دی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کی ولادت سن ۱۹۵ ہجری میں ہوئی ہے۔(۴)

کلینی، شیخ طوسی اور نوبختی کے بقول آپ کی رحلت (۵) ماہِ ذیقعد سن ۲۲۰ ہجری کے آخر میں ہوئی ہے۔(۶) مسعودی نے اسے پانچ ذی الحجہ قرار دیا ہے (۷) اور بعض ذرائع نے چھ ذی الحجہ نقل کیا ہے۔(۸)

امام محمد تقی علیہ السلام کی والدہ کا نام سبیکہ [سکینہ] نوبیہ (۹) اور ایک اور روایت کے مطابق ''خیزران'' تھا، جن کا

۱۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۴۹۲، ارشاد۔ ص ۲۹۷، التہذیب۔ ج ۶۔ ص ۹۰

۲۔ مسار الشیعہ۔ ص ۷

۳۔ اثبات الوصیہ۔ ص ۲۰۹، کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۳۴۳، روضۃ الواعظین۔ ص ۲۸۹، اعلام الوریٰ۔ ص ۳۴۴، مناقب ابن شہر آشوب۔ ج ۴۔ ص ۳۷۹

۴۔ کتاب ''تواریخ النبی والآل'' کے صفحہ ۳۸ پر غلطی سے آیا ہے کہ ''وکیف کان فلا خلاف فی سَنَتِہ، سَنَۃ خمس و سبعین و مائۃ.'' اسے ''خمس و تسعین مائۃ.'' ہونا چاہیے۔

۵۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۴۹۷، التہذیب۔ ج ۶۔ ص ۹۰، فرق الشیعہ۔ ص ۱۰۰

۶۔ صرف ''مروج الذہب'' میں آپ کی وفات کا سال ۲۱۹ ہجری ذکر کیا گیا ہے، جو درست نہیں ہے۔ دیکھیے: ج ۳۔ ص ۴۶۴

۷۔ اثبات الوصیہ۔ ص ۲۲۰، مروج الذہب۔ ج ۳۔ ص ۴۶۴

۸۔ تاریخ بغداد۔ ج ۳۔ ص ۵۵۔ وہاں آیا ہے کہ حضرت نے ۶ ذی الحجہ بروز منگل سن ۲۲۰ ہجری کو رحلت فرمائی۔

۹۔ ''نوبہ'' کا اطلاق جنوب مصر میں واقع وسیع سرزمینوں پر ہوتا ہے۔ وہاں کے لوگ نصرانی ہیں اور اس خطے کے لوگوں کی اچھائی کے بارے میں رسول خدا کی ایک روایت نقل ہوئی ہے۔ معجم البلدان۔ ج ۵۔ ص ۳۰۹

تعلق ام المومنین حضرت ماریہ قبطیہ کے خاندان سے قرار دیا گیا ہے۔(۱) آپ کی والدہ کا نام "ریحانہ" بھی بیان کیا گیا ہے۔ نوبختی کے بقول آپ کی والدہ کا نام "درّہ" تھا جنہیں بعد میں خیزران کہا گیا۔(۲)

امام محمد تقی علیہ السلام کا مشہور ترین لقب "جواد" ہے اور دوسرے القاب جیسے زکی، مرتضیٰ، قانع، رضی، مختار، متوکل اور منتجب بھی بیان کیے گئے ہیں۔ آپ کی کنیت "ابوجعفر" ہے، جسے عام طور پر تاریخی روایات میں "ابوجعفر ثانی" لکھا گیا ہے، تا کہ اسے "ابوجعفر اوّل" یعنی امام محمد باقر علیہ السلام سے جدا پہچانا جاسکے۔ آپ نے پچیس سال عمر پائی، اور اپنے والدِ بزرگوار کی شہادت کے بعد سن ۲۰۳ ہجری سے ۲۲۰ ہجری تک شیعوں کی امامت کی ذمے داری اٹھائی۔

امام محمد تقی کی امامت

ایک مسئلہ جس نے بعد میں امامت سے تعلق رکھنے والے کلامی مباحث میں ایک خاص مقام حاصل کیا، وہ یہ تھا کہ آیا ممکن ہے کوئی شخص بالغ ہونے سے پہلے مقامِ امامت پر فائز ہو جائے؟ یہ مسئلہ اُس وقت سے شیعوں کی علمی اور کلامی محافل میں سنجیدگی کے ساتھ زیرِ بحث آنے لگا جب سن ۲۰۳ ہجری میں امام محمد تقی علیہ السلام مقامِ امامت پر فائز ہوئے۔ بعد میں سن ۲۲۰ ہجری میں امام علی نقی علیہ السلام اور اُن کے بعد امام مہدی علیہ السلام کی امامت کے بارے میں بھی اس مسئلے پر بحث جاری رہی۔

جب سن ۲۰۳ ہجری میں امام علی رضا علیہ السلام کی شہادت واقع ہوئی، تو آپ کے شیعہ گہری پریشانی اور اضطراب کا شکار ہو گئے، کیونکہ اُس وقت آپ کے اکلوتے فرزند (امام محمد تقی علیہ السلام) کی عمر صرف آٹھ برس تھی۔ بعض مورخین کے بقول: اس مسئلے میں شیعہ پریشان ہو گئے اور ان کے درمیان اختلاف پھوٹ پڑا، دوسرے شہروں میں بسنے والے شیعوں کا بھی یہی حال تھا۔(۳) لہٰذا ان کا ایک گروہ عبدالرحمٰن بن حجاج کے گھر جمع ہو کر گریہ وزاری کرنے لگا۔(۴) شیعہ جو امامِ معصوم کی اطاعت کو ایمان کا اہم ترین رکن سمجھتے ہیں اور اپنے فقہی اور دینی مسائل ومشکلات میں اُس کی طرف رجوع کرتے ہیں، اُن کے لیے یہ انتہائی اہمیت کا حامل مسئلہ تھا، اور اسے اسی طرح بغیر حل کیے نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ البتہ شیعوں کو یقین تھا کہ امام علی رضا علیہ السلام نے اپنے فرزند امام محمد تقی علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر کیا ہے، لیکن آپ کی کمسنی کی وجہ سے پیدا ہونے والی مشکل نے شیعوں کو اس بات پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ اطمینانِ خاطر کے لیے اس

۱۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۴۹۲، التہذیب۔ ج ۶۔ ص ۹۰
۲۔ فرق الشیعہ۔ ص ۱۰۰
۳۔ دلائل الامامہ۔ ص ۲۰۴
۴۔ عیون المعجزات۔ ص ۱۱۹

بارے میں مزید تحقیق کریں۔

امام محمد تقی علیہ السلام کی جانشینی کے بارے میں امام علی رضاؑ سے ملنے والی نصوص میں' خاص طور پر اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ آپ نے اپنے کمسن فرزند امام محمد تقی علیہ السلام کو اپنی جانشینی کے لیے چنا ہے' اور باوجودیکہ اس کام کے لیے کافی وقت باقی تھا' آپ اُن کی جانشینی پر اصرار کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اپنے بعض اصحاب کی جانب سے امام محمد تقی علیہ السلام کی کم سنی کی جانب اشارہ کیے جانے پر' آپ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شیر خوارگی کی عمر میں نبی بنائے جانے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "جب عیسیٰؑ کو نبوت عطا کی گئی' تو اس وقت اُن کی عمر میرے فرزند سے بھی کم تھی۔" (۱)

امام علی رضا علیہ السلام کی رحلت کے بعد شیعوں کے درمیان پیدا ہونے والا اضطراب' اس بات کا سبب بنا کہ اُن میں سے کچھ لوگ امام رضاؑ کے بھائی عبداللہ بن موسیٰ کی طرف چلے گئے۔ لیکن کیونکہ شیعہ بغیر دلیل کے کسی کی امامت قبول کرنے پر تیار نہ تھے' اس لیے ان میں سے بعض لوگوں نے عبداللہ کے سامنے کچھ سوالات پیش کیے اور جب ان لوگوں نے انہیں ان سوالات کے جواب دینے سے عاجز پایا' تو اُن سے دور ہو گئے۔ (۲)

کچھ لوگ واقفیوں سے ملحق ہو گئے' جو امام موسیٰ کاظم علیہ السلام پر ٹھہر گئے تھے۔ نوبختی کے خیال میں اس اختلاف کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ بلوغ کو امامت کی شرائط میں سے ایک شرط سمجھتے تھے۔ (۳)

اس پوری صورتحال کے باوجود اکثر شیعوں نے امام محمد تقی علیہ السلام کی امامت تسلیم کر لی۔ اگرچہ ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے کم عمری کے مسئلے کو خود امام محمد تقی علیہ السلام کی خدمت میں بھی پیش کیا تھا' اور امامؑ نے اُن کے جواب میں حضرت سلیمانؑ کے حضرت داؤدؑ کے جانشین ہونے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ: "حضرت سلیمانؑ بھی ایک کم سن بچے سے زیادہ نہ تھے اور بھیڑوں کو چرانے کے لیے لے جاتے تھے' لیکن انہیں حضرت داؤدؑ نے اپنا جانشین بنا دیا تھا۔ حالانکہ بنی اسرائیل کے علما اور عبادت گزار افراد ان کے اس اقدام کو نہیں مانتے تھے۔" (۴)

نوبختی کی تحریر کے مطابق امام محمد تقی علیہ السلام کی امامت پر استدلال کرنے والوں کی جانب سے حضرت یحییٰ بن زکریاؑ' شیر خوارگی کی عمر میں حضرت عیسیٰؑ کی نبوت' حضرت یوسفؑ کی داستان اور حضرت سلیمانؑ کے علم کو بطور دلیل پیش کرنا

۱۔ روضۃ الواعظین۔ ص ۲۰۲

۲۔ دیکھئے: مناقب ابن شہر آشوب۔ ج ۲۔ ص ۴۲۹' مسند الامام الجوادؑ۔ ص ۲۹۔ ۳۰' ۲۲۲

۳۔ فرق الشیعہ۔ ص ۸۸' المقالات والفرق۔ ص ۹۵

۴۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۳۸۳

اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ "حجت خدا" اگرچہ بلوغ کی عمر کو نہ پہنچا ہو پھر بھی بغیر کسی اور کی جانب سے تعلیم دیے اور لدنی طور پر علم کا مالک ہو سکتا ہے۔(۱)

ائمہ اہل بیتؑ کی امامت پر عقیدہ رکھنے والے شیعہ ایک طرف تو امامت کو اس کے الٰہی پہلو سے دیکھتے تھے اس لیے امام کی کمسنی ان کے عقیدے میں کوئی خلل نہیں ڈال سکتی تھی لیکن دوسری طرف جو بات اہمیت کی حامل تھی وہ اس الٰہی پہلو کا ائمہؑ کے علم و دانش کے ذریعے ظہور تھا۔ درحقیقت ائمہ شیعوں کے تمام سوالات کے جواب دینے والے ہوتے تھے۔ اسی لیے شیعہ تمام ائمہؑ کے بارے میں اس اصول کو ملحوظ رکھتے تھے اور ان سے طرح طرح کے سوالات کیا کرتے تھے۔ اور (ان کی امامت کے بارے میں نص کی موجودگی میں) صرف اسی صورت میں انہیں امام معصوم تسلیم کرتے تھے جب انہیں یہ احساس ہو جاتا تھا کہ وہ بخوبی ان کے سوالات کے جوابات دے رہے ہیں۔

امام محمد تقی علیہ السلام کی کمسنی کے پیش نظر شیعوں کی جانب سے آپ کی آزمائش کی ضرورت نے شدت اختیار کر لی تھی۔ اس بنیاد پر انہوں نے مختلف مواقع پر آپ کی یہ آزمائش کی اور اس کے بعد (بہت تھوڑے سے لوگوں کے سوا) تقریباً تمام ہی شیعوں نے اطمینانِ قلبی کے ساتھ آپ کی امامت کو تسلیم کر لیا۔

ایک محفل میں جس کے بارے میں پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اس میں جانشینی کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے شیعہ اکٹھے ہوئے تھے امام رضا علیہ السلام کی نظر میں ایک قابلِ اعتماد شیعہ یونس بن عبدالرحمٰن نے کہا: اس بچے (امام محمد تقی) کے بڑے ہونے تک ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اس موقع پر ریان بن صلت اپنی جگہ سے اٹھے اور اعتراض کرتے ہوئے کہا: تم بظاہر اپنے آپ کو امام محمد تقی علیہ السلام کی امامت کا معتقد قرار دیتے ہو لیکن دکھائی یہ دیتا ہے کہ باطن میں تمہیں ان کی امامت کے بارے میں شک ہے! اگر امامت خدا کی جانب سے ہو تو ایک دن کا بچہ بھی بزرگ کے برابر ہے اور اگر خدا کی جانب سے نہ ہو تو ہزار سال عمر کا انسان بھی عام لوگوں کی طرح ہے۔ اس موقع پر دوسرے لوگوں نے اٹھ کر ریان کو خاموش کرایا۔۔۔ آخر کار ایامِ حج میں بغداد اور دوسرے شہروں سے تعلق رکھنے والے اسّی شیعہ علما جمع ہو کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ وہاں یہ لوگ پہلے عبداللہ بن موسیٰ کاظمؑ کے پاس گئے لیکن جب انہیں وہاں اپنا مطلوب نہ ملا تو وہاں سے رُخ موڑ کر امام محمد تقی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ان کے سوالات کے جواب دیے اور وہ لوگ آپ کے جوابات سن کر جو آپ کی امامت اور علمِ الٰہی کی واضح دلیل تھے مسرت سے کھل اٹھے۔(۲)

۱۔ فرق الشیعہ۔ ص ۹۰، المقالات والفرق۔ ص ۹۴-۹۵

۲۔ بحار الانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۹۹-۱۰۰، از عیون المعجزات۔ ص ۱۱۹-۱۲۱ اور دیکھیے: اثبات الوصیہ۔ ص ۲۱۳

ایک مرتبہ مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے شیعوں کا ایک گروہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایک نشست میں آپ سے بہت سے سوالات کیے۔ آپ نے جو اس وقت دس برس سے زیادہ کے نہ تھے ان کے ان تمام سوالات کے جواب دیے۔ (۱) اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ:

اولاً: شیعہ اس بات پر مصر تھے کہ وہ امامؑ کے علم کے ذریعے ان کی امامت کو قبول کریں گے۔

ثانیاً: امامؑ جو اس وقت ایک کم سن بچے ہی تھے امر امامت کے الٰہی ہونے کی وجہ سے شیعوں کی طرف سے کیے جانے والے علمی اور فقہی سوالات کے جواب دینے پر قادر تھے۔

شیخ مفید نے (اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہ امام علی رضا علیہ السلام کی وفات کے بعد بعض شیعہ حتیٰ آپ کی امامت کا انکار کر کے عقیدۂ واقفیہ کے پیرو ہو گئے تھے اور کچھ اور لوگوں نے احمد بن موسیٰ کی امامت کو قبول کر لیا تھا) حضرت امام محمد تقی علیہ السلام کی امامت کی تاکید کی ہے جنہیں شیعوں کی اکثریت نے قبول کر لیا تھا اور اسے ثابت کرنے کے لیے اس عقلی دلیل کمال العقل لایستنکر لحجج اللہ مع صغر السنّ. (کمسنی کے باوجود حجت خدا کے لیے عقل کا کمال کوئی انوکھی بات نہیں) کے علاوہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں نازل ہونے والی آیات سے بھی استدلال کیا ہے۔ نیز اسلام قبول کرنے کے لیے رسول کریمؐ کی جانب سے حضرت علیؑ کو دعوت دینا (جبکہ آپ ابھی بالغ بھی نہ ہوئے تھے) حالانکہ اسی عمر کے دوسرے افراد کو آنحضرت نے ہرگز اس قسم کی دعوت نہیں دی تھی اور امام حسنؑ اور امام حسینؑ کا اس وقت انتہائی کم سن ہونے کے باوجود مباہلے میں شرکت کرنا بھی شیخ مفید کے نزدیک امام محمد تقی علیہ السلام کی امامت صحیح ہونے پر ایک دلیل ہے۔ (۲)

امامت کے مسئلے میں جس بات کو اہمیت حاصل ہے وہ گزشتہ امامؑ کی اپنے بعد آنے والے امامؑ کے بارے میں نص ہے جسے شیخ مفید نے امام محمد تقی علیہ السلام کے لیے امام رضا علیہ السلام کے چند بزرگ اور نزدیکی اصحاب سے نقل کیا ہے اور اس نص کے راویوں کے یہ اسمائے گرامی بیان کیے ہیں: علی بن جعفر بن محمد صادقؑ، صفوان بن یحییٰ، معمر بن خلاد، حسین بن بشار، ابن ابی نصر بزنطی، ابن قیام واسطی، حسن بن جہم، ابو یحییٰ صنعانی، خیرانی، یحییٰ بن حبیب بن زیات اور کچھ دوسرے افراد۔ (۳)

شیخ مفید نے ان میں سے چند افراد کی روایات کو کتاب ارشاد میں نقل کیا ہے اور "استاد عطاردی" نے تقریباً ان

۱۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۴۹۶
۲۔ الفصول المختار۔ ص ۲۵۶۔ ۲۵۷
۳۔ ارشاد۔ ص ۳۱۷، اعلام الوریٰ۔ ص ۳۳۰

سب کو مسند الامام الجوادؑ میں جمع کیا ہے۔(۱) علامہ مجلسی نے بھی بحار الانوار میں امام محمد تقیؑ کے بارے میں نصوص کے ذکر کے لیے ایک فصل مخصوص کی ہے۔(۲)

ان روایات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ امام علی رضا علیہ السلام نے متعدد مواقع پر اور مختلف مناسبتوں سے اپنے فرزند بزرگوار کی امامت کا ذکر کیا ہے' اور اپنے خاص اصحاب کو اس معاملے سے باخبر رکھا ہے۔ درحقیقت امام علی رضاؑ کے اصحاب کی اکثریت کا امام محمد تقیؑ کی امامت پر برقرار رہنا' جس کی بنیاد امام علی رضاؑ کے فرامین ہی تھے' امام محمد تقیؑ کی امامت پر بہترین دلیل ہے۔ کیونکہ شیعہ فقہا اور محدثین ائمہؑ کی امامت قبول کرنے کے سلسلے میں غیر معمولی احتیاط سے کام لیا کرتے تھے' اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا' نص کے ہوتے ہوئے بھی' متعدد علمی سوالات کے بعد ان کی امامت قبول کیا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کبھی کبھی نص ایک سے زیادہ افراد کے لیے بھی ہوا کرتی تھی' تاکہ دشمن کسی ایک خاص شخص کے بارے میں حساسیت کا شکار نہ ہو۔

امام محمد تقی کی تاریخی زندگی

امام محمد تقی علیہ السلام کی زندگی کے بارے میں زیادہ وسیع تاریخی معلومات موجود نہیں ہیں' کیونکہ ہر دور میں ائمہؑ سے متعلق اطلاعات کے عام ہونے میں رکاوٹ بننے والی سیاسی پابندیوں کے علاوہ ائمہ معصومینؑ اور اُن کے شیعوں کو حکمرانوں کے دباؤ سے محفوظ رکھنے کے لیے اختیار کیا جانے والا تقیہ اور آپ کی خفیہ جدوجہد کے طریقے بھی تاریخی منابع (sources) میں آپ کے بارے میں اطلاعات نقل نہ ہونے کا مؤثر عامل ہیں۔ علاوہ ازایں' امام محمد تقیؑ کی زندگی بھی مختصر تھی' جس کی بنا پر آپ کے بارے میں بکثرت روایات ہماری دسترس میں نہیں۔

اور یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جب امام علی رضا علیہ السلام کو خراسان لے جایا گیا' تو آپ اپنے گھرانے کے کسی ایک فرد کو بھی اپنے ساتھ لے کر نہیں گئے' اور وہاں تنہا زندگی بسر کی۔ اس مدت میں امام محمد تقی علیہ السلام اپنے والد گرامی سے ملاقات کے لیے طوس گئے یا نہیں' اس بارے میں صرف ''ابن فندق'' نے ''تاریخ بیہق'' میں نقل کیا ہے کہ آپ سن ۲۰۲ ہجری میں طوس تشریف لائے' اور وہاں اپنے والد سے ملاقات کی۔ اس بارے میں ابن فندق کی روایت کا متن درج ذیل ہے:

''محمد بن علی بن موسیٰ الرضاؑ' جن کا لقب تقی تھا' انہوں نے طبس مسینا کے راستے دریا عبور کیا۔(۳)

۱۔ مسند الامام الجوادؑ۔ ص ۵۰' ۲۵۰ ۔ ۳۳۳۔ ہم نے اس تحریر میں اس مجموعے سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔
۲۔ بحار الانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۱۸۔ ۳٦
۳۔ عبارت اصل میں اسی طرح ہے۔

(کیونکہ اس وقت قومس (دامغان) کا راستہ استعمال نہیں ہوتا تھا اور اس راستے کو نزدیکی عہد میں سفر کے لیے استعمال کیا گیا) آپ بیہق کے نواح میں پہنچے اور ششتمد نامی دیہات میں اترے اور وہاں سے اپنے والد علی بن موسیٰ الرضاؑ کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے سن ۲۰۲ ہجری میں۔''(۱)

اس بات کا ذکر دوسری کتابوں میں نہیں ہوا ہے۔ امام علی رضا علیہ السلام کی شہادت سے متعلق روایات سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں امام محمد تقی علیہ السلام مدینہ میں مقیم تھے اور صرف اپنے والد کے غسل و کفن اور اقامۂ نماز کے لیے طوس تشریف لائے تھے۔ البتہ اس بات کا بھی امکان ہے کہ اس سے پہلے آپ ایک مرتبہ طوس تشریف لائے ہوں۔ مذکورہ روایت پر غور کیا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ممکن ہے کہ ابن فندق نے اس روایت کو حاکم نیشاپوری کی ''تاریخ نیشاپور'' سے لیا ہو۔

جب مامون امام علی رضا علیہ السلام کی شہادت کے بعد سن ۲۰۴ ہجری میں بغداد لوٹ گیا تو اسے امام رضاؑ کی جانب سے تو اطمینان ہو چکا تھا لیکن وہ یہ جانتا تھا کہ شیعہ امام علی رضاؑ کے بعد ان کے بیٹے کی امامت قبول کر لیں گے اور یوں خطرہ اپنی جگہ موجود رہے گا۔ اسے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو کنٹرول کرنے کے سلسلے میں اپنے باپ (جس نے امامؑ کو بغداد بلا کر قید کر دیا تھا) کی پالیسی یاد تھی۔ اس نے اسی پالیسی سے سبق سیکھتے ہوئے امام علی رضاؑ کے ساتھ بھی یہی رویہ اپنایا لیکن ریاکاری اور دھوکا دہی کے ساتھ۔ چنانچہ اس نے کوشش کی کہ نہ صرف بظاہر قید وغیرہ کی کوئی صورت سامنے نہ آئے بلکہ دوستانہ طرزِ عمل اختیار کر کے اس طرح پروپیگنڈا کیا جائے کہ وہ امامؑ سے شدید محبت کرتا ہے۔ اب امام محمد تقیؑ سامنے تھے جنہیں کسی نہ کسی صورت سے کنٹرول کرنا مقصود تھا۔ مامون نے اس مقصد کے لیے اپنی بیٹی کو ان کے نکاح میں دے دیا اور انہیں اپنا داماد بنا لیا۔ اس طرح سے وہ ایک طرف تو امامؑ کو آسانی کے ساتھ اپنے کنٹرول میں رکھ سکتا تھا اور دوسری طرف آپ کے پاس شیعوں کی آمد و رفت اور امامؑ کے ساتھ ان کے روابط کی نگرانی کر سکتا تھا۔

بعض روایات کے مطابق مامون نے (سن ۲۰۴ ہجری میں) بغداد پہنچنے کے بعد فوری طور پر امام محمد تقی علیہ السلام کو مدینہ سے بغداد طلب کیا۔ (۲) علاوہ ازایں کیونکہ مامون پر الزام تھا کہ اس نے امام علی رضاؑ کو شہید کیا ہے اس لیے اب اس کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ ان کے بیٹے کے ساتھ ایسا سلوک کرے کہ اس الزام سے بھی بری ہو جائے۔

اس بات پر بھی توجہ مرکوز رکھنے کی ضرورت ہے کہ بعض تاریخی روایات کے مطابق مامون نے امام علی رضاؑ

۱۔ تاریخ بیہق۔ ص ۴۶

۲۔ الحیاۃ السیاسیہ للامام الجوادؑ۔ ص ۶۵۔ یہ وہ روایت ہے جسے کچھ لوگوں نے نقل کیا ہے لیکن جو روایت اکثر نقل کی گئی ہے اور اسے ہم بعد میں ذکر کریں گے وہ طبری وغیرہ کی روایت ہے جس میں آیا ہے کہ امام محمد تقی علیہ السلام سن ۲۱۵ میں بغداد تشریف لائے ہیں۔

کو ولی عہد بناتے وقت ہی اپنی بیٹی ام فضل کو امام محمد تقی علیہ السلام کے عقد میں دے دیا تھا' یا امامؑ کے ساتھ اس کا رشتہ طے کر دیا تھا۔ طبری اور ابن کثیر کے بقول' جب سن ۲۰۲ ہجری میں مامون کی بیٹی ام حبیب امام علی رضاؑ کے عقد میں آئی' اُسی وقت اُس نے اپنی دوسری بیٹی ام فضل کو امام محمد تقی علیہ السلام کے عقد میں دے دیا۔ (۱) شاید یہ موضوع صاحب جہق کی اس روایت کے درست ہونے کا قرینہ ہو کہ امام محمد تقی علیہ السلام سن ۲۰۲ ہجری میں اپنے والد سے ملاقات کے لیے طوس تشریف لائے تھے۔

وہ روایت جسے شیخ مفید نے ریان بن شبیب سے نقل کیا ہے' اُس سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ: جب مامون نے ام فضل کو امام محمد تقی علیہ السلام کے عقد میں دینے کا فیصلہ کیا' تو عباسیوں میں بے چینی پھیل گئی' کیونکہ انہیں اس بات کا خوف ہوا کہ کہیں مامون کے بعد خلافت علوی خاندان میں نہ لوٹ جائے' جیسے کہ وہ امام رضاؑ کے بارے میں بھی اسی شدید پریشانی کا شکار تھے۔ (۲) لیکن جیسا کہ مندرجہ بالا دو روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک مختلف طریقے سے اپنی مخالفت کا اظہار کیا اور مامون سے کہا کہ: وہ اپنی بیٹی ایک ایسے بچے کے عقد میں دے رہا ہے جسے نہ دین خدا کے بارے میں کوئی سمجھ بوجھ ہے' نہ وہ حلال و حرام میں تمیز کر سکتا ہے اور نہ اسے واجب اور مستحب کی پہچان ہے۔

ان لوگوں کے اس اعتراض کے جواب میں مامون نے ایک نشست کا اہتمام کیا' اور امام محمد تقی علیہ السلام کو اس زمانے کے سب سے بڑے اہل سنت عالم اور فقیہ یحییٰ بن اکثم کے ساتھ مناظرے کی دعوت دی' تاکہ اس طرح عباسیوں سے تعلق رکھنے والے اپنے مخالف اور معترض لوگوں پر اُن کی غلطی آشکار کر دے۔ (۳) یہ سب اس حال میں ہو رہا تھا کہ مذکورہ دو روایات کے مطابق ام فضل کے ساتھ عقد کے وقت امام محمد تقی علیہ السلام کو بچہ کہا جاتا تھا۔

ایک روایت جو ابن طیفور' ابن اثیر اور بعض دوسروں سے نقل ہوئی ہے' اور اس کے صحیح ہونے کا بھی پورا امکان موجود ہے' اُس میں ہے کہ: جب سن ۲۱۵ ہجری میں مامون ''تکریت'' پہنچا' تو امام محمد تقی علیہ السلام بھی مدینہ سے بغداد پہنچ چکے تھے۔ آپ مامون سے ملاقات کے لیے تکریت تشریف لے گئے' اور وہیں ام فضل کا آپ سے عقد ہوا۔ اس کے بعد آپ موسم حج کی آمد تک بغداد میں احمد بن یوسف کے مکان میں مقیم رہے' جو دجلہ کے کنارے بنایا گیا تھا' اور پھر اپنے اہل خانہ کے ساتھ مراسم حج کی ادائیگی کے لیے مکہ تشریف لے گئے اور وہاں سے مدینہ پہنچے اور پھر وہیں رہے۔ (۴)

۱۔ تاریخ طبری۔ ج ۷۔ ص ۱۳۹' البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۰۔ ص ۲۶۰
۲۔ ارشاد۔ ص ۳۱۹
۳۔ ارشاد۔ ص ۳۱۹۔ ۳۲۰
۴۔ تاریخ طبری۔ ج ۷۔ ص ۱۹۰۔ سن ۲۱۵ ہجری کے واقعات' تاریخ بغداد۔ ج ۳۔ ص ۵۴۔ ۵۵' مسند الامام الجوادؑ۔ ص ۵۵' الحیاۃ السیاسیۃ للامام الجوادؑ۔ ص ۷۹

اس روایت کی بنیاد پر امامؑ صرف اسی مختصر مدت کے دوران بغداد میں رہے ہیں اگرچہ دوسرے زمانوں میں آپ کا بغداد میں رہنا ناممکن نہیں سمجھا گیا ہے۔ اس بارے میں اور آپ کے بچپن میں بغداد آنے کے بارے میں ''اربلی'' کی ایک روایت بھی ہمارے پاس موجود ہے اس کے مطابق: جب مامون بغداد آیا تو اس نے امام محمد تقی علیہ السلام سے وہاں آنے کی خواہش ظاہر کی۔ یہیں پر اس نے دیکھا کہ امامؑ اپنے ہم عمر بچوں کے ایک گروہ کے ساتھ کھیل کود میں مشغول ہیں۔ مامون کی سواری نزدیک آنے پر تمام بچے بھاگ کر اس کے راستے سے ہٹ گئے لیکن امامؑ خاموشی کے ساتھ پُر وقار اور پُرسکون انداز میں ایک طرف کھڑے رہے۔ یہ دیکھ کر مامون حیرت زدہ رہ گیا اور اس نے امامؑ سے پوچھا: تم دوسروں کی طرح کیوں نہیں بھاگے؟ امامؑ نے جواب دیا: میں نے کوئی جرم نہیں کیا جس کی سزا کے خوف سے فرار ہوتا دوسری بات یہ ہے کہ راستہ اتنا تنگ نہیں کہ آپ کی سواری نہ گزر سکے۔ مامون نے پوچھا: آپ کون ہیں؟ فرمایا: میں محمد بن علی بن موسیٰ الرضا ہوں۔

اس روایت کے ساتھ کچھ ایسی دوسری باتیں بھی آئی ہیں جن کے بارے میں کچھ محققین نے اعتراضات کیے اور سوالات اٹھائے ہیں اور ہمارے استاد بزرگوار علامہ سید جعفر مرتضیٰ سمیت بعض نے اس کی تائید کی کوشش ہے۔ (۱) اس کے باوجود بعض اعتراضات کا درست جواب نہیں مل سکا ہے۔

اس روایت کے درست ہونے کی صورت میں یہ ماننا پڑے گا کہ مامون نے سن ۲۰۴ ہجری میں بغداد آتے ہی فوراً یا اس کے کچھ عرصے بعد امام محمد تقی علیہ السلام کو وہاں بلا لیا۔ یہ وہ واحد روایت ہے جو امام محمد تقی علیہ السلام کی بچپنے میں بغداد آمد پر دلالت کرتی ہے۔ اگر ہم اس روایت کو قبول نہ کریں تو ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ تاریخی کتب سے جو کچھ سامنے آتا ہے اس کے مطابق امامؑ صرف سن ۲۱۵ ہجری میں ایک مرتبہ بغداد تشریف لائے تھے اور سن ۲۲۰ ہجری میں جب آپ کو معتصم نے بغداد طلب کیا اس وقت تک آپ مدینہ ہی میں رہتے تھے۔ فی الحال کوئی اور ایسی روایت ہماری دسترس میں نہیں ہے جو یہ بتائے کہ امامؑ نے سن ۲۱۵ اور سن ۲۲۰ ہجری کے درمیان کبھی بغداد کا سفر کیا ہو۔

مدینہ میں امام محمد تقی علیہ السلام کی آمد و رفت اور لوگوں کی جانب سے آپ کے احترام کے بارے میں بعض روایات میں مختصر اطلاعات موجود ہیں۔ (۲)

اپنی حکومت کے قیام کے پہلے ہی سال سن ۲۲۰ ہجری میں معتصم عباسی کی جانب سے امامؑ کو بغداد طلب کرنا اس

۱۔ الحیاۃ السیاسیۃ للامام الجواد۔ ص ۶۸۔۷۵

۲۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۴۹۲۔۴۹۳

مسئلے کے سیاسی پہلوؤں سے بے تعلق نہیں ہو سکتا۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ امامؑ جس سال بغداد تشریف لائے' اسی سال آپ کی وفات واقع ہوئی۔ جبکہ اس وقت آپ کی عمر صرف ۲۵ برس تھی۔ آلِ علیؑ سے عباسیوں کی دشمنی' بالخصوص شیعہ ائمہؑ سے اُن کی عداوت' جن کی پیروی اس زمانے میں لوگوں کی ایک قابلِ ذکر تعداد کیا کرتی تھی' امام محمد تقی علیہ السلام کی شہادت میں حکومت کا ہاتھ ہونے کی ایک دلیل ہے۔ اسی طرح آپ کو بغداد بلانا اور اسی سال بغداد میں آپ کی شہادت کا ہونا' عباسی کارندوں کے ہاتھوں آپ کی شہادت کے ناقابلِ انکار شواہد ہیں۔

مرحوم شیخ مفید نے امام محمد تقی علیہ السلام کو زہر دیے جانے' اور آپ کی شہادت کے بارے میں ایک روایت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے' آپ کی رحلت کو مشکوک قرار دیا ہے۔(۱) مذکورہ روایت جو متعدد کتابوں میں آئی ہے(۲) اس کے علاوہ' وہ قرائن جن کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے' وہ بھی اسی بات پر دلالت کرتے ہیں۔ مستوفی کی روایت کے مطابق' شیعوں کا عقیدہ یہ ہے کہ آپ کو معتصم نے زہر دیا ہے۔(۳)

اہلِ سنت کے بعض منابع (sources) میں اس بات کی جانب اشارہ ملتا ہے کہ امام محمد تقی علیہ السلام اپنی مرضی سے معتصم سے ملاقات کے لیے بغداد تشریف لائے تھے۔(۴) جبکہ بعض دوسرے منابع یہ بیان کرتے ہیں کہ معتصم نے ابن زیات کو حکم دیا تھا کہ وہ امامؑ کو بغداد لانے کے لیے کسی کو روانہ کرے۔(۵) ابن صباغ نے بھی "اِشخاص المعتصم لہ من المدینۃ" کی عبارت کے ذریعے اس بات کی تائید کی ہے۔(۶)

مسعودی نے ایک روایت نقل کی ہے' جس کی بنا پر امام محمد تقی علیہ السلام کی شہادت امِ فضل کے ہاتھوں اس وقت واقع ہوئی جب آپ مدینہ سے معتصم کے پاس بغداد تشریف لائے ہوئے تھے۔(۷) امامؑ کی شہادت کے بعد امِ فضل اپنے اس عمل کے انعام کے طور پر خلیفہ کے حرم میں شامل ہوگئی۔(۸) یہ نکتہ نظر سے دور نہیں رہنا چاہیے کہ امِ فضل امامؑ کے

۱۔ ارشاد۔ ص ۳۲۶

۲۔ الفصول المہمہ۔ مالکی۔ ص ۲۷۶

۳۔ تاریخ گزیدہ۔ ص ۲۰۵۔۲۰۶

۴۔ الائمۃ الاثنی عشر ابن طولون۔ ص ۱۰۳' شذرات الذہب۔ ج ۲۔ ص ۴۸

۵۔ بحار الانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۸

۶۔ الفصول المہمہ۔ ص ۲۷۵

۷۔ مروج الذہب۔ ج ۳۔ ص ۴۶۴

۸۔ الائمۃ الاثنی عشر ابن طولون۔ ص ۱۰۳' الفصول المہمہ۔ ص ۲۷۶۔

ساتھ اپنی ازدواجی زندگی میں دو پہلوؤں سے ناکام رہی تھی:

اوّل یہ کہ اس سے امامؑ کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

دوّم یہ کہ امامؑ بھی اس کی جانب کوئی خاص توجہ نہ دیتے تھے اور آپ کے بچے عام طور پر آپ کی کنیزوں سے متولد ہوئے۔

امِ فضل نے ایک بار (شاید مدینہ سے) ایک خط لکھا، جس میں اس نے مامون سے امامؑ کی شکایت کی اور اس بات پر گلہ کیا کہ امامؑ کی چند ایک کنیزیں ہیں۔ لیکن مامون نے اسے جواب میں لکھا کہ: ہم نے تجھے ابوجعفر کے عقد میں اس لیے نہیں دیا ہے کہ ہم اُن پر کسی حلال کو حرام کر دیں۔ اب آئندہ ایسی شکایتیں نہ کرنا۔(۱)

بہرحال امِ فضل نے اپنے باپ کے مرنے کے بعد امامؑ کو بغداد میں زہر دے دیا۔ اس کے بعد اس کا خلیفہ کے حرم میں شامل ہو جانا اور وہاں کی آسائشوں سے مستفیض ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کام معتصم کے حکم پر ہوا تھا۔(۲)

ایک اور دلیل یہ ہے کہ امام محمد تقی علیہ السلام نے سن ۲۱۵ ہجری میں بغداد جاتے ہوئے کسی کو اپنا جانشین معین نہیں کیا تھا، لیکن جب معتصم کے حکم پر بغداد جانے لگے تو آپ نے اپنا جانشین مقرر فرمایا اور یہ خود اس بات کی علامت ہے کہ امامؑ نے اس سفر کے خطرناک ہونے کو محسوس کر لیا تھا۔

امام محمد تقیؑ کے علمی مناظرات

امام محمد تقی علیہ السلام کو دو اطراف سے علمی مناظرات پر مجبور کیا جاتا تھا:

اوّل: اپنے شیعوں کی جانب سے، جو آپ کی کمسنی کی وجہ سے یہ جاننا چاہتے تھے کہ آپ علمِ الٰہی کے حامل ہیں بھی یا نہیں۔ لہٰذا قدرتی بات ہے کہ اس مقصد سے متعدد نشستوں کا انعقاد کیا گیا۔

دوّم: حکومت کی طرف سے، خاص طور پر آپ کے معاصر دو خلفا مامون اور معتصم کی جانب سے۔ کیونکہ شیعہ اپنے ائمہؑ کے بارے میں یہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ علمِ الٰہی کے حامل ہوا کرتے ہیں اس لیے خلفا کی یہ کوشش رہتی تھی کہ مناظرے کی نشستوں کا انعقاد کر کے ان کا اس زمانے کے نامور علما سے سامنا کرائیں، تاکہ شاید وہ کچھ سوالات کے جواب دینے سے عاجز رہیں اور اس طرح شیعوں کا (اپنے ائمہؑ کے پاس علمِ لدنی ہونے) کا اعتقاد متزلزل ہو جائے اور وہ ان کی پیروی سے گریز کرنے لگیں۔ مامون کی جانب سے امام علی رضا علیہ السلام کو مناظرے کی مجلس میں دعوت دینے کا یہی مقصد تھا۔

۱۔ ارشاد۔ ص ۳۲۳، بحار الانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۷۹۔ ۸۰

۲۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۳۲۳

اگر چہ مامون اپنا مقصد جیسا کہ ہم نے بیان کیا اس کے برعکس ظاہر کرتا تھا اور یہ ظاہر کرتا تھا کہ اُس نے امامؑ کے علم ودانش سے لوگوں کو روشناس کرنے کے لیے یہ اقدام کیا تھا۔

ان باتوں کے علاوہ اس قسم کے مناظرات کے انعقاد میں مامون کی ذاتی دلچسپی بھی شامل تھی۔ وہ علم دوستی میں مشہور تھا اور عباسی خلفا میں فلسفی کے طور پر جانا جاتا تھا۔

ان مناظرات کے بارے میں اہم ترین سند وہ تفصیلی روایت ہے جسے شیخ مفید نے ریان بن شبیب (۱) سے نقل کیا ہے اور ہم اس کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں:

جب مامون نے ام فضل کو امام محمد تقی علیہ السلام کے عقد میں دینے کا فیصلہ کر لیا' تو عباسیوں میں ہل چل مچ گئی اور اُن میں پریشانی کی لہر دوڑ گئی' کیونکہ اُن کے خیال میں خلیفہ کے اس اقدام سے وہی نتائج برآمد ہوں گے' جو ان کے والد امام علی رضا علیہ السلام کے بارے میں اس کے اقدام سے برآمد ہوئے تھے۔ لہٰذا وہ مامون کے پاس آئے اور یہ خوف دلا کر کہ کہیں اس اقدام سے حکومت بنی عباس کے ہاتھ سے نہ نکل جائے اُسے اس عمل سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ انہوں نے عباسیوں اور علویوں کے دیرینہ اختلافات کی جانب بھی اشارہ کیا اور کہا کہ: علی ابن موسیٰ الرضاؑ کا ماجرا ہی کافی ہے۔

مامون نے انہیں جواب دیا کہ: جو کچھ تمہارے اور آلِ ابوطالب کے درمیان پیش آیا اس میں قصور تمہارا ہی ہے۔ کیونکہ اگر تم انصاف سے کام لیتے' تو وہ تم پر فوقیت رکھتے تھے۔ مجھ سے پہلے خلفا نے ان کے ساتھ جو کچھ کیا' وہ سوائے قطع رحم کے کچھ اور نہ تھا! میں علی ابن موسیٰ الرضاؑ کی ولی عہدی کے بارے میں اب بھی پشیمان نہیں ہوں! (۲) میں نے ابوجعفر (امام محمد تقی علیہ السلام) کو ان کی کمسنی کے باوجود اس لیے منتخب کیا ہے کہ تمام اہلِ علم وفضل پر ان کی برتری میرے لیے اظہر من الشمس ہے اور مجھے امید ہے کہ جو کچھ میں آج سمجھا ہوں' مستقبل میں وہ تمام لوگوں پر آشکار ہو جائے گا اور وہ جان لیں گے کہ ان کے بارے میں میری رائے درست تھی۔

جواب میں عباسیوں نے کہا کہ: محمد بن علی (امام محمد تقی علیہ السلام) ایک بچے سے زیادہ کچھ نہیں' نہ انہیں دین کی کوئی معرفت ہے اور نہ ہی فقہ کا کوئی علم۔ خلیفہ پہلے انہیں دین میں سمجھ بوجھ پیدا کرنے دیں اور اس کے بعد جو مصلحت

۱۔ ریان بن شبیب موثق اور قابلِ اعتماد راویوں میں سے ہیں۔ وہ خراسان میں امام رضاؑ کے پاس تھے اور بعد میں قم میں سکونت اختیار کی۔ انہوں نے امام رضاؑ سے صباح بن نصر ہندی کے مسائل (روایات) کو جمع کیا ہے۔ دیکھیے: رجال النجاشی۔ ص ۱۶۵

۲۔ ہم نے امام رضاؑ کی زندگی پر گفتگو کے دوران کچھ باتیں بیان کی ہیں جن کی بنا پر مامون کے اس دعوے کو قبول نہیں کر سکتے۔ اور ابن شعبہ کی روایات میں بھی آیا ہے: یہ مامون ہی تھا جس نے امامؑ کو عاجز کرنے کے لیے یحییٰ بن اکثم سے کہا کہ وہ امامؑ کے ساتھ علمی مناظرہ کرے۔ تحف العقول۔ ص ۳۳۵

سمجھیں وہ کریں۔

مامون نے کہا: وائے ہو تم پر! میں اس جوان کو تم سے زیادہ جانتا ہوں' وہ ایسے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں جن کا علم لدنی ہے اور جس کا منبع الہامِ الٰہی ہے اور ان کے آباؤ اجداد ہمیشہ علم و ادب کے حوالے سے کسبِ علوم اور رائج تعلیم سے بے نیاز رہے ہیں۔ یہ بات جاننے کے لیے تم جب چاہو انہیں آزما سکتے ہو۔

عباسیوں نے یہ بات قبول کر لی اور امام محمد تقی علیہ السلام سے مناظرے کے لیے اُس زمانے کے ایک مشہور فقیہ اور قاضی یحییٰ بن اَکثم (۱) کا انتخاب کیا۔ یحییٰ کی رضامندی حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اس سے کہا کہ وہ مناظرے کے لیے انتہائی دشوار اور پیچیدہ سوالات تیار کرے' اور اس سے وعدہ کیا کہ اگر اس نے مناظرے میں امامؑ کو شکست پر مجبور کر دیا' تو اسے انتہائی گراں قیمت مال و اسباب دیا جائے گا۔ آخر کار اس مناظرے کے لیے ایک دن مقرر کیا گیا اور اس دن تمام عباسی' امام محمد تقی علیہ السلام' یحییٰ بن اَکثم اور حتیٰ خود مامون بھی محفل میں موجود تھا۔

پہلے یحییٰ ابن اَکثم نے امامؑ کے سامنے اپنے سوالات پیش کرنے کی اجازت طلب کی۔ مامون سے اجازت لینے کے بعد اُس نے امامؑ سے بھی اجازت چاہی اور جب امامؑ نے اپنی آمادگی کا اظہار کر دیا' تو یحییٰ نے آپ سے پوچھا: جس شخص نے حالتِ احرام میں کسی جانور کا شکار کیا ہو' اُس پر شرعاً کیا عائد ہو گا؟ جواباً امامؑ نے اُس سے دریافت کیا: حالتِ احرام میں اس شخص نے شکار کو حرم کے حدود میں مارا ہے یا اُس سے باہر؟ کیا وہ شخص حکم سے واقف تھا یا اُس سے لاعلم؟ کیا اُس نے جانتے بوجھتے مارا تھا یا غلطی سے؟ کیا وہ آزاد تھا یا غلام؟ کیا وہ بالغ تھا یا نابالغ؟ کیا اس نے مکہ جاتے ہوئے شکار کیا تھا یا وہاں سے واپسی پر؟ شکار پرندہ تھا یا کچھ اور؟ شکار چھوٹا تھا یا بڑا؟ وہ شخص اپنے عمل پر مصر تھا یا اپنے کیے پر پشیمان؟ اس نے شکار کو رات کے وقت مارا تھا یا دن کے وقت؟ وہ عمرے کے احرام میں تھا یا حج کے احرام میں؟

امام محمد تقی علیہ السلام نے مسئلے کے بارے میں جو مفروضے پیش کیے اُنہیں سن کر یحییٰ حیرت زدہ ہو کر بغلیں جھانکنے لگا' یہاں تک کہ تمام حاضرین نے اس کی اُڑی رنگت دیکھ کر اُس کی شکست خوردگی کو محسوس کر لیا۔

اس صورتحال پر مامون نے اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بنی عباس کی طرف رُخ کر کے کہا: کیا تم نے ان کے بارے میں میری رائے کے صحیح ہونے کو جان لیا؟

اس کے بعد اُس نے اپنی بیٹی اُمِ فضل کو امامؑ کے عقد میں دے دیا اور اس کا حق مہر وہی رکھا جو جناب زہرا علیہا السلام کا تھا۔ جب حاضرین محفل سے چلے گئے' تو مامون نے امامؑ سے درخواست کی کہ جو مفروضے آپ نے یحییٰ ابن اَکثم

۱۔ ذہبی کے بقول یحییٰ ایک بڑا فقیہ تھا' جس کی وفات سن ۲۴۲ ہجری میں ہوئی۔ میزان الاعتدال۔ ج ۴۔ ص ۳۶۱۔۳۶۲

کے سوال پر پیش کیے تھے اُن کے جواب بیان فرمائیں۔ امامؑ نے اُن میں سے ایک ایک کا جواب دیا۔ پھر امامؑ نے یحییٰ ابن اکثم سے پوچھا: مجھے ایسے شخص کے بارے میں بتاؤ جس کے لیے ایک عورت دن کی ابتدا میں حرام تھی دن چڑھے وہ عورت اس پر حلال ہوگئی ظہر کے وقت دوبارہ حرام ہوگئی عصر کے وقت پھر حلال ہوگئی اور غروب آفتاب کے وقت پھر حرام ہوگئی عشا کے وقت حلال ہوگئی نصف شب کو پھر حرام ہوگئی اور طلوع آفتاب کے وقت ایک بار پھر حلال ہوگئی۔ اس عورت کا مسئلہ کیا ہے اور وہ کیوں اس مرد پر مسلسل حلال اور حرام ہورہی ہے؟

یحییٰ ابن اکثم اس مسئلے کا جواب دینے سے عاجز رہا اور اُس نے امامؑ سے درخواست کی کہ وہ خود ہی اس کا جواب عنایت فرمائیں۔ امامؑ نے فرمایا: یہ عورت کسی اور کی کنیز تھی اور اس مرد پر حرام تھی۔ دن چڑھے اس نے اس کنیز کو اس کے مالک سے خرید لیا اور اس طرح وہ اس پر حلال ہوگئی۔ ظہر کے وقت اسے آزاد کردیا اور اس وجہ سے اس پر وہ حرام ہوگئی۔ عصر کے وقت اس نے اس سے شادی کرلی یوں وہ اس پر حلال ہوگئی۔ غروب کے وقت اس سے ظہار کیا جس کے نتیجے میں اس پر وہ حرام ہوگئی عشا کے وقت اُس نے ظہار کا کفارہ ادا کیا تو وہ دوبارہ حلال ہوگئی۔ آدھی رات کو اس نے اسے طلاق دی اور اس سبب سے وہ اس پر حرام ہوگئی اور صبح کے وقت اس نے اس سے رجوع کرلیا لہٰذا وہ ایک بار پھر اس پر حلال ہوگئی۔

مامون نے ایک بار پھر امامؑ کے علم و دانش پر حیرت کا اظہار کیا اور بولا: اس خاندان کے لیے عمر کی کمی عقل کے کمال میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ (۴۷)

ام فضل کے ساتھ امامؑ کے عقد کا سال اگر سن ۲۱۵ ہجری ہو تو مذکورہ مناظرے کے موقع پر آپ کی عمر بیس سال ہوگی۔ اسی روایت میں آگے چل کر آیا ہے کہ امامؑ عقد کے بعد ام فضل کو اپنے ساتھ مدینہ لے گئے۔ اس بنیاد پر یہ مناظرہ سن ۲۱۵ ہجری ہی میں ہوا ہوگا۔

معتصم عباسی کی موجودگی میں بھی ایک ایسا ہی مناظرہ منعقد ہوا تھا جو امامؑ کی علمی برتری ثابت ہونے کے بعد آپ کی شہادت پر منتج ہوا۔ شیعہ مفسر عیاشی ''زرقان'' سے روایت کرتے ہیں کہ: ایک دن میرا دوست ابن ابی داؤد معتصم کے پاس سے لوٹ کر آیا تو انتہائی ناراض دکھائی دے رہا تھا۔ حالانکہ اسے ابوجعفر جواد (امام محمد تقی علیہ السلام) سے سخت شکایت تھی۔ جب میں نے اس کی ناراضی کی وجہ دریافت کی تو اس نے کہا: آج ایک شخص کو معتصم کے دربار میں لایا گیا جس نے چوری کا اعتراف کیا تھا اور طے ہوا تھا کہ حد جاری کر کے اسے (اس جرم سے) پاک کردیا جائے گا۔ اس مسئلے پر فقہا کی

۱۔ ارشاد۔ ص ۳۶۰۔ ۵۱ الفصول المہمہ۔ ص ۲۶۷۔ ۲۷۱ تفسیر قمی۔ ج ۱۔ ص ۱۸۲ آخری حصے کے بارے میں دیکھیے: تحف العقول۔ ص ۳۳۵

بحث چھڑ گئی کہ چور کا ہاتھ کہاں سے کاٹا جائے؟ میں نے کہا: کلائی (الکرسوع) تک کو ہاتھ کہا جاتا ہے' اس لیے اس کا ہاتھ کلائی سے کاٹا جائے۔ دوسرے بھی مجھ سے متفق تھے۔ کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ کہنی (مِرفَق) سے کاٹا جائے۔ لیکن معتصم نے اس بارے میں ابوجعفر (امام محمد تقی علیہ السلام) سے رائے طلب کی۔ انہوں نے ابتدا میں تو ٹالنے کی کوشش کی' لیکن جب خلیفہ نے اصرار کیا تو فرمایا: وَاَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا. (۱) یعنی ہاتھ کی ہتھیلی جو سجدے کے لیے ہے' اُسے سجدے کے لیے چھوڑ دیا جائے اور اسے کاٹا نہ جائے۔ معتصم نے ان کی رائے کو قبول کر لیا۔ اس موقع پر مجھے اس قدر شرمندگی ہوئی کہ میں موت کی آرزو کرنے لگا۔ چند دن بعد میں معتصم کے پاس گیا اور فقہا کی آراء پر ایک نوجوان کی رائے کو ترجیح دینے پر اس کی سرزنش کی' اور اس پر اس کے ناگوار نتائج واضح کیے۔ معتصم میری باتوں سے متاثر ہوا اور اس نے اپنے ایک معتمد کو حکم دیا کہ امام محمد تقی علیہ السلام کو اپنے گھر دعوت پر بلائے اور انہیں زہر کھلا دے اور اس شخص نے اس حکم پر عمل کر دیا۔ (۲)

خلفا کے فضائل کے بارے میں مناظرہ

ایک اور محفل میں' یا شاید اسی محفل میں جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں' یحییٰ ابن اکثم نے امام محمد تقی علیہ السلام سے کچھ دوسرے سوالات بھی کیے' جن میں اوّلین خلفا کے بارے میں سوالات بھی شامل تھے۔ اس نے پہلے ایک روایت بیان کی جس کے ضمن میں آیا ہے کہ: جبرئیلؑ نے خدا کی جانب سے رسول اللہؐ سے کہا: ابوبکر سے پوچھئے کہ کیا وہ مجھ سے راضی ہے؟ میں تو اُن سے راضی ہوں۔ امام نے اس محفل میں جہاں علمائے اہلِ سنت کی ایک بڑی تعداد موجود تھی' فرمایا: میں ابوبکر کے فضل کا منکر نہیں ہوں' لیکن جس نے اس روایت کو نقل کیا ہے' اُسے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس روایت پر بھی توجہ دینی چاہیے جسے حدیث کے تمام ماہرین نے صحیح قرار دیا ہے' اور جو یہ ہے کہ آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: ''مجھ سے منسوب جھوٹی اور گھڑی ہوئی باتوں کی کثرت ہوگئی ہے' اور اس کے بعد ان میں اور اضافہ ہوگا (قَدْ كَثُرَتِ الْكَذَّابَةُ عَلَيَّ)' جو لوگ مجھ پر جھوٹ باندھیں گے اُن کا ٹھکانہ آگ سے بھر جائے گا۔ جب میری جانب سے کوئی حدیث تم تک پہنچے تو اسے کتابِ خدا اور میری سنت کے سامنے رکھو۔ اگر وہ ان کے موافق ہو' تو اسے قبول کر لو' ورنہ اسے ایک طرف ڈال دو۔'' ابھی جو حدیث تم نے نقل کی ہے' وہ کتابِ خدا کے موافق نہیں ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (۳) کیا خدا کو ابوبکر کی

۱۔ سورۂ جن ۷۲۔ آیت ۱۸

۲۔ تفسیر العیاشی۔ ص ۳۱۹' مسند الامام الجواد۔ ص ۱۸۱۔ ۱۸۳

۳۔ سورۂ ق ۵۰۔ آیت ۱۶

رضامندی یا ناراضگی کا علم نہ تھا' جو وہ اُن سے پوچھ رہا ہے؟ یہ بات عقلاً محال ہے۔

یہ روایت بتاتی ہے کہ امامؑ نے کس انداز سے اپنی مخصوص درایت کے ساتھ اس روایت کا سامنا کیا اور اسے قرآن پر پیش کرنے کے بعد اس کا انکار کیا۔ بحث کے اسی انداز کو ہم نے امام علی رضا علیہ السلام کی زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے بھی پیش کیا ہے' کہ آپ نے فرمایا: جو حدیث کتابِ خدا کی مخالف ہو' ہم اسے قبول نہیں کرتے۔(۱)

اس کے بعد یحییٰ نے اس روایت کے بارے میں سوال کیا کہ: "مَثَل ابی بکر و عمر فی الأرض کمثل جبرئیل و میکائیل فی السّماء"۔ (زمین پر ابوبکر اور عمر کی مثال' آسمان پر جبرئیل اور میکائیل کی طرح سے ہے) امامؑ نے جواب میں فرمایا: اس روایت کا مضمون درست نہیں ہے' کیونکہ جبرئیل اور میکائیل نے ہمیشہ خدا کی بندگی کی ہے' اور ایک لمحے کے لیے بھی اُس کی نافرمانی کے مرتکب نہیں ہوئے ہیں' جبکہ ابوبکر اور عمر اسلام قبول کرنے سے پہلے سالہا سال مشرک رہے تھے۔ اس کے بعد یحییٰ نے حدیث: "ابوبکر و عمر سیّدا کھول اھل الجنّة." (ابوبکر اور عمر جنت کے بوڑھوں کے سردار ہیں) کے بارے میں دریافت کیا۔ امامؑ نے فرمایا: جنت میں جوانوں کے سوا کوئی اور نہ ہوگا کہ یہ دو حضرات اس کے بوڑھوں کے سید و سردار بن سکیں۔

یحییٰ نے اس حدیث کے بارے میں سوال کیا کہ: "انّ عمر بن الخطاب سراج اھل الجنة." (عمر ابن خطاب اہلِ جنت کا چراغ ہیں) امامؑ نے فرمایا: جنت میں خدا کے مقرب فرشتے' آدمؑ اور محمدؐ اور تمام انبیائے عظام موجود ہوں گے' کیا جنت کو روشن کرنے کے لیے اُن کا نور کافی نہ ہوگا کہ عمر ابن خطاب کے نور کی ضرورت پڑ جائے۔

یحییٰ نے ایک اور حدیث: "انّ السکینة تنطق علی لسان عمر." کے بارے میں سوال کیا' تو امامؑ نے فرمایا: میں عمر کے فضل کا منکر نہیں ہوں' لیکن ابوبکر جو اُن سے افضل تھے' وہ منبر پر جا کر کہتے تھے: "انّ لی شیطانا یعترینی' فاذا ملت فسدّدونی." (میرے لیے ایک شیطان ہے جب وہ مجھ پر سوار ہو تو تم مجھے روک دو)

یحییٰ نے کہا: اس حدیث کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: "لولم اُبعث لَبُعثَ عمر." (اگر میں نبوت کے لیے مبعوث نہ ہوتا تو عمر مبعوث ہوتے) امامؑ نے فرمایا: کتابِ خدا زیادہ سچی ہے' جو کہتی ہے کہ: وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَھُمْ وَ مِنْکَ وَ مِنْ نُّوْحٍ. (۲) خدا نے انبیاء سے ان کی ذمے داری کو صحیح اور درست طریقے سے انجام دینے کا عہد لیا ہے' اور ان عظیم انسانوں نے ایک لمحے کے لیے بھی شرک نہیں

۱۔ التوحید۔ ص ۱۱۰' کافی۔ ج ۱۔ ص ۹۵

۲۔ سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۷

کیا ہے۔ لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے عہد کے خلاف ایک ایسے شخص کو نبوت کے لیے منتخب کرلے جس نے اپنی عمر کا ایک حصہ شرک کی حالت میں گزارا ہے۔ اسی طرح تمہاری پیش کی ہوئی یہ روایت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس صحیح حدیث: "بُعِثتُ و آدم بین الروح والجسد." (مجھے اس وقت نبی بنایا گیا جب آدمؑ روح اور جسد کے درمیان تھے) سے بھی متصادم ہے۔ یحییٰ نے کہا: رسول خداؐ سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا: "ما احتبس عنّی الوحی قطّ إلاّ ظننته قد نزل علی آلِ خطّاب." (مجھ پر وحی متوقف نہیں ہوئی مگر یہ کہ میں یہ سمجھا کہ آل خطاب پر نازل ہو رہی ہے)۔ امامؑ نے فرمایا کہ: انبیاؑ کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ ایک لمحے کے لیے بھی وہ اپنی نبوت کے بارے میں شک و شبہ کا شکار ہوں۔ دوسری طرف خدا کا ارشاد ہے کہ: اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ. (۱) لہٰذا کس طرح ممکن ہے کہ نبوت خدا کے ایک برگزیدہ بندے سے ایک ایسے شخص کو منتقل ہو جائے جس نے مدتوں خدا کے ساتھ شرک کیا ہے؟ یحییٰ نے کہا: پیغمبرؐ سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا: "لو نزّل العذاب لما نجیٰ إلاّ عمر." (اگر عذاب نازل کیا جاتا تو عمر کے سوا کوئی بچ نہ پاتا) امامؑ نے فرمایا: یہ روایت قرآن کی اس آیت: وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ (۲) سے مطابقت نہیں رکھتی اور حجت نہیں بن سکتی۔ (۳)

امام محمد تقیؑ کی علمی میراث

عام طور پر ہر امامؑ کی رحلت کے بعد پیش آنے والی مشکلات کی وجہ سے ایک مدت تک شیعوں کا بعد میں آنے والے امامؑ سے رابطہ انتہائی محدود ہو جاتا تھا۔ گزشتہ امامؑ کے وہ وکلا جو دوسرے اسلامی شہروں میں ہوتے تھے حتیٰ اُن کا امامؑ کے ساتھ رابطہ بھی مشکلات اور دشواریوں کا شکار ہو جاتا تھا۔ امام محمد تقی علیہ السلام کی امامت کے آغاز میں اُن کی کمسنی نے بھی مشکلات میں ایک اور مشکل کا اضافہ کر دیا تھا اور شیعوں کے شکوک و شبہات برطرف ہونے میں کافی وقت لگ گیا تھا۔

ایک نص میں آیا ہے کہ امامؑ نے دس سال کی عمر تک اپنی امامت کو مخفی رکھا۔ (۴) یہ خود امامؑ اور اُن کے شیعوں کے درمیان روابط کی برقراری میں دشواری کی ایک دلیل ہے۔ دوسری طرف حکمراں بھی اس حوالے سے سختیاں کرتے تھے جس کی وجہ سے اس رابطے کی برقراری اور مشکل ہو جاتی تھی اور نتیجے میں شیعہ اپنے امامؑ کے پاس آزادی کے ساتھ

۱۔ سورۂ حج ۲۲۔ آیت ۷۵

۲۔ سورۂ انفال ۸۔ آیت ۳۳

۳۔ الاحتجاج۔ ج ۲۔ ص ۲۴۵۔ ۲۴۹

۴۔ اثبات الوصیہ۔ ص ۲۱۵

آمد و رفت نہیں رکھ پاتے تھے۔ رابطے کا ایک سادہ ترین اور آسان ترین راستہ امامؑ کو خط لکھ کر اس کا جواب لینا تھا۔ لہٰذا امام محمد تقی علیہ السلام اور ان کے بعد' حتیٰ اُن سے پہلے امام علی رضا علیہ السلام کے زمانے میں بھی شیعہ خط و کتابت کے ذریعے سے اپنے امامؑ کے ساتھ رابطہ رکھتے تھے۔

ابھی امام محمد تقی علیہ السلام کی زندگی کے پچیس سال بھی نہیں گزرے تھے' کہ آپ شہید ہو گئے۔ اپنی کم عمری کی وجہ سے آپ کو اپنے شیعوں کے ساتھ روابط کو وسعت دینے کا بہت کم موقع ملا۔ اس کے باوجود اصحاب یا ان کی کتابوں کے بارے میں امام محمد تقیؑ سے جو باتیں نقل ہوئی ہیں' اُن کے علاوہ بھی مختلف اسلامی مسائل پر آپ کی دو سو بیس سے زیادہ احادیث ہماری دسترس میں ہیں۔ قدرتی بات ہے کہ اُس دور کے سیاسی حالات میں متعدد خطوط ضائع ہو گئے ہوں گے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ایک سو بیس افراد نے آپ سے صادر ہونے والی احادیث کی روایت کی ہے۔(۱) شیخ طوسی نے امام محمد تقیؑ کی احادیث کے ایک سو تیرہ راویوں کا ذکر کیا ہے۔

امام محمد تقی علیہ السلام سے منقول اس قدر روایات سے آپ کی علمی عظمت اور فقہی' تفسیری اور عقیدتی مسائل نیز دعا اور مناجات پر آپ کے عبور کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ آ... کے آثار میں سے مختصر اور خوب صورت جملوں (کلماتِ قصار) سے آپ کے اخلاقی کمالات بخوبی آشکارا ہیں۔

امام محمد تقی علیہ السلام کے کلماتِ قصار میں سے کچھ کلموں کو ابن صباغ مالکی نے "الفصول المہمۃ" میں جمع کیا ہے۔ اسی طرح "تحف العقول" اور دوسری کتابوں میں بھی آپ کے اس قسم کے بکثرت کلمات پائے جاتے ہیں۔ امام محمد تقیؑ کی فقہی روایات کا ایک بڑا حصہ ان مکتوبات سے حاصل کیا جا سکتا ہے جو آپ نے مختلف اسلامی شہروں سے موصول ہونے والے اپنے اصحاب کے خطوط کے جواب میں تحریر فرمائے ہیں۔

گمراہ فرقوں کا مقابلہ

امام محمد تقی علیہ السلام اپنے زمانے میں موجود فرقوں کو نظر میں رکھتے ہوئے' اس حوالے سے بھی اپنے شیعوں کی رہنمائی فرماتے تھے کہ ان فرقوں نے کونسا موقف شیعوں کے برخلاف اختیار کیا ہوا ہے۔ ان ہی فرقوں میں سے ایک فرقہ "اہلِ حدیث" کا تھا' جو مجسمی مذہب تھے' اور خدا کی جسمانیت کا قائل تھا۔ امامؑ نے ان کے بارے میں اپنے شیعوں سے فرمایا کہ انہیں کسی بھی ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنے اور اسے زکات ادا کرنے کی اجازت نہیں جو خدا کی جسمانیت کا قائل ہو۔(۲)

۱۔ جناب عطاردی کی گنتی کے مطابق مسند الامام الجوادؑ میں ہے۔
۲۔ التوحید۔ ص ۱۰۱' التہذیب۔ ج ۳۔ ص ۲۸۳

امام محمد تقی علیہ السلام کے زمانے میں موجود فرقوں میں سے ایک اور فرقہ شیعوں سے جدا ہونے والا ''واقفہ'' فرقہ تھا' جو شیعوں کے لیے ایک مشکل بنا ہوا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی شہادت کے بعد آپ کی امامت پر متوقف ہو گئے تھے اور انہوں نے آپ کے فرزند امام علی ابن موسیٰ الرضا علیہ السلام کی امامت کو قبول نہیں کیا تھا۔ جب امامؑ سے واقفی مذہب سے تعلق رکھنے والوں کے پیچھے نماز پڑھنے کے بارے میں پوچھا گیا' تو آپ نے اپنے شیعوں کو اس سے منع فرمایا۔(۱)

شیعوں سے پھوٹنے والا ایک اور فرقہ ''زیدیہ'' تھا' جس کے بارے میں اس سے پہلے ہم امام جعفر صادق علیہ السلام کی زندگی پر گفتگو کے دوران کچھ باتیں عرض کر چکے ہیں اور وہاں ائمہؑ کے بارے میں ان کا موقف بیان کیا جا چکا ہے۔ زیدیوں کی امامیوں کے ساتھ دشمنی اور ائمہؑ پر اُن کی طعنہ زنی اس بات کا سبب بنی کہ ائمہؑ نے ان کے خلاف سخت موقف اختیار کیا' جیسا کہ امام محمد تقی علیہ السلام کی ایک روایت میں واقفیہ اور زیدیہ کو آیتِ قرآن: وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ (۲) کا مصداق قرار دیا گیا ہے اور انہیں ناصبیوں کی صف میں شمار کیا گیا ہے۔(۳)

کیونکہ شیعوں کو بدنام کرنے میں غالیوں (غلو کرنے والوں) کا بھی اہم کردار تھا' لہٰذا ائمہؑ اُن سے متنفر تھے۔ شیعوں کے لیے غالی انتہائی شدید خطرہ تھے' کیونکہ یہ لوگ ائمہ علیہم السلام کے ناموں سے روایات گھڑتے اور ان کے ذریعے سے ائمہؑ کے پیروکار شیعوں کو گمراہ کرتے تھے۔

امام محمد تقی علیہ السلام نے غالیوں کے سرغنہ ابو الخطاب کے بارے میں فرمایا: ''ابو الخطاب پر اور اس کے ساتھیوں پر اور اُن لوگوں پر جو ان پر لعنت کرنے میں تامل یا تردد کا شکار ہوں خدا کی لعنت ہو۔'' (۴) اس کے بعد امامؑ نے ابو الغمر' جعفر بن واقد اور ہاشم بن ابی ہاشم کی طرف اشارہ کیا اور اس بات کا ذکر کرتے ہوئے کہ انہوں نے لوگوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے ائمہؑ سے سوءِ استفادہ کیا ہے' انہیں بھی ابو الخطاب کی صف میں قرار دیا۔ یہاں تک کہ ایک روایت میں اسحاق انباری سے فرمایا: جس طرح بھی ممکن ہو' ابو السمہری اور ابن ابی الزرقا نامی دو غالیوں کو' جو اپنے آپ کو امامؑ کا ترجمان ظاہر کرتے تھے' قتل کر دیا جائے۔ اسحاق' امامؑ کے حکم پر عمل کی کوشش کر رہے تھے' لیکن اُن دونوں کو امامؑ کے حکم کا پتا چل گیا' لہٰذا انہوں نے خود کو اسحاق کی نگاہوں سے اوجھل کر لیا۔ امامؑ کے اس حکم کی وجہ شیعوں کو گمراہ کرنے کے سلسلے میں اُن

۱۔ من لا یحضرہ الفقیہ۔ ج۱۔ ص۳۷۹

۲۔ سورۂ غاشیہ ۸۸۔ آیت ۲۔۳

۳۔ رجال کشی۔ ص۳۹۱' مسند الامام الجوادؑ۔ ص۱۵۰

۴۔ رجال کشی۔ ص۴۴۴

لوگوں کا خطرناک کردار بیان کی گئی ہے۔(۱)

امام محمد تقی کے اصحاب

امام محمد تقی علیہ السلام کے بہت سے اصحاب آپ کے والد کے اصحاب اور امامؑ کے فرزند تھے۔ان میں سے بعض کئی سال زندہ رہے اور انہوں نے ائمہ کی بیش بہا احادیث پر مشتمل کتابیں بھی تالیف کیں۔

امام محمد تقی علیہ السلام کے ایک صحابی، حضرت عبدالعظیم حسنی ہیں، جنہوں نے آپ کی احادیث کی ایک قابلِ توجہ مقدار روایت کی ہے۔اس عظیم علوی حسنی ہستی نے سکونت کے لیے "رَے" کی سرزمین کا انتخاب کیا اور احادیث اہلِ بیتؑ کی ترویج واشاعت کا بیڑا اٹھایا۔انہی کی جدوجہد کی وجہ سے "رَے" میں شیعوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور اس علاقے میں تشیع نے فروغ پایا۔(۲)

امام محمد تقی علیہ السلام کے ایک اور صحابی، داؤد بن قاسم ہیں، جو ابوہاشم جعفری کے نام سے مشہور ہیں۔انہوں نے امامؑ سے بکثرت احادیث نقل کی ہیں اور وہ آپ کے ممتاز ترین صحابیوں میں سے ایک ہیں۔ابوہاشم کا تعلق جعفر بن ابی طالبؑ کے گھرانے سے تھا، اور علمِ رجال کی کتب میں اُن کا ذکر اچھے الفاظ کے ساتھ کیا گیا ہے۔

امام محمد تقی علیہ السلام کے ایک اور صحابی علی بن مہزیار ہیں، جو شیعوں کے درمیان ایک قابلِ احترام اور معروف شخصیت کے مالک ہیں۔ان کا اصلی وطن ہندیجان تھا، جہاں سے وہ اہواز تشریف لائے اور اس کے بعد اہوازی کے طور پر مشہور ہوئے۔نجاشی نے تحریر کیا ہے کہ انہوں نے امام علی رضا اور امام محمد تقی علیہما السلام، دونوں ہی سے روایات نقل کی ہیں۔ان کا شمار امام محمد تقی کے قریبی اصحاب میں ہوتا تھا، اور امامؑ ان کا خصوصی احترام کیا کرتے تھے۔(۳) انہوں نے امام محمد تقی سے نسبتاً زیادہ روایات نقل کی ہیں۔(۴)

نجاشی نے تحریر کیا ہے کہ علی بن مہزیار کے، فطحی مذہب سے تعلق رکھنے والے علی بن اسباط کے ساتھ کئی مناظرے ہوئے تھے، اور اس حوالے سے ان کے درمیان بعض مسائل کا ردوبدل ہوا تھا۔آخرکار وہ دونوں اپنے مسائل لے کر امام محمد تقی کی خدمت میں حاضر ہوئے، جس کے نتیجے میں علی بن اسباط نے اپنا باطل عقیدہ چھوڑ دیا۔

۱۔رجالِ کشی۔ص ۴۴۴

۲۔ایک کتاب "عبدالعظیم الحسنی، حیاتہ ومسندہ" استاد عطاردی نے تحریر فرمائی ہے، جس کا مختصر حصہ ان کے خط کے ذیل میں مسند الامام الجوادؑ صفحہ ۲۹۸۔۳۰۸ پر موجود ہے۔

۳۔رجال النجاشی۔ص ۱۷۷

۴۔مسند الامام الجوادؑ۔ص ۳۱۶

امام محمد تقی علیہ السلام کے وکلا میں سے ایک وکیل "خیران الخادم" تھے' جن کا ذکر کشی نے کیا ہے۔(۱)

امامؑ کے ایک اور وکیل "ابراہیم بن محمد ہمدانی" بھی تھے' جنہوں نے آپ سے چند روایات نقل کی ہیں۔(۲)

امام محمد تقی علیہ السلام کے ایک اور صحابی احمد بن محمد بن ابی نصر بزنطی بھی ہیں' جن کا شمار اصحاب اجماع میں ہوتا ہے۔ یہ امام علی رضا اور امام محمد تقی علیہما السلام کے خاص اصحاب میں سے تھے' اور تمام علمائے رجال نے ان کی تعریف کی ہے۔ ان کی وفات سن ۲۲۱ ہجری میں ہوئی۔ ابن ندیم نے ان کا اور امام علی رضا علیہ السلام کی روایت پر مشتمل ان کی کتاب کا ذکر کیا ہے اور "الجامع" اور "المسائل" نامی دو کتابوں کو اُن کے آثار میں سے قرار دیا ہے۔(۳)

ایرانی شیعوں کا امام محمد تقی کے ساتھ رابطہ

شیعہ امامی' تمام اسلامی شہروں میں موجود تھے' ان کی ایک بڑی تعداد بغداد' مدائن اور سوادِ عراق (۴) میں رہائش پذیر تھی' اور کچھ لوگ ایران یا اس زمانے کے دوسرے ممالک میں رہتے تھے۔ یہ لوگ امامؑ کے وکلا کے توسط سے آپ سے رابطہ رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ ایام حج میں مدینہ میں بھی آپ سے ملاقات کیا کرتے تھے۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ امام محمد تقیؑ کے شیعوں کی ایک تعداد مصر میں بھی مقیم تھی۔ اس روایت میں علی بن اسباط کہتے ہیں: میں امامؑ کے سراپے کو غور سے دیکھ رہا تھا' تاکہ اسے مصر میں اپنے ساتھیوں سے بیان کرسکوں۔(۵) ایک دوسری روایت میں ہے کہ خراسان کا ایک شیعہ بھی امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔(۶)

ایک اور روایت' جوحر بن عثمان ہمدانی سے منقول ہے' وہ یہ بیان کرتی ہے کہ "رَے" کے شیعوں کا ایک گروہ امامؑ کے حضور شرفیاب ہوا تھا۔(۷) جہاں تک ہم جانتے ہیں "رَے" میں ہمیشہ کچھ شیعہ رہے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔(۸)

۱۔ رجال کشی۔ ص ۵۰۸

۲۔ مسند الامام الجوادؑ۔ ص ۲۵۲ نقل از جامع الرواۃ

۳۔ الفہرست ابن ندیم۔ ص ۲۷۶

۴۔ الغیبہ طوسی۔ ص ۲۱۲

۵۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۳۸۴

۶۔ المناقب فی المناقب۔ ص ۲۰۸

۷۔ الثاقب فی المناقب۔ ص ۲۰۸

۸۔ تاریخ تشیع در ایران از آغاز تا قرن دہم ہجری۔ ج ۱۔ ص ۲۳۵۔۲۵۴

maablib.org

قم بھی شیعوں کا ایک اہم مرکز تھا اور امام محمد تقی علیہ السلام کے دور میں یہاں کے شیعوں کا امامؑ سے قریبی رابطہ تھا۔ احمد بن محمد بن عیسیٰ، جنہیں "شیخ القمیین" کہا جاتا ہے، پہلے امام علی رضا علیہ السلام اور اُن کے بعد امام محمد تقی علیہ السلام اور ان کے بعد اُن کے فرزندِ گرامی کے اصحاب میں شامل رہے، حتیٰ انہوں نے امام حسن عسکری علیہ السلام کی خدمت کا شرف بھی حاصل کیا ہے۔ انہوں نے حدیث پر کئی تالیفات یادگار چھوڑی ہیں۔(۱) قم میں امام محمد تقی علیہ السلام کے ایک اور صحابی صالح بن محمد بن سہل تھے، جو اس شہر میں امامؑ کی موقوفات کی دیکھ بھال کے ذمے دار تھے۔(۲)

ایک اور روایت میں آیا ہے: بست اور سجستان کا رہنے والا ایک شخص ایامِ حج میں امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا کہ: ہمارا حاکم محبِ اہلِ بیتؑ اور آپ کا عقیدت مند ہے۔ مجھ پر حکومت کا خراج (ٹیکس) واجب الادا ہے۔ آپ اس کے نام ایک رقعہ لکھ دیجیے، تاکہ وہ اس بارے میں مجھ پر سختی نہ کرے۔ امامؑ نے فرمایا: میں اسے نہیں جانتا۔ میں نے کہا: وہ آپ اہلِ بیتؑ کا محب ہے۔ حضرت نے کاغذ لیا اور اس پر یہ تحریر فرمایا: "حاملِ رقعہ نے تمہارے مبارک عقیدے کے بارے میں بتایا۔ تم جو بھی نیک عمل انجام دو گے، وہ تمہارے لیے ہوگا۔ پس اپنے بھائیوں سے نیک سلوک کرو اور یہ بات ذہن نشین رکھو کہ خدا تمہارے ایک ایک اور ذرّہ برابر اعمال کے بارے میں سوال کرے گا۔" میں نے امامؑ سے خط لیا اور اس سے پہلے کہ میں سجستان پہنچتا، یہ خبر حسین بن عبداللہ نیشاپوری (جو وہاں کا والی تھا) تک پہنچ گئی اور وہ شہر سے دو فرسخ باہر نکل کر میرے استقبال کے لیے آیا۔ میں نے امامؑ کی تحریر اس کے حوالے کی، اس نے اسے چوما، آنکھوں سے لگایا، اور بولا: تمہاری حاجت کیا ہے؟ میں نے کہا: حکومت کا کچھ خراج مجھ پر واجب الادا ہے۔ حسین بن عبداللہ نے حکم دیا کہ وہ خراج بخش دیا جائے، علاوہ ازایں اُس نے حکم دیا کہ جب تک وہ والی ہے، اس وقت تک مجھ سے خراج نہ لیا جائے۔ اس کے بعد اس نے میرے حالات کے بارے میں پوچھا اور پھر اپنے اہلکاروں سے کہا کہ میرے لیے وظیفہ معین کر دیا جائے۔(۳)

علی بن مہزیار بھی امام محمد تقی علیہ السلام کے اصحاب میں سے ہیں، جو دراصل نصرانی تھے اور اسلام لانے کے بعد پہلے امام علی رضا علیہ السلام کے خاص اصحاب میں شامل رہے اور ان کے بعد امام محمد تقی علیہ السلام کے صحابی بنے۔ وہ جنوب کے ایک قریے هندوان (جسے آج کل ہندیجان کہتے ہیں) کے رہنے والے تھے اور بعد میں اہواز میں سکونت اختیار کی۔(۴)

۱۔ مسند الامام الجوادؑ۔ ص ۲۶۵

۲۔ التہذیب۔ ج ۴۔ ص ۱۴۰، الاستبصار۔ ج ۲۔ ص ۶۰

۳۔ کافی۔ ج ۵۔ ص ۱۱۱، التہذیب۔ ج ۶۔ ص ۳۳۶

۴۔ مسند الامام الرضاؑ۔ ص ۳۱۵

شیعہ ائمہؑ اور ان کے شیعوں کے درمیان موجود روابط کا گہرا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روابط امام علی رضاؑ کے بعد سے وسیع ہوتے گئے۔ اس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ ان ائمہؑ کے زمانوں میں ان علاقوں میں شیعوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہوگا۔ اس وسعت کا تعلق ہر چیز سے بڑھ کر امام علی رضا علیہ السلام کے خراسان کے سفر نیز ایران کے مختلف علاقوں میں ان ائمہؑ کے وکلا کے پھیلے ہوئے جال (نیٹ ورک) سے نظر آتا ہے۔

آپ کے ایک وکیل ابراہیم بن محمد ہمدانی ہیں' جنہوں نے کشی کی روایت کے مطابق چالیس مرتبہ حج کی سعادت حاصل کی۔(۱) امام محمد تقی علیہ السلام نے ایک خط میں انہیں لکھا: "قَدْ وَصل الحساب' تقبّل اللّٰہ منک و رضی و جعلهم معنا فی الدنیا و الآخرة." (تمہاری ارسال کردہ رقم مجھ تک پہنچ گئی ہے' خدا اسے تمہاری جانب سے قبول فرمائے اور ہمارے شیعوں سے راضی رہے اور انہیں دنیا اور آخرت میں ہمارے ساتھ قرار دے)۔(۲)

اس روایت سے واضح طور پر اس بات کا پتا چلتا ہے کہ مذکورہ وکیل مالی امور کے ذمے دار تھے' جس کے تحت وہ شیعوں سے اموال جمع کر کے امامؑ کے لیے بھیجتے تھے۔ امامؑ اسی خط میں آگے چل کر مذکورہ وکیل کو تحریر فرماتے ہیں: "میں نے نضر (بن محمد ہمدانی) (۳) سے تمہاری سفارش کر دی ہے اور اپنے نزدیک تمہارے مقام کے بارے میں انہیں بتا دیا ہے اور انہیں لکھ دیا ہے کہ تمہیں نہ چھیڑیں۔ ایوب (بن نوح بن دراج) (۴) کو بھی یہی حکم دے دیا ہے' نیز ہمدان میں اپنے دوستوں کو خط لکھ کر انہیں تاکید کی ہے کہ تمہاری پیروی کریں' کیونکہ تمہارے علاوہ وہاں ہمارا کوئی اور وکیل نہیں ہے۔"(۵)

ایسی کتابیں جو ائمہؑ کی احادیث پر مشتمل تھیں' اور اصحاب ائمہؑ جنہیں امام محمد باقر علیہ السلام کے زمانے سے منظم کر رہے تھے اور جو درحقیقت ائمہؑ اور شیعوں کی علمی اور فکری امور پر بڑھتی ہوئی توجہ کی آئینہ دار تھیں' ان کتابوں نے ان خطوں میں شیعہ فقہ و عقائد کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا۔

جب امام محمد تقی علیہ السلام سے تقیے کی وجہ سے پوشیدہ اصحاب کی کتابوں میں موجود روایات کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: "حدثوا بها فانها حق." (ان سے روایت کرو کہ یہ حق اور صحیح ہیں)۔(۶) اس طرح شیعوں

۱۔ مسند الامام الرضاؑ۔ ص ۶۰۸

۲۔ مسند الامام الرضاؑ۔ ص ۶۱۱

۳۔ تنقیح المقال۔ ج ۳۔ ص ۲۷۱

۴۔ تنقیح المقال۔ ج ۱۔ ص ۱۵۹

۵۔ رجال کشی۔ ص ۶۱۱۔ ۶۱۲' بحار الانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۱۰۹

۶۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۵۳

نے اپنے اسلاف کے آثار پھیلانے اور ان کے احیا کے لیے جدوجہد کی اور تشیع کی فقہی بنیاد کو مضبوط کیا جسے بنیادی کام کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی یہ بھی ذمے داری تھی کہ منحرفین کی طرف سے ایک طرف ڈال دیے جانے والے فقہی مسلمات پر بھی عمل کریں، تاکہ انہیں رواج حاصل ہو۔ انہی میں سے ایک حج تمتع بھی تھا، جو ایک حاجی کے لیے بافضیلت ترین عمل شمار کیا جاتا تھا۔(۱) ایسی ہی تاکید متعہ نسا کے بارے میں بھی کی گئی ہے۔

☆☆☆

۱۔ کافی۔ ج ۳۔ ص ۲۹۱، تہذیب۔ ج ۵۔ ص ۳۰

علیہ السلام

امام علی نقی

امام علی نقی علیہ السلام نے فرمایا:

"اذا كانَ زمان العدل فيه اغلب من الجور، فحرامٌ أن يظنّ بأحد سوءً ا حتى يعلم ذلک منه، واذا كان زمانُ الجور فيه من العدل فليس لأحدان يظنّ بأحد خيرا مالم يعلم ذلک منه."

"جب ایسا زمانہ ہو جس میں عدل، ظلم و جور پر غالب ہو تو کسی کے بارے میں سوءِ ظن رکھنا حرام ہے، جب تک کہ اس (کی برائی) کا یقین نہ ہو جائے۔ اور جب ایسا زمانہ ہو کہ جس میں ظلم و جور، عدل پر غالب ہو تو کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی کے بارے میں حسنِ ظن رکھے، جب تک کہ اس (کی اچھائی) کا یقین نہ ہو جائے۔"

(بحار الانوار۔ ج ۷۸۔ ص ۳۷۰)

دور امامت (34) سال (42) سال

امام علی نقی کی شخصیت

حضرت علی بن محمد علیہما السلام، جنہیں "ہادی" کا لقب دیا گیا ہے، شیعوں کے دسویں امامؑ ہیں، جن کی ولادت کلینی، شیخ مفید، شیخ طوسی اور ابن اثیر کی روایت کے مطابق ۱۵ ذی الحجہ سن ۲۱۲ ہجری (۱) کو ہوئی۔ بعض منابع (sources) میں ۲۷ ذی الحجہ (۲) اور چند دوسرے منابع میں (سن ۲۱۴ ہجری کے) ماہ رجب کی ۲، ۵ (۳) یا ۱۳ تاریخ (۴) بیان کی گئی ہے۔(۵) آپ کی والدہ کا نام "سمانہ" (۶) یا "سوسن" (۷) بتایا گیا ہے۔

امام علی نقی علیہ السلام کی رحلت سن ۲۵۴ ہجری میں ہوئی، اگرچہ اس کے مہینے اور دن کے بارے میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض منابع نے اسے تین رجب قرار دیا ہے۔(۸) جبکہ بعض دوسرے منابع نے پچیس یا چھبیس جمادی الثانی بیان کیا ہے۔(۹)

امام علی نقی علیہ السلام اور ان کے فرزند امام حسن عسکری علیہ السلام نے عسکریین کے عنوان سے شہرت پائی۔(۱۰)

۱۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۴۹۷، ارشاد۔ ص ۳۲۷، التہذیب۔ ج ۶۔ ص ۹۲، کامل ابن اثیر۔ ج ۷۔ ص ۱۸۹

۲۔ مسار الشیعہ۔ ص ۲۳

۳۔ مصباح المتہجد۔ ص ۷۴۱

۴۔ کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۳۷۴

۵۔ اثبات الوصیہ۔ ص ۲۲۱، کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۳۷۴

۶۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۴۹۷، ارشاد۔ ص ۳۰۷، اثبات الوصیہ۔ ص ۲۲۰

۷۔ فرق الشیعہ۔ ص ۱۰۴

۸۔ مسار الشیعہ۔ ص ۳۳، مصباح المتہجد۔ ص ۷۵۳، فرق الشیعہ۔ ص ۱۰

۹۔ کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۳۸۴، کافی۔ ج ۱۔ ص ۴۹۷، مروج الذہب۔ ج ۱۔ ص ۸۴

۱۰۔ یافعی نے مرآۃ الجنان کی جلد ۲ صفحہ ۱۶۰ پر مذکورہ بالا نکتے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے "سامرا" کی عسکر کے نام سے شہرت کی وجہ یہ قرار دی ہے کہ خود معتصم اپنے لشکر کے ساتھ وہاں منتقل ہو گیا تھا، دیکھئے: تذکرۃ الخواص۔ ص ۳۵۹، معانی الاخبار۔ ص ۶۵

کیونکہ خلفائے بنی عباس انہیں سن ۲۳۳ میں سامرا (عسکر) لے گئے تھے اور آخری عمر تک انہیں وہاں اپنے زیرِ نظر رکھا تھا۔

امام علی نقی علیہ السلام دوسرے القاب سے بھی مشہور ہیں' جیسے عالم' فقیہ' امین اور طیب۔ آپ کی کنیت ابوالحسن ہے۔ کیونکہ امام موسیٰ کاظمؑ اور امام علی رضاؑ کی کنیت بھی ابوالحسن تھی' اس لیے غلط فہمی سے بچنے کے لیے امام موسیٰ کاظمؑ کو ابوالحسن اوّل' امام علی رضاؑ کو ابوالحسن ثانی اور امام علی نقی کو ابوالحسن ثالث کہا جاتا ہے۔

ابن صباغ مالکی کی روایت کے مطابق امام علی نقی علیہ السلام کی انگوٹھی کا نقش "اللّٰہ ربّی وھو عصمتی من خلقہ" تھا۔(۱)

شیخ مفید اور بعض دوسروں کی روایت کے مطابق آپ نے سامرا میں ۲۰ سال اور ۹ ماہ مقیم رہنے کے بعد سن ۲۵۴ ہجری کے ماہ رجب میں وفات پائی۔ (۲) اس زمانے میں تیرھواں عباسی خلیفہ معتز تخت نشین تھا۔ ابن شہرآشوب کے بقول آپ اپنی طبیعی موت دنیا سے رخصت نہیں ہوئے تھے' انہوں نے اس بارے میں ابن بابویہ سے روایت بیان کی ہے کہ معتمد عباسی نے آپ کو زہر دیا تھا۔ (۳) واضح ہے کہ معتمد سن ۲۵۵ ہجری میں' یعنی امامؑ کی رحلت کے ایک سال بعد خلیفہ بنا تھا اور اس روایت کا معتمد سے کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا۔ بہرصورت' آپ کو زہر دیا جانا اور آپ کی شہادت تاریخ کے اوراق میں ثبت ہے' اگرچہ متعدد مورخین نے اس کی جانب کوئی اشارہ نہیں کیا ہے' یا اسے دوسرے اقوال کے مقابلے میں ایک قول سمجھا ہے' جیسا کہ مسعودی اور سبط ابن جوزی نے امامؑ کی مسمومیت اور شہادت کو بطور ایک روایت ذکر کیا ہے۔ (۴) قدرتی بات ہے کہ خاندانِ علوی اور خاص طور پر اس گھرانے کے بزرگوں اور اماموں کے ساتھ اس زمانے کے مقتدر حکمرانوں کی جانب سے جس دشمنی اور عناد کا مظاہرہ کیا جاتا تھا' نیز اس بات کو دیکھتے ہوئے کہ امام علی نقی علیہ السلام نے سامرا میں طویل جبری اقامت گزاری اور وفات کے وقت آپ کی عمر تقریباً چوالیس سال تھی۔ مزید یہ کہ تاریخ میں آپ کو لاحق کسی خاص جسمانی عارضے کا ذکر بھی نہیں ہوا ہے' آپ کو زہر دیے جانے اور آپ کی شہادت کی روایت قوی محسوس ہوتی ہے۔

امام علی نقی کی امامت

سن ۲۲۰ ہجری میں امام محمد تقی علیہ السلام کی شہادت کے بعد' اُن کے فرزند امام علی نقی علیہ السلام منصب امامت پر

۱۔ الفصول المہمہ۔ ص ۲۷۷

۲۔ تاریخ بغداد۔ ج ۱۲۔ ص ۵۶

۳۔ مناقب شہرآشوب۔ ج ۲۔ ص ۴۴۲' مسند الامام الہادی۔ ص ۵۶

۴۔ مروج الذہب۔ ج ۴۔ ص ۸۶' تذکرۃ الخواص۔ ص ۳۶۲' اور دیکھئے: الفصول المہمہ۔ ص ۲۸۳

فائز ہوئے جو ابھی چھ سال کے بھی نہیں ہوئے تھے۔ کیونکہ کشی کے چند افراد کے سوا باقی تمام شیعہ امام محمد تقی علیہ السلام کے معاملے میں امام کے بلوغ کے مسئلے سے گزر چکے تھے' اس لیے شیعہ بزرگ امام علی نقی علیہ السلام کی امامت کے حوالے سے کسی خاص شک وشبے کا شکار نہیں ہوئے۔ شیخ مفید اور اسی طرح نوبختی کی تحریر کے مطابق' کشی کے چند لوگوں کے سوا امام محمد تقی علیہ السلام کے تمام ماننے والوں نے امام علی نقی علیہ السلام کی امامت کو قبول کرلیا تھا۔ وہ چند افراد جنہوں نے آپ کی امامت قبول کرنے سے گریز کیا' انہوں نے ایک مختصر مدت کے لیے موسیٰ بن محمد (م:۲۹۶ ہجری) کی امامت کو قبول کیا' جو موسیٰ مبرقع کے نام سے مشہور ہیں اور قم (۱) میں مدفون ہیں۔ لیکن ایک مختصر عرصے کے بعد انہوں نے موسیٰ کی امامت سے منہ موڑ کر امام علی نقی علیہ السلام کی امامت کو قبول کرلیا۔ (۲) سعد بن عبداللہ کے مطابق ان لوگوں کے امام علی نقی علیہ السلام کی جانب پلٹنے کی وجہ یہ تھی کہ خود موسیٰ مبرقع نے ان سے بیزاری اختیار کرتے ہوئے انہیں اپنے سے دور کردیا تھا۔ (۳)

طبرسی اور ابن شہر آشوب کے مطابق امام علی نقی علیہ السلام کی امامت پر شیعوں کا یہی اجماع' آپ کی امامت کے درست ہونے پر ایک مضبوط اور ناقابلِ تردید دلیل ہے۔ (۴) اس کے باوجود مرحوم کلینی اور دوسرے علما نے آپ کی امامت پر مبنی نصوص کو شمار کیا ہے اور بعض روایات سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ امام محمد تقی علیہ السلام کو جب معتصم عباسی نے بغداد طلب کیا گیا' تو انہوں نے اسے اپنے لیے ایک خطرہ سمجھتے ہوئے' اپنی جانشینی کے لیے امام علی نقی علیہ السلام کا انتخاب کیا۔ (۵) حتیٰ آپ کی امامت کے بارے میں ایک تحریری نص بھی چھوڑی' تاکہ اس کے بعد اس بارے میں کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے۔ (۶)

امام علی نقی کے حوالے سے متوکل کی سیاست

معتصم عباسی نے رجب سن ۲۱۸ ہجری سے ربیع الاوّل سن ۲۲۷ ہجری تک حکومت کی' اس کے بعد "واثق" ذی الحجہ

۱۔ دیکھیے: موسیٰ مبرقع کے بارے میں میرزا حسین نوری کا رسالہ جس کا عنوان "البدر المشعشع فی احوال ذریۃ موسیٰ المبرقع" ہے' جس میں انہوں بڑی شدت کے ساتھ موسیٰ مبرقع کا دفاع کیا ہے۔

۲۔ فرق الشیعہ۔ ص ۹۱' الفصول المختار۔ ص ۲۵۷

۳۔ المقالات والفرق۔ ص ۹۹

۴۔ اعلام الوریٰ۔ ص ۳۳۳' مناقب ابن شہر آشوب۔ ج ۲۔ ص ۴۴۳' مسند الامام الہادیؑ۔ ص ۲۰

۵۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۳۲۳' بحار الانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۱۱۸

۶۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۳۲۵' دیکھیے: مسند الامام الہادیؑ۔ ص ۱۸۔ ۲۰

سن ۲۳۲ ہجری تک تخت نشین رہا' اور پھر شوال سن ۲۴۷ ہجری تک متوکل عباسی نے زمامِ خلافت اپنے ہاتھ میں رکھی۔ متوکل کے بعد منتصر (م: ۲۴۸ ہجری) ایک سال تک اور اس کے بعد مستعین سن ۲۵۱ ہجری کے آخر تک اور پھر سن ۲۵۵ ہجری تک معتز تخت نشین رہا۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں' امام علی نقی علیہ السلام کی وفات کا سال ۲۵۴ ہجری ہے' جو ظاہر ہے کہ معتز کا دورِ حکومت تھا۔

متوکل کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے' خلفا مامون ہی کی سیاست پر گامزن تھے۔ یہ سیاست شدت پسند اہلِ سنت یعنی اہلِ حدیث' کے مقابلے میں معتزلہ کا ساتھ دیا کرتی تھی۔ اس بات نے علویوں کے لیے سازگار سیاسی ماحول پیدا کر دیا تھا۔ متوکل کے برسرِ اقتدار آنے سے از سرِ نو تنگ نظری کا آغاز ہو گیا' اور اہلِ حدیث کی حمایت اور انہیں معتزلہ اور شیعوں کے خلاف ابھار کر شدت کے ساتھ ان دونوں کی سرکوبی کی گئی۔

ابو الفرج اصفہانی نے' متوکل کے دور میں اٹھنے والی علوی تحریکوں کے ذکر کی ابتدا میں' طالبیوں کے ساتھ اس کے نامناسب برتاؤ کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس کے وزیر عبید اللہ بن یحییٰ بن خاقان کو بھی اسی کی طرح خاندانِ علوی کے جانی دشمنوں میں سے شمار کیا ہے۔ طالبیوں کے ساتھ متوکل کے سخت رویے میں حضرت امام حسین علیہ السلام کے روضۂ اقدس کو مسمار کرنا' اس کے اطراف کی زمین ہموار کر کے اس پر ہل چلانا' اس پر کھیت اگانا اور امام حسینؑ کے زائرین کو ہولناک سزائیں دینا شامل ہے۔ (۱) یہ کھنچاؤ صرف اس لیے تھا کہ کربلا میں امام حسینؑ کی قبرِ مطہر کی موجودگی شیعہ فکر اور ان کے اماموں کے ساتھ عوام الناس کے جذباتی تعلق کو مضبوط کر سکتی تھی۔ اسی طرح ابو الفرج نے مدینہ کے علویوں کے ساتھ متوکل کی جانب سے روا رکھی جانے والی سختیوں کے کچھ نمونے بھی پیش کیے ہیں' جو انتہائی تکلیف دہ ہیں۔

سامرا میں امامؑ کو طلب کرنا

علویوں کے ساتھ اپنے ظالمانہ رویے کے دوران ہی متوکل کو امام علی نقی علیہ السلام کا خیال آیا' اور اس نے حکم دیا کہ امامؑ کو مدینہ میں گرفتار کر کے سامرا لایا جائے۔ اس طرح وہ امامؑ کے پاس آنے جانے والے لوگوں کی نزدیک سے نگرانی کر سکتا تھا۔ یہ وہی مامونی سیاست تھی جو اس سے پہلے امام علی رضا علیہ السلام کے بارے میں جاری رہ چکی تھی' البتہ مامون کے زمانے میں اس سیاست کا ظاہر خوشنما تھا۔

۱۔ مقاتل الطالبیین۔ ص ۴۷۸۔ ابو الفرج اپنی روایت جاری رکھتے ہوئے اضافہ کرتے ہیں کہ: امام حسینؑ کے شیعوں میں سے کچھ لوگوں نے آپ کی قبر مبارک کی تخریب کے بعد اس کی کچھ علامتیں معین کر دی تھیں۔ یہ لوگ متوکل کے مارے جانے کے بعد کربلا آئے اور وہاں علویوں اور طالبیوں کے بعض افراد کے ساتھ قبر کی نشاندہی کر کے اس پر ایک مقبرہ بنایا۔

حدیث اور تاریخ کے منابع (sources) میں مدینہ سے امامؑ کو گرفتار کر کے سامرا لانے کے بارے میں کئی روایات موجود ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ ان سب کو ملا کر اس بارے میں ایک جامع روایت پیش کریں۔

متوکل نے سن ۲۳۳ ہجری میں امامؑ کو مدینہ سے سامرا بلانے کا فیصلہ کیا۔ شیخ مفید نے یہ تاریخ سن ۲۴۳ ہجری قرار دی ہے جو درست نہیں' بلکہ اس تاریخ کو ایک شیعہ نے متوکل کے اس خط کو نقل کیا تھا' جس میں اس نے امام علی نقی علیہ السلام کو طلب کیا تھا۔(۱)

اس سال عبداللہ بن محمد ہاشمی نے ایک خط میں متوکل کو لکھا: اگر تجھے حرمین (مکہ اور مدینہ) کی ضرورت ہے' تو علی بن محمدؑ کو وہاں سے دور کر دے' کیونکہ وہ لوگوں کو اپنی طرف دعوت دیتے ہیں اور لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے ان کی دعوت پر لبیک کہا ہے۔ متوکل کی بیوی نے بھی اس حوالے سے اُسے ایک اشتعال انگیز خط لکھا۔ (۲) انہی رپورٹوں کے بعد متوکل نے امامؑ کو سامرا طلب کرنے کا قدم اٹھایا۔ (۳) ابن اثیر نے علویوں کے ساتھ متوکل کے اس سخت رویے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بعض ناصبیوں اور اسی عبداللہ بن محمد ہاشمی کا نام لیا ہے' جو مسلسل خلیفہ کے غیظ وغضب کو بھڑکاتے رہتے تھے۔ یہ لوگ ہمیشہ متوکل کو علویوں سے خائف رکھتے اور اسے انہیں جلاوطن کرنے اور ان کے ساتھ سخت طرزِ عمل اپنانے پر اُکساتے تھے۔ (۴)

ابن جوزی خاندانِ رسالت سے عداوت رکھنے والے بعض افراد کی طرف سے متوکل کے کان بھرے جانے کی جانب اشارہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں: متوکل نے لوگوں کے امام علی نقی علیہ السلام کی جانب مائل ہونے کی انہی اطلاعات کی بنا پر امامؑ کو سامرا طلب کیا۔ (۵)

شیخ مفید لکھتے ہیں: امام علی نقی علیہ السلام نے متوکل کو ایک خط لکھ کر اسے فراہم کی جانے والی ان اطلاعات کو جھوٹا قرار دیا۔ (۶) متوکل نے امامؑ کے جواب میں ایک احترام آمیز خط لکھا اور (مدینہ میں نماز اور جنگی امور کے ذمے دار) عبداللہ بن محمد ہاشمی کو معزول کرتے ہوئے' چالاکی کے ساتھ امامؑ سے درخواست کی کہ آپ سامرا (عسکر) تشریف لے

۱۔ دیکھئے: ارشاد۔ ص ۳۳۳۔ ۳۳۲' کافی۔ ج ۱۔ ص ۵۰۱

۲۔ ثم کتبت الیه بهذا المعنی زوجة المتوکل.

۳۔ بحار الانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۲۱۳ نقل از عیون المعجزات

۴۔ کامل ابن اثیر۔ ج ۷۔ ص ۲۰ اور دیکھئے: مقاتل الطالبیین۔ ص ۴۸۰

۵۔ تذکرۃ الخواص۔ ص ۳۵۹

۶۔ ارشاد۔ ص ۳۳۳

آ ئیں۔ مرحوم کلینی اوراسی طرح شیخ مفید نے متوکل کے اس خط کا متن نقل کیا ہے۔

متوکل نے اس خط میں اس بات پر زور دیتے ہوئے کہ وہ امامؑ کی رفیع الشان شخصیت کو پہچانتا ہے اور آپ کی ہر قسم کی مدد کرنے کو تیار ہے عبداللہ بن محمد کی معزولی اور اس کی جگہ محمد بن فضل کی جانشینی کی خبر امامؑ کو دی۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ اس نے محمد بن فضل کو حکم دیا ہے کہ وہ امامؑ کا احترام کرے اور ان کی رائے اور حکم سے سرتابی نہ کرے۔ آگے چل کر متوکل کے خط میں آیا ہے: وہ امامؑ سے تجدید عہد کا مشتاق ہے اور ان سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے آنجناب جس کے ساتھ آنا چاہیں (مناسب موقع اور مکمل سکون واطمینان کے ساتھ) سامرا چلے آئیں اور اگر آپ چاہیں تو یحییٰ بن ہرثمہ اور اس کے ساتھ موجود سپاہی (جو آپ کے حکم کی اطاعت کریں گے) (۱) اس سفر میں آپ کے ہمراہ ہوں گے۔ اس کے بعد اس نے یحییٰ کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ تین سو سپاہیوں کے ساتھ کوفہ جائے اور وہاں ساز و سامان رکھنے کے بعد صحرا کے راستے مدینہ جا کر علی بن محمد ہادی علیہ السلام کو عزت و احترام کے ساتھ اس کے پاس لے آئے۔ (۲)

متوکل نے اپنا یہ پروگرام اس لیے اس طرح تیار کیا تھا' تا کہ لوگ حساس نہ ہو جائیں اور امامؑ کو مجبور کر کے سفر پر آمادہ کرنا خطرناک نتائج کا سبب نہ بن جائے۔ لیکن مدینہ کے لوگ ابتدا ہی سے سارا معاملہ سمجھ گئے تھے۔

اس بارے میں ابن جوزی نے یحییٰ بن ہرثمہ سے نقل کیا ہے: میں مدینہ کی طرف روانہ ہوا اور شہر میں داخل ہو گیا۔ لوگ انتہائی غضبناک اور بپھر گئے تھے اور انہوں نے ایک غیر متوقع لیکن ساتھ ہی نرم رد عمل کا مظاہرہ کیا۔ رفتہ رفتہ لوگوں کی ناراضگی اس قدر بڑھی کہ وہ کھلم کھلا نعرے بلند کرنے لگے اور اس کام میں اتنا آگے بڑھ گئے کہ مدینہ نے کبھی ایسے حالات نہیں دیکھے ہوں گے۔ انہیں امام علی نقی علیہ السلام کی جان کا خوف تھا' کیونکہ وہ ان کے ساتھ ہمیشہ نیکی کرنے کے علاوہ اپنا بیشتر وقت مسجد میں گزارتے تھے اور دنیا سے انہیں کوئی مطلب نہ تھا۔ اس صورت حال میں' میں مجبور ہو گیا کہ لوگوں کو اطمینان دلاؤں اور انہیں صبر و تحمل اور اطمینان اور سکون سے رہنے کی دعوت دوں۔ میں نے ان کے سامنے قسم کھائی کہ مجھے امامؑ کے ساتھ سخت برتاؤ کا کوئی حکم نہیں دیا گیا ہے اور آپ کی سلامتی کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ (۳)

واضح ہے کہ امامؑ اپنی مرضی سے سامرا آنا نہیں چاہتے تھے (جو ایک فوجی اور محدود شہر تھا) اور متوکل کے اس اہل کار کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ امامؑ کو زبردستی وہاں لے آئے۔ اسی لیے جیسا کہ درج بالا روایت میں آگے چل کر آیا ہے' اس نے امامؑ کے گھر کی تلاشی لی اور دعاؤں اور علم سے متعلق کتابوں کے سوا اس کے ہاتھ کچھ اور نہ آیا۔ کہا جاتا ہے کہ خود یحییٰ بن ہرثمہ

۱۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۵۰۱' ارشاد۔ ص ۳۳۳' تذکرۃ الخواص۔ ص ۳۶' الفصول المہمہ۔ ص ۲۷۹

۲۔ بحار الانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۱۴۲ نقل از الخرائج والجرائح

۳۔ تذکرۃ الخواص۔ ص ۳۵۹

بھی امامؑ سے متاثر ہو کر دل سے آپ کی امامت کی طرف مائل ہو گیا تھا۔(۱)

"عیون المعجزات" کی ایک روایت بتاتی ہے کہ یحییٰ بن ہرثمہ پہلے عبداللہ بن محمد ہاشمی کے پاس گیا' اور متوکل کا خط اسے دکھایا اور پھر وہ دونوں امامؑ کی خدمت میں پہنچے اور انہیں سفر کی تیاری کرنے کے لیے تین دن کی مہلت دی۔ جب تین دن بعد وہ لوگ امامؑ کی خدمت میں آئے تو آپ سفر کے لیے تیار تھے۔(۲) ایک اور روایت میں آیا ہے کہ امام علی نقی علیہ السلام نے فرمایا: انہیں زبردستی سامرا لایا گیا ہے۔(۳)

سامرا میں امامؑ کی اقامت

جب امام علی نقی علیہ السلام سامرا پہنچے' تو لوگوں نے آپ کا شاندار استقبال کیا اور آپ کو خزیمہ بن حازم کے گھر ٹھہرایا گیا۔(۴) یحییٰ بن ہرثمہ کہتا ہے: جب ہم راستے میں بغداد پہنچے' تو میں بغداد کے والی اسحاق بن ابراہیم طاطری سے ملا۔ اس نے امامؑ کے بارے میں مجھ سے کہا: اے یحییٰ! یہ شخص فرزندِ رسولؐ ہے' متوکل کی اخلاقی کیفیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے (جس سے تم بھی پوری طرح واقف ہو) اگر تم نے ان کے بارے میں خلیفہ کو مشتعل کرنے والی کوئی خبر دی' تو وہ انہیں قتل کر دے گا اور اگر ایسا ہوا تو روزِ قیامت تیرا معاملہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہوگا۔ جب ہم سامرا پہنچے تو پہلے "وصیف ترکی" سے ملاقات ہوئی اور میں نے اسے امامؑ کے پہنچنے کی اطلاع دی۔ اس نے کہا: اگر اس شخص کے سر سے ایک بال بھی کم ہوا' تو تم سے باز پرس ہوگی۔ پھر میں متوکل کے پاس گیا اور آپ کے بارے میں اسے رپورٹ دی جس سے آپ کے حسنِ سیرت' تقویٰ اور زہد کی عکاسی ہوتی تھی اور میں نے اسے بتایا کہ ان کے گھر کی تلاشی میں مجھے چند علمی کتابوں اور مصحف کے سوا کچھ اور نہیں ملا۔(۵)

شیخ مفید کے بقول جب امامؑ سامرا میں داخل ہوئے' تو پہلے روز متوکل نے حکم دیا کہ انہیں ایک دن کے لیے "خان (۶) صعالیک" میں ٹھہرایا جائے اور اگلے روز انہیں اس گھر میں منتقل کیا گیا جو ان کی رہائش کے لیے معین کیا گیا تھا۔(۷) صالح بن سعید کے خیال میں ایسا امامؑ کی توہین کی غرض سے کیا گیا تھا۔ وہ کہتا ہے: امامؑ کے آتے ہی میں

۱۔ مروج الذہب۔ ج ۴۔ ص ۸۴' تذکرۃ الخواص۔ ص ۳۵۹

۲۔ بحار الانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۲۰۹

۳۔ مناقب ابن شہر آشوب۔ ج ۲۔ ص ۴۵۴' مسند الامام الہادیؑ۔ ص ۴۴

۴۔ اثبات الوصیہ۔ ص ۲۲۸

۵۔ تذکرۃ الخواص۔ ص ۳۵۹' مروج الذہب۔ ج ۴۔ ص ۸۵

۶۔ سرائے' مسافر خانہ

۷۔ ارشاد۔ ص ۳۳۴' روضۃ الواعظین۔ ص ۲۱۰

نے ان سے عرض کیا: ان لوگوں کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ خدائی نور کو بجھادیں اور آپ کے الٰہی مقام کو نظر انداز کریں' اسی لیے ان لوگوں نے آپ کو اس مسافر خانے میں جو "خان الصعالیک" کے نام سے معروف ہے' ٹھہرایا ہے۔(۱)

امامؑ نے اپنی عمر کے آخر تک (بیس سال سے زائد عرصہ) اسی شہر میں زندگی بسر کی۔ شیخ مفید سامرا میں امامؑ کی جبری اقامت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: آپ کو بظاہر خلیفہ کی جانب سے احترام دیا جاتا تھا' لیکن باطن میں متوکل کی طرف سے آپ کے خلاف سازشیں کی جاتی تھیں' لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی سازش عملاً کامیاب نہیں ہوئی۔(۲)

امامؑ کے ساتھ متوکل کا طرزِ عمل

امامؑ سامرا میں اپنی جبری اقامت کے دوران بظاہر ایک پرسکون زندگی گزار رہے تھے' اور متوکل چاہتا تھا کہ امامؑ پر نگرانی رکھتے اور انہیں کنٹرول کرتے ہوئے انہیں اپنا ایک درباری بنا کے رکھ دے اور لوگوں کی نظر میں آپ کی عظمت اور ہیبت کو کم کردے۔

طبری لکھتے ہیں: متوکل مسلسل لوگوں کی نظروں میں امامؑ کی شخصیت کو گرانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔(۳)

مشہور مورخ مسعودی متوکل کے ساتھ امامؑ کے برتاؤ کے دو نمونے پیش کرتا ہے:

۱۔ محمد بن یزید مبرد کہتا ہے: ایک دن متوکل نے امامؑ سے پوچھا: آپ کے والد کا بیٹا (یعنی آپ) عباس بن عبدالمطلب کے بارے میں کیا کہتا ہے؟

امامؑ نے جواب دیا: اے خلیفہ! میرے والد کا بیٹا (یعنی میں) ایک ایسے شخص کے بارے میں سوائے اچھائی کے اور کیا کہہ سکتا ہے جس کی اولاد کی اطاعت کو خدا نے لوگوں پر واجب کیا ہے اور اس کی اطاعت کو اس کی اولاد پر واجب قرار دیا ہے؟

متوکل جو امامؑ کے جواب کو اپنی مرضی کے مطابق سمجھ رہا تھا' بہت خوش ہوا اور آپ کو ایک لاکھ درہم بخش دیے۔

مسعودی اس بات کو نقل کرنے کے بعد کہتا ہے: اس جواب سے امامؑ کا اصل مقصد یہ بتانا تھا کہ بنی عباس پر خدا کے احکام کی اطاعت واجب ہے' جسے آپ نے اس انداز سے کنایتاً بیان فرمایا۔(۴)

۱۔ ارشاد۔ ص ۳۳۴

۲۔ ارشاد۔ ص ۳۳۴

۳۔ اعلام الوریٰ۔ ص ۳۴۸

۴۔ مروج الذہب۔ ج ۴ ص ۱۰-۱۱: قال المسعودی: "انما اراد ابوالحسن طاعة الله علی بنیه."

اس قسم کے جواب سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ متوکل کی جانب سے خطرے کی زد پر تھے' اس لیے آپ پر لازم تھا کہ تقیہ کریں اور ذہانت کے ساتھ ایسا جواب دیں۔ جس سے صرف گہرائی کے ساتھ غور و فکر کرنے والے ہی امامؑ کا اصل مقصد جان سکتے ہیں۔

متوکل یہ بات جان چکا تھا کہ امامؑ کی نظر میں آیت: وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ (۱) کا اشارہ بعض خلفا کی طرف ہے۔ اس لیے اُس نے اس سے سوءِ استفادہ کرنے کی بابت سوچا اور کوشش کی کہ اس کو سامنے لا کر امامؑ کو کسی طرح سے عامہ یعنی اہلِ حدیث کے مقابلے میں لے آئے۔ لہٰذا اس نے ایک دن جبکہ دربار میں کافی لوگ موجود تھے' امامؑ سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا۔ امامؑ نے فرمایا اس سے مراد دو افراد ہیں' جن کا ذکر خدا نے کنایتاً کیا ہے اور ان کے ناموں کی صراحت کے بغیر ان پر احسان جتایا ہے۔ کیا خلیفہ یہ چاہتا ہے کہ جس چیز کو خدا نے پوشیدہ رکھا ہے' اسے یہاں برملا کر دے؟ متوکل نے کہا: نہیں۔ (۲) اس طرح امامؑ نے اپنے خلاف بچھائے گئے خطرناک جال سے خود کو بچا لیا۔

۲۔ متوکل کو اطلاع دی گئی کہ امام علی نقی علیہ السلام کے گھر میں جنگی ساز و سامان اور آپ کے نام شیعوں کے خطوط وغیرہ موجود ہیں۔ اس نے حکم دیا کہ چند سپاہی امامؑ کے گھر پر چھاپا ماریں۔ اس حکم پر عمل کیا گیا' اور جب سپاہی گھر میں داخل ہوئے' تو انہوں نے آپ کو ایک ایسے کمرے میں تنہا پایا جس کا فرش ریت اور مٹی کا تھا' آپ نے دروازہ بند کیا ہوا تھا اور اونی لباس پہنے ہوئے' ایک چادر سر پر ڈالے ہوئے' قرآنِ مجید کی ان آیات کی تلاوت کر رہے تھے جن میں وعدہ اور وعید کیے گئے تھے۔ آپ کو اسی حالت میں متوکل کے پاس لایا گیا۔ جب امامؑ متوکل کے دربار میں پہنچے' تو اس کے ہاتھ میں شراب کا جام تھا۔ متوکل نے آپ کو اپنے برابر میں بٹھایا اور آپ کی طرف جام بڑھاتے ہوئے بولا: پیجیے۔ امامؑ نے معذرت چاہی اور فرمایا: میرا گوشت اور خون اب تک شراب سے آلودہ نہیں ہوا ہے۔ پھر متوکل نے امامؑ سے مطالبہ کیا کہ آپ اسے کچھ ایسے اشعار سنائیں جنہیں سن کر وہ وجد و سرور میں آجائے۔ امامؑ نے فرمایا: میں شعر کم ہی پڑھتا ہوں۔ جب متوکل کا اصرار بڑھا' تو امامؑ نے یہ اشعار پڑھے:

باتوا على قلل الأجبال تحرسهم غُلْبُ الرِّجال فما تنفعهم القلل

واستنزلوا بعد عزّ من معاقلهم فاودِعوا حُفَراً يا بئس ما نزلوا

ناداهم صارخ من بعد ما قبروا أين الأساور و التيجان و الحُلَل

۱۔ سورۂ فرقان ۲۵۔ آیت ۲۷ (جس دن ظالم حسرت سے اپنا ہاتھ کاٹے گا)

۲۔ بحار الانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۲۱۲

أين الوجوه التي كانت منعّمة	من دونها تضرب الأستار و الكلل
فأصفح القبر عنهم حين سائلهم	تلك الوجوه عليها الدود تنتقل (۱)
قد طال ما أكلوا دهراً و قد شربوا	و أصبحوا اليوم بعد الأكل قد أكلوا
و طالما عمّروا دوراً لتحصنهم	ففارقوا الدور والأهلين و انتقلوا
و طالما كنزوا الأموال و ادّخروا	فخلّفوها على الأعداء و ارتحلوا
أضحت منازلهم قفراً معطّلة	و ساكنوها الى الأجداث قد رحلوا

''پہاڑوں کی چوٹیوں پر انہوں نے اس حالت میں رات بسر کی کہ طاقتور مرد اُن کی حفاظت کر رہے تھے لیکن ان چوٹیوں نے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ وہ اپنی پناہ گاہوں سے نیچے اتار لیے گئے اور سیاہ مٹی کے نیچے ڈال دیے گئے۔ اور انہوں نے اقامت کے لیے کس قدر بری جگہ کا انتخاب کیا۔

جب وہ اپنی قبروں میں پہنچ گئے تو ایک پکارنے والے نے پکار کر کہا: کہاں گئے وہ بازو بند' کہاں ہیں وہ تاج' کہاں ہیں وہ زر و زیور؟ کہاں گئے وہ چہرے جو ناز و نعم میں پلے تھے اور ان کے سامنے قیمتی نازک پردے آویزاں تھے۔ جب ان سے یہ سوال کیا جائے گا تو ان کی جانب سے قبر یہ جواب دے گی: وہ چہرے اب لاش خور کیڑوں کی آماجگاہ بن گئے ہیں۔ انہوں نے ایک لمبی عمر کھانے پینے میں بسر کی' اور اب اس ساری کھلائی پلائی کے بعد خود کیڑوں مکوڑوں کی خوراک بن گئے ہیں۔ کتنے ہی محل انہوں نے اپنے لیے بنائے' لیکن آخرکار ان محلوں اور اپنے عزیزوں کو چھوڑ کر چلے گئے۔ کتنا ہی مال و دولت انہوں نے جمع کیا' لیکن اسے اپنے دشمنوں کے لیے چھوڑ کر خود رخصت ہو گئے۔ آخرکار ان کے تخت ویران اور معطل ہو گئے اور یہ محل نشین لوگ اپنی قبروں کی طرف روانہ ہو گئے۔''

امامؑ کے ان اشعار نے تمام حاضرین بزم کو ہلا کر رکھ دیا' یہاں تک کہ خود متوکل کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ اس موقع پر خلیفہ نے شراب ہٹا لینے کا حکم دیا اور حکم دیا کہ امامؑ کو احترام کے ساتھ ان کے گھر پہنچا دیا جائے۔ (۲)

متوکل نے امامؑ کو مجبور کیا کہ آپ بھی اس کے امراء' وزراء' سپہ سالاروں اور دوسرے درباریوں کی طرح لباس فاخرہ زیب تن کریں اور سج دھج کر دوسروں کی طرح متوکل کی سواری کے ساتھ پیدل چلا کریں۔ خلیفہ کے ساتھ پیدل چلنے سے

۱۔ اور دوسرے نسخے میں ''تقتتل'' آیا ہے۔ یعنی کیڑے ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑنے میں مشغول ہیں۔

۲۔ مروج الذہب۔ ج ۴۔ ص ۱۱' مرآۃ الجنان۔ ج ۲۔ ص ۱۵۹' تتمۃ المختصر۔ ص ۳۴۷

صرف ایک شخص مستثنا تھا اور وہ اس کا کینہ پرور وزیر فتح بن خاقان تھا' جو اسی کی طرح گھوڑے پر سوار ہوا کرتا تھا۔ یہ صورتحال امامؑ کے لیے انتہائی سخت اور ناقابلِ برداشت تھی۔ اسی قصے کے بعد امامؑ نے "دعاء المظلوم علی الظالم" (ظالم کے خلاف مظلوم کی دعا) پڑھی تھی۔(۱)

اسی طرح متوکل اس بات پر بھی اصرار کیا کرتا تھا کہ امامؑ اس کی محفلوں میں موجود رہا کریں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح وہ آپ (جو کہ شیعوں کے امام اور نیک لوگوں کے راہنما تھے) کی اچھی طرح توہین کرسکتا تھا اور آپ کو لوگوں کی نظروں سے گرا کر آپ کے پیروکاروں کو آپ سے دور کرسکتا تھا۔ اس بات کا اعتراف خود متوکل نے ان الفاظ میں کیا ہے: امامؑ کی ثابت قدمی انہیں شراب کی محفل میں بلانے میں رکاوٹ بنتی تھی۔(۲)

امامؑ سامرا میں ایسی بلند اور باعظمت شخصیت کے مالک تھے' کہ سب لوگ آپ کے سامنے انکساری کا مظاہرہ کرتے تھے' اور نا چاہتے ہوئے بھی آپ کے ساتھ عاجزی اور انکساری سے پیش آتے اور آپ کا احترام کرتے تھے۔(۳)

متوکل نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں امامؑ کو شہید کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ابن ارومہ کہتا ہے: میں ان دنوں سامرا گیا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ متوکل نے امامؑ کو سعید حاجب کے سپرد کیا ہے اور انہیں قتل کرنا چاہتا ہے' لیکن دو دن بعد (امامؑ کی پیش گوئی کے عین مطابق) رات کے وقت ترکوں نے متوکل پر حملہ کرکے اسے اس کے گھر میں (جبکہ وہ اپنے بستر پر آرام کررہا تھا) قتل کردیا۔ اس طرح امامؑ کو اس کے چنگل سے نجات ملی۔(۴)

دوسری روایات میں آیا ہے: متوکل امامؑ کی گرفتاری کا حکم دینے کے تیسرے روز قتل کردیا گیا۔(۵)

متوکل کے بعد اس کا بیٹا منتصر مسندِ اقتدار پر بیٹھا اور یہ امام علی نقی علیہ السلام سمیت خاندانِ علوی پر حکومتی دباؤ میں کمی کا سبب بنا۔ اگرچہ دوسرے شہروں میں شیعوں پر حکام کا ظلم و ستم اسی طرح جاری تھا۔(۶)

گزشتہ زمانوں کی نسبت سختیوں میں کچھ کمی نے مختلف شہروں میں شیعوں کے نظم کو مضبوط کیا' اور جوں ہی کسی شہر میں امامؑ کا کوئی وکیل گرفتار ہوتا' امامؑ فی الفور اس کی جگہ کسی اور شخص کو اپنا وکیل مقرر کردیتے۔ امامؑ کے وکیلوں میں سے ایک وکیل

۱۔ مہج الدعوات ابن طاؤس۔ ص ۲۶۵۔ طبع تہران' مسند الامام الہادیؑ۔ ص ۱۸۶۔۱۹۱

۲۔ کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۳۸۱

۳۔ کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۳۹۸

۴۔ کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۳۹۴

۵۔ مناقب ابن شہر آشوب۔ ج ۲۔ ص ۴۴۷' مسند الامام الہادیؑ۔ ص ۴۱

۶۔ دیکھئے: تاریخ سیاسی غیبت امام دوازدہم۔ ص ۸۵

علی بن جعفر تھے' جنہیں گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔(۱) اسی طرح مصر میں محمد بن فرج کو گرفتار کر کے عراق لایا گیا' اور وہ آٹھ سال تک قید خانے میں رہے۔(۲)

اس بارے میں ڈاکٹر جاسم حسین لکھتے ہیں: کندی کی تحریر کے مطابق' مصر میں امامیہ' یزید بن عبداللہ ترکی (جو خلیفہ کی طرف سے مصر کا حاکم تھا) کے ہاتھوں سخت تکلیف میں مبتلا تھے۔ اسی نے مصر کے ایک علوی رہنما ابوحمزہ کو اُن کے پیروکاروں کے ساتھ گرفتار کیا۔ ان پر خفیہ سرگرمیوں کا الزام تھا۔ انہیں سن ۲۴۸ ہجری میں عراق بھیج دیا گیا۔(۳)

شیخ کلینی لکھتے ہیں: مسلسل تعاقب اور گرفتاری کے اس عمل نے امام علی نقی علیہ السلام کے پیروکاروں کو نقصان پہنچایا۔(۴) مثال کے طور پر محمد بن حجر مارے گئے' سیف بن لیث کا مال و دولت ضبط کر لیا گیا اور اسی زمانے میں عراق میں' سامرا میں رہنے والے امامؑ کے بعض پیروکار گرفتار کر لیے گئے(۵) اور کوفہ میں قاضی شہر آپ کے وکیل ایوب بن نوح کے تعاقب میں رہا۔(۶) شیعہ مدتوں سے ائمہ علیہم السلام کے حکم کے مطابق حکومتی عہدوں پر فائز ہو چکے تھے اور ضروری مواقع پر شیعوں کی مدد کیا کرتے تھے۔ معتصم عباسی کا ایک معتمد "یعقوب بن یزید" کاتب تھا' جس نے بداء کے موضوع پر ایک کتاب اور "المسائل" اور "نوادر الحج" نامی ایک کتاب تالیف کی ہے۔(۷) ظاہر ہے کہ اس قسم کے افراد انتہائی خفیہ طریقے سے کام کیا کرتے تھے' کیونکہ بصورتِ دیگر خلفا ان کی حقیقت سے واقف ہو جاتے' اور امامؑ کے ساتھ ان کے تعلقات سے آگاہ ہو کر ان پر سخت دباؤ ڈالتے اور آخرکار انہیں نکال دیتے اور ان کا وظیفہ بھی بند کر دیتے۔(۸)

امام علی نقی علیہ السلام کے پیروکاروں اور شیعوں کے علاوہ آپ سے روایت کرنے والے تقریباً ایک سو نوے صحابی ہمارے علم میں ہیں' جن میں سے ایک سو اسی اصحاب کی مختلف ابواب میں احادیث ہماری دسترس میں ہیں۔ اس زمانے میں شیعوں کے پاس ائمہؑ کی احادیث پر مبنی کلامی اور فقہی تدوین شدہ کتابیں موجود تھیں' اور وہ وکلا کے ذریعے امامؑ سے اپنی مشکلات کا حل معلوم کرتے تھے۔ خود امامؑ بھی اُن لوگوں کو اپنے ایسے اصحاب کی طرف بھیج دیتے تھے' جو مدتوں سے امامؑ کے

۱۔ اثبات الوصیہ۔ ص ۲۳۲

۲۔ بحار الانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۱۴۰

۳۔ ولاۃ مصر۔ ص ۲۲۹' نقل از تاریخ سیاسی غیبت امام دوازدہم۔ ص ۸۹

۴۔ کافی۔ ج ۱ص ۵۱۱۔ ۵۱۳

۵۔ مناقب ابن شہر آشوب۔ ج ۴۔ ص ۴۱۶

۶۔ کشف الغمہ۔ ج ۳۔ ص ۲۴۷' نقل از تاریخ سیاسی غیبت امام دوازدہم۔ ص ۸۹

۷۔ رجال النجاشی۔ ص ۳۱۳

۸۔ امالی شیخ طوسی۔ ج ۱۔ ص ۲۹۱' مسند الامام الہادیؑ۔ ص ۳۸۔ ۳۹

ساتھ تھے اور اہلِ بیتؑ سے شدید محبت کرتے تھے۔(۱) اگرچہ تاریخ میں ہمیں اس زمانے میں شیعوں کے حالات کی ٹھیک ٹھیک عکاسی کرنے والی اطلاعات نہیں ملتیں، لیکن بعد میں آنے والے قرائن سے بخوبی یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ شیعہ سوسائٹی ائمہؑ اور ان کے وکلا کی منظم سرگرمیوں اسی طرح اہلِ بیتِ رسولؐ سے مسلمانوں کی گہری محبت کی مرہونِ منت رہی ہے۔

امام علی نقی علیہ السلام کے دور میں زیدیوں کے اماموں نے بھی پوری اسلامی مملکت میں وسیع تحریکیں چلائیں۔ مجموعی طور پر زیدیوں کو (شیعوں کے ساتھ ان کے سخت برتاؤ کی وجہ سے) ائمہؑ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ لیکن جب کبھی وہ اپنی تحریکوں میں صداقت اور خلوصِ نیت کا مظاہرہ کرتے، تو شیعہ امامی بھی جذباتی لحاظ سے ان سے ہمدردی رکھتے تھے۔ ان تحریکوں سے متعلق معلومات ابوالفرج اصفہانی کی ''مقاتل الطالبیین'' میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

امام علی نقیؑ کے وکلا اور ان کے اختیارات

شیعوں کے آخری ائمہؑ کا دور عباسی خلفا کی جانب سے پیدا کردہ شدید گھٹن کا دور تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس دور میں شیعہ تمام اسلامی ممالک میں پھیل چکے تھے۔ اس دور میں شیعوں کی تعداد میں اضافہ اس زمانے میں شیعہ مخالف سرگرمیوں اور حکمرانوں کی جانب سے تشیع کے روز افزوں فروغ کو روکنے کے لیے اٹھائے جانے والے سیاسی اور فوجی اقدامات سے بخوبی واضح ہے۔ اس حوالے سے بعد میں ہم ایرانی شیعوں کے ساتھ امام علی نقی علیہ السلام کے رابطوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے بیان کریں گے۔

امام علی نقی علیہ السلام کے عراق، یمن، مصر اور دوسرے علاقوں کے شیعوں کے ساتھ بھی تعلقات برقرار تھے۔ امامؑ کے وکلا کا نظام ان روابط کے پیدا ہونے، ان کے تسلسل اور ان کے استحکام کا ضامن تھا۔ وہ لوگ جو امام علی رضا علیہ السلام کی جانب سے، اور ان کے بعد امام محمد تقی علیہ السلام اور امام علی نقی علیہ السلام کی جانب سے امامؑ اور ان کے شیعوں کے درمیان روابط کی برقراری اور ان میں تنظیم کے ذمے دار تھے، وہ خمس کو جمع کر کے امامؑ کی خدمت میں ارسال کرنے کے علاوہ، کلامی اور فقہی مشکلات کے حل میں بھی اہم کردار کے مالک تھے اور اپنے علاقوں میں اگلے امامؑ کی امامت کو رائج کرنے کے معاملے میں بھی مرکزی کردار ادا کرتے تھے۔ بسا اوقات ان وکلا میں سے کچھ لوگ امامؑ سے منحرف بھی ہوئے ہیں اور امامؑ کی جانب سے ان کی تکذیب بھی کی گئی ہے۔ ایسے حالات میں دوسرے لوگ ان کی جگہ لے لیا کرتے تھے۔

بہر کیف وکالت کا نظام، شیعوں کی سیاسی اور فکری پوزیشن کے استحکام میں بنیادی کردار ادا کرتا تھا۔ بقول ڈاکٹر جاسم حسین: جیسا کہ تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے، وکلا کے تعین کے لیے جن شہروں کو پیشِ نظر رکھا جاتا تھا، وہ چار

۱۔ رجال کشی۔ ص ۱۱؛ مسند الامام الہادیؑ۔ ص ۸۳

علاقوں میں تقسیم ہوتے تھے:

الف: بغداد مدائن سواد اور کوفہ۔

ب: بصرہ اور اہواز۔

ج: قم اور ہمدان۔

د: حجاز یمن اور مصر۔(۱)

ائمہؑ کے وکلا عام طور پر قابلِ اعتماد افراد کے توسط سے خطوط کے ذریعے سے امامؑ کے ساتھ رابطہ رکھا کرتے تھے۔ جیسا کہ امام محمد تقی علیہ السلام نیز امام حسن عسکری علیہ السلام کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے ہم نے اس نکتے پر تاکید کی ہے۔ ائمہؑ کے فقہی اور کلامی علوم کا بڑا حصہ اپنے شیعوں کے نام آپ کے خطوط کے ذریعے سے پہنچا ہے، جنہیں مصادر حدیث میں نقل کیا گیا ہے اور جو آج بھی ہماری دسترس میں ہیں۔ امام علی نقی علیہ السلام کے ایک وکیل علی بن جعفر تھے، جو بغداد کے ایک دیہات ہمینیا کے رہنے والے تھے۔ ان کے بارے میں متوکل کو رپورٹیں دی گئیں جن کی بنا پر انہیں گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ وہ طویل قید کاٹنے کے بعد امام علی نقی علیہ السلام کے حکم پر مکہ چلے گئے اور آخر عمر تک وہیں مقیم رہے۔(۲)

امام علی نقی علیہ السلام نے غالیوں کے ایک سرغنہ فارس بن حاتم قزوینی کے مقابلے پر علی بن جعفر کی تائید کی غرض سے اپنے بعض اصحاب کے جواب میں خطوط تحریر کیے۔ یہ خطوط سن ۲۴۰ ہجری میں لکھے گئے ہیں۔(۳)

حسن بن عبدربہ یا (بعض دوسروں کی روایت کے مطابق) اُن کا بیٹا علی (۴) امام علی نقی علیہ السلام کے وکیلوں میں شامل تھا، ان کے بعد ابو علی بن راشد امامؑ کی جانب سے ان کے جانشین کے طور پر معین ہوئے۔ امامؑ نے سن ۲۳۲ ہجری میں علی بن بلال کے نام خط میں تحریر کیا:

"ثُمَّ اِنّی اَقَمْتُ اَباعلیٍّ مَقامَ الْحُسَیْنِ بْنِ عَبْدِ رَبِّہٖ وَائْتَمَنْتُہُ علی ذٰلِکَ بِالْمَعْرِفَۃِ بِماعِنْدَہُ الَّذی لا یَتَقَدَّمُہُ اَحَدٌ وَ قَدْ اَعْلَمُ اَنَّکَ شَیْخُ ناحیَتِکَ فَاَحْبَبْتُ اِفْرادَکَ

۱۔ تاریخ سیاسی غیبت امام دوازدہم۔ ص ۱۳۷

۲۔ رجال کشی۔ ص ۶۰۷۔ ۶۰۸، تنقیح المقال۔ ج ۲۔ ص ۲۷۱، از کشی اثبات الوصیہ۔ ص ۲۳۲

۳۔ رجال کشی ص ۵۲۵۔ ۵۲۷

۴۔ مامقانی نے اس بارے میں تفصیل سے گفتگو کی ہے اور حسین بن عبدربہ کا امام علی نقی کے وکیل کی حیثیت سے تعارف کرانے کے بعد کہتے ہیں: بعید نہیں ہے کہ خود علی اور ان کے والد دونوں ہی مختلف زمانوں میں امامؑ کے وکیل رہے ہوں۔ دیکھئے: تنقیح المقال۔ ج ۱۔ ص ۳۳۱۔ ۳۳۲

وَاِکْرامَکَ بِالْکِتابِ ذٰلِکَ فَعَلَیْکَ بِالطَّاعَةِ لَهُ وَالتَّسْلِیمِ اِلَیْهِ جَمیعَ الْحَقِّ قِبَلَکَ وَاَنْ تَحُضَّ مَوالِیَّ عَلیٰ ذٰلِکَ و تُعَرِّفَهُمْ مِنْ ذٰلِکَ ما یَصیرُ سَبَباً اِلیٰ عَوْنِهِ وَکِفایَتِهِ فَذٰلِکَ تَوْفیرٌ عَلَیْنا وَمَحْبوبٌ لَدَیْناوَلَکَ بِهِ جَزاءٌ مِنَ اللّٰهِ وَاَجْرٌ فَاِنَّ اللّٰهَ یُعْطی مَنْ یَشاءُ اَفْضَلَ الاعْطاءِ وَالْجَزاءِ بِرَحْمَتِهِ وَاَنْتَ فی وَدیعَةِ اللّٰهِ وَکَتَبْتُ بِخَطّی وَاَحْمَدُ اللّٰهَ کَثیراً."(۱)

"میں نے ابوعلی کو حسین بن عبدربہ کی جگہ منتخب کیا ہے اور انہیں اس مقام پر اپنا امین قرار دیا ہے۔ کیونکہ میں اُن کی دیانت وامانت سے (جس میں کوئی اُن پر سبقت نہیں لے سکا) واقف تھا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ اپنے علاقے کے بزرگ ہو اس لیے میں نے چاہا کہ آپ کے احترام میں اس بارے میں آپ کو ایک علیحدہ خط لکھوں۔ پس اب آپ ابوعلی کی اطاعت کیجیے اور جو (مالی) حقوق آپ کے پاس موجود ہیں وہ ان کے سپرد کر دیں اور ہمارے دوستوں کو اُن کی اطاعت کرنے کی ترغیب دیں اور انہیں اس بارے میں اس طرح مطلع کریں جس سے ہمارے شیعوں میں اُن کی مدد کا جذبہ پیدا ہو اور یہ اُن کے کاموں کی صحیح طور پر انجام دہی کا سبب بن سکے۔ اُن کے احترام میں آپ کا یہ اقدام ہماری نظر میں پسندیدہ ہوگا اور اس کام پر خدا آپ کو اجر عطا فرمائے گا۔ خدا جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت سے عظیم ترین اجر عطا کرتا ہے۔ میں آپ کو خدا کے حوالے کرتا ہوں۔ اس خط کو میں نے اپنی تحریر میں لکھا ہے اور میں کثرت سے خدا کی حمد کرتا ہوں۔"

اس خط کے مضمون میں غور کرنے سے ایک وکیل کی ذمے داریاں اس کے اختیارات کا دائرہ اور ایک بڑے خطے میں کام کرنے والے جزوی وکیلوں کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ انہی ابوعلی بن راشد کے بارے میں امام علی نقی علیہ السلام کا ایک اور مکتوب بھی موجود ہے جس میں ابن راشد کے مقام کی وضاحت کرتے ہوئے ان کی اطاعت کو امامؑ اور خدا کی اطاعت قرار دیا گیا ہے۔ اس خط میں امامؑ نے درج ذیل عبارت تحریر فرمائی ہے:

"فَقَدْاَوْجَبْتُ فی طاعَتِهِ طاعَتی وَالْخُروجُ اِلیٰ عِصْیانِهِ الْخُروجُ اِلیٰ عِصْیانی فَالْزَموا الطَّریقَ یَاْجُرْکُمُ اللّٰهُ وَ یَزیدُکُمْ مِنْ فَضْلِهِ."(۲)

۱۔ رجال کشی۔ ص ۵۱۳' بحارالانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۲۲۲

۲۔ رجال کشی۔ ص ۵۱۴' بحارالانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۲۲۰

''میں نے ان کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا ہے'ان کے حکم سے سرتابی میرے حکم سے سرتابی ہے۔

پس اسی راستے پر قائم رہو'خدا تمہیں اجر عطا کرے اور تم پر اپنے فضل میں اضافہ فرمائے۔''

اسی طرح ایک اور خط میں'ایوب بن روح کو خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ابو علی کے ساتھ ٹکراؤ سے پرہیز کرو۔ تم اور ابو علی اپنے اپنے مخصوص علاقوں میں وہ کام انجام دو جو تمہارے ذمے لگائے گئے ہیں۔''

امامؑ نے بالکل ایسا ہی ایک خط'ابو علی کو بھی تحریر فرمایا'جس میں ایوب بن روح کے بارے میں تاکید کی اور ان دونوں سے کہا کہ وہ اپنے اپنے علاقے میں شیعوں کے مالی امور کو انجام دیں اور دوسرے کے علاقے سے کوئی چیز نہ لیں۔(۱)

ایک روایت سے'جسے کشی نے اسماعیل بن اسحاق نیشاپوری کے بارے میں درج کیا ہے'یہ معلوم ہوتا ہے کہ: احتمال یہ ہے کہ احمد بن اسحاق رازی بھی امامؑ کے وکلا میں سے ایک تھے۔(۲)

امام علی نقیؑ کے مکتب میں قرآن کو بنیاد قرار دینا

وہ انحرافات جو شیعہ غالیوں نے پیدا کیے'اور جن کی وجہ سے دوسرے فرقوں کی جانب سے شیعوں پر اعتراض کیے گئے'اُن میں سے ایک تحریفِ قرآن کا مسئلہ بھی ہے۔ یہ وہ مشکل ہے جس میں اہلِ سنت بھی گرفتار ہیں'جس کی وجہ یہ ہے کہ خود ان کی کتابوں میں بھی تحریفِ قرآن پر مبنی جھوٹی روایات موجود ہیں۔ حالانکہ اکثر مسلمانوں نے'جن میں اہلِ سنت اور شیعہ امامی (چند غالیوں کے سوا) دونوں ہی شامل ہیں'اس غلط عقیدے کی شدت کے ساتھ مخالفت کی ہے۔ اس کے باوجود' ابن شاذان کی ''ایضاح'' اور خیاط معتزلی کی ''انتصار'' سے معلوم ہوتا ہے'تیسری صدی ہجری میں شیعوں پر تحریفِ قرآن کا عقیدہ رکھنے کا الزام زبان زدِ عام تھا۔

اس الزام کے مقابل صورت یہ ہے کہ شیعہ ائمہؑ نے ہمیشہ قرآن کو بنیاد قرار دیا ہے اور اس کے برخلاف ہونے والی ہر روایت کو باطل شمار کیا ہے۔ ہم نے امام جعفر صادق علیہ السلام کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے اس مسئلے کا ذکر کیا ہے۔

امام علی نقی علیہ السلام نے ایک مفصل رسالے میں' جسے آپ سے ابن شعبہ حرانی نے نقل کیا ہے'شدت کے ساتھ قرآن کے بنیاد ہونے پر تاکید کی ہے اور اسے روایات کی پرکھ اور صحیح اور غلط حدیث کی پہچان کے لیے صحیح ترین کسوٹی قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں باضابطہ طور پر قرآن کے ایسا واحد متن (text) ہونے کا اعلان کیا ہے جسے تمام اسلامی فرقے بطور

۱۔ رجال کشی۔ ص ۵۱۴

۲۔ مسند الامام الہادیؑ۔ ص ۳۲۰

سند پیش کرتے ہیں۔

امام علی نقی علیہ السلام پہلے مرحلے میں روایات کی دو قسمیں کرتے ہیں: پہلی قسم اُن روایات پر مشتمل ہے' جو برحق ہیں اور جنھیں عمل کی بنیاد قرار دینا چاہیے اور دوسری قسم میں وہ روایات ہیں' جو باطل ہیں اور جن پر عمل سے اجتناب کرنا چاہیے۔ پھر امام نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ پوری امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ: "قرآن حق ہے اور کسی فرقے کو اس پر شک نہیں ہے۔" اس کے بعد فرماتے ہیں:

"اگر قرآن کسی روایت کی صحت کو تسلیم کرے' لیکن امت کا کوئی گروہ اسے قبول نہ کرے' تو اس روایت کی صحت کا اعتراف کرنا چاہیے' کیونکہ سب لوگ قرآن کی حقانیت کے اصول پر متفق ہیں۔" پھر آپ نمونے کے طور پر حدیثِ ثقلین کا ذکر کرتے ہیں اور اس موقع پر آیۂ ولایت کو اس کی اس شانِ نزول کی بنیاد پر سامنے رکھتے ہیں جو اہلِ سنت کی روایات میں بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد آپ حدیث: "لا جبرَ ولا تفویضَ بل امرٌ بین الامرین." کی وضاحت کرتے ہوئے دوبارہ قرآن کی طرف آتے ہیں اور متعدد آیات پیش کر کے اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ یہ آیات اس حدیث کی صحت کی تائید کرتی ہیں۔"

امامؑ اپنے استدلال کے دوران' قرآن کی دسیوں آیات پیش کرتے ہیں' جو ایک اعتبار سے جبر کی جانب اور دوسرے اعتبار سے تفویض کی جانب اشارہ کرتی ہیں' اور آخر میں اس بارے میں بطور گواہ حضرت علی علیہ السلام کے محکم اور متین کلمات سے استفادہ کرتے ہیں۔(۱)

ایک اور نشست کے دوران' آپ نے ایک اختلافی مسئلے میں' قرآن سے استناد کر کے' تمام حاضرین کو اپنی رائے قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔(۲) ایک اور روایت میں' جسے عیاشی نے نقل کیا ہے' آیا ہے: **کان ابو جعفر و ابو عبداللّٰہ لایصدّق علینا الابما یوافق کتاب اللّٰہ و سنّة نبیہ.** (ابو جعفر اور ابو عبداللہ ہماری کسی چیز کی تصدیق نہیں فرماتے تھے' سوائے اس چیز کے جو کتابِ خدا اور سنتِ نبویؐ کے موافق ہوتی)۔(۳)

امام علی نقی اور علمِ کلام

شیعہ گروہوں کے درمیان پائے جانے والے اختلافِ رائے سے' ائمہؑ کے لیے ان کی ہدایت کا کام دشوار ہو جاتا

۱۔ تحف العقول۔ ص ۳۳۸۔ ۳۵۶' الاحتجاج۔ ج ۲۔ ص ۲۵۱' بحار الانوار۔ ج ۲۔ ص ۲۲۵

۲۔ مناقب ابن شہر آشوب۔ ج ۲۔ ص ۴۴۳' مسند الامام الہادیؑ۔ ص ۲۸۔ ۲۹

۳۔ تفسیر العیاشی۔ ج ۱۔ ص ۹' بحار الانوار۔ ج ۲۔ ص ۲۴۴

تھا۔ شیعوں کا مختلف شہروں میں بکھرے ہوئے ہونا اور بسا اوقات دوسروں کے بعض افکار سے ان کا متاثر ہو جانا بھی مشکل میں اضافہ کر دیتا تھا۔ اس کشاکش کے عالم میں غیر شیعہ اور شیعہ مخالف متعصب گروہوں کے لوگ بھی اس اختلاف میں مزید شدت پیدا کرتے اور اسے انتہائی گہرا ظاہر کرتے تھے۔ کشی سے ایک روایت موجود ہے' جو واضح طور پر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ایک فرقے سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب نے اپنی طرف سے زراریہ' عماریہ اور یعفوریہ کے ناموں سے مختلف مذاہب بنائے اور ان میں سے ہر مذہب کو امام جعفر صادق علیہ السلام کے بزرگ اصحاب زرارہ' عمار ساباطی اور ابن ابی یعفور سے منسوب کر دیا۔(۱)

بسا اوقات ائمہ علیہم السلام کو ایسے سوالات کا سامنا کرنا پڑتا تھا جن میں سے بعض کی بنیاد علمائے شیعہ کے درمیان یہی داخلی اختلافات ہوا کرتے تھے۔ یہ اختلاف کبھی تو سطحی ہوتا تھا اور بعض اوقات بہت گہرا ہو جاتا تھا' اور ائمہؑ اس میں مداخلت کیا کرتے تھے۔ ان کلامی مسائل میں سے ایک مسئلہ تشبیہ و تنزیہ کا بھی تھا۔ ائمہؑ ابتدا ہی سے تنزیہ کے نظریے کی حقانیت پر زور دیا کرتے تھے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے خطبے' جو آپ کے بعد ہمیشہ ائمہؑ بلکہ ان کے شیعوں کی دسترس میں بھی رہے' اس مدعا پر بہترین دلیل ہیں۔ تمام ائمہؑ سے نقل ہونے والی روایات' جنہیں شیخ صدوق نے محنت شاقہ کے ذریعے کتاب ''التوحید'' میں جمع کیا ہے' اسی بات کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اس کے باوجود شیعوں پر تشبیہ کا عقیدہ رکھنے کی تہمت وہ تہمت ہے جو عام طور پر مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والی شخصیات کی جانب سے شیعوں پر لگائی جاتی رہی۔ البتہ جو لوگ کسی حد تک منصف مزاج تھے' انہوں نے شیعوں کے صرف بعض فرقوں پر یہ الزام عائد کیا ہے۔

اس کے مقابلے میں ائمہ ہدیٰ علیہم السلام' تشیع کے دامن سے اس الزام کو صاف کرنے کے لیے بھرپور کوششیں بروئے کار لائے۔ اسی طرح بعد میں اس بارے میں شیعہ علما نے بھی اپنے ائمہؑ کی ان کوششوں کو آگے بڑھایا۔ ان میں سے ایک شیخ صدوق ہیں' جنہوں نے اپنی کتاب ''التوحید'' کے مقدمے میں اس کی تالیف کا محرک ''شیعوں سے تشبیہ کے شبہ کو دور کرنا'' بیان کیا ہے۔(۲)

اس حوالے سے ایک نمایاں نکتہ ایک اہم مثال کے طور پر ہشام بن حکم اور ہشام بن سالم سے منسوب اقوال ہیں۔ اگرچہ یہ دونوں افراد باہم اختلاف رائے رکھتے تھے' حتیٰ ہشام بن حکم نے' ہشام بن سالم کی رد میں ایک رسالہ بھی تحریر کیا تھا' لیکن یاد رہے کہ ان کی جانب سے محض جسم کے لفظ کا بے وجہ استعمال اور اس کا خدا پر اطلاق کرنا' شیعوں پر تشبیہ اور تجسیم

۱۔ رجال کشی۔ ص ۲۶۵' قاموس الرجال۔ ج ۹۔ ص ۳۲۲

۲۔ التوحید۔ ص ۱۷

کی تہمت کی بنیاد بنا تھا' یہاں تک کہ ہشام بن حکم کا تعارف تشبیہ پر عقیدہ رکھنے والے ایک رافضی کے طور پر کرایا گیا ہے۔(۱)

ہشام بن حکم تجسیم کا عقیدہ رکھتے تھے یا نہیں؟ اس بارے میں بعض محققین کے درمیان اختلاف رائے سامنے آیا ہے۔ بعض عرب محققین نیز شیعہ علمانے بخوبی وضاحت کی ہے کہ خدا کے بارے میں جسم کا لفظ استعمال کر کے ہشام تشبیہ کا نظریہ بیان کرنا نہیں چاہتے تھے' بلکہ وہ "جسم" کو "شے" کے ہم معنی اور اصطلاحاً مترادف سمجھتے ہیں اور اس سے "موجود" مراد لیتے ہیں۔(۲)

ان حالات میں ائمہ طاہرینؑ نے جو اس بات کو سمجھتے تھے کہ مخالفین ہشام کی اس رائے سے سوءِ استفادہ کر رہے ہیں' ہشام کی جانب سے ظاہر کی جانے والی اس رائے کی مخالفت کی۔ البتہ اس بات کو ہشام کی جانب سے ایک بدسلیقگی ضرور قرار دیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ شیعہ ائمہ نے مناسب مواقع پر ہشام کو تجسیم اور تشبیہ کے اعتقاد سے بری الذمہ بھی قرار دیا ہے۔

مذکورہ بالا گفتگو' امام علی نقی علیہ السلام کی اس روایت کی وضاحت کے لیے تمہید تھی' جو ہشام بن حکم کے عقیدے کی تکذیب میں آپ سے نقل کی گئی ہے۔ صقر بن ابی دلف کہتا ہے:

"سَألْتُ اَبَاالْحَسَنِ عَلِيَّ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيِّ بْنِ مُوسَىٰ الرِّضا(علیه السلام) عَنِ التَّوحِيدِ وَقُلْتُ لَهُ: اِنّى اَقُولُ بِقَوْلِ هِشامِ بْنِ الْحَكَمِ. فَغَضِبَ (عَلَيْهِ السَّلامُ) ثُمَّ قالَ: مالَكُمْ وَلِقَوْلِ هِشامٍ اِنَّهُ لَيْسَ مِنّا مَنْ زَعَمَ اَنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ جِسْمٌ وَنَحْنُ مِنْهُ بُرَاءُ فِي الدُّنْيا وَالآخِرَةِ يَابْنَ اَبِى دُلَفٍ اِنَّ الْجِسْمَ مُحْدَثٌ وَاللهُ مُحْدِثُهُ وَمُجَسِّمُهُ." (۳)

"میں نے امامؑ سے توحید کے بارے میں سوال کیا اور عرض کیا کہ میں ہشام بن حکم کے عقیدے پر ہوں۔ امامؑ غیظ میں آگئے اور فرمایا: تمہیں ہشام کے قول سے کیا مطلب؟ وہ لوگ ہم میں سے نہیں ہیں جو یہ گمان کرتے ہیں کہ خدائے عزوجل جسم ہے۔ ہم دنیا اور آخرت میں ان سے بیزار ہیں۔ اے ابن ابی دلف! جسم خود مخلوق ہے' اسے خدا نے خلق کیا ہے اور اسی نے اسے جسمیت عطا کی ہے۔"

ایک اور روایت میں آیا ہے:

"عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْفَرَجِ الرُّخَجِيِّ قالَ: كَتَبْتُ اِلىٰ اَبِى الْحَسَنِ عَلَيْهِ السَّلامُ اَسْألُهُ عَمّا

۱۔ الانتصار۔ ص ۶۱

۲۔ دیکھئے: "مقولة جسم لا کالاجسام بین هشام بن حکم و مواقف سائر اهل کلام." مجلّہ "تراثنا" شمارہ ۱۹۔ ص ۱۰۷۔۱۰۸

۳۔ التوحید۔ ص ۱۰۴

قَالَ هِشَامُ بْنُ الْحَكَمِ فِي الْجِسْمِ وَ هِشَامُ بْنُ سَالِمٍ فِي الصُّورَةِ فَكَتَبَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: دَعْ عَنْكَ حَيْرَةَ الْحَيْرَانِ وَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ لَيْسَ الْقَوْلُ مَا قَالَ الْهِشَامَانِ." (۱)

"میں نے امام علی نقی (علیہ السلام) کو خط لکھا' اور آپ سے جسم کے بارے میں ہشام بن حکم اور صورت کے بارے میں ہشام بن سالم کے اقوال کے بارے میں دریافت کیا۔ آپ نے جواب میں تحریر فرمایا: پریشان خیال لوگوں کی پریشان خیالی سے دور رہو اور شیطان سے خدا کی پناہ طلب کرو۔ جو کچھ ان دونوں نے کہا ہے' وہ ہمارا کہا ہوا نہیں ہے۔"

امام جعفر صادق اور امام موسیٰ کاظم علیہما السلام نے بھی ہشام سے منسوب اس رائے پر شدید مخالفت کا اظہار کیا ہے۔ (۲)

ہشام بن حکم اور ہشام بن سالم کی باتیں شیعوں کے درمیان اختلافات پیدا ہونے کا موجب بنیں' اور ائمہؑ کو بار بار اس قسم کے سوالات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس طرح کے سوالات کرنے والوں میں سے ایک ابراہیم بن محمد ہمدانی ہیں' جنہوں نے اس بارے میں امام علی نقی علیہ السلام کو یہ خط تحریر کیا:

"اس خطے میں آپ کے محبین' توحید کے بارے میں اختلافات کا شکار ہو گئے ہیں۔ ان میں سے بعض تجسیم کی طرف مائل ہیں اور بعض تشبیہ کی جانب رجحان رکھتے ہیں۔ امامؑ نے جواب میں تحریر فرمایا:

"سُبْحَانَ مَنْ لَا يُحَدُّ وَلَا يُوصَفُ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ." (۳)

"پاک ہے وہ خدا جس کی نہ کوئی حد ہے اور نہ اس کی توصیف کی جا سکتی ہے۔ وہ بے مثل اور سننے اور دیکھنے والا ہے۔"

اسی قسم کا سوال محمد بن علی کاشانی (۴) اور دوسرے افراد سے بھی نقل کیا گیا ہے' جو اس حوالے سے شیعوں کے درمیان پھوٹ پڑنے والے اختلاف کی واضح علامت ہے۔

قیامت کے دن بھی رویتِ خدا کے ناممکن ہونے کی تائید میں (جیسا کہ مشبہ اور اہلِ حدیث اس کے امکان کے قائل ہیں) امام علی نقی علیہ السلام سے ایک روایت نقل کی گئی ہے' جس میں رویت کے ناممکن ہونے پر استدلال کیا گیا

۱۔ التوحید۔ ص ۹۷

۲۔ دیکھئے: التوحید۔ ص ۹۷۔ ۱۰۵

۳۔ التوحید۔ ص ۱۰۱' کافی۔ ج ۱۔ ص ۱۰۲

۴۔ التوحید۔ ص ۱۰۱' کافی۔ ج ۱۔ ص ۱۰۲

ہے(۱) ایک دوسری حدیث میں امامؑ کی جانب سے آسمانِ دنیا پر خدا کے نازل ہونے کا شدت کے ساتھ انکار کیا گیا ہے۔(۲)

اس بارے میں امام علی نقی علیہ السلام سے اکیس سے زیادہ روایات نقل کی گئی ہیں' جن میں سے بعض انتہائی مفصل ہیں' اور یہ سب کی سب روایات اس بات کی ترجمانی کرتی ہیں کہ امام تنزیہ کے قائل تھے۔(۳)

جبر و اختیار کے بارے میں شیعہ ائمہؑ کے عقیدے کے متعلق بھی امام علی نقی علیہ السلام کا ایک مفصل رسالہ موجود ہے۔اس رسالے میں آیات قرآنی کی بنیاد پر (امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایات کی گئی) حدیث: لاجبر ولا تفویض' بل امر بین الأمرین." کی تشریح اور تحلیل کی کوشش کی گئی ہے' اور جبر و تفویض کے مسئلے میں شیعہ عقائد کی بنیاد بیان کی گئی ہے۔(۴)

امامؑ نے اس رسالے کے ایک حصے میں' اس مسئلے کے بارے میں یوں فرمایا ہے:

"لٰكِنْ نَقُولُ: إِنَّ اللّٰهَ جَلَّ وعَزَّ خَلَقَ الْخَلْقَ بِقُدْرَتِهِ وَمَلَّكَهُمْ اسْتِطاعَةَ تَعَبُّدِهِمْ بِها' فَأَمَرَهُمْ وَنَهاهُمْ بِما أرادَ فَقَبِلَ مِنْهُمْ اتِّباعَ أمْرِهِ وَرَضِيَ بِذٰلِكَ لَهُمْ' وَنَهاهُمْ عَنْ مَعْصِيَتِهِ وَذَمَّ مَنْ عَصاهُ وعاقَبَهُ عَلَيْها وَلِلّٰهِ الْخيرَةُ فِي الأمْرِ وَ النَّهْيِ يَخْتارُ ما يُرِيدُ وَ يَأْمُرُ بِهِ وَ يَنْهىٰ عَمّا يُكْرِهُ وَيُعاقِبُ عَلَيْهِ بِالاِسْتِطاعَةِ الَّتِي مَلَّكَها عِبادَهُ لاِتِّباعِ أمْرِهِ وَ اجْتِنابِ مَعاصِيهِ لأنَّهُ ظاهِرُ الْعَدْلِ وَالنَّصفَةِ وَالْحِكْمَةِ الْبالِغَةِ."(۵)

"ہم کہتے ہیں: خدائے عز و جل نے اپنی مخلوقات کو لامحدود طاقت سے خلق کیا ہے اور انہیں عبادت و بندگی کی قوت دی ہے۔پھر انہیں' جس چیز کا چاہا حکم دیا اور جس چیز سے چاہا منع کیا ہے' اور ان سے اپنے اوامر کی پیروی کو قبول کیا ہے اور اسی بات پر ان سے راضی ہوتا ہے۔اور انہیں اپنی نافرمانی سے روکا ہے اور اسی بنا پر نافرمانوں سے بازپرس کرتا ہے۔امر و نہی میں اختیار و انتخاب کا حق خدا کے ہاتھ میں ہے۔اس نے جس چیز کو چاہا ہے' امر کیا ہے اور جس چیز کو ناپسند کیا ہے' اس سے نہی کی ہے اور اسی کی بنیاد پر مواخذہ کرے

۱۔کافی۔ج۱۔ص۹۷'التوحید۔ص۱۰۹

۲۔کافی۔ج۱۔ص۱۲۶

۳۔مسند الامام الہادیؑ۔ص۸۴۔۹۴

۴۔تحف العقول۔ص۳۳۸۔۳۵۶' مسند الامام الہادیؑ۔ص۱۹۸۔۲۱۳

۵۔مسند الامام الہادیؑ۔ص۲۰۵

گا۔ کیونکہ اس نے اپنے بندوں کو اپنے احکام کی پیروی کرنے اور گناہوں سے باز رہنے کی طاقت عطا کی ہے لہٰذا اس کا عدل و انصاف اور اس کی حکمت بالغہ واضح اور نا قابلِ انکار ہے۔"

اس کے بعد ان شبہات کا جواب دیا گیا ہے جن میں بعض آیات کے ظواہر سے استناد کرتے ہوئے جبر کے اثبات پر استدلال کیا گیا ہے۔

امام علی نقی علیہ السلام سے احتجاجات (استدلالات) کے سلسلے میں نقل ہونے والی روایات میں بڑی تعداد جبر و تفویض کے مسئلے سے متعلق ہیں۔(۱)

امام علی نقی اور دعا و زیارت کی ثقافت

یہ حقیقت بھی مدِ نظر رہنی چاہیے کہ شیعہ مکتب فکر دعاؤں اور زیارات کے اعتبار سے انتہائی ثروتمند ہے' کسی اور اسلامی فرقے کے پاس اس قدر دعائیں اور زیارتیں نہیں ہیں۔ یہ تشیع کی روحانیت اور شیعی عرفان کا مظہر ہے' جو شیعہ معاشرے میں دینی خلوص اور تزکیۂ نفس کی تقویت کا باعث ہے۔

ائمہؑ کے درمیان دعاؤں کو اعلیٰ مقام حاصل تھا اور ان میں سے بعض اماموں سے بہت سی دعائیں نقل ہوئی ہیں۔(۲) اس سے پہلے ہم نے امام زین العابدین علیہ السلام کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے دعا کا کردار بیان کیا ہے۔ امام علی نقی علیہ السلام نے بھی شیعوں کی تربیت اور انہیں شیعہ معارف سے آگاہ کرنے کے لیے دعا اور زیارت سے اہم کام لیا ہے۔ ان دعاؤں میں خدا سے راز و نیاز کے علاوہ' مختلف صورتوں سے' بعض سیاسی و سماجی مسائل کی جانب بھی اشارے موجود ہیں۔ ایسے اشارے جو شیعوں کی سیاسی زندگی میں انتہائی موثر تھے اور جو خاص مفاہیم کو منظم انداز میں شیعہ معاشرے تک پہنچاتے تھے۔

اب ہم ان دعاؤں کے ذریعے پیش کیے گئے مسائل میں سے چند نمونوں کی جانب اشارہ کریں گے:

۱۔ عوام اور اہلِ بیتؑ کے درمیان تعلق قائم کرنا

ان دعاؤں میں محمد و آلِ محمد علیہم السلام پر بار بار درود بھیجنے کے علاوہ (جو ائمہ اہلِ بیت کی تقریباً تمام ہی دعاؤں میں موجود ہے) امت اور آلِ محمدؐ کے درمیان مضبوط اور اٹوٹ بندھن پر خاص زور دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک دعا کا کچھ

۱۔ مسند الامام الہادیؑ۔ ص ۱۹۸۔ ۲۲۷

۲۔ شیعوں کے دعائیہ آثار کی ایک فہرست ہم نے کتاب نزھۃ الزاھد و نھزۃ العابد (ناشر نشر اہلِ قلم۔ تہران۔ ۱۳۷۶ھ ق) کے مقدمے میں پیش کی ہے۔

حصہ ملاحظہ فرمایئے:

"اَللّٰھُمَّ فَصَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَ آلِہٖ وَ لَا تَقْطَعْ بَیْنِیْ وَ بَیْنَھُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْآخِرَۃِ وَاجْعَلْ عَمَلِیْ بِھِمْ مُتَقَبَّلاً۔" (۱)

"بارالہا! محمد و آل محمد پر درود بھیج اور دنیا و آخرت میں میرے اور ان کے درمیان رابطے کو منقطع نہ فرما اور میرے اعمال کو ان کے وسیلے سے قبول فرما۔"

۲۔ اہلِ بیتؑ کے عظیم مقام اور ان کی قیادت پر تاکید

جو زیارتیں امام علی نقی علیہ السلام سے روایت کی گئی ہیں' اُن میں بارہا اس نکتے پر زور دیا گیا ہے اور اہلِ بیتِ رسولؐ کی ان الفاظ میں توصیف کی گئی ہے: "معدن الرّحمة' خُزّان العلم' قادة الأمم' ساسة العباد' أمناء الرحمٰن' ائمة الهدیٰ' وَرَثة الانبیاء' وحجج اللّٰه علی اهل الدنیا والآخرة والاولی." (رحمت کے سرچشمے' علم کے خزینہ دار' قوم کے رہنما' بندوں کے امور کی سیاست کرنے والے' خداوند رحمان کے امانتدار' ہدایت کے پیشوا' انبیا کے وارث' اہلِ دنیا کی موجودہ اور آئندہ زندگی کے لیے اللہ کی طرف سے حجت)۔(۲)

اسی طرح اسی زیارت میں ائمہ ہدیٰ کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

"اَشْھَدُ اَنَّکُمُ الْاَئِمَّۃُ الرَّاشِدُوْنَ' الْمَھْدِیُّوْنَ' الْمَعْصومون' الْمُکَرَّمون' الْمُقَرَّبون' الْمتقون' الصّادقون' المصطفَوْن' المطیعون لِلّٰه.."

"میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ ائمہ ہدایت یافتہ ہیں' معصوم ہیں' مکرم ہیں' مقرب ہیں' صاحبانِ تقویٰ ہیں' صادق ہیں' برگزیدہ ہیں' اللہ کے مطیع ہیں۔۔۔"

آگے چل کر یہ جملے ائمہ کی خصوصیات بیان کرنے کے علاوہ' شیعوں کو امام کی درست تعریف اور اُس میں مطلوب خصوصیات سے آگاہ کرتے ہیں۔

۳۔ مکتبِ اہلِ بیتؑ پر تاکید

ایک اور حصے میں یہ زیارات شیعوں کو اس بات کی تعلیم دیتی ہیں کہ وہ اپنے ائمہؑ کو عظیم منزلت پر فائز سمجھیں لہٰذا اُن کے بارے میں گواہی دیتے ہوئے وہ کہتا ہے:

۱۔ مصباح المتہجد۔ ص ۲۳۹' مسند الامام الہادیؑ۔ ص ۱۸۷

۲۔ من لا یحضرہ الفقیہ۔ ج ۲۔ ص ۶۰' عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۲۔ ص ۲۷۲' التہذیب۔ ج ۶۔ ص ۹۵' مسند الامام الہادیؑ۔ ص ۲۲۷

"وَجاهَدْتُمْ فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهادِهِ حَتّٰی اَعْلَنْتُمْ دَعْوَتَهُ وَبَیَّنْتُمْ فَرائِضَهُ وَاَقَمْتُمْ حُدودَهُ وَنَشَرْتُمْ شَرائِعَ اَحْکامِهِ وَ سَنَنْتُمْ سُنَّتَهُ... وَفَصْلُ الْخِطابِ عِنْدَکُمْ وَ آیاتُ اللّٰهِ لَدَیْکُمْ وَعَزائِمُهُ فیکُمْ وَنورُهُ وَبُرْهانُهُ عِنْدَکُمْ وَاَمْرُهُ اِلَیْکُمْ."

"(میں گواہی دیتا ہوں کہ) آپ نے اس طرح جہاد کیا' جیسا جہاد کرنے کا حق تھا' یہاں تک کہ دعوتِ خداوندی کو آشکارا کیا' احکامِ الٰہی کو واضح کیا' حدودِ الٰہی کا قیام عمل میں لائے' شریعتِ الٰہی کو نشر کیا اور الٰہی سنتوں کو استوار کیا۔۔۔ فصل الخطاب اور آیاتِ الٰہی آپ کے پاس ہیں' اس کے ستون آپ کے درمیان ہیں' جیسا کہ خدا کا نور اور برہان بھی آپ ہی کے پاس ہے اور امرِ الٰہی آپ کے سپرد کیا گیا ہے۔"

اس طرح امامؑ کے نقطۂ نظر سے سچے الٰہی علوم و معارف صرف کتبِ اہلِ بیتِ رسولؐ ہی سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ اس صورت میں صرف وہ لوگ حق پر ہیں' جو اس پاکیزہ خاندان کے کتب اور ان کی تعلیمات کی پیروی کریں' بصورتِ دیگر وہ دین سے نکل جانے والے اور راہِ حق سے دور جانے والے ہیں: فَالرّاغِبُ عَنْکُمْ مارِقٌ وَاللّازِمُ لَکُمْ لاحِقٌ. (۱)

۴۔ ظلم وستم کے خلاف جہاد

شیعوں کے درمیان انتہائی نمایاں مقبول ترین مفاہیم میں ظلم وستم کے خلاف جہاد بھی شامل ہے۔ یہ نکتہ امام علی نقی علیہ السلام سے نقل ہونے والی دعاؤں میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ "دعاء المظلوم علی الظالم" جیسی دعا' ایک ایسی مستقل دعا ہے' جس میں ظالموں اور جباروں کے خلاف خدا سے مدد مانگی گئی ہے۔ یہ درست ہے کہ اس دعا میں ظلم وستم کا خاتمہ کرنا خدا کے سپرد کیا گیا ہے' لیکن درحقیقت اس کا مقصد لوگوں کو معاشرے میں موجود ظلم وستم اور اس کی مختلف شکلوں سے آگاہ کرنا بھی ہوسکتا ہے' جو بذاتِ خود ظلم وستم کے خاتمے کے لیے ایک بنیادی قدم کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ دعا متوکل کی جانب سے امامؑ پر روا رکھے جانے والے ظلم اور آپ کی اہانت کے بعد آپ سے صادر ہوئی' جو واضح طور پر سیاسی پہلو کی حامل ہے۔ ذیل میں دعا کا متن محترم قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے:

"فَهااَنا ذا یا سَیِّدی مُسْتَضْعَفٌ فی یَدَیْهِ مُسْتَضامٌ تَحْتَ سُلْطانِهِ مُسْتَذَلٌّ بِعِنائِهِ مَغْلوبٌ مَبْغِیٌّ عَلَیَّ مَغْضوبٌ وَجِلٌ خائِفٌ مُرَوَّعٌ مَقْهورٌ... فَاَسْئَلُکَ یا ناصِرَ الْمَظْلومِ الْمَبْغِیِّ عَلَیْهِ اِجابَةَ دَعْوَتی' فَصَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَ آلِ مُحَمَّدٍ وَ خُذْهُ مِنْ مَأْمَنِهِ اَخْذَ عَزیزٍ مُقْتَدِرٍ

۱۔ مسند الامام الہادیؑ۔ ص ۲۴۹

وَافْجاهُ فی غَفْلَتِهِ مُفاجَئَةَ مَلیکٍ مُنْتَصِرٍ وَاسْلُبْهُ نِعْمَتَهُ وَ سُلْطانَهُ وَافْضُضْ عَنْهُ جُموعَهُ وَاَعْوانَهُ وَمَزِّقْ مُلْكَهُ كُلَّ مُمَزَّقٍ... وَاقْصِمْهُ یا قاصِمَ الْجَبابِرَةِ وَاَهْلِكْهُ یا مُهْلِكَ الْقُرُونِ وَ اَبِرْهُ یامُبیرَ الاُمَمِ الظّالِمَةِ وَاخْذُلْهُ یا خاذِلَ الْفِئاتِ الْباغِیَةِ..."(۱)

امام علی نقیؑ اور غالی شیعہ

شیعوں کی اندرونی مشکلات ان مشکلات سے کم نہ تھیں جو باہر سے دشمنوں کے ذریعے ان پر پڑتی تھیں۔ بالخصوص جبکہ ان اندرونی مشکلات کی وجہ سے براہِ راست بیرونی مشکلات میں اضافہ ہوتا تھا۔ اسی بنا پر شیعہ ائمہؑ ہر ممکن طریقے سے تشیع کے دامن کو غلو کی آلودگی سے پاک رکھنے، غالیوں کو اپنے آپ سے دور کرنے اور اس طرح اندرونی مشکلات کے حل کے لیے کوئی راستہ نکالنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ لیکن غالی، اپنے مفادات کے حصول یا کج فکری کی بنا پر، اپنے آپ کو شیعہ ائمہؑ سے منسوب کرتے تھے، اور ائمہؑ کی جانب سے ان کی جو مخالفت کی جاتی تھی اسے ایک قسم کا تقیہ قرار دیتے تھے، یہاں تک کہ دور دراز علاقوں میں رہنے والے بعض شیعہ، جنہیں شیعیت کا علمی، فقہی اور فکری ماحول میسر نہ تھا، وہ ان غالیوں کے فریب میں آجاتے اور عقیدتی اعتبار سے انحراف کا شکار ہوجاتے تھے۔ یہ فکر دوسرے فرقوں کے نزدیک شیعوں کو بدنام کرنے میں انتہائی موثر ثابت ہوتی تھی۔

امام علی نقی علیہ السلام نے بھی سابقہ ائمہؑ کی کوششوں کو آگے بڑھاتے ہوئے غالیوں کا مقابلہ کیا، کیونکہ آپ کے اصحاب میں بھی غالی افراد موجود تھے۔ احمد بن محمد بن عیسیٰ، جو ایک معتدل شیعہ عالم اور ائمۂ طاہرین علیہم السلام سے شدید محبت کرنے والے فرد تھے، اور دین میں ہر قسم کے غلو کے سخت خلاف تھے، نقل کرتے ہیں کہ ایک خط میں امام علی نقی علیہ السلام سے پوچھا گیا: آپ کی اور آپ کے اجداد کی طرف ایسی احادیث منسوب کی جاتی ہیں جنہیں سن کر دل بیزار ہوتے ہیں، اور کیونکہ ان احادیث کو آپ کے آباؤ اجداد سے نقل کیا جاتا ہے اس لیے ہم انہیں مسترد کرنے کی جرأت بھی نہیں کرپاتے۔ آگے چل کر خط میں تحریر تھا: علی بن حسکہ اور قاسم یقطینی جو اپنے آپ کو آپ کے محبّ اور آپ سے منسوب قرار

۱۔ مسند الامام الہادیؑ۔ ص ۱۸۹۔۱۹۰ "اے میرے سید و سردار! میں تیرا کمزور بندہ اس (ظالم) کے ہاتھوں اسیر ہوں، اس کے ہاتھوں ذلیل ہورہا ہوں، یہ مجھے اپنی سرکشی کا نشانہ بنارہا ہے، مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش کررہا ہے اور اپنے قہر کا نشانہ بنارہا ہے۔ لہٰذا میں تجھ سے سوال کرتا ہوں، اے وہ جو مظلوم اور ستم دیدہ کی فریاد سنتا ہے! پس تو محمد و آلِ محمد پر درود بھیج اور تو اس (ظالم) کو اس طرح پکڑ جیسے ایک مضبوط اور مقتدر بادشاہ کی پکڑ ہوتی ہے۔ اور تو اسے غفلت کے عالم میں اس طرح اچانک اپنی گرفت میں لے لے جس طرح نصرت کرنے والا ایک بادشاہ گرفت کرتا ہے۔ تو اس سے اس کی آسائش اور سلطنت کو سلب کرلے۔ اس سے اس کے مددگاروں اور ناصروں کو دور کردے۔ اس کی مملکت کو پاش پاش کردے۔۔۔۔ اے جابروں کی کمر توڑنے والے اس کی کمر توڑ دے اور اسے ہلاک کردے اے جابروں کو ہلاک کرنے والے۔"

دیتے ہیں' نقل کرتے ہیں کہ آیتِ قرآن :اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ (۱) میں فحشاء اور منکر سے مراد ایسا شخص ہے جو اہلِ رکوع وسجدہ نہیں تھا۔ اسی طرح زکات سے مراد ایک خاص آدمی ہے' نہ کہ درہم ودینار کی ادائگی۔ یہ لوگ اسی طرح سے فرائض' سنن اور معصیتوں میں سے بعض کی تاویل کرتے ہیں۔ اگر آپ مصلحت سمجھتے ہوں' تو ہمارے لیے اس بات کی وضاحت فرما دیجیے اور اپنے ماننے والوں پر احسان کرتے ہوئے انہیں ان انحراف آمیز تاویلوں کی دلدل سے نجات دلایئے۔ آپ نے جواب میں تحریر فرمایا:

"لَیْسَ ھٰذا مِنْ دِیْنِنا. فَاعْتَزِلْهُ." (۲)

"اس قسم کی تاویلات ہمارے دین کا حصہ نہیں ہیں' ان سے پرہیز کرو۔"

اسی قسم کا خط ابراہیم بن شیبہ اور سہل بن زیاد سے بھی روایت کیا گیا ہے۔ اور ان میں سے ایک کے جواب میں امامؑ نے بہت تفصیل سے گفتگو فرمائی ہے' اور اس میں محمد بن حسکہ کو مسترد کرتے ہوئے اور خاندانِ رسالت کے ساتھ اس کی وابستگی اور ولایت کا انکار کرتے ہوئے' اس کی باتوں کو باطل قرار دیا ہے اور اپنے شیعوں کو اس سے بچنے کا حکم دیا ہے۔ یہاں تک کہ ان سے فرمایا ہے کہ ان دونوں میں سے جو کوئی بھی ان کے ہاتھ لگے' اسے فوراً قتل کردیں۔ (۳) ایک اور روایت میں محمد بن حسکہ اور قاسم یقطینی پر امامؑ نے لعنت اور نفرین بھی کی ہے۔ (۴)

علی بن حسکہ' قاسم شعرانی یقطینی کا استاد تھا' جو خود بھی غالیوں کا ایک سرغنہ اور ائمہ طاہرینؑ کا دھتکارا ہوا فرد تھا۔ (۵) حسن بن محمد بن بابای قمی اور محمد بن موسیٰ شریقی بھی علی بن حسکہ کے شاگردوں میں سے تھے۔

امام علی نقی علیہ السلام کی لعن ونفرین کا نشانہ بننے والوں میں محمد بن نصیر نمیری اور فارس بن حاتم قزوینی بھی تھے۔ امامؑ نے ایک خط میں بابای قمی سے اعلانِ بیزاری کرتے ہوئے لکھا: وہ (یعنی ابن بابا) یہ سمجھتا ہے کہ میں نے اسے نبی بنایا ہے' اور وہ میرا باب (دروازہ) ہے۔ اس کے بعد شیعوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں: اگر بس میں ہو' تو اسے قتل کردو۔ (۶)

محمد بن نصیر نمیری جو نبوت کا دعویدار تھا' وہ "نمیریہ" یا "نصیریہ" فرقے کا سربراہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ تناسخ اور امام علی

۱۔ سورۂ عنکبوت ۲۹۔ آیت ۴۵ (نماز ہر برائی اور بدکاری سے روکنے والی ہے)

۲۔ رجال کشی۔ ص ۵۱۷

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً۔ ص ۵۱۸۔ ۵۱۹

۵۔ ایضاً۔ ص ۵۱۸

۶۔ ایضاً۔ ص ۵۲۰۔ ۵۲۱

نقی علیہ السلام کی ربوبیت کا معتقد تھا (نعوذ باللہ)۔ علاوہ ازایں وہ محارم سے نکاح اور مرد کی مرد کے ساتھ شادی کو جائز سمجھتا تھا اور اس بات کا دعویٰ کرتا تھا کہ وہ امام علی نقی علیہ السلام کی جانب سے نبوت کے لیے مبعوث ہوا ہے۔ محمد بن موسیٰ بن حسن بن فرات بھی اس کی حمایت کیا کرتا تھا۔ محمد بن نصیر کے پیروکار' جو نصیریہ کہلاتے تھے' وہ غالیوں کا مشہور ترین فرقہ تھا' جو خود چند گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔(۱)

اس دور کے دوسرے غالی عباس بن صدقہ' ابو العباس طرفانی (طبرانی) اور ابو عبداللہ کندی معروف بہ شاہ رئیس تھے۔ یہ سب کے سب لوگ غالیوں کے بزرگوں میں سے تھے۔(۲)

امام علی نقی علیہ السلام نے حکم دیا کہ فارس بن حاتم کی تکذیب اور تذلیل کی جائے اور فارس بن حاتم اور علی بن جعفر کے درمیان جو اختلاف پیدا ہوا تھا' اس میں آپ نے علی بن جعفر کی حمایت کی اور ابن حاتم کی مخالفت۔ اسی طرح آپ نے ابن حاتم کے قتل کا حکم بھی صادر کیا' اور اس کے قاتل کے لیے اُخروی سعادت اور جنت کی ضمانت دی۔ آخر کار جنید نامی ایک شیعہ نے امامؑ سے بالمشافہ اجازت لے کر ابن حاتم کو قتل کر دیا۔ رجال کشی میں ابن حاتم کے بارے میں آنے والی متعدد روایات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اس کا وجود شیعیت کے لیے انتہائی خطرناک تھا۔ شیعہ بار بار اس کے بارے میں امام علی نقی علیہ السلام سے سوالات کرتے اور امامؑ اُن سب کے جواب میں اس سے بیزاری کا اظہار فرماتے تھے۔(۳)

سری بن سلامہ نے غالیوں اور ان کے پھیلائے ہوئے بگاڑ کے بارے میں ایک اور خط امام علی نقی علیہ السلام کی خدمت میں ارسال کیا' جس کے جواب میں امامؑ نے شیعوں کے لیے دعا فرمائی اور انہیں غالیوں کے مقابل ثابت قدمی اور استقامت کی دعوت دی۔(۴)

احمد بن محمد سیاری بھی ان غالیوں میں سے ایک ہے جو خود کو امام علی نقی علیہ السلام کے اصحاب میں بتاتے تھے۔(۵) زیادہ تر علمائے رجال نے اسے غالی اور فاسد المذہب قرار دیا ہے۔(۶) کتاب "القراءات" ان روایات کے بنیادی مصادر میں شمار ہوتی ہے جن سے بعض نادان افراد نے تحریف قرآن پر استدلال کیا ہے۔(۷) خصوصاً جبکہ خود امام علی نقی

۱۔ رجال کشی۔ ص ۵۲۱' فرق الشیعہ۔ ص ۹۳' المقالات والفرق۔ ص ۱۰۰۔۱۰۱ اور دیکھئے: ابن ابی الحدید۔ ج ۲۔ ص ۳۰۹' الغیبہ۔ ص ۲۵۹
۲۔ رجال کشی۔ ص ۵۲۲
۳۔ رجال کشی۔ ص ۵۲۲۔۵۲۸
۴۔ حیاۃ الامام الہادیؑ۔ ص ۳۳۶
۵۔ مسند الامام الہادیؑ۔ ص ۳۲۳
۶۔ رجال النجاشی۔ ص ۵۸' معجم رجال الحدیث۔ ج ۲۔ ص ۲۹۰
۷۔ اس بارے میں دیکھئے: راقم الحروف کی تالیف: اکذوبۃ تحریف القرآن بین الشیعہ و السنہ

نے قرآن کے تحریف سے محفوظ ہونے اور تمام اسلامی فرقوں کی نظر میں اس کے دست اندازی سے بچے رہنے پر زور دیا ہے:

"قَدِ اجْتَمَعَتِ الْاُمَّةُ قَاطِبَةً لَا اخْتِلَافَ بَیْنَهُمْ اَنَّ الْقُرْآنَ حَقٌّ لَا رَیْبَ فِیهِ عِنْدَ جَمِیعِ اَهْلِ الْفِرَقِ."(۱)

"یقیناً پوری کی پوری امت قرآن پر مجتمع ہے' ان کے درمیان قرآن کی حقانیت کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے' تمام فرقوں کے نزدیک اس کے بارے میں ذرہ برابر شک نہیں ہے۔"

حسین بن عبید بھی اپنے آپ کو امام علی نقی علیہ السلام کے اصحاب میں قرار دینے والے غالیوں میں سے ایک تھا۔ احمد بن محمد بن عیسیٰ قمی' جن کا شمار قم کے ان علما میں ہوتا تھا جو غلو کے مخالف تھے' انہوں نے اس شخص کو بعض دوسرے لوگوں کے ساتھ غلو کے الزام میں قم سے نکال دیا تھا۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بتایا کہ قمی حضرات خالص شیعہ نظریہ رکھتے تھے اور معمولی سا غلو بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ اسی لیے کبھی کبھی وہ ان افراد کو بھی شہر بدر کر دیا کرتے تھے جو غالیوں میں سے نہیں تھے اور کبھی مفوضہ میں شمار ہوتے تھے یا غالیوں کی طرف سے نقل کی جانے والی روایات کو بیان کرتے تھے۔

بہر صورت' ائمہ کی جانب سے غالیوں کی مسلسل تکذیب اور انہیں مسترد کیے جانے نے انہیں زوال سے دوچار کر دیا' اور اُن کا اہم ترین ہتھیار جو اُن کا اپنے آپ کو بے بنیاد طور پر ائمہؑ سے منسوب کرنا تھا' ان کے ہاتھ سے چھن گیا۔ اس کے باوجود غالیوں کے نظریات صدیوں تک باقی رہے' اور آج بھی دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں میں ایسے مذاہب پائے جاتے ہیں جو ان گمراہ فرقوں سے نسبت رکھتے ہیں۔ علاوہ ازایں' ان کا فکری اثر حدیث کی شیعہ کتابوں میں باقی رہا اور بعض اوقات کچھ لوگ ایسے مسائل کے لیے' جن کا حقیقی تشیع سے کوئی واسطہ نہیں ان (احادیث) کا سہارا لیتے ہیں۔

فتح بن یزید جرجانی' امام علی نقی علیہ السلام سے ایک تفصیلی روایت کے ذیل میں اعتراف کرتے ہیں کہ وہ پہلے یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ امامؑ کو کھانے پینے کی حاجت نہیں ہوتی' کیونکہ یہ مقامِ امامت سے سازگار نہیں ہے۔ امام علی نقی علیہ السلام نے اُن سے مخاطب ہو کر فرمایا: "اے فتح بن یزید! حتیٰ انبیا بھی' جو ہمارے لیے اسوہ ہیں' کھاتے پیتے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے اور ہر جسم ایسا ہی ہوتا ہے' سوائے خدا کے' جس نے جسم کو جسمیت بخشی ہے۔"(۲)

امام علی نقی اور قرآن کی مخلوقیت

تیسری صدی کے آغاز میں جن اہم ترین بحثوں نے دنیائے اہلِ سنت کو اپنے اندر مشغول رکھا' ان میں سے ایک

۱۔ تحف العقول۔ ص ۳۳۸

۲۔ کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۳۳۸' اور دیکھئے: تنقیح المقال۔ ج ۳۔ ص ۴

بحث قرآن کے حادث یا قدیم ہونے کے بارے میں تھی' جو خود اُن کے درمیان کئی فرقوں اور گروہوں کے وجود میں آنے کا سبب بنی۔ اس مسئلے کو سب سے پہلے چھیڑنے والا شخص احمد بن ابی داؤد تھا۔(۱) اس کے بعد مامون اور پھر معتصم نے اس بحث کو جاری رکھا اور بھرپور کوشش کی کہ علما اور محدثین قرآنِ کریم کا مخلوق ہونا قبول کریں۔ علما پر دباؤ کا یہ واقعہ تاریخ میں "محنۃ القرآن" کے نام سے مشہور ہوا۔ احمد بن حنبل جیسے لوگوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ وہ اہلِ حدیث کے قائد کے طور پر قرآنِ مجید کے قدیم ہونے کا عقیدہ رکھتے تھے' اور اس حوالے سے اُنہیں عباسی حکومت کی جانب سے سخت دباؤ اور اہانتوں کا سامنا کرنا پڑا' حتیٰ ان کے حکم پر انہوں نے کوڑوں کی سزا بھی برداشت کی۔

مامون اور معتصم کا دور گزرنے کے بعد' متوکل ابن حنبل کا طرفدار ہوگیا' اور اس مرتبہ قرآن کے قدیم ہونے کا اعتقاد دوسروں پر مسلط کیا جانے لگا۔ علاوہ ازایں' متوکل کی حکومت نے مذہبِ اہلِ حدیث کی ترویج اس تعریف کے مطابق شروع کردی جو ابن حنبل نے وضع کی تھی اور دوسرے مذاہب کو بدعت قرار دے کر ان کا انکار کیا۔ اسی زمانے میں اہلِ حدیث کو "سنی" کا عنوان دیا گیا اور دوسروں کو اہلِ "بدعت" کہا جانے لگا۔

دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے خلق یا قدیم ہونے کے مسئلے نے شیعوں کے درمیان کوئی ردِعمل پیدا نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس مسئلے پر بحث کرنا ہی غیر معقول اور بے معنی تھا۔

جہاں تک ہم جانتے ہیں' اہلِ بیتؑ کی روایات اور ائمہ طاہرینؑ کے اصحاب کے کلام میں اس حوالے سے کوئی بحث موجود نہیں' اور شیعوں نے اس بارے میں خاموشی اختیار کررکھی تھی۔ آج ہمارے یہاں امام علی نقی علیہ السلام کا ایک خط موجود ہے' جس میں آپ نے اپنے ایک شیعہ کو حکم دیا ہے کہ وہ اس بارے میں رائے کا اظہار نہ کرے اور قرآن کے حادث یا قدیم ہونے میں سے کسی نظریے کی حمایت نہ کرے۔ آپ نے اپنے خط میں یوں تحریر فرمایا ہے:

"بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم. عصمنا اللّٰہ و ایّاکَ مِنَ الفتنۃ' فإن یفعل فقد أعظم بھا نعمۃ وإن لا یفعل فھی الھلکۃ' نحن نری أنّ الجدال فی القرآن بدعۃ' اشترک فیھا السائل والمجیب' فیتعاطی السائل ما لیس لہ' و یتکلّف المجیب مالیس علیہ' ولیس الخالق إلاّ اللّٰہ عزّوجلّ' وماسواہ مخلوق' والقرآن کلام اللّٰہ' لاتجعل لہ اسماً من عندک فتکون من الظالمین' جعلنا اللّٰہ وایّاک من الذین یخشون ربّھم بالغَیْب وھم من السّاعۃ مُشفقون."(۲)

۱۔ الطبقات السنیۃ فی تراجم الحنفیۃ۔ ج۱۔ ص ۲۹۔ طبع ریاض ۱۹۸۳ء

۲۔ التوحید۔ ص ۲۲۴' امالی صدوق۔ ص ۳۲۸' بحار الانوار۔ ج ۹۲۔ ص ۱۱۸

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ خدا ہمیں اور تمہیں فتنے سے محفوظ رکھے! اگر تم اپنے آپ کو اس سے بچائے رہے' تو تم نے نعمت کی تعظیم کی ہے' بصورت دیگر ہلاک ہو جاؤ گے۔ ہماری رائے میں قرآن کے بارے میں بحث و جدال بدعت ہے' اور اس کے گناہ اور اس سے پیدا ہونے والے برے آثار کی ذمے داری میں (اس بابت) سوال کرنے والا اور جواب دینے والا دونوں ہی شریک ہیں۔ کیونکہ سوال کرنے والا بلا وجہ ایک ایسی چیز کے بارے میں سوال کرتا ہے جس کی اس سے باز پرس نہیں کی جائے گی اور وہ جواب دینے والے کو بغیر کسی وجہ کے ایک ایسی چیز کے بارے میں جواب دینے کی زحمت میں مبتلا کرتا ہے جس کا وہ ذمے دار نہیں ہے۔ خدا کے سوا کوئی خالق نہیں ہے' اور اس کے سوا سب اُس کی مخلوق ہیں۔ قرآن کلامِ الٰہی ہے' اپنی طرف سے اس کا کوئی نام نہ رکھو' کیونکہ اس صورت میں تمہارا شمار ظالموں میں ہوگا۔ خدا ہمیں اور تمہیں ان لوگوں میں شمار کرے جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور خدا اور روزِ قیامت سے ڈرتے ہیں۔''(۱)

یہ مؤقف اس بات کا سبب بنا کہ شیعہ اس لاحاصل بحث میں الجھنے سے بچے رہے۔

امام علی نقیؑ اور ایران میں ان کے شیعہ

پہلی صدی ہجری میں زیادہ تر شیعوں کا تعلق کوفہ سے تھا۔ یہ بات علمِ رجال کی شیعہ کتابوں کے مطالعے سے بخوبی معلوم ہو جاتی ہے' کیونکہ ان لوگوں کا لقب کوفی ہونا ہمارے دعوے کی بہترین دلیل ہے۔

امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام کے زمانے کے بعد سے ائمہؑ کے بعض اصحاب کے نام کے آخر میں ''قمی'' کا لقب نظر آتا ہے' یہ عرب نژاد اشعری تھے جو قم میں زندگی بسر کرتے تھے۔(۲)

امام علی نقی علیہ السلام کے زمانے میں قم' ایرانی شیعوں کا اہم ترین مرکز تھا' اور اس شہر کے شیعوں اور ائمہ طاہرینؑ کے درمیان مضبوط تعلقات قائم تھے۔ یہ نکتہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ جس طرح انحرافی اور غلو آمیز رجحانات کوفہ کے شیعوں میں پائے جاتے تھے' اسی طرح قم کے شیعوں پر اعتدال اور غلو مخالف رجحانات کی حکمرانی تھی۔ یہاں کے شیعوں نے اس بات پر کافی اصرار اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا۔ اس سے پہلے ہم غالیوں کے بارے میں امام علی نقی علیہ السلام کے

۱۔ متشابہ القرآن و مختلفہ۔ ج ۱۔ ص ۶۱۔ اور اسی صفحے پر امام زین العابدینؑ سے ایک حدیث نقل ہوئی ہے' جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ: ''قرآن نہ خالق ہے اور نہ مخلوق' بلکہ خداوند خالق کا کلام ہے۔''

۲۔ دیکھئے: تاریخ تشیع در ایران۔ ج ۱۔ زیر عنوان ''قم پایگاہ تشیع در ایران''

نام قمیوں کے خطوط کا ذکر کر چکے ہیں اور غالیوں اور ان راویوں کے لیے جو غالیوں سے روایت کرنے میں سخت گیری سے کام نہیں لیتے تھے ان کے سخت رویے کی جانب اشارہ کر چکے ہیں۔

قم کے ساتھ دو شہر "آبہ" یا "آوہ" اور کاشان بھی شیعہ تعلیمات کے زیر اثر تھے اور وہ لوگ قم کے شیعہ نظریات کی پیروی کرتے تھے۔ بعض روایات میں محمد بن علی کاشانی کا نام لیا گیا ہے جنہوں نے امام علی نقی علیہ السلام سے توحید کے باب میں سوال کیا تھا۔(۱)

اہل قم امام علی نقی علیہ السلام کے ساتھ مالی رابطہ بھی رکھتے تھے۔ اس حوالے سے محمد بن داؤد قمی اور محمد طلحی کے ناموں کا ذکر کیا گیا ہے جو قم اور اس کے نواحی علاقوں سے اموال اور یہاں کے حالات کی خبریں امامؑ کی خدمت میں پہنچایا کرتے تھے۔(۲) جیسا کہ امامؑ پر ایک الزام یہ بھی تھا کہ اہل قم کی طرف سے آپ کو اموال بھیجے جاتے ہیں۔(۳)

اسی طرح قم اور آوہ کے لوگ امام علی رضا علیہ السلام کی مرقد مطہر کی زیارت کے لیے مشہد بھی جایا کرتے تھے اور امام علی نقی علیہ السلام نے بھی ان کے اس عمل پر انہیں "مغفور لھم" کہا ہے۔(۴)

ایران کے دوسرے شہروں کے شیعہ بھی ائمہؑ کے ساتھ ایسے ہی روابط رکھتے تھے۔ حالانکہ ایران کے زیادہ تر شہروں میں امویوں اور عباسیوں کے ظالمانہ اور جابرانہ تسلط کی وجہ سے سنی رجحانات پائے جاتے تھے اور وہاں شیعہ اقلیت میں تھے۔

امام علی نقی علیہ السلام کے ایک اور صحابی صالح المعروف ابو مقاتل دیلمی تھے جنہوں نے امامت کے مسئلے پر ایک روائی اور کلامی کتاب تالیف کی ہے۔(۵) دیلم دوسری صدی ہجری کے اواخر ہی سے شیعوں کی ایک بڑی تعداد کا مسکن تھا۔ اس کے علاوہ دیلم سے عراق ہجرت کر کے آنے والے لوگوں نے بھی شیعہ مذہب قبول کیا تھا۔ امام علی نقی علیہ السلام کے اصحاب کے ناموں میں شہروں کے لقب جو ان کے مختلف علاقوں سے تعلق کو واضح کرتے ہیں ان سے کسی حد تک ان مراکز کی نشاندہی ہوتی ہے جہاں شیعہ آباد تھے۔ مثال کے طور پر بشر بن بشار نیشاپوری فتح بن یزید جرجانی احمد بن اسحق رازی حسین بن سعید اہوازی حمدان بن اسحاق خراسانی اور علی بن ابراہیم طالقانی کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں جو کہ ایران

۱۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۱۰۲ التوحید۔ ص ۱۰۱

۲۔ مشارق الانوار۔ ص ۱۰۰ مسند الامام الہادیؑ۔ ص ۳۵

۳۔ امالی طوسی۔ ج ۱۔ ص ۲۸۲ مناقب ابن شہر آشوب۔ ج ۲۔ ص ۴۵۱ مسند الامام الہادیؑ۔ ص ۳۷

۴۔ عیون اخبار الرضاؑ۔ ج ۲۔ ص ۲۶۰

۵۔ مسند الامام الہادیؑ۔ ص ۳۱۷ تنقیح المقال۔ ج ۲۔ ص ۹۰

کے مختلف شہروں میں رہا کرتے تھے۔ جرجان (۱) اور نیشاپور (۲) شیعوں کی روز افزوں سرگرمیوں کی وجہ سے رفتہ رفتہ چوتھی صدی ہجری میں شیعہ اثر ورسوخ کے مراکز بن گئے تھے۔

دوسرے شواہد سے اس بات کی عکاسی ہوتی ہے کہ قزوین میں بھی امام علی نقی علیہ السلام کے بعض اصحاب سکونت پذیر تھے۔ (۳)

اصفہان، جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہاں کے رہنے والے متعصب حنبلی سنی ہیں (اور اس کا بڑا حصہ ایسا ہی تھا) اس کے باوجود اس کے دامن میں امام علی نقی علیہ السلام کے اصحاب بھی تھے، جن میں سے ابراہیم بن شیبہ اصفہانی کی جانب اشارہ کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ وہ کاشانی تھے، لیکن احتمالاً طویل مدت تک اصفہان میں مقیم رہنے کی وجہ سے ان کا لقب ''اصفہانی'' ہوگیا تھا۔ اس کے برعکس بھی ہوتا تھا۔ جیسا کہ علی بن محمد کاشانی، جو امام علی نقی علیہ السلام کے اصحاب میں سے ہیں، وہ اصلاً اصفہانی تھے۔ (۴) ایک روایت میں ''عبدالرحمٰن نامی'' شخص کا نام لیا گیا ہے، جو اصفہان کے رہنے والے تھے اور سامرا میں امام علی نقی علیہ السلام کی ایک کرامت دیکھ کر شیعہ ہوگئے تھے۔ (۵)

چوتھی صدی ہجری میں اصفہان میں ایسے لوگوں کی بڑی تعداد موجود تھی، جو اپنی جان ومال اور گھرانے سے زیادہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کو عزیز رکھتے تھے۔ (۶)

ایک روایت میں ھمدان میں اپنے ایک وکیل کے نام امام علی نقی علیہ السلام کے ایک خط کا ذکر آیا ہے، جس میں آپ نے فرمایا ہے: میں نے ھمدان میں اپنے دوستوں کو تمہارے بارے میں تاکید کی ہے۔ (۷)

☆☆☆

۱۔ احسن التقاسیم۔ ص ۳۶۵، ۳۵۸، ۳۶۱، ۳۷۱

۲۔ احسن التقاسیم۔ ص ۳۶۶

۳۔ رجال کشی۔ ص ۵۲۶

۴۔ مسند الامام الہادیؑ۔ ص ۳۵۲

۵۔ بحار الانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۱۴۱، مسند الامام الہادیؑ۔ ص ۱۲۳

۶۔ مختصر تاریخ دمشق۔ ج ۱۰۔ ص ۱۰۴

۷۔ رجال کشی۔ ص ۶۱۰

علیہ السلام

امام حسن عسکری

"ابو عثمان عمرو بن بحر الجاحظ: و من الذی یُعَدّ من قریش او من غیرهم ما یُعَدُّه الطالبیین عَشَرَة فی نَسَق، کلّ واحد منهم عالمٌ زاهدٌ ناسکٌ شجاعٌ جوادٌ طاهر زاک، فمنهم خلفاء، ومنهم مرشحون: ابن ابن ابن ابن، هٰکذا الی عشرة، وهم الحسن بن علی بن محمد بن علی بن موسیٰ بن جعفربن محمدبن علی بن الحسین بن علی علیهم السلام، وهذا لم یتفق لبیت من بیوت العرب ولا من بیوت العجم."

"ابو عثمان عمرو بن بحر جاحظ ائمہ میں سے دس اماموں کی مدح وستائش کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔۔۔۔ان میں سے ہر ایک عالم، زاہد، ناسک، شجاع، جواد، طاہر اور تزکیہ کرنے والا ہے۔۔۔۔یہ سلسلہ عرب اور عجم کے کسی اور گھرانے میں نہیں پایا جاتا۔"

(شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ج ۱۵۔ ص ۲۷۸)

امام حسن عسکریؑ کی شخصیت

دور امامت

امام حسن بن علی عسکری علیہما السلام شیعوں کے گیارہویں امام ہیں۔ مورخین کی روایت کے مطابق آپ کی ولادت دس (۱) یا آٹھ (۲) یا چار (۳) ربیع الثانی سن ۲۳۲ ہجری اور خطیب (۴) کے بقول سن ۲۳۱ ہجری کو ہوئی اور آپ نے ۲۸ سال عمر پائی۔ (۵) ابن خلکان نے سن ۲۳۱ ہجری کے کسی مہینے کی جمعرات کے دن کو آپ کا روز ولادت قرار دیا ہے اور اس سلسلے میں ایک اور قول بھی نقل کیا ہے جس کے مطابق آپ کی تاریخ ولادت چھ ربیع الثانی سن ۲۳۲ ہجری ہے۔ (۶) مسعودی نے شہادت کے وقت آپ کی عمر ۲۹ سال قرار دی ہے۔ (۷) اس بنیاد پر اس کے نزدیک امام کا سن ولادت ۲۳۱ ہجری معتبر ہونا چاہیے۔

مؤرخین کے درمیان اس بات پر اتفاق پایا جاتا ہے کہ امام حسن عسکری علیہ السلام نے ۸ ربیع الاول سن ۲۶۰ ہجری کو رحلت فرمائی، (۸) اگرچہ بعض نے اسی سال کے جمادی الاول کو بھی آپ کی شہادت کا مہینہ قرار دیا ہے۔ (۹) امام علی نقی علیہ السلام نے سن ۲۵۴ ہجری میں رحلت فرمائی لہٰذا شیخ مفید کے مطابق امام حسن عسکری علیہ السلام کا دور امامت

۱۔ مسار الشیعہ۔ ص ۳۰

۲۔ اعلام الوریٰ۔ ص ۳۶۷

۳۔ مصباح کفعمی۔ ص ۵۳۰

۴۔ تاریخ بغداد۔ ج ۱۲۔ ص ۵۷

۵۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۵۰۳

۶۔ وفیات الاعیان۔ ج ۲۔ ص ۹۴، الائمۃ الاثنی عشر ابن طولون۔ ص ۱۱۳

۷۔ مروج الذہب۔ ج ۴۔ ص ۱۱۲

۸۔ ارشاد۔ ص ۳۳۵، المقالات والفرق۔ ص ۱۰۲، نور الابصار۔ ص ۱۶۸، کافی۔ ج ۱۔ ص ۵۰۳۔ دیکھئے: تواریخ النبی والآل۔ ص ۷۵

۹۔ وفیات الاعیان۔ ج ۲۔ ص ۹۴

چھ سال (۱) اور سعد بن عبداللہ کے بقول پانچ سال اور آٹھ ماہ رہا۔ (۲)

آپ کی والدہ' جو ام ولد (کنیز) تھیں' ان کے نام کے بارے میں مختلف روایتیں پائی جاتی ہیں۔ بعض کتابوں میں ان خاتون کا نام "حدیث" یا "حدیثہ" آیا ہے اور بعض دوسروں نے آپ کا نام "سوسن" (۳) یا عسفان (۴) ذکر کیا ہے۔ کتاب عیون المعجزات کے مؤلف نے ان کا اصل نام "سلیل" قرار دیا ہے اور عبارت "کانت من العارفات الصالحات." (وہ عارف اور صالح خاتون تھیں) کے ذریعے آپ کو سراہا ہے۔ (۵)

امام حسن عسکری علیہ السلام کے القاب الصامت' الہادی' الرفیق' الزکی اور التقی ذکر کیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض مورخین نے آپ کا ایک لقب "الخالص" بھی بیان کیا ہے۔ امام محمد تقی علیہ السلام اور امام حسن عسکری علیہ السلام دونوں کو "ابن الرضا" کے عنوان سے شہرت حاصل ہوئی۔ (۶) اسی طرح امام علی نقی علیہ السلام اور امام حسن عسکری علیہ السلام' دونوں عسکریین کے نام سے بھی مشہور ہوئے ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ عسکر' سامرا کا غیر معروف نام رہا ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ امام حسن عسکری علیہ السلام کی انگشتری پر "سُبحان مَن له مقالیدُ السّموات والارض" (۷) اور "اِنَّ اللہ شهید" منقوش تھا۔ (۸)

احمد بن عبید اللہ بن خاقان نے امامؑ کے ظاہری شکل وشمائل کے بارے میں لکھا ہے: آپ سیاہ آنکھوں' خوش قامت' خوش شکل اور موزوں ومتناسب بدن کے حامل تھے۔ (۹)

آپ کی امامت

سن ۲۵۴ ہجری میں امام علی نقی علیہ السلام کی شہادت کے بعد' آپ کی نص کے مطابق' آپ کے فرزند حسن عسکریؑ

۱۔ ارشاد۔ ص ۳۳۵

۲۔ المقالات والفرق۔ ص ۱۰۲

۳۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۵۰۳' کمال الدین۔ ج ۲۔ ص ۳۳۹' الفصول المہمہ۔ ص ۲۸۴' کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۴۰۲' نور الابصار۔ ص ۱۶۶

۴۔ فرق الشیعہ۔ ص ۱۰۵

۵۔ بحار الانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۲۳۸

۶۔ مناقب ابن شہر آشوب۔ ج ۴۔ ص ۴۲۱' بحار الانوار۔ ج ۵۰ ص ۲۳۶' نور الابصار۔ ص ۱۶۶

۷۔ نور الابصار۔ ص ۱۶۶

۸۔ بحار الانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۲۳۸

۹۔ کمال الدین۔ ج ۱۔ ص ۴۰

اثنا عشری شیعوں کے امام منصوب ہوئے۔ امام علی نقی علیہ السلام کی جانب سے اپنے فرزند (حسن عسکریؑ) کی امامت کے بارے میں وصیت اور نص پر مبنی روایات، حدیث اور تاریخ کی بہت سی شیعہ کتابوں میں کثرت کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ (۱) ظاہر ہے امام علی نقی علیہ السلام کی وصیت اور نص کے پیش نظر (جو شیعوں کے نزدیک ان کے بعد آنے والے امام کی امامت کے درست ہونے کی علامت ہے) شیعوں نے امام حسن عسکریؑ کی امامت کو قبول کر لیا۔ گنتی کے چند افراد کے سوا، تمام شیعوں کا اس امر پر اتفاق، خود اس دور کے شیعہ معاشرے میں اس امر کی مقبولیت کی ایک دلیل ہے۔

سعد بن عبداللہ کے بقول، چند افراد جنہوں نے محمد بن علی (جو اپنے والد امام علی نقی علیہ السلام کی حیات ہی میں وفات پا چکے تھے) کی امامت کو قبول کیا اور انگلیوں پر گنے جا سکنے والے کچھ افراد جنہوں نے جعفر بن علی کو اپنا امام مانا، ان کے سوا امام علی نقی علیہ السلام کے اصحاب کی اکثریت نے امام حسن عسکریؑ کی امامت کو قبول کیا۔ جعفر بن علی کے پیروکاروں کو "جعفریۂ خُلَّص" کا لقب ملا۔ (۲) مسعودی نے جمہور شیعہ کو امام حسن عسکریؑ اور ان کے بیٹے کا پیروکار قرار دیا ہے، جو تاریخ میں "قطعیہ" کے نام سے مشہور ہوئے۔ (۳) قطعیہ کا عنوان اس گروہ کی جانب اشارہ ہے جو گزشتہ امامؑ کی مہدویت کا قائل نہیں ہے، بلکہ گزشتہ امامؑ کی رحلت پر یقین (قطع) رکھتے ہوئے اگلے امامؑ کی امامت کو قبول کرتا ہے۔ یہ نام پہلی مرتبہ اہلِ واقفہ کے مقابلے میں استعمال ہوا جو امام موسیٰ کاظمؑ کی شہادت کے بعد وجود میں آئے تھے۔ جعفر اور اس کے پیروکاروں کے بارے میں ہم امام مہدیؑ کی زندگی پر گفتگو کے دوران عرض کریں گے۔

امام حسن عسکریؑ سامرا میں

امام علی نقی علیہ السلام کی زندگی پر گفتگو کرتے ہوئے ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ شیخ مفید نے امامؑ کو سامرا لانے کے لیے متوکل کے خط کی تاریخ ۲۴۳ ہجری بیان کی ہے۔ (۴) حالانکہ کافی کی روایت کے مطابق (۵) یہ وہ سال ہے جب راوی نے یحییٰ بن ہرثمہ سے خط کا متن حاصل کیا تھا۔ دراصل امامؑ اس سے دس سال پہلے ہی سامرا بلائے جا چکے تھے، اور جیسا کہ ابن خلکان نے لکھا ہے، امام علی نقی علیہ السلام تقریباً بیس سال اور نو ماہ سامرا میں مقیم رہے ہیں، اور اسی لیے اُن کا اور

۱۔ دیکھئے: الغیبہ طوسی۔ ص ۱۲۰۔۱۲۲، کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۴۰۳۔ ۴۰۷، ارشاد۔ ص ۳۳۵، روضۃ الواعظین۔ ص ۲۴۷، بحار الانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۲۳۹۔۲۴۶

۲۔ المقالات والفرق۔ ص ۱۰۱

۳۔ مروج الذہب۔ ج ۴۔ ص ۱۱۲

۴۔ ارشاد۔ ص ۳۳۴

۵۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۴۱۹۔ ح ۷

اُن کے بیٹے کا لقب "عسکری" ہو گیا تھا۔(۱)

جو بات قطعی ہے، وہ یہ ہے کہ ان دو اماموں کو (اُس دور میں عباسی خلافت کے مرکز) سامرا بلوانا، کئی پہلوؤں سے مامون کی اُس سیاست کے مشابہ ہے، جس کے تحت وہ امام رضاؑ کو خراسان لایا تھا۔ کیونکہ اس طرح امامؑ کے پاس شیعوں کی آمد و رفت پر بہتر طور پر نظر رکھی جا سکتی تھی اور حکمرانوں کے لیے شیعوں کو پہچاننا ممکن ہو جاتا تھا۔ عباسیوں کا خیال تھا کہ ممکن ہے ائمہؑ دوسرے علویوں کی طرح اپنے حمایتی پا کر ان کے خلاف شورش برپا کر دیں۔ مرکزِ خلافت میں امامؑ کی موجودگی اُن کے ایسے اقدام میں رکاوٹ ثابت ہوتی۔

جن برسوں میں امامؑ اس شہر میں رہے، چند مرتبہ قید کے سوا، بظاہر ایک عام آدمی کی طرح زندگی گزارتے رہے۔ قدرتی بات ہے کہ آپ کی حرکات و سکنات پر حکومت ایک محتاط نگاہ ضرور رکھتی تھی۔ واضح ہے کہ امام حسن عسکریؑ کو آزادی اور اختیار حاصل ہوتا، تو وہ بھی دوسرے ائمہؑ کی طرح اقامت کے لیے سامرا کی بجائے مدینہ کا انتخاب کرتے۔ درحقیقت سامرا میں آپ کی طویل اقامت کی وجہ خلیفہ کی جانب سے آپ کی ایک قسم کی نظر بندی کے سوا کچھ اور ممکن دکھائی نہیں دیتی۔ یہ مسئلہ، خصوصاً مدتوں سے ایک منظم شیعہ جماعت کی موجودگی کی وجہ سے خلیفہ کے لیے انتہائی اہمیت اختیار کر گیا تھا اور اس کے لیے انتہائی پریشانی اور وحشت کا موجب بنا ہوا تھا اور ایک ایسی چیز بن چکا تھا جس پر کسی نہ کسی صورت سے قابو پانے کی ضرورت تھی۔

اسی لیے حکام نے امامؑ سے مطالبہ کیا تھا کہ آپ سامرا میں اپنی موجودگی کی اطلاع مسلسل حکومت کو دیتے رہا کریں۔ چنانچہ امامؑ کے ایک خدمت گار کے مطابق، امامؑ کو ہر پیر اور جمعرات کے دن دارالخلافہ (دربار) میں حاضری دینا ہوتی تھی۔(۲) یہ حاضری جسے بظاہر امامؑ کے لیے ایک قسم کا احترام قرار دیا جاتا تھا، درحقیقت خلیفہ کی جانب سے امامؑ کی نگرانی کا ایک ذریعہ تھی۔

شیعوں کو امامؑ سے ملاقات کرنے میں مشکل پیش آتی تھی، چنانچہ صرف ایک مرتبہ جب خلیفہ "صاحب البصرہ" سے ملاقات کے لیے جا رہا تھا، اور اس نے امامؑ کو بھی اپنے ہمراہ لیا ہوا تھا، تب اصحابِ امامؑ نے راستے میں امامؑ کی زیارت کے لیے اپنے آپ کو تیار کیا تھا۔(۳) اس روایت سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ آپ کی زندگی میں کم از کم ایک ایسا دور ضرور پایا

۱۔ وفیات الاعیان۔ ج ۲۔ ص ۹۴۔۹۵، معجم البلدان۔ ج ۳۔ ص ۱۳۴، الائمۃ الاثنی عشر۔ ص ۱۱۳

۲۔ الغیبہ طوسی۔ ص ۱۲۹۔ بعض نسخوں میں "دار العامۃ" آیا ہے، جس سے مراد گویا "دار الخلافۃ" ہے۔

۳۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۵۰۹، ارشاد۔ ص ۳۴۷، اعلام الوریٰ۔ ص ۳۷۰، کشف الغمہ۔ ج ۳۔ ص ۲۲۵، الخرائج والجرائح۔ ج ۱۔ ص ۴۴۳، الصراط المستقیم۔ ج ۲۔ ص ۲۰۸

جاتا ہے جب آپ کے گھر میں آپ سے براہ راست ملاقات ممکن نہ تھی۔

اسماعیل بن محمد کہتے ہیں: میں رقم طلب کرنے کے لیے امامؑ کے راستے میں بیٹھ گیا' اور جب امامؑ وہاں سے گزرے تو میں نے آپ سے مالی مدد کا تقاضا کیا۔(۱) ابوبکر فہفکی کہتے ہیں: میں ایک کام (امامؑ سے ملاقات) کے لیے سامرا سے نکلا اور آپ کی سواری آنے کے دن ابی قطیعہ بن داؤد نامی سڑک پر امامؑ کے پہنچنے کا انتظار کرنے لگا' تاکہ دار العامہ کی طرف جاتے ہوئے اُن سے ملاقات کرلوں۔(۲)

محمد بن عبدالعزیز بلخی بھی دار العامہ کی جانب امام حسن عسکریؑ کی روانگی کے موقع پر الغنم نامی سڑک پر آپ کی تشریف آوری کے منتظر تھے۔(۳) محمد بن ربیع شیبانی کہتے ہیں: میں امامؑ کے دیدار کے لیے بابِ احمد بن خضیب پر بیٹھا ہوا تھا اور میں نے آپ کو وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھا۔(۴) علی بن جعفر نے حلبی سے نقل کیا ہے: ایک دن جس میں امامؑ کو دار الخلافہ جانا تھا' ہم اُن کی زیارت کی توقع میں عسکر میں جمع ہوگئے۔ اس موقع پر امامؑ کی طرف سے ہمیں یہ توقیع (تحریر) موصول ہوئی:

"اَلَا لَا یُسَلِّمَنَّ عَلَیَّ اَحَدٌ وَلَا یُشِیرُ اِلَیَّ بِیَدِہِ وَلَا یُوْمِیُٔ فَاِنَّکُمْ لَا تُؤْمِنُونَ عَلٰی اَنْفُسِکُمْ."(۵)

''کوئی مجھے سلام نہ کرے' حتیٰ میری طرف ہاتھ سے اشارہ بھی نہ کرے' کیونکہ تم لوگ محفوظ نہیں ہو۔''

یہ روایت بخوبی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ حکومت شیعوں کے ساتھ امامؑ کے روابط کی کس حد تک نگرانی کیا کرتی تھی اور انہیں کنٹرول کرتی تھی۔ البتہ امامؑ اور اُن کے شیعہ مختلف موقعوں پر ایک دوسرے کے ساتھ ملاقات کیا کرتے تھے اور ان ملاقاتوں کے لیے پوششیں (covers) بھی موجود تھیں۔ شیعوں کے ساتھ امامؑ کے رابطے کا ایک بہترین ذریعہ خط و کتابت تھا جو ہمیں مصادر میں کثرت کے ساتھ ملتے ہیں۔

سامرا میں امامؑ کا مقام

امام حسن عسکری علیہ السلام اگرچہ انتہائی جوان تھے' لیکن اپنے بلند علمی اور اخلاقی مقام' بالخصوص شیعوں کی قیادت

۱۔ کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۴۱۳

۲۔ الخرائج والجرائح۔ ج ۱۔ ص ۴۳۶

۳۔ الخرائج والجرائح۔ ج ۱۔ ص ۴۴۷' حاشیے میں مستدرک جلد ۹ صفحہ ۲۷ ' اثبات الوصیہ صفحہ ۲۴۳ سے۔

۴۔ کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۴۲۵' الخرائج والجرائح۔ ج ۱۔ ص ۴۲۵' بحار الانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۲۹۳

۵۔ الخرائج والجرائح۔ ج ۱۔ ص ۴۳۹' الصراط المستقیم۔ ج ۱۔ ص ۲۰۷

اور امامؑ پر اُن کے غیر متزلزل اعتقاد اور لوگوں کی جانب سے آپ کے احترام کی وجہ سے آپ نے بہت زیادہ شہرت حاصل کر لی تھی۔ نیز کیونکہ آپ عوام وخواص کی توجہ کا مرکز تھے' اس لیے عباسی خلافت نے بعض مواقع کے سوا' عموماً آپ کے ساتھ بظاہر احترام آمیز طرزِ عمل اختیار کیا۔

ایک طویل روایت' جو متعدد مصادر میں نقل ہوئی ہے' وہ سامرا میں آپ کی روز افزوں اہمیت' عظمت اور مقام کی نشان دہی کرتی ہے۔ اس روایت کی اہمیت کی بنا پر ہم یہاں اس کے بعض حصے نقل کرتے ہیں:

شیعوں کے معروف عالمِ دین سعد بن عبداللہ اشعری جنہیں شاید امام حسن عسکری علیہ السلام سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا ہے(۱) کہتے ہیں:

''شعبان سن ۲۷۸ ہجری میں (امامؑ کی شہادت کے اٹھارہ سال بعد) میں ایک دن احمد بن عبید اللہ بن خاقان کی مجلس میں موجود تھا(۲)' جو ان دنوں قم کے خراج کا ذمے دار تھا اور آلِ محمدؐ اور قم کے لوگوں سے بغض وعداوت رکھتا تھا۔ اسی اثنا میں سامرا میں رہنے والے طالبیوں' اُن کے مذہب اور حاکم کے نزدیک ان کی حیثیت کا ذکر چھڑ گیا۔ احمد نے کہا: میں نے سامرا میں علویوں میں حسن بن علی عسکریؑ جیسا کوئی شخص نہیں دیکھا اور نہ سنا جو وقار' پاک دامنی' زیرکی اور بزرگ منشی میں اپنے اہلِ بیتؑ کے درمیان معروف ہو' اور حاکم اور بنی ہاشم کے نزدیک لائق احترام ہو۔ حتیٰ وہ انہیں سن رسیدہ افراد' اُمرا' وزرا اور معتمدین پر بھی ترجیح دیا کرتے تھے۔ ایک دن میں اپنے باپ کے پیچھے کھڑا ہوا تھا' اس دن میرے والد لوگوں کے ساتھ ملاقات کے لیے تشریف فرما تھے' کہ ایک حاجب نے آ کر کہا: ابن الرضا باہر دروازے پر کھڑے ہیں۔ میرے والد نے بلند آواز سے کہا: انہیں تشریف لانے دو' آنجناب داخل ہوئے۔۔۔ جب میرے والد نے انہیں دیکھا' تو استقبال کے لیے چند قدم ان کی طرف بڑھے۔ یہ ایسا کام تھا جو میں نے انہیں حتیٰ اُمرا اور گورنروں کے ساتھ بھی انجام دیتے نہیں دیکھا تھا۔ جب وہ ان کے نزدیک پہنچے' تو انہوں نے انہیں گلے لگایا اور اُن کے چہرے اور پیشانی کا بوسہ لیا۔ پھر ان کا ہاتھ تھام کر انہیں اپنی جگہ پر بٹھایا۔ میرے والد ان کے سامنے بیٹھے اور ان کے ساتھ گفتگو کرنے لگے۔ وہ گفتگو کے دوران انہیں ان کی کنیت (جس سے احترام کا اظہار ہوتا ہے) سے مخاطب کرتے تھے اور مسلسل کہہ رہے تھے: میرے ماں باپ آپ پر قربان۔۔۔

۱۔ رجال النجاشی۔ ص ۱۲۶

۲۔ اس کا باپ معتمد عباسی کا وزیر تھا۔ دیکھیے: کامل ابن اثیر۔ ج ۷۔ ص ۲۳۵

رات کو میں اپنے والد کے پاس گیا۔۔۔ اور ان سے پوچھا: بابا جان! آج جس شخص کی آپ اس قدر تعظیم وتکریم کر رہے تھے اور اپنے ماں باپ کو بھی اس پر فدا کر رہے تھے وہ کون تھا؟ انہوں نے کہا: وہ رافضیوں کے امام ابن الرضا تھے۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ چند لمحوں بعد سکوت کو توڑا اور بولے: بیٹا! اگر کسی دن خلافت بنی عباس کے ہاتھوں سے نکل گئی تو بنی ہاشم کے درمیان ان کے سوا کوئی بھی خلافت کے لائق نہیں ہے۔ وہ اپنے فضل، پاک دامنی، زہد، عبادت اور حسنِ اخلاق کی وجہ سے مقامِ خلافت کے حقدار ہیں۔ اگر تم نے ان کے والد کو دیکھا ہوتا، تو وہ ایک ذی احترام، عاقل، صاحب شرافت اور صاحب فضل انسان تھے۔ یہ سن کر غصے کی آگ نے میرے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے متعلق جاننے کے لیے میرے اندر تجسس کی حس بھڑک اٹھی ۔ میں نے کسی بھی بنی ہاشم، معتمد، قاضی، فقیہ، حتیٰ عام آدمی سے بھی ان کے بارے میں پوچھا، تو آپ کو اس کے نزدیک انتہائی عظمت وشان کا مالک اور اہلِ بیت کے تمام افراد پر برتر جانا۔ سب کہتے تھے: وہ رافضیوں کے امام ہیں۔ اس کے بعد میری نظر میں ان کی اہمیت روز بروز بڑھتی چلی گئی، کیونکہ دوست اور دشمن سب نے ان کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا تھا۔" (۱)

یہ روایت، اس کے راوی کو مدِنظر رکھتے ہوئے، جو اہلِ بیتؑ کا شدید دشمن تھا، عام لوگوں، حتیٰ خواص کے درمیان امامؑ کے اخلاقی اور اجتماعی مقام کی نشاندہی کرتی ہے۔

امام حسن عسکری علیہ السلام کا خادم کہتا ہے: جن دنوں امامؑ خلیفہ کی اقامت گاہ میں جایا کرتے تھے، اُن دنوں لوگوں کے درمیان عجیب ہیجان پیدا ہو جایا کرتا تھا۔ آپ کے راستے میں آنے والی سڑکیں ایسے لوگوں سے بھر جاتی تھیں جو اپنی سواریوں پر سوار ہوتے تھے۔ جب امامؑ تشریف لاتے تو ایک دَم خاموشی چھا جاتی تھی اور آپ لوگوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے دربار میں داخل ہو جاتے تھے۔ (۲)

قدرتی بات ہے کہ ان میں زیادہ تر وہ شیعہ ہوں گے جو دور و نزدیک سے امامؑ کی زیارت کے لیے سامرا آیا کرتے تھے، اگرچہ اولادِ رسولؐ سے عام لوگوں کی عقیدت بھی ان میں امامؑ کی زیارت کا اشتیاق پیدا کرتی تھی اور ہجوم میں اضافے کا سبب بنتی تھی۔

۱۔ بحار الانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۳۲۵، کافی۔ ج ۱۔ ص ۵۰۵، الغیبہ طوسی۔ ص ۱۳۱۔ ۱۳۲، کمال الدین۔ ج ۱۔ ص ۴۰۔ ۴۱، اعلام الوریٰ۔ ص ۳۵۷۔ ۳۵۹، ارشاد۔ ص ۳۳۸۔ ۳۴۰، کشف الغمہ۔ ج ۱۔ ص ۴۰۷

۲۔ الغیبہ طوسی۔ ص ۱۲۹

امامؑ کی گرفتاری کے ادوار

جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے' متوکل کے حکم سے امام علی نقی علیہ السلام کو امام حسن عسکری علیہ السلام کے ہمراہ سامرا طلب کرنے کا مقصد' ان دونوں اماموں کو زیر نظر رکھنا اور ان کے شیعوں سے ان کے روابط کو کنٹرول کرنے کے لیے انہیں اس شہر میں نظر بند کرنا تھا۔ بعض مواقع پر اس نظر بندی کے دوران ان حضرات پر زیادہ سختی کی جاتی تھی' خاص طور پر جب ایسے خاص حادثات وجود میں آتے' جو کسی اعتبار سے حکومت کے لیے خطرہ شمار ہوتے تھے' ان مواقع پر امامؑ کو آپ کے بعض قریبی ساتھیوں کے ساتھ قید خانے میں ڈال دیا جاتا تھا۔

امام حسن عسکری علیہ السلام کی اسیری کے حوالے سے متعدد روایات موجود ہیں' جو بعض پہلوؤں سے ایک دوسرے سے موافق نہیں ہیں۔ ممکن ہے اس کی وجہ متعدد بار آپ کی گرفتاری کے علاوہ خلفا کے ناموں میں لوگوں کا غلطی کرنا بھی ہو۔ تمام متعلقہ روایات کو جمع کر کے' ان کے ایک دوسرے کے ساتھ موازنے سے حقیقت تک پہنچنے کی امید بڑھ جاتی ہے۔

امام حسن عسکری علیہ السلام کی اسیری کی ایک خبر مستعین کے دور (۲۴۸ ہجری تا ۲۵۲ ہجری) میں ملتی ہے۔ حمیری نے کتاب "الاوصیاء" میں نقل کیا ہے کہ مستعین نے سعید حاجب کو امام حسن عسکریؑ کو حراست میں لینے اور انہیں کوفہ لانے کا حکم دیا۔ ابوالہیثم بن سیابہ نے امامؑ کو جو خط لکھا ہے' اُس میں انہوں نے اس خبر کے حوالے سے پریشانی کا اظہار کیا ہے۔ امامؑ نے جواب میں انہیں تحریر فرمایا: "تین دن بعد مشکلات سے رہائی مل جائے گی۔" چنانچہ تین دن بعد مستعین کا تختہ الٹ گیا اور خطرہ دور ہو گیا۔ (۱) یہ خبر دوسری کتابوں میں معتز کے بارے میں بیان کی گئی ہے۔ یہ بات تو معلوم ہے کہ امام حسن عسکریؑ کی امامت کا آغاز سن ۲۵۴ ہجری میں ہوا ہے' اس وجہ سے شاید مستعین کے حوالے سے یہ خبر درست نہ ہو۔ اربلی نے بھی اس غلطی کو محسوس کیا ہے' اور کہا ہے کہ اس روایت میں یا تو مستعین کا نام غلطی سے آ گیا ہے یا پھر یہ خبر امام علی نقی علیہ السلام کے بارے میں ہو گی۔ (۲)

معتز' جو ایک سخت گیر عباسی خلیفہ تھا' سن ۲۵۲ ہجری میں تختِ خلافت پر بیٹھا۔ روایت ہے کہ اسی سال متعدد شیعہ' بشمول ابوہاشم جعفری قید میں تھے۔ خطیب بغدادی ابن عرفہ سے نقل کرتے ہوئے ان کی اسیری کی وجہ یوں بیان کرتے ہیں: ان سے سنی جانے والی کچھ باتیں' ان کی قید کا سبب بنیں۔ (۳)

۱۔ بحار الانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۳۱۲۔ ۳۱۳' از مہج الدعوات ابن طاؤس

۲۔ نیز دیکھیے: مرآۃ العقول۔ ج ۶۔ ص ۱۵۱

۳۔ نقل از قاموس الرجال۔ ج ۳۔ ص ۵۹۔ سمعانی نے غلطی سے ۲۴۲ لکھا ہے۔

ایک روایت کے مطابق' جسے شیخ طوسی نے نقل کیا ہے' ابو ہاشم جعفری کی بنی ہاشم اور غیر بنی ہاشم چند افراد کے ساتھ گرفتاری کی وجہ عبداللہ بن محمد عباسی کا قتل تھا۔(۱) بعض روایات کے مطابق' اس قید خانے کا داروغہ صالح بن وصیف تھا' جو سن ۲۵۶ ہجری میں موسیٰ بن بغا کے ہاتھوں مارا گیا۔(۲) اعلام الوریٰ میں آنے والی ایک روایت کے مطابق' ابو ہاشم نے کہا تھا کہ سن ۲۵۸ ہجری میں وہ چند طالبیوں کے ساتھ معتز کی قید میں تھے۔ یہ تاریخ غلط ہوگی' کیونکہ معتز سن ۲۵۵ ہجری میں اور وصیف ۲۵۶ ہجری میں مارے جا چکے تھے۔ زیادہ امکان یہ ہے کہ یہ خبر سن ۲۵۲ ہجری کے بعد سے تعلق رکھتی ہے' کیونکہ خطیب اور دوسروں کی روایت میں اس سال ابو ہاشم کی گرفتاری کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔(۳)

انہوں نے اس خبر میں امام حسن عسکری علیہ السلام اور ان کے بھائی جعفر کے قید خانے میں آنے کا ذکر کیا ہے۔ سن ۲۵۴ ہجری میں امام علی نقی علیہ السلام کی شہادت اور امام حسن عسکری علیہ السلام کی امامت کو پیشِ نظر رکھا جائے' تو ان دو بھائیوں کا قید خانے میں آنا ۲۵۴ یا ۲۵۵ ہجری کی بات ہوسکتی ہے۔ اس روایت میں آیا ہے کہ امامؑ نے علوی ہونے کے دعویدار ایک عجمی شخص (خ ل جمحی) کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "اگر یہ شخص نہ ہوتا' تو میں بتا دیتا کہ تم کتنے عرصے بعد قید سے نجات پاؤ گے' کیونکہ وہ تمہاری نگرانی کررہا ہے اور تمہاری حرکتوں کو خلیفہ تک پہنچاتا ہے"۔ ابو ہاشم کہتے ہیں کہ: ایک دن ہم نے دھوکا دے کر اس شخص کے لباس سے ایک کاغذ برآمد کیا جس میں ہم میں سے ہر ایک کے بارے میں بری رپورٹ خلیفہ کے لیے تیار کی گئی تھی۔(۴)

عباسیوں کا ایک کارندہ صالح بن وصیف تھا' جو اس قید خانے کا داروغہ تھا جس میں امامؑ کو قید رکھا گیا تھا' جب بنی عباس سے تعلق رکھنے والی بعض شخصیات نے اسے امامؑ کے خلاف سخت گیری پر اکسایا' تو اس نے انہیں جواب دیا:

"قَد وكّلتُ بِه رَجُلَينِ شَرَّ مَن قَدَرْتُ عليه فَقَدْ صارا مِنَ العِبادةِ و الصَّلاةِ الى أمرٍ عَظيمٍ."(۵)

"میں نے اپنی دانست میں دو بدترین افراد کو اُن پر مامور کیا تھا' لیکن وہ اُن سے ایسے متاثر ہوئے کہ عبادت اور نماز میں بلند مقام پر پہنچ گئے۔"

امام کا کردار ایسا ہوتا ہے کہ معصوم اور بے نمازی بھی نمازی بن گئے ایک قسم میں) امام سے وابستہ ہوئے

۱۔ الغیبہ طوسی۔ ص ۱۳۶' بحار الانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۳۰۶

۲۔ الکامل۔ ج ۷۔ ص ۲۱۸۔ ۲۱۹' ۲۲۵

۳۔ دیکھئے: بحار الانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۳۱۱۔ ۳۱۲' از اعلام الوریٰ۔ ص ۳۵۴۔ علامہ نے اس غلطی کو محسوس کرلیا ہے۔

۴۔ نور الابصار۔ ص ۱۶۶' کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۴۳۲' بحار الانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۲۵۴' الخرائج الجرائح۔ ج ۲۔ ص ۱۸۲

۵۔ ارشاد۔ ص ۳۴۴' کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۴۱۴' روضۃ الواعظین۔ ص ۲۴۸

بعض ذرائع سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ امامؑ قید خانے میں ہمیشہ روزے سے ہوا کرتے تھے۔(۱)

مذکورہ بالا خبر کے علاوہ بیان کیا گیا ہے کہ معتز نے سعید حاجب کو حکم دیا کہ امام حسن عسکری علیہ السلام کو کوفہ لے آئے لیکن وہ تین دن بعد مارا گیا۔(۲) یہ خبر اس روایت کی مانند ہے جو اس سے پہلے مستعین کے دور کے بارے میں گزر چکی ہے۔

مہتدی کے دور (۲۵۵ ہجری تا ۲۵۶ ہجری) کے بارے میں بھی ایک خبر موجود ہے۔ مہتدی اس بات کا دعویدار تھا کہ وہ عباسیوں کا عمر بن عبدالعزیز ہے۔(۳) علاوہ ازایں اہل سنت اس پر معتزلی اور قدری ہو جانے کا الزام لگاتے تھے اور گویا اس الزام کا اس کے قتل میں بھی دخل تھا۔(۴) ابو ہاشم جعفری نے کہا ہے: مہتدی کے دور میں جب میں قید میں تھا تو امام حسن عسکری علیہ السلام کو زندان میں لایا گیا۔ سن ۲۵۶ ہجری میں مہتدی کے قتل کے بعد خدا نے موت کے خطرے سے ان کی جان کو نجات دلائی کیونکہ خلیفہ امامؑ کو قتل کرنا چاہتا تھا۔(۵)

جیسا کہ نقل کیا گیا ہے امام حسن عسکری علیہ السلام ایک مرتبہ پھر معتمد عباسی کی خلافت کے دور (۲۵۶ تا ۲۷۹ ہجری) میں قید کیے گئے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ آپ سن ۲۵۹ ہجری میں معتمد عباسی کی قید میں تھے اور علی بن جرین قید خانے کا داروغہ تھا۔ معتمد نے اس سے امامؑ کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا: وہ مسلسل دن میں روزہ رکھتے اور رات میں نماز میں مشغول رہتے ہیں۔(۶)

اسی طرح صیمری نے کتاب "الاوصیاء" میں روایت کی ہے کہ اس نے کہا: میں نے خود معتمد کی قید سے نکلتے وقت ابو محمد عسکریؑ کی تحریر کو دیکھا آپ نے یہ آیت لکھ رکھی تھی: يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ اللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ.(۷)

شیخ مفید نے محمد بن اسماعیل علوی سے یہ روایت بیان کی ہے:

۱۔ نورالابصار۔ ص ۱۶۸، الفصول المہمہ۔ ص ۲۸۶، کافی۔ ج۱۔ ص ۵۱۲

۲۔ کشف الغمہ۔ ج۲۔ ص ۴۱۶، الخرائج والجرائح۔ ج۱۔ ص ۴۵۱، بحارالانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۲۹۵

۳۔ المنتظم۔ ج ۱۲۔ ص ۸۳۔ سال ۲۵۵ ہجری کے حالات میں۔

۴۔ بحارالانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۳۱۳، از کتاب الاوصیاء صیمری بتوسط مہج الدعوات

۵۔ بحارالانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۳۱۳، از مہج الدعوات۔ ص ۳۴۳، الغیبہ طوسی۔ ص ۱۲۳

۶۔ بحارالانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۳۱۴، از کتاب الاوصیاء بتوسط مہج الدعوات۔ ص ۳۴۴

۷۔ سورہ صف ۶۱۔ آیت ۸

"امام عسکری علیہ السلام کو علی بن اوتامش (یا بارمش) کے پاس قید کر دیا گیا۔ یہ شخص آلِ ابی طالب کا شدید دشمن تھا۔ اسے حکم دیا گیا تھا کہ وہ امامؑ پر جتنی سختیاں کر سکتا ہے کر گزرے۔ لیکن امامؑ سے ملاقات کے بعد۔۔۔ وہ اس حال میں آپ سے جدا ہوا کہ دوسروں سے زیادہ امامؑ کی خدائی عظمت کا قائل اور آپ کا ثنا خواں ہو گیا تھا۔"(۱)

تقریباً یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ امامؑ کی یہ اسیری سن ۲۵۹ ہجری میں واقع ہوئی تھی۔ اس امکان کی صداقت کی گواہی درج ذیل روایت دیتی ہے:

"کشی نے "رجال" میں لکھا ہے: محمد بن ابراہیم سمرقندی نے کہا: میں حج کے لیے جا رہا تھا' میں نے فیصلہ کیا کہ راستے میں اپنے ایک دوست بورق بوشجانی (۲) سے ملتا جاؤں گا' جو صدق وصلاح اور تقویٰ اور نیکی میں زبانِ زدِ عام تھا۔ میں اس کے پاس تھا کہ درمیان میں فضل بن شاذان کا ذکر آ گیا۔ بورق بولا: وہ معدے پر ورم کی وجہ سے شدید بیمار تھا اور۔۔۔ بورق نے گفتگو کے دوران آگے چل کر کہا: جب میں حج کے ارادے سے مکہ کی جانب جا رہا تھا' تو میں محمد بن عیسیٰ العبیدی کے پاس گیا جو شیخ فاضل تھے۔ میں نے اس کے گھر میں کچھ لوگوں کو افسردہ اور مغموم بیٹھے دیکھا۔ سبب معلوم کیا' تو کہنے لگے: ابو محمد (امام حسن عسکریؑ) کو قید کر لیا گیا ہے۔ میں اپنے سفر پر روانہ ہو گیا اور واپسی پر دوبارہ محمد بن عیسیٰ سے ملاقات کے لیے گیا۔ مجھے وہ بہت خوش اور مسرور نظر آیا۔ میں نے اس سے حالات دریافت کیے' تو اس نے جواب دیا: امامؑ آزاد ہو گئے ہیں۔ میں کتاب "یوم ولیلہ" اپنے ہمراہ لیے سامرا پہنچا اور ابو محمد (امام حسن عسکریؑ) کی خدمت میں شرفیاب ہوا۔ میں نے وہ کتاب امامؑ کو دکھاتے ہوئے عرض کیا: میں آپ کے قربان جاؤں! یہ کتاب ملاحظہ فرمایئے۔ امامؑ نے اس کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے فرمایا: صحیح ہے۔ یہ اس بات کی مستحق ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ میں نے عرض کیا: فضل شدید بیمار ہے' اور میں نے سنا ہے کہ آپ کی دعا کی وجہ سے وہ اس بیماری میں مبتلا ہوا ہے' کیونکہ اس کے بارے میں آپ سے کہا گیا ہے کہ وہ ابراہیمؑ کے وصی کو رسولِ خداؐ کے وصی سے بالاتر سمجھتا ہے' حالانکہ ایسا نہیں ہے' اور یہ بات اس کی جانب غلط منسوب کی گئی ہے۔ امامؑ نے فرمایا: ہاں' خدا فضل پر رحمت کرے۔ بورق کہتا ہے: میں واپس

۱۔ ارشاد۔ ص ۳۲۲' کافی۔ ج ۱۔ ص ۵۰۸' کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۴۱۲

۲۔ بوشجان ہرات کا ایک دیہات ہے۔

لوٹ آیا اور دیکھا کہ جن ایام میں امامؑ نے رَحِمَہُ اللّٰہُ الفَضلَ کہا تھا' انہی دنوں میں اس کا انتقال ہوا ہے۔"(۱)

جیسا کہ مشہور ہے' فضل بن شاذان کی وفات سن ۲۶۰ ہجری میں ہوئی ہے' اگر ہم یہ بات قبول کرلیں' تو قدرتی طور پر ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ امامؑ سن ۲۵۹ ہجری کے اواخر میں ذی الحجہ سے پہلے زندان میں تھے۔

امامؑ کا اپنے شیعوں کے ساتھ رابطہ

جب امام رضا علیہ السلام خراسان تشریف لائے' تو علوی سادات گوناگوں وجوہات کی بنا پر وسیع مملکت اسلامیہ کے مختلف علاقوں میں ہجرت کر گئے۔ عراق میں شیعوں اور علویوں پر گھٹن اور دباؤ کی شدت نے اس ہجرت میں اضافہ کیا۔ شیعہ اپنے لیے ایسے خطے تلاش کرنے پر مجبور ہو گئے' جہاں انہیں کسی حد تک امن وامان میسر آسکے۔ سرزمین عرب پر اموی طرز تفکر اور جذبات کی حکمرانی کی وجہ سے یہ سرزمین شیعوں کے لیے جائے امن نہیں بن سکتی تھی' لیکن مشرق میں' خصوصاً ایران میں ان کے لیے حالات سازگار تھے۔ لہٰذا بکثرت شیعوں نے وہاں کا رُخ کیا اور مختلف شہروں میں ایک دوسرے سے دور زندگی گزارنے لگے۔ انہیں سب سے پہلے' ایک دوسرے کے ساتھ باہمی روابط کی ضرورت تھی' کیونکہ ان کا امامؑ بھی حاضر تھا اور انہیں اپنے دینی مسائل اور کسی حد تک پیش آنے والی سیاسی اور اجتماعی مشکلات کے حل کی بھی ضرورت تھی۔ اسی لیے وہ امامؑ سے رابطے کے مختلف طریقوں سے استفادہ کرتے تھے' جیسے خاص افراد کو امامؑ کی خدمت میں بھیجنا' حج کے ایام میں اور مدینہ میں امامؑ سے ملاقات کرنا اور خط وکتابت کرنا۔ ان طریقوں سے وہ امامؑ سے روایات اور علمی رہنمائی حاصل کیا کرتے تھے۔

حضورِ ائمہؑ کے آخری ساٹھ سالوں سے غیبت صغریٰ کے آغاز تک شیعوں کا بکھرنا اور منتشر ہونا بخوبی نظر آتا ہے' اور اس کے تاریخی قرائن اور شواہد حتیٰ فقہی احادیث میں بھی کثرت کے ساتھ دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہاں ہم ابتدا میں مذکورہ دور میں شیعوں کے منتشر ہونے اور اس کے بعد ان کے ساتھ امامؑ کے رابطے کی کیفیت پر گفتگو کریں گے۔ البتہ ہماری گفتگو صرف ان شیعوں کے بارے میں ہوگی جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بارہ اماموں کی امامت پر عقیدے کی بنیاد پر ان سے فکری اور دینی رابطہ رکھتے تھے' ان کے محبوں کے بارے میں گفتگو نہیں کریں گے جو صرف عام معنی میں محبانِ اہل بیتؑ تھے۔ امام حسن عسکری علیہ السلام کی ایک روایت میں ان دو گروہوں کا فرق بیان کیا گیا ہے اور اسے اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے۔ امامؑ سے اعتقادی تشیع اور محبت اہل بیتؑ کی حد تک کی تشیع کے درمیان فرق کے بارے میں پوچھا گیا:

۱۔ رجال کشی۔ ص ۵۳۷۔ ۵۳۸۔ روایت ۱۰۲۳

ما الفرق بین الشیعة والمُحِبین؟

شیعوں اور محبوں کے درمیان کیا فرق ہے؟

"قال: شیعتنا هُمُ الَّذِینَ یتّبعونَ آثارَنا وَ یُطیعونا فی جمیعِ اوامِرِنا ونواهینا ومَنْ خالفنا فی کثیرٍ ممّا فَرَضَهُ اللهُ فلیس مِنْ شیعتنا."(۱)

"آپ نے فرمایا: ہمارے شیعہ وہ ہیں' جو ہمارے آثار کی پیروی کریں اور ہمارے تمام اوامر ونواہی میں ہماری اطاعت کریں۔ اور جو لوگ خدا کی فرض کی ہوئی زیادہ تر باتوں میں ہماری مخالفت کریں' وہ ہمارے شیعوں میں سے نہیں ہیں۔"

وہ اہم علاقے جن میں شیعہ بڑی تعداد میں بستے تھے' اور اُن کا امامؑ سے رابطہ بھی تھا' اُن میں نیشاپور کا نام بھی لیا جاسکتا ہے۔ بنیادی طور پر ایران کے مشرقی علاقے کا شمار اُن خطوں میں ہوتا ہے جن کی تاریخ میں ائمہؑ کے متعدد اصحاب اور اسی طرح تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے مشہور شیعہ علما کے نام نظر آتے ہیں۔ اس قسم کی شخصیات کا ایک واضح نمونہ فضل بن شاذان ہیں' جنہیں شیعہ علما اور اصحابِ ائمہؑ کے درمیان بلند مقام حاصل ہے۔

نیشاپور کے علاوہ سمرقند' بیہق اور طوس بھی شیعہ آبادی کے مراکز شمار ہوتے تھے۔ بیہق کی اکثر آبادی شیعہ تھی۔ اس قسم کی بکھری ہوئی آبادی (جس کی مانند آبادی دوسرے علاقوں میں بھی پائی جاتی تھی) کے لیے رابطے کے ایک منظم اور انتہائی حساس نظام کی ضرورت تھی' جس کے ذریعے تشیع کو فروغ حاصل ہو' یا کم از کم اس کی موجودہ حالت کو برقرار رکھا جاسکے۔ یہ نظام ائمہؑ کی جانب سے "وکلا" کے تعین سے تشکیل پاتا تھا اور امامؑ اور ان کے وکلا کے درمیان رابطے کے ذریعے (جو خصوصاً خط وکتابت کی صورت میں ہوتا تھا) وجود میں آتا تھا۔ اس کے ذریعے سے دینی اور سیاسی معاملات میں ضروری ہدایات فراہم کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔

یہ طریقہ ماضی میں بھی رائج تھا' جسے امام حسن عسکری علیہ السلام نے بھی اپنے دورِ حیات میں جاری رکھا اور اس کی توسیع اور اس سے استفادے کی کوشش کرتے رہے۔ ایسے افراد جو شاندار علمی ریکارڈ کے مالک تھے اور اسی طرح امام حسن عسکریؑ یا گزشتہ ائمہؑ سے مستحکم روابط رکھتے تھے اور حدیث کے اعتبار سے شیعوں کے مضبوط پشت پناہ شمار ہوسکتے تھے' ان کا وکیل کے طور پر انتخاب کیا جاتا تھا۔

نیشاپور' جسے دوسرے علاقوں کی نسبت زیادہ مضبوط علمی' ثقافتی اور اقتصادی مرکزیت حاصل تھی' وہ خراسان کے لیے

۱۔ تفسیر امام حسن عسکریؑ ' ص ۳۱۶ ۔ ش ۱۶۱' الخرائج والجرائح ۔ ج ۲ ۔ ص ۶۸۴

انتہائی اہمیت کا حامل تھا۔ ایک روایت کے مطابق' جسے ہم ذیل میں نقل کریں گے' اس شہر میں امامؑ کے وکیل ابراہیم بن عبدہ تھے۔ یہاں ہم اس نظام کی اہمیت اور اس کے ذریعے سے انجام دیے گئے کاموں کی وضاحت کے لیے اس وکالت کے حوالے سے لکھے جانے والے امامؑ کے خطوط پر ایک نظر ڈالتے ہیں:

امام حسن عسکری علیہ السلام نے عبداللہ بن حمدویہ کو جو خط تحریر کیا' اس میں ہے کہ:

''میں نے تم پر ابراہیم بن عبدہ کو مقرر کیا ہے' تا کہ اس خطے اور تمہارے علاقے کے لوگ ہمارے واجب حقوق انہیں ادا کریں۔ میں نے انہیں اس علاقے میں اپنے دوستوں کے لیے اپنا امین قرار دیا ہے۔ تقویٰ اختیار کرو اور اپنے حقوق کی ادائیگی کا خیال رکھو' انہیں ترک کرنے یا ان میں تاخیر کا کوئی عذر نہیں ہے۔'' (۱)

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم کی وکالت اور ان کی سرگرمیوں کا دائرہ گردونواح کے تمام علاقوں' حتیٰ عبداللہ بن حمدویہ بیہقی (عبداللہ کا تعلق غالباً اسی بیہق سے تھا) کے علاقے پر بھی محیط تھا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ بعض شیعوں کو ابراہیم کے بارے میں امامؑ کے اس خط کی اصلیت کے بارے میں شک تھا' لہٰذا امامؑ نے اس کے بعد درج ذیل خط تحریر فرمایا:

''وہ خط جس میں ابراہیم کو میرے وکیل کے طور پر معین کیا گیا ہے' اور جس میں انہیں میرے دوستوں سے میرے حقوق جمع کرنے پر مامور کیا گیا ہے' وہ میری ہی جانب سے ہے اور اس خط کو خود میں نے تحریر کیا ہے۔ میں نے انہیں واقعاً ان کے شہر میں مقرر کیا ہے۔ خدا سے ڈرو اور میرے حقوق انہیں ادا کرو' کیونکہ میں نے انہیں اس بارے میں پوری اور کامل اجازت دی ہوئی ہے۔'' (۲)

امام حسن عسکری علیہ السلام کی تحریروں میں سے طویل ترین خط انہی ابراہیم بن عبدہ کے بارے میں ہے' جسے آپ نے اسحاق بن اسماعیل نیشاپوری کو ارسال کیا تھا۔ یہ خط اخلاقی نصیحتوں اور انتہائی قیمتی ہدایات سے لبریز ہے۔ امامؑ نے خط کے آغاز میں' اوصیا کے توسط سے ہدایتِ الٰہی کی اہمیت' اور ائمہ ہدیٰ علمِ الٰہی کے ابواب ہیں کے بارے میں ایک طویل مقدمے کے بعد آیت '' اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ..... '' کو لوگوں کی ہدایت کے لیے ائمہؑ کے انتخاب کو خدا کے احسان کی دلیل قرار دیا ہے۔ اسی طرح امامؑ نے اُن حقوق کا ذکر بھی کیا ہے جو ائمہ معصومینؑ کو ادا کیے جانے چاہئیں اور لکھا ہے:

۱۔ رجال کشی۔ ص ۵۸۰

۲۔ رجال کشی۔ ص ۵۸۰

"ابراہیم بن عبدہ کو میری طرف سے معین کیا گیا ہے۔ اے اسحاق! تم ابراہیم بن عبدہ کی جانب میرے بھیجے گئے نمائندے ہو' تا کہ وہ ان باتوں پر عمل کریں جو میں نے محمد بن موسیٰ نیشاپوری کے نام ارسال کردہ خط میں لکھی ہیں۔ اسی طرح تمہاری اور تمہارے شہر میں رہنے والے تمام لوگوں کی ذمے داری ہے کہ وہ اس خط کے مضمون پر عمل کریں۔ ابراہیم پر' تم پر اور ہمارے تمام دوستوں پر سلام ہو۔ جو لوگ اس خط کو پڑھیں اور جو لوگ تمہارے علاقے میں رہتے ہیں اور منحرف نہیں ہوئے ہیں' انہیں چاہیے کہ وہ سب ہمارے حقوق ابراہیم کو ادا کریں' تا کہ وہ بھی انہیں رازی تک پہنچا دیں اور یہ میرا حکم ہے۔ اے اسحاق! میرا یہ خط بلال کو' جس پر ہمیں اعتماد ہے اور اسی طرح محمودی کو بھی پڑھ کر سنانا اور جب بغداد پہنچو' تو اسے دہقان کو بھی' جو ہمارا وکیل اور قابلِ اعتماد فرد ہے اور جو ہمارے دوستوں سے رقم وصول کرتا ہے' اور اسی طرح ہماری ولایت رکھنے والے جس فرد سے بھی ملو' اسے سنانا۔ اور اگر کوئی اس خط کی نسخہ برداری (copy) کرنا چاہے' تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ بہر حال سوائے شیطان کے' جو تمہارا مخالف ہے' اسے کسی سے نہ چھپانا۔ جب تک عمری سے ملاقات نہ ہو شہر سے باہر نہ جانا۔ جو کچھ ہمارے دوستوں سے ہم تک پہنچتا ہے' وہ چند واسطوں کے بعد آخر کار اس تک پہنچتا ہے اور پھر ہم تک پہنچ جاتا ہے۔" (۱)

اس خط سے وکالتی نظام کے کئی اہم نکات سامنے آتے ہیں: اس کا موضوع خصوصاً مالی واجبات کی ادائیگی کے سلسلے میں شیعوں کی رہنمائی ہے' جو ان کے تحفظ کے لیے بنیادی ضرورت کی حامل ہے۔ وکلا کا تعارف اور ان کی پوزیشن کو مضبوط بنانے کے لیے ان پر مکمل اعتماد کا اظہار' ان نکات میں شامل ہے' جو ان توقیعات (تحریروں) میں واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ علاوہ ازایں' یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مختلف علاقوں کے وکلا کے درمیان سلسلۂ مراتب بھی پایا جاتا تھا جس کے توسط سے امامؑ کے مالی حقوق آپ کے اصلی وکیل تک پہنچا کرتے تھے۔ کبھی کچھ افراد کی وکالت کے بارے میں شبہات پیدا ہو جاتے تھے' تو ایسے مواقع پر امامؑ مجبوراً دوسرے خطوط ارسال فرما کر ان شبہات کا خاتمہ کرتے تھے۔

ان روابط کا قیام اور ان کی حفاظت' فکری اور اجتماعی زندگی کے میدانوں میں شیعوں کے احیا کا باعث تھی اور شیعوں کے درمیان نظم کو کمزور نہ پڑنے دیتی تھی' اور نتیجے کے طور پر انہیں سنی معاشرے میں ہضم اور تحلیل (Disolve) ہو جانے سے محفوظ رکھتی تھی؛ جس کا امکان بہر حال ہر اقلیت کے لیے ہوتا ہے۔ یہ وہی نظام تھا جس سے ملتے جلتے نظام سے ایک زمانے میں عباسیوں نے اور ایک طویل مدت تک اسماعیلیوں نے استفادہ کیا۔ قدرتی طور پر اس کا حاصل سوائے اس کے

۱۔ بعد میں اس شخص کے لالچ اور دوسرے انحرافات کی وجہ سے امامؑ نے اسے اپنے سے علیحدہ کر دیا تھا۔

کچھ اور نہ تھا کہ شیعوں کو ان خطرات سے محفوظ رکھا جائے جو انہیں جڑ سے ختم کر دینے کا باعث بن سکتے تھے۔

مزید یہ کہ رابطے کے اس دقیق نظام سے استفادہ تمام چھوٹی بڑی اور بکھری ہوئی شیعہ آبادیوں میں حدیث اور کلام کی صورت میں شیعہ تعلیمات کے پھیلاؤ کا موجب بنا' جیسے کش اور سمرقند۔ گو کہ یہ علاقے ائمہؑ کی جائے اقامت سے بہت دور تھے' اس کے باوجود وہاں کئی عظیم شیعہ علما پیدا ہوئے۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا' اس بکھری ہوئی آبادی کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل کو ائمۂ ہدیٰ کی جانب سے بھیجے جانے والے افراد اور آپ حضرات کے برمحل اور گرانقدر خطوط حل کر دیا کرتے تھے۔ خط و کتابت کے ذریعے یہ رابطہ' اس دور میں بہت وسیع اور ایک جدید صورت شمار ہوتا تھا۔ اگرچہ عموماً مختلف وجوہات کی بنا پر اکثر خطوط ضائع ہو چکے ہیں لیکن باقی رہ جانے والے خطوط کی مقدار اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ شیعوں اور ائمہؑ کے درمیان بہت زیادہ خطوط کا تبادلہ ہوتا تھا۔

ابو الادیان کہتے ہیں: میں امام حسن عسکری علیہ السلام کا خادم تھا۔ میرا کام امامؑ کے خطوط کو مختلف شہروں میں لے جانا تھا۔ آخری بار جب میں آپ کا خط لے کر روانہ ہوا' تو امامؑ مریض تھے۔ انہوں نے مجھے خط دیا اور فرمایا: اسے مدائن لے جاؤ' پندرہ دن بعد جب تم واپس آؤ گے' تو مجھے غسل و کفن کی حالت میں پاؤ گے۔ میں نے خط لیا اور جب واپس آیا تو میں نے وہی حالت دیکھی جو امامؑ نے فرمائی تھی۔ (۱) یہ روایت بتاتی ہے کہ خطوط لانے اور لے جانے کے لیے امامؑ کے پاس مخصوص قاصد تھے۔

محمد بن حسین بن عباد کہتے ہیں: ابو محمد حسن بن علی عسکری علیہما السلام بروز جمعہ' آٹھ ربیع الاوّل' سن ۲۶۰ ہجری کو پورے ۲۹ سال کی عمر میں نماز فجر کی ادائیگی کے دوران دنیا سے رخصت ہوئے۔ امامؑ نے اسی رات مدینہ کے لیے کئی خطوط تحریر کیے تھے۔ (۲) آج بھی ہمارے پاس قم اور آبہ (آوہ) کے لوگوں کے نام امام حسن عسکری علیہ السلام کا ایک خط موجود ہے۔ (۳) ابن شہر آشوب لکھتے ہیں: امام حسن عسکریؑ نے ایک خط علی بن حسن بن بابویہ کے نام لکھا ہے۔ البتہ اس بات کے پیش نظر کہ ابن بابویہ کی رحلت سن ۳۲۹ ہجری میں ہوگئی تھی یہ امر بعید نظر آتا ہے۔ لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اُن کا حسین بن روح کے توسط سے امامِ زمانہؑ کے ساتھ خط و کتابت کا رابطہ تھا۔ (۴)

شیعوں کی طرف سے امامؑ کی خدمت میں افراد بھیج کر' آپ سے براہِ راست ملاقات کرنا' امامؑ اور ان کے چاہنے

۱۔ بحار الانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۳۳۲' از کمال الدین۔ ج ۲۔ ص ۱۳۹

۲۔ بحار الانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۳۳۱' از کمال الدین۔ ج ۲۔ ص ۱۳۹۔ ۱۵۰

۳۔ مناقب ابن شہر آشوب۔ ج ۳۔ ص ۴۲۵' بحار الانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۳۱۷

۴۔ رجال النجاشی۔ ص ۱۸۴

والوں کے درمیان موجود رابطے کی ایک اور صورت تھی۔ جعفر بن شریف جرجانی سے نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں خانۂ کعبہ کی زیارت سے مشرف ہوا اور سامرا میں امام حسن عسکری علیہ السلام کی خدمت میں پہنچا۔ میں چاہتا تھا کہ جو اموال دوستوں نے میرے ذریعے سے امامؑ کو بھجوائے ہیں' وہ آپ کے حوالے کروں۔ اس سے پہلے کہ میں آپ سے یہ پوچھتا کہ وہ اموال کس کے سپرد کروں' آپ نے فرمایا: جو کچھ اپنے ساتھ لائے ہو' وہ میرے خادم مبارک کو دے دو۔(۱)

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ ایک علوی "فضل" کی تلاش میں جبل کے علاقے کی طرف روانہ ہوا۔ حلوان میں اس کی ایک شخص سے ملاقات ہوئی' تو اس شخص نے اس سے پوچھا: کہاں سے آرہے ہو؟ بولا: سامرا سے۔ پوچھا: کیا تم سامرا میں فلاں آدمی کے گھر سے واقف ہو؟ جواب دیا: ہاں۔ اس شخص نے پوچھا: کیا حسن بن علیؑ کی کوئی خبر ہے؟ کہنے لگا: نہیں۔ اس شخص نے کہا: تم کس لیے آئے ہو؟ اس نے کہا روپیہ کمانے کے لیے۔ اس شخص نے اس سے کہا: میں تمہیں پچاس دینار دوں گا' تم مجھے سامرا میں حسن بن علیؑ کے پاس لے چلو۔ علوی نے اس پیشکش کو قبول کر لیا اور اس شخص کو سامرا میں امامؑ کی خدمت میں لے آیا۔ اس شخص نے امامؑ کی خدمت میں چار ہزار دینار پیش کیے۔(۲)

امامؑ کے ایک اور وکیل' (اہواز کے رہنے والے) ابراہیم بن مہزیار اہوازی تھے۔(۳) کشی کی نقل کے مطابق' وہ دراصل ہندیجان کے رہنے والے تھے۔

قم وہ بنیادی ترین شہر تھا جس نے بڑی تعداد میں شیعوں کو اپنے دامن میں جگہ دی ہوئی تھی اور امام جعفر صادقؑ کے زمانے سے ائمۂ معصومین علیہم السلام کے ساتھ مسلسل اور منظم رابطے میں تھا۔ قم کی وہ شیعہ شخصیات جو امام حسن عسکریؑ کے ساتھ رابطے میں تھیں' اُن میں احمد بن اسحاق بن عبداللہ اشعری بھی شامل تھے' جنہیں نجاشی نے "كَانَ وَافِدَ الْقُمِّيِّينَ" (امامؑ اور قمیوں کے درمیان واسطہ) کہا ہے اور تصریح کی ہے کہ احمد' امام حسن عسکریؑ کے خاص اصحاب میں شامل تھے۔(۴) امام حسن عسکریؑ نے احمد بن اسحاق کو ایک قابلِ اعتماد فرد قرار دیا ہے۔(۵) بعض دوسرے منابع میں اُن کا ذکر امامؑ کے وکیل کے طور پر کیا گیا ہے۔(۶)

۱۔ کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۴۲۷

۲۔ کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۴۲۶

۳۔ قاموس الرجال۔ ج ۱۔ ص ۳۱۹

۴۔ رجال النجاشی۔ ص ۶۶' الفہرست طوسی۔ ص ۲۶

۵۔ رجال کشی۔ ص ۵۵۷۔ حدیث ۱۰۵۳

۶۔ تنقیح المقال۔ ج ۱۔ ص ۵۰

امام حسن عسکری علیہ السلام کے ایک اہم ترین وکیل، جو بعد میں غیبت صغریٰ کے دوران نائب خاص کے مرتبے پر پہنچے، عثمان بن سعید تھے، جو سمان کے لقب سے معروف تھے۔ وہ امام علی نقیؑ اور امام حسن عسکریؑ کی جانب سے وکالت کے لیے منتخب کیے گئے تھے۔ شیخ طوسی اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، ان کے لقب سمان کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: وہ تیل کی تجارت کیا کرتے تھے، تاکہ اس کی آڑ میں اپنا اصل کام (وکالت) انجام دے سکیں۔ جب شیعوں کی جانب سے ان کے پاس کوئی مال آتا، تو وہ اسے تیل کے ڈبوں میں چھپا کر خفیہ طور پر امام حسن عسکریؑ کی خدمت میں بھیج دیتے تھے۔(۱)

اس سے پہلے جو روایت ہم نے پیش کی تھی، اس میں اس بات کی تصریح کی گئی تھی کہ عثمان بن سعید وکلا میں سب سے بلند مرتبے پر فائز تھے اور جو مسائل یا اموال امام تک پہنچانے ہوتے تھے، وہ انہی کے توسط سے امامؑ تک پہنچتے تھے۔(۲) امام علی نقیؑ اور امام حسن عسکریؑ نے بارہا ان پر اپنے اعتماد کی تاکید کی ہے۔(۳) یمن کے کچھ شیعہ امامؑ کی زیارت اور ساتھ ہی اپنے مالی واجبات کی ادائیگی کے لیے سامرا آئے ہوئے تھے۔ اس موقع پر امامؑ نے عثمان بن سعید کو بھیجا، تاکہ جو مال وہ لائے ہیں، وہ اُن سے وصول کرلیں۔(۴)

ائمہ معصومین علیہم السلام کے وکلا کے حوالے سے جو بات انتہائی گہرے دکھ اور افسوس کے ساتھ باعث تعجب ہے، وہ یہ ہے کہ گاہ بگاہ آپ کے وکلا کے درمیان ایسے افراد بھی ملتے ہیں، جو شیعوں کی طرف سے انہیں امامؑ کی خدمت میں پہنچانے کے لیے دیے جانے والے مال کو دیکھ کر بہک جاتے تھے اور اس میں خیانت کے مرتکب ہوتے تھے۔ اسی لیے امامؑ کی جانب سے ان پر لعنت ملامت کی جاتی تھی، اور وہ بارگاہِ امامؑ سے دھتکار دیے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ یہاں تک پہنچتا تھا کہ بعض وکلا امامؑ کی رحلت کے بعد ان کی وفات کا انکار کیا کرتے تھے، تاکہ یہ بہانہ کرکے وہ اپنے پاس موجود رقم اگلے امامؑ کو ادا کرنے سے انکار کرسکیں۔ بنیادی طور پر یہی بات شیعوں کے درمیان مختلف فرقوں کی پیدائش کے اہم ترین اسباب میں شمار ہوتی ہے۔

عروۃ بن یحییٰ، جو دہقان کے نام سے معروف تھا (جس کی اس سے پہلے اسحاق بن اسماعیل نیشاپوری کے نام امامؑ کے خط میں توثیق کی گئی تھی اور جو بغداد میں امامؑ کا وکیل تھا) اُس نے جب امام علی نقیؑ اور امام حسن عسکریؑ کی طرف جھوٹی باتوں

۱۔ الغیبہ طوسی۔ ص ۲۱۴۔ ۲۱۵

۲۔ رجال کشی۔ ص ۵۷۵۔ حدیث ۱۰۸۸

۳۔ الغیبہ طوسی۔ ص ۲۱۵

۴۔ الغیبہ طوسی۔ ص ۲۱۶

کو منسوب کیا' تو امام حسن عسکریؑ نے اس پر لعنت کی اور اس کو خود سے دور کر دیا۔ آپ نے شیعوں کو بھی یہ حکم دیا کہ وہ اس پر لعنت اور نفرین کریں اور اس سے دوری اختیار کریں' کیونکہ اس نے امامؑ کے خزانچی کی حیثیت سے' خزانے سے کچھ مال غبن کیا تھا' اور اسے اپنا مال قرار دے دیا تھا۔(۱)

وہ توقیعات (تحریریں) جو ان مواقع پر امامؑ کی جانب سے صادر ہوتی تھیں' وہ انتہائی سرعت کے ساتھ شیعوں کے درمیان عام ہو جاتی تھیں اور اس طرح وہ سب اس توقیع کے مضمون سے آگاہ ہو جاتے تھے' اور جس شخص کی طرف امامؑ نے اشارہ فرمایا ہوتا تھا' شیعہ معاشرہ یکلخت اسے مسترد کر دیتا تھا۔ اسی طرح احمد بن ہلال (جس نے ایک عمر ائمہؑ کی مصاحبت میں گزاری تھی اور بعد میں امام حسن عسکری علیہ السلام اور اس کے درمیان تعلقات میں بعض مشکلات پیش آ گئی تھیں) کے خلاف امامؑ کی طرف سے توقیع صادر ہوئی۔ امامؑ نے عراق میں اپنے وکلا کو لکھا: اِحذَروا الصُّوفِیَّ المُتَصَنِّعَ. (ریاکار صوفی سے دور رہو)۔(۲) بعض شیعہ احمد پر بہت زیادہ اعتماد کرتے تھے' لہٰذا انہوں نے اس توقیع کے بارے میں شک وشبہے کا اظہار کیا' اس پر امامؑ نے شیعوں کے نام ایک مفصل خط تحریر فرمایا اور اس کی خطاؤں کا ذکر کیا جن میں سے اہم ترین امامؑ کے احکامات کی پروا نہ کرنا اور آپ کے مقابل اپنی رائے پر عمل کرنا تھی۔(۳) اسی طرح امامؑ نے بعض مواقع پر ان لوگوں سے اپنی شدید ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے جو بلا وجہ وکلا کے کام میں مداخلت کرتے تھے (مثال کے طور پر) ان کی جانب سے روپے پیسے کی ادائیگیوں پر تنقید کرتے تھے' اور ایسے افراد کو اُن معاملات میں مداخلت سے باز رہنے کی تاکید کی ہے جن کا اُن سے کوئی تعلق نہیں۔(۴)

اس طرح سے وکالت (نمائندگی) کے نظام نے' امامؑ اور شیعوں کے درمیان رابطہ پیدا کرنے' خصوصاً شرعی رقومات (جن کا ایک بڑا حصہ ضرورت مند شیعوں پر صرف ہوتا تھا) کی وصولی کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا' جیسا کہ امامؑ کے حالاتِ زندگی بیان کرنے والی کتب میں اس قسم کی امدادوں کی جانب بارہا اشارہ ہوا ہے۔(۵)

واقفیوں' غالیوں اور شیعوں میں پھوٹنے والے دوسرے تمام انحرافی افکار کی سرائیت کو (خاص طور پر امامؑ کے محلِ اقامت سے دور کے علاقوں میں زندگی بسر کرنے والے شیعوں میں) وکالت کے اسی طریقے سے کنٹرول اور دور کیا جاتا تھا

۱۔ رجال کشی۔ ص ۵۷۳۔ حدیث ۱۰۸۶

۲۔ رجال کشی۔ ص ۵۳۵۔ ۵۳۶۔ حدیث ۱۰۲۰' دیکھئے: تنقیح المقال۔ ج ۱۔ ص ۹۹۔ ۱۰۰' رجال النجاشی۔ ص ۶۰' الغیبہ طوسی۔ ص ۲۱۴

۳۔ رجال کشی۔ ص ۵۳۵۔ ۵۳۶

۴۔ الغیبہ طوسی۔ ص ۲۱۳' بحار الانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۳۰۶

۵۔ دیکھئے: کافی۔ ج ۱۔ ص ۵۰۷۔ ۵۰۸' اعیان الشیعہ۔ ج ۳۔ جز ۲۔ ص ۱۸۶

اور اس نظام نے شیعہ فکر کی حفاظت اور اس میں انحرافی افکار کی آمیزش کی روک تھام میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔

اصحابِ امامؑ اور شیعہ فکری میراث کی حفاظت

اصحاب ائمہؑ کے درمیان احادیث کے مجموعوں کی تحریر کا سلسلہ بہت طولانی ہے' بالخصوص امام جعفر صادق علیہ السلام کے دور کے بعد سے شیعہ سماج کے بکثرت افراد نے یہ عزم کیا کہ ائمہؑ کی روایات جمع کر کے انہیں دور و نزدیک کے ممالک میں مقیم شیعوں کے لیے بھیجا جائے' تاکہ وہ بھی اہلِ بیتؑ کے افکار و نظریات سے رہنمائی حاصل کر سکیں۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ ان مؤلفین کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور زیادہ اور تفصیل کے ساتھ کتابیں تالیف ہوئیں۔

امام حسن عسکری علیہ السلام کے دور کے ایک مؤلف' حسین ابن اشکیب سمرقندی ہیں۔ یہ کچھ عرصے تک قم میں حضرت معصومہؑ کے روضۂ مبارک کے خادم بھی رہے تھے' اس کے بعد سمرقند چلے گئے اور وہیں اقامت اختیار کر لی۔ انہیں سمرقند کے حوزۂ علمیہ (جو تیسری صدی ہجری کے اواخر اور چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں بھرپور طور سے ابھرا تھا) اور قم کے شیعوں کے درمیان موجود رابطے کی ایک کڑی ہونا چاہیے۔ نجاشی نے ان کی تالیفات کا ذکر کیا ہے' جن میں ایک کتاب "الرد علی الزیدیہ" کے نام سے بھی نظر آتی ہے۔(۱) اس دور میں زیدیوں کی سرگرمیوں کی شدت اور ان کی طرف سے رونما ہونے والی پے در پے شورشوں کو دیکھتے ہوئے اس بات کا امکان پایا جاتا تھا کہ بعض شیعہ ان سے متاثر ہو جائیں' اس لیے اس قسم کی کتابیں' جن میں اکثر ائمہ معصومینؑ سے صادر ہونے والی روایات سے استناد کیا جاتا تھا' اس قسم کے انحرافات کو کنٹرول کرنے کا بہترین ذریعہ تھیں۔

اسی دور کی ایک اور نمایاں شخصیت محمد بن خالد برقی ہیں' جو کئی کتابوں کے مؤلف ہیں احمد (وفات ۲۷۴ یا ۲۸۰ ہجری) جو ان کے فرزند تھے' انہیں اپنے والد سے زیادہ شہرت نصیب ہوئی' وہ امام علی نقیؑ اور امام حسن عسکریؑ کے زمانے کے ایک شیعہ تھے' جن کی کتاب "المحاسن" مختلف دینی معارف جیسے اخلاق' تفسیر وغیرہ پر ائمہؑ کی احادیث کا ایک دائرۃ المعارف (encyclopaedia) تھی۔(۲) ان کی اور بھی تالیفات تھیں' جن میں سے ایک کتاب "التبیان فی اخبار البلدان" ہے' جس کا موضوع دنیائے اسلام کا تاریخی جغرافیہ ہے۔

امام حسن عسکری علیہ السلام کے ایک اور صحابی حسن بن موسیٰ خشاب کئی کتابوں کے مؤلف تھے' جن میں ایک کتاب'

۱۔ رجال النجاشی۔ ص ۴۴۔ ش ۸۸

۲۔ بدقسمتی سے اس کتاب کا بعض تھوڑا سا حصہ باقی بچا ہے' جو دو جلدوں میں مرحوم محدث ارموی کی تصحیح کے ساتھ (اور ابھی حال ہی میں سید مہدی رجائی کی تصحیح کے ساتھ) شائع ہوا ہے۔

''الرد علی الواقفیہ'' بھی شامل ہے۔(۱) اس زمانے میں واقفہ جو مشکلات پیدا کیا کرتے تھے' ان کو دیکھتے ہوئے اس کتاب کی اہمیت بالکل واضح ہے۔ مختلف فرقوں کی رد میں یا فقہی موضوعات پر لکھی جانے والی کتابوں کے علاوہ' تاریخ اسلام پر بھی کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ امام حسن عسکریؑ کے ایک صحابی محمد بن علی بن حمزہ نے کئی کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔(۲) ان کے بارے میں عیاشی لکھتے ہیں: مختلف موضوعات پر ائمہؑ کی کوئی کتاب ایسی نہ تھی جو ان کے پاس موجود نہ ہو۔(۳) یہ روایت بتاتی ہے کہ ائمہؑ کی روایات' حتیٰ ان کے مکتوبات بھی اصحاب ائمہؑ کے پاس موجود تھے' اور یہ بات ایک قابلِ قدر علمی تحریک کی موجودگی کی علامت ہے' جو خود شیعہ علوم کا ایک بنیادی ستون شمار ہوتی ہے۔ اس دور تک جو اصول [احادیث کے مجموعے] تالیف ہوئے' وہ حدیث کے بڑے مجموعوں جیسے ''کافی'' ''من لایحضر الفقیہ'' اور حدیث پر شیخ صدوق اور شیخ طوسی کی دوسری کتابوں کی تالیف کی بنیاد بنے۔ کیونکہ یہ کتابیں اصحاب ائمہؑ کی انہی تالیفات سے تدوین کی گئی ہیں۔ بعض مصادر (sources) میں تحریر ہوا ہے کہ ائمہؑ کے اصحاب ان میں سے بعض کتابوں (اصولِ اولیہ) کے بارے میں ائمہؑ کی رائے بھی لیتے تھے۔ ان میں سے ایک اس سے پہلے بیان کردہ روایت کے مطابق بورق بوشجانی تھے' جنہوں نے اپنی کتاب ''یوم ولیلہ'' امام حسن عسکریؑ کی خدمت میں پیش کی تھی اور اس کے بارے میں امامؑ کی رائے طلب کی تھی۔(۴)

امام حسن عسکری علیہ السلام کے اصحاب میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جنہوں نے سائنسی موضوعات پر کتابیں تالیف کی تھیں۔ نجاشی نے امام حسن عسکریؑ کے ایک خاص صحابی کے عنوان سے احمد بن ابراہیم بن اسماعیل کا ذکر کرنے کے بعد ان کی کتابوں کو شمار کرتے ہوئے ان کی ایک کتاب ''اسماء الجبال والمیاہ والاودیہ'' (۵) کا نام بھی لیا ہے' جو علمِ جغرافیہ کے بارے میں ان کی ایک تالیف تھی۔

امام حسن عسکریؑ اور یعقوب بن اسحاق کندی

ابن شہر آشوب (وفات ۵۸۸ ہجری) ابو القاسم کوفی کی تالیف ''التبدیل (۶) [والتحریف]'' سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: یعقوب بن اسحاق کندی (۱۸۵ ہجری تا تقریباً ۲۵۲ ہجری) اپنے زمانے کا عرب فلسفی تھا' جس نے (بزعم خویش)

۱۔ رجال النجاشی۔ ص ۳۱

۲۔ رجال طوسی۔ ص ۴۲۳' رجال النجاشی۔ ص ۱۸۲

۳۔ رجال کشی۔ ص ۵۳۰۔ حدیث ۱۰۱۴

۴۔ رجال کشی۔ ص ۵۳۸۔ حدیث ۱۰۲۳

۵۔ رجال النجاشی۔ ص ۶۷۔۶۸

۶۔ دیکھئے: الذریعہ۔ ج ۳۔ ص ۳۱۱

تناقضات قرآن کے بارے میں ایک کتاب لکھنے کا آغاز کیا اور کسی کو اپنے اس کام میں شامل نہیں کیا۔ ایک دن اس کا ایک شاگرد امام حسن عسکریؑ کی خدمت میں آ پہنچا۔ امامؑ نے اس سے فرمایا: کیا تمہارے درمیان کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو اپنے استاد کو قرآن کے بارے میں اس قسم کی چیز لکھنے سے باز رکھ سکے؟ اس نے کہا: ہم اس کے شاگرد ہیں' ہم کس طرح اس بارے میں یا کسی اور چیز کے بارے میں اس پر اعتراض کر سکتے ہیں؟ امامؑ نے اس سے فرمایا: اگر میں تم سے ایک بات کہوں' تو کیا تم وہ کندی سے کہہ دو گے؟ اس شخص نے کہا: ہاں۔ امامؑ نے اس سے فرمایا: اس کے پاس جاؤ اور اس سے پوچھو: کیا آپ کے خیال میں یہ ممکن ہے کہ قرآن کی مراد وہ معنی نہ ہوں جو آپ سمجھے اور قبول کیے ہوئے ہیں؟ وہ کہے گا: بالکل ممکن ہے۔ کیونکہ وہ سمجھدار آدمی ہے۔ پس پھر اس سے کہنا: آپ کو کیا معلوم؟ جب یہ بات ممکن ہے' تو ہو سکتا ہے کہ قرآن کی مراد وہ معنی نہ ہوں جو آپ سمجھے ہیں اور ہو سکتا ہے اس کے الفاظ کسی اور معنی میں استعمال ہوئے ہوں۔ وہ شخص کندی کے پاس گیا اور امامؑ کی باتیں اس تک پہنچا دیں۔ کندی جو کلام کے بارے میں اس بات کو ممکن اور عقلی اعتبار سے جائز سمجھتا تھا' کہنے لگا: میں قسم کھاتا ہوں کہ جو کچھ تم نے کہا ہے وہ تمہارے الفاظ نہیں ہیں۔ اس شخص نے کہا: یہ ابو محمد عسکریؑ نے کہا تھا۔ کندی نے کہا: میں اسی وقت ان کے پاس جاؤں گا کہ یہ کام اس خاندان کے سوا کوئی اور کر بھی نہیں سکتا۔ پھر اس نے آگ منگوائی اور جو کچھ لکھا تھا وہ سب جلا کر راکھ کر دیا۔(۱)

مذکورہ بالا روایت صرف ابن شہر آشوب سے نقل ہوئی ہے' اور اس کے راوی ابو القاسم کوفی پر بھی غلو کا الزام لگایا گیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس روایت کا سیاق کچھ اس قسم کا ہے کہ کندی کو اسلام پر یقین نہ رکھنے والے کی حد تک لے جاتا ہے اور یہ اس کے بارے میں ناروا بات ہے۔ علاوہ ازیں اس روایت کی تائید کرنے والی کوئی مستقل دلیل بھی موجود نہیں ہے۔(۲) دوسرے یہ کہ اگر کندی کی وفات سن ۲۵۲ ہجری میں واقع ہوئی ہو' تو اس زمانے میں امام حسن عسکریؑ شیعوں کے امامؑ کے طور پر سامنے نہیں آئے تھے۔

اس آخری بات کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ کندی کی یہ تاریخ وفات امکانی ہے اور اس بارے میں کوئی بالکل صحیح اطلاع ہمارے پاس نہیں ہے۔ قدرتی طور پر اس بات کا امکان ہے کہ کندی کی وفات مذکورہ تاریخ کے چند سال بعد واقع ہوئی ہو۔ دوسرے یہ کہ ضروری نہیں ہے کہ امام حسن عسکریؑ نے اپنے دور امامت ہی میں کندی سے یہ بات کہی ہو۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ یہ روایت کندی کو اسلام سے انکار تک لے جاتی ہے' تو اس کے بارے میں یہ کہا

۱۔ مناقب ابن شہر آشوب۔ ج ۴۔ ص ۴۲۴' بحار الانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۳۱۱

۲۔ تاریخ الغیبۃ الصغریٰ۔ ص ۱۹۵۔۱۹۶

جاسکتا ہے کہ اس روایت کا لازمی مفہوم نہیں نکلتا' کیونکہ ممکن ہے کہ عقل کی طرف حد سے زیادہ رجحان رکھنے کی وجہ سے کندی کے اندر سوالات اور اعتراضات نے جنم لیا ہو اور اس نے اِس بارے میں کسی کو آگاہ بھی نہ کیا ہو۔ اس کے باوجود یہ بات اپنی جگہ قطعی ہے کہ اس روایت کا راوی بالکل قابلِ اعتماد نہیں ہے۔(۱)

امام حسن عسکریؑ سے منسوب کتابیں

الف: تفسیر

تفسیر کی ایک کتاب کو امام حسن عسکریؑ سے منسوب کیا جاتا ہے' جو سورۂ حمد اور سورۂ بقرہ کے کچھ حصے کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ چوتھی صدی ہجری میں اس کتاب کے سامنے آنے کے بعد سے آج تک علمی محافل میں اس کے بارے میں مختلف آراء کا اظہار کیا گیا ہے۔

کچھ علما نے اس کتاب کو امامؑ کے آثار میں سے قرار دیا ہے اور اس سے بعض احادیث بھی نقل کی ہیں۔ بعض دوسروں نے اسے جعلی سمجھا ہے اور اسے علمی طور پر غیر معتبر سمجھتے ہیں۔ ان میں سے بعض آراء کا تعلق کتاب کی سند سے ہے' کیونکہ دو افراد یوسف بن محمد بن زیاد اور محمد بن سیار اس کی روایات کی بنیاد ہیں اور ان کے اور شیخ صدوق کے درمیان واسطہ محمد بن قاسم استر آبادی نامی ایک شخص ہے۔ اگرچہ ابن شہر آشوب کی روایت کی بنیاد پر حسن بن خالد برقی بھی اس تفسیر کے راویوں میں شامل ہے۔(۲) خالد بن حسن کے سوا مذکورہ بالا دوسرے افراد کی شخصیتوں کے بارے میں پائے جانے والے ابہام اور اشکالات کی وجہ سے نیز اس کی سند کی کیفیت اور اس بات نے کہ آیا یہ دو افراد خود کتاب کے راوی ہیں یا ان

۱۔ ہنری تھامس "کندی" کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے: اگر فلسفہ اشیا کی حقیقت جاننے کا علم ہے' تو اس صورت میں دین اور فلسفے کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔۔۔ فلسفہ حقیقت ہے اور دین بھی علمِ حقیقت ہے۔ لہٰذا جس طرح دینی حقائق سے روگردانی کرنے والا شخص کافر قرار دیا جاتا ہے' اسی طرح فلسفے کا منکر بھی' اس بنیاد پر کہ وہ حقیقت کا منکر ہے' کافر شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود فلسفی نظریات اور قرآنی آیات کے درمیان تناقضات موجود ہیں۔ ان تناقضات کو کس طرح سے حل کیا جائے؟ کندی نے اس مشکل کے حل کے لیے بھی ایک راہِ حل پیش کی ہے اور وہ تاویل ہے۔ کندی کے خیال میں عربی الفاظ کے ایک حقیقی معنی ہوتے ہیں اور ایک مجازی معنی۔ اس لیے بہت سے مقامات پر قرآنی آیات کی ان کے مجازی معنی میں تاویل کرنی چاہیے۔ اس صورت میں فلسفی نظریات اور دینی افکار کے درمیان کوئی اختلاف نہیں رہے گا۔ (بزرگانِ فلسفہ۔ ہنری تھامس۔ ترجمہ فریدون بدرہ ای۔ تہران۔ کیھان۔ ص ۳۲۷۔ ۳۲۸)

۲۔ معالم العلماء۔ ص ۳۴۔ عبارت اس طرح ہے: حسن بن خالد برقی' اخو محمد بن خالد' من کتبه: تفسیر العسکری من املاء الامام علیه السلام' مائة وعشرون مجلدة.

کے باپ' اس کتاب کے امامؑ سے منسوب ہونے کی صحت کو مخدوش کر دیا ہے۔(۱) ان میں سے بعض اعتراضات کے مختلف جوابات دیے گئے ہیں۔

اس کتاب پر ایک اور اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اس میں ایسی روایات نقل ہوئی ہیں جو اپنے مضمون کے اعتبار سے انتہائی حد تک قابلِ اعتراض ہیں اور بسا اوقات ان میں ایسی خرافات کی آمیزش ہے جنہیں کسی صورت امامؑ سے نسبت نہیں دی جاسکتی۔ جیسا کہ علامہ تستری نے ایسے چالیس مقامات کی جانب اشارہ کیا ہے۔(۲) اس تفسیر کے مخالفین میں ابن الغضائری' علامہ حلی' علامہ بلاغی اور آیت اللہ خوئی کا نام لیا جاسکتا ہے۔

اس کے مقابل کچھ دوسرے لوگ سختی کے ساتھ اس کتاب کی امامؑ سے نسبت کے حامی ہیں۔ ان میں شیخ صدوق' کتاب الاحتجاج کے مؤلف طبرسی' کرکی' مجلسی اوّل' مجلسی دوم اور شیخ حرِ عاملی کے نام لیے جاسکتے ہیں۔(۳) ان ناموں سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ عام طور پر اخباری رجحان رکھنے والوں نے اس کتاب کو قبول کیا ہے اور عقلی رجحان رکھنے والوں نے اسے مسترد کیا ہے۔

بعض دوسرے علما نے درمیانی راہ اختیار کی ہے اور رائے دی ہے کہ اس تفسیر پر دوسری کتابوں کی طرح تنقید کی جاسکتی ہے اور اس کی صحیح روایات کو قبول کیا جاسکتا ہے۔ علامہ بلاغی نے ایک رسالے میں اس پر تنقید کرتے ہوئے ان مقامات کی نشاندہی کی ہے جن کی بنا پر اس تفسیر کا اعتبار ختم ہو جاتا ہے۔(۴)

اہم بات یہ ہے کہ قدیم شیعہ مفسرین علی بن ابراہیم قمی اور محمد بن مسعود عیاشی میں سے کسی نے بھی اپنی تفسیر میں اس کتاب کی ایک روایت کو بھی نقل نہیں کیا ہے۔ یہ مسئلہ اس کتاب کے بارے میں رائے قائم کرنے میں فیصلہ کن کردار ادا کرسکتا ہے۔

ب: کتاب المقنعہ

ایک اور کتاب جسے ابن شہر آشوب نے امامؑ سے منسوب کیا ہے' وہ ''کتاب المقنعہ'' ہے۔ یہ کتاب مناقب کے

۱۔ رسالة حول التفسير المنسوب الى الامام العسكرى عليه السلام. علامہ محمد جواد بلاغی۔ تحقیق رضا استادی۔ مجلۂ نور علم۔ دورۂ دوم۔ ش ا۔ ص ۳۹

۲۔ الاخبار الدخیلہ۔ ج ا۔ ص ۳۹

۳۔ ''بحثی دربارۂ تفسیر امام حسن عسکریؑ'' رضا استادی۔ مجلۂ نور علم۔ دورۂ دوم۔ ش ا۔ ص ۱۱۸۔۱۳۵

۴۔ رسالة حول التفسير المنسوب الى الامام العسكرى عليه السلام. ص ۱۳۷۔۱۵۱

ایک نسخے میں "کتاب المنقبہ" کے نام سے درج ہوئی ہے اور صاحب الذریعہ نے بھی اس کا ذکر اسی عنوان سے کیا ہے۔ لیکن مناقب کی طبع نجف اور قم میں اس کا نام "رسالۃ المقنعہ" ذکر ہوا ہے۔ بیاضی نے بھی اس کا ذکر "کتاب المقنعہ" یا "رسالۃ المقنعہ" کے نام سے کیا ہے۔(۱) ان دونوں منابع میں کہا گیا ہے کہ یہ کتاب علم حلال وحرام پر مشتمل ہے۔ لہٰذا یہ مناقب کا موضوع نہیں ہو سکتی اور یوں "المنقبہ" کے عنوان میں لکھنے میں کوئی غلطی ہوئی ہوگی۔

اس مسئلے کے حل کے لیے تین مختلف روایات کو ایک ساتھ رکھ کر دیکھنا ہوگا:

۱۔ نجاشی نے رجاء بن یحییٰ عبرتائی کاتب کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: رجاء امام علی نقیؑ سے روایت کیا کرتا تھا' اور وہ ابوالحسن کے گھر میں کام کرنے والے اپنے باپ کے ذریعے سے' آپ کے در دولت تک پہنچا' اور آپ کے خاص اصحاب میں شامل ہو گیا۔ اس نے آپ سے "المقنعہ فی ابواب الشریعہ" نامی ایک کتاب نقل کی ہے۔ ابوالمفضل شیبانی نے بھی اسے رجاء بن یحییٰ سے روایت کیا ہے۔(۲)

۲۔ ابن طاؤس نے لکھا ہے: علی بن عبدالواحد نے اپنی سند سے رجاء بن یحییٰ سے نقل کیا ہے کہ ابو محمد حسن بن علی صاحب العسکر کے گھر سے سن ۲۵۵ ہجری میں ہمیں ایک کتاب ملی۔ اس کے بعد اس نے "الرسالۃ المقنعہ" کو پورا نقل کیا ہے۔(۳)

۳۔ ابن شہر آشوب کہتے ہیں کہ مذکورہ کتاب سن ۲۵۵ ہجری میں تالیف ہوئی ہے۔(۴)

ان تین روایات کی بنیاد پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ کتاب کا مضمون امام علی نقیؑ سے لیا گیا ہے جو رجاء بن یحییٰ کے توسط سے روایت کیا گیا ہے اور یہ سن ۲۵۵ ہجری میں امام حسن عسکریؑ (جو اس زمانے میں شیعوں کی امامت کے منصب پر فائز تھے) کے گھر سے برآمد ہوئی ہے۔

قابلِ توجہ نکتہ: مناقب میں تصریح کی گئی ہے کہ کتاب "المقنعہ" کے آغاز میں یہ تحریر ہے: **اخبرنی علی بن محمد بن موسیٰ** (جو امام علی نقیؑ ہیں)۔ ابوالمفضل نے سن ۳۱۴ ہجری میں اسے رجاء بن یحییٰ سے نقل کیا ہے اور رجاء کا انتقال بھی اسی سال ہوا ہے۔(۵)

۱۔ مناقب۔ ج ۴۔ ص ۴۲۴' الصراط المستقیم۔ ج ۲۔ ص ۱۷۵' الذریعہ۔ ج ۲۳۔ ص ۱۳۹' اعیان الشیعہ۔ ج ۲۔ جز ۲۔ ص ۱۸۸

۲۔ رجال النجاشی۔ ص ۱۱۹

۳۔ اقبال الاعمال۔ ج ۱۔ ص ۸۰

۴۔ مناقب۔ ج ۴۔ ص ۴۲۴

۵۔ مکارم الاخلاق۔ ص ۴۵۸' الذریعہ۔ ج ۲۲۔ ص ۴۳۱' توابع الرواۃ۔ ص ۳۱

امام حسن عسکریؑ کی رحلت

ہم بیان کر چکے ہیں کہ امام حسن عسکری علیہ السلام کی رحلت ۸ ربیع الاوّل سن ۲۶۰ ہجری کو ہوئی تھی۔ اس بارے میں کہ کیا امامؑ کی موت طبیعی تھی یا آپ کو شہید کیا گیا ہے' اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ اگرچہ طبری کی روایت کے مطابق بعض شیعہ علما امام جعفر صادقؑ کے اس قول کو بنیاد بنا کر' جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ: "ما منا الا مسموم او مقتول." (ہم میں سے ہر ایک یا مسموم ہے یا مقتول) ان اماموں کے بارے میں بھی جن کی شہادت کے بارے میں کوئی روایت نہیں ملتی' اسی بات کے قائل ہیں کہ آپ حضرات کو ظالم حکمرانوں نے قتل کیا ہے۔(۱)

البتہ امام حسن عسکری علیہ السلام کی شہادت کے بارے میں ایک روایت چھٹی صدی ہجری کے تاریخی منابع (sources) میں سے ایک میں موجود ہے۔(۲) اس بنیاد پر آپ کی شہادت ایک پوری طرح ممکن امر ہے۔ آپ کی گرفتاریاں اور وہ خطرہ جو مستقل طور پر آپ کی زندگی کو حکومت کی جانب سے لاحق تھا اور یہ کہ آپ ایک مخالف سیاسی شخصیت شمار ہوتے تھے' نیز آپ کا جوانی میں فوت ہونا' یہ سب باتیں آپ کی شہادت کی تائید میں پیش کی جاسکتی ہیں۔

کیونکہ امامؑ سامرا کی جانی پہچانی شخصیت تھے' اس لیے آپ کی شہادت کے موقع پر پورے شہر کی فضا پر غم واندوہ کی فضا طاری ہوگئی۔ احمد بن عبید اللہ نے ایک روایت میں' جس کا کچھ حصہ پہلے بھی نقل ہو چکا ہے' اس منظر کو اس طرح بیان کیا ہے:

> "جب امام حسن عسکری علیہ السلام نے رحلت فرمائی' تو ہر طرف سے گریہ وزاری کی آوازیں آنے لگیں۔ لوگ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے: ابن الرضا رحلت کر گئے۔ پھر آپ کو تدفین کے لیے تیار کر دیا گیا۔ بازار بند ہوگیا۔ میرا باپ (جو معتمد عباسی کا وزیر تھا) بنی ہاشم' فوج' عدلیہ کی شخصیات' معتمد اور عوام سب نے جنازے کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ اس روز سامرا میں ایک قیامت بپا تھی۔"(۳)

امام حسن عسکری علیہ السلام اور آپ کے والدِ ماجد کی سامرا میں کم از کم سترہ سال موجودگی کے دوران نہ صرف عوام الناس آپ کی طرف مائل ہو گئے تھے' بلکہ بہت سے شیعہ بھی اس شہر میں جمع ہو گئے تھے۔ ایسی حالت میں قدرتی بات تھی کہ آپ کی وفات کے وقت پورا سامرا سوگ میں ڈوب جائے اور فرزندِ رسولؐ کی جدائی پر بیتابی کا مظاہرہ کرے اور عزا کی تصویر بن جائے۔
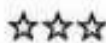
☆☆☆

۱۔ بحار الانوار۔ ج ۵۰۔ ص ۲۳۸' اعلام الوریٰ۔ ص ۳۳۹' الفصول المہمہ۔ ص ۲۹۰

۲۔ مجمل التواریخ والقصص۔ ص ۳۵۸ "اور کہا جاتا ہے کہ انہیں زہر دیا گیا۔"

۳۔ کمال الدین۔ ج ۱۔ ص ۴۳' نور الابصار۔ ص ۱۶۸' الغیبہ طوسی۔ ص ۱۳۲

علیہ السلام

امام مہدی

"وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ."

"اور ہم نے ذکر کے بعد زبور میں بھی لکھ دیا ہے کہ ہماری زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہی ہوں گے۔"

(سورۂ انبیاء ۲۱۔ آیت ۱۰۵)

امامِ زمانہؑ کی ولادت

حضرت صاحب العصر، امامِ زمان (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) خدا کی بارہویں حجت ہیں۔ بعض روایات کے مطابق قرآنِ کریم میں "بقیۃ اللّٰہ" (۱) کے عنوان سے آپ کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

آپ کے روزِ ولادت کے بارے میں تاریخی منابع (sources) میں کوئی خاص اختلاف دکھائی نہیں دیتا، کیونکہ تقریباً تمام ہی مورخین اور صاحب رائے شخصیات نے پندرہ شعبان کو آپ کے روزِ ولادت کے طور پر قبول کیا ہوا ہے۔ البتہ آپ کی ولادت کے سال کے بارے میں اختلافِ رائے پائے جاتے ہیں۔ بدیہی ہے کہ یہ اختلاف آپ کی ولادت کو خفیہ رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

شیخ مفید نے آپ کی ولادت کا سال سن ۲۵۵ ہجری بیان کیا ہے۔ اس طرح اپنے والدِ گرامی کی رحلت کے وقت آپ صرف پانچ برس کے تھے۔ (۲) ثقۃ الاسلام کلینی نے بھی آپ کی ولادت کا سال سن ۲۵۵ ہجری ہی کو مانا ہے۔ (۳) امام حسن عسکری علیہ السلام کی پھوپھی حکیمہ خاتون سے ایک روایت بھی امامِ زمانہؑ کی ولادت اسی سال بیان کرتی ہے۔ (۴) بعض فرقوں میں (جن کا ذکر اشعری نے کیا ہے) کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اس بات کے قائل تھے کہ آپ کی ولادت امام حسن عسکریؑ کی شہادت کے آٹھ ماہ بعد ہوئی۔ (۵) یہ رائے نہ صرف یہ کہ متعدد روایات سے متصادم ہے، بلکہ یہ اس شیعہ عقیدے کے بھی برخلاف ہے جس کے مطابق "زمین کسی صورت حجتِ خدا سے خالی نہیں رہ سکتی۔"

۱۔ سورۂ ہود ۱۱۔ آیت ۸۶

۲۔ ارشاد۔ ص ۳۳۶

۳۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۵۱۴

۴۔ الغیبہ۔ ص ۱۴۱۔ ۱۴۳

۵۔ المقالات والفرق۔ ص ۱۱۴

ایک اور قول یہ ہے کہ آپ کی ولادت سن ۲۵۸ ہجری میں ہوئی ہے۔(۱) اثبات الوصیہ میں غیبت صغریٰ کے آغاز کے وقت آپ کی عمر چار سال سات مہینے قرار دی گئی ہے' جس کے مطابق آپ کی ولادت سن ۲۵۶ ہجری میں ہونی چاہیے۔(۲) ایک اور نقل کے مطابق امام زمانہؑ کی ولادت سن ۲۵۷ میں ہوئی ہے۔(۳)

اس سب کے باوجود یہ بات واضح ہے کہ سن ۲۵۵ ہجری' جو امام محمد تقی علیہ السلام کی دختر جناب حکیمہ خاتون کی روایت پر مبنی ہے' اسی کو زیادہ تر مؤرخین کی تائید حاصل ہے۔ اس روایت میں امام حسن عسکری علیہ السلام کی پھوپھی حکیمہ خاتون کی زبانی امام زمانہؑ کے تولد کے بارے میں نسبتاً دقیق تفصیلات بیان ہوئی ہیں۔

حکیمہ خاتون کہتی ہیں: امام حسن عسکریؑ نے کسی کو بھیج کر مجھے کہلوایا کہ آپ آج افطار کے وقت ہمارے یہاں آجایئے گا' تاکہ خدا آپ کو اپنی حجت اور میرے بعد ہونے والے خلیفہ کی زیارت سے شاد کرے۔ اس رات میں امام حسن عسکریؑ کے گھر گئی' اور اس بچے کی ولادت ہونے تک وہیں رہی۔(۴)

حکیمہ خاتون ایک اور روایت میں کہتی ہیں: اس کے اگلے روز میں دوبارہ اپنے بھتیجے کے گھر پہنچی' لیکن مجھے وہ بچہ نظر نہیں آیا' جب میں نے اپنے بھتیجے سے اس کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا: میں نے اسے اسی کے حوالے کر دیا ہے جس کے حوالے مادرِ موسیٰ نے اپنے بیٹے کو کیا تھا۔ سات دن بعد میں امامؑ کے حکم پر ان کے گھر گئی اور اپنے بھتیجے کو اس حال میں دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے کو آغوش میں لیے بیٹھے تھے اور اس سے کہہ رہے تھے: بیٹا! بات کرو۔ اس بچے کے لب کھلے اور پھر اس آیت کی تلاوت فرمائی: وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا ...(۵)

ڈاکٹر جاسم حسین امامِ زمانہؑ کی ولادت سے متعلق روایات میں موجود بعض نکات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ولادت کے بعد آپ کو دشمنوں سے مخفی رکھنے کے لیے مدینہ لے جایا گیا تھا۔(۶)

امام مہدیؑ کی والدہ

آپ کی والدۂ ماجدہ کے نام کے بارے میں مختلف روایات موجود ہیں۔ شیخ طوسی کی نقل کردہ ایک روایت میں آپ

۱۔ کشف الغمہ۔ ج۲۔ ص۴۳۷

۲۔ اثبات الوصیہ۔ ص۲۳۱

۳۔ دیکھئے: تاریخ اہل بیت۔ حاشیہ ص۸۸

۴۔ الغیبہ طوسی۔ ص۱۴۱۔۱۴۲

۵۔ سورۂ قصص ۲۸۔ آیت ۵' اور دیکھئے: الغیبہ۔ ص۱۴۳

۶۔ تاریخ سیاسی غیبت امام دوازدہم۔ ص۱۴۴

کی والدہ کا نام "ریحانہ" لیا گیا ہے، لیکن پھر فوراً ہی اضافہ کیا ہے کہ انہیں نرجس، صیقل اور سوسن بھی کہا جاتا تھا۔(۱) بعض لوگوں کے خیال میں، جنہیں شہید نے لفظ "قیل" (کہا گیا ہے) سے تعبیر کیا ہے، آپ کی والدہ "مریم بنت زید العلویہ" تھیں۔(۲) حکیمہ خاتون کی روایت میں، جو امام زمانہؑ کی ولادت کے بارے میں مشہور ترین اور مستند ترین روایت ہے، آپ کی والدہ کا نام "نرجس" آیا ہے۔(۳)

بعض محققین کا خیال ہے کہ ممکن ہے اُن کا اصل نام نرجس ہی ہو، اور صیقل کے سوا دوسرے نام انہیں امام محمد تقی علیہ السلام کی دختر حکیمہ خاتون نے دیے ہوں۔ اس زمانے میں لوگ کنیزوں کو ان کی تعریف کرنے کے لیے مختلف ناموں سے پکارا کرتے تھے۔ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ نرجس، ریحانہ اور سوسن، سب کے سب پھولوں کے نام ہیں۔(۴)

امامِ زمانہؑ کی ولادت کے بارے میں چند نکات

بغداد اور سامرا پر حاکم عباسی حکمراں، امام حسن عسکری علیہ السلام کے معمولاتِ زندگی کو زیرِ نظر رکھنے کے لیے جس تگ و دو کا مظاہرہ کرتے تھے، وہ امامِ زمانہؑ کی ولادت جیسے اہم مسئلے کو خفیہ رکھنے کا جواز فراہم کرتی ہے۔ اسی طرح اس سے یہ نکتہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس زمانے میں امام کی غیبت کا مسئلہ زبانوں پر رہتا تھا اور بنی عباس اس کوشش میں تھے کہ ہر ممکن طریقے سے شیعوں پر امامت کا راستہ بند کر دیں۔

شیخ مفید امام زمانہؑ کے حالاتِ زندگی کے آغاز میں لکھتے ہیں: اس دور کی مشکلات اور خدا کی آخری حجت کو تلاش کرنے کے لیے حکمرانوں کی شدید خواہش اور مسلسل کوششوں کی وجہ سے آپ کی ولادت سب پر پوشیدہ رہی۔(۵)

اس سے پہلے بھی ائمہ علیہم السلام کی روایات میں امام مہدیؑ کی پر اسرار ولادت کی جانب اشارہ کیا جا چکا تھا، حتیٰ یہ بات آپ کی پہچان کا ایک ذریعہ قرار دی گئی تھی۔(۶)

امام حسن عسکری علیہ السلام کے فرزند کی تلاش کے لیے بنی عباس کی مسلسل کوششوں کی روئیداد زیادہ تر تاریخی ماخذ میں بیان ہوئی ہے۔ احمد بن عبیداللہ بن خاقان، جو قم کے خراج کا ذمے دار تھا، اُس نے امام حسن عسکریؑ کے گھر کی تلاشی لیے

۱۔ الغیبہ۔ ص ۲۳۱، تاریخ اہل بیتؑ۔ ص ۱۲۵

۲۔ بحار الانوار۔ ج ۵۱۔ ص ۲۸

۳۔ بحار الانوار۔ ج ۵۱۔ ص ۲

۴۔ تاریخ سیاسی غیبت امام دوازدہم۔ ص ۱۱۴

۵۔ ارشاد۔ ص ۳۳۵

۶۔ منتخب الاثر۔ ص ۲۸۷۔ ۲۸۸

جانے کے بارے میں ذکر کیا ہے۔ اس روایت کا متن درج ذیل ہے:

''جب امام حسن عسکری (علیہ السلام) کی بیماری کی خبر پھیلی' تو خلیفہ نے میرے والد کو بلوایا۔ وہ دارالخلافہ گئے اور وہاں سے پانچ اہل کاروں کے ساتھ واپس آئے جو خلیفہ کے معتمد تھے۔ میرے باپ نے انہیں حکم دیا کہ وہ امامؑ کے گھر کو اپنی نگرانی میں رکھیں اور ایک ایک لمحے کی معلومات رکھیں۔ اس کے بعد بعض طبیبوں کو بلایا اور انہیں حکم دیا کہ دن رات امامؑ کے سرہانے موجود رہیں۔

دو یا تین دن کے بعد انہیں بتایا گیا کہ امامؑ مزید کمزور ہو گئے ہیں۔ اس نے حکم دیا کہ طبیب ان کی دیکھ بھال میں اضافہ کر دیں۔ اس کے بعد وہ قاضی القضاۃ کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ ایسے دس افراد جن پر اسے دینداری اور پرہیزگاری کے لحاظ سے مکمل اعتماد ہو امام حسن عسکریؑ کے گھر بھیجے' جو دن رات وہاں موجود رہیں۔

یہ صورتحال امامؑ کی وفات تک جاری رہی۔ اس کے بعد خلیفہ کے حکم پر امامؑ کے گھر کی مکمل تلاشی لی گئی اور ہر چیز کو سربمہر (seal) کر دیا گیا۔ اس کے بعد آپ کے فرزند کی تلاش کے لیے طویل کوششوں کا آغاز کیا گیا۔ حتیٰ امامؑ کی کنیزوں کی بھی نگرانی کی گئی' تاکہ معلوم ہو سکے کہ ان میں سے کون حاملہ ہے۔ ان میں سے ایک کنیز' جس کے حاملہ ہونے کا امکان نظر آتا تھا' اسے ایک کمرے میں رکھ کر اس کی نگرانی کی گئی' یہاں تک کہ اس کے حاملہ نہ ہونے کا یقین ہو گیا۔ اس کے بعد امامؑ کی میراث کو ان کی والدہ اور بھائی میں تقسیم کر دیا گیا۔

اسی روایت میں' مذکورہ تفصیل کے بعد' اپنے بھائی کی جانشینی کی لیے جعفر کی موقع پرستی کی جانب بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ جس میں سے یہ بھی ہے کہ اُس نے عبیداللہ بن خاقان سے خواہش ظاہر کی کہ امام حسن عسکریؑ کے جانشین کی حیثیت سے اس کا اعلان کرے اور اسے متعارف کرائے لیکن اس نے جعفر کی اس خواہش کو مسترد کر دیا۔''(۱)

ایک اور روایت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ قم کے بعض شیعہ' جنہیں امام حسن عسکریؑ کی رحلت کا علم نہ تھا' شرعی رقوم کی ادائیگی کے لیے سامرا آئے۔ سامرا پہنچنے کے بعد' کچھ لوگ انہیں جعفر کے پاس لے گئے۔ قمیوں نے پہلے

۱۔ کافی۔ ج۱۔ ص۵۰۵۔۵۰۶' الغیبہ۔ ص۱۳۱۔۱۳۲' کمال الدین۔ ج۱۔ ص۴۱۔۴۲' اعلام الوریٰ۔ ص۳۵۹' ارشاد۔ ص۳۳۰' کشف الغمہ۔ ج۱۔ ص۴۰۷

جعفر کا امتحان لینے کی ٹھانی۔ چنانچہ انہوں نے جعفر سے پوچھا کہ کیا وہ اس رقم کی بابت بتا سکتا ہے جو وہ لوگ ساتھ لے کر آئے ہیں؟ جعفر نے اپنی لاعلمی کا اظہار کرنے کے بعد کہا: صرف خدا علمِ غیب سے آگاہ ہوتا ہے۔ لہٰذا قمیوں نے اسے رقم ادا نہیں کی۔ اس موقع پر ایک شخص نے انہیں ایک گھر کا پتا بتایا اور جب وہاں انہیں ان کی لائی ہوئی رقم کی بابت بتا دیا گیا' تب انہوں نے وہ رقم درست جواب دینے والے کے حوالے کر دی۔ جعفر نے یہ بات معتمد کو بتائی جس کے بعد معتمد کے حکم پر امامؑ کے گھر کی اور ان کے ہمسایوں کے گھر کی نئے سرے سے تلاشی لی گئی۔

اس موقع پر ایک کنیز کو گرفتار کیا گیا' جس کا نام صقیل تھا اور جس نے لگتا ہے کہ امامِ زمانہؑ کی جان بچانے کے لیے اپنے حاملہ ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ اسے دو سال تک زیرِ نظر رکھا گیا۔ یہاں تک کہ جب اس کے حاملہ نہ ہونے کا یقین ہو گیا' تو اسے رہا کر دیا گیا۔(۱)

یقینی طور پر حکومت کی جانب سے اس قدر شدید حساسیت' اور جعفر کے اقدامات کی وجہ یہ تھی کہ وہ امامِ زمانہؑ پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ' ان کے ہاتھ نہ آنے کی صورت میں کم از کم اس بات کا اعلان کر سکیں کہ امام حسن عسکریؑ کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ قابلِ اعتماد افراد کو امامؑ کے گھر پر مامور کرنے کا مقصد بھی یہی تھا' تاکہ اس بارے میں اپنے ادعا پر حقیقت کا رنگ بھر دیں اور شیعوں کو تتر بتر اور منتشر کر دیں۔ جیسا کہ اسی روایت میں آگے چل کر شیخ طوسی سے نقل کیا گیا ہے کہ: مذکورہ قابلِ اعتماد افراد' جو امامؑ کے گھر پر موجود تھے' انہوں نے گواہی دی کہ امامؑ کا انتقال ہو گیا ہے۔(۲) حقیقت یہ ہے کہ اس حوالے سے پہلے سے طے شدہ اور بھرپور منصوبہ بندی کے مطابق امامؑ کی ولادت کا معاملہ لوگوں کی' حتیٰ اکثر شیعوں کی نظروں سے بھی یکسر اوجھل رہا اور اس کے باوجود کوئی خاص مشکل بھی پیش نہ آئی۔

بعض شیعوں کا امامِ زمانہؑ کی ولادت سے آگاہ ہونا

البتہ ایسا نہ تھا کہ کسی کو بھی اس آخری حجتِ خدا کی ولادت کا علم نہ ہو' یا ولادت کے بعد کسی نے اُن کو دیکھا نہ ہو۔ بعض قابلِ اعتماد شیعہ اور امامؑ کے چند وکلا نے اور جو لوگ امامؑ کے گھر میں خدمت میں مشغول رہتے تھے' وہ سب اس بات سے آگاہ تھے۔ شیخ مفید نے امام حسن عسکری علیہ السلام کے چند قریبی اصحاب' خدام اور دوستوں سے روایت کی ہے کہ ان کو امامِ زمانہؑ کی زیارت کی توفیق حاصل ہوئی ہے۔ ان میں محمد بن اسماعیل بن موسیٰ بن جعفر' حکیمہ خاتون بنت امام محمد تقیؑ' ابوعلی بن مطہر' عمرو اہوازی اور امامؑ کے گھر کا خادم ابونصر طریف شامل ہیں۔(۳)

۱۔ کمال الدین۔ ص ۴۷۳۔۴۷۴

۲۔ الغیبہ طوسی۔ ص ۱۳۲

۳۔ ارشاد۔ ص ۳۵۰۔۳۵۱' اور دیکھئے: ینابیع المودہ۔ ص ۴۶۱

اس طرح امام حسن عسکری علیہ السلام نے چند افراد کو اپنے بیٹے کی زیارت کرائی اور اپنے جانشین کے طور پر ان کا تعارف کرایا۔

شیخ کلینی نے ضو بن علی عجلی سے روایت کی ہے کہ فارس سے تعلق رکھنے والے ایک ایرانی نے ان سے کہا تھا: میں امام حسن عسکریؑ کے گھر میں خدمت کے لیے سامرا گیا' اور امامؑ نے اپنے گھر کا سامان خریدنے کی ذمے داری میرے سپرد کی۔ وہ کہتا ہے: ایک دن امام حسن عسکریؑ نے مجھے اپنے بیٹے کو دکھایا اور فرمایا: "ھٰذا صاحبکم." وہ کہتا ہے کہ اس کے بعد سے میں نے امام حسن عسکریؑ کی رحلت تک اس بچے کو نہیں دیکھا۔ وہ مزید کہتا ہے: جب اُس نے امام کو دیکھا تھا' تو اس وقت ان کی عمر تقریباً دو سال تھی۔ (۱)

شاید امام حسن عسکری علیہ السلام کے اصحاب نے امام زمانہؑ کا اہم ترین دیدار اس وقت کیا ہوگا جب آپ کے وکیل خاص محمد بن عثمان عمری چالیس دوسرے افراد کے ساتھ امام حسن عسکریؑ کی خدمت میں موجود تھے۔ آپ نے ان لوگوں کو اپنا بیٹا دکھایا اور فرمایا:

"ھٰذا امامکم من بعدی و خلیفتی علیکم' أطیعوہ و لا تتفرقوا من بعدی فی أدیانکم لتھلکوا' أما انکم لا ترونہ بعد یومکم ھٰذا."

"یہ میرے بعد تمہارا امام اور تمہارے درمیان میرا جانشین ہے۔ اس کی اطاعت کرنا اور میرے بعد اپنے دین میں اختلاف نہ کرنا' کہ اس صورت میں تم ہلاک ہو جاؤ گے اور اس کے بعد اسے ہرگز نہیں دیکھو گے۔"

اس روایت میں آگے چل کر آیا ہے کہ اس کے چند دن بعد امام حسن عسکریؑ رحلت فرما گئے۔ (۲)

اسی روایت کو شیخ طوسی نے بھی نقل کیا ہے اور ان چالیس افراد میں موجود بعض شیعہ شخصیات کا نام لیا ہے۔ ان لوگوں میں علی بن بلال' احمد بن ہلال' محمد بن معاویہ بن حکیم اور حسن بن ایوب بن نوح شامل ہیں۔ (۳)

اس زمانے میں امام زمانہؑ کا نام لینا ممنوع تھا' اور امام حسن عسکریؑ تاکید فرماتے تھے کہ آپ کو صرف "الحجہ من آل محمد" کے عنوان سے پکارا جائے۔ (۴)

۱۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۵۱۴

۲۔ منتخب الاثر۔ ص ۳۵۵' از کمال الدین' اور دیکھیے: ینابیع المودہ۔ ص ۴۶۰' الغیبہ طوسی۔ ص ۲۱۷

۳۔ منتخب الاثر۔ ص ۳۵۵

۴۔ کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۴۴۹

امام حسن عسکریؑ کی رحلت کے بعد پیدا ہونے والے اختلافات

عباسی خلفا نے شیعہ ائمہؑ کے لیے جو سیاسی مشکلات پیدا کی تھیں اور اُن پر جن سختیوں کو روا رکھا ہوا تھا' وہ ائمہؑ اور شیعوں کے درمیان منظم رابطے میں خلل کا باعث بنی تھیں۔ یہ مشکل بالخصوص ایک امامؑ کی رحلت اور اس کی جگہ دوسرے امامؑ کے منصب سنبھالنے کے درمیانی فاصلے میں پیدا ہوتی تھی۔ بعض شیعہ اپنے امامؑ کی پہچان میں شک وشبہ کا شکار ہو جاتے تھے' اور یوں نئے پیدا ہونے والے فرقوں اور ناروا افکار اور نظریات کے زوال پذیر ہونے اور نئے امامؑ کے پوری طرح جمنے میں کافی عرصہ لگ جاتا تھا۔ کبھی کبھی یہ مشکلات اس قدر شدید ہوتی تھیں کہ شیعوں کا ایک پورا گروہ ان سے کاملاً جدا ہو جاتا تھا۔ جیسا کہ واقفہ' فطحیہ اور حتیٰ اسماعیلیہ کی پیدائش اور ان کی جانب سے مزاحمت کو اس کی مثال قرار دیا جا سکتا ہے۔

امام حسن عسکری علیہ السلام کی شہادت کے بعد یہ مشکل دوگنا ہو گئی تھی۔ کیونکہ ایک طرف تو امام زمانہؑ کی ولادت' نگہداشت اور وصایت مکمل طور پر خفیہ رکھی گئی تھی اور دوسری طرف آپ کی غیبت کا دور بھی شروع ہو گیا تھا۔ اس وقت امام زمانہؑ کی امامت کی مستحکم ترین دلیل ایک طرف احادیث کا وہ عظیم خزانہ تھا جو اصلِ مہدویت اور اس کے بعض لوازم کا ذکر کرتا تھا اور دوسری طرف رابطے کے مستحکم نظام کا وجود اور امام حسن عسکریؑ اور شیعوں کے درمیان بعض مشہور شیعوں کی موجودگی تھی۔

امام حسن عسکری علیہ السلام کی شہادت کے بعد شیعوں کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کی کیفیت ''المقالات والفرق'' اور نوبختی کی ''فرق الشیعہ'' نامی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ شیخ مفید نے نوبختی کی باتوں کو تلخیص اور کچھ اضافوں کے ساتھ نقل کر کے اُن کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے۔ اشعری نے پندرہ فرقوں کا نام لیا ہے' جن میں سے ہر ایک امام حسن عسکریؑ کی جانشینی کے بارے میں اپنے مخصوص عقیدے پر کاربند تھا۔ یہاں تک کہ بعض لوگ گیارہویں امامؑ کی امامت کے بارے میں بھی شک وشبہے کا شکار ہو گئے تھے' کیونکہ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ امامؑ کا کوئی بیٹا نہیں رہا ہے۔ لہٰذا یہ لوگ خود امام حسن عسکریؑ کی امامت میں بھی شک کرنے لگے تھے۔ نوبختی نے ابتدا میں چار فرقوں کے نام لیے ہیں' لیکن ان میں سے ہر فرقے کی تشریح کے دوران تیرہ فرقوں کا ذکر کیا ہے۔ شیخ مفید نے نوبختی سے نقل کرتے ہوئے چودہ فرقوں کا نام لیا ہے۔ (۱)

شیخ نے ان فرقوں کے اصل نظریات کو (جن کو مجموعی طور پر ہم بعد میں بیان کریں گے) نقل کیا ہے اور روایات (۲) سے استناد اور کلامی دلائل دیتے ہوئے ان پر تنقید کی ہے۔ ان فرقوں کو مجموعاً بیان کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ

۱۔ دیکھئے: المقالات والفرق۔ ص ۱۰۲۔ ۱۱۶' فرق الشیعہ۔ ص ۹۶۔ ۱۱۲' الفصول المختار۔ ص ۲۵۸۔ ۲۶۶

۲۔ الغیبہ طوسی۔ ص ۱۳۰۔ ۱۳۵

اصولی لحاظ سے یہ درج ذیل پانچ گروہوں میں تقسیم ہوتے ہیں:

۱۔ وہ لوگ جو امام حسن عسکری علیہ السلام کی رحلت کے قائل نہیں' اور انہیں "مہدیٔ آلِ محمدؐ" کے طور پر زندہ سمجھتے ہیں اور "واقفہ" (یعنی وہ لوگ جنہوں نے امام حسن عسکریؑ پر توقف کر لیا) کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ (۱)

۲۔ وہ لوگ جو امام حسن عسکری علیہ السلام کی رحلت کے بعد ان کے بھائی جعفر بن علی نقیؑ کے پیچھے چل پڑے' اور اس دلیل کی بنا پر کہ انہوں نے امام حسن عسکریؑ کے فرزند کو نہیں دیکھا' جعفر (جنہیں کذاب کا لقب دیا گیا ہے) کی امامت کو قبول کر لیا۔ ان میں سے کچھ لوگ اسے گیارہویں امامؑ کا جانشین اور کچھ اسے گیارہواں امام مانتے تھے۔ ان لوگوں کو "جعفریہ" کہا گیا۔

۳۔ کچھ لوگ امام حسن عسکری علیہ السلام کی امامت کا انکار کرنے کے بعد امام علی نقیؑ کے بڑے بیٹے "محمدؒ" کی طرف مائل ہو گئے' جو اپنے والد کی زندگی ہی میں دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ یہ لوگ "محمدیہ" کہلائے۔

۴۔ کچھ لوگ اس بات کے قائل تھے کہ جس طرح رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا' اسی طرح امام حسن عسکری علیہ السلام کی رحلت کے بعد بھی کوئی امام نہیں ہو گا۔

۵۔ ایک اور فرقہ' امامیہ تھا' جو شیعوں کی تقریباً اکثریت پر مشتمل تھا اور جو امام مہدی علیہ السلام کی امامت کا معتقد تھا۔ یہی وہ گروہ تھا جس نے امامی شیعوں کی اصولی رہنمائی کا ذمہ لیا۔ (۲)

ان فرقوں میں سے واحد فرقہ جسے بعض مشہور شخصیات کی حمایت حاصل ہوئی' وہ جعفر بن علی کی امامت کا قائل فرقہ تھا۔ نوبختی نے لکھا ہے کہ کوفہ کے ایک متکلم (علمِ عقائد کے ماہر) علی بن الطاحی نے اس فرقے کی حمایت کی اور مشہور غالی فارس بن حاتم قزوینی کی بہن بھی اس کام میں اس کی مددگار تھی۔ (۳) اس سے پہلے بھی فارس بن حاتم (جس کی امام علی نقیؑ نے سخت ملامت کی تھی) کے ماننے والوں نے امام حسن عسکریؑ کے زمانے ہی میں جعفر کی امامت کا مسئلہ اٹھایا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ امام علی نقیؑ کے بیٹے محمد جو در اصل امام تھے انہوں نے اپنے بعد امامت کے لیے جعفر کو منتخب کیا تھا۔

جو بات یقینی ہے' وہ یہ ہے کہ فرقۂ جعفریہ (یعنی جعفر بن امام علی نقیؑ کی امامت کا طرفدار) امامیہ کا سخت ترین مخالف تھا اور شیعوں کے درمیان بھی غالی وغیرہ اُس کے حمایتی تھے۔ اس کی مثال علی طاحن (۱) اور علی بن حسن بن فضال ہیں' جو

۱۔ دیکھئے: کمال الدین۔ ص ۴۰

۲۔ تاریخ سیاسی غیبت امام دوازدہم۔ ص ۱۰۳۔۱۱۲

۳۔ فرق الشیعہ۔ ص ۹۹

پہلے فطحی مذہب سے تعلق رکھتے تھے اور بعد میں اسی تسلسل میں جعفر کی امامت کے معتقد ہو گئے تھے۔ شاید یہ کہا جا سکے کہ زیدیہ اور اسماعیلیہ کے بعد جعفریہ شیعوں میں پیدا ہونے والا ایک بڑا فرقہ تھا' اگرچہ بغداد میں آل نوبخت کے شیعہ امامیہ کی جانب رجحان کی وجہ سے اسے دوام حاصل نہ ہوا' البتہ یہ دوسرے علاقوں میں محدود طور پر زندہ رہا۔

شیخ مفید نے زور دے کر کہا ہے کہ جب وہ سن ۳۷۳ ہجری میں اس کتاب کی تدوین میں مشغول تھے' تو مذکورہ بالا چار فرقوں میں سے صرف امامیہ اپنا وجود برقرار رکھ سکے تھے۔ وہ ان کی توصیف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"امامیہ' تعداد کے لحاظ سے اور علمی اعتبار سے شیعوں کا سب سے بڑا فرقہ ہے۔ بڑی تعداد میں علم کلام کے ماہرین' صالحین' عبادت گزار' فقہا' علمائے حدیث' ادبا اور شعرا اس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ "وجه الامامية و رؤساء والمعتمد عليهم في الديانة." (امامیہ کی چوٹی کی شخصیات دین کے معاملے میں بزرگ اور معتمد) ہیں۔" (۲)

شیخ طوسی نے بھی جعفریہ مذہب کے کسی پیروکار کی نشاندہی نہیں کی ہے۔ (۳) اس کے باوجود شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ دور دراز کے بعض علاقوں میں جعفر کے کچھ ماننے والے باقی بچے ہیں' جنہوں نے آج تک اپنے مذہب کو محفوظ رکھا ہوا ہے۔ (۴)

وہ مذہب جو خلافت اسلامی کے مرکز میں اپنی حفاظت کرتا رہا' اور اس نے اپنی واضح موجودگی کو برقرار رکھا' وہ مذہب امامیہ تھا کہ جو امام حسن عسکریؑ کے فرزند امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف پر ایمان لایا اور شیعوں کی ایک بڑی تعداد کی ایک معین راہ پر ہدایت کرتا رہا۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ جو اقدامات اٹھائے گئے تھے اور اس عظیم تبدیلی کے لیے جو مقدمات پہلے سے ترتیب دے لیے گئے تھے' وہ اتنے گہرے اور مستحکم تھے کہ ان کی وجہ سے شیعوں کی اکثریت گروہ بندی اور فرقہ سازی سے محفوظ رہی۔

بہر صورت یہ بات مدنظر رہے کہ شیعوں کے درمیان غیبت کا مسئلہ یوں ہی سادگی سے حل نہیں ہوا تھا' اور تیسری صدی کے آخری عشرے اور چوتھی صدی میں بھی شیعوں کے درمیان اس حوالے سے کافی مشکلات پیش آئی تھیں۔ اسی بات نے شیعہ علما کو غیبت کے مسئلے پر تفصیل کے ساتھ کتب لکھنے اور اس کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرنے پر آمادہ کیا۔ اس

۱۔ امامی شیعہ جعفر کے پیروکاروں کو اسی مناسبت سے طاحیہ کہتے تھے۔
۲۔ الفصول المختار۔ ص ۲۶۱
۳۔ الغیبہ۔ ص ۲۱۸
۴۔ اس مسئلے کی تفصیل جاننے کے لیے دیکھیے: مکتب در فرآیند تکامل۔ ص ۱۲۰۔ ۱۲۱

دور کے بہت سے علما نے اس موضوع پر کتابیں تحریر کی ہیں۔

محمد بن بحر رُہنی نے چوتھی صدی ہجری کے اختتام پر اس بارے میں ایک کتاب لکھی۔(۱) شیخ صدوق نے سب سے بڑے شیعہ محدث کی حیثیت سے چوتھی صدی ہجری کے نصف میں اس بارے میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کا جواب دینے کے لیے گرانقدر کتاب ''کمال الدین و تمام النعمہ'' لکھی۔ اسی صدی میں محمد بن ابراہیم نعمانی نے کتاب ''الغیبہ'' ان شبہات کو دور کرنے کے لیے تحریر کی جو شیعوں کے درمیان پیدا ہو گئے تھے اور ان کے درمیان اختلافات کا سبب بن گئے تھے۔(۲) انہوں نے ان شکوک وشبہات کا سبب مسئلۂ غیبت کے بارے میں موجود کثیر روایات پر عدم توجہ کو قرار دیا ہے اور پھر خود اس جانب توجہ دلانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ نعمانی، جنہوں نے چوتھی صدی ہجری کے پہلے نصف میں کتاب الغیبہ تحریر کی، ان کے علاوہ بھی بہت سے دوسرے علما نے اس موضوع پر کتابیں لکھی ہیں۔ انہی میں چوتھی صدی ہجری سے تعلق رکھنے والے شیخ مفید ہیں، جنہوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں، جن کے نام نجاشی نے اپنی کتاب رجال میں ذکر کیے ہیں۔(۳)

شیخ مفید کے بعد اس بارے میں اہم ترین کتاب شیخ طوسی کی ''کتاب الغیبہ'' ہے، جو انہوں نے سن ۴۴۷ ہجری میں تحریر کی۔ وقت گزرنے کے ساتھ قدرتی طور پر غیبت کے مسئلے کے جائزے، اس کی تفہیم اور اس کے بارے میں پیدا ہونے والے ضمنی سوالات کے جواب دینے کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس ہوا کرتی تھی۔(۴) شیخ طوسی نے اس ضرورت کی جانب اپنی کتاب کے آغاز میں اشارہ کیا ہے۔(۵)

پیغمبر اسلامؐ اور ائمۂ اہلِ بیتؑ کا غیبت کے لیے ذہنوں کو تیار کرنا

امام زمانہ علیہ السلام کی غیبت اور ان کے قیام کے بارے میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمۂ معصومینؑ کی بکثرت روایات لوگوں کی دسترس میں تھیں۔ ان کثیر روایات کو (جنہیں ابھی حال ہی میں ایک معجم کی صورت میں مرتب کر دیا گیا ہے) دیکھا جائے، تو اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ یہ مسئلہ کسی بھی امامؑ کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں رہا ہے، اور

۱۔ معالم العلماء۔ ص ۹۶

۲۔ الغیبہ نعمانی۔ ص ۲۱

۳۔ رجال النجاشی۔ ص ۲۸۳۔ ۲۸۷

۴۔ غیبت کے مسئلے پر کتب نویسی کا جائزہ لینے کے لیے دیکھیے: نور مہدیؑ مقالہ سیر تاریخی غیبت امامؑ۔ ص ۷۷۔ ۹۵

۵۔ الغیبہ۔ ص ۲۔ ۳

ان تمام بزرگ ہستیوں نے اس پر زور دیا ہے۔ اس بارے میں مذکورہ معجم کی دو جلدوں پر محیط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کے علاوہ، ہر امامؑ سے غیبت اور مہدویت کے مختلف پہلوؤں پر نیز ان میں پیشِ نظر مصداق کے تعین کے بارے میں روایات موجود ہیں، جن کی مجموعی تعداد چھ سو سے زیادہ ہو جاتی ہے۔(۱)

یہ اس بات کا مظہر ہے کہ شیعہ روایات کی کتب میں مہدویت کا مسئلہ بہت زیادہ اہمیت کا حامل رہا ہے، کیونکہ ہر امامؑ کی رحلت کے بعد (چاہے وہ کسی بھی طریقے سے اس دنیا سے رخصت ہوا ہو) حتیٰ اُن کی زندگی میں بھی مہدویت کا خیال عروج پر پہنچ جاتا تھا۔ شیعہ فرقوں کے بارے میں اشعری اور نوبختی نے جو بحث چھیڑی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیعوں کے درمیان گروہ بندی کی اہم ترین وجہ مہدویت کا مسئلہ ہی رہی ہے، جسے ائمہؑ کے بعض اصحاب کی جانب سے غلط طور پر پیش کر دیا جاتا تھا اور ایک گروہ شیعیت سے (اگرچہ محدود طور پر ہی سہی) الگ ہو جاتا تھا۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ محمد بن حنفیہ، نفس زکیہ (۲) اور بہت سے دوسرے علویوں کے مہدی ہونے کا عقیدہ بنیادی طور پر اسی تاکید کی بنا پر تھا جو مہدویت کے بارے میں کی گئی ہے۔ اس کا ایک نمونہ عبداللہ بن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر (م: ۱۲۹ ہجری) کی مہدویت کا دعویٰ ہے۔ امام محمد باقر علیہ السلام کے بارے میں بھی یہی دعویٰ کیا گیا تھا، جسے خود امامؑ نے مسترد کیا اور اسے شدت کے ساتھ جھٹلایا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کے فرزند اسماعیل کے لیے، حتیٰ خود امام جعفر صادقؑ اور امام موسیٰ کاظمؑ (۳) اور عباسیوں کے خلاف قیام بپا کرنے والے بعض دوسرے علوی رہنماؤں کے لیے بھی مہدویت کا دعویٰ کیا گیا۔ جیسے حسن بن قاسم، یحییٰ بن عمر، محمد بن قاسم وغیرہ۔ (۴) وہ القاب جنہیں عباسی خلفا اپنے لیے استعمال کرتے تھے، اکثر ایسے القاب ہوتے تھے جنہیں بعض روایات میں "القابِ مہدی" کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ سفاح، منصور، مہدی، ہادی، رشید، امین اور مامون انہی القابات میں سے ہیں۔

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں شیعوں اور اسی طرح اہلِ سنت کے درمیان مہدویت کے اس قدر زیادہ دعوے، اس بات کی علامت ہیں کہ "قائم" اور "مہدی" کا وجود مسلمانوں کے درمیان ایک ثابت اور مسلّمہ اصول رہا ہے اور صرف مصداق کے تعین میں کچھ مشکلات پیش آئی ہیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ شیعہ روایات میں "قائم" کا عنوان "مہدی" کے لقب سے زیادہ استعمال ہوا ہے، جبکہ اہلِ سنت کی روایات میں صرف "مہدی" کا لفظ آیا ہے۔

۱۔ معجم احادیث المہدیؑ۔ پانچ جلدوں میں (ناشر مؤسسۂ المعارف الاسلامیہ)

۲۔ نفس زکیہ کے بارے میں اس وقت کے متعدد اہلِ سنت نے مہدویت کا دعویٰ کیا تھا۔ دیکھئے: مقاتل الطالبیین۔ ص ۲۴۰۔ ۲۳۹

۳۔ فرق الشیعہ۔ ص ۷۸۔ ۹۰

۴۔ دراسات وبحوث فی التاریخ والاسلام۔ ج ۱۔ ص ۵۷۔ ۷۵۔ مقالة المهدية بنظرة جديدة

بعد کی صدیوں میں، بالخصوص آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں بھی ہمیں مہدویت کے متعدد دعویدار نظر آتے ہیں۔
ان سب باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس بارے میں مختلف اسلامی فرقوں کے پاس موجود کافی روایات اس دعوے کے لیے سازگار فضا پیدا کرتی تھیں۔ یہ روایات احادیث کے شیعہ مجموعوں میں کثرت کے ساتھ موجود ہیں اور اہلِ سنت کی بنیادی کتب میں بھی فراواں نظر آتی ہیں۔(۱)

کلامی مسائل اور امام مہدیؑ کی جانشینی

ایک امامؑ کے بعد دوسرے امامؑ کی جانشینی کے بارے میں شیعوں کے عقائد، نئے امامؑ کی امامت کے استحکام میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔ یہ عقائد شیعوں کے درمیان کم و بیش تسلیم شدہ تھے اور ان سے روگردانی قابلِ قبول نہیں تھی۔ امام مہدیؑ کی امامت کے بارے میں بھی ایسے ہی مسائل پیش آئے۔ نوبختی اور اشعری کے مطابق امامِ زمانہؑ کی جانشینی کے بارے میں شیعوں نے جو مسائل اٹھائے وہ تیسری صدی میں ان کے امامت اور اگلے امامؑ کی جانشینی کے بارے میں نظریات کا ایک مظہر ہیں، اور بعد میں انہی نظریات کی بنیاد پر امامت کے بارے میں شیعہ اصولِ عقائد تشکیل پائے۔
نوبختی نے شیعہ فرقوں میں سے بارہویں فرقے، یعنی امامیہ کے بارے میں بحث کرتے ہوئے ان بنیادوں کی طرف اس ترتیب سے اشارہ کیا ہے:

۱۔ زمین حجت خدا سے خالی نہیں ہوسکتی۔
۲۔ امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے بعد دو اماموں کی امامت ممکن نہیں ہے۔
۳۔ اگر زمین پر صرف دو افراد بستے ہوں، تو لازماً ان میں سے ایک حجتِ خدا ہوگا۔
۴۔ جس کی امامت ثابت نہ ہوئی ہو، اس کی اولاد کی امامت بھی جائز نہیں ہے۔ مثلاً امام جعفر صادقؑ کے فرزند اسماعیل کیونکہ اپنے والد کی زندگی میں ہی بغیر امام بنے وفات پا چکے تھے، اس لیے ان کا بیٹا محمد بھی مقامِ امامت کا حقدار نہیں ہوسکتا۔

اس کے بعد وہ مزید کہتے ہیں: مذکورہ بالا بنیادیں امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام کی روایات سے اخذ کی گئی ہیں، اور کسی شیعہ نے انہیں رد یا ان کا انکار نہیں کیا ہے اور ان کے طریق اور ان کی اسناد کے اثبات اور استحکام کے بارے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں پایا جاتا۔ شیعوں کی نظر میں زمین ایک لمحے کے لیے بھی حجتِ خدا سے خالی نہیں رہ سکتی، کیونکہ اس صورت میں زمین اور جو کچھ اس پر ہے، وہ سب یکلخت تباہ و برباد ہوجائے گا۔ ہم گزشتہ امام (امام حسن عسکریؑ)

۱۔ دو جلدی مجموعہ "المہدیؑ فی کتب اہل السنۃ" ان آثار میں شامل ہے جو ایک حد تک اس قسم کی احادیث پر مشتمل ہے۔

کی وفات کے وقت تک ان کی امامت پر عقیدہ رکھنے کے ساتھ ساتھ یہ اعتقاد رکھتے اور یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ان کے جانشین ان کے صلب سے ہیں اور آپ کے بعد امت کی امامت کی ذمے داری انہی کو سونپی گئی ہے۔ وہ حکمِ خدا سے ایک دن پردۂ غیبت سے باہر آئیں گے اور اپنے امر کو آشکار کریں گے' کیونکہ ان کی غیبت اور ظہور کا اختیار خدا کے ہاتھ میں ہے۔ جیسا کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے:

"اَللّٰھم انّک لاتخلوا الأرض من حجّةٍ لک علی خلقک ظاھراً معروفاً او خائفاً مغموراً کیلا تبطل حجّتک وبیّناتک."

"بار الٰہا! بے شک تو اپنی زمین کو مخلوق کے لیے اپنی حجت سے خالی نہیں رکھتا' چاہے وہ ظاہر اور معروف ہو یا خائف و پنہاں' تا کہ تیری حجتیں اور نشانیاں محو نہ ہونے پائیں۔"

ہمیں اس بات کا حکم دیا گیا ہے اور اس اعتقاد کی تائید میں گزشتہ ائمہ معصومینؑ سے صحیح احادیث ہم تک پہنچی ہیں۔ خدا کے بندوں کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ خدا کے کاموں میں تجسس کریں اور کھوج لگائیں اور جن باتوں کو خدا نے پوشیدہ رکھا ہے' انہیں کشف کرنے کی کوششیں کریں اور جس چیز کے بارے میں نہیں جانتے اس کے بارے میں حکم لگائیں۔ اور جائز نہیں ہے کہ ہم ان کا اسمِ مبارک زبان پر لائیں اور آپ کی اقامت گاہ کے بارے میں تفتیش و تحقیق کریں' مگر جب حکم ہو۔۔۔

آگے چل کر وہ تقیے کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں اور امام جعفر صادقؑ' امام موسیٰ کاظمؑ اور امام علی رضاؑ کی جانب سے تقیہ ملحوظ رکھنے اور آغازِ غیبت کے حالات میں شیعوں کی طرف سے اس کا لحاظ رکھنے کو ان دو اماموں کے زمانوں سے زیادہ لازم سمجھتے ہیں۔ انہوں نے اس بات کو ثابت کرنے کے لیے بعض روایات کا سہارا لیا ہے' جن کی رو سے آپ کی ولادت لوگوں کے لیے خفیہ اور آپ کا اسمِ مبارک پوشیدہ رہے گا' یہاں تک کہ وہ اپنے عالمی قیام سے کچھ عرصہ پہلے لوگوں سے اپنا تعارف کروائیں گے۔

اور آخر میں کہتے ہیں:

"فھذا سبیل الأمانة والمنھاج الواضح الأحبّ الّذی لم تزل الشیعة الامامیة الصحیحة التشیّع علیه."(۱)

"یہ وہ راستہ ہے جو امانت کا راستہ ہے اور واضح طریق ہے' وہ پسندیدہ ترین شے ہے جس پر ہمیشہ سے

۱۔ فرق الشیعہ۔ ص ۱۰۸۔۱۱۲

شیعہ امامیہ قائم رہے ہیں۔"

شیخ مفید نے ایسے ہی دلائل ان گروہوں کی رد میں بیان کیے ہیں جو امام حسن عسکری علیہ السلام کی جانشینی کے بارے میں غلط نظریات کے حامل تھے۔ جن اہم اصولوں کی جانب شیخ نے اشارہ کیا ہے ان میں حجت خدا سے زمین کا خالی نہ رہنا اور وہ حدیث شامل ہے جس میں کہا گیا ہے کہ: "جو شخص اپنے زمانے کے امامؑ کی معرفت کے بغیر مرجائے وہ جاہلیت کی موت مرا ہے۔"(۱)

اسی قسم کی روایات اور ان روایات سے اخذ کیے جانے والے دلائل میں سے کچھ دلائل کو شیخ طوسی نے "الغیبہ" میں امام حسن عسکریؑ کی شہادت کے بعد پیدا ہونے والے گروہوں کے نظریات کی رد میں بیان کیا ہے۔(۲)

زمین کے حجت خدا سے خالی نہ ہونے کے اصول کے علاوہ، قرآنِ کریم کی دو آیات بھی مہدویت کی اعتقادی پشت پناہی کے لیے نازل ہوئی ہیں:

وَ نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ. (۳)

وَ لَقَدْ كَتَبْنَا فِى الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِىَ الصّٰلِحُوْنَ. (۴)

شیخ مفید نے امامِ زمانہؑ کے حالاتِ زندگی کے آغاز میں ان دو آیات اور اس مشہور حدیثِ نبویؐ سے استناد کیا ہے:

"لن تنقضى الأيام والليالى حتىّ يبعث الله رجلًا من أهل بيتى يواطى اسمه يملأها قسطاً وعدلاً كما مُلئت ظلماً وجوراً."(۵)

"روز و شب کی آمد و شد ختم نہ ہوگی جب تک کہ اللہ میرے اہلِ بیت میں سے ایک ایسے شخص کو مبعوث نہ کر دے جو میرا ہم نام ہوگا اور جو زمین کو عدل و انصاف سے ایسے بھر دے گا جیسے وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہوگی۔"

۱۔ الفصول المختار۔ ص ۲۶۳۔۲۶۴

۲۔ الغیبہ طوسی۔ ص ۱۳۰۔۱۳۷

۳۔ سورۂ قصص ۲۸۔ آیت ۵۔ امام محمد تقی علیہ السلام کی دختر حکیمہ خاتون کے مطابق امام مہدیؑ نے ولادت کے فوراً بعد اس آیت کی تلاوت فرمائی تھی۔ الغیبہ۔ ص ۱۴۳

۴۔ سورۂ انبیاء ۲۱۔ آیت ۱۰۵

۵۔ ارشاد۔ ص ۳۳۶

امام مہدیؑ اور نائبینِ خاص

سن ۲۶۰ ہجری میں امام حسن عسکری علیہ السلام کی رحلت کے فوراً بعد غیبتِ صغریٰ کا آغاز ہوگیا اور یہ ۳۲۹ ہجری میں امامِ زمانہؑ کے آخری نائب خاص کی وفات تک جاری رہی۔ اس کے بعد غیبتِ کبریٰ کا آغاز ہوا۔

غیبتِ صغریٰ کے زمانے میں امامِ زمانہؑ اپنے چار خاص نائبین کے توسط سے شیعوں کے ساتھ رابطے میں رہتے تھے' اور ان کے مسائل حل کیا کرتے تھے۔ ان امور میں مالی مسائل کے علاوہ' عقیدتی اور فقہی مسائل بھی شامل تھے۔ امامؑ اور شیعوں کے درمیان رابطہ بننے والے یہ چار افراد گزشتہ ائمۂ کے پرانے اور قابلِ اعتماد اصحاب تھے' جنہوں نے یکے بعد دیگرے اس عظیم ذمے داری کو سنبھالا۔ یہ لوگ امامِ زمانہؑ کے نواب خاص کے عنوان سے معروف ہیں۔ یہ افراد امامؑ کی طرف سے دور دراز ترین اسلامی علاقوں میں متعین آپ کے وکلا سے رابطے میں رہتے تھے اور شیعوں کے خطوط اور درخواستیں امامؑ کی خدمت میں پہنچاتے تھے' جس کے جواب میں امامؑ کی طرف سے توقیعات (تحریریں) صادر ہوتی تھیں۔

قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ اس دور میں نہ صرف خود امامِ زمانہؑ لوگوں کی آنکھوں سے پوشیدہ تھے' بلکہ آپ کے نمائندے بھی خفیہ طور پر اور بغیر لوگوں کی نظروں میں آئے کام کیا کرتے تھے۔ علاوہ ازایں' امامی شیعوں کے انقلابی سرگرمیوں اور حکومت کا تختہ الٹنے جیسے اقدامات سے دور رہنے کی وجہ سے انہیں نسبتاً کم خطرات کا سامنا کرنا پڑتا تھا' اور ان کے لیے اپنے حالات بہتر بنانا ممکن ہوسکتا تھا۔ اس موقف کا نتیجہ یہ نکلا کہ عباسی خلافت کے مرکز میں بھی امامی شیعوں نے اپنا فیصلہ کن وجود برقرار رکھا اور اپنے آپ کو عباسی حکومت اور بغداد میں بااثر انتہا پسند سنیوں سے ایک باضابطہ اور تسلیم شدہ اقلیت کے طور پر منوایا۔ اس زمانے میں بغداد میں شیعوں کا مرکز دوسرے شہروں کے شیعوں کی سرپرستی کرتے ہوئے' ان کی مذہبی زندگی کو بھی اپنی تنظیم کے تحت لے آیا تھا۔

اس دور میں شیعوں کی خاص پالیسی' جسے ائمۂ معصومین علیہم السلام کی حمایت بھی حاصل تھی' بعض شیعہ عمائدین کو عباسی حکومت میں بااثر بنانا' حتیٰ انہیں وزارت تک پہنچانا تھی۔ (۱)

اب ہم امامِ زمانہؑ کے نائبین خاص کے مختصر حالاتِ زندگی بیان کریں گے' نیز ان اقدامات کا ذکر بھی کریں گے جو انہوں نے امامؑ کے حکم سے انجام دیے تھے۔

۱۔ دیکھیے: خاندان نوبختی۔ ص ۹۶۔ ۹۷

۱۔عثمان بن سعید عَمْری سَمّان

یہ امام زمانہؑ کے سب سے پہلے نائب خاص تھے۔سمّان یعنی روغن فروش۔یہ پیشہ اختیار کرنے کا مقصد اپنی مذہبی اور سیاسی سرگرمیوں کو پوشیدہ رکھنا تھا' کیونکہ جو اموال انہیں امامؑ کی خدمت میں پہنچانے کے لیے دیے جاتے تھے' وہ اُنہیں روغن کے برتنوں میں ڈال کر آپ تک لیجاتے تھے۔(۱) اس سے پہلے بھی ائمہؑ کے بعض وکلا اس طریقے سے کام لے چکے تھے' جیسے کہ محمد قطان' شرعی رقومات کو پارچہ فروشی کے پردے میں امامؑ کی خدمت میں پہنچایا کرتے تھے۔(۲)

عثمان بن سعید جو قبیلۂ اسد سے تعلق رکھتے تھے' اور امام حسن عسکریؑ کے وکلا میں شمار ہوتے تھے' وہ اس سے پہلے امام علی نقیؑ کے بھی قابلِ اعتماد افراد میں سے تھے۔امامؑ نے ان کا اپنے اصحاب سے ایک موثق اور قابلِ اعتماد شخص کی حیثیت سے تعارف کرایا تھا۔(۳) ایک مرتبہ جب یمن کے شیعوں کا ایک وفد امام حسن عسکریؑ کی خدمت میں شرفیاب ہوا' تو امامؑ نے عثمان بن سعید کو اپنے وکیل کے طور پر مامور کیا تھا کہ وہ ان کے لائے ہوئے اموال ان سے وصول کرلیں۔(۴) انہی نے امام حسن عسکریؑ کے غسل وکفن کی ذمے داری لی تھی اور آپ کے جسدِ پاک کو قبر میں اتارا تھا۔(۵)

۲۔ابو جعفر محمد بن عثمان بن سعید عَمْری

امامِ زمانہؑ کے دوسرے نائب خاص محمد بن عثمان تھے' جنہیں ان کے والد کی وفات کے بعد امام مہدیؑ نے ایک توقیع (تحریر) کے ذریعے تعزیت پیش کی اور ان کے حق میں دعائے خیر کرنے کے بعد' امور ان کو سونپ دیے۔(۶) وہ بھی اپنے والد کی طرح امام حسن عسکریؑ کے قریبی اور قابلِ اعتماد اصحاب میں شامل تھے۔جیسا کہ امامِ زمانہؑ کی ایک روایت کے ضمن میں آیا ہے:

"العمری و ابنه ثقتان' فما أدّیا الیک فعنّی یؤدّیان و ما قالا لک فعنّی یقولان' فاسمع لهما و اطعهما فانّهما ثقتان المأمونان."(۷)

۱۔الغیبہ طوسی۔ص۲۱۴

۲۔بحار الانوار۔ج۵۱۔ص۳۹۷

۳۔بحار الانوار۔ج۵۱۔ص۲۱۵

۴۔بحار الانوار۔ج۵۱۔ص۲۱۶

۵۔بحار الانوار۔ج۵۱۔ص۲۱۶

۶۔الغیبہ طوسی۔ص۲۱۹

۷۔الغیبہ طوسی۔ص۲۱۹

''عمری اور اس کا بیٹا' دونوں ثقہ اور قابلِ اعتماد ہیں۔ یہ جو کچھ تم تک پہنچاتے ہیں وہ میری طرف سے پہنچاتے ہیں' اور جو کچھ کہتے ہیں' وہ میری طرف سے کہتے ہیں۔ پس ان کی بات سنو اور ان کی اطاعت کرو کہ یہ میرے ثقہ اور امین ہیں۔''

بعض غالیوں کی جانب سے ان کی مخالفت کے باوجود اکثر شیعہ ان کی پیروی کرتے تھے' اور ان کی عدالت کے بارے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں کرتے تھے۔(۱) وہ سن ۳۰۵ ہجری تک بقیدِ حیات تھے اور شیعوں اور امامؑ کے درمیان رابطہ برقرار رکھنے والے شمار ہوتے تھے اور دوسرے شہروں میں رہنے والے امامؑ کے وکیلوں کو کنٹرول اور ان کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ ان کے عہدے کی مدت کے دوران امامؑ کی جانب سے کئی بار ان کی نمائندگی کی تائید میں توقیعات صادر ہوئیں۔(۲)

شیخ طوسی کے بقول' حدیث میں ان کی کئی تالیفات بھی ہیں جو حسین بن روح اور ان کے بعد ابوالحسن سَمُری کے ہاتھوں تک پہنچی ہیں۔(۳)

۳۔ ابوالقاسم حسین بن رَوْح

امام زمانہؑ کے تیسرے نائب خاص حسین بن روح تھے' جو ابوجعفر عمری کے قابلِ اعتماد اور بغداد میں ان کے قریبی افراد میں شمار ہوتے تھے۔(۴) ابوجعفر نے اپنے پاس آنے والے لوگوں کو حسین بن روح کی جانب بھیج کر ان کی جانشینی کا راستہ ہموار کیا' اور اپنی زندگی کے آخری ایام میں امامؑ کے حکم سے انہیں اپنے جانشین کے طور پر متعارف کرایا۔ اس کے بعد شیعہ اپنے اموال (امامؑ تک) پہنچانے کے لیے ان سے رجوع کرتے تھے۔(۵) اقبال نے ''خاندانِ نوبختی'' میں تفصیل کے ساتھ حسین بن روح کا تذکرہ کیا ہے' اور انہیں ان کی ماں کی طرف سے خاندانِ نوبختی سے منسوب قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں قمی بھی کہا گیا ہے۔(۶) وہ امام حسن عسکریؑ کے اصحاب میں سے تھے اور بغداد میں ابوعلی بن ہمام' ابو عبداللہ بن محمد الکاتب' ابوعبداللہ الباقطانی' ابوسہل اسماعیل بن علی نوبختی' ابوعبداللہ بن الوجناء وغیرہ جیسے شیعہ بزرگوں کی

۱۔ الغیبہ طوسی۔ ص ۲۲۱

۲۔ الغیبہ طوسی۔ ص ۲۲۰

۳۔ الغیبہ طوسی۔ ص ۲۲۱۔ اور ان کے حالاتِ زندگی کی تفصیل جاننے کے لیے دیکھئے: تنقیح المقال۔ ج ۳۔ ص ۱۴۹

۴۔ الغیبہ طوسی۔ ص ۲۲۳

۵۔ الغیبہ طوسی۔ ص ۲۲۳۔ ۲۲۶

۶۔ خاندانِ نوبختی۔ ص ۲۱۳۔ ۲۱۴

موجودگی کے باوجود انہیں ابوجعفر عمری کا جانشین مقرر کیا گیا۔(۱)

ابوجعفر کی بیٹی ام کلثوم نے ایک روایت میں اپنے والد ابوجعفر کے زمانے میں حسین بن روح کے اہم کردار اور شیعوں کے درمیان ان کے بلند مقام پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔(۲)

حسین بن روح نے اُس دور میں حکومت کے اندر اثر و رسوخ پیدا کر لیا تھا جب آل فرات مقتدر عباسی کے وزیر اور شیعوں کے حامی تھے' لیکن جب حامد بن عباس حکومت میں آیا' جو شیعوں کے مخالفین کی حمایت کیا کرتا تھا' تو حسین بن روح کے لیے مشکلات پیدا ہو گئیں۔ سن ۳۱۱ ہجری سے جبکہ حامد بن عباس حاکم بنا' سن ۳۱۷ ہجری تک جبکہ حسین بن روح قید سے رہا ہوئے' ان کی زندگی کے بارے میں صحیح صحیح معلومات موجود نہیں ہیں۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ سن ۳۱۲ ہجری سے ۳۱۷ ہجری تک قید میں رہے تھے۔(۳)

اس کے بعد شعبان سن ۳۲۶ ہجری میں' ان کی وفات تک' وہ بغداد میں ایک بلند مقام کے مالک تھے اور حکومت میں آل نوبخت کے اثر و رسوخ کی وجہ سے کسی نے ان کے لیے پریشانی پیدا نہیں کی۔

اقبال لکھتا ہے: ابوالقاسم حسین بن روح' اپنے مخالفوں اور حامیوں کی تصدیق کے مطابق اپنے زمانے کے عاقل ترین اور سمجھدار ترین انسان تھے۔(۴)

۴۔ ابوالحسن علی بن محمد سمری

یہ امام زمانہؑ کے چوتھے اور آخری نائب ہیں جن کو حسین بن روح نے امامؑ کے حکم سے اپنا جانشین مقرر کیا۔ انہوں نے سن ۳۲۹ ہجری تک مجموعی طور پر تقریباً تین سال امامؑ کے نائب خاص کی ذمے داری کو ادا کیا۔ ابوالحسن دراصل بصرہ کے گرد و نواح کے ایک دیہات کے رہنے والے تھے۔ بعض مورخین کے بقول' بصرہ میں ان کے خاندان کے بہت سے افراد' جیسے اسماعیل بن صالح کے فرزند حسن اور محمد اور علی بن زیاد کی بہت سی املاک تھیں۔ انہوں نے اپنی املاک کی نصف آمدنی امام حسن عسکریؑ کے لیے وقف کی ہوئی تھی اور امامؑ ہر سال یہ آمدنی وصول کرتے اور ان کے ساتھ خط و کتابت فرماتے تھے۔(۵)

۱۔ الغیبہ طوسی۔ ص ۲۲۶۔ ۲۲۷

۲۔ الغیبہ طوسی۔ ص ۲۲۷

۳۔ دیکھیے: خاندان نوبختی۔ ص ۲۱۷۔ ۲۱۸

۴۔ ایضاً۔ ص ۲۲۱

۵۔ اثبات الوصیہ۔ ص ۲۳۶۔ ۲۴۷ نقل از تاریخ سیاسی غیبت امام دوازدہم۔ ص ۲۱۰

دراصل سمری کے دور میں جو اہم ترین تبدیلی واقع ہوئی، وہ امامؑ کے اس نائب کی عنقریب ہونے والی وفات کی پیش گوئی پر مبنی امامؑ کی توقیع ہے۔ یہ توقیع ان کی وفات سے چند دن پہلے سامنے آئی تھی۔ اس توقیع میں غیبت کبریٰ کے آغاز کا وعدہ دیا گیا تھا۔ توقیع کے الفاظ یہ ہیں:

"بسم اللّٰه الرّحمٰن الرّحیم. یا علی بن محمد السمری! أعظم اللّٰه أجر اخوانک فیک فانک میّت ما بینک و بین ستّة أیّام. فاجمع أمرک ولاتوص الی أحد فیقوم مقامک بعد وفاتک فقد وقعت الغیبة التّامّة فلا ظهور الابعداذن اللّٰه (تعالیٰ ذکره) وذلک بعد طول الأمد و قسوة القلوب و امتلاء الأرض جوراً و سیأتی لشیعتی من یدّعی المشاهدة ألا فمن ادّعی المشاهدة قبل خروج السفیانی و الصیحة فهو کذّاب مفتری ولا حول ولا قوة الا باللّٰه العلیّ العظیم."(۱)

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اے علی بن محمد سمری! خدا تمہارے (غم میں) تمہارے بھائیوں کو اجر عظیم عطا کرے، کہ تم چھ دن کے اندر اندر وفات پا جاؤ گے۔ پس اپنے کاموں کو سمیٹ لو اور اپنی وفات کے بعد کسی کو اپنی جانشینی کے لیے وصیت نہ کرنا، کہ اب غیبتِ کبریٰ کا وقت آ پہنچا ہے اور میرا ظہور اللہ تعالیٰ کی اجازت ہی سے ہوگا۔ اور یہ ایک طویل مدت گزرنے کے بعد ایسے وقت میں ہوگا جبکہ لوگوں کے دل سخت اور زمین ظلم وستم سے بھر چکی ہوگی۔ کچھ لوگ ہمارے شیعوں کے سامنے مجھ سے رابطے اور ملاقات کا دعویٰ کریں گے۔ جو شخص سفیانی کے خروج اور آسمانی چیخ (جو ظہور کی علامات میں سے ہیں) سے پہلے ایسا دعویٰ کرے، اس کا یہ دعویٰ جھوٹ کے سوا کچھ نہ ہوگا۔"

اس توقیع میں نئے دور کے کلی اصول بیان کیے گئے ہیں اور دوسری توقیعات اور اس سے پہلے ائمہؑ سے صادر ہونے والی احادیث کے ساتھ اس میں شیعوں کے لیے ایک نئی راہ پیش کی گئی ہے۔

شیعوں کے حوالے سے نائبین کے اقدامات کا ایک مختصر جائزہ

نائبینِ خاص کے تمام کام، حتیٰ روزمرہ جزئی ترین امور میں بھی ان کے اقدامات، امامِ زمانہؑ کے احکامات اور ان کی ہدایات کی روشنی میں انجام پاتے تھے۔ لہٰذا ہمیں اپنے جائزے کو ان نکات کی بنیاد پر جانچنا چاہیے جو امامؑ کی توقیعات میں بیان ہوئے ہیں، اگرچہ بہت سی توقیعات (اگر کسی زمانے میں جمع بھی کی گئی ہوں تو) آج ہماری دسترس میں نہیں ہیں۔

۱۔ الغیبہ طوسی۔ ص ۲۴۳

نائبین کے اقدامات کا چند پہلوؤں سے جائزہ لیا جا سکتا ہے:

الف: غالیوں سے مقابلہ

ہم اس سے پہلے اکثر ائمۂ ہدیٰ کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے اس موضوع کا جائزہ لے چکے ہیں اور بتا چکے ہیں کہ ان عظیم شخصیات کے علمی اور سیاسی جہاد کا ایک بنیادی ترین محور شیعوں کے اندر پیدا ہونے والے فرقوں اور ان میں سرفہرست غالیوں سے مقابلہ تھا۔ اس زمانے میں غالیوں کا اثر و رسوخ بڑھ گیا تھا اور انہیں ائمہؑ کی بعض اولادوں مثلاً جعفر بن علی نقی (جعفر کذاب) کی ہمراہی اور چند دوسری شیعہ سیاسی شخصیات کی حمایت کی وجہ سے فروغ مل رہا تھا۔

اس دور میں جو غالی حضرات میدان میں آئے ان میں سے ایک نُصیر یہ فرقہ کا بانی محمد بن نصیر تھا جس کے غلو آمیز دعوے امام علی نقی علیہ السلام کے زمانے میں اور اس کے بعد زبان زدِ عام ہوئے۔ شیخ طوسی کہتے ہیں: وہ نائب دوّم کے زمانے میں غلو آمیز عقائد مثلاً پچھلے دور کے غالیوں کے عقائد جیسے ائمہؑ کی خدائی اور محرم عورتوں کے ساتھ نکاح کے جائز ہونے وغیرہ کو رواج دے رہا تھا۔ ابو جعفر نے اس پر لعنت اور نفرین کی اور اس سے بیزاری کا اظہار کیا۔ اس کے بعد اس کے ماننے والے تین گروہوں میں تقسیم ہو گئے البتہ زیادہ عرصے قائم نہ رہ سکے۔ (۱)

جن لوگوں کا شمار ابتدا میں فقہائے امامیہ اور امامؑ کے وکلا میں ہوتا تھا اُن میں سے ایک محمد بن علی شلمغانی تھا۔ وہ اپنے اہم منصب کے باوجود اپنی جاہ طلبی کی وجہ سے غلو کا شکار ہو گیا اور خاص طور پر اس نے حلول کے نظریے پر زیادہ زور دیا۔ اس نے اپنے بعض زبردست افراد کو جو بنو بسطام کے ممتاز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے دھوکا دینے کی کوشش کی اور اپنے بارے میں حسین بن روح کی لعن اور نفرین کی یہ توجیہ کی کہ کیونکہ وہ رازوں سے باخبر ہو چکا ہے اور اب ان کو فاش کر رہا ہے اس لیے اس قسم کی لعن و نفرین کا نشانہ بن رہا ہے۔ (۲)

شیخ طوسی کے بقول: وہ یہ تصور کرتا تھا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روح نائب دوم میں اور امیر المومنین حضرت علی ابن ابیطالبؑ کی روح نائب سوم کے بدن میں اور روح فاطمہ زہرا علیہا السلام ام کلثوم بنت ابو جعفر کے بدن میں حلول کر گئی ہے۔

حسین بن روح اس عقیدے کو کھلا کفر اور الحاد سمجھتے تھے اور اسے ایک مکار اور دھوکے باز شخص کہتے تھے اور اس کے عقائد کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں عیسائیوں کے عقائد کی مانند اور حلاج کے عقائد کی طرح قرار دیتے تھے۔ (۳)

۱۔ الغیبہ طوسی۔ ص ۲۴۴۔ ۲۴۵

۲۔ ایضاً۔ ص ۲۴۸

۳۔ ایضاً۔ ص ۲۴۹

انہوں نے شلمغانی کی ساکھ کمزور کرنے کی بھرپور کوشش کی اور آخرکار امامِ زمانہؑ کی توقیع نے اس حوالے سے ان کی کوششوں پر تائید کی مہر ثبت کردی۔(۱) اس کے باوجود شلمغانی کی مکاریوں نے ایک مدت تک امامیہ کے لیے مشکلات کھڑی رکھیں۔ بے شک وہ اور اس کے ساتھی شیعوں کی بدنامی کا ایک اہم ترین سبب تھے۔

غالیوں کے سرغنہ جانے پہچانے افراد کے علاوہ بھی خود شیعہ عوام میں گاہ بگاہ غلو جیسے عقائد ظاہر ہوتے رہتے تھے۔ ایک روایت جسے شیخ طوسی نے نقل کیا ہے' اس میں اس بارے میں آیا ہے کہ: شیعوں کے ایک گروہ کے درمیان اس بات پر اختلاف پیدا ہوگیا کہ آیا خدا نے ائمۂ طاہرینؑ کو خلق کرنے اور روزی دینے کی طاقت عطا کی ہے یا نہیں؟ ایک گروہ نے اسے جائز سمجھا اور دوسرے نے اسے باطل قرار دیا۔ آخرکار انہوں نے نائبِ دوّم ابوجعفر سے رجوع کیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس بارے میں ان کے لیے امامِ زمانہؑ سے کوئی توقیع لے آئیں۔ امام کا جواب اس طرح سے تھا:

"انّ اللّٰہ تعالیٰ ھو الّذی خلاق الأجسام وقسّم الارزاق لأنہ لیس بجسمٍ ولاحالاً فی جسم' لیس کمثلہ شیءٌ و ھو السمیع العلیم' وأما الأئمّة فانّھم یسئلون اللّٰہ تعالیٰ فیخلق ویسئلونہ فیرزق ایجاباً لمسألتھم واعظاماً لحقّھم۔"(۲)

''ہر چیز کو خدا نے خلق کیا ہے اور روزی وہی تقسیم کرتا ہے' کیونکہ وہ نہ جسم ہے اور نہ کسی جسم میں حلول کرتا ہے۔ اس کی مثل کوئی نہیں اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اور ائمہؑ خدا سے سوال کرتے ہیں تو وہ ان کی درخواست پر اور ان کے احترام میں خلق بھی کرتا ہے اور روزی بھی دیتا ہے۔''

اس طرح یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس زمانے میں باقاعدہ طور پر غلو آمیز عقائد کے بارے میں بحث وجدال ہوا کرتی تھی' اور ان مشکلات کو حل کرنا اور غالیوں کے ان منحرف افکار کا مسلسل انتھک مقابلہ کرنا نائبینِ خاص کی ایک اہم ذمے داری تھی۔

ب: امام مہدیؑ کے بارے میں پائے جانے والے شکوک وشبہات کا ازالہ

نائبینِ خاص کا ایک اہم کام' امامِ زمانہ علیہ السلام کی ذاتِ اقدس کے بارے میں پائے جانے والے شکوک و شبہات کو دور کرنا تھا۔ یہ کوششیں زیادہ تر پہلے اور دوسرے نائب کے دور میں کی گئیں اور اس کے بعد بھی غیبتِ صغریٰ کے

۱۔ الغیبہ طوسی۔ ص ۲۵۰' اور دیکھئے: تاریخ الغیبۃ الصغریٰ۔ ص ۵۱۸۔ شلمغانی کے بارے میں تفصیلات ''تاریخ سیاسی غیبت امامِ دوازدہم'' صفحہ ۲۰۰ تا ۲۰۶ پر آئی ہیں۔

۲۔ الغیبہ طوسی۔ ص ۱۷۸

اختتام تک اس بارے میں مسائل پیش آتے رہتے تھے۔

امام زمانہ علیہ السلام کی جو توقیعات آج بھی ہماری دسترس میں ہیں' ان میں سے کئی اسی مسئلے سے تعلق رکھتی ہیں۔ شیخ طوسی کے بقول' ابن ابی غانم قزوینی اور شیعوں کے ایک گروہ کے درمیان بحث چھڑ گئی' اس کا اصرار تھا کہ گیارہویں امام کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ مجبوراً شیعوں نے امام کی خدمت اقدس میں ایک خط بھیجا اور آپ سے درخواست کی کہ اس کا جواب عنایت فرمائیں' تاکہ اس کے ذریعے سے اس بارے میں ہونے والی بحث و جدال کا فیصلہ ہو سکے۔ اس کے جواب میں' خود امامؑ کی تحریر میں ایک خط صادر ہوا' جس میں مسئلۂ امامت و ولایت کا جائزہ لیتے ہوئے اور گزشتہ ائمہؑ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"تم یہ سمجھتے ہو کہ خدا نے گیارہویں امامؑ کے بعد اپنے دین کو باطل کر دیا ہے' اور اپنے اور لوگوں کے درمیان رابطے کو منقطع کر دیا ہے؟ نہیں' ایسا نہیں ہے اور قیام قیامت تک ایسا نہیں ہوگا۔"

اس کے بعد اس توقیع میں آپ نے غیبت اور ظالموں کی نگاہوں سے دور رہنے کی ضرورت کی جانب بھی اشارہ کیا ہے۔(۱)

ایک اور روایت' ایک نسبتاً تفصیلی توقیع کا ذکر کرتی ہے' جو امام حسن عسکری علیہ السلام کے بھائی جعفر کی جانب سے اُن کی جانشینی کے دعوے کے بعد امام زمانہؑ کی جانب سے صادر ہوئی اور اس میں بھی ائمۂ طاہرین علیہم السلام کی امامت کے مسئلے' ان کے علم و عصمت کا جائزہ لیتے ہوئے' حلال و حرام سے جعفر کی لاعلمی نیز حق و باطل اور محکم و متشابہ سے اس کی عدم شناسائی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے' یہ سوال کیا گیا ہے کہ ایسی صورت میں وہ کس طرح امامت کا دعویٰ کر رہا ہے؟(۲)

محمد بن ابراہیم بن مہزیار' جن کے والد امام حسن عسکری علیہ السلام کے وکیلوں میں سے تھے' اس بارے میں ان کا شک امام زمانہؑ کی جانب سے ایک مکتوب پانے کے بعد دور ہوا۔(۳)

اس بارے میں مزید روایات بھی موجود ہیں۔(۴) انہی میں ایک روایت امام مہدی علیہ السلام کی ایک توقیع پر مشتمل ہے' جس میں امامؑ نے شک کرنے والوں کے سامنے اپنے وجودِ مقدس کو ثابت کرتے ہوئے چند فقہی مسائل کا

۱۔ الغیبہ طوسی۔ ص ۱۷۲۔۱۷۳

۲۔ الغیبہ طوسی۔ ص ۱۷۲۔۱۷۶

۳۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۵۱۸

۴۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۵۱۸۔۵۱۹

جواب دیا ہے۔(۱) جیسا کہ ہم اس سے پہلے اشارہ کر چکے ہیں' نائبینِ خاص بارہویں امامؑ کے وجودِ مقدس کو ثابت کرنے پر اصرار کے ساتھ ساتھ شیعوں سے یہ بھی چاہتے تھے کہ وہ امامؑ کی امتیازی نشانیاں جاننے پر اصرار نہ کریں۔ یہ روش امامؑ کی حفاظت اور سلامتی کے لیے اختیار کی گئی تھی۔

ج: وکیلوں کو منظم کرنا

مختلف علاقوں کے معاملات چلانے اور شیعوں اور ائمہؑ کے درمیان رابطہ قائم کرنے کی غرض سے وکیلوں کے تعین کی پالیسی' کم از کم امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے بعد سے معمول تھی۔ غیبت کے آغاز کے بعد امامؑ کے ساتھ وکیلوں کا براہ راست رابطہ منقطع ہو گیا اور اس کی جگہ رابطے کا محور نائب خاص بن گیا' جسے امامؑ نے معین کیا تھا۔ شیعہ نشین علاقے ایک حد تک جانے پہچانے تھے' اور ضرورت کی بنیاد پر ہر علاقے میں وکیل مقرر کر دیا جاتا تھا۔ کبھی ان چند لوگوں کو جو کسی چھوٹے علاقے میں اپنی ذمے داری ادا کر رہے ہوتے تھے' کسی اور وکیل کی سرپرستی میں دے دیا جاتا تھا' جو غیبت سے پہلے امامِ وقت اور زمانۂ غیبت میں نائب خاص کے ذریعے ان کے لیے معین ہوتا تھا۔ یہ وکلا اموالِ شرعیہ کے طور پر جو مال لوگوں سے وصول کرتے تھے' وہ مختلف طریقوں سے بغداد میں نائب خاص کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے اور وہ ان اموال کو امامِ زمانہؑ کے حکم کے مطابق مخصوص کاموں میں خرچ کرتے تھے۔

بعض اوقات اس بات کا امکان بھی ہوتا تھا کہ وکیلوں میں سے کوئی وکیل ایک بار امامِ زمانہؑ سے ملاقات کا شرف حاصل کر لے۔ جیسا کہ نائب دوّم ابو جعفر کے ایک وکیل محمد بن احمد قطان امامؑ کی ملاقات سے شرفیاب ہوئے۔(۲) لیکن ان انتہائی شاذ و نادر ملاقاتوں کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ لوگ امامؑ کے ساتھ براہ راست رابطہ رکھتے تھے' بلکہ عام طور پر یہ ملاقاتیں نائب خاص کی موجودگی میں ہوتی تھیں۔ احمد بن متیل قمی کی روایت کے مطابق' ابو جعفر کے بغداد میں دس وکیل تھے' جن میں سے اُن سے نزدیک ترین حسین بن روح تھے' جو بعد میں امامؑ کے تیسرے نائب خاص مقرر ہوئے۔(۳)

ان کے نزدیکی ساتھیوں میں سے ایک اور ساتھی جعفر بن احمد بن متیل تھے۔ بہت سے شیعہ بزرگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ ابو جعفر کے جانشین مقرر کیے جائیں گے۔

ایک روایت یہ بتاتی ہے کہ لوگ جو اموال وکیلوں کو دیا کرتے تھے' ان کے مقابل ان سے رسید وصول کیا کرتے

۱۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۱۷۶

۲۔ کمال الدین۔ ص ۴۴۲

۳۔ الغیبہ طوسی۔ ص ۲۲۵

تھے۔ لیکن نائب خاص سے کسی رسید یا سند کا مطالبہ نہیں کیا جاتا تھا۔ لہٰذا جب ابوجعفر نے حسین بن روح کی نیابت خاص کا اعلان کیا' تو حکم دیا کہ ان سے رسید طلب نہ کی جائے۔(۱) اھواز' سامرا' مصر' حجاز' یمن' نیز ایران کے علاقوں جیسے خراسان' رے' قم وغیرہ میں امامؑ کے وکلا تھے' جن کے بارے میں مختلف مسائل و موضوعات پر اطلاعات طوسی کی "الــــغیبة" اور صدوق کی "کمال الدین" میں کہیں کہیں نظر آتی ہیں۔

د: امامِ زمانہؑ کو مخفی رکھنا

ایک روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امام عراق' مکہ اور مدینہ میں تھے اور اس طرح زندگی بسر کرتے تھے کہ اُن کے نائب خاص ان سے ملاقات کر سکتے تھے۔ اسی طرح کوئی صحابی بھی ان سے ملاقات کا شرف حاصل کر سکتا تھا' جیسا کہ محمد بن احمد قطان کے بارے میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اسی طرح ایک مرتبہ جب ابوطاہر محمد بن علی بن بلال' ابوجعفر عمری کی نیابت کے بارے میں شک کا شکار ہوئے' تو وہ انہیں امامؑ کی خدمت میں لے گئے' تاکہ وہ خود آپ کی زبانِ مبارک سے ابوجعفر کی نیابت کے بارے میں سُن لیں اور پھر ایک عام اجتماع میں ابوجعفر نے اُن سے اعتراف کروایا کہ حضرت قائم (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) نے حکم دیا ہے کہ شیعہ اپنے شرعی اموال ابوجعفر کے حوالے کریں۔(۲)

ان تمام باتوں کے باوجود' امامؑ اور ان کی خاص علامتوں کو خفیہ رکھنا' نائبینِ خاص کی ایک بنیادی ذمے داری تھی۔

جس زمانے میں حسین بن روح نوبختی' امامؑ کی نیابت کے منصب پر فائز ہوئے' تو اس دور میں شیعوں کے ایک بزرگ ابوسہل اسماعیل بن علی نوبختی' بغداد میں مقیم اور وہاں اعلیٰ مقام کے حامل تھے۔ حسین بن روح کی نیابت خاص پر تعیناتی کے بعد' ایک شخص نے ابوسہل سے (ابوسہل کی بجائے) حسین بن روح کے انتخاب کی حکمت دریافت کی' جس پر ابوسہل نے جواب دیا: جنہوں نے انہیں اس مقام کے لیے چنا ہے' وہ ہم سے زیادہ بصیرت رکھتے ہیں' کیونکہ میرا کام مخالفوں سے مناظرہ اور ان سے بحث کرنا ہے۔ اگر مجھے امام غائب کا مکان اس طرح سے معلوم ہوتا' جس طرح سے ابو القاسم (حسین بن روح) جانتے ہیں' تو شاید میں بحث و جدال کے دوران تنگ آ کر دشمن کو ان کے مکان سے آگاہ کر دیتا' جبکہ اگر امامؑ ابوالقاسم کے دامن کے نیچے مخفی ہوں' تب بھی وہ کسی کو ان کا پتا نہیں بتائیں گے' چاہے انہیں قینچی سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے۔(۳)

۱۔ الغیبہ طوسی۔ ص ۲۲۵۔ ۲۲۶

۲۔ الغیبہ طوسی۔ ص ۲۶ بہ نقل از تاریخ سیاسی غیبت امام دوازدہم۔ ص ۱۲۶

۳۔ الغیبہ طوسی۔ ص ۲۵۵ بہ نقل از خاندانِ نوبختی۔ ص ۲۱۷

غیبتِ کبریٰ میں امامؑ کے نام کو فاش کرنے کا جائز نہ ہونا

متعدد روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ زمانۂ غیبت میں امامِ زمانہؑ کو اُن کے اسمِ مبارک سے پکارنا جائز نہیں ہے۔

کیا یہ روش ایک خاص زمانے کے لیے سیاسی اقدام تھی یا آپ کے ظہور تک آپ کا نام لینا اسی طرح حرام رہے گا؟ اس بارے میں فقہا اور مورخین کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ ان روایات کو علامہ مجلسی نے "باب النهی عن التسمية" کے عنوان کے تحت جمع کیا ہے۔(۱)

عبداللہ بن جعفر حمیری سے روایت کی گئی ہے کہ: میں احمد بن اسحاق کے ہمراہ امامِ زمانہؑ کے نائب عثمان بن سعید کے پاس گیا ہوا تھا۔ میں نے عثمان بن سعید کو مخاطب کر کے کہا: میں حضرت ابراہیمؑ کی طرح' جنہوں نے فقط اطمینانِ قلب کے لیے خدا سے سوال کیا تھا' آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد میں نے پوچھا: کیا آپ نے صاحب الامر کو دیکھا ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ میں نے پوچھا: ان کا نام کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا:

"اِیّاکَ ان تبحث عن هذا' فانّ عند القوم انّ هذا النّسل انقطع." (۲)

''اس بارے میں ہرگز سوال نہ کرنا' کیونکہ یہ قوم (حکومت) یہ سمجھتی ہے کہ اس نسل کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے۔''

اس روایت سے یہ بات بخوبی سمجھی جا سکتی ہے کہ جب عباسیوں کو یہ اطمینان ہو گیا کہ امام حسن عسکری علیہ السلام کی کوئی اولاد نہیں ہے' تو انہوں نے اس معاملے پر مزید تگ ودو کرنا چھوڑ دی اور یہ بات امامؑ اور اُن کے شیعوں کے حق میں گئی۔

غیبتِ صغریٰ کے دوران آپ کی طرف سے صادر ہونے والی ایک توقیع میں آیا ہے کہ: ''ملعون ہے وہ شخص جو محفلوں میں میرا نام زبان پر لائے۔'' (۳)

یہ معاملہ حتیٰ امام علی نقی علیہ السلام کے زمانے ہی سے درپیش تھا اور آپ کے حکم سے طے پایا تھا کہ آپ کو صرف "الحجّة من آلِ محمد" کہا جائے گا۔(۴)

۱۔ بحارالانوار۔ ج ۵۱۔ ص ۳۰۔ ۳۴' اور دیکھئے: کافی۔ ج ۱۔ ص ۳۳۲۔ ۳۳۳۔ میر داماد نے "شرعة التسمية" میں اس حوالے سے بیس حدیثیں نقل کی ہیں۔

۲۔ بحارالانوار۔ ج ۵۱۔ ص ۳۳

۳۔ بحارالانوار۔ ج ۵۱۔ ص ۳۳' کمال الدین۔ ج ۲۔ ص ۴۸۳' الغیبہ طوسی۔ ص ۲۶۲' اعلام الوریٰ۔ ص ۴۳۲' شرعة التسمیه۔ ص ۶۰

۴۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۳۳۳

شیخ صدوق نے حتیٰ مشہور روایت "لوح" کے ذکر کے باوجود امامؑ کا نام لینے کے عدم جواز پر مبنی اپنا واضح عقیدہ بیان کیا ہے۔(۱)

اربلی ان روایات کی جانب اشارہ کرنے کے بعد، جن میں امام مہدی علیہ السلام کا نام لینے سے منع کیا گیا ہے اور امامؑ کی کنیت کے تذکرے کے بعد کہتے ہیں: شیعہ غیبت اوّل (صغریٰ) کے دوران امامؑ کے لیے "ناحیہ مقدس" کا لفظ استعمال کرتے تھے، اور یہ وہ رمز تھا جس سے شیعہ امامؑ کو پہچانتے تھے۔ ایک اور رمز (code word) "غریم" تھا جس سے ان کی مراد امامؑ ہوا کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ مزید فرماتے ہیں کہ: شیخ طوسی (۲) اور شیخ مفید پر تعجب ہے، کہ وہ امام کا نام لینے کی حرمت پر تاکید کرنے اور آپ کی کنیت بتانے کے بعد کہتے ہیں کہ: "اسمه اسم النبی و کنیته کنیته" (ان کا نام نبی کا نام اور ان کی کنیت نبی کی کنیت ہے) اور پھر یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے امامؑ کے نام اور آپ کی کنیت کو فاش نہیں کیا ہے! میں سمجھتا ہوں کہ یہ روش تقیے کی وجہ سے تھی، اور ایک ایسے زمانے میں اس کی پیروی کی جاتی تھی جب امامؑ کو تلاش کیا جارہا تھا اور آپ کی جان کو سخت خطرات لاحق تھے، لیکن اب ایسا نہیں ہے۔(۳)

اس مسئلے میں علمائے شیعہ کے درمیان اختلاف پایا جاتا تھا، اور بعد میں "میر داماد" نے اس بارے میں ایک استفتاء (۴) کے جواب میں "شرعة التسمية فی النهی عن تسمية صاحب الزمانؑ" نامی ایک کتاب تحریر کی اور اس میں نام لینے سے روکنے والی روایات میں موجود اطلاقات کی بنیاد پر اس بارے میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔(۵) علامہ آقا بزرگ نے اس بارے میں شیخ حر عاملی کی ایک کتاب "کشف التعمية فی جواز التسمية" کا ذکر کیا ہے۔(۶) اس کتاب کے نام سے بخوبی واضح ہے کہ شیخ حر عاملی نام لینے کے جائز ہونے کے طرفدار تھے، اس کی حرمت

۱۔ عیون اخبار الرضا۔ ج ۱۔ ص ۴۱

۲۔ اصل میں تو طبرسی ہے، لیکن طوسی درست ہونا چاہیے، کیونکہ آقا بزرگ نے بھی اس سخن کو نقل کرتے ہوئے طوسی لکھا ہے۔ دیکھیے: الذریعہ۔ ج ۱۳۔ ص ۱۷۸

۳۔ کشف الغمہ۔ ج ۲۔ ص ۵۱۹۔ ۵۲۰

۴۔ میر لوحی کے بقول: اس مسئلے پر شیخ بہائی اور میر داماد کے درمیان اختلاف نظر تھا۔ یہاں تک کہ میر داماد نے یہ رسالہ تحریر کیا۔ دیکھیے: فوائد الرضویہ۔ ص ۴۲۲

۵۔ دیکھیے: الذریعہ۔ ج ۱۴۔ ص ۱۷۸۔ ۱۷۹۔ یہ کتاب آقائے استادی کی تصحیح کے ساتھ مہدیہ میر داماد کے توسط سے اصفہان میں شائع ہوئی ہے۔

۶۔ الذریعہ۔ ج ۱۸۔ ص ۲۳۔ اس باب میں دوسرے رسالے بھی لکھے گئے ہیں، جن کا تذکرہ "شرعة التسمیه" پر آقائے استادی کے مقدمے میں آیا ہے۔

کے نہیں۔ کہا گیا ہے کہ انہوں نے یہ کتاب "شرعة التسمیة" نامی کتاب کی رد میں لکھی ہے۔

بعض روایات، جن کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں، اُن سے واضح طور پر یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ صرف سیاسی مشکلات ہی کی وجہ سے اس دور میں امامؑ کے نام لینے کو ناجائز قرار دیا گیا تھا۔ جیسا کہ اُس روایت میں جس کا ہم نے کچھ ہی پہلے ذکر کیا ہے صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ امام زمانہؑ کے پہلے نائب نے حمیری سے کہا: امامؑ کے نام کے بارے میں سوال کرنا تم پر حرام ہے، کیونکہ حکمراں یہ سمجھتے ہیں کہ گیارہویں امامؑ نے اس حال میں انتقال فرمایا ہے کہ اُن کا کوئی فرزند نہیں ہے اور اسی لیے ان کی میراث تقسیم کر دی گئی ہے۔۔۔ اگر ان کا نام فاش ہو گیا، تو وہ ان کی تلاش شروع کر دیں گے۔(۱)

اس صورت میں گہرائی کے ساتھ اس معاملے کی وضاحت کے لیے ان کتابوں کو دیکھنا چاہیے جو خصوصی طور پر اس بارے میں لکھی گئی ہیں، اور مسئلے کا تحقیقی جائزہ لینا چاہیے۔

غیبتِ صغریٰ کے دور میں تشیع کا فروغ

شاید عباسی حکومت میں ایک مضبوط گروہ کی حیثیت سے شیعوں کے نفوذ کا پہلا مرحلہ، امام علی رضا علیہ السلام کی ولایت عہدی کا معاملہ ہو۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس سے پہلے بھی امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی جانب سے علی بن یقطین کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ عباسی حکومت میں موجود رہیں اور وہاں رہتے ہوئے شیعوں کی مدد کریں۔(۲) امام علی رضاؑ کی ولی عہدی کے دور میں بظاہر تشیع نے بھی حکومتی رنگ اپنا لیا تھا۔ اس کے بعد مامون مسلسل اپنی شیعیت کا اظہار کیا کرتا تھا، اگرچہ اُس کی شیعیت، امامی شیعیت نہیں تھی، لیکن تشیع کا ایک رنگ ضرور شمار ہو سکتا تھا اور ممکن تھا کہ کچھ لوگ تشیع کی طرف مائل ہو جائیں۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ عراق آنے کے بعد مامون نے کوشش کی کہ امورِ مملکت شیعہ رجحان رکھنے والے افراد کے سپرد کرے۔ بعد میں جب وہ اہلِ سنت میں سے کچھ لوگوں کو بھی امورِ مملکت میں شریک کرنے پر راضی ہوا، تو اس وقت بھی اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ہر اہلِ سنت فرد کے ساتھ ایک شیعہ فرد کو بھی رکھا جائے۔(۳)

مامون اور معتصم کے بعد متوکل نے اس طریقۂ کار کو بدل دیا اور اہلِ حدیث کی حمایت شروع کر دی، جو شدت کے ساتھ معتزلہ اور شیعوں کے مخالف تھے۔ وہ علویوں کے ساتھ اپنی دشمنی میں یہاں تک آگے بڑھ گیا کہ حتیٰ اُس نے امام حسینؑ

۱۔ کافی۔ ج ۱۔ ص ۳۳۰

۲۔ بحارالانوار۔ ج ۴۸۔ ص ۱۳۶

۳۔ تاریخ تشیع در ایران۔ ص ۱۶۹

کا روضۂ مبارک مسمار کرنے کا حکم دے دیا اور کہا کہ اس کے اردگرد کی زمین پر ہل چلا کر اس میں کاشت کاری کی جائے۔(۱)
یہ سلسلہ بھی زیادہ عرصے جاری نہ رہ سکا اور ایسے خلفا کے برسر اقتدار آنے کے بعد جو کبھی سختی اور کبھی نرمی کے ساتھ اسی پالیسی پر عمل کرتے رہے' آخر کار سن ۲۹۵ ہجری میں مقتدر عباسی کے برسر خلافت آنے کے بعد بغداد اور دوسرے علاقوں میں تشیع کے فروغ کی راہ ہموار ہوئی۔

اس دور میں ہم جانتے ہیں کہ بہت سے ممتاز شیعہ افراد اہم حکومتی اور انتظامی عہدوں پر فائز تھے۔ اس سے پہلے ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ حکومتی عہدوں میں نفوذ کے۔لیے شیعہ بہت پہلے سے تیار تھے۔ شیخ طوسی نے نقل کیا ہے کہ حکم بن علیا نے کہا: میں بحرین کا فرمانروا تھا اور وہاں میں نے بہت مال جمع کر لیا تھا' جس میں کچھ میں نے انفاق کیا اور کچھ سے زمین وغیرہ خرید لی۔ کچھ عرصے بعد میں اس کا خمس لے کر امام محمد تقی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ امامؑ نے فرمایا: تمہارے پاس جتنا مال ہے' وہ سب ہمارا ہے' لیکن ہم وہی مال قبول کرتے ہیں جو تم لائے ہو اور باقی تمہیں بخشتے ہیں۔(۲)
نجاشی نے "حمدویہ" سے نقل کیا ہے کہ محمد بن اسماعیل بن بزیع اور احمد بن حمزہ' حکومتی وزرا میں شامل تھے۔ "حمدویہ" امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے شیعہ تھے اور انہوں نے امام محمد تقی علیہ السلام کا دور بھی پایا ہے۔(۳)
حسین بن عبداللہ نیشاپوری' جو امام محمد تقی علیہ السلام کے شیعہ تھے' ایک مدت تک سیستان کی حکومت ان کے پاس رہی۔(۴) نوح بن درّاج' اُن شیعوں میں سے تھے جو کوفہ کے قاضی شمار کیے جاتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ انہوں نے اپنے بھائی جمیل بن درّاج سے' جو امام جعفر صادق علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھے (کوفہ میں قضاوت کی) اجازت لی ہے۔(۵)
حکومتی نظام میں امامی شیعوں کی شمولیت کا سلسلہ آخری ائمہؑ کے دور میں وسعت اختیار کر گیا تھا۔ امام حسن عسکریؑ کے دور اور ان کے بعد غیبت صغریٰ کے زمانے میں' بہت سے شیعوں نے عباسی حکومت میں کئی اہم عہدے حاصل کیے۔ ہم جانتے ہیں کہ مشہور شیعہ امامی مؤرخ یعقوبی سیکریٹری کے عہدے پر فائز تھے۔ اسی لیے وہ "کاتب" کے نام سے مشہور ہوئے۔ علی بن محمد بن زیاد بھی شیعوں میں سے تھے' جن کا بہنوئی جعفر بن محمد وزیر تھا' اور جو حکومت میں ایک اہم عہدہ حاصل

۱۔ مقاتل الطالبین۔ ص ۴۷۸
۲۔ الاستبصار۔ ج ۲۔ ص ۵۸
۳۔ رجال النجاشی۔ ص ۲۳۳
۴۔ کافی۔ ج ۵۔ ص ۱۱۱
۵۔ رجال کشی۔ ص ۲۵۱

کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ انہوں نے کتاب ''الاوصیاء'' لکھی تھی' جس سے علامہ مجلسی نے نقل کیا ہے اور اس کا ذکر کیا ہے۔(۱)

اس دور کی اہم بات یہ تھی کہ شیعوں نے تمام تر دشواریوں کے باوجود اس قسم کے اہم مقام حاصل کیے اور بغداد میں اپنی پوزیشن کو مستحکم کیا۔ اس زمانے میں شیعوں سے عباسیوں کی دشمنی کے علاوہ' زیدی شیعوں کی شورشوں' قرامطہ اور اسماعیلیوں کی تحریکوں نے امامی شیعوں کے لیے کئی خطرات پیدا کر دیے تھے۔ کیونکہ بہر صورت شیعہ کا نام ان سب کے درمیان مشترک تھا۔ ان حالات میں امامی شیعوں نے کوشش کی کہ اپنے آپ کو ان گروہوں سے دور رکھیں اور بغداد پر اپنے کنٹرول کو مضبوط بنائیں۔

عباس اقبال نے' ابو سہل اسماعیل بن علی نوبختی (۲۳۷ ہجری سے ۳۱۱ ہجری) کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے' اس دور میں شیعیت کے فروغ اور عباسی حکومت کی انتظامیہ میں ان کے اثر ورسوخ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے:

''ابو سہل' کم از کم خلیفہ مقتدر کی خلافت کے ابتدائی دور اور ابن فرات کی وزارت کے زمانے میں دربار کے اندر غیر معمولی اثر ورسوخ کا مالک تھا اور اس دور یعنی غیبت صغریٰ کے ایام میں' جس میں خاندانِ نوبخت کے دوسرے افراد بھی' جیسے ابو الحسین علی بن عباس (وفات ۳۲۴ ہجری) اور ابو القاسم حسین بن روح (۳۲۶ ہجری) بغداد میں طاقت واقتدار کے مالک تھے' فرقۂ امامیہ کے افراد ابو سہل اسماعیل بن علی کی رہنمائی میں عزت وشوکت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔''

وہ آلِ فرات کی وزارت اور ان کی جانب سے آلِ ابی طالب کی پشت پناہی کے بارے میں لکھتا ہے:

''اہلِ سنت کے کئی مخالفین (عموماً اور فرقۂ امامیہ خصوصاً) آلِ فرات کی پشت پناہی کے زیر سایہ فروغ پاتے رہے۔''(۲)

اقبال' امام زمانہؑ کے تیسرے نائب حسین بن روح کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: حسین بن روح' اپنے نائب امام بننے سے حامد بن عباس کی وزارت کے دور (جمادی الثانی سن ۳۰۶ ہجری سے ربیع الثانی سن ۳۱۱ ہجری) تک بغداد میں پورے عزت واحترام کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے اور ان کے گھر میں امیروں' معزول شدہ وزیروں اور دوسرے اہم افراد کی رفت وآمد جاری رہتی تھی۔۔۔۔۔ قید سے رہائی کے بعد' حسین بن روح ایک مرتبہ پھر بغداد

۱۔ بحار الانوار۔ ج ۵۱۔ ص ۳۲۳ اور دیکھیے: تاریخ سیاسی غیبت امام دوازدہم۔ ص ۲۱۰

۲۔ خاندانِ نوبختی۔ ص ۹۶۔ ۹۹

میں اسی عزت و احترام کے ساتھ شیعوں کے دینی امور کی تنظیم میں مشغول ہو گئے اور امامی شیعوں کے ذمے جو اموال ہوا کرتے تھے وہ حسین بن روح کو پہنچاتے تھے۔ کیونکہ اس دور میں آلِ نوبخت کے چند افراد جیسے ابو یعقوب اسحاق بن اسماعیل (م: ۳۲۲ ہجری) اور ابو الحسین علی بن عباس (م: ۳۲۴ ہجری) اور ابو عبداللہ حسین بن علی نوبختی (م: ۳۲۶ ہجری) خلفا اور لشکر کے امرا کے دربار میں اہم مقام پر فائز تھے اس لیے کوئی ابو القاسم حسین بن روح کے لیے کسی قسم کی مشکلات پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ (۱)

شیخ صدوق نے بھی مخالفین کے قول سے امامِ زمانہؑ کی غیبت پر ایک اعتراض نقل کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اموی دور میں جبکہ مشکلات کہیں زیادہ تھیں' ائمہؑ نے غیبت اختیار کیوں نہیں کی' لیکن ایک ایسے دور میں جبکہ شیعوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی اور وہ حکومتی افراد اور صاحبانِ اقتدار کے ساتھ دوستی کی وجہ سے بااثر بھی ہو گئے تھے' غیبت کیوں اختیار کی گئی؟ اس نقل میں' اس دور میں شیعوں کے سیاسی اثر و رسوخ کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ شیخ صدوق کا جواب یہ ہے کہ اس زمانے میں ائمہؑ کے اقدامات سیاسی نہیں تھے اور ائمہؑ کے لیے قیام بالسیف (مسلح جدوجہد) کا کوئی سلسلہ نہیں تھا' لیکن امام زمانہؑ کے بارے میں ''قائم'' ہونے اور قیام بالسیف کا معاملہ موجود تھا اور اسی وجہ سے اس پہلو سے بہت زیادہ خطرات کا امکان تھا۔ (۲)

یہاں جو چیز قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ ایک طرف تو شیعہ عباسیوں کی قیادت کو ناجائز سمجھتے تھے' اور دوسری طرف اُن کی حکومت میں وزارت تک کے عہدوں پر کام کیا کرتے تھے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جو مدتوں شیعوں کی سیاسی فقہ میں زیرِ بحث رہا ہے اور فقہا کی کتابوں میں اس کے بارے میں جو متعدد اقوال بیان ہوئے ہیں' اُن کے علاوہ سید مرتضیٰ نے خاص اس بارے میں ایک رسالہ تحریر کیا ہے' جس کا ذکر ہم نے ایک دوسرے مقام پر تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ (۳)

امام مہدیؑ کی سیرت

امامِ زمانہ علیہ السلام کے حالات' اختصار کے ساتھ بیان کرنے کے بعد' ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس مجموعے کے حُسنِ اختتام کے طور پر ظہور کے بعد امامِ زمانہؑ کی سیرت کے بارے میں کچھ روایات نقل کریں۔ اس بارے میں جو کچھ

۱۔ خاندانِ نوبختی۔ ص ۲۱۷۔ ۲۲۰

۲۔ کمال الدین۔ ص ۴۵

۳۔ دیکھیے: ''دین و سیاست در دورۂ صفوی'' اس کی پہلی فصل ''مبانی فقہی مشارکت علما در دولت صفوی'' کے عنوان سے ہے۔ سید مرتضیٰ کے رسالے کا عنوان ''مسألة فی العمل مع السلطان'' ہے جو ''رسائل الشریف المرتضیٰ'' کی جلد ۲ صفحہ ۸۹ تا ۹۷ پر طبع ہوا ہے۔

استاد محمد رضا حکیمی نے اپنی گرانقدر کتاب ''خورشیدِ مغرب'' میں بیان کیا ہے' اسے ہو بہو نقل کرتے ہوئے ان روایات کے مضمون کے علاوہ استاد کے ادیبانہ طرزِ نگارش سے بھی استفادہ کریں گے:

الف: سیرتِ دینی

مہدی علیہ السلام خدا اور اس کے جلال کے مقابل اس طرح متواضع ہیں جیسے شاہین' جب وہ اپنے پروں کو سمیٹ کر اور سر کو جھکا کر آسمان کی بلندی سے نیچے آتا ہے۔ مہدیؑ جلالِ الٰہی کے سامنے فروتن ہیں۔ خدا اور اس کی عظمت ان کے وجود سے چھلکتی ہے' اور اُس نے ان کے پورے وجود کو اپنے اندر ڈبو لیا ہے۔(۱)

مہدیؑ عادل ہیں اور مبارک اور پاکیزہ' وہ حق سے ذرہ برابر غفلت نہیں برتیں گے۔ خدا اُن کے ذریعے دین اسلام کو سربلندی عطا کرے گا۔۔۔ مہدیؑ کے دل میں ہمیشہ خوفِ خدا موجزن ہے' وہ خدا سے قربت کے جس مقام پر فائز ہیں اُس پر مغرور نہیں ہوتے۔ وہ دنیا سے دل نہیں جوڑیں گے اور نہ اپنے لیے کچھ بنائیں گے۔ ان کی حکومت میں کسی کو تکلیف نہیں پہنچے گی' مگر یہ کہ خدا کی مقرر کی ہوئی حد جاری کی جائے۔(۲)

ب: سیرتِ خُلقی

مہدیؑ صاحبِ حشمت' پرسکون و پروقار ہیں۔ وہ کھردرا کپڑا زیبِ تن کریں گے اور نانِ جویں کھائیں گے۔ ان کا علم و حلم تمام لوگوں سے زیادہ ہوگا۔ مہدیؑ پیغمبر اکرمؐ کے ہم نام ہیں (محمدؐ) اور ان کا اخلاق اخلاقِ محمدیؐ ہے۔(۳)

مہدیؑ دنیا میں ہدایت کی روشن مشعل کے ساتھ رہیں گے اور صالحین کی طرح زندگی گزاریں گے۔(۴)

ج: سیرتِ عملی

انقلابِ مہدیؑ کے زمانے میں محبت ہی محبت' یگانگت ہی یگانگت ہوگی' یہاں تک کہ جس کو جس چیز کی بھی ضرورت ہوگی' وہ بلا روک ٹوک دوسرے کے مال سے اٹھا لے گا۔(۵)

مہدیؑ کے زمانے میں' لوگ ایک دوسرے کے ساتھ سودا کرتے ہوئے منافع نہیں لیں گے۔(۶) دلوں سے

۱۔ المہدی الموعود۔۔۔ ج ۱۔ ص ۲۸۰ اور ۳۰۰

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً۔ ج ۱۔ ص ۲۸۱۔ ۲۸۲ اور ۲۶۶ اور ۳۰۰

۴۔ ایضاً

۵۔ الاختصاص۔ ص ۲۴

۶۔ وسائل الشیعہ۔ ابوابِ تجارت

دشمنیاں دور ہو جائیں گی اور ہر جگہ سکون واطمینان اور امن وامان ہو گا۔(۱)

مہدیؑ دریادل ہیں وہ بے دریغ لوگوں کو مال ودولت سے نوازیں گے ان کی خواہشات پوری کریں گے۔ وہ اپنے عہدیداروں وزیروں اور حکومتی اہلکاروں کے لیے بہت سخت گیر ہوں گے اور کمزوروں اور لاچاروں کے لیے انتہائی رحم دل اور مہربان۔(۲)

علامة المهديّ ان يكونَ شديداً علَى العُمّال جواداً بِالمال رَحيماً بِالمَساكين. (۳)

''مہدی کی علامت یہ ہے کہ وہ اپنے اہلکاروں کے ساتھ سختی سے پیش آئیں گے مال کے معاملے میں فیاض ہوں گے اور مساکین پر رحیم ہوں گے۔''

مہدیؑ کا طرز عمل ایسا ہو گا گویا اپنے ہاتھوں سے مکھن اور شہد مفلس ولاچار لوگوں کے منہ میں رکھ رہے ہوں۔(۴) مہدیؑ امیر المومنین حضرت علیؑ کی طرح زندگی بسر کریں گے سوکھی روٹی کھائیں گے اور پارسائی کے ساتھ زندگی گزاریں گے۔(۵)

و: سیرتِ انقلابی

مہدیؑ ہر حقدار کا حق لے کر اسے دیں گے حتیٰ اگر کسی کا حق دوسرے کے دانتوں تلے دبا ہوا ہو تب بھی غاصب کے دانتوں سے وہ حق کھینچ کر اسے حقدار تک پہنچائیں گے۔(۶)

جب مہدیؑ قیام کریں گے تو جزیہ اٹھا لیا جائے گا اور کوئی غیر مسلم نہیں رہے گا۔ وہ لوگوں کو تلوار سے خدا کے دین کی طرف دعوت دیں گے اور جو قبول نہیں کرے گا اس کی گردن اڑا دیں گے اور جو سرکشی کرے گا اسے کچل کے رکھ دیں گے۔(۷) مہدیؑ کوفہ شہر میں داخل ہو کر ہر منافق اور شک کرنے والے کو قتل محلوں کو مسمار اور وہاں موجود فوجوں کو تہس نہس

۱۔ بحار الانوار۔ ج ۱۰
۲۔ المہدی الموعود۔۔۔ ج ۱۔ ص ۲۷۶۔۲۷۷
۳۔ ایضاً
۴۔ ایضاً۔ ج ۱۔ ص ۲۹۷
۵۔ الغیبہ نعمانی' بحار الانوار۔ ج ۵۲۔ ص ۳۵۹
۶۔ المہدی الموعود۔۔۔ ج ۱۔ ص ۲۷۹' ۲۸۲۔۲۸۳
۷۔ ایضاً

کردیں گے۔ ظالموں اور اُن کے مددگاروں کو اس طرح قتل کریں گے کہ خدا ان سے راضی اور خوش ہو جائے۔ (۱)

مہدیؑ زکات کا انکار کرنے والے (۲) کو قتل کر دیں گے۔ زانی مُحصن کو گواہ طلب کیے بغیر سنگسار کریں گے۔ (۳)

زُرارة بن اعین کہتے ہیں: میں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا: کیا قائمؑ لوگوں کے ساتھ نبی کی طرح سلوک کریں گے؟ فرمایا: ہیہات! ہیہات! (ہرگز نہیں) پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کے ساتھ نرمی سے پیش آتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ دین کی راہ میں لوگوں کی محبت حاصل کریں اور تالیفِ قلوب کریں۔ لیکن قائمؑ تلوار اور قتل کے ساتھ لوگوں کا سامنا کریں گے۔ خدا نے انہیں یہ حکم دیا ہے کہ وہ قتل کریں اور کسی کی توبہ قبول نہ کریں۔ افسوس اس شخص پر جو مہدیؑ سے جنگ آزما ہو۔ (۴)

مہدیؑ صرف اور صرف تلوار کو جانتے ہیں وہ کسی کی توبہ قبول نہیں کریں گے اور حکمِ خدا کے نفاذ اور دین خدا کو استحکام دینے کی خاطر نہ کسی کی بات سنیں گے اور نہ کسی کی ملامت پر کان دھریں گے۔ (۵)

ھ: سیرتِ سیاسی

مہدیؑ کی حکومت کے وقت ظالموں جابروں اور متکبروں کی حکومت اور منافقوں اور خیانت کاروں کے سیاسی اثر ورسوخ کا خاتمہ ہو جائے گا۔ (۶)

شہرِ مکہ مسلمانوں کا قبلہ اور مہدیؑ کی انقلابی تحریک کا مرکز ہوگا۔ اُن کے قیام میں شریک ہونے والے ابتدائی افراد اسی شہر میں جمع ہوں گے اور وہیں ان کے ساتھ شامل ہوں گے۔

مہدیؑ دنیا سے یہودیوں اور عیسائیوں کے نفوذ کا خاتمہ کر دیں گے۔ انطاکیہ کے غار سے تابوتِ سکینہ نکالیں گے۔ توریت اور انجیل کے اصل نسخے اسی میں ہیں۔ اس طرح وہ توریت کو ماننے والوں کے درمیان توریت سے اور انجیل کو ماننے والوں کے درمیان انجیل سے فیصلے کریں گے اور انہیں اپنی اتباع کی دعوت دیں گے جسے کچھ لوگ قبول کر لیں گے۔ (۷)

۱۔ ارشاد بحار الانوار۔ ج ۵۲۔ ص ۳۳۸

۲۔ جو لوگ زکات ادا نہیں کرتے۔

۳۔ کمال الدین بحار الانوار۔ ج ۵۲۔ ص ۳۲۵

۴۔ الغیبہ نعمانی بحار الانوار۔ ج ۵۲۔ ص ۳۵۵

۵۔ ایضاً

۶۔ المہدی الموعود۔۔۔۔ ج ۱۔ ص ۲۵۲

۷۔ ایضاً۔ ج ۱۔ ص ۲۵۳۔ ۲۵۵

دوسروں کے ساتھ جنگ کریں گے' نہ کوئی صاحب اقتدار بچے گا اور نہ کوئی صاحب مذہب (خواہ وہ اہل کتاب سے ہو یا کسی اور مسلک ومذہب سے)۔ پھر اسلام کی سچی حکومت اور قرآن کی عادلانہ سیاست کے سوا کوئی سیاست اور کوئی حکومت باقی نہیں رہے گی۔ اس طرح مہدیؑ کی حکومت مشرق ومغرب پر محیط ہو جائے گی۔ عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے زمین پر تشریف لے آئیں گے اور مہدیؑ کے پیچھے نماز ادا کریں گے' اور بلند آواز سے کہیں گے: "بیت المقدس کا دروازہ کھولو!" دروازہ کھول دیا جائے گا۔ اس دوران دجال ستر ہزار مسلح یہودیوں کے ساتھ سامنے آئے گا۔۔۔۔ اور جب حضرت عیسیٰ دجال کو قتل کرنے کا ارادہ کریں گے' تو وہ فرار ہو جائے گا۔ عیسیٰ کہیں گے: میں تجھے ایک ضربت سے قتل کر دوں گا اور ایسا ہو گا۔ اسے پکڑیں گے اور قتل کر دیں گے۔ یہودی بچنے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگیں گے اور ہر درخت و پتھر اور جانور وغیرہ کی پناہ لینے کی کوشش کریں گے۔ لیکن ہر چیز بول اٹھے گی اور چلّائے گی: اے خدا کے مسلمان بندے! یہاں ایک یہودی ہے' آ کر اسے قتل کر دے۔ (۱)

اس طرح دنیا یہودیوں کے وجود سے پاک ہو جائے گی۔ ہاں! جب مہدیؑ قیام کریں گے' تو کوئی ایسی سرزمین نہیں باقی نہ رہے گی جہاں سے "اشہدان لا الہ الا اللہ واشہدان محمد ارسول اللہ" کی آواز بلند نہ ہو۔ (۲)

و: سیرتِ تربیتی

مہدیؑ کے دورِ حکومت میں' تمام لوگوں کو علم وحکمت کی تعلیم دی جائے گی۔ یہاں تک کہ گھروں کے اندر عورتیں کتاب وسنت سے فیصلے کیا کریں گی۔ (۳) اس زمانے میں عام انسانوں کی عقل کی طاقت متمرکز ہو جائے گی۔ مہدیؑ تائیدِ خداوندی سے لوگوں کی عقلوں کو کمال تک پہنچائیں گے اور تمام لوگوں میں دانائی پیدا ہو جائے گی۔ (۴) مہدیؑ کی حکومت کے زمانے میں شیعوں سے مصائب ومشکلات دور ہو جائیں گی' اور ان کے دل فولادی ہو جائیں گے۔ ایک شخص طاقت میں چالیس مردوں کے برابر ہو گا اور زمین کی حکومت اور سربراہی ان کے ہاتھ میں آ جائے گی۔ (۵)

ز: سیرتِ اجتماعی

جب مہدیؑ آئیں گے' تو (سختیوں اور جنگوں کے بعد) ظلم وستم کا خاتمہ کر دیں گے اور پوری زمین کو عدل وانصاف

۱۔ المہدی الموعود۔۔۔۔۔ ج ۲۔ ص ۵۔۷

۲۔ تفسیر عیاشی' بحار الانوار۔ ج ۵۲۔ ص ۳۴۰

۳۔ بحار الانوار۔ ج ۵۲۔ ص ۳۵۲

۴۔ اصول کافی۔ ج ۱۔ کتاب العقل۔ حدیث ۲۱

۵۔ خصال صدوق' خرائج راوندی' بحار الانوار۔ ج ۵۲۔ ص ۳۱۷' ۳۳۵

سے بھر دیں گے۔ زمین پر کوئی چیز باقی نہیں رہے گی مگر یہ کہ وہ امامؑ کے عدل واحسان کی برکت سے فیض حاصل کر کے زندہ ہو جائے گی۔ یہاں تک کہ حیوانات اور نباتات بھی اس برکت، عدل وانصاف اور نیکی سے فیض اٹھائیں گے۔(۱) تمام لوگ مہدیؑ کے دورِ حکومت میں تونگر اور بے نیاز ہو جائیں گے۔(۲)

مہدیؑ کی عدالت ایسی ہوگی کہ کسی پر، کسی بھی معاملے میں، کسی بھی قسم کا ظلم نہیں ہوگا۔ ان کی عدالت کی سب سے پہلی علامت یہ ہے کہ ان کی حکومت کے ترجمان مکہ میں بلند آواز سے کہیں گے: ''جس نے حجرِ اسود کے نزدیک، محلِ طواف میں واجب نماز پڑھ لی ہے اور اب وہ نافلہ نماز پڑھنا چاہتا ہے، تو ایک طرف ہو جائے، تاکہ کسی کا حق پامال نہ ہو، اور جو کوئی واجب نماز پڑھنا چاہتا ہے، وہ آ جائے اور نماز پڑھ لے۔''(۳)

ح: سیرتِ مالی

دنیا کا تمام مال ودولت، جو کچھ زمین کے اندر ہے اور جو کچھ اس کے اوپر، سب مہدیؑ کے پاس اکٹھا ہوگا۔ پھر وہ لوگوں سے کہیں گے: ''آؤ اور آکر یہ اموال لے جاؤ! یہ وہی چیز ہے جسے حاصل کرنے کے لیے تم نے قطعِ رحم کیا اور اپنے رشتے داروں کو خفا کیا تھا، ناحق خون بہائے تھے اور گناہوں کے مرتکب ہوئے تھے، اب آؤ اور اسے لے جاؤ!''

پھر اس طرح مال عطا کرنا شروع کریں گے کہ اس وقت تک کسی نے اس طرح اموال کی بخشش نہ کی ہوگی۔(۴)

مہدیؑ کے زمانے میں زمین بہت فصل دے گی اور سب کی مرادیں بر آئیں گی۔ جو بھی مہدیؑ کے پاس آکر کہے گا کہ: ''مجھے کچھ مال دیجیے!'' مہدیؑ بے درنگ کہیں گے: ''لے جاؤ۔''(۵)

مہدیؑ لوگوں کے درمیان اموال کو مساوی طور پر تقسیم کریں گے۔(۶) اور کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دیں گے۔(۷)

ط: سیرتِ اصلاحی

مہدیؑ وہ فریادرس ہیں جنہیں خدا نے دنیا بھر کے لوگوں کی فریادرسی کے لیے بھیجا ہے۔ ان کے دور میں سب لوگوں

۱۔ بحار الانوار۔ ج ۱۰۔ اس بارے میں متعدد اور معروف روایات موجود ہیں۔

۲۔ بحار الانوار۔ ج ۵۱۔ ص ۱۳۶

۳۔ کافی۔ ج ۳۔ ص ۴۲۷

۴۔ علل الشرائع صدوق، بحار الانوار۔ ج ۵۱۔ ص ۲۹

۵۔ کشف الغمہ اربلی، کفایۃ الطالب گنجی شافعی، بحار الانوار۔ ج ۵۱۔ ص ۸۸

۶۔ کتاب خورشید مغرب کی تیرہویں فصل بعنوان ''تساوی در اموال'' کو بھی ملاحظہ فرمایئے۔

۷۔ المہدی الموعود۔۔۔۔ ج ۱۔ ص ۲۶۳، ۲۷۵، ۲۷۷، ۲۸۵، ۲۸۷، ۲۸۸، ۳۱۱، ۳۱۸ اور جلد ۲ صفحہ ۱۱

کو رفاہ و آسائش اور نعمتوں کی بے مثال فراوانی میسر ہوگی۔ حتیٰ چوپائے بھی بکثرت ہو جائیں گے اور دوسرے جانور بھی خوش اور آسودہ ہوں گے۔ زمین کثرت کے ساتھ فصلیں اگائے گی' نہروں میں پانی کی مقدار بڑھ جائے گی' زمین کے خزانے' دفینے اور دوسری معدنیات نکالی جائیں گی۔(۱) مہدیؑ کے زمانے میں فتنوں اور شورشوں کی آگ سرد ہو جائے گی' ظلم و ستم اور قتل و غارتگری کا خاتمہ ہو جائے گا اور جنگیں ختم ہو جائیں گی۔(۲)

مہدیؑ دنیا کے لوگوں کو ایک بڑے' پوری دنیا پر محیط اور لاینحل فتنے سے نجات دلائیں گے۔(۳)

دنیا میں کوئی ویران جگہ ایسی نہیں رہے گی جسے مہدیؑ آباد نہ کردیں گے۔(۴)

قائمؑ کے اصحاب پوری دنیا میں پھیل جائیں گے اور ہر جگہ کا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔ ہر شخص اور ہر چیز ان کی مطیع ہو جائے گی۔ یہاں تک کہ جنگلی درندے اور شکاری پرندے' سب کے سب' ان کی رضا و خوشنودی کے طلبگار ہوں گے۔ دین' صلاح اور عدالت کا پیغام لانے والے اس شخص کی وجہ سے خوشی کا یہ عالم ہوگا کہ زمین کا ایک حصہ دوسرے حصے پر اس لیے فخر کرے گا کہ اس کے اوپر امامؑ کے کسی صحابی نے قدم رکھا ہے۔(۵) قائمؑ کا ہر صحابی طاقت میں چالیس مردوں کے برابر' اور ان کے قلوب فولاد کی مانند ہوں گے۔ اگر ان کی راہ میں آہنی پہاڑ بھی آجائیں' تو یہ انہیں بھی ریزہ ریزہ کردیں گے۔ جب تک خدا راضی نہ ہو جائے اُس وقت تک قائمؑ کے اصحاب اپنی تلواریں زمین پر نہیں رکھیں گے:

لَا یَکُفُّونَ سُیُوفَهُم حَتّیٰ یَرضَی اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ.(۶)

ہاں' جب دنیا فتنہ و آشوب سے بھر چکی ہوگی' اور ہر طرف غارتگری' ظلم و ستم اور فساد کا دور دورہ ہوگا' تو خداوند عالم عظیم مصلح کو بھیجے گا' تاکہ وہ ضلالت و گمراہی کے قلعوں کو مسمار کرے' اور توحید' انسانیت اور عدالت کے نور سے تاریک اور پتھر بن جانے والے دلوں کو منور کردے۔(۷)

آخر کار امام مہدیؑ کی اخلاقی سیرت کے حوالے سے ہم نہج البلاغہ میں حضرت علیؑ کے کلام تک پہنچتے ہیں' یہ بیٹے کے حق میں باپ کی گواہی ہے: جب مہدیؑ آئیں گے' تو ہوا پرستی کو خدا پرستی میں تبدیل کردیں گے' بعد اس کے کہ لوگ خدا

۱۔ المہدی الموعود۔۔۔۔ج ۱۔ص ۲۶۳' ۲۷۵' ۲۷۷' ۲۸۵' ۲۸۷' ۲۸۸' ۳۱۱' ۳۱۸' اور جلد ۲ صفحہ ۱۱

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً

۵۔ کمال الدین' بحار الانوار۔ ج ۵۲۔ ص ۳۲۷

۶۔ ایضاً

۷۔ المہدی الموعود۔۔۔۔ج ۱۔ص ۳۱۰

پرستی کو ہوا پرستی میں تبدیل کر چکے ہوں گے۔ رائے اور فکر کو قرآن کی طرف پلٹا دیں گے' اس کے بعد کہ لوگ قرآن کو اپنی آرا اور افکار کی طرف پلٹا چکے ہوں گے۔۔۔۔۔ وہ اپنے اہلکاروں اور عاملوں کا مواخذہ کریں گے۔ زمین اپنی گہرائیوں میں جو کچھ رکھے ہوگی' اسے ان کے لیے باہر نکال دے گی اور اپنے تمام وسائل اور برکتوں کو ان کے حوالے کر دے گی۔ اس وقت مہدیؑ تم کو بتائے گا کہ عدل کی سیرت کیا ہے اور کتاب وسنت کو زندہ کرنا کسے کہتے ہیں۔"(۱)

ی: سیرت قضائی

امام مہدیؑ کی حکومت میں فیصلوں اور احکام میں کسی پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا' اور کسی کا دل رنجیدہ نہیں ہوگا۔(۲)

امام مہدیؑ دین کے خالص احکام کے مطابق (نہ کہ دوسروں کے خیالات اور مختلف مذاہب کے علما اور فقہا کے افکار کے مطابق) حکم دیں گے اور حکومت کریں گے۔(۳)

امام مہدیؑ' لوگوں کے درمیان میزانِ عدل قائم کریں گے' اور اس طرح کوئی بھی کسی دوسرے پر ظلم نہیں کر سکے گا۔(۴)

مہدیؑ' ایک نئی قضاوت لائیں گے۔۔۔۔۔(۵) مہدیؑ' داؤد اور آلِ داؤد کی طرح فیصلے کریں گے اور لوگوں سے گواہ طلب نہیں کریں گے۔

شیخ مفید کہتے ہیں: جب قائمِ آلِ محمد علیہ السلام قیام کریں گے' تو حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح' یعنی باطن کے اعتبار سے قضاوت کریں گے اور کسی گواہ کی ضرورت کے بغیر فیصلہ صادر کریں گے۔ خدا ان پر فیصلے کا الہام کرے گا' اور وہ خدا کے الہام کی بنیاد پر حکم دیں گے۔ مہدیؑ' ہر گروہ کے خفیہ منصوبوں سے واقف ہوں گے اور انہیں ان کے منصوبوں کے بارے میں بتایا کریں گے۔ امام مہدیؑ اپنے دوستوں اور دشمنوں کو ایک نظر میں پہچان لیں گے۔(۶)

☆☆☆

۱۔ نہج البلاغہ۔ فیض الاسلام۔ ص ۴۲۴۔۴۲۵

۲۔ المہدی الموعود۔۔۔ ج ۱۔ ص ۲۸۰' ۲۸۳۔۲۸۴

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً

۵۔ غیبت نعمانی' بحار الانوار۔ ج ۵۲۔ ص ۳۳۹ اور ۳۵۴

۶۔ ارشاد۔ ص ۳۶۵۔۳۶۶

فہرستِ منابع

۱۔ ائمتنا، محمدعلی دُخَیِّل، بیروت، دارالمرتضی۔

۲۔ائمۃ الاثنی عشر، ابن طولون، تحقیق صلاح الدین منجد، قم، منشورات الرضی۔

۳۔ ائمۃ الاثنی عشر، عادل الادیب، بیروت، دارلاضواء۔

۴۔الاتحاف بحب الاشراف، الشبراوی، مصر۔

۵۔ اثبات الوصیّہ، مسعوی، قم، منشورات رضی۔

۶۔اثبات الهداة، شیخ حر العاملی، قم، ۱۴۰۱ ق۔

۷۔ الاحتجاج، طبرسی، نجف، مطبعۃ النعمان، ۱۳۸۴ ق، افست قم، کتابفروشی قدس محمدی۔

۸۔ احسن التقاسیم، المقدسی، بیروت، مکتبۃ الخیاط۔

۹۔ الاحکام فی اصول الاحکام، سیف الدین الآمدی، تحقیق شیخ ابراهیم العجوز، بیروت، دارالکتب العلمیۃ، ۱۴۰۵ ق۔

۱۰۔ اخبار اصبهان، حافظ ابونعیم اصبهانی، تهران، مؤسسۃ النصر، افست ازروی جاپ لیدن ۱۹۳۴م۔

۱۱۔ اخبار الطوال، ابوحنیفۃ الدینوری، تحقیق: عبدالمنعم عامر، قاهره، ۱۹۶۰م۔

۱۲۔ الاختصاص، (منسوب به) شیخ مفید، قم، انتشارات اسلامی۔

۱۳۔ اختیار معرفۃ الرجال (رجال کشی)، الطوسی، تحقیق مصطفوی، مشهد، دانشگاه مشهد۔

۱۴۔ الارشاد فی معرفة حجج الله علی العباد،محمد بن محمد بن النعمان الشیخ المفید،قم، بصیرتی۔ (اور اس پر تحقیق موسسۃ آل البیتؑ قم، ۱۴۱۳ق)

۱۵۔ الاستیعاب،ابن عبدالبر القرطبی (الاصابہ کے حاشیے پر طبع شدہ) بیروت،داراحیاء التراث العربی۔

۱۶۔ اسد الغابہ،ابن الاثیر،بیروت،داراحیاء التراث العربی۔

۱۷۔ الاصابة فی تمییز الصحابة،ابن حجرعسقلانی،بیروت،داراحیاء التراث العربی،الطبعة الاولی ۱۳۲۸ق۔

۱۸۔ اعلام الدین،دیلمی،قم،مؤسسة آل البیتؑ،۱۴۰۸ق۔

۱۹۔ اعلام الوری،أبوعلی فضل بن حسن طبرسی، تهران،دارالکتب الاسلامیة،۱۳۹۰ق۔

۲۰۔ اعیان الشیعة،سیدمحسن امین،بیروت،دارالتعارف،طبع اوّل۔

۲۱۔ الاغانی،ابوالفرج الاصفهانی،مصر، وزارة الثقافة و الارشاد القومی، المؤسسة المصریة العامة، ۱۹۶۳م۔

۲۲۔ الامالی،شیخ صدوق،بیروت،اعلمی،۱۹۸۰م۔

۲۳۔ الامالی فی آثار الصحابه،عبدالرزاق بن همام الصنعانی، تحقیق: مجدی، السید ابراهیم، قاهره،مکتبة القرآن۔

۲۴۔ الامالی،محمد بن الحسن الطوسی،نجف۔

۲۵۔ الامالی، محمد بن محمد بن نعمان، الشیخ المفید، تحقیق:حسین استاد ولی، علی اکبرغفاری، قم ۱۴۰۳ق۔

۲۶۔ الامام ابوحنیفه،ابوزهره،مصر،دارالفکر العربی۔

۲۷۔ الامام الصادقؑ،محمد جواد فضل الله،بیروت،دارالزهراء، ۱۴۰۱ق۔

۲۸۔ الامام الصادقؑ و المذاهب الاربعة،اسد حیدر،اصفهان،مکتبة الامام امیر المؤمنینؑ۔

۲۹۔ الامام المجتبیٰؑ،حسن مصطفوی، قم،مکتبة المصطفوی۔

۳۰۔ الامام مالک،ابوزهره،قاهره،دارالفکر العربی۔

۳۱۔ امامة و التبصرة من الحیرة،ابن بابویه قمی،قم،مدرسة الامام المهدیؑ،۱۴۰۴ق۔

۳۲۔ الامامة و السیاسة،ابومحمد عبدالله بن مسلم ابن قتیبة الدینوری،مصر، ۱۳۸۸۔

۳۳۔امان الاخطار'ابن طاووس'نجف.

۳۴۔الامتاع والمؤانسہ'ابوحیان التوحیدی' تحقیق: احمد امین واحمد الزین' بیروت'دارمکتبة الحیاۃ.

۳۵۔ الانتصار'ابوالحسین خیاط' تحقیق نیبرج'قاھرہ'۱۹۲۵م.

۳۶۔ انساب الاشراف'بلاذری' تحقیق محمد باقرالمحمودی' بیروت ۱۳۹۸ق.

۳۷۔ الاوائل'ابوھلال عسکری'دمشق'۱۹۷۵م.

۳۸۔ اوائل المقالات' الشیخ المفید' قم'مکتبة الداوری.

۳۹۔ الایضاح' فضل بن شاذان النیشابوری'بیروت'الاعلمی (اورطبع شدہ) محدث ارموی' تھران' ۱۳۶۳ش.

۴۰۔بحارالانوار'علامہ محمد باقرمجلسی'بیروت'مؤسسة الوفاء'۱۴۰۳ق.

۴۱۔بحوث مع اھل السنة والسلفیة' السید مھدی الروحانی' بیروت ' المکتبة الاسلامیة.

۴۲۔البدایة والنھایة' ابوالفداء ابن کثیرالدمشقی' بیروت ' دارالکتب العلمیہ' ۱۴۰۷ق.

۴۳۔البرھان فی تفسیرالقرآن' سید ھاشم بحرانی' قم ' مکتبة اسماعیلیان.

۴۴۔بزرگانِ فلسفہ' ھنری توماس' ترجمہ فریدون بدرہ ای' تھران' مؤسسۂ کیھان.

۴۵۔ بصائرالدرجات ' ابوجعفرمحمد بن حسن فروخ صفار قمی' حاج میرزا محسن کوچہ باغی تبریزی(کی کاوشوں سے)' قم ' مکتبة المرعشی' ۱۴۰۴ق.

۴۶۔ البصائروالذخائر' ابوحیان التوحیدی' تحقیق احمد امین' قاھرہ' ۱۳۷۳ق.

۴۷۔بھج الصباغة فی شرح نھج البلاغة ' علامہ شیخ محمد تقی التستری' تھران' منشوراتِ مکتبة الصدر' ۱۳۹۰ق.

۴۸۔ تاریخ ابن الوردی'زین الدین عمربن مظفرابن الوردی'نجف'مطبعة الحیدریة '۱۳۸۹ .

۴۹۔تاریخ ابن خلدون'بیروت'مؤسسة الاعلمی'۱۳۹۱ق.

۵۰۔تاریخ ابی زرعة الد مشقی'عبدالرحمن بن عمرو بن عبداللہ النصری' دراسة و تحقیق' شکراللہ بن نعمة اللہ القوجانی.

۵۱۔ تاریخ الامم والرسل والملوک'محمد بن جریرطبری'بیروت'مؤسسة الاعلمی' ۱۹۸۳

(معاویہ کی حکومت کے حصے تک ' طبع از محمد ابوالفضل ابراهیم' مصر'دارالمعارف)

۵۲۔تاریخ الکبیر'بخاری'بیروت'دارالکتب العلمیة.

۵۳۔تاریخ اهل البیتؑ' تحقیق محمد رضا حسینی جلالی' قم' مؤسسة آل البیتؑ'۱۴۱۰.

۵۴۔تاریخ بغداد'ابوبکراحمد بن علی خطیب بغدادی' بیروت ' دارالکتاب العربی.

۵۵۔ تاریخ بیهق' ابوالحسن علی بن زید بیهقی"ابن فندق" تصحیح ڈاکٹر کلیم الله حسینی' حیدرآباد.

۵۶۔ تاریخ تشیع درایران'رسول جعفریان' قم' انصاریان'۱۳۷۵ش.

۵۷۔تاریخ الثقات'العجلی' تحقیق عبدالمعطی قلعجی'بیروت'دارالکتب العلمیه'۱۴۰۵.

۵۸۔ تاریخ جرجان' السهمی' به اهتمام: محمد عبدالمعید خان' بیروت' عالم الکتب' الطبعة الرابعة' ۱۴۰۷ق.

۵۹۔ تاریخ الخلفاء' جلال الدین السیوطی' تحقیق: محمد محیی الدین عبدالحمید' مصر' مطبعة السعاده'۱۳۷۱ق.

۶۰۔تاریخ خلیفة بن خیاط'مدینة منوره'دارطیبه'۱۴۰۵ق.

۶۱۔ تاریخ سیاسی غیبت امام دوازدهم' جاسم حسین' ترجمة محمد تقی آیة اللهی' تهران' امیر کبیر' ۱۳۶۷ش.

۶۲۔ تاریخ الطبری'محمد بن جریر طبری'بیروت'مؤسسة الاعلمی.

۶۳۔تاریخ فخری' ابن طقطقی' ترجمة محمد وحید گلپایگانی' تهران ' بنگاه ترجمه و نشر کتاب'۱۳۶۰ش.

۶۴۔تاریخ قم'حسن بن محمد قمی' ترجمة حسن بن علی بن حسن عبدالملک قمی'سید جلال الدین تهرانی کی کاوشوں سے' تهران 'توس ۱۳۶۱ش.

۶۵۔تاریخ گزیده'حمد الله مستوفی'عبدالحسین نوایی کی کاوشوں سے' تهران' امیر کبیر'۱۳۶۲ش.

۶۶۔تاریخ المدینة المنوره' ابوزید عمر بن شبّه النمیری' تحقیق: فهیم محمد شلتوت' افست قم' دارالفکر'۱۴۱۰ق.

۶۷۔تاریخ الموصل'ابوزکریاالازدی' تحقیق محمد توفیق عویضه' قاهره'۱۹۶۷م.

۶۸۔ تاریخ یحیی بن معین' تحقیق: احمد محمد نورسیف' ریاض' جامعة الملک عبدالعزیز' ۱۳۹۹ ق۔

۶۹۔ تاریخ الیعقوبی' احمد بن محمد ابن واضح الیعقوبی' بیروت دار صادر۔

۷۰۔ تأسیس الشیعة لعلوم الاسلام' سید حسن صدر' تهران' منشورات الاعلمی۔

۷۱۔ تجارب الامم' ابوعلی مسکویه' تحقیق دکتر امامی تهران' سروش۔

۷۲۔ تحف العقول' ابن شعبة حرانی' قم' انتشارات اسلامی۔

۷۳۔ التدوین فی اخبار قزوین' رافعی' تصحیح عزیزاللہ عطاردی' بیروت' دارالکتب العلمیه۔

۷۴۔ تذکرة الحفاظ' شمس الدین الذهبی' بیروت داراحیاء التراث العربی ۱۳۷۴ ق۔

۷۵۔ تذکرة الخواص' سبط بن الجوزی' تهران' مکتبة نینوی۔

۷۶۔ تراتیب الاداریة' الکتانی' بیروت' داراحیاء التراث العربی۔

۷۷۔ ترجمة الامام الحسنؑ ابن سعد' تحقیق: السید عبدالعزیز طباطبائی' مجلة تراثنا' ش ۱۱ میں شائع شدہ۔

۷۸۔ ترجمة الامام الحسنؑ من تاریخ دمشق' ابن عساکر' تحقیق العلامة المحمودی' بیروت۔

۷۹۔ ترجمة الامام الحسینؑ ابن سعد' تحقیق: السید عبدالعزیز طباطبائی' تراثنا' ش ۱۰ میں طبع شدہ۔

۸۰۔ ترجمة الامام الحسینؑ من تاریخ دمشق' ابن عساکر' تحقیق العلامة المحمودی' بیروت۔

۸۱۔ ترجمة الامام علی بن ابی طالبؑ' ابن عساکر' تحقیق: محمد باقر محمودی' طبع اوّل۔

۸۲۔ تشیع در مسیر تاریخ' ڈاکٹر حسین جعفری' ترجمة محمد تقی آیه اللهی' تهران دفتر نشر فرهنگ اسلامی' ۱۳۵۹ ش۔

۸۳۔ تفسیر الامام العسکریؑ' تصحیح موسسة الامام المهدیؑ' قم۔

۸۴۔ تفسیر الصافی' فیض کاشانی' بیروت' موسسة الاعلمی۔

۸۵۔ تفسیر العیاشی' محمد بن مسعود عیاشی' تهران' انتشارات علمیة اسلامیه۔

۸۶۔ تقیید العلم' خطیب بغدادی' بیروت' داراحیاء التراث العربی' ۱۹۷۴ م۔

۸۷۔ التنبیه و الاشراف' ابوالحسن علی بن الحسین المسعودی' تحقیق: عبداللہ اسماعیل الصاوی' قاهره (افست قم) ۱۳۶۳ ش۔

۸۸۔تنقیح المقال' علامۂ مامقانی' طبع سنگی۔
۸۹۔التوحید'محمد بن علی بن الحسین ابن بابویہ الشیخ الصدوق' تہران' مکتبۃ الصدوق' ۱۳۹۸۔
۹۰۔تہذیب الاحکام' محمد بن حسن الطوسی' تہران۔
۹۱۔تہذیب التہذیب'ابن حجر عسقلانی' بیروت' دار صادر۔
۹۲۔تہذیب الکمال'امام مزی'بیروت'مؤسسۃ الرسالہ۔
۹۳۔الثاقب فی المناقب'ابوجعفر محمد بن علی طوسی'ابن حمزہ' تحقیق: نبیل رضا علوان' قم' انصاریان' ۱۴۱۱ق۔
۹۴۔الثقات'ابن حبان' حیدر آباد' بیروت' مؤسسۃ الکتب الثقافیۃ' ۱۴۰۳ق۔
۹۵۔جامع المسانید' ابوالمؤید موفق بن احمد خوارزمی 'بیروت'دارالکتب العلمیہ۔
۹۶۔جامع بیان العلم وفضلہ 'ابن عبدالبر القرطبی'مصر'دارالکتب الحدیثیۃ'۱۹۷۹م۔
۹۷۔ الجرح و التعدیل'ابوحاتم رازی' بیروت'داراحیاء التراث العربی'۱۹۵۲م۔
۹۸۔الجَمَل' شیخ مفید' تحقیق:السید علی میرشریفی' قم' مکتب الاعلام الاسلامی' ۱۳۷۱۔
۹۹۔جہاد الشیعۃ' سمیرہ مختار اللیثی' افست قم' نشر البطحاء' ۱۳۶۳ش۔
۱۰۰۔ حلیۃ الاولیاء' ابونعیم اصفہانی' بیروت' دارالکتاب العربی' ۱۳۸۷ق۔
۱۰۱۔حیاۃ الامام باقرؑ'باقر شریف قرشی' نجف۔
۱۰۲۔الحیاۃ السیاسیۃ للامام الحسنؑ' السید جعفر مرتضی' قم' انتشارات اسلامی'۱۴۰۵ق۔
۱۰۳۔الحیاۃ السیاسیۃ للامام الجوادؑ'جعفر مرتضی' بیروت' الدارالاسلامیہ۔
۱۰۴۔الحیاۃ السیاسیۃ للام الرضاؑ' جعفر مرتضی' بیروت' دارالتبلیغ الاسلامی'۱۳۹۹۔
۱۰۵۔حیاۃ الصحابۃ' الکاندھلوی' بیروت'دارالقلم'۱۹۶۸م۔
۱۰۶۔ خاندان نوبختی' عباس اقبال' تہران' کتابخانۂ طہوری' ۱۳۵۷ش۔
۱۰۷۔ الخرائج والجرائح' تحقیق: مدرسۃ الامام المہدیؑ'قم'۱۴۰۹ق۔ (اور ایک جلد کی صورت میں تلخیص شدہ طباعت)
۱۰۸۔ الخطط المقریزیۃ' تقی الدین المقریزی' بیروت' دار صادر۔
۱۰۹۔خورشید مغرب'محمد رضا حکیمی' تہران'دفتر نشر فرہنگ اسلامی'۱۳۶۳ش۔

۱۱۰۔ دراسات وبحوث فی التاریخ والاسلام' جعفر مرتضی' قم' انتشارات اسلامی۔

۱۱۱۔ در المنثور' جلال الدین سیوطی' قم' افست کتابخانۂ مرعشی۔

۱۱۲۔ دعائم الاسلام' قاضی نعمان' مصر' دار المعارف' ۱۳۸۳ق۔

۱۱۳۔دعبل بن علی الخزاعی شاعر اهل بیت ' عبدالکریم الاشتر' دمشق ' دار الفکر' ۱۴۰۴ق۔

۱۱۴۔ دلائل الامامۃ ' محمد بن جریر الطبری الامامی' نجف' ۱۳۸۳ق۔

۱۱۵۔ دیوان ابو الاسود الدئلی' صنعۃ ابی سعید الحسن السکری' تحقیق الشیخ محمد حسن آل یاسین ' بیروت ' مؤسسۃ ایف' ۱۴۰۲۔

۱۱۶۔ دیوان دعبل بن علی الخزاعی' شرحہ حسن احمد ' بیروت ' دار الکتاب العربی' ۱۴۱۴۔

۱۱۷۔ ذخائر العقبی فی مناقب ذوی القربی' محب الدین طبری' بیروت' دار المعرفۃ۔

۱۱۸۔ذریعۃ الی تصانیف الشیعۃ ' علامہ شیخ آقا بزرگ طهرانی' بیروت' دار الاضواء' ۱۴۰۳ق۔

۱۱۹۔ ربیع الابرار ونصوص الاخبار' ابو القاسم محمود بن عمر الزمخشری' قم' (افست رضی)' ۱۳۶۹ق۔

۱۲۰۔رجال الطوسی' الشیخ الطوسی' نجف' المطبعۃ الحیدریہ' ۱۳۸۰ق۔

۱۲۱۔ رجال الکشی' (اختیار معرفۃ الرجال) محمد بن حسن شیخ طوسی' تصحیح مصطفوی' مشهد' دانشگاہِ مشهد۔

۱۲۲۔رجال النجاشی' ابو العباس النجاشی' تصحیح آیۃ اللہ زنجانی' قم' مؤسسۃ النشر الاسلامی۔

۱۲۳۔ روضۃ الشهداء' ملا حسین کاشفی' تصحیح ابو الحسن شعرانی' تهران' اسلامیہ۔

۱۲۴۔ روضۃ الواعظین' فتالِ نیشاپوری' نجف' مطبعۃ الحیدریہ' ۱۳۸۶' افست قم' رضی۔

۱۲۵۔ سبل الهدی والرشاد فی سیرۃ خیر العباد' محمد بن یوسف الصالحی الشامی' تحقیق: الدکتور مصطفی عبدالواحد' قاهره (ج ۱) ۱۳۹۲ق۔

۱۲۶۔ سر السلسلۃ العلویۃ' بخاری نسابہ' نجف' ۱۳۸۱ق۔

۱۲۷۔ سنن ابن ماجہ' ابو عبداللہ محمد بن یزید قزوینی ابن ماجد' تحقیق: محمد فؤاد عبدالباقی' بیروت' دار احیاء التراث العربی۔

۱۲۸۔سنن الدارمی' ابو محمد عبداللہ بن بهرام الدارمی' بیروت' دار الفکر' ۱۳۹۸ق۔

۱۲۹۔سیراعلام النبلاء ' شمس الدین ذهبی 'بیروت 'مؤسسة الرسالة ' ۱۴۰۱ ق.
۱۳۰۔ سیرة و قیام زید بن علی 'ڈاکٹرحسین کریمان ' تهران ' انتشارات علمی و فرهنگی ' ۱۳۶۰ .
۱۳۱۔سیرة الائمة الاثنی عشر ' هاشم معروف الحسنی ' قم ' منشورات رضی.
۱۳۲۔شذرات الذهب فی اخبار من الذهب ' ابن العماد الحنبلی ' بیروت ' دارالاحیاء التراث العربی (بی تا).
۱۳۳۔شرح الاخبار ' قاضی نعمان ' تحقیق: سید محمد حسینی جلالی ' قم ' انتشارات اسلامی ' ۱۴۰۹ ق.
۱۳۴۔ شرح نهج البلاغه 'ابن ابی الحدید ' تحقیق: محمد ابوالفضل ابراهیم 'مصر ' دارالاحیاء الکتب العربیه ' ۱۳۸۷ ق.
۱۳۵۔شرعة التسمیة ' میرداماد ' تصحیح رضااستادی ' اصفهان 'مؤسسة المهدیة.
۱۳۶۔ صحیح البخاری ' (سندی کے حاشیے کے ساتھ) 'ابوعبدالله محمد بن اسماعیل البخاری ' بیروت ' دارالمعرفة.
۱۳۷۔ صحیح من سیرة النبی الاعظمؐ السید جعفر مرتضی ' قم ' ۱۴۰۳ (بی تا).
۱۳۸۔صحیفة سجادیه ' الامام علی بن الحسینؑ طبع رایزنی فرهنگی ایران ' شام .
۱۳۹۔صراط المستقیم ' البیاضی العاملی ' نجف ' مطبعة الحیدریة ' ۱۳۸۴ ق.
۱۴۰۔صفات الشیعة ' شیخ صدوق ' تهران ' اعلمی.
۱۴۱۔ صفة الصفوة ' ابوالفرج بن الجوزانی ' دارالوعی 'شام ' ۱۳۹۰ ق.
۱۴۲۔ صلح الامام الحسنؑ 'محمد جواد فضل الله 'بیروت 'دارالغدیر.
۱۴۳۔صلح الحسنؑ 'آل یاسین 'دارالکتب العراقیة ' الکاظمیة.
۱۴۴۔صلة بین التشیع والتصوف 'مصطفی کامل شیبی ' مصر ' دارالمعارف.
۱۴۵۔صواعق المحرقة ' ابن حجر هیثمی ' مصر ' مکتبة القاهرة ' ۱۳۸۵ ق.
۱۴۶۔ ضحی الاسلام ' احمد امین ' مکتبة النهضة المصریة.
۱۴۷۔ طبقات الحنابلة ' قاضی ابوالحسین بن محمد بن ابی یعلی ' تحقیق محمد حامد الفقی ' قاهره ' ۱۳۷۱ ق.

۱۴۸۔طبقات السنیة فی تراجم الحنفیة ' تقی الدین عبدالقادر الحنفی' تحقیق: عبدالفتاح الحلو'
ریاض'دار الرفاعی' ۱۴۰۳ق.

۱۴۹۔ طبقات الکبری' محمد بن سعد' بیروت 'دار صادر' ۱۴۰۵.

۱۵۰۔عقد الفرید' ابن عبدربه ' بیروت ' دارالکتب العلمیة ' ۱۴۰۴ق.

۱۵۱۔ علل الشرائع ' شیخ صدوق' نجف'مطبعة الحیدریة ' ۱۳۸۵ق.

۱۵۲۔علی بن الحسینؑ'شهیدی' تهران ' دفتر نشر فرهنگ اسلامی.

۱۵۳۔عمدة الطالب فی انساب آل ابی طالب'ابن عنبة ' نجف' مکتبة الحیدریة '۱۳۸۰ق.

۱۵۴۔عوالم العلوم' شیخ عبدالله بحرانی' تحقیق : مدرسة الامام المهدیؑ' قم.

۱۵۵۔عیون اخبار الرضاؑ'محمد بن علی بن الحسین ابن بابویه الشیخ الصدوق' تهران'اعلمی.

۱۵۶۔ عیون اخبار'ابومحمد عبدالله بن مسلم ابن قتیبة الدینوری' قاهره'المؤسسة المصریة العامه'
۱۳۸۳ق

۱۵۷۔الغارات'ابواسحاق ابراهیم بن محمد ثقفی کوفی' تحقیق: میر جلال الدین محدث ارموی'
تهران'۱۳۵۵ق.

۱۵۸۔ الغدیر' عبدالحسین الامینی' بیروت ' دارالکتاب العربی ' ۱۳۹۷ق.

۱۵۹۔غریب الحدیث ' ابوعبید قاسم بن سلام هروی' بیروت 'هند' ۱۳۸۴ق.

۱۶۰۔الغیبه' نعمانی' تحقیق علی اکبر غفاری' تهران ' مکتبة الصدوق.

۱۶۱۔الغیبة ' ابوجعفر محمد بن حسن شیخ طوسی' تهران'مکتبة نینوی' (تحقیق و اشاعت : بنیاد
معارف اسلامی' قم).

۱۶۲۔الفائق فی غریب الحدیث ' زمخشری' مصر' مطبعة الحلبی.

۱۶۳۔الفتوح'ابومحمد احمد ابن اعثم الکوفی'هند۱۳۹۹ق.

۱۶۴۔ فرائد السمطین ' ابراهیم بن محمد الجوینی الخراسانی' تحقیق: محمد باقر محمودی'
بیروت'مؤسسة المحمودی.

۱۶۵۔فرج المهموم ' ابن طاووس' نجف'۱۳۶۹ق.

۱۶۶۔ فرق الشیعة ' ابومحمد حسن بن موسی النوبختی' تصحیح: سید محمد صادق آل بحر

العلوم ' نجف' المکتبة المرتضویه' ۱۳۵۵ ق.

۱۶۷۔ الفرق بین الفرق' البغدادی' بیروت ' دار المعرفة.

۱۶۸۔ الفصول المختاره 'محمد بن محمد بن نعمان الشیخ المفید' قم' مکتبة الداوری.

۱۶۹۔ الفصول المهمة' ابن صباغ مالکی' تهران' منشورات الاعلمی.

۱۷۰۔ فضل الاعتزال وطبقات المعتزله' قاضی عبدالجبار' تحقیق فؤاد سید' تیونس' ۱۳۹۳ .

۱۷۱۔ فوائد الرضویة فی احوال العلماء الجعفریة ' شیخ عباس قمی' قم.

۱۷۲۔ فوات الوفیات ' صلاح الدین الصفدی' بیروت' ۱۴۰۲ .

۱۷۳۔ الفهرست' محمد بن اسحاق ابن ندیم' تصحیح تجدد' تهران' مروی.

۱۷۴۔ قاموس الرجال' الشیخ محمد تقی التستری ' تهران' مرکز نشر الکتاب' ۱۳۹۷ .

۱۷۵۔ قرب الاسناد' ابو العباس جعفر بن عبدالله حمیری' تهران' مکتبة نینوی الحدیثه.

۱۷۶۔ الکافی' محمد بن یعقوب الکلینی' تحقیق: علی اکبر غفاری' تهران ' دار الکتب الاسلامیة' ۱۳۸۸ ق.

۱۷۷۔ کامل الزیارات ' ابن قولویه ' نجف' المکتبة المرتضویة ' ۱۳۵۶ ق.

۱۷۸۔ الکامل فی التاریخ ' ابو الحسن علی بن ابی الکریم ابن الاثیر' بیروت ' دار صادر' ۱۳۸۵ .

۱۷۹۔ الکامل فی اللغة والادب' ابو العباس محمد بن یزید المبرد النحوی' تحقیق: تغارید بیضون' نعیم زرزور' بیروت' ۱۴۰۷ ق.

۱۸۰۔ الکامل فی ضعفاء الرجال' ابن عدی ' بیروت ' دار الفکر.

۱۸۱۔ کشف الغمه فی معرفة الائمه' علی بن عیسی اربلی' تحقیق : سید هاشم رسولی' تبریز.

۱۸۲۔ کشف القناء فی حجیة الاجماع' محقق الکاظمی' تهران ' ۱۳۱۶ ق.

۱۸۳۔ کمال الدین و تمام النعمة ' شیخ صدوق' تهران' دار الکتب الاسلامیة' ۱۳۵۹ ش.

۱۸۴۔ لباب الانساب والالقاب والاعقاب' ابو الحسن علی بن ابو القاسم بیهقی ابن فندق' تحقیق: مهدی رجائی' قم کتابخانة آیة الله مرعشی' ۱۴۱۰ .

۱۸۵۔ لسان العرب ' ابن منظور ' قم' نشر ادب الحوزه.

۱۸۶۔ لسان المیزان ' ابن حجر العسقلانی' بیروت ' مؤسسة الاعلمی' الطبعة الثانیة ' ۱۳۹۰ ق.

۱۸۷۔ مبعوث الحسین ' محمد علی عابدین ' قم' انتشارات اسلامی.

۱۸۸۔متشابه القرآن ومختلفه ' ابن شهرآشوب المازندرانی ' قم' بیدار.

۱۸۹۔ مجمع البیان' فضل بن حسن طبرسی' تحقیق: سید هاشم رسولی محلاتی' تهران ' المکتبة العلمیة الاسلامیة.

۱۹۰۔ مجمع الزوائد ومنبع الفوائد' نورالدین علی بن ابی بکر الهیثمی' بیروت' دارالکتاب' ۱۹۶۷ م.

۱۹۱۔ مجمل التواریخ والقصص' (تالیف سال ۵۲)' به کوشش محمد رمضانی ' تهران' کلالة خاور' ۱۳۰۹ ش.

۱۹۲۔مجموعة رسائل اعتقادی' علامۂ مجلسی' به کوشش سید مهدی رجایی' مشهد' بنیاد پژوهشهای اسلامی' ۱۳۶۸ .

۱۹۳۔مجموعة الآثار' مجموعة مقالات دومین کنگرۂ امام رضاؑ.

۱۹۴۔المحاسن' احمد بن محمد بن خالد برقی' تصحیح محدث ارموی' تهران' ۱۳۷۰ ق.

۱۹۵۔ المحاسن والمساوی' ابراهیم بن محمد بیهقی' بیروت ' دارصادر' ۱۳۹۰ ق.

۱۹۶۔ محاضرات الادباء' راغب اصفهانی' افست قم' منشورات الرضی' ۱۳۷۴ ش.

۱۹۷۔ مختصر تاریخ دمشق' محمد بن مکرم ابن المنظور' دمشق' دارالفکر' ۱۹۸۸ م.

۱۹۸۔ مذاهب ابتدعتها السیاسة فی التاریخ ' عبدالواحد الانصاری' بیروت ' مؤسسة الاعلمی' ۱۳۹۳ ق.

۱۹۹۔ مرآة الجنان' یافعی' بیروت' اعلمی.

۲۰۰۔ مرجئه تاریخ واندیشه' رسول جعفریان' قم' خرّم' ۱۳۷۱ ش.

۲۰۱۔مروج الذهب ومعادن الجوهر' ابوالحسن علی بن الحسین المسعودی' بیروت' دارالاندلس' الطبعة الاولی' ۱۳۵۸ ق.

۲۰۲۔مروج الذهب ومعدن الجوهر' مسعودی' تصحیح یوسف اسعد داغر' بیروت' دارالاندلس.

۲۰۳۔مسارالشیعه' محمد بن محمد بن نعمان شیخ مفید.

۲۰۴۔مستدرک الوسائل' میرزاحسین النوری' قم' مؤسسة آل البیتؑ.

۲۰۵۔ مستدرک علی الصحیحین' ابوعبدالله الحاکم النیشاپوری' بیروت' دارالمعرفة (آفست

طباعت ہندوستان، سال ۱۳۴۲ ق)۔

۲۰۶۔ مسند الامام الرضاؑ، عزیز اللہ عطاردی، مشھد، کنگرۂ جھانی امام رضاؑ۔

۲۰۷۔ مسند الامام الجوادؑ، عزیز اللہ عطاردی، مشھد، کنگرۂ جھانی امام رضاؑ۔

۲۰۸۔ مسند الامام الکاظمؑ، عزیز اللہ عطاردی، مشھد، کنگرۂ جھانی امام رضاؑ۔

۲۰۹۔ مسند الامام الھادیؑ، عزیز اللہ عطاردی، مشھد، کنگرۂ جھانی امام رضاؑ۔

۲۱۰۔ المصنف، ابن ابی شیبہ، طبع ہندوستان۔

۲۱۱۔ المصنف، عبدالرزاق بن ھمام الصنعانی، تحقیق: حبیب الرحمن الاعظمی، بیروت، ۱۳۹۲ھ ق۔

۲۱۲۔ معادن الحکمۃ، محمد بن فیض کاشانی، تحقیق العلامۃ الاحمدی، قم، منشورات جماعۃ المدرسین، ۱۴۰۷ ق۔

۲۱۳۔ المعارف، ابن قتیبۃ الدینوری، تحقیق: ثروۃ عکاشہ، مصر، دار المعارف، آفست طباعت قم، ۱۴۱۵، منشورات رضی۔

۲۱۴۔ معالم العلماء، ابن شھر آشوب، نجف، المطبعۃ الحیدریہ، ۱۳۸۰ ق۔

۲۱۵۔ معانی الاخبار، ابوجعفر محمد بن علی ابن الحسین بن بابویہ القمی، تصحیح: علی اکبر غفاری، قم، انتشارات اسلامی، ۱۳۶۱ ش۔

۲۱۶۔ معجم احادیث المھدیؑ، مؤسسۃ المعارف الاسلامیۃ، قم، ۱۴۱۱ ق۔

۲۱۷۔ معجم البلدان، یاقوت حموی، بیروت، دار صادر، ۱۳۹۹ ق۔

۲۱۸۔ معجم الکبیر، الطبرانی، بیروت، دار احیاء التراث العربی۔

۲۱۹۔ معرفۃ الصحابۃ، ابونعیم اصفھانی، تحقیق: ڈاکٹر محمد راضی بن حاج عثمان، مدینۃ منورہ، مکتبۃ الدار، ۱۴۰۸ ق۔

۲۲۰۔ المعرفۃ والتاریخ، ابویوسف یعقوب بن سفیان البَسَوی، تحقیق: اکرم ضیاء العُمَری، بغداد، مطبعۃ الارشاد، ۱۳۹۴ ق۔

۲۲۱۔ المعیار والموازنہ فی فضائل امیر المؤمنین علی بن ابی طالبؑ، ابوجعفر الاسکافی، تحقیق: الشیخ محمد باقر المحمودی۔

۲۲۲۔ مقاتل الطالبین، ابوالفرج الاصفھانی، نجف، المطبعۃ الحیدریۃ، ۱۹۶۵۔

۲۲۳۔مقتل امیرالمؤمنین ' ابن ابی الدنیا ' تصحیح: السید عبدالعزیز الطباطبائی ' (مجلة تراثنا ' ش ۱۲ ' و تصحیح الشیخ محمد باقر المحمودی ' تهران ' سازمان چاپ و انتشارات وزارتِ ارشادِ اسلامی.

۲۲۴۔ مقدمه ای بر تاریخ تدوین حدیث ' رسول جعفریان ' قم ' فؤاد ' ۱۳۶۹ ش.

۲۲۵۔ المقنع فی الامامه ' عبدالله بن عبدالله السدآبادی ' تحقیق: شاکر شبع ' قم ' انتشاراتِ اسلامی ' ۱۳۷۴ ش

۲۲۶۔مکاتیب الرسول ' علی الاحمدی ' قم ' نشریس ' ۱۳۶۳ ش.

۲۲۷۔ مکارم الاخلاق ' حسن بن فضل بن حسن طبرسی ' بیروت ' مؤسسة الاعلمی.

۲۲۸۔ الملل والنحل ' الشهر ستانی ' تحقیق: محمد فتح الله بن بدران ' قاهره ' افست قم ' ۱۳۶۴ ش ' منشوراتِ رضی.

۲۲۹۔ مناقب آل ابی طالب ' ابن شهر آشوب السروی المازندرانی ' قم ' مکتبة علامه.

۲۳۰۔ مناقب احمد بن حنبل ' ابن جوزی ' بیروت ' دارالآفاق الجدیدة ' ۱۳۹۳ ق.

۲۳۱۔ منتخب الاثر ' لطف الله صافی ' تهران ' مکتبة الصدر.

۲۳۲۔ منهاج التحرک عند الامام الهادیؑ ' نجف تهران ' سازمانِ چاپ وانتشارات وزارتِ ارشادِ اسلامی ' ۱۴۰۳ ق.

۲۳۳۔الموطاء ' مالک بن انس ' تحقیق: محمد فؤاد عبدالباقی ' بیروت ' داراحیاء التراث العربی.

۲۳۴۔الموفقیات ' زبیر بن بکار ' افست قم ' (بغداد میں ۱۹۷۲ کی طباعت کے مطابق) ' منشورات الرضی ' ۱۳۷۴.

۲۳۵۔ مهج الدعوات ' ابن طاووس ' تهران ' کتابخانهٔ سنایی.

۲۳۶۔ میزان الاعتدال ' شمس الدین ذهبی ' بیروت ' دارالمعرفة ' الطبعة الاولی ' ۱۳۸۲ ق.

۲۳۷۔ میزان فی تفسیر القرآن ' علامه سید محمد حسین طباطبائی ' تهران ' دارالکتب الاسلامیة ' ۱۳۹۷ ق.

۲۳۸۔ نثرالدّر ' ابو سعید آبی ' مصر ' الهیئة العامة المصریة للکتب ' ۱۹۸۱ م.

۲۳۹۔ نظم درر السمطین فی فضایل المصطفی والمرتضی والبتول والسبطین ' جمال الدین محمد بن یوسف حنفی مدنی ' تحقیق: محمد هادی امینی ' تهران ' مکتبة نینوی.

۲۳۰۔ نوابغ الرواۃ' (طبقات اعلام الشیعة فی قرن الرابع) ' آقا بزرگ طهرانی' بیروت' دار الکتب العربی۔

۲۳۱۔ نور الابصار' محمد مؤمن شبلنجی' مصر' المطبعة الیوسفیة۔

۲۳۲۔ نهج السعادة فی مستدرک نهج البلاغة' الشیخ محمد باقر المحمودی' بیروت' مؤسسة الاعلمی و ....' ۱۳۹۷ق۔

۲۳۳۔ الوافدات من النساء علی معاویة' تحقیق سکینة الشهابی' دمشق۔

۲۳۴۔ الوزراء والکتاب' الجشهیاری' مصر' مطبعة مصطفی الحلبی' ۱۳۵۷ق۔

۲۳۵۔ وسائل الشیعة إلی تحصیل مسائل الشریعة' محمد بن حسن الحر العاملی' بیروت' دار الاحیاء التراث العربی' الطبعة الرابعة' ۱۳۹۱۔

۲۳۶۔ وفیات الاعیان' ابن خلکان' تحقیق: احسان عباس ۱۹۶۹م' (افست قم' منشورات رضی)۔

۲۳۷۔ وقعة صفین' نصر بن مزاحم منقری' تحقیق: عبدالسلام هارون' افست قم' مکتبة آیة الله مرعشی' ۱۴۰۳۔

۲۳۸۔ ولاة مصر' الکندی' تحقیق: دفن گست' بیروت' ۱۹۰۸۔

۲۳۹۔ الهفت الشریف' مفضل بن عمر جعفی' تحقیق: مصطفی غالب' بیروت' در الاندلس۔

۲۵۰۔ ینابیع المودة' قندوزی حنفی' قم' انتشاراتِ بصیرتی۔

☆☆☆